اُردُو زبان میں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر جامع ترین کتاب

سیرۃ النبی

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

حصہ چہارم

علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ
علامہ سیّد سُلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ

الفیصل
ناشران و تاجرانِ کُتب
غزنی سٹریٹ اُردو بازار لاہور

فہرست مضامین

دیباچہ طبع اول	۱۵	نبوت کے لوازم اور خصوصیات	۴۶
دیباچہ طبع ثانی	۱۸	وہبی استعداد	۴۸
مقدمہ		غیبی علم	۵۰
منصب نبوت		علم انسانی کے ماخذ	۵۱
کتاب کا موضوع، آپؐ کے پیغمبرانہ کارنامے	۱۹	ذرائع علم کے حصول کے زمانے اور ان کے مراتب	۵۲
نبی اور مصلح اور حکیم	۲۰	غیر مادی علم	۵۴
نبوت کی حقیقت اور خصوصیات	۲۰	علم غیب	۵۸
نبوت و رسالت کے ثبوت کا اجمالی طریقہ	۲۲	غیب کی حقیقت	۵۹
پہلا طریقہ	۲۳	وحی اور ملکۂ نبوت	۶۳
دوسرا طریقہ	۲۳	کتاب اور سنت	۶۴
تیسرا طریقہ	۲۴	وحی متلو اور وحی غیر متلو	۶۵
نبی کی ضرورت	۲۵	احادیث، قرآن کا بیان ہیں	۶۷
نبی کی عصمت	۲۶	الہام و اجتہاد و حکمت	۶۷
نبی کی محبوبیت	۲۷	اجتہاد نبوت	۶۸
مصلحین	۲۷	عصمت و بے گناہی	۷۳
مصلحین کے اقسام	۲۷	بعض شبہات کا ازالہ	۸۰
نبی کی دو بعثتیں	۲۸	نبی کی بشریت	۸۶
بعثت کے لیے کسی قوم کا انتخاب	۲۹	اجتہاد نبوی میں خطاء	۹۳
بعثت کا زمانہ	۲۹	اس خطاء کے معنی	۹۴
نبی کی یقینی کامیابی	۳۰	پانچ اجتہادی علوم پر تنبیہہ الٰہی	۹۴
ایک شبہ اور اس کا جواب	۳۸	پہلا واقعہ	۹۵
نبی اور غیر نبی کے امتیازات	۴۲	دوسرا واقعہ	۹۶

تیسرا واقعہ ۹۹
چوتھا واقعہ ۹۹
پانچواں واقعہ ۱۰۰
ایک غلط استدلال ۱۰۲
عقل بشری ۱۰۴
ملکۂ نبوت یا عقل نبوت کا شرعی ثبوت ۱۰۶
حکمت ۱۰۷
کتاب وحکمت کی تعلیم ۱۱۷
علم ۱۱۹
علم وحکم ۱۲۰
شرح صدر ۱۲۳
تبیین کتاب ۱۲۷
ارأت ۱۲۹
رسول کا وجود مستقل ہدایت ہے ۱۳۱
تزکیہ ۱۳۲
نور ۱۳۲
آیات وملکوت کی رویت ۱۳۳
سماع غیب ۱۳۴
تبلیغ ودعوت ۱۳۴
ایک شبہ کا ازالہ ۱۳۶
انبیاء کی تعلیم کا امتیازی نتیجہ ۱۴۱
نبوت کی غرض وغایت ۱۴۱
تائید ونصرت ۱۴۴
خاتمہ ۱۴۶

شب ظلمت

پیغمبر اسلام کی بعثت کے وقت دنیا کی مذہبی اور اخلاقی حالت ۱۴۷
ظہور اسلام کے وقت دنیا کی تمدنی اور مذہبی حالت ۱۴۸
مجوس فارس ۱۴۸
عیسائی روم ۱۵۲
ہندوستان ۱۵۸
یہود ۱۶۰

ظہور اسلام کے وقت عرب کی مذہبی واخلاقی حالت

خدا کا اعتقاد ۱۷۰
ملائکہ کی الوہیت ۱۷۱
جنات کی الوہیت ۱۷۳
بت پرستی ۱۷۳
ستارہ پرستی ۱۷۸
جن وشیاطین اور بھوت پریت ۱۷۹
کہانت ۱۸۱
اوہام پرستی ۱۸۴
جنگ جوئی ۱۸۴
شراب خوری ۱۸۵
قمار بازی ۱۹۷
سود خوری ۱۹۸
لوٹ مار ۱۹۹
چوری ۲۰۰
سفاکی وبے رحمی ووحشت ۲۰۲
زنا اور فواحش ۲۰۲
بے شرمی وبے حیائی ۲۰۴

عورتوں پر ظلم ۲۰۴
وحشت وجہالت ۲۰۷
عربوں کی خصوصیات اور خیر الامم بننے کی اہلیت
صحت نسب ۲۰۸
کسی پہلے مذہب میں داخل نہ تھے ۲۰۹
محکوم نہ تھے ۲۱۰
کتابی فاسد تعلیم سے نا آشنا تھے ۲۱۰
وہ زمین کے وسط میں آباد تھے ۲۱۰
بعض اخلاقی خوبیاں ۲۱۱
شجاع وبہادر تھے ۲۱۱
پرجوش تھے ۲۱۱
حق گو تھے ۲۱۱
عقل ودانش والے تھے ۲۱۲
ذہن اور حافظہ کے تیز تھے ۲۱۲
فیاض تھے ۲۱۲
مساوات پسند تھے ۲۱۳
عملی تھے ۲۱۳
ان اوصاف کی مصلحت ۲۱۳
صبح سعادت
ایک قوم کا انتخاب ۲۱۵
اصلاح وہدایت کی مشکلات ۲۱۶
جہالت ۲۱۶
آبائی دین ورسوم کی پابندی ۲۲۱
توہم پرستی ۲۲۴
قبائل کی خانہ جنگیاں ۲۲۷
سیاسی مشکلات ۲۳۰
ذریعۂ معاش ۲۳۲
رفع شک ۲۳۴
تبلیغ نبوی کے اصول اور اس کی کامیابی کے اسباب
فریضۂ تبلیغ ۲۳۷
تبلیغ کی اہمیت ۲۳۸
اس کی وسعت ۲۳۹
تبلیغ کے اصول ۲۴۱
قول لین ۲۴۲
اعراض اور قول بلیغ ۲۴۲
تیسیر وتبشیر ۲۴۳
تدریج ۲۴۳
تالیف قلب ۲۴۴
دعوت عقل ۲۴۴
مذہب میں زبردستی نہیں ۲۴۶
میدان جنگ میں تبلیغ ۲۴۸
مسلح تبلیغی جماعتیں ۲۵۲
تبلیغ ودعوت کی تنظیم ۲۵۳
مبلغوں کی تعلیم وتربیت ۲۵۴
دعوت بالقرآن ۲۵۴
اشاعت اسلام کی قدرتی ترتیب ۲۵۵
قبول اسلام کے لیے کیا چیز درکار تھی؟ ۲۵۵
اشاعت اسلام کے اسباب وذرائع ۲۵۷
ایک ضروری نکتہ ۲۶۳

موانع کا ازالہ ۲۶۴

اسلام یا محمد رسول اللہ ﷺ کا پیغمبرانہ کام

تعلیمات نبوی کی ہمہ گیری ۲۷۰

اسلام کے چار حصے ۲۷۳

عقائد

عقائد کی حقیقت اور اہمیت ۲۷۴

اللہ تعالیٰ پر ایمان

اصلاح عقائد ۲۸۱

بزرگوں کی مشرکانہ تعظیم سے روکنا ۲۸۳

درمیانی واسطوں کا مشرکانہ اعتقاد ۲۸۶

خوارق خدا کے حکم سے ہوتے ہیں ۲۸۷

حرام وحلال کرنا خدا کا کام ہے ۲۸۹

غیر خدا کی مشرکانہ تعظیم ۲۸۹

صفات الٰہی کی توحید ۲۹۰

مخفی قوتوں کا ابطال ۲۹۲

اوہام وخرافات کا ابطال ۲۹۳

کفارہ اور شفاعت کے غلط معنی کی تردید ۲۹۶

اجرام سماوی کی قدرت کا انکار ۳۰۲

غیر خدا کی قسم سے روکنا ۳۰۳

خدا کی مشیت میں کوئی شریک نہیں ۳۰۴

مشتبہات شرک کی ممانعت ۳۰۵

قبر پرستی اور یادگار پرستی سے روکنا ۳۰۷

ریا اور عدم اخلاص بھی معنوی شرک ہے ۳۰۷

توحید اور اس کے ایجابی اصول و ارکان

اللہ تعالیٰ کی ہستی پر دلیل ۳۱۰

توحید پر عقلی دلیلیں ۳۱۸

توحید کی تکمیل ۳۲۰

خدا کی حقیقی عظمت ۳۲۰

انسان کا مرتبہ ۳۲۳

خدا کا جامع اور مانع تخیل ۳۲۷

اسماء وصفات ۳۲۹

صفات جمالی ۳۳۸

صفات جلالی ۳۴۰

نکتہ ۳۴۱

صفات کمالی ۳۴۲

صفات وحدانیت ۳۴۲

صفات وجودی ۳۴۲

صفات علم ۳۴۲

صفات قدرت ۳۴۳

نکتہ ۳۴۴

صفات تنزیہہ ۳۴۵

ان تعلیمات کا اثر اخلاق انسانی پر ۳۴۵

خدا کا ڈر اور پیار ۳۵۱

محبت کے ساتھ خوف وخشیت کی تعلیم ۳۵۲

محبت کی جسمانی اصطلاحات کی ممانعت ۳۵۵

تعلیمات اسلامی میں محبت الٰہی کے مظاہر ۳۶۰

فرشتوں پر ایمان

ملائکہ کے معنی ۳۷۱

ملائکہ کا تخیل مذاہب قدیمہ میں	۳۷۱
اسلام میں فرشتوں کی حقیقت	۳۷۲
اس عقیدہ کی عقلی حیثیت	۳۷۴
آیات واحادیث میں ملائکہ کا ذکر	۳۷۵
فلسفہ ومذاہب کی ملائکہ کے متعلق بے اعتدالی	۳۸۲
فرشتوں پر ایمان لانے کا مقصد	۳۸۶
رسولوں پر ایمان	
ایک عام غلط فہمی کا ازالہ	۳۸۷
نبوت کسی ملک یا قوم سے مخصوص نہیں	۳۸۸
تمام دنیا میں پیغمبر آئے	۳۸۸
تمام پیغمبروں کی صداقت کا اعتراف	۳۸۹
پیغمبروں میں تفریق کی ممانعت	۳۹۱
پیغمبروں کی غیر محدود تعداد	۳۹۲
پیغمبری کی واضح حقیقت کا اظہار	۳۹۲
پیغمبروں کی عصمت	۳۹۳
قرآن میں پیغمبروں کا جامع تذکرہ	۳۹۴
وہ انبیاء جن کا تذکرہ قرآن میں نہیں	۳۹۵
ایسے انبیاء کی شناخت کا اصول	۳۹۶
کتب الٰہی پر ایمان	
کتاب الٰہی پر ایمان لانے کا مقصد	۳۹۸
اس عقیدہ کا تکمیلی پہلو	۳۹۸
تمام کتب الٰہی پر ایمان لانا ضروری ہے	۳۹۹
چار معلوم الاسم آسمانی صحائف	۴۰۰
اس عقیدہ کا اثر سیاسیات عالم پر	۴۰۱
اقوام عالم کی قانونی تقسیم اور ان کے حقوق	۴۰۲
(۱) مسلمان	۴۰۲
(۲) اہل کتاب	۴۰۲
(۳) شبہہ اہل کتاب	۴۰۲
(۴) کفار اور مشرکین	۴۰۳
وحدۃ الادیان	۴۰۳
دین اور شرعۃ، منسک منہاج کا فرق	۴۰۴
صحیفے وقتاً فوقتاً کیوں نازل ہوئے	۴۰۴
وحدت دین پر قرآن کی شہادت	۴۰۵
وحدت دین کی دعوت عامہ	۴۰۶
دین قیم	۴۰۶
اسلام اور مذاہب قدیمہ کا اتحاد	۴۰۷
دین ہمیشہ ایک رہا	۴۰۷
شرعہ اور منہاج میں تبدیلی ہوئی	۴۰۸
خانہ کعبہ کے حج کی تعیین	۴۰۸
یہودیوں اور عیسائیوں کو اپنی کتابوں پر عمل کرنے کی ہدایت	۴۰۹
مسلمانوں کو شریعت اسلام پر عمل کرنے کا حکم	۴۰۹
اہل کتاب نے اپنی کتابوں کو چھوڑ کر اہل اہوا کی پیروی کی	۴۱۰
یہود ونصاریٰ فروعی اختلافات پر ایک دوسرے کو برسر باطل کہتے تھے	۴۱۰
اسلام کی دعوت اصل دین ابراہیمی کی جانب	۴۱۰
اسلام کا تمام اہل مذاہب کو یکساں خطاب	۴۱۱
اسلام تمام رسولوں کی تصدیق کا نام ہے	۴۱۲
یہود ونصاریٰ انبیاء کی تکذیب کرتے رہے اس لیے اصل اسلام سے ہٹ گئے	۴۱۳
اسلام کا اصل الاصول توحید کامل اور رسالت	

عمومی ہے	۴۱۴
اسلام کا ہدایت تامہ ہونا	۴۱۵
نبوت محمدی ﷺ کا دعویٰ	۴۱۶
دعوت محمدی ﷺ میں ہدایت کی بشارت	۴۱۶
تکمیل دین	۴۱۸
قرآن کے سوا کسی صحیفہ نے دین الٰہی کی تکمیل کا دعویٰ نہیں کیا	۴۱۸
حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بشارت ایک آنے والے نبی کے لیے	۴۱۸
موعود الامم (ﷺ) کی آمد اور اس کا دعویٰ	۴۱۹
وحی الٰہی کی جانب سے تکمیل دین کا اعلان	۴۱۹
تکمیل دین کے اثرات ومظاہر	۴۱۹
قرآن مہیمن کتاب ہے	۴۱۹
قرآن محفوظ ہے اور رہے گا	۴۲۰
قرآن کی بقا اور حفاظت کی ذمہ داری اللہ پر	۴۲۰
ختم نبوت	۴۲۱
وحدت ادیان اور دین اسلام	۴۲۱
صحیفہ محمدی نے اہل کتاب کو وحدت دین کی دعوت دی	۴۲۲
پچھلے دن اور پچھلی زندگی پر ایمان	
یہ اسلام کے سلسلۂ ایمانیات کی آخری کڑی ہے	۴۲۴
آخرت کے لفظی معنی اور مفہوم	۴۲۴
آخرت سے مراد عالم بعد الموت ہے	۴۲۶
قرآن میں ایمان باللہ کے بعد سب سے زیادہ زور ایمان آخرت پر ہے	۴۲۶
آئندہ زندگی کے دو دور یعنی برزخ وبعثت	۴۲۶
توراۃ وانجیل میں برزخ وبعثت کی تفصیل نہیں	۴۲۶
اسلام اور یوم آخرت کی تفصیل	۴۲۶
اسلام میں تین دور ہائے حیات: دنیا برزخ اور قیامت۔ ان تینوں دوروں میں فرق	۴۲۷
۱: برزخ	
قرآن مجید میں لفظ برزخ اور اس کے معنی	۴۲۸
موت وحیات کی منزلیں	۴۲۹
نیند اور موت کی مشابہت	۴۲۹
نیند اور موت کا فرق	۴۳۰
قرآن میں موت کی تشبیہ نیند سے	۴۳۰
برزخ کی زندگی کی تعبیر نیند سے	۴۳۰
قرآن میں دوسری زندگی کے لیے بعث کا لفظ	۴۳۱
خواب میں لذت والم	۴۳۱
خواب کی خیالی دنیا کا جسم پر اثر انداز ہونا	۴۳۲
عالم خواب کی لذت والم کا خاتمہ بیداری میں	۴۳۲
بیداری کی لذت والم کا خاتمہ	۴۳۲
عالم خواب کے لذائذ وآلام کے فلسفیانہ اسباب وعلل	۴۳۲
بھولے ہوئے احساسات ومعلومات کا خواب میں متشکل ہو کر نظر آنا	۴۳۲
اچھے اور برے اعمال کے نقوش	۴۳۲
ذہن انسانی کے گوشوں میں تمثیلی خواب اور اس کی مثالیں	۴۳۲
جسم انسانی میں مختلف مادوں کی کمی بیشی سے خواب میں ان کی متناسب مجسم شکلیں اور اس	۴۳۲

کی مثالیں	۴۳۳
اعمال انسانی کا خواب میں اپنے متناسب قالب میں مجسم ہونا اوران کی مثالیں	۴۳۳
اعمال کی تمثیلات قرآن مجید میں	۴۳۳
اعمال کی تمثیلات احادیث میں	۴۳۵
گناہوں کی تمثیلی سزائیں	۴۳۶
آنحضرت ﷺ کے ایک رویائے صادقہ میں مختلف گناہوں کی مختلف تمثیلی سزاؤں کے مناظر	۴۳۶
ان تمثیلات کی تعبیر وتشریح	۴۳۷
علم النفس سے انسان کی لاعلمی	۴۳۸
قرآن پاک میں یقین کی دو قسمیں	۴۳۸
احوال برزخ کا عین الیقین	۴۴۰
موت کے بعد خدا کی طرف روح کی بازگشت	۴۴۲
موت کے بعد قرآن میں خدا کی طرف باز گشت کی اصطلاح اوراس کا مفہوم	۴۴۲
اس وقت کا سماں	۴۴۳
موت کے سماں کا خاکہ قرآن مجید میں	۴۴۳
جسم سے روح کی علیحدگی کے بعد سزا کا دور	۴۴۳
سزا قانون عمل کے مطابق انسانی اعمال کا نتیجہ ہے	۴۴۴
نیکوکاروں کو بشارتیں	۴۴۵
برزخ کا عذاب وراحت	۴۴۵
برزخ میں عذاب وثواب کے مناظر	۴۴۵
برزخ اوراس کے عذاب وثواب کا تذکرہ	۴۴۶
قبر کی اصطلاح	۴۴۸
احادیث میں برزخ کا اصطلاحی نام قبر ہے	۴۴۸
قبر کا مفہوم	۴۴۹
قبر میں روحیں جسم خاکی کے بجائے جسم مثالی میں متشکل ہوتی ہیں	۴۴۹
جسم خاکی کی طرح جسم مثالی میں بھی لذت والم کا احساس ہوتا ہے	۴۴۹
بعض سعید روحیں جسم خاکی کی شکل کی قید سے آزاد کردی جاتی ہیں	۴۴۹
مٹی کی قبروں میں عذاب کے مشاہدات	۴۵۰
سوال وجواب	۴۵۰
قبر میں فرشتوں کا توحید ورسالت کے متعلق سوال	۴۵۰
قبر کے سوال وجواب کا ذکر قرآن مجید میں	۴۵۰
سوال وجواب کا اصل مفہوم	۴۵۱
برزخ میں ارواح کا مسکن	۴۵۲
آخرت کی دوسری اور حقیقی منزل	
(قیامت اور جزائے اعمال)	
نظام کائنات کی بربادی کی پیشین گوئی اہل سائنس کی طرف سے	۴۵۵
قیامت کا عقیدہ مختلف آسمانی کتابوں میں	۴۵۶
قیامت	
قیامت کے نام قرآن میں	۴۵۶
قیامت کے اوصاف	۴۵۸
قیامت میں فساد نظام ہوگا	۴۵۹
قیامت کی حقیقت	۴۶۱
صور قیامت	۴۶۴

عربوں کا انکار	۴۶۴
قیامت پر قرآنی دلائل	۴۶۷
حشر جسمانی	۴۷۲
جسم وجسد	۴۷۳
خلق جدید	۴۷۴
ذمہ داری روح پر ہے	۴۷۵
دنیاوی جسم بدلتے رہنے پر بھی وہی جسم رہتا ہے	۴۷۶
اخروی جسم کیسا ہوگا؟	۴۷۶
جزا اور سزا	
جزا اور سزا دیگر مذاہب میں	۴۷۸
عالم آخرت کا فہم وادراک	۴۸۱
اس طرز افہام سے فلسفی و عامی دونوں تشفی پاتے ہیں	۴۸۲
اخروی وقائع کے سمجھانے کے لیے مادی الفاظ کا استعمال	۴۸۲
وجود کے موجودہ قوانین فطرت اور ان کے خصوصیات ولوازم	۴۸۲
مادی دنیا کے قوانین فطرت اور سلسلۂ علت و معلول اسی مادی عالم کے ہیں	۴۸۲
ضروری نہیں کہ موجودہ قوانین فطرت وہاں بھی کارفرما ہوں	۴۸۳
اصول جزاء	۴۸۳
اصول فطرت صرف مادیات تک محدود نہیں	
اعمال کے لوازم ونتائج	۴۸۳
عقاب وثواب ردعمل ہے	۴۸۴
حصول راحت کا اصول	۴۸۵
نامہ عمل	۴۸۶
کوئی چیز پیدا ہونے کے بعد فنا نہیں ہوتی	۴۸۷
اعمال کے ریکارڈ ہمیشہ محفوظ رہتے ہیں	۴۸۷
قرآن مجید میں اس اصول کی تشریح اور اس پر شہادتیں	۴۸۷
اعضاء کی شہادت	۴۸۹
میزان	۴۹۰
حساب	۴۹۱
جنت ودوزخ	۴۹۲
جنت انسان کی وراثت ہے	۴۹۲
حضرت آدمؑ کا زمین پر آنا ان کی پیدائش سے پہلے مقدر ہو چکا تھا	۴۹۲
آدمؑ اور بنو آدم کی اصلی جگہ جنت ہے	۴۹۲
جنت کے دو درخت نیک و بد کی پہچان کا اور زندگی جاوید کا	۴۹۲
آدمؑ کو نیک و بد کی شناخت کے درخت سے روکا گیا	۴۹۲
شیطان نے حیات جاوداں کا درخت کہہ کر نیک وبد کی شناخت کے درخت کو بتا دیا	۴۹۲
حیات جاوداں سے مقصود کیا ہے؟	۴۹۲
نیک وبد کی تمیز ہی شرعی تکلیف کا باعث ہے	۴۹۳
آدمؑ کو نیک وبد کی تمیز کا فطری الہام	۴۹۳
انسان کا تکلیف شرعی کی امانت کو قبول کرنا اور حیات جاوداں کا حصول سعی وعمل پر موقوف ہونا	۴۹۳

زمین پر بنوآدم کی چار چیزوں کھانے پینے پہننے اوراوڑھنے کی ضروریات کا پیدا ہونا	۴۹۳	دوزخ میں رحمت الٰہی کا ظہور اور نجات	۵۱۵
مذہب نے ان ضروریات اربعہ کے جائز طریقوں کی تعلیم اور نا جائز طریقوں سے		شرک وکفر کی بخشائش نہیں	۵۱۸
احتراز کی تلقین کی	۴۹۳	کیا دوزخ کی انتہا ہے؟	۵۱۹
جنت کی وراثت کا وعدۂ الٰہی	۴۹۴	دوزخ رحمت الٰہی کی چھینٹوں سے بالآخر سرد ہو جائے گی	۵۱۹
انسانی جزاء وسزا کے تین گھر	۴۹۶	اللہ کے غضب پر رحمت کی سبقت	۵۱۹
انسان کا پہلا دارالجزاء	۴۹۶	دوزخ کی انتہا قرآن مجید میں مشیت پر ہے	۵۱۹
یہ دارالجزاء فانی ہے	۵۰۰	کفار ومشرکین کے عذاب کی انتہا مشیت الٰہی پر موقوف ہے	۵۱۹
یہ دارالجزاء دارالاصلاح بھی ہے	۵۰۱	قرآن مجید کی کوئی آیت دوزخ کے تسلسل وجود پر دلالت نہیں کرتی	۵۱۹
انسان کی تنبیہہ واصلاح کے مراتب نیکی سے برائی کا کفارہ	۵۰۱	قرآن مجید میں بہشت کے عدم انقطاع کی تصریح کی گئی	۵۲۰
توبہ کفارہ ہے	۵۰۲	قرآن مجید سے اس کی تشریح	۵۲۰
مصائب کی تنبیہہ اور کفارہ	۵۰۴	اس کی شہادت حدیثوں میں	۵۲۰
عذاب الٰہی کا مقصد	۵۰۴	دفع شبہ	۵۲۳
عذاب برزخ بھی کفارہ ہے	۵۰۷	قرآن مجید کی بعض آیتوں سے دوزخ کے دوام کا شبہ	۵۲۳
عذاب دوزخ کفارہ گناہ ہے	۵۰۹	اس شبہ کا ازالہ	۵۲۳
عذاب انسان کے اعمال کا نتیجہ ہے	۵۰۹	چند آیتوں میں کفار کے دوزخ سے الگ نہ ہونے کی تشریح	۵۲۳
انسان کی تخلیق رحمت کے لیے ہے	۵۰۹	ان آیات کا مفہوم	۵۲۳
دوزخ	۵۰۹	اللہ تعالیٰ کے وعدہ ثواب وعذاب میں فرق	۵۲۳
دوزخ قید خانہ نہیں شفاخانہ ہے	۵۱۳	مشرکین وکفار کی معافی کی تصریح کیوں نہیں	۵۲۴
گناہ روحانی بیماری کا اور عذاب اس کے نتیجہ بد کا اصطلاحی نام ہے	۵۱۳	عقیدۂ کفارہ اور عقیدۂ کرم اور عقیدۂ مغفرت	۵۲۴
دوزخ کی مثال شفاخانہ ہے	۵۱۳		
دوزخ سے بالآخر نجات ہوگی	۵۱۳		
گویا دوزخ بھی ایک نعمت ہے	۵۱۴		

عذاب طویل کا سبب	۵۲۸
مشرک وکافر کا آخر انجام	۵۲۸
جمہور کا مسلک	۵۳۱
بہشت ودوزخ کی جزاوسزا بھی تمثیلی ہے	۵۳۳
تمثیلی سزا کے معنی	۵۳۳
اس کی مثالیں قرآن مجید اور احادیث سے	۵۳۴
دوزخ کی جسمانی سزائیں	۵۳۵
جسمانی سزاؤں کی تصریح قرآن مجید سے	۵۳۶
دوزخ میں روحانی سزائیں	۵۳۸
ان کی تصریح قرآن مجید سے	۵۳۸
جنت	
جنت کے نام	۵۴۰
جنت کا دوام	۵۴۰
اس کی تصریح قرآن مجید میں	۵۴۰
دائمی قیام سے اہل جنت کا جنت میں گھبرانا ان کی جبلت وفطرت کے خلاف ہوگا	۵۴۰
غیر فانی بادشاہی	۵۴۴
جنت کے عیش ومسرت کی تعبیر	۵۴۴
آسمانی بادشاہی سے	۵۴۴
عیسوی پیغام میں آسمانی بادشاہی	۵۴۴
''آسمانی بادشاہی'' کے اجمال کی اسلامی تفصیل	۵۴۴
باغ کا استعارہ	۵۴۶
استعارہ میں ایک نکتہ	۵۴۶
سامان جنت کے دنیاوی نام	۵۴۶
جنت میں دنیاوی الفاظ کے معانی سے بلند تر حقائق	۵۴۶
اس کی شہادت قرآن مجید واحادیث سے	۵۴۷
جنت کی مسرتیں اعمال کی تمثیل ہیں	۵۴۸
اس کی شہادت قرآن مجید اور احادیث سے	۵۴۸
لطف ومسرت کا تصور	۵۵۳
لطف ومسرت کا اعلیٰ ترین تخیل	۵۵۳
جنت میں انسان کی ہر خواہش پوری ہوگی	۵۵۳
جنت جہاں کوئی جسمانی وروحانی آزار نہیں	۵۵۵
جنت جہاں رشک وحسد نہیں	۵۵۶
وہاں کی جسمانی زندگی کیسی ہوگی؟	۵۵۶
جنت ارتقائے روحانی ہے	۵۵۷
امن وسلامتی کا گھر	۵۵۹
مقام رحمت	۵۶۰
مقام نور	۵۶۰
مقام رضوان	۵۶۱
مقام طیب وطاہر	۵۶۳
مقام تسبیح وتہلیل	۵۶۴
مقام قرب	۵۶۵
دیدار الٰہی	۵۶۵
ان تعلیمات کا عملی اثر	۵۶۵
عرب کا ایمان ویقین اور صحابہؓ کی خشیت الٰہی	۵۶۶
قضاوقدر	
کیا عقیدۂ قضاوقدر ایمانیات میں ہے	۵۶۷
عقیدہ قضاوقدر کا ماحصل	۵۶۷
اس عقیدہ کی تعلیم نے اس کی کیا تکمیل کی اور کیا اثرات پیدا ہوئے	۵۶۸

اصطلاح قضاوقدر کی تشریح	۵۶۹
اس عقیدہ کی اخلاقی اہمیت	۵۶۹
عقیدۂ قضاوقدر کی توضیح	۵۶۹
عقیدۂ قضا وقدر کا نتیجہ پستی ستی و دون ہمتی نہیں اس کا نتیجہ بلندی استقلال اور صبر وثبات ہے	۵۷۱
غلط فہمی کا ازالہ	۵۷۱
قضاوقدر اور سعی عمل کی باہمی تطبیق	۵۷۱
پہلے فسق اور نافرمانی ہوتی ہے	۵۷۱
اس کے نتیجہ میں خدا کی طرف سے ضلالت کا ظہور ہوتا ہے	۵۷۲
جبر وقدر کا لاینحل مسئلہ	۵۷۲
قدیم مذاہب میں اس کے حل کی دو صورتیں یا تو خاموشی یا جبر کی تلقین	۵۷۴
آنحضرت ﷺ نے اس راز کو ظاہر کیا	۵۷۴
بیک وقت دو صداقتیں صحیفۂ محمدی میں ان دونوں صداقتوں کی تفصیل	۵۷۴
اور ان کی تشریح	۵۷۵
ہدایت وضلالت کے الفاظ سے پیدا شدہ غلط فہمی کا ازالہ	۵۷۵
خیر وشر کا مفہوم اسلام میں	۵۷۶
اگر خدا چاہتا تو ان کو ہدایت دیتا کی تفسیر	۵۷۶
بندہ کی مشیت	۵۷۶
اللہ کی گمراہی کن کے لیے ہے	۵۷۷
نتیجہ بحث	۵۷۷
ایمان کے نتائج	
ایمان کا مقصد دل کی اصلاح ہے	۵۸۳
اسلام میں ایمان وعمل کی جامعیت	۵۸۳
درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے	۵۸۳
اہل ایمان کی عملی شناخت	۵۸۳
تمام نیکیاں صرف ایک جڑ ایمان کی شاخیں ہیں	۵۸۴
ایمان کے بعد عمل کی ضرورت	۵۸۴
ایمان ملزوم اور اعمال اس کے لوازم ہیں	۵۸۵

❀❀❀

دیباچہ طبع اول

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِالْمُرْسَلِیْنَ وَ عَلٰی اٰلِہ وَ صَحْبِہ اَجْمَعِیْنَ.

اے باز کن درِ معانی
برما بکلیدِ آسمانی
ہرچہ از تو گمان برم بچونی
آن من برم و توز آن برونی
شاہِ رسل و شفیعِ مرسل
خورشید پسیں و نورِ اول
سلطانِ ممالکِ رسالت
طغرائے صحیفۂ جلالت
(خسرو)

پیش نظر کتاب ''سیرت النبی'' کے سلسلہ کی چوتھی جلد ہے' اس کا موضوع منصب نبوت ہے' اس تقریب سے سب سے پہلے اس میں ایک مقدمہ ہے جس میں نبوت کی حقیقت اور اس کے لوازم وخصوصیات کی تشریح ہے' اس کے بعد دیباچہ ہے جس میں آنحضرت ﷺ کی ولادت اور ظہورِ اسلام کے وقت دنیا کی مذہبی واخلاقی حالت کا مرقع دکھایا گیا ہے۔ بالخصوص آنحضرت ﷺ سے پہلے ملک عرب کی جو مذہبی واخلاقی حالت تھی اور اس کی اصلاح میں جو دقتیں درپیش تھیں شرح وبسط کے ساتھ ان کی تفصیل کی گئی ہے۔ اس کے بعد آپؐ کے تعلیمات و ارشادات کی تفصیل سے اصل کتاب کا آغاز ہوا ہے۔

آنحضرت ﷺ کو پیش گاہِ باری سے جو شریعتِ کاملہ اور قانونِ ابدی عطا ہوا' وہ درحقیقت چار عنوانوں پر منقسم ہے۔ عقائد' عبادات' اخلاق اور معاملات۔ خیال تھا کہ عقائد وعبادات کی ایک جلد ہو اور اخلاق ومعاملات دوسری جلد میں ہوں' مگر جوں جوں مسافرِ قلم اس دشوار گزار مرحلہ میں آگے بڑھتا گیا' راستہ اس قدر وسیع اور مسافت اتنی ہی بعید نظر آنے لگی' ناچار اس جلد کو صرف عقائد کے بیان پر محدود رکھا گیا' دوسری جلد میں عبادات اور

ان کی حقیقت اور فرائض چہارگانہ کے حقائق وفوائد سے بحث ہوگی اور تیسری جلد کا عنوان اخلاق ومعاملات ہوگا۔ جس میں ہم ان شاء اللہ بہ تفصیل بتائیں گے کہ تمدن ومعاشرت بالخصوص قوانین نکاح' طلاق' وراثت' حقوق نساء 'غلامی' جہاد' اصول حکومت اور اقتصادیات وغیرہ کے متعلق تمام دنیا کے مذاہب کے کیا اصول اور تمام سلطنتوں اور قوموں کے کیا قوانین تھے اور آج مغرب نے اس انتہائی تہذیب تک پہنچ کر کس حد تک ان امور میں ترقی کی ہے۔ پھر موازنہ کر کے ہم دکھائیں گے کہ شریعتِ اسلام کے مقابلہ میں مغرب کی معراجِ ترقی شریعت اسلام کا پایۂ اولین ہے۔

حضرت الاستاذ مرحوم نے اس جلد کا کام شروع ہی کیا تھا اور مذکورۂ بالا مباحث میں سے صرف عرب جاہلیت کے مذہبی واخلاقی حالات کے پچیس تیس صفحے لکھنے پائے تھے کہ وفات پائی۔ یہ صفحے بھی اوراق میں شامل ہیں' مگر چونکہ ان میں بکثرت اضافہ وترمیم کی ضرورت پیش آئی ہے اس لیے ان صفحات کو ان کے اسم گرامی کی طرف منسوب کرنے میں احتیاط کرتا ہوں۔ بقیہ پوری کتاب کی ذمہ داری خاکسار ہی کے خطا کار قلم پر ہے۔ وَ مَا اُبَرِّئُ نَفْسِیْ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوْٓءِ۔

کوشش ہے کہ ان اوراق میں پیغمبر اسلام علیہ السلام کے پیغام وتعلیم کو پوری تشریح' استناد' استدلال اور دلچسپی کے ساتھ ناظرین کی خدمت میں پیش کیا جائے' قرآن پاک کے استناد کو ہر موقع پر سب سے آگے رکھا گیا ہے اور اسی کے پرتو میں احادیثِ صحیحہ سے فائدہ اٹھایا گیا ہے' مناظرانہ پہلو سے بچ کر ہر پیش نظر مسئلہ میں اسلام کا دوسرے مذاہب سے اس غرض سے موازنہ کیا گیا ہے تاکہ اسلام کی تکمیل شان نمایاں ہو جائے ان اوراق کے لکھنے والے کے نزدیک نسخ شریعت کے معنی کسی حکم کو اس کے غلط یا غیر مفید ہونے کے سبب سرے سے مٹا کر کسی دوسرے حکم کو نافذ کرنے کے نہیں ہیں بلکہ محرف احکام کی جگہ پر اصل احکام کے دوبارہ نازل ہونے اور دنیا کے حسب حال ناقص کی جگہ کامل اور کامل کے بدلہ کامل تر تعلیمات دینے کے نہیں بلکہ ان کی تکمیل کرنے والے کے ہیں' مذاہب کی تاریخ جب سے شروع ہوئی ہے ہر مذہب اور اس کی کتاب انسانی عروج وترقی کی ایک ایک منزل ہے اور اسلام اس عروج وترقی کی وہ انتہائی منزل مقصود ہے جس کے بعد تکمیل دین کی سرحد ختم ہو جاتی ہے اور جیسا کہ خود اس کا دعویٰ ہے اور اس دعویٰ میں کوئی اور دین اس کا شریک نہیں ہے کہ ﴿اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ﴾

ان تکمیلی مباحث میں سے یہ جلد صرف عقائد پر مشتمل ہے اور کون نہیں جانتا کہ مذاہب میں اعتقادات کی حیثیت کتنی اہم اور ان کی بحث کتنی نازک ہے' اس لیے اس خارزار سے کسی آبلہ پا کا بسلامت گزر جانا کس قدر مشکل ہے' تاہم میں نے جدوجہد اسی کی' کی ہے کہ کسی آبلہ کو ٹھیس لگے بغیر اس راستہ کو طے کر لوں' چلنے والا تو تھک کر چور ہے اب یہ دیکھنے والوں کو فیصلہ کرنا ہے کہ اس نے رہروی کی یہ شرط کہاں تک پوری کی۔

اربابِ بصیرت جانتے ہیں کہ اسلامی فرقوں میں سے کسی فرقہ کے مطابق بھی اگر عقائد کی کتاب لکھی جاتی تو

یہ منزل نہایت آسان تھی کہ ان میں سے ہر ایک کی مدوّن اور مرتب کتابیں سامنے ہیں لیکن مجھے اس جلد میں کسی خاص فرقہ کے نہیں' اسلام کے وہ عقائد لکھنے تھے جن پر ایمان لانے کا قرآن نے ہم سے مطالبہ کیا ہے اور جن کی تعلیم محمد رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہؓ کو دی تھی' چنانچہ ان اوراق میں انہی چند عقائد کی تشریح ہے اور یہ وہی ہیں جو ﴿اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ وَ كُتُبِهٖ وَ رُسُلِهٖ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ الْقَدْرِ خَيْرِهٖ وَ شَرِّهٖ مِنَ اللّٰهِ تَعَالٰى﴾ میں مذکور ہیں یعنی خدا' اس کے فرشتوں' اس کی کتابوں' اس کے رسولوں پر اور آخری دن اور قضا و قدر پر ایمان' چنانچہ اس جلد میں مقدمہ و دیباچہ کے بعد ان ہی چھ باتوں کی تفصیل و تشریح ہے۔

میں نے اپنے جانتے اس کی پوری احتیاط کی ہے کہ کسی مسئلہ کی تشریح میں قلم صراط مستقیم سے تجاوز نہ کرے۔ لیکن عالم الغیب جانتا ہے کہ قدم نے کہاں ٹھوکر کھائی ہے' اس لیے اس کی بارگاہ میں نہایت عجز سے دعا ہے کہ خداوند میری لغزش کو دوسروں کی لغزش کا سبب نہ بنا' اور ہم کو سیدھی راہ دکھانا۔

﴿مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِيْ﴾ (الاعراف:۱۷۸)

''جس کو خدا راہ دکھائے وہ راہ پایا ہوا ہے۔''

﴿وَ مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّضِلٍّ﴾ (الزمر:۳۷)

''اور جس کو خدا راہ دکھائے اس کو کوئی گمراہ کرنے والا نہیں۔''

﴿رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا﴾ (البقرہ:۲۸۶)

''ہمارے پروردگار ہماری بھول چوک کی باز پرس ہم سے نہ فرمانا۔''

ایں نامہ کہ خامہ کرد بنیاد — توقیع قبول روزیش باد

طالبِ رحمت ـــــ سلیمان ندوی

(۲۵ ربیع الاول ۱۳۵۱ھ) (دار المصنفین اعظم گڑھ)

❀ ❀ ❀

دیباچہ طبعِ ثانی
سیرت النبی جلد چہارم

سیرت جلد چہارم کو جو اسلام کے اصول وعقائد پر ہے جس وقت پہلی دفعہ ناظرین کرام کے ہاتھوں میں دے رہا تھا۔ میرا دل اضطراب کے عالم میں تھا کہ ایسے مشکل اور پیچیدہ راستہ مین معلوم نہیں، میرا قلم کہاں کہاں بہکا اور قدم نے کہاں کہاں ٹھوکر کھائی، لیکن الحمدللہ والمنتہ کہ سوائے دوزخ کی ابدیت وغیر ابدیت کے ایک مسئلہ جس میں جمہور کی رائے ہمارے ساتھ نہ تھی، ہر مسئلہ میں اس کتاب کی تحریر کو قبولیتِ عام حاصل ہوئی، جن جن حوصلہ افزا طریقوں سے خواص علماء اور عام مسلمانوں نے اپنی تحسین وآفرین کی عزت بخشی اس سے جی چاہتا تھا کہ یہ قیاس کروں کہ ملاءِ اعلیٰ کی خوشنودی ورضامندی بھی اس حقیر مؤلف کے شامل حال ہے۔

اس کتاب کی طبع ثانی چھوٹی تقطیع پر چھاپی جارہی ہے اس میں طبع اول کے مطبعی اغلاط کی تصحیح کر دی گئی ہے۔ کہیں کہیں عبارت کی خوبی وشستگی کے لیے لفظی تبدیلیاں بھی کی گئی ہیں اور مسئلۂ ابدیتِ نار میں جمہور کے خیال کی ترجمانی کا اضافہ بھی کر دیا گیا ہے تا کہ ناظرین کو اس کے دونوں پہلوؤں سے واقفیت ہو جائے۔ وَ اَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَ مِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو اس سے فائدہ پہنچائے تا کہ ناچیز مؤلف کو اپنی مغفرت کا وسیلہ ہاتھ آئے۔

کتاب کی طبع اول چونکہ بڑی تقطیع پر چھپی تھی اس لیے ۶۸۶ صفحوں کی ایک جلد رہنے دی گئی لیکن چھوٹی تقطیع پر اس کی ضخامت ۸۸۸ صفحوں تک پہنچ گئی ہے جس کا ایک جلد میں سمانا مشکل تھا، اس لیے گو صفحوں کا شمار مسلسل رکھا گیا ہے مگر صفحہ ۴۰۵ سے کتاب دو حصوں میں علیحدہ بھی کر دی گئی ہے تا کہ اگر کسی کا جی چاہے تو اس کو دو جلدوں میں کر لے تا کہ پڑھنے میں اور سفر میں ساتھ رکھنے میں آسانی ہو۔

جامع

سید سلیمان ندوی

۲۷ رجب ۱۳۵۳ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

منصبِ نبوت

کتاب کا موضوع، آپؐ کے پیغمبرانہ کارنامے

سیرت کی عام کتابوں میں آنحضرت ﷺ کے واقعاتِ زندگی کے اندر جو چیز سب سے زیادہ ممتاز ہو کر نظر آتی ہے وہ غزوات اور لڑائیاں ہیں لیکن یہ غزوات اور لڑائیاں ظاہر ہے کہ مقصود بالذات نہ تھیں۔ بلکہ وہ سلسلۂ دعوت میں اتفاقاً پیش آ گئیں، آنحضرت ﷺ نے عرب کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کی، انہوں نے اس کے قبول کرنے سے انکار کیا اور نہ صرف انکار کیا بلکہ اس کے مٹانے کی پرزور کوشش کی، اس کے قبول کرنے والوں کو ستایا اور ان کو ان کے گھروں سے نکال دیا، وہ اپنی جان بچا کر دوسرے شہر کو چلے گئے، وہاں ان کی دعوت نے فروغ پایا، اور بہت بڑی تعداد نے ان کی سچائی کو قبول کیا، یہ دیکھ کر مخالفوں نے ہر طرف سے یورش کی، اور چاہا کہ اس جماعت کو بزورِ شمشیر مٹا دیں، اس نے اپنی جان کے بچاؤ کی تدبیریں کیں اور ان کی پرزور سازشوں اور کوششوں کے سیلاب کو پہاڑ بن کر روکا، اس کشمکش نے خون ریز لڑائیوں کا ایک سلسلہ چھیڑ دیا جو مسلسل دس سال تک قائم رہا۔ رفتہ رفتہ اعجازِ نبوت، حسنِ تدبیر، لطفِ اخلاق سے تمام معرکے سر ہوئے اور پھر ایک پرامن نظام قائم ہو گیا بے شبہ یہ کارنامہ بھی کچھ کم مستوجبِ منقبت نہیں لیکن ناظرین اس نکتہ کو پیش نظر رکھتے ہوں گے کہ ہم کس (ذات اقدس) کے سوانح لکھ رہے ہیں۔

یہ جو کچھ ہوا اور پیش آیا، وہ گو نہایت عجیب، حیرت انگیز اور کرشمۂ ربانی کا پورا مظہر ہے۔ تاہم وہ درحقیقت آنحضرت ﷺ کا اصلی براہِ راست اور مقصود بالذات کارنامہ نہیں، وہ اتفاقی حوادث ہیں، جو اسلام کی دعوت و اشاعت کی راہ میں دشمنوں کی مخالفت سے پیش آ گئے۔ آپ کے اصلی پیغمبرانہ کارنامے وہ ہیں جو اگر یہ اتفاقی واقعات رونما نہ ہوئے ہوتے تب بھی ظاہر ہی ہوتے اور وہی آپؐ کی سیرتِ مبارکہ کے اصلی وقائع اور سوانح ہیں۔ یعنی عرب میں سرتاپا روحانی و اخلاقی انقلاب پیدا کر دینا تمام عالم کے سامنے کامل ترین اور اخیر (سب سے بہتر) شریعت کو پیش کرنا، دنیا کے گوشہ گوشہ کو ترانۂ توحید اور سرور و محبت سے معمور کرنا، ظلمت کدۂ عالم کو سراج منیر بن کر بقعۂ نور بنا دینا، گمراہوں کو راستہ بتانا، بھولوں کو یاد دلانا، بندوں کا رشتہ خدا سے جوڑنا، غلط اوہام کو مٹانا، اخلاق فاضلہ کا سکھانا، گناہوں کے دفتر کو دھونا، انسانوں کو شیطانوں کے دامِ فریب سے نکال کر فرشتوں کی صف میں کھڑا

کرنا۔ دنیا کو رفق ومحبت' لطف وشفقت اور برادرانہ مساوات کی تعلیم دینا' حکمت ودانائی' پند وموعظت اور تہذیب و تمدن کے رموز سکھانا' روحانیت کی برباد شدہ دنیا کی دوبارہ تعمیر اور قلوب وارواح کے ویران گھروں کی از سر نو آبادی' الغرض خاتم النبیین کا اصلی کام ایک شریعتِ ابدی کی تاسیس' مذاہبِ عالم کی اصلاح' فنِ اخلاق کی علمی وعملی تکمیل' قانونِ الٰہی کا اظہار وعرض اور تہذیبِ نفوس کی معراجِ اخیر تھی' اور یہ سب اسی پر آشوب زمانہ میں ہوتا رہا جس کے لیل ونہار صرف حملوں کے تیرِ باراں کے روکنے میں صرف ہو گئے' پیش نظر جلد آنحضرت ﷺ کی سیرت مبارکہ کے ان ہی واقعات اور کارناموں پر مشتمل ہے۔

نبی اور مصلح اور حکیم

بظاہر نظر آتا ہے کہ اس قسم کے کچھ کام ایسے لوگوں سے بھی انجام پاتے ہیں جو نبوت اور رسالت کے منصب پر فائز نہیں ہوتے' وہ اپنی قوم وملک کے سامنے اپنی اصلاح کی دعوت پیش کرتے ہیں اور سعی ومحنت اور متواتر جدوجہد سے ان میں کوئی سیاسی' اجتماعی' تعلیمی' اقتصادی اور معاشرتی انقلاب پیدا کرتے ہیں اور ان کو قعرِ مذلت سے نکال کر ترقی کی سطح مرتفع تک پہنچا دیتے ہیں ایسے لوگوں کو مصلح اور ریفارمر کہتے ہیں اور ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے منہ سے اخلاق وحکمت اور پند وموعظت کے موتی جھڑتے ہیں' جن کو حکیم کہتے ہیں' اس حالت میں ایک پیغمبر اور ایک مصلح اور ایک حکیم میں کیا فرق ہوگا؟ اس التباس کا نتیجہ یہ ہے کہ بہت سے کوتاہ نظر ایک پیغمبر اور ایک مصلح اور ایک حکیم میں کوئی امتیاز نہیں کرتے اس بنا پر اس سے پہلے کہ ہم آگے بڑھیں' اس فرق وامتیاز کو نمایاں کر دینا ضروری سمجھتے ہیں۔

نبوت کی حقیقت اور خصوصیت

اس فرق کو پوری طرح واضح کرنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے نبوت کی حقیقت اچھی طرح ذہن نشین کر لی جائے۔ نبوت کی فلسفیانہ حقیقت کی بہترین تشریح امام غزالی نے معارج القدس [1] اور شاہ ولی اللہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ میں کی ہے' یہ دونوں بزرگ تصوف' فلسفہ' نقلیات تینوں کوچوں سے باخبر ہیں اس لیے یہ جو کچھ بتائیں گے اس میں کچھ کچھ ذاتی ذوق ومشاہدہ کا حصہ بھی شامل ہوگا۔

امام صاحب فرماتے ہیں:

''نبوت انسانیت کے رتبہ سے بالاتر ہے جس طرح انسانیت حیوانیت سے بالاتر ہے' عطیۂ الٰہی اور موہبتِ ربانی ہے' سعی ومحنت اور کسب وتلاش سے نہیں ملتی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسٰلَتَهٗ﴾ (الانعام:۱۲۴)

''اللہ بہتر جانتا ہے کہ جہاں وہ اپنی پیامبری کا منصب بنائے۔''

---

(۱) معارج القدس کا یہ حصہ حضرت الاستاذ مرحوم نے الکلام کے آخر میں بطور ضمیمہ شائع کر دیا ہے۔

﴿وَ كَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا مَا كُنْتَ تَدْرِىْ مَا الْكِتٰبُ وَ لَا الْاِيْمَانُ وَ لٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِىْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا﴾[1] (الشوریٰ:۵۲)

''اور اسی طرح ہم نے تیرے پاس اپنے حکم سے ایک روح بھیجی تو پہلے نہیں جانتا تھا کہ کتاب کیا ہے اور ایمان کیا؟ لیکن اس کو ہم نے ایک نور بنایا ہے جس سے ہم اپنے بندوں میں سے جس کو چاہیں راہ سجھائیں۔''

اس موقع کے لیے صریح آیت یہ ہے۔

﴿ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ﴾ (الجمعۃ:۴)

''یہ (نبوت) خدا کا فضل ہے جس کو وہ چاہے دے۔''

گو یہ صحیح ہے کہ وہ عبادات و ریاضات جو فکر و مراقبہ پر مشتمل اور ریا اور شہرت طلبی سے پاک ہوں، نفس میں آثارِ وحی کے قبول کرنے کی استعداد پیدا کر دیتے ہیں، تاہم نبوت کا منصب خاص اتفاقی نہیں جو محنت اور کوشش سے کسی کو حاصل ہو جائے بلکہ جس طرح نوعِ انسان کا انسان اور فرشتوں کا فرشتہ بن جانا ان کے افراد کی سعی و محنت کا مرہونِ منت نہیں اسی طرح نوعِ انبیاء کا نبی بن جانا، ان کے افراد کی کوشش اور محنت سے ممکن نہیں، ہر انسان کا بچہ اپنی ذاتی محنت سے نہیں بلکہ فیاضِ عالم کی بخشش سے انسانیت کا رتبہ حاصل کرتا ہے۔ مگر انسانیت کے ممکن کمالات کو بالفعل حاصل ہو جانے کے لیے اس کو یقیناً کچھ جد و جہد کرنی پڑتی ہے، اسی طرح نبوت نوعِ انبیاء کے لیے اکتسابی چیز نہیں، لیکن منشائے نبوت کے مطابق ریاضت اور عمل، قبولِ وحی کی استعداد اور تیاری کے لیے البتہ ضروری ہیں۔

چنانچہ اسی اصول کے مطابق اکثر پیغمبروں کے آغاز وحی کے حالات میں آپ کو یہ ملے گا کہ انہوں نے ایک زمانہ تک عبادت و مراقبہ میں بسر کی، ایک ایک مہینہ، ایک ایک چلہ اس طرح گزارا کہ وہ مادی دنیا کی آلائشوں سے یکسر الگ ہو گئے توراۃ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نسبت ہے کہ کتاب ملنے سے پہلے وہ چالیس روز تک کوہ طور پر روزہ کی حالت میں رہے، اسی طرح انجیل میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق ہے کہ وہ ایک سنسان جنگل میں چالیس روز تک روزہ رکھ کر عبادتوں میں مصروف رہے اور وحی سے پہلے آنحضرت ﷺ کا غارِ حرا میں مہینوں عزلت گزین رہنا اور فکر و مراقبہ اور عبادت و ریاضت میں مصروف رہنا سب کو معلوم ہے۔

چنانچہ آنحضرت ﷺ نبوت سے پہلے حرا میں جا کر عبادات میں مشغول ہوئے تو رؤیائے صادقہ دیکھنے لگے جس کی سچائی مثل سپیدۂ صبح کے صاف نمایاں ہوئی تھی، وحی کے بعد بھی آپؐ اس قدر عبادت میں مصروف رہتے تھے کہ آپؐ کے دونوں پاؤں سوج جاتے تھے۔ اسی لیے قرآن نے آپؐ کو خطاب کر کے کہا۔

﴿طٰهٰ مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰى﴾ (طه : ۱)

---

(۱) امام صاحب نے آیت پوری نہیں لکھی ہے میں نے اپنی طرف سے آیت پوری لکھ دی ہے۔

''(اے پیغمبر)! ہم نے یہ قرآن تجھ پر اس لیے نہیں اتارا کہ تو تکلیف اٹھائے۔''

اس عبادت و ریاضت کے ساتھ نبوت کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اس کے حامل میں حسنِ صورت' اعتدالِ مزاج' نشوونما کی پاکی' حسنِ تربیت' طہارتِ نسب' کرمِ اخلاق' نیک طینتی' متانت' سنجیدگی' دوستانِ الٰہی کے ساتھ نرم خوئی اور تواضع اور دشمنانِ حق کے ساتھ شدت وقوت پائی جائے' علاوہ بریں وہ راست گفتار' امانت دار' تمام برائیوں سے پاک' فضائل ومحاسن سے آراستہ اور ذلیل باتوں سے مبرا ہوتا ہے۔ وہ ظلم کرنے والوں کو معاف اور اپنے ساتھ برائی کرنے والوں کے ساتھ حسن سلوک کرتا ہے۔ قرابت مندوں اور ہمسایوں کے ساتھ احسان' مظلوموں کی اعانت' فریادخواہوں کی فریادرسی' اس کی طینت اور نیکی سے محبت اور بدی سے نفرت اس کی فطرت ہوتی ہے' اس کی شان جیسا کہ قرآن نے بتایا ہے یہ ہوتی ہے کہ:

﴿مَاضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَ مَا غَوٰى﴾ (نجم:۲)

''تمہارا ساتھی (پیغمبر) نہ گمراہ ہوا اور نہ بھٹکا۔''

اس کی یہ صفت اس دنیاوی عالم میں ہے کہ وہ ہر گمراہی و بے راہ روی سے پاک ہوتا ہے۔

﴿مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَ مَا طَغٰى﴾ (نجم:۱۷)

''اس کی نگاہ نہ کج ہوئی اور نہ سرکش ہوئی۔''

یہ اس دنیا کے مناظر اور مشاہدات کے متعلق اس کی کیفیت ہوتی ہے۔

تمام دنیا کی قوتیں اس کی قوت کے سامنے بالآخر طوعًا وکرہًا سرنگوں ہو جاتی ہیں' بایں ہمہ وہ مغرور' جابر' جفا پیشہ' بدخو اور درشت مزاج نہیں ہوتا۔ وہ پیغمبری اور رسالت کے بارِ عظیم کو اٹھاتا ہے اور اس کا پورا حق ادا کرتا ہے اور تمام عالم میں اپنی رحمت کا فیض جاری کرتا ہے۔

نبوت ورسالت کے ثبوت کا اجمالی طریقہ

نبوت کے ثبوت کے دو طریقے ہیں' ایک اجمالی اور دوسرا تفصیلی' اجمالی طریقہ یہ ہے کہ جس طرح انسان کو حیوان پر نفسِ ناطقہ کی بنا پر فضیلت حاصل ہے کہ یہ عقلی و دماغی خصوصیت حیوان میں نہیں پائی جاتی' جس کے بل پر انسان' حیوان پر حکمرانی کرتا ہے اور اس کا مالک بنا ہوا ہے اور اس کو اپنے کام میں لگائے ہوئے ہے' اسی طرح انبیاء علیہم السلام کو اپنے نفوسِ قدسیہ کی بنا پر تمام انسانوں پر برتری حاصل ہے' وہ اپنے ان قدسی نفوس و پیغمبرانہ قوت سے دوسروں کو راہ راست سجھاتے اور خود راہ راست پر قائم رہتے ہیں' ان کی پیغمبرانہ عقل وفہم تمام انسانی عقلوں سے بالاتر ہوتی ہے اور ان کو وہ ربانی خصوصیت حاصل ہوتی ہے۔ جس کی بنا پر وہ تمام انسانی نفوس کی تدبیر کا فرض انجام دیتے اور ان پر قابو پاتے اور ان کو کام میں لگاتے ہیں اور جس طرح انسانوں کے عجیب وغریب کام حیوانوں کو حیرت انگیز معلوم ہوتے ہیں' اسی طرح پیغمبروں کے عجیب وغریب کام انسانوں کو معجزہ نظر آتے ہیں۔

اور اگر چہ نبی عام انسانوں کے ساتھ بشریت اور انسانیت میں برابر کا شریک ہوتا ہے مگر عقلیت و معنویت میں وہ ان سے بالکل الگ ہوتا ہے کیونکہ اس میں وحی کے قبول کرنے کی جو صلاحیت ہوتی ہے وہ دوسرے انسانوں میں نہیں ہوتی' اسی مفہوم کو قرآن نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے۔

﴿اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ﴾ (الکہف:۱۱۰)

''میں تمہاری ہی طرح بشر ہوں مجھ پر وحی کی جاتی ہے۔''

دیکھو کہ بشریت میں گو پیغمبر کو دوسرے انسانوں کے مثل کہا ہے مگر ساتھ ہی وحی کے فرق و امتیاز کو دونوں میں حدِ فاصل قرار دے دیا ہے۔

نبوت کے تفصیلی ثبوت کے تین طریقہ ہیں۔

پہلا طریقہ

انسان میں تین قسم کے اختیاری حرکات پائے جاتے ہیں' فکری' قولی' عملی' ان تینوں سے جو افعال سرزد ہوتے ہیں' وہ اچھے بھی ہوتے ہیں اور برے بھی' فکر یعنی رائے صحیح بھی ہوتی ہے اور غلط بھی' قول سچ بھی ہوتا ہے اور جھوٹ بھی' عمل اچھا بھی ہوتا ہے اور برا بھی۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ صحیح اور غلط' سچ اور جھوٹ اور اچھے اور برے میں تمیز کیونکر ہو؟ پھر کیا یہ تمیز ہر شخص کر سکتا ہے یا کوئی نہیں کر سکتا' یا بعض کر سکتے ہیں اور بعض نہیں' پہلے دو احتمال بداہتہً غلط ہیں' اب رہ گیا تیسرا احتمال' یعنی بعض انسان ایسے ہوتے ہیں جو ان حدود کو متعین کر سکتے ہیں کہ فلاں رائے و عقیدہ صحیح اور فلاں غلط ہے فلاں قول سچ ہے فلاں جھوٹ ہے اور فلاں فعل اچھا اور فلاں برا ہے' جس شخص کو خالقِ فطرت اپنے فضل و کرم سے یہ قوت عطا فرماتا ہے وہی پیغمبر اور صاحبِ شریعت ہوتا ہے۔

دوسرا طریقہ

نوعِ انسان کو اپنے اختیاری اعمال و حرکات اور مصلحتی معاملات میں باہمی اجتماع اور تعاون کی ضرورت ہے اگر انسانوں میں باہم یہ اجتماع اور تعاون نہ ہو تو نہ انسان کا کوئی فرد زندہ رہے نہ جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت ہو سکے' اسی بقائے نفس اور جان و مال و آبرو کے تحفظ کے اصول و آئین کا نام شریعت ہے انسان کو اس کے لیے دو قسم کے کاموں کی ضرورت ہے ایک یہ کہ اچھے کاموں میں سب مل کر ایک دوسرے کا ہاتھ بٹائیں' اس کو تعاون کہتے ہیں اور دوسرے یہ کہ برے کاموں سے ایک دوسرے کو باز رکھنے کی کوشش کریں اس کو تمانع کہتے ہیں' اسی تعاون کے ذریعہ سے انسان کھانے' پینے' پہننے اور رہنے کے سامان و اسباب فراہم کرتا ہے۔ تعاون کے ذریعہ نکاح و قرابت' اولاد و اعزہ اور احباب و دوست کے حقوق و تعلقات پیدا ہوتے ہیں اور تمانع کے ذریعہ سے نوعِ انسانی اور افرادِ انسانی کی زندگی' اور ان کی دولت و جائیداد اور عزت و آبرو کے بچاؤ کی صورت پیدا ہوتی ہے' اس

تعاون اور تمانع کے اصول ضروری ہے کہ مرتب' محدود اور معلوم ہوں اور وہ اس طرح بنائے جائیں' جن میں کسی شخص' خاندان' قبیلہ' قوم اور ملک کے فوائد کی ترجیح نہ ہو' بلکہ ان میں سب کا برابر فائدہ ہو' یہ ظاہر ہے کہ ایسا قانون انسانوں کے ذریعہ نہیں بلکہ وحیِ ربانی اور تعلیمِ الٰہی سے بن سکتا ہے' مطلب یہ ہے کہ محض کسی انسان کی عقل سے جو بہر حال کوئی خاص شخص یا کسی خاص خاندان' قبیلہ' قوم اور ملک کا ہوگا۔ ایسا غیر جانبدارانہ قانون جس میں تمام مخلوقات کی حیثیت یکساں ہو اور کسی طرف پلہ جھکنے نہ پائے اور تمام عالم کے لیے یکساں واجب العمل ہو محال ہے اس لیے ضروری ہے کہ یہ اصول اس کی طرف سے وحی ہوں' جس کے ہاتھ میں نظامِ عالم کی باگ ہے اور جو پورے نوعِ انسانی کے اندرونی و بیرونی احوال و کیفیات کے رموز سے باخبر ہے۔ یہ اصول خلاقِ عالم کی طرف سے جس شخص پر وحی ہوتے ہیں وہی پیغمبر اور رسول ہوتا ہے۔

تیسرا طریقہ

یہ وہ طریقہ ہے کہ جس نے اس کو نہیں جانا اس نے نبوت کی حقیقت نہیں پہچانی' پہلے یہ جاننا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے دو کام ہیں' خلق (پیدا کرنا' نیست سے ہست کرنا) اور امر (جو موجود ہست ہے اس کو اپنی مصلحت کے مطابق حکم دینا) کائنات ان ہی دو چیزوں سے عبارت ہے تو جس طرح فرشتے خالق اور مخلوق کے درمیان خلق و ایجاد و پیدائش اور پیغام رسانی میں واسطہ ہیں' اسی طرح پیغمبر' خدا اور بندہ کے درمیان احکام کے پہنچانے میں واسطہ ہیں اور جس طرح خدا پر بحیثیتِ خالق اور آمر (پیدا کرنے والے اور حکم دینے والے) کے ایمان لانا واجب ہے اسی طرح فرشتوں پر اس حیثیت سے کہ وہ خالق و مخلوق کے درمیان ایجاد و پیدائش اور پیغام رسانی کے واسطہ ہیں' ایمان لانا ضروری ہے اور اسی طرح پیغمبروں پر اس حیثیت سے ایمان لانا فرض ہے کہ وہ خدا اور بندہ کے درمیان حکم کے پہنچانے میں واسطہ ہیں۔

اس کے بعد حسب ذیل مقدمات ذہن نشین رکھنے چاہییں۔

(۱) چونکہ ممکن کا وجود اور عدم برابر ہے اس لیے ممکن ہے کہ وجود میں آنے کے لیے ایک مرجح کا ہونا ضروری ہے جس کی وجہ سے وجود کو عدم پر ترجیح ہو اور وہ شے عدم سے وجود میں آسکے' یہی امرِ مرجح ممکن کی علت ہوتا ہے۔

(۲) ہر قسم کے حرکات کے لیے ایک محرک کی ضرورت ہوتی ہے جو دم بدم حرکت کی تجدید کرتا رہے' حرکات کی بھی دو قسمیں ہیں طبعی اور ارادی۔ ارادی حرکت کے لیے ضرور ہے کہ اس کے محرک میں ارادہ اور اختیار پایا جائے' اسی طرح طبعی حرکت کے لیے بھی یہ ضروری ہے کہ اس کا محرک عقل اور تدبیر والا ہو' آفتاب و ماہتاب اور دوسری آسمانی مخلوقات کی حرکات گو طبعی ہیں تاہم ان کو حرکت دینے کے لیے کسی عاقل و مدبر کی ضرورت ہے اسی لیے قرآن نے ان کے لیے کہا۔

﴿وَ اَوْحٰی فِیْ کُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَهَا﴾ (حم السجدۃ:۱۲)

''خدا نے ہر آسمان میں اس کا فرض اور کام وحی کیا۔''

(۳) اب جس طرح انسانی حرکات کو ارادہ اور اختیار کی حاجت ہے یعنی ارادہ اور اختیار کے بغیر وہ وقوع میں نہیں آ سکتیں' اسی طرح ان حرکات کو ایسے رہنما کی ضرورت ہے جو ان اعمال و حرکات کا ٹھیک راستہ اور صحیح طریقہ بتائے اور حق کو باطل سے' سچ کو جھوٹ سے اور خیر کو شر سے ممتاز کر دے۔

(۴) خدا کے حکم دو قسم کے ہیں' تدبیری اور تکلیفی' پہلا حکم تمام نظامِ عالم میں جاری ہے۔ جس کی بنا پر تمام عالم میں تدبیر اور انتظام کا سلسلہ نظر آتا ہے' قرآن مجید میں ہے۔

﴿وَالشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرَاتٍ بِاَمْرِهٖ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ﴾ (الاعراف:۷).

''اور سورج اور چاند اور ستارے اس کے حکم کے تابعدار ہیں اسی کا کام ہے بنانا اور حکم فرمانا۔''

تکلیفی حکم صرف انسان کے لیے ہے' چنانچہ قرآن میں ہے۔

﴿یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ﴾ (البقرہ:۲۱)

''اے انسانو! اپنے اس رب کی عبادت کرو جس نے تم کو پیدا کیا۔''

مقدماتِ مذکورہ بالا سے ثابت ہوا کہ انسان کے تمام حرکات ممکن ہیں' اسی لیے مرجّح کی ضرورت ہے' اختیاری ہیں' اس لیے عقل کی ضرورت ہے' خیر و شر کے متحمل ہیں' اس لیے رہنما کی ضرورت ہے اسی رہنما کا نام پیغمبر ہے۔

نظامِ عالم میں خدا کا جو تدبیری حکم نافذ ہے وہ ملائکہ کے ذریعہ سے ہے' اسی قیاس پر انسانوں میں خدا کا جو تکلیفی حکم نافذ ہے وہ بھی ایسے ہی نفوسِ قدسیہ کے ذریعہ سے ہوگا' اور ان ہی کا نام پیغمبر ہے۔

شاہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ کے چھٹے مبحث کے دو ابتدائی بابوں میں اس پر بحث کی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ کمال نکتہ سنجی سے کی ہے' شاہ صاحب کی تقریر کو ہم اپنے الفاظ میں لکھتے ہیں۔

نبی کی ضرورت

انسان میں دو قسم کی قوتیں ہیں۔ بہیمی اور ملکوتی۔ کھانا' پینا' شہوت' حرص و طمع' استیلاء و جبر وغیرہ' افعال بہیمی. قوت کے آثار ہیں۔ اور غور و فکر' علم و معرفت' حسن اخلاق' صبر و شکر' عبادت و طاعت وغیرہ ملکوتیت کے نتائج ہیں' انسان کی روحانی کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ اس کی بہیمی قوت' اس کی ملکوتی قوت کے تابع ہو' اگرچہ عقلِ سلیم ان اصول اور طریقوں کو معلوم کر سکتی ہے جن کے ذریعہ سے بہیمیت کے تابع ملکوتیت ہونے کے فائدے اور گناہ و عصیان کے نقصانات ظاہر ہوں۔ عقلِ سلیم کے اس علم سے انسان فائدہ اٹھا کر اپنی اصلاح کر سکتا ہے' مگر یہ تو امکان عقلی ہے عملی کیفیت یہ ہے کہ انسان کی آنکھوں پر موجودہ دنیاوی لذائذ' حرص و طمع اور بے جا خواہشوں اور

غفلتوں کے اتنے تو برتو پردے پڑ جاتے ہیں کہ اس کے اصلی اور فطری وجدان اور قوتِ احساس کا مادہ فاسد ہو جاتا ہے۔ جیسے بیماری میں انسان کی زبان کا ذائقہ بدل جاتا ہے تو میٹھی سے میٹھی چیز اس کو کڑوی معلوم ہوتی ہے۔ اسی طرح اندرونی وجدان و احساس کے فاسد ہو جانے سے بھی وہ حق و باطل، خیر و شر اور نیک و بد کی تمیز کو بھول جاتا ہے۔ اس لیے نوع انسان کو ایسے صحیح رہنماؤں اور روحانی معلموں کی ضرورت ہے جن کے احساس و وجدان کا آئینہ گرد آلود نہ ہو۔

اگر افراد، جماعات اور اہل ملک کو ایسے شخص کی ضرورت ہے جو اپنی سیاست کے زور سے ان میں صلح و آشتی اور امن و امان پیدا کر دے تو ایک قوم کی قوم بلکہ کل دنیا کے لیے ایک ایسے شخص کی ضرورت کیوں نہ ہو۔ جو ہر گروہ کی استعداد کو پیش نظر رکھ کر اس کے مطابق اس کے حقوق و فرائض کی تعیین کرے، ایسے لوگ جو ایسے اہم فریضہ کو انجام دے سکیں، اسی طرح کم ہیں جس طرح اصناف کے اہلِ کمال، انسانوں کے معمولی پیشوں، نجاری اور لوہاری کو دیکھو کہ کس قدر معمولی ہیں، مگر ان کو کرنا بھی ہر شخص کا کام نہیں یہ پیشے بھی ایسے لوگوں کے بغیر وجود میں نہیں آئے، جن کو ان کاموں کا خاص ذوق و وجدان تھا اور ان کو ان کاموں کی خاص فطری استعداد ملی تھی، جس کے ذریعہ انہوں نے اس فن کو تکمیل تک پہنچایا اور اس کے اصول و قواعد وضع کیے اور بعد کے آنے والوں نے ان کی تقلید کی اور اس تقلید سے مدارجِ علیا تک پہنچے، پھر اخلاق اور روحانیت اور ملک و ملت کے مصالح و فوائدِ عامہ کا فن جس قدر اہم اور نازک ہے کیا اس کو سمجھنا اور وضع کرنا ہر کس و ناکس کا کام ہو سکتا ہے۔

نبی کی عصمت

پھر اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ جو شخص اس رہنمائی کے منصب کا مدعی ہو، وہ اپنی نسبت یہ بھی ثابت کرے کہ وہ ان اصول و قواعد سے بخوبی واقف ہے اور وہ اپنے علم اور تعلیم میں غلطی اور گمراہی سے محفوظ ہے اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک اس کے علم اور تعلیم کا ماخذ اور سرچشمہ غلطیوں سے پاک اور محفوظ نہ ہو، اس کو ان امور کا علم اسی طرح وجدانی ہو جس طرح انسان کو بھوک اور پیاس کا وجدان ہوتا ہے، کیا کسی کو اس علم میں کہ اس کو بھوک یا پیاس معلوم ہوتی ہے کوئی غلطی ہو سکتی ہے، اسی طرح اس کو حق و باطل، خیر و شر اور نیک و بد امور کے درمیان فیصلہ اسی طرح قطعی معلوم ہوتا ہے جس میں نہ دلیل کی حاجت ہوتی ہے اور نہ عقلِ معاش کی ضرورت ہوتی ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے ہمارے اندر بھوک اور پیاس ہونے کا علم اس طرح رکھ دیا کہ ہمارے سامنے کوئی معاند کتنی ہی دلیلیں پیش کرے کہ ہم کو بھوک یا پیاس نہیں ہے۔ ہم کبھی اپنے اس وجدانی یقین سے جس کو خدا نے ہمارے اندر پیدا کر دیا ہے، اس معاند کے ان عقلی دلائل سے متاثر ہو کر دست بردار نہیں ہو سکتے، اور اپنے یقین کو غلط نہیں کہہ سکتے، بعینہٖ اسی طرح ان نفوسِ قدسیہ کے اندر بھی اللہ تعالیٰ نے خاص قسم کا وجدان و ذوقِ سلیم رکھ دیا ہے جس کا عمل ہمیشہ صحیح اور جس کا احساس ہمیشہ درست اور جس کا فیصلہ ہمیشہ ناطق ہوتا ہے۔

نبی کی محبوبیت

ایسا شخص جب لوگوں کے سامنے آتا ہے اور لوگوں کو بار بار کے تجربہ سے اس کی صداقت' سچائی اور راست بازی کا یقین ہو جاتا ہے اور اس کے ہاتھ سے جو تصرفات صادر ہوتے ہیں' ان سے اس کا مقربِ بارگاہِ الٰہی ہونا بھی ظاہر ہو جاتا ہے تو ہر طرف سے لوگ اس کے اردگرد جمع ہو جاتے ہیں اور اس کی محبت کی راہ میں جان و مال اور اہل وعیال سب کو قربان کر دیتے ہیں شاہ صاحب اس کے بعد دوسری فصل میں اسی بحثِ نبوت کو ایک اور انداز سے لکھتے ہیں۔ جس کا ماحصل یہ ہے۔

مصلحین

فضل وکمال اور علم وعمل کے لحاظ سے انسانوں کے مختلف درجے ہیں' ان میں سب سے بڑا درجہ مفہمین کا ہے اور یہ وہ لوگ ہیں جن کی قوتِ ملکیہ نہایت بلند ہے اور جن میں یہ قدرت ہوتی ہے کہ سچے اور صحیح جذبہ سے ایک خاص نظام کو دنیا میں قائم کر دیں اور ان پر بارگاہِ الٰہی سے ایسے علوم اور احوال کا ترشح ہوتا ہے جن میں ربانی آثار نظر آتے ہیں ایسے لوگ معتدل مزاج اور اپنی صورت وسیرت میں درست اور عقل وذکاوت میں متوسط ہوتے ہیں' نہ اس قدر بلید کہ جزئیات سے کلیات تک ان کا پہنچنا مشکل ہو: نہ اس قدر تیز کہ جزئیات اور محسوسات سے قطع نظر کر کے ہمیشہ ذہنیات اور تخیلات میں مبتلا رہیں' صحیح فطرت پر وہ قائم رہتے ہیں' طور وطریق ان کے پسندیدہ ہوتے ہیں' خدا کے ساتھ ان کا تعلق عبادت وطاعت سے اور بندوں کے ساتھ عدل وانصاف سے قائم رہتا ہے وہ اپنے فیصلوں میں شخصی اور جزئی بھلائی اور منفعت کا لحاظ نہیں کرتے بلکہ منفعتِ عامہ اور تدبرِ کلی کا لحاظ کرتے ہیں' اور براہِ راست کسی کو تکلیف نہیں دیتے' الا یہ کہ منفعتِ عامہ کا حصول اور بڑی تعداد کا فائدہ چھوٹے سے نقصان سے حاصل ہو تو وہ اس جزئی تکلیف اور شخصی نقصان کو گوارا کر لیتے ہیں' وہ ہمیشہ اپنے کاروبار میں عالم غیب کی طرف مائل رہتے ہیں جس کا اثر ان کی بات چیت' کام کاج اور معاملات میں نمایاں ہوتا ہے کارکنانِ عالم ان کی تائید و نصرت میں رہتے ہیں' معمولی ریاضت سے ان کے لیے قرب وسکینت کے وہ دروازے کھل جاتے ہیں جو دوسروں کے لیے نہیں کھلتے۔

مصلحین کے اقسام

مفہمین کے درجہ بدرجہ مختلف اصناف ہیں اور ان کی مختلف استعدادیں ہیں اور اس بنا پر ان میں سے ہر ایک کے الگ الگ اصلاحی نام ہیں جو زیادہ تر عبادات کے ذریعہ سے تہذیبِ نفس کے علوم پاتا ہے' وہ کامل ہے' اور جو اخلاقِ فاضلہ اور تدبیر منزل کے اصول حاصل کرتا ہے' وہ حکیم ہے' جو عمومی تدبیر وسیاست کے علوم کا فیض پاتا ہے اور ان کے مطابق اس کو لوگوں میں عدل کے قیام اور ظلم کے دور کرنے کی توفیق ملتی ہے وہ خلیفہ ہے اور جس پر ملاءِ

اعلیٰ کا نزول ہوا' اور وہ اس سے تعلیم پائے اور اس کو مخاطب کرے اور مختلف قسم کے تصرفات اس سے صادر ہوں وہ مؤید بروح القدس کہلاتا ہے اور وہ جس کی زبان اور دل میں نور ہو کہ لوگ اس کی صحبت اور پند و موعظت سے نفع اٹھائیں' اور وہ نور اس سے منتقل ہو کر اس کے رفقائے خاص میں منتقل ہو۔ جس سے وہ بھی کمال کے درجہ تک پہنچ جائیں۔ اس کا نام ہادی اور مزکی (پاک کرنے والا) ہے اور جس کے علم کا بڑا حصہ ملت کے اصول و قواعد اور اس کی مصلحتوں کی واقفیت ہو اور ملت کے منہدم ارکان کو دوبارہ قائم کرنے کی طاقت ہو وہ امام کہا جائے گا اور جس کے قلب میں یہ ڈالا جائے کہ وہ لوگوں کو ان کی مصیبتِ عظمیٰ سے خبردار کرے' جو اس دنیا میں ان کے لیے ان کے اعمال کے نتیجہ کے طور پر مقدر ہے اور ان کو بداعمالی کے سبب سے ان سے حق تعالیٰ کی رحمت کو جو دوری ہے یا قبر اور حشر میں ان پر جو مصیبتیں آنے والی ہیں' اس کا نام منذر (ڈرانے والا' ہشیار کرنے والا) ہے۔

اور جب حکمتِ الٰہی کا یہ اقتضا ہوتا ہے کہ مخلوق کی ہدایت و اصلاح کے لیے ان مفہمین میں سے کسی کو بھیجے تو اس کی آمد مخلوق کے تاریکی سے نکل کر' روشنی میں آنے کا سبب ہو جاتی ہے اور وہ بندوں پر یہ فرض قرار دیتا ہے کہ وہ دل و جان سے اس کی اطاعت کریں اور بارگاہِ الٰہی سے تاکید ہوتی ہے کہ جو اس کی اطاعت کرے وہ اس سے خوش نودی اور جو اس سے مخالفت کرے وہ اس سے ناخوشی ظاہر کرے' یہی شخص نبی ہوتا ہے۔

نبی کی دو بعثتیں

نبیوں میں بڑا درجہ اس کا ہوتا ہے جس کو اس پیغمبرانہ بعثت کے ساتھ ایک اور بعثت ملتی ہے اور وہ یہ کہ مرادِ الٰہی یہ ہوتی ہے کہ اس نبی کے ذریعہ سے اس کی قوم اور اس کی قوم کے ذریعہ سے دوسری قومیں ظلمت سے نکل کر نور میں آئیں تو اس نبی کی ذاتی بعثت کا نام بعثتِ اولیٰ اور اس کی قوم کی دوسری قوموں کی ہدایت کے لیے نامزدگی بعثتِ ثانیہ ہے۔

نبی کی پہلی بعثت کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے:

﴿هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَ یُزَكِّیْهِمْ وَ یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ﴾ (الجمعۃ:۲)

''وہی خدا جس نے ان پڑھوں میں ان ہی میں سے ایک رسول بھیجا جو ان کو اس کی آیتیں سناتا' اور ان کو پاک بناتا اور ان کو کتاب اور دانائی سکھاتا ہے۔''

اور دوسری بعثت کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے۔

﴿كُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ (آل عمران:۱۱۰)

''تم بہترین امت ہو کیونکہ تم نیکی کا حکم کرتے ہو اور برائی سے روکتے ہو''۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ جس طرح محمد رسول اللہ ﷺ کی پیغمبرانہ بعثت ان کی امت کے لیے ہوئی ویسی ہی ان کی امت کی بعثت دوسری قوموں کی طرف ہوئی اور اسی معنی میں قرآن پاک کی یہ آیت بھی ہے:

﴿لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَّ تَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ﴾ (الحج:۱۰)

''تا کہ رسول تم پر گواہ ہو اور تم لوگوں پر گواہ ہو۔''

اسی لیے احادیث میں ہے کہ آپؐ نے صحابہؓ سے فرمایا تھا:

''تم آسانی کرنے والے بنا کر بھیجے گئے ہو' سختی کرنے والے بنا کر نہیں۔'' آنحضرت ﷺ سے پہلے جو انبیاء علیہم السلام آئے وہ ان مختلف مذکور بالا مناصب میں سے ایک یا دو منصب کے ساتھ مبعوث ہوئے' لیکن آنحضرت ﷺ ان تمام منصبوں پر ایک ساتھ سرفراز ہوئے اور یہ تمام فنون آپ کی واحد ذات میں جمع کر دیے گئے اور آپؐ کو یہ دونوں بعثتیں بھی بکمالِ استحقاق عطا ہوئیں۔

بعثت کے لیے کسی قوم کا انتخاب

یہ بھی واضح ہو کہ رسول کی بعثت کے لیے حکمتِ الٰہی کا اقتضا اس لیے ہوتا ہے کہ عالم کی عمومی تدبیر و نظم و نسق میں جو اضافی خیر معتبر ہے' وہ ان دنوں اسی رسول کی بعثت میں منحصر ہوتا ہے اور اس بعثت کے حقیقی سبب کا علم اسی دانائے غیب کو ہے' مگر اتنی بات ہم قطعاً جانتے ہیں کہ کچھ اسباب ایسے ہیں جو بعثت کے ساتھ ضرور پائے جاتے ہیں' اور امت پر اس رسول کی اطاعت اسی لیے فرض ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ دنیا کی تمام قوموں سے جس قوم کی نسبت یہ جانتا ہے کہ اس میں خدا کی اطاعت و پرستش کی استعداد اور اس میں اللہ تعالیٰ کے فیضان اٹھانے کی صلاحیت زیادہ ہے' اس میں وہ رسول مبعوث ہوتا ہے اور چونکہ اس قوم کی اصلاح اسی پیغمبر کی پیروی اور اتباع میں منحصر ہوتی ہے اس لیے بارگاہِ الٰہی کا یہ فیصلہ ہوتا ہے کہ اس کی اطاعت سب پر واجب کی جائے۔

بعثت کا زمانہ

اس موقع پر چند باتیں اور قابل لحاظ ہیں اگر یہ وقت وہ وقت ہوتا ہے کہ کوئی نئی حکومت اس لیے قائم کی جائے تا کہ اس کے ذریعہ سے ان دوسری حکومتوں کو جو دنیا میں فساد اور شر کا موجب بنی ہوئی ہیں' مٹا دیا جائے تو ایسی حالت میں اللہ تعالیٰ اس شخص کو بھیجتا ہے جو پہلے قائم ہونے والی اس سلطنت کی قوم کی اصلاح کرے اور اس کے دین کو درست کرے تا کہ اس کے ذریعہ سے دوسری قوموں کی اصلاح ہو جس طرح سے ہمارے پیغمبر محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت ہوئی یا یہ کہ اللہ تعالیٰ کسی قوم کی زندگی کی بقا اور اس کو اپنا برگزیدہ بنانا چاہتا ہے تو اس میں وہ ایک ایسے شخص کو بھیجتا ہے جو اس کی کجی کو دور کر دے اور اس کو کتابِ الٰہی کی تعلیم دے کر اس کو اس کا مستحق بنا دے' جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بنی اسرائیل میں بعثت ہوئی' یا کسی قوم کے متعلق قضائے الٰہی کا فیصلہ یہ ہوتا ہے کہ اس کو مزید زندگی ملتی رہے اور اس کا دین و سلطنت برقرار رہے تو مجددینِ نبوت پیدا ہوتے ہیں جیسے بنی اسرائیل کے مختلف

زمانوں میں حضرت داؤدؑ حضرت سلیمانؑ اور پیمبروں کے ایک گروہ کی بعثت ہوتی رہی۔

نبی کی یقینی کامیابی

ہر نبی کی بعثت کے دور میں اللہ تعالیٰ کا یہ فیصلہ ہوتا ہے کہ اس کو اور اس کے دوستوں کو کامیابی اور اس کے دشمنوں کو پے در پے ناکامی ہو (یہاں تک کہ حق استوار اور دعوت مکمل ہو جائے) قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَ لَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ ○ اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ ○ وَ اِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ ○﴾ (الصّٰفّٰت: ۱۷۱۔۱۷۳)

"اور ہماری بات اے پیغمبر بندوں کے متعلق پہلے ہی طے ہو چکی ہے کہ انہی کی مدد کی جائے گی اور ہمارا ہی لشکر غالب ہوگا۔"

ان دونوں بزرگوں (امام غزالی اور شاہ ولی اللہ صاحب) نے اپنے اپنے الفاظ میں جو کچھ کہا ہے وہ حرف بحرف صحیح ہے۔ انبیائے کرام علیہم السلام کے احوالِ مبارکہ اور سوانحِ مقدسہ پر جس کی نظر عمیق و وسیع ہوگی' اس کو ان اصول کے تسلیم کرنے میں ذرہ بھر شک نہیں ہو سکتا اور ان پر استدلال' واقعات اور حوادث سے اسی طرح کیا جا سکتا ہے' جس طرح نفسیاتِ اجتماع (سائیکلوجی آف پیپل) یا نفسیاتِ رہنمائی (سائیکلوجی آف لیڈرشپ) پر واقعات کے تسلسل اور تواتر سے کرتے ہیں' اسی طرح امام غزالی اور شاہ ولی اللہ صاحب نے اوپر کے صفحات میں جو کچھ کہا ہے ہم مجازاً کہہ سکتے ہیں کہ "وہ نفسیاتِ نبوت" کے گویا ابواب ہیں۔

موجودہ زمانہ میں خیالات' طرزِ گفتار' اسلوبِ تحریر اور طریقۂ استدلال' غرض ہر چیز میں فرق ہو گیا ہے' اس لیے ضرورت ہے کہ اہل زمانہ سے ان کی اصطلاح میں گفتگو کی جائے اور جو اصول قائم کیا جائے' اس پر قرآن مجید سے بھی ساتھ ساتھ استدلال کیا جائے کہ عقل و نقل دونوں درباروں میں کہنے والے کی بات کا اعتبار ہو۔

غور کرنے سے یہ معلوم ہوگا کہ دنیا کا ذرہ ذرہ جس غرض و مقصد کے لیے پیدا ہوا ہے وہ اپنے ذاتی ارادہ اور قصد کے بغیر خود بخود اس کو پورا کر رہا ہے اور اس کے خالق نے اس کے روز پیدائش سے اس کو جو حکم دے دیا ہے اس کی تعمیل سے وہ سرِ مو انحراف نہیں کرتا' آسمان سے لے کر زمین تک ہر چیز اپنے اپنے کام میں لگی ہوئی ہے آفتاب دنیا کو گرمی اور روشنی دینے پر مامور ہے اور ہر آن اور ہر لمحہ وہ اس میں مصروف ہے' زمین کو سرسبزی اور شادابی کا کام سپرد ہے اور وہ اس کو انجام دے رہی ہے ابر کو سیرابی اور گوہر باری کا حکم ہے اور وہ اس کی تعمیل کر رہا ہے' درخت پھل دینے پر مقرر ہیں اور وہ اس کام میں لگے ہوئے ہیں' حیوانات جن کاموں پر مامور ہیں وہ بخوشی ان کو کر رہے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ کیا انسان بھی اس دنیا میں کسی کام پر اسی طرح مقرر ہو کر آیا ہے یا نہیں؟ اگر آیا ہے تو کیا اس کو انجام دے رہا ہے؟

آؤ انسان کو غور سے دیکھیں' بظاہر وہ بھی کھاتا پیتا' چلتا پھرتا' اٹھتا بیٹھتا زندگی گزارتا ہے اور پھر مر جاتا ہے'

کیا اس کی زندگی کا بس اسی قدر مقصد ہے' اگر یہی ہے تو پھر انسان اور حیوان میں کیا پہچان اور ذی ارادہ اور غیر ذی ارادہ میں کیا امتیاز؟ اور صاحب عقل اور بے عقل میں کیا فرق؟ چنانچہ قرآن پاک اسی لیے انسانوں سے سوال کرتا ہے اور بجا سوال کرتا ہے:

﴿اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا﴾ (المؤمنون:۱۱۵)

''کیا تم یہ گمان کرتے ہو کہ ہم نے تم کو بیکار پیدا کیا۔''

﴿اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدًى﴾ (القیامہ:۳۶)

''کیا انسان یہ گمان کرتا ہے کہ وہ بیکار چھوڑ دیا جائے گا۔''

اس سے معلوم ہوا کہ وہ بھی کسی غرض و مقصد کے لیے پیدا ہوا ہے لیکن وہ غرض و مقصد کیا ہے۔

انسان کی پوری ہستی اگر کائنات کے صفحہ سے مٹ جائے تو بھی آفتاب اسی طرح چمکتا رہے گا' سمندر اسی طرح ابلتے رہیں گے' ہوائیں اسی طرح چلتی رہیں گی' پانی اسی طرح برستا رہے گا' سبزے اگتے رہیں گے اور درخت اسی طرح پھلتے رہیں گے' لیکن اگر درخت نہ پھلیں تو انسان کی ہستی معرضِ خطر میں پڑ جائے' سبزیاں نہ اگیں تو انسان بھوکا مر جائے' پانی نہ برسے تو انسان پیاسا تڑپ جائے اگر ہوا نہ چلے تو انسان گھٹ کر مر جائے' اگر زمین نہ ہو تو انسان کو کھڑے ہونے کی جگہ نہ ملے' اگر آفتاب نہ چمکے تو انسان کی ہستی کا چراغ فوراً بجھ جائے' سمندر نہ ہو تو نہ پانی برسے نہ سبزیاں اگیں' نہ انسانی غذا میسر آئے نہ پانی برس کر پھر زمین کو خشک ہونا نصیب ہو' الغرض دنیا کی کوئی ہستی اپنے وجود کے لیے انسان کی محتاج نہیں' لیکن انسان اپنے وجود کے لیے کارخانۂ ہستی کے ایک ایک پرزے کا حاجت مند ہے' تو پھر کیا یہ نتیجہ صحیح نہیں کہ اس کارخانہ کے ہر پرزہ کی غرض و غایت انسان کا وجود اور اس کی بقا ہے' لیکن خود انسان کے وجود کی غرض کوئی دوسری ہے' جو دیگر موجودات کے وجود کی غرض سے زیادہ اہم ہے۔

قرآن پاک دوسرے موجودات و مخلوقات کی نسبت تو یہ کہتا ہے:

﴿هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا﴾ (البقرہ:۲۹)

''اس نے تمہارے لیے (اے انسانو!) وہ سب پیدا کیا جو زمین میں ہے۔''

پھر یہ بھی بتایا:

﴿اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ﴾ (الحج:۶۵)

''اے انسان! کیا تو غور نہیں کرتا کہ زمین میں جو کچھ ہے اس کو تمہارے کام میں اس نے لگا رکھا ہے۔''

زمین کے بعد آسمان کی نسبت بھی اس نے اعلان کیا:

﴿وَ سَخَّرَ لَكُمُ الَّیْلَ وَ النَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ وَ النُّجُوْمُ مُسَخَّرٰتٌۢ بِاَمْرِهٖ﴾ (النحل:۱۲)

''اور (اے انسانو!) اس نے رات اور دن کو اور سورج کو اور چاند کو تمہارے کام میں لگایا ہے اور ستارے بھی اس کے حکم سے کام میں لگے ہیں۔''

ہستیاں دو ہی ہیں' خالق کی اور اس کی مخلوقات کی۔ مخلوقات کے حالات پر غور کرنے سے نظر آتا ہے کہ ان میں ہر ادنیٰ چیز اپنے سے اعلیٰ چیز کے کام آ رہی ہے۔ جمادات نباتات کے' نباتات حیوانات کے اور جمادات اور نباتات اور حیوانات تینوں انسان کے کام آ رہے ہیں' آخر انسان کو بھی اپنے سے کسی اعلیٰ ہستی کے کام آنا چاہیے' مخلوقات میں تو اب اس سے کوئی اعلیٰ ہستی نہیں' تو لامحالہ اس کی تخلیق خود خالق کے لئے ہوئی ہے۔

الغرض دنیا کی ساری چیزوں کی غرض و غایت بواسطہ یا بلا واسطہ انسانوں کی بقا' زندگی اور آسائش ہے لیکن خود انسان کی زندگی اس کے لئے نہیں بلکہ خدا کے لئے ہے جیسا کہ وہ خود فرماتا ہے:

﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَ الْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ﴾ (الذاریات:۵۶)

''اور میں نے جن اور انسان کو اس لیے پیدا کیا کہ وہ میری اطاعت کریں۔''

عقل و فہم اور ارادہ و اختیار کے لحاظ سے مخلوقات کی تین قسمیں ہیں۔

(۱) ایک وہ جو ان صفات سے یکسر محروم ہیں۔ آفتاب' ماہتاب' زمین' مٹی' پتھر' پھل' پھول' درخت۔

(۲) دوسری وہ جو صرف ابتدائی احساس اور علم و فہم رکھتی ہیں' لیکن قیاس و استقراء و تمثیل اور حاضر پر غائب کو قیاس کر کے کسی نئے علم کا استخراج کرنا ان کی قدرت سے باہر ہے ان کا ارادہ و اختیار بھی صرف ظاہری محسوس اشیا تک محدود ہے جیسے حیوانات۔

(۳) تیسری وہ مخلوق ہے جو عقل و ادراک رکھتی ہے' قیاس آرائی کرتی ہے' استقراء و تمثیل کے ذریعہ سے استنباط کرتی ہے' جزئیات سے کلیات بناتی اور کلیات سے جزئیات پر حکم لگاتی ہے۔ بدیہیات سے نظریات تک پہنچتی اور غائب کو حاضر پر قیاس کرتی ہے۔

پہلی قسم کی مخلوقات سے جو حرکات اور آثار پیدا ہوتے ہیں وہ اضطراری اور غیر ارادی ہوتے ہیں اور کبھی ان میں تخلف نہیں ہوتا اسی لیے ان کو فطری آثار اور طبعی خصائص کہتے ہیں' جن کا صدور ان مخلوقات سے ہمیشہ یکساں اور بلا ارادہ ہوتا رہتا ہے دوسری قسم کی مخلوقات سے جو آثار و حرکات پیدا ہوتے رہتے ہیں' وہ گو ارادہ اور احساس اور ابتدائی فہم کے تحت صادر ہوتے ہیں لیکن ان کے ہر فرد سے ایک ہی قسم کے افعال' حرکات اور آثار کو جبلت' فطرت اور طبیعت کہتے ہیں' ان کے صدور میں بھی وہ مخلوقات اپنی فطرت اور طبیعت کے تقاضے سے مجبور ہیں' جیسے حیوانات کے افعال' ان کے مختلف انواع کے الگ الگ نوعی کام کہ وہ ازل سے قیامت تک یکساں' ایک ہی طرح' اور وہ بھی کسی غایت اور انجام و مآل کے پہلے سے سوچے بغیر ان سے صادر ہوتے ہیں۔

تیسری مخلوق کے بعض افعال گو طبیعت و جبلت کے مطابق ہوتے ہیں جو دیگر مخلوقات کی طرح ویسے ہی بے ارادہ اور اضطرار اً سرزد ہوتے ہیں مگر اس کے اور دوسرے افعال و حرکات تمام تر اس سے ارادہ' اختیار اور فہم سے

صادر ہوتے ہیں۔ صرف یہی آخری قسم کے افعال وہ ہیں، جن پر خیر وشر اور نیک و بد کا حکم جاری ہوتا ہے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ اس کے تمام عاقلانہ کام، عاقبت بینی انجام اور مآلِ کار کو خیال کر کے اس کے ارادہ سے صادر ہوتے ہیں اور یہیں سے اس کی ذمہ داری کا سوال پیدا ہو جاتا ہے۔

جن وانس کے علاوہ تمام دوسری مخلوقات خیر وشر کی ذمہ داری سے بری ہیں۔ جمادات ونباتات تو اِس لیے کہ ان کے افعال وحرکات تمام تر مجبورانہ، بے ارادہ اور فکرِ انجام کے بغیر صادر ہوتے ہیں، یا یوں کہو کہ ان احکام کے بموجب ہمیشہ ہوتے ہیں جو خدا نے ان کو اول ہی دے دیے ہیں، حیوانات بھی اس لیے اس ذمہ داری سے بری ہیں کہ ان کے افعال وحرکات بھی تمام تر جبلی وطبعی ہیں، اور وہ جبلت وطبیعت پر مجبورانہ، بے ارادہ اور انجام کے خیال کے بغیر عامل ہیں، یا یوں کہو کہ وہ اپنے خالق کے احکام پر ہمیشہ اضطراراً عمل پیرا ہیں اسی طرح فرشتے بھی اس تکلیف سے سب سبکدوش ہیں کیونکہ وہ بھی اپنی خلقت اور جبلت سے اطاعت پر مجبور ہیں اور اسی لیے ان سے عصیاں نہیں سرزد ہوتا، صرف ایک انسان ایسی مخلوق ہے جو بہت سی باتوں میں ارادہ، اختیار اور علم رکھتا ہے، نیکی، بدی اور خیر وشر ان دونوں پہلوؤں میں سے کسی ایک کے اختیار پر قطعی مجبور نہیں ہے بلکہ وہ عقل وفہم سے سوچ سمجھ کر مآل کار اور انجام پر غور کر کے یا اپنے جذبات کے تحت کوئی کام کرتا ہے اس لیے وہی خیر وشر کے امتیاز اور حق وباطل کے فرق کے لیے پیغام الٰہی کا محتاج قرار پایا۔

جمادات ونباتات اور دیگر مخلوقات سے احکام الٰہی کی مجبورانہ اطاعت یعنی جبلت یا فطرت یا خاصیت کو قرآن پاک یوں ادا کرتا ہے:

﴿وَ لِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ وَّ الْمَلٰٓئِكَةُ وَ هُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ○ يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ وَ يَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ○﴾ (النحل:۴۹۔۵۰)

''اور خدا ہی کے آگے سر جھکاتے ہیں جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے جانداروں میں سے اور فرشتے وہ سرکشی نہیں کرتے۔ اپنے پروردگار کا اوپر سے ڈر رکھتے ہیں، اور کرتے ہیں جو حکم پاتے ہیں۔''

اسی فطری اطاعتِ الٰہی کا دوسرا نام فطری وحی بھی رکھ لو، جیسا کہ قرآن میں ہے:

﴿وَ اَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِيْ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا وَّ مِنَ الشَّجَرِ وَ مِمَّا يَعْرِشُوْنَ ○ ثُمَّ كُلِيْ مِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ فَاسْلُكِيْ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا﴾ (نحل:۶۸۔۶۹)

''اور تیرے پروردگار نے شہد کی مکھیوں پر وحی بھیجی کہ پہاڑوں میں اور درختوں میں اور جہاں چھت ڈالتے ہیں اپنے لیے گھر بنا لے، پھر ہر پھل میں سے کھا، پھر اپنے پروردگار کی راہوں پر (مقررہ احکام پر) چل مطیع ہو کر۔''

دیکھو اس آیت پاک میں طبعی الہام کی مجبورانہ پیروی کو اطاعتِ الٰہی کہا گیا ہے اور دوسری جگہ ان کی اپنے خالق اور پیدا کرنے والے کے حکم کی اسی طبعی اطاعت اور فطری تعمیل کو ان کی زبانِ حال کی نماز اور تسبیح فرمایا گیا

ہے۔

﴿اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُسَبِّحُ لَهٗ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَ الطَّيْرُ صٰٓفّٰتٍ كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلٰوتَهٗ وَ تَسْبِيْحَهٗ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ﴾ (النور:۴۱)

''کیا تو نے نہیں دیکھا کہ آسمان وزمین میں جو کوئی ہے اور اڑتے جانور پر کھولے اس کی یاد کرتے ہیں' ہر ایک نے جان رکھی ہے' اپنی طرح کی نماز اور اس کی پاکی کی یاد اور خدا کو معلوم ہے جو وہ کرتے ہیں۔''

لیکن انسان کو دوسرے موجودات ومخلوقات کی طرح مجبورِ محض نہیں پیدا کیا گیا ہے بلکہ جیسا کہ بتایا جا چکا وہ احساس اور ارادہ جو جمادات میں معدوم' نباتات میں محلِ بحث اور حیوانات میں متحرک ہے۔ انسان میں پوری طرح بیدار اور کارفرما ہے' اسی طرح وہ ارادی قدرت و اختیار جو جمادات میں معدوم' نباتات میں مفقود اور حیوانات میں محدود ہے انسان میں ایک حد تک وسیع ہے۔ علاوہ ازیں ہر کام میں عاقبت بینی اور مآل اندیشی صرف انسان کا خاصہ ہے' اسی لیے تمام مخلوقات میں وہی ''ارادی تکلیف'' کا مستحق قرار پایا اور غیر ذی ارادہ مخلوقات کی طرح بالاضطرار اور مجبورانہ اطاعت الٰہی کے لیے نہیں بلکہ بالارادہ اطاعت کے لیے اس کی تخلیق ہوئی۔ فرمایا:

﴿اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ الْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَ اَشْفَقْنَ مِنْهَا وَ حَمَلَهَا الْاِنْسَانُ﴾ (الاحزاب:۹)

''ہم نے اپنی امانت آسمانوں پر اور زمین پر اور پہاڑوں پر پیش کی تو انہوں نے انکار کیا اور اس سے ڈرے اور انسان نے اس کو اٹھا لیا۔''

یہ امانت اس کی نیکی وبدی کی تمیز اور خیر وشر کا فرق ہے جس کے نتیجہ کے طور پر شریعتِ الٰہی کا نزول ہوا ہے' انسان کو اپنی اس امانت سے عہدہ برآ ہونے کے لیے بالارادہ اور بااختیار افعال میں بھی بے اختیارانہ افعال کی طرح احکامِ الٰہی کی اطاعت کرنا ضروری ہے یعنی جس طرح بے اختیارانہ افعال میں فطرت و جبلت کی مجبورانہ اطاعت کر کے حکمِ الٰہی کی تعمیل کی جاتی ہے اسی طرح باارادہ اور اختیاری افعال میں بھی شریعت کی بالارادہ اطاعت کر کے حکمِ الٰہی کی تعمیل ضروری ہے۔

اس مطلب کو دوسرے لفظوں میں یوں ادا کر سکتے ہیں کہ غیر ارادی افعال وحرکات میں جس طرح ہم اپنے فطری الہام ووحی کی مجبورانہ پیروی کرتے ہیں' اسی طرح ارادی افعال میں بھی شرعی الہام ووحی کی بالارادہ پیروی کریں۔

لیکن کسی کی اطاعت اس وقت تک ممکن نہیں جب تک اس کے احکام واوامر سے ہم کو واقفیت نہ ہو' انبیاء و رسل وہی ہیں جن پر اللہ تعالیٰ اپنے ان احکام اور اوامر کی شریعت کو وحی کرتا ہے اور وہ ان ذی ارادہ بندوں کو اس سے آگاہ وباخبر کرتے اور اس کی اطاعت کی دعوت دیتے ہیں۔

یہ نکتہ کہ انسان کے علاوہ تمام دیگر بے ارادہ مخلوقات خدا کی اطاعت پر طبعاً مجبور اور مجبول ہیں اور کسی قدر با اختیار انسان کے افراد اپنے اسی تھوڑے سے اختیار اور ارادہ کے بل پر اپنے خالق سے سرکشی کرنے پر آمادہ ہیں خود قرآن پاک کے الفاظ میں موجود ہے' فرمایا۔

﴿اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَ مَنْ فِى الْاَرْضِ وَ الشَّمْسُ وَ الْقَمَرُ وَ النُّجُوْمُ وَ الْجِبَالُ وَ الشَّجَرُ وَ الدَّوَآبُّ وَ كَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ وَ كَثِيْرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ﴾ (الحج:۱۸)

''کیا تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ ہی کے آگے سر جھکاتا ہے جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے اور سورج اور چاند اور ستارے اور پہاڑ اور درخت اور جانور اور بہت سے انسان اور بہت سے (انسان) ہیں جن پر عذاب ٹھہر چکا۔''

دیکھو کہ انسان کے علاوہ تمام دوسری بے ارادہ اور بے عقل مخلوقات کی کلی اطاعت اور سرافگندگی کا اعلان ہے لیکن خاص باارادہ اور باعقل اور انجام بین انسانوں کی دو قسمیں کر دی گئیں' مطیع اور سرکش۔

کائنات کے صحیفہ کا تدریجی مطالعہ کرو تو معلوم ہوگا کہ جمادات' نباتات' حیوانات اور انسان میں سے جس صنفِ مخلوقات میں احساس' ارادہ اور اختیار کی جتنی کمی ہے اسی قدر فطرت اس کی دایہ گری کی خدمات زیادہ انجام دیتی ہے اور جس حد تک احساس اور اختیار کا دائرہ اصنافِ ہستی میں بڑھتا جاتا ہے' اسی قدر معلمِ فطرت اپنے فرائض سے کنارہ کش ہوتا جاتا ہے اور وہ صنف کائنات اپنی ذمہ داری آپ قبول کرتی جاتی ہے' جمادات اپنی نشوونما کے لیے بیرونی غذا کے محتاج نہیں' نباتات جن میں ان اوصاف کی ہستی صرف آنکھیں کھولتی ہے ان کی غذا خود ان کے پاؤں کے نیچے ہوتی ہے اور وہ خود اڑ کر اور چل کر ان تک پہنچ جاتی ہے' حیوانات جن میں یہ اوصاف جاگ کر کروٹیں بدلتے ہیں۔ ان کی غذا بے جوتے' بے بوئے' بے چنے نکھارے' بن پکے پکائے' ہر قدم پر ہر وقت تیار ملتی ہے لیکن انسان جس میں یہ تینوں اوصاف بیٹھ کر حکمران اور کارفرما ہوتے ہیں' اس کے منہ تک غذا کا ایک دانہ بھی اس وقت تک نہیں پہنچ سکتا جب تک اس کی جدوجہد و جانفشانی کے پسینہ کا گرم قطرہ پیشانی سے چل کر اس کے پاؤں تک نہیں پہنچتا۔

جہاں احساس' ارادہ اور اختیار جیسے جیسے کم ہے' اسی قدر طبیعت' فطرت اور جبلت کی اضطراری حکومت زیادہ قائم ہے لیکن جیسے جیسے ان تینوں اوصاف کی ترقی و تکمیل ہوتی جاتی ہے' طبیعت' فطرت اور جبلت کی حکومت کا دائرہ تنگ ہو کر' احساس' ارادہ اور اختیار کی شہنشاہی قائم ہوتی جاتی ہے اور حرکات و اعمال کی باگ فطرت و جبلت کے مضبوط اور ناممکن التغیر ہاتھوں سے نکل کر اختیار و ارادہ کے کمزور اور ہر آن بدل جانے والے ہاتھوں میں آ جاتی ہے' جمادات ہمیشہ وہی کریں گے جو ان کو کرنا چاہیے۔ عموماً وہی بنیں گے جو ان کو بننا چاہیے' حیوانات وہی کام انجام دیں گے جو ان کے سپرد کر دیا گیا ہے' لیکن انسان کسی قدر اختیار اور ارادہ پا کر اکثر اپنی راہ سے ہٹ جاتا ہے

اور حدودِ اعتدال سے قدم باہر نکال دیتا ہے اور اپنے اس اختیار وارادہ کی ذمہ داری کی امانت کو بھول جاتا ہے' انبیا اور رسول وہی ہیں جو اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس ذی ارادہ اور بااختیار مخلوق کو اس کی اس ذمہ داری کے فرائض سمجھانے کے لیے آتے ہیں۔

اس اختیار وارادہ کے مرکز کا نام مذاہب کی زبان میں ''دل'' ہے جو انسان کے سر سے لے کر پاؤں تک کی رگ رگ اور ریشہ ریشہ کی ایک ایک جنبش وحرکت پر حکمران ہے اور اسی کے حکم سے اس جسم کے اندرونی عالم میں سب کچھ ہوتا اور سرانجام پاتا ہے' انبیا اسی دل کے نظام کو درست کرنے کے لیے آتے ہیں۔

انسان کو اپنے وجود' بقا' ترقی اور تکمیل کی ہر منزل میں قدم قدم پر ہزاروں چیزوں کی احتیاج ہوتی ہے ان چیزوں کے مہیا اور تیار کرنے کے لیے ہر انسان میں استعداد وقوت الگ الگ ہوتی ہے اور یہ استعداد وقوت فیاضِ قدرت کی طرف سے پیدائش بلکہ پیدائش سے پہلے ہی آب وگل کے عالم میں اس میں ودیعت رکھی جاتی ہے یہی سبب ہے کہ ہر انسان میں جس قسم کا میلان ہوتا ہے اسی کی استعداد اس میں پائی جاتی ہے اور پھر بعد کو خاص خاص فنی الہامات کے ذریعہ سے جن کو تم ایجادات واختراعات کہتے ہو' ہر پیشہ ور اپنے متعلقہ کام کو بڑھاتا ہے اور ترقی دیتا ہے اور تمہاری ضرورت کے مطابق تمہارے لیے سامان فراہم کرتا ہے۔

ان مادی ضروریات کے بنانے والوں کے حسبِ استعداد اور حسبِ حیثیت مختلف درجے اور مرتبے ہیں' بعض ان میں سے محض مقلد ہوتے ہیں' جو وہی بنا سکتے ہیں جو بنانا سیکھا ہے' بعض چابک دست اور ذہین ہوتے ہیں جو اچھے کاری گروں کے صرف نمونوں کو دیکھ کر اچھی چیزیں تیار کر سکتے ہیں' بعض ایسے ذہین اور فطین ہوتے ہیں کہ وہ نئی نئی چیزیں بناتے' دریافت کرتے اور ایجاد کرتے ہیں اور بعد کے آنے والے مدت تک ان ہی کی تقلید کرتے رہتے ہیں' کاشت کاری کے اصول' ازالۂ مرض کی تدبیریں' کھانے پکانے کے طریقے' سواری کی ضروریات' رہنے سہنے کے سامان' پہننے کے کپڑے' لڑنے کے آلات ان میں سے ہر شے کی ضرورت ہے اور ان میں ہر ضرورت کے لیے خالقِ فطرت نے ایک ایک گروہ پیدا کر دیا ہے اور وہ اپنے اپنے کام انجام دیتا رہتا ہے۔ ان ضرورتوں کے فراہم ہو جانے سے انسان کی مادی زندگی کی تکمیل ہو جاتی ہے اب اس کے بعد اس کی روحانی اور اخلاقی زندگی کی ضروریات کا جن کو تم اصولِ تمدن' طریقۂ معاشرت' آئینِ عدل وانصاف' اخلاقِ حسنہ اور دین و تقویٰ کے نام سے موسوم کرتے ہو' دور شروع ہوتا ہے' اگر یہ اصول اور تعلیمات انسانوں کے سامنے نہ ہوں تو آدم کے بیٹوں کی یہ جنت دوزخ ہو جائے اور اشرف المخلوقات کی یہ جماعت جانوروں کا گلہ اور درندوں کا غول بن جائے۔

جو تمہارے لیے غلہ پیدا کرتا ہے وہ کاشت کار ہے' جو اوزار بناتا ہے وہ لوہار ہے' جو زیور گھڑتا ہے وہ سنار ہے' جو تمہارے لیے کپڑے بنتا ہے وہ بنکر (جولاہا) ہے' جو تمہارے مکان بناتا ہے وہ معمار ہے' جو تمہاری حفاظت کرتا ہے وہ سپاہی ہے جو تمہاری نگہبانی کرتا ہے وہ حاکم ہے' جو تمہارے آپس کے جھگڑے چکاتا ہے وہ قاضی ہے'

جوتمہارے ملک کے اندر امن وامان کا ضامن ہے وہ بادشاہ ہے جوتمہاری جسمانی بیماریوں کا معالج ہے وہ طبیب ہے' جواپنی صناعیوں سے تمہاری ضرورتوں کے لیے کاری گری کی چیزیں بناتا ہے وہ صناع ہے اور جوتمہارے لیے مادی کائنات کے چہرے سے اسرار کا پردہ ہٹا کر تم کو ہر چیز سے باخبر کرتا ہے وہ حکیم ہے۔

اسی طرح جو برگزیدہ افراد تمہارے روحانی واخلاقی واجتماعی حالات کے معلم ونگران ہیں' ان کی بھی ایک جماعت ہے لیکن جس طرح تمہارے مادی ضروریات کے بنانے والوں کے حسبِ استعداد اور حسبِ حیثیت درجے ہیں' اسی طرح ان روحانی ضروریات کے فراہم کرنے والوں میں بھی مرتبے اور درجے ہیں' بعض وہ ہیں' جو صرف اگلے روحانی معلمین کی نقل وتقلید کرتے ہیں۔ یہ عام علما ہیں' بعض وہ ہیں جو اچھے روحانی نمونوں کو دیکھ کر خود بھی ان کی عمدہ نقل اتارتے ہیں اور دوسروں کو بھی بتاتے ہیں' یہ مجددین ہیں۔ بعض ایسے ہیں جو الہامِ ربانی سے فیض پاکر روحانیت کے نئے نئے اصول وضع کرتے اور دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں' یہ انبیا ہیں۔ ان کے مقدس ہاتھ تمہارے لیے غلہ پیدا کرنے' مکان بنانے' کپڑا بننے اوزار بنانے اور صناعی کرنے کے لیے نہیں بلکہ ان سے بدرجہا بلند تر اور بہتر کام کے لیے ہیں' ان کی مبارک انگلیاں تمہارے ان تاروں پر پڑتی ہیں جن سے یہ صدہا قسم کے نغمے نکل رہے ہیں' یعنی تمہارے دل کی رگوں پر۔ غور کرو کہ یہ اصل مرکز جس پر تمہارے اعمال وافعال اور ہر قسم کے حرکات وسکنات اور ہر طرح کی جدوجہد کا مدار ہے یعنی ''دل'' کیا انبیاء اور ان کے متبعین کے سوا نوع انسانی کا کوئی طبقہ اس کی نشوونما' حفاظت' ترقی' تکمیل اور اصلاح کے لیے بھی کام کر رہا ہے اور کیا خالقِ فطرت کا یہ فرض نہ تھا کہ وہ مادی ترقی واصلاح کی طرح تمہاری روحانی ترقی واصلاح کی بھی فکر کرتا اور ایسا سمجھنا کہ اس نے اس کی ترقی وتکمیل واصلاح کی خدمت نوع انسانی کے کسی کارکن طبقہ سے متعلق نہیں کی ہے' کیا اس کی شانِ ربوبیت کے ساتھ سوءِ ظن نہیں ہے۔

یہی وہ طبقہ ہے جو تمام متفرق اور مختلف انسانی طبقوں کو باہم جوڑ کر ایک عام انسانی تمدنی سطح پر لایا ہے' وہ ان سب کو جو تمہارے لیے روٹی تیار کرتے ہیں' کپڑے بنتے ہیں' جھونپڑے بناتے ہیں اور سامان اور اوزار درست کرتے ہیں' ایک دوسرے کے ساتھ مشارکت اور معاونت اور نیکی پر آمادہ کر کے ان میں روحانی برادری پیدا کرتے ہیں' اور مٹی سے پیدا ہونے والے ایک آدمؑ کے بیٹوں کو جن کو دولت وغربت' سوسائٹی اور مجلس' حکومت اور اقلیم اور جغرافی وقومی تقسیم نے پارہ پارہ کر رکھا ہے' باہم جوڑ دیتے ہیں اور ان تمام مصنوعی امتیازات کو مٹا کر پوری زمین کو ایک ملک' تمام اقوامِ عالم کو اولادِ آدم' اور کل بلند وپست طبقوں کو ایک انسانی طبقہ قرار دیتے ہیں' اور ان کے اخلاقی وروحانی عالم میں اصلاح وترقی اور امن وامان پیدا کرتے ہیں' ان کے دلوں سے بغض وکینہ کو نکال کر اخوت ومحبت کا نور بھرتے ہیں' ان کے احساس' ارادہ اور اختیار کی باگ پر ان کے دل کو قابو حاصل کرنے کی تدبیر بتاتے ہیں اور ان کو اعتدال کی حد بتا کر صحیح وغلط کی تمیز عطا کرتے ہیں۔

یہی وہ انسانی طبقہ ہے جس کو ہم نبی' رسول اور پیغمبر کہتے ہیں' ان کو گو براہِ راست جسم وجسمانیات سے تعلق

نہیں ہوتا بلکہ صرف دل اور قلب وروح کے عالم سے سروکار ہوتا ہے' تاہم اس دل اور قلب وروح کی اصلاح کے لیے جسم وجسمانیات کی کسی قدر اصلاح بھی اس حد تک ان کے فرائض میں داخل ہے جہاں تک ان کو دل اور قلب و روح کے کاموں کی اصلاح میں اس کی ضرورت معلوم ہوتی ہے۔

ایک شبہ اور اس کا جواب

اس مقام پر ایک شبہ یہ ہوتا ہے کہ افرادانسانی کے درمیان امن وامان اور اطمینان پیدا کرنے کا کام تو بادشاہ بھی کرتے ہیں' اخلاق کا ایک معلم بھی کرتا ہے' ایک فلسفی اور اجتماعیات کا ایک حکیم بھی کرتا ہے مگر ان کے کاموں کے درمیان جو عظیم الشان فرق ہے اس کو سمجھ لینا ہی اس شبہ کا ازالہ ہے۔ علمی اصطلاح میں یوں سمجھو کہ مختلف فنون کے ماہر' ایک ہی چیز پر مختلف حیثیتوں سے نظر ڈالتے ہیں اور اسی اختلافِ نظر سے ان کا فن بھی علیحدہ علیحدہ ہو جاتا ہے۔ کسی جسم کے اجزائے ترکیبی سے اگر بحث کی جائے تو کیمسٹری ہے' اگر اس کی زندگی اور اسبابِ زندگی پر غور کیا جائے تو بیالوجی (علم الحیات) ہے' اگر اس کے دماغی قویٰ اور ان کے آثار کی تحقیق کی جائے تو سائیکالوجی (علم النفس) ہے اگر اس کے جذبات اور جذبات کے مطابق اس کے شخصی افعال واعمال کے حدود اور ان کے اسباب و علل اور غرض وغایت پر نظر ڈالی جائے تو یہ ایتھکس (فلسفۂ اخلاق) ہے اگر اس کے جماعتی خصائص اور لوازم کی تفتیش کی جائے تو یہ سوشیالوجی (علم اجتماع ومعاشرت) ہے' اگر جسم کی صحت ومرض کے اسباب کی جستجو کی جائے تو یہ طب ہے۔ دیکھو کہ ایک ہی جسم یا متعلقِ جسم پر کتنی حیثیتوں سے بحثیں کی گئی ہیں اور ان سے کتنے مختلف علوم پیدا ہو گئے ہیں۔ تاہم وہ سب کے سب جسم اور جسمانیات ہی سے متعلق اور وابستہ ہیں اور بایں ہمہ ان میں سے ہر ایک علم وفن علیحدہ اور ہر ایک علم وفن کے جاننے والے علیحدہ ہیں۔

اسی طرح ایک نبی اور ایک رسول کا کام بھی بادشاہوں' فلاسفروں اور حکیموں کی طرح انسانوں ہی کی اصلاح ہے مگر ان میں سے کسی ایک کا کام بھی دوسرے سے ملتا جلتا نہیں ہے' بادشاہ صرف اس کا ذمہ دار ہے کہ وہ اپنے زور وقوت سے بازاروں گلیوں' آبادیوں اور میدانوں میں امن وامان اور انصاف کو قائم رکھے۔ فلاسفر انسانوں کے تمام اعمال وخیالات کے اسباب وعلل کی تفتیش اور ان میں نظم وتسلسل اور علت ومعلول کا ربط پیدا کرنے کا کفیل ہے' فلسفۂ اخلاق کے معلم تمہارے اخلاق وعادات کے اسباب وعلل تم کو بتاتے اور ناقابلِ فہم جذبات کی تشریح کرتے ہیں۔ اس سے آگے ان کا کوئی کام نہیں' حکیم اور واعظ تمہارے اعمال واخلاق کی اصلاح کے لیے نہایت شیریں' خوش گوار اور ڈھلے ہوئے فقرے سناتے ہیں' مگر ان میں سے کوئی نہیں جو تمہارے دلوں کا رہنما ہو' جو تمہارے احساس' ارادہ اور اختیار کے قدم کو غلط روی سے روک سکے' وہ نہ صرف تمہارے اخلاق وعادات اور جذبات کے اسباب وعلل بتائے بلکہ تمہارے اخلاق وعادات اور جذبات میں خیر وشر کی تمیز کرے اور خیر کے حصول اور شر سے حفاظت کی تدبیر بتائے بلکہ اس کے ہاتھ اور زبان میں یہ قوت ہو کہ اپنی تعلیم وتلقین وفیضِ صحبت سے تمہارے

اخلاق وعادات وجذبات بلکہ احساس' ارادہ اور اختیار کی غرض وغایت بلکہ پورے دل کی قوتوں میں انقلاب پیدا کردے اور شر کے تخم کو دلوں کی سرزمین سے نکال کر خیر کا برگ وبار پیدا کرے' البتہ نبی یہ تمام کام سرانجام دیتا ہے وہ انسانوں کو ان کے احساس' ارادہ اور اختیار کی بھولی ہوئی ذمہ داری یاد دلاتا ہے اور ان کے قویٰ کے مرکز یعنی دل کو خدا کے حکم سے درست کردیتا ہے۔

وہ بادشاہوں کی طرح صرف بازاروں' مجمعوں اور آبادیوں کا امن واطمینان نہیں چاہتا بلکہ وہ لوگوں کے دلوں کے اندر کا امن واطمینان چاہتا ہے' وہ معلمین اخلاق کی طرح اسباب وعلل کی تلاش وجستجو وتشریح کی پروا نہیں کرتا بلکہ اخلاقِ ببتہ خواہ کسی سبب سے ہوں' وہ ان کی بیخ کنی کرتا ہے اور اخلاقِ حسنہ خواہ وہ کسی علت کے معلول ہوں' وہ ان کو انسانوں کے اندر پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے' وہ انسانی اوہام کے طلسم کو توڑ دیتا ہے اور غلط رسم و رواج کی بندشوں کو کھولتا ہے اور انسانوں کی غلامی سے آزاد کر کے صرف خدا کی غلامی میں دیتا ہے۔

﴿يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ يُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَ يُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَآئِثَ وَ يَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلَالَ الَّتِىْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ﴾ (الاعراف:۱۵۷)

''وہ ان کو بھلائی کا حکم دیتا ہے اور برائی سے روکتا ہے اور اچھائیوں کو ان کے لیے حلال اور خبیث چیزوں کو حرام ٹھہراتا ہے اور ان کے اس بندھن اور زنجیروں کو جو ان پر ہوتی ہیں ان سے اتارتا ہے۔''

﴿رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ﴾ (النساء: ۱۶۵)

''ایسے رسول بھیجے جو نیکوں کو خوش خبری دیتے اور بدکاروں کو ہشیار کرتے ہیں تاکہ رسولوں کے اس وعظ و تذکیر کے بعد پھر انسانوں کو خدا پر الزام دینے کا موقع نہ ملے کہ ہم بھولے تھے تو خدا نے ہم کو کیوں نہ یاد دلایا۔''

﴿لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَ اَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَ الْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ﴾ (الحدید:۲۵)

''ہم نے رسولوں کو کھلی ہدایتیں دے کر بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اتاری اور (عدل کی) ترازو تاکہ لوگ عدل وانصاف پر قائم رہیں اور دنیا میں امن وامان کی زندگی بسر کریں۔''

نوعِ انسانی کے دوسرے تمام خدام اور کارکن اپنے فرائض کو جن اغراض سے انجام دیتے ہیں' ان کا دائرہ موجودہ زندگی کی بھلائی اور برائی سے آگے نہیں بڑھتا مگر انبیا اور رسول نوعِ انسانی کی خدمت کے یہ کام بھی اس کی موجودہ زندگی کی بھلائی اور برائی کو اس لحاظ سے سامنے رکھ کر کرتے ہیں کہ ان کا اثر اس کی دوسری دائمی و پائیدار زندگی پر کیا پڑے گا۔ وہ جسم کی خدمت جسم کے لیے نہیں بلکہ روح کے لیے کرتے ہیں اور مخلوق کی خدمت خالق کے منشا کے مطابق بجالاتے ہیں' وہ صرف ایک مخلوق کو دوسری مخلوق ہی سے نہیں بلکہ مخلوق کو خالق سے اور خالق ہی کے

لیے ایک مخلوق کو دوسری مخلوق سے جوڑتے ہیں۔

وہ صرف اچھی اچھی اور میٹھی میٹھی باتیں لوگوں کو نہیں سناتے' بلکہ خود بہتر سے بہتر عمل کرتے ہیں اور دوسروں کو اس کا عامل بناتے ہیں' وہ خیال آرا شاعروں اور جھوٹے حکیموں کی طرح نہیں ہوتے' جو کہتے ہیں اور کرتے نہیں' دماغ ہوتے ہیں مگر دل نہیں ہوتے' زبانیں ہوتی ہیں مگر ہاتھ نہیں ہوتے۔

﴿وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ ○ اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ ○ وَ اَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ ○﴾ (شعراء:۲۲۴'۲۲۶)

''اور شاعروں کے پیرو کار گم کردہ راہ ہوتے ہیں تم دیکھتے نہیں کہ وہ ہر میدان میں سر مارتے پھرتے ہیں اور وہ وہ کہتے ہیں جو کرتے نہیں۔''

وہ اس دعویٰ کے ساتھ انسانوں میں آتے ہیں کہ ان کے خالق نے جس نے ان کے ذرہ ذرہ کا سامانِ راحت فراہم کیا ہے اور جو ان کے قلب و روح کا سامانِ راحت بھی بہم پہنچاتا ہے' ان کو اس لیے بھیجا ہے کہ انسانوں کے قلب و روح کو اس سامان کا برتنا سکھائیں' اور ان کے رب کا پیغام ان کو سنائیں اور بتائیں کہ وہ یہ چاہتا ہے کہ اس کے بندے اپنے احساس' اپنے ارادہ اور اپنے اختیار کو اس طرح اس عالم میں صرف کریں کہ وہ پریشانی و بے اطمینانی کی تاریکی سے نکل کر سکون و اطمینان اور امن و سعادت کی روشنی میں داخل ہوں۔

﴿هُوَ الَّذِيْ يُنَزِّلُ عَلٰى عَبْدِهٖٓ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ وَ اِنَّ اللّٰهَ بِكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ﴾ (الحدید:۱)

''وہی خدا ہے جو اپنے (رسول) بندے پر کھلی آیتیں اتارتا ہے۔ کہ' تم کو (اے انسانو!) وہ تاریکی سے نکال کر روشنی میں لائے (اور اللہ نے ایسا اس لیے کیا) کہ تم پر شفقت کرنے والا مہربان ہے۔''

انبیا بھی ایک بادشاہ کی طرح جماعتوں کا انتظام کرتے ہیں' مگر ملک کے خراج اور زمین کی آبادی کے لیے نہیں بلکہ خدا کے لیے۔ وہ بھی جان و مال کی حفاظت کے لیے مقنن کی طرح قانون بناتے ہیں اور قاضی کی طرح سزا و جزا کا حکم سناتے ہیں مگر انعام شاہی اور تنخواہ ماہانہ پا کر کسی دنیاوی بادشاہ کے فرمان کی تعمیل کے لیے نہیں' بلکہ جسم و جان کے شہنشاہ اور کائنات کے مالک کے فرمان کی تعمیل میں۔ وہ بھی فلاسفر کی طرح رموز و اسرار کا پردہ فاش کرتے ہیں مگر تجربہ' استقرا اور قیاس سے نہیں' بلکہ عالمِ اسرار کے مبدءِ علم سے فیض پا کر' وہ بھی حکیم و واعظ کی طرح پر تاثیر کلام کرتے ہیں' مگر ان کے مانند اپنے دل سے جوڑ کر نہیں بلکہ خدا سے سن کر' اور وہ صرف کہتے نہیں' بلکہ جو کہتے ہیں وہ کرتے ہیں' وہ دوسروں سے کراتے ہیں وہ خدا سے ہیں' خدا سے پاتے ہیں اور اسی سے سنتے ہیں اور وہی اوروں کو سناتے ہیں۔ غرض اوپر آسمان سے ان کو جو کچھ ملتا ہے وہی نیچے زمین پر سب کو بانٹتے ہیں۔

﴿وَ النَّجْمِ اِذَا هَوٰى ○ مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى ○ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ○ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ○ عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى ○ ذُوْ مِرَّةٍ فَاسْتَوٰى ○ وَهُوَ بِالْاُفُقِ

الْاَعْلٰی ○﴾ (النجم:۱۔۷)

''قسم ہے اس ستارہ کی جب وہ نیچے گرے کہ تمہارا ساتھی (پیغمبر) نہ بھولا' نہ بھٹکا اور نہ نفس کی خواہش سے بات کرتا ہے وہ تو وہ ہے جو اس کو وحی کے ذریعہ کہا جاتا ہے' اس کو بڑی بڑی قوتوں والے ہی نے سکھایا طاقت والا' تو وہ سیدھا ہوا۔ درآنحالیکہ وہ آسمان کے سب کے اوپر کناروں میں تھا۔''

﴿فَاَوْحٰٓی اِلٰی عَبْدِہٖ مَآ اَوْحٰی ○ مَا کَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰی ○ اَفَتُمٰرُوْنَہٗ عَلٰی مَا یَرٰی ○﴾ (النجم:۱۰۔۱۲)

''تو اس نے اپنے بندہ پر وحی کی جو وحی کی' نہ اس کے دل نے جو اس نے دیکھا' اس کو جھوٹ کہا' کیا وہ جو دیکھتا ہے تم اس پر اس سے جھگڑتے ہو''۔

﴿مَازَاغَ الْبَصَرُ وَ مَا طَغٰی ○ لَقَدْ رَاٰی مِنْ اٰیٰتِ رَبِّہِ الْکُبْرٰی﴾ (النجم:۱۷۔۱۸)

''نہ بینائی نے کجی کی اور نہ سرکشی کی' اس نے اپنے رب کی بڑی بڑی نشانیوں میں سے دیکھا۔''

﴿قُلْ اِنَّمَآ اَتَّبِعُ مَا یُوْحٰٓی اِلَیَّ مِنْ رَّبِّیْ ھٰذَا بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّکُمْ وَ ھُدًی وَّ رَحْمَۃٌ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ﴾ (الاعراف:۲۰۳)

''کہہ دے (اے پیغمبر!) کہ میں تو اسی کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر میرے رب کی طرف سے وحی کی جاتی ہے' یہ (اے انسانو!) تمہارے رب کی طرف سے بصیرتیں ہیں' اور ان کے لیے جو ایمان رکھتے ہیں' ہدایت اور رحمت ہیں۔''

﴿وَ اِنَّہٗ لَتَنْزِیْلُ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○ نَزَلَ بِہِ الرُّوْحُ الْاَمِیْنُ ○ عَلٰی قَلْبِکَ لِتَکُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِیْنَ ○ بِلِسَانٍ عَرَبِیٍّ مُّبِیْنٍ ○﴾ (الشعراء:۱۹۲'۱۹۵)

''یہ تو عالم کے پرورش کرنے والے کی طرف سے اتارا گیا ہے اس کو امانت والی روح نے تیرے دل پر اتارا تاکہ تو ہشیار کرنے والوں میں سے ایک ہو' فصیح عربی زبان میں۔''

نکتہ: بالکل ممکن' بلکہ واقعہ ہے کہ ایک ہی قسم کا کام مختلف لوگ مختلف غرض و نیت سے کرتے ہیں' کسی قوم کی اصلاح ہی کا کام ہے کہ اس کو مختلف لوگ مختلف غرض و نیت سے کرتے ہیں' خود غرضی کے غیر مخلصانہ اغراض سے قطع نظر کر کے صرف مخلصانہ اغراض کو لو۔ کوئی یہ سمجھتا ہے کہ قوم کی مالی حالت کی درستی سے قوم بن سکتی ہے' کوئی اصلاح کی جڑ تعلیم کو قرار دیتا ہے کوئی رسم و رواج و معاشرت پر زور دیتا ہے' کوئی ظاہری تمدن پر مدار رکھتا ہے' کوئی جسمانی قوت پر بھروسہ رکھتا ہے' کوئی سیاسی کامیابی کو قومی اصلاح کا مرکز ٹھہراتا ہے لیکن انبیاؑ کے نزدیک یہ سب ثانوی درجہ کی باتیں ہیں' وہ اپنی بنیاد صرف قلب کی اصلاح پر رکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہی اصل چیز ہے اور تمام دوسری ترقیوں اور اصلاحوں کو وہ یکسر اسی ایک اصل کی فروع اور اسی ایک جڑ کی شاخیں جانتے ہیں۔

یہی سبب ہے کہ ان کی دعوت کی کامیابی سے قوموں کو سلطنت بھی ملتی ہے' دولت بھی ہاتھ آتی ہے' علم بھی

حاصل ہوتا ہے زور اور قوت بھی پیدا ہوتی ہے اور دنیاوی عظمت وجلال کا ہر منظر خادمانہ اس کے استقبال کے لیے آگے بڑھتا ہے۔ مگر یہ خوب سمجھ لینا چاہیے کہ سیاسی مصلحین کی طرح قوت وطاقت ان کا مطمح نظر نہیں ہوتی بلکہ جو کچھ ان کے سامنے ہوتا ہے وہ صرف خدا کی اطاعت' خدا کی محبت خدا کی خوشنودی ہوتی ہے اور باقی تمام چیزیں ان کی نگاہ میں فرعی' ثانوی اور ضمنی ہوتی ہیں۔

نبی اور غیر نبی کے امتیازات

سطورِ بالا سے ہویدا ہے کہ انبیا اور ان کے مشابہ اشخاص میں کتنا عظیم الشان فرق ہے۔ یہ فرق چار حیثیتوں سے نمایاں ہے' مبدا اور منبع کا فرق' غرض وغایت کا فرق' طریقِ دعوت کا فرق اور علم وعمل کا فرق۔ نبی کے علم کا مبدا' منبع' ماخذ اور سرچشمہ جو کچھ کہو وہ تعلیمِ ربانی' شرحِ صدر اور وحی والہام ہوتا ہے اور حکیم کے علم کا ماخذ ومنبع تعلیم انسانی' گزشتہ تجربہ' استقراء اور قیاس ہوتا ہے یعنی حکیم عقل سے جانتا ہے اور نبی خالقِ عقل سے' اسی طرح ایک حکیم کے تمام اقوال اور جدوجہد کا منشا اپنی شہرت طلبی' علم کا اظہار' قوم یا ملک کی محبت کی خاطر اس کی اصلاح ہوتا ہے۔ مگر ایک نبی کا مقصد خدا کے حکم کا اعلان اور خالق کی رضامندی کے لیے مخلوق کی بھلائی ہوتا ہے۔ طریق دعوت کا فرق یہ ہوتا ہے کہ حکیم اپنی دعوت کی عمارت کو تمام تر حکمتوں' مصلحتوں اور علل واسباب کے ستونوں پر کھڑا کرتا ہے' لیکن نبی اپنی دعوت کو زیادہ تر خالق کی اطاعت' محبت اور رضاجوئی پر قائم کرتا ہے۔ حکیم کہتا ہے لیکن اس کا کرنا اس کے لیے ضروری نہیں' نبی جو کہتا ہے وہ کرتا ہے اور اس کا کر کے دکھانا اس کے لیے ضروری ہے' وہ صرف جلوت کے منبر پر جلوہ نما نہیں ہوتا بلکہ وہ جلوت وخلوت اور ظاہر وباطن میں یکساں حسنات سے آراستہ اور برائیوں سے پاک ہوتا ہے' دنیا میں سقراط' افلاطون' ارسطو' دیوجانس وغیرہ ایک طرف اور ابراہیمؑ' موسیٰ علیہ السلام اور محمد ﷺ دوسری طرف ہیں اور دونوں کے سوانح اور سیرتیں اور کارنامے بالکل نمایاں اور ایک دوسرے سے اس طرح ممتاز ہیں کہ ان میں ذرا التباس نہیں۔

بادشاہ اپنی تلوار کے زور اور اپنی فوج ولشکر کی قوت سے رعایا کو اپنے قانون کا پابند بناتے ہیں تاکہ فتنہ وفساد رک جائے۔ فلاسفر اپنے دعووں کو صرف استدلال کی قوت اور عقل کے خطاب سے ثابت کرنا چاہتے ہیں تاکہ ان کی بات لوگ تسلیم کریں۔ لیکن پیغمبر اپنے پیروؤں کے قلب کو اس طرح بدل دینا چاہتے ہیں کہ وہ از خود برائی کو چھوڑ کر نیکی اختیار کرلیں' وہ اگر کبھی قانون وحدوسزا کو اختیار کرتے ہیں یا ساتھ ساتھ عقل کو بھی مخاطب کرتے ہیں تو ان کا یہ ضمنی یا ثانوی کام ہوتا ہے' اولین نہیں' ان کی اولین غرض یہ ہوتی ہے کہ ان کے پیروؤں کو خدا کی قدرت اور اس کے حاضر وناظر ہونے کا اتنا محکم اور پختہ یقین ہوجائے کہ وہ اس کے حکموں اور نصیحتوں کو جوان کے ذریعہ آتی ہیں' بے چون وچرا تسلیم کرلیں۔

دنیا کے بادشاہ اور فاتح اور کشور کشا اپنے زور بازو اور تلوار کی قوت سے دنیا کے طبقے الٹ دیتے ہیں' انہوں

نے کبھی کبھی چار دانگِ عالم پر حکمرانی کی' قوموں کی جان و مال پر اپنا قبضۂ اقتدار جمایا' ان کی تلوار کی دھاک نے آبادیوں اور مجمعوں کے مجرموں کو روپوش کر دیا اور بازاروں اور راستوں میں امن و امان پیدا کر دیا' لیکن کیا انہوں نے دلوں کے طبقے بھی الٹے' اپنی سلطنت کے دائرہ سے باہر کسی کمزور سے کمزور انسان سے اپنے حکم منوا سکے' وہ لوگوں کے دلوں کو بھی اپنے قبضۂ اقتدار میں لا سکے؟ وہ آبادیوں اور مجمعوں کے روپوش مجرموں کو بھی فنا کر سکے؟ وہ دلوں کی بستیوں میں بھی امن و امان پیدا کر سکے' وہ روحوں کی مملکتوں کا بھی نظم و نسق قائم کر سکے۔

حکما اور فلاسفر جو اپنی عقلِ رسا کے ذریعہ سے عجائباتِ عالم کی طلسم کشائی اور کائنات کے مخفی اسرار کے فاش کرنے کے مدعی ہیں' کیا وہ قلب و روح کے عجائبات کو بھی دریافت کر سکے' وہ ماورائے مادہ اسرار و رموز کو بھی حل کر سکے؟ وہ انسانوں کی اصلاح و ہدایت کا بھی کوئی سامان اپنی تحقیق و تفتیش سے فراہم کر سکے؟ ان کی دقیق نکتہ سنجیوں اور خیال آرائیوں کے پیچھے ان کے ذاتی حسن عمل کا بھی کوئی نمونہ ہے؟ ارسطو نے فلسفۂ اخلاق کی بنیاد ڈالی۔ دوسرے حکما نے اخلاق کے اسباب و علل کے حدود' ظہورِ اثر اور نتیجہ کے ایک ایک حرف کی تحقیق کی مگر کیا اس سے کسی انسان کے دل سے برائی کا تخم دور ہوا؟ اچھائی کے بیج نے نشو و نما پائی؟ ان کے اخلاق و تعلیمات کے فلسفیانہ رموز و اسرار کا دائرہ ان کی درس گاہوں کی چہار دیواریوں سے کبھی آگے بڑھ سکا؟ کیونکہ وہ اپنے درس کے کمروں سے نکل کر جب انسانی صحبتوں میں داخل ہوتے ہیں تو ان کی اخلاقی زندگی اور قلبی صفائی عام انسانی افراد سے ایک انچ بھی بلند نہیں ہوتی' حکمائے یونان میں سقراط سے بڑھ کر کوئی نہیں۔ مگر کیا یہ وہی نہیں ہے جو بازار کی فاحشہ عورتوں سے ارتباط رکھتا تھا اور ان میں ایک پیشہ ور کے فروغ اور کامیابی کے لیے کوشاں رہتا تھا۔ یہی یونان کے دوسرے حکما کا حال تھا اور توحید پرستی کا درجہ تو اس سے بدرجہا بلند ہے جس کی ان کو ہوا بھی نہیں لگی تھی۔

ان سطروں سے اندازہ ہوا ہوگا کہ ہر شیریں نوا واعظ' ہر مؤثر بیان خطیب' ہر دقیقہ رس' ہر کشور کشا فاتح اور ہر نکتہ داں حکیم اس لائق نہیں کہ نبوت و رسالت کا اہم اور بلند اور مقدس منصب اس سے منسوب کیا جائے۔ اس منصب کے ساتھ کچھ ایسے شروط' لوازم اور خصوصیات بھی وابستہ ہیں' جو اس کے ضروری اجزا اور عناصر ہیں۔

(۱) سب سے پہلی بات یہ ہے کہ اس کا تعلق پر اسرار عالمِ غیب سے ہو وہ عالمِ غیب کی آوازیں سنتا ہو' غیب کی چیزیں دیکھتا ہو' غیب سے علم پاتا ہو' عالمِ ملکوت کی تائید اس کے ساتھ ہو' روح القدس اس کا ہم سفیر و ہمنوا ہو۔

(۲) اللہ تعالیٰ نے اس کو تمام بندوں میں سے اس کے لیے چنا ہو کہ وہ اس بلند منصب پر سرفراز ہو۔

(۳) اس سے خدا کے حکم سے عجیب و غریب اور حیرت انگیز تصرفات صادر ہوں۔ جن سے اس کا مقبولِ بارگاہ ہونا ثابت ہو۔

(۴) فضائلِ اخلاق کے پھولوں سے اس کا دامن بھرا ہو' اور ہر قسم کے گناہ کے خس و خاشاک سے پاک و صاف ہو کہ گندے ہاتھوں سے میلے کپڑے پاک و صاف نہیں ہو سکتے۔

(۵) وہ لوگوں کو خدا اور عالمِ غیب پر یقین کی دعوت اور فضائل و اخلاق کی تعلیم دے اور روزِ الست کا بھولا ہوا

عہد ان کو یاد دلائے۔

(۶) نہ صرف تعلیم' بلکہ اس میں یہ قوت ہو کہ وہ شریروں کو نیک اور گمراہوں کو راست رو بنا دے اور جو خدا سے بھاگتے ہوں ان کو پھیر کر پھر اس کے آستانہ پر لے آئے۔

(۷) اپنے سے پہلے خدا کی طرف سے آئے ہوئے صحیح اصول کو انسانی تصرفات سے پاک وصاف کر کے پیش کرے۔

(۸) اس کی دعوت' جدوجہد اور تعلیم وتلقین سے مقصود کوئی دنیاوی معاوضہ' شہرت' جاہ طلبی' دولت مندی' قیامِ سلطنت وغیرہ نہ ہو' بلکہ صرف خدا کے حکم کی بجا آوری اور خلقِ خدا کی ہدایت ہو۔

یہ نبوت ورسالت کے وہ اوصاف اور لوازم ہیں جو دنیا کے تمام پیغمبروں میں یکساں پائے جاتے ہیں' مذاہب عالم کے صحیفوں پر ایک نظر ڈالنے سے یہ حقیقت منکشف اور آشکارا ہو جاتی ہے' خصوصاً قرآن پاک نے جو دنیا میں نبوت کا سب سے آخری اور سب سے مکمل صحیفہ ہے اور جس نے نبوت ورسالت کی حقیقت اور شرائط و لوازم کی سب سے بہتر تشریح کی ہے سورۂ انعام میں اکثر پیغمبروں کا ذکر کر کے یہ حقائق ان الفاظ میں بیان کیے ہیں۔

﴿وَ تِلْکَ حُجَّتُنَآ اٰتَیْنٰهَآ اِبْرٰهِیْمَ عَلٰی قَوْمِهٖ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ اِنَّ رَبَّکَ حَکِیْمٌ عَلِیْمٌ ○ وَ وَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَ یَعْقُوْبَ کُلًّا هَدَیْنَا وَ نُوْحًا هَدَیْنَا مِنْ قَبْلُ وَ مِنْ ذُرِّیَّتِهٖ دَاوٗدَ وَ سُلَیْمٰنَ وَ اَیُّوْبَ وَ یُوْسُفَ وَ مُوْسٰی وَ هٰرُوْنَ وَ کَذٰلِکَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ ○ وَ زَکَرِیَّا وَ یَحْیٰی وَ عِیْسٰی وَ اِلْیَاسَ کُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِیْنَ ○ وَ اِسْمٰعِیْلَ وَالْیَسَعَ وَ یُوْنُسَ وَ لُوْطًا وَ کُلًّا فَضَّلْنَا عَلَی الْعٰلَمِیْنَ ○ وَ مِنْ اٰبَآئِهِمْ وَ ذُرِّیّٰتِهِمْ وَ اِخْوَانِهِمْ وَاجْتَبَیْنٰهُمْ وَ هَدَیْنٰهُمْ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ○ ذٰلِکَ هُدَی اللّٰهِ یَهْدِیْ بِهٖ مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَلَوْ اَشْرَکُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَّا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ○ اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْکِتٰبَ وَ الْحُکْمَ وَالنُّبُوَّةَ فَاِنْ یَّکْفُرْ بِهَا هٰٓؤُلَآءِ فَقَدْ وَکَّلْنَا بِهَا قَوْمًا لَّیْسُوْا بِهَا بِکٰفِرِیْنَ ○ اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ هَدَی اللّٰهُ فَبِهُدٰهُمُ اقْتَدِهْ قُلْ لَّآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْهِ اَجْرًا اِنْ هُوَ اِلَّا ذِکْرٰی لِلْعٰلَمِیْنَ ○﴾

(الانعام: ۸۴۔۹۰)

اور یہ تھی ہماری دلیل جو ہم نے ابراہیم کو اس کی قوم کے مقابلہ میں دی۔ ہم جس کو چاہتے ہیں کئی درجے بلند کرتے ہیں' بے شبہ تیرا پروردگار تدبیر والا خبردار ہے اور ہم نے ابراہیمؑ کو اسحاقؑ اور یعقوبؑ بخشے اور ہر ایک کو ہدایت دی اور نوحؑ کو اس سے پہلے ہدایت دی تھی اور اس کی اولاد میں داؤدؑ اور سلیمانؑ اور ایوبؑ اور یوسفؑ اور موسیٰ علیہ السلام اور ہارونؑ کو اور اسی طرح ہم نیکوکاروں کو بدلہ دیتے ہیں اور زکریاؑ اور یحییٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام اور الیاسؑ کو کہ ہر ایک نیکوکاروں میں سے ہے اور اسمٰعیلؑ اور الیسعؑ اور یونسؑ

اور لوطؑ کو ہر ایک کو بزرگی بخشی' دنیا والوں پر اور ان کے باپ دادوں اور بھائیوں میں سے' اور ہم نے ان کو چن کر پسند کیا اور ان کو سیدھی راہ پر چلایا' یہ اللہ کی ہدایت ہے اس پر وہ جس کو چاہے چلاتا ہے' اگر وہ شرک کرتے تو ان کا سارا کیا برباد ہو جاتا۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کو ہم نے کتاب اور حق و باطل میں فیصلہ کرنا (حکم) اور نبوت دی تو اگر کوئی ان باتوں کا انکار کرے تو ہم نے ان باتوں پر ایسے دوسرے کو مقرر کیا ہے جو ان کا انکار نہیں کرتے' یہی وہ لوگ ہیں جن کو ہم نے ہدایت دی' اے محمد (ﷺ)؟ تو بھی انہی کی راہنمائی کی پیروی کر اور کہہ میں اپنے کام کی تم سے مزدوری نہیں چاہتا' یہ قرآن تو دنیا والوں کو یاددہانی ہے۔"

ان آیتوں میں اکثر پیغمبروں کے نام لے کر ان کے پیغمبرانہ اوصاف گنائے ہیں' اگر ہم ان کو یکجا کر دیں تو نبوت و رسالت کے عام اوصاف' خصوصیات اور لوازم واضح ہو جائیں۔

(۱) فرمایا۔ "ہم نے ابراہیم کو دلیل دی اور ہم نے ان کو ہدایت بخشی۔" جس سے معلوم ہوا کہ ان کے علم اور ہدایت کا سرچشمہ عالمِ ملکوت سے ہوتا ہے۔

(۲) ارشاد ہوا کہ "ہم نے ان کو سیدھی راہ چلایا اور یہ سب نیکوکار تھے۔" اس سے ثابت ہوا کہ وہ معصوم اور گناہوں سے بے داغ ہوتے ہیں۔

(۳) یہ بھی کہا کہ "ہم نے ان کو چن کر پسند کیا اور اپنے بندوں میں سے جس کو چاہیں یہ ہدایت عطا کریں۔" جس سے یہ مقصود ہے کہ یہ منصب سعی و محنت سے نہیں بلکہ خدا کی مرضی اور انتخاب سے ملتا ہے۔

(۴) فرمایا کہ "ہم نے ان کو کتاب' حق و باطل کے فیصلہ کی طاقت (حکم) اور احکام غیب کی تعلیم (نبوت) دی' اس سے معلوم ہوا کہ ان منصب والوں کو کیا کیا چیزیں عطا ہوتی ہیں۔

(۵) حکم ہوا کہ "ان کی رہنمائی کی پیروی کر۔" اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کی رہنمائی اور دعوت پر مامور ہوتے ہیں اور لوگ ان کی پیروی سے نیکوکار اور صالح بنتے ہیں۔

(۶) فرمایا کہ "اے پیغمبر! یہ کہہ دے کہ میں اپنے کام کا کوئی معاوضہ یا بدلہ تم سے نہیں چاہتا۔ یہ تو اہل دنیا کے لیے نصیحت اور یاد دلانا ہے اس سے ثابت ہوا کہ خالق کی خوشنودی اور اس کے ذریعہ سے مخلوق کی خیر خواہی کے علاوہ ان کا کوئی دوسرا مقصد اور مطمحِ نظر نہیں ہوتا۔

دوسرے انبیا کرام علیہم السلام کے علاوہ خاص محمد رسول اللہ ﷺ کے تعلق و نسبت سے ان حقیقتوں کو قرآن پاک نے کئی دفعہ بتصریح بیان کیا ہے' جن میں سے چار باتیں سب سے زیادہ نمایاں ہیں۔

(۱) اشیائے غیب' امورِ خیر اور فلاح و سعادت کے اسباب پر اس کا علم خدا کی تعلیم سے کامل ہو۔

(۲) وہ اپنے علم کے مطابق اپنے عمل میں کامل اور راست باز ہو۔

(۳) وہ دوسروں کو ان امور کی تعلیم دیتا ہو۔

(۴)اوران کوبھی اپنی تعلیم اورصحبت کے فیض سے حسبِ استعداد کامل بناتا ہو۔قرآن پاک میں متعدد موقعوں پرآپ کی نسبت یہ فرمایا گیا:

﴿یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَ یُزَكِّیْهِمْ وَ یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ﴾ (البقرہ والجمعہ:۲)

''وہ رسول ان پڑھوں کوخدا کی باتیں سناتا اوران کو پاک وصاف بناتا' اوران کوکتاب وحکمت سکھاتا ہے۔''

اس مختصرسی آیت میں ان چاروں مذکورہ بالا امورکو یکجا ذکر کیا ہے' جاہلوں کوآیات الٰہی پڑھانے اور کتاب و حکمت سکھانے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ خود اس کوآیاتِ الٰہی پڑھائی اور کتاب وحکمت سکھائی گئی ہوں اور دوسروں کو پاک وصاف بنانے کے لیے ضروری ہے کہ خود پاک وصاف ہو' کہ ایک جاہل اپنے ہی جیسے دوسرے جاہل کوعالم' اورایک ناپاک اپنے ہی جیسے دوسرے ناپاک کو پاک نہیں بنا سکتا' ایک دوسری آیت میں ہے۔

﴿سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰۤى ○ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ اِنَّهٗ یَعْلَمُ الْجَهْرَ وَ مَا یَخْفٰى ○ وَ نُیَسِّرُكَ لِلْیُسْرٰى ○ فَذَكِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى ○ سَیَذَّكَّرُ مَنْ یَّخْشٰى ○ وَ یَتَجَنَّبُهَا الْاَشْقَى ○﴾ (الاعلیٰ:۶۔۱۱)

''ہم تجھے پڑھائیں گے تو تو نہیں بھولے گا۔مگر جواللہ چاہے' وہ جانتا ہے پکاراور چھپا' اور ہم تجھے آہستہ آہستہ آسانی تک پہنچائیں گے' اورتو سمجھا' اگر تیرا سمجھانا فائدہ دے جس کوخدا کا لحاظ ہوگا' وہ سمجھے گا اور جو بدبخت ہوگا وہ اس سے پرہیز کرے گا۔''

ایسا پڑھانا جس میں بھول نہ ہو' پیغمبر کی روحانی تعلیم ہے اور آسانی کی منزل کی طرف اس کوآہستہ آہستہ لے چلنا اوراس کے لیے اس کٹھن منزل کوآسان کردینا اس کے ذاتی عمل کوکمال کے درجہ تک اس طرح پہنچا دینا ہے کہ تمام امورِ خیر اس سے بسہولت ازخود صادر ہونے لگیں' پھر اس کو دنیا کے ''سمجھانے'' پر مامور کرنا' اس رمز کو آشکارا کرنا ہے کہ دوسروں کی تعلیم وتذکیر کا منصب اس کوملا ہے' اس کے بعد یہ فرمانا کہ ''متقی اس نصیحت سے فیض پائیں گے' اور بدبخت محروم رہیں گے۔'' اس کی تشریح یہ ہے کہ ناقصوں کی تکمیل اورذی استعداد لوگوں کوان کی استعداد کے مطابق پہنچانا بھی اس کا فرض ہے۔(۱)

نبوت کے لوازم اور خصوصیات

نبوت کی شرحِ حقیقت اوراس کے لوازم اور خصوصیات کے اجمالی بیان کے بعد ضرورت ہے کہ نبوت کی چند اہم خصوصیات پر تفصیل سے گفتگو کی جائے تا کہ وقت کی بہت سی غلط فہمیوں کا سدباب ہو' لیکن ان خصوصیات کے ذکر سے پہلے خود ہم کو ''خصوصیت'' کو سمجھنا ہے کہ اس سے مقصود کیا ہے۔

(۱) یہ تشریح اورطریقہ استدلال امام رازی نے اپنی تفسیر اور بعض کتب کلامیہ میں اختیار کیا ہے۔

دنیا میں ہر نوع اور ہر نوع کے ماتحت ہر صنف میں کچھ نہ کچھ مخصوص صفات ہوتی ہیں' یہ مخصوص صفات اس نوع اور صنف کے ہر فرد میں یکساں پائی جاتی ہیں' ان ہی کو ہم لوازم اور خصوصیات کہتے ہیں' پھل پھول' چوپائے' پرندے' انسان تمام انواع میں کچھ نہ کچھ ایسی خصوصیات ہیں جو دوسروں میں نہیں پائی جاتیں اور انہی خصوصیات کی بنا پر ہر نوع دوسری نوع سے ممتاز اور ہر صنف دوسری صنف سے علیحدہ ہے' گلاب میں خاص قسم کا رنگ' خاص قسم کی خوشبو اور خاص قسم کے پتے ہوتے ہیں' یہ ناممکن ہے کہ کوئی گلاب ہو اور اس میں یہ چیزیں نہ پائی جائیں' لیکن گلاب کی بھی مختلف صنفیں ہیں' اور ان میں سے ہر ایک میں کچھ ایسی لازمی صفات ہوتی ہیں' جن سے گلاب کی ہر صنف (قسم) دوسری صنف (قسم) سے علانیہ الگ نظر آتی ہے۔

اسی طرح انسانیت کے کچھ خاص لوازم ہیں' دو ہاتھ' دو پاؤں' سیدھا قد' بولنے کی طاقت' سمجھ بوجھ اور غور و فکر کی اہلیت' ایجاد و اختراع کی قوت' انجام بینی اور مآل اندیشی کی صلاحیت وغیرہ اس کے خواص ہیں اور جس طرح شہد میں مٹھاس' حنظل میں کڑواپن' آگ میں گرمی اور برف میں ٹھنڈک' نوعی خواص کی حیثیت سے خود بخود پیدا ہو گئی ہیں۔ اسی طرح انسان میں انسانیت کی مذکورہ بالا خاصیتیں فطرۃً ودیعت ہیں لیکن اس وصفِ انسانیت میں اشتراک کے ساتھ گلاب کے اصناف کی طرح نوعِ انسانی کے بھی مختلف اصناف ہیں جیسے ہندی' چینی' حبشی' رومی' ایشائی' یورپین' دیکھو کہ ان میں ہر ایک صنف میں انسانیت کے اشتراک کے باوجود قد و قامت' چہرہ مہرہ' رنگ و روغن' صورت شکل' اخلاق و عادات وغیرہ بیسیوں چیزوں کا نمایاں امتیاز ہوتا ہے اور یہ تمام انسانی اصناف جو مختلف آب و ہوا' مختلف مرز و بوم' مختلف نسل اور مختلف ماحول سے تعلق رکھتے ہیں' انسان ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے صریحاً ممتاز ہیں۔

اسی طرح ہر صنف انسانی کے اندر مختلف افراد ہیں' خلاق فطرت نے ان میں سے ہر ایک کو مختلف قابلیتیں عطا کی ہیں' شاعری' زبان دانی' فلسفہ' ریاضی' صناعی' باغبانی' معماری' پہلوانی' سینکڑوں مختلف قسم کی انسانی استعداد کی خصوصیتیں دوسروں سے الگ ہیں' ایک تخیل پسند شاعر اور ایک حقیقت شناس ریاضی دان میں عظیم الشان فرق ہوتا ہے' ادب و انشا کے خیالی بلند پرواز' عموماً ریاضیات جیسے ٹھوس اور واقعی علوم سے کورے ہوتے ہیں اور واقعیات سے لبریز ریاضیات کے جاننے والے' ادب و شاعری سے بیگانہ' پہلوانی کے جوہر باغبانی سے الگ ہیں' اور ایک صناع کی طبیعت ایک فلسفی سے متضاد ہوتی ہے۔

اسی کے ساتھ صنفِ شعراء میں خاص دماغی قابلیت کا اتحاد ہوتا ہے' نظم کی قوت' تخیل کی بلندی' محاکات کی قدرت' الفاظ کا زور' معانی کا جوش' یہ تمام شعرا کی مخصوص صفات ہیں' اسی طرح تمام فلسفیوں کی ایک خاص دماغی کیفیت ہوتی ہے' خاموشی' غور و فکر' دقتِ نظر' خارجی عالم سے بے پروائی' تصور میں انہماک' خلوت گزینی' اخلاق کی خشکی' الغرض مرز و بوم اور آب و ہوا کے اختلاف کی بنا پر جو اصنافِ انسانی پیدا ہوتے ہیں' ان میں بھی یہ اختلاف و امتیاز نظر آتا ہے' ہنی بال و نپولین' تیمور و چنگیز' دم کے دم میں آبادی کو ویرانہ اور ویرانہ کو آبادی' پہاڑ کو میدان اور

میدان کو پہاڑ بنا سکتے تھے مگر وہ بیٹھ کر فلسفۂ اخلاق پر چند صفحے نہیں لکھ سکتے تھے افلاطون تنہائی میں بیٹھ کر جمہوریت کا فلسفیانہ خاکہ تیار کر سکتا تھا مگر ایتھنز کے تخت پر بیٹھ کر ایک لمحہ حکمرانی کا فرض انجام نہیں دے سکتا تھا۔ سلطان محمود کے درباری شاعر فردوسی نے اپنی طبیعت کے زور سے سینکڑوں خیالی سومنات کے معرکے فتح کیے لیکن پتھر کی ایک چٹان پر کلہاڑی نہ مار سکا' اس کے برخلاف سلطان محمود فوجوں کے دل کے ساتھ پہاڑوں کو چیرتا' دریاؤں کو پھاڑتا اور ریگستانوں میں پانی بہاتا ہوا غزنی سے چل کر گجرات کے کناروں تک پہنچ گیا اور سومنات کے سنگی قلعہ اور مجسمہ کو چکنا چور کر ڈالا مگر فردوسی کی طرح تنہا بیٹھ کر وہ خیالی شاہنامہ کا ایک معرکہ بھی فتح نہیں کر سکتا تھا۔

ان مثالوں سے یہ ثابت ہے کہ نوعِ انسانی میں اشتراک ہونے کے باوجود اصنافِ انسانی کی ہزاروں قسمیں ہیں اور ان میں سے ہر قسم وصنف کے الگ الگ خصوصیات' صفات اور لوازم ہیں' انہی مختلف اصنافِ انسانی میں انبیاء علیہم السلام کی بھی ایک صنف ہے اور نوعِ انسانی کی اس مقدس صنف کے بھی چند خاص اوصاف' خصوصیات اور لوازم ہیں' جو ان کو دوسرے اصناف انسانی سے علانیہ ممتاز بناتے ہیں۔

اس تمہید کے بعد اب ہم کو اس مسئلہ کی طرف توجہ کرنی چاہیے کہ نبوت ورسالت کے اہم لوازم اور خصوصیات کیا ہیں۔

وہبی استعداد

ان میں سے سب سے پہلی چیز وہبی استعداد ہے' اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ مختلف انسانوں میں مختلف قسم کی فطری استعدادیں پائی جاتی ہیں' اور انہی کی طرف ان کا طبعی میلان ہوتا ہے اور جیسے جیسے وہ آگے بڑھتے جاتے ہیں' ان کی استعداد اور میلانِ طبع کا جوہر برگ وبار پیدا کرنے لگتا ہے یہاں تک کہ ایک خاص مقررہ مدت میں جا کر وہ پوری طرح ظاہر ہو جاتا ہے جس طرح ہر درخت سے آم کا پھل پیدا نہیں ہو سکتا' بلکہ اسی سے ہو گا... جس کو خدا نے آم کا درخت بنایا ہے پھر آم کے درخت کے آثار' خواص' پھل' اس کا مزہ' اس کا رنگ وبو غرض جملہ خصوصیات خود اس درخت میں اسی وقت موجود ہوتے ہیں جب وہ ہنوز تخم کی صورت میں ہوتا ہے وہی تخم پودا بنتا ہے' پودا بڑھتا ہے' کونپل اور شاخیں پیدا کرتا ہے اور چند سال میں پھل دینے لگتا ہے لیکن اپنی ترقی کے ہر دور میں وہ اپنے مخفی خصوصیات وہی رکھتا ہے جو ایک دن اس سے آخر میں ظاہر ہونے والی ہیں اور اس پھل کی صفت ہمیشہ اس میں بالقوہ موجود تھی۔

اسی تمثیل کے مطابق سمجھنا چاہیے کہ ہر انسان کوشش سے نبی نہیں ہو سکتا' بلکہ وہی ہو سکتا ہے جس کو خدا نے نبی بنایا ہے اور نبوت کے یہ آثار' خواص اور کیفیات اس میں بالقوہ اور استعداد کی صورت میں اسی وقت سے موجود رہتے ہیں جب وہ ہنوز آب وگل کے عالم میں ہوتا ہے' شاید آنحضرت ﷺ کے ارشاد کا کہ میں اس وقت نبی تھا جب آدمؑ ہنوز آب وگل میں تھے۔ (۱) اسی قسم کا مطلب ہو گا۔

(۱) جامع ترمذی مناقب نبوی' مستدرک حاکم مناقب محمدی ج دوم ص ۶۰۰ حیدر آباد۔

انبیائے کرام علیہم السلام کی سیرتوں پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جب سے وہ عرصۂ وجود میں قدم رکھتے ہیں' اسی زمانہ سے آنے والے وقت اور ملنے والے منصب کے آثار ان سے ظاہر ہونے لگتے ہیں' وہ حسب و نسب اور سیرت وصورت میں ممتاز ہوتے ہیں' شرک وکفر کے ماحول میں ہونے کے باوجود اس کی گندگی سے بچائے جاتے ہیں' اخلاق حسنہ سے آراستہ ہوتے ہیں ان کی دیانت' امانت' سچائی راست گفتاری مسلم ہوتی ہے اور یہ تمہیدیں اس لیے ہوتی ہیں تاکہ منصب ملنے کے بعد' ان کے دعوائے نبوت کی تصدیق اور لوگوں کے میلانِ خاطر کا سامان پہلے ہی سے موجود رہے۔ حضرت ابراہیمؑ' حضرت اسمٰعیلؑ' حضرت اسحاقؑ' حضرت یوسفؑ' حضرت موسیٰ علیہ السلام' حضرت سلیمانؑ' حضرت یحییٰؑ' اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے حالات و واقعات قبلِ نبوت پڑھو تو ہمارے اس دعویٰ کی سچائی تم کو نظر آئے گی' حضرت ابراہیمؑ کا نبوت پانے سے پہلے ہی سے آسمان وزمین کے خالق کی تلاش' سورج' چاند اور ستاروں پر متفکرانہ نظر اور بت پرستی کے خلاف نفرت کا شدید جذبہ کس بات کی شہادت ہے۔ حضرت اسمٰعیلؑ کا بے آب وگیاہ میدان میں پرورش پانا' چاہِ زم زم کا ظہور' آنے جانے والے قافلوں کا اس کی آبادی کی طرف میلان' چلنے پھرنے کے قابل ہوئے تو مقدس باپ کے ساتھ مقدس سفر کے لیے تیاری اور اس کم سنی میں باپ کے خواب کو عملی جامہ پہنانے کے لیے پوری آمادگی اور صبر وشکر اور تسلیم و رضا کا اظہار کس مستقبل کی خبر دیتا ہے؟ حضرت اسحٰقؑ کا فرشتوں کی بشارت سے پیدا ہونا اور پیدائش سے پہلے ہی غُلٰمٍ عَلِیْمٍ (الحجر:۵۳) کا خطاب پانا پھر مقدس باپ کی جانشینی اور یروشلم کی مسجد کی پاسبانی کے لیے انتخاب' کس مقصود کا دیباچہ ہے۔

حضرت یوسفؑ کا بچپن میں رؤیائے صادقہ اور صبر وشکر اور پاک دامنی کس بات کی گواہی دیتی ہے؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی عین خطرہ میں پیدائش' حفاظت' پرورش اور نبوت سے پہلے ہی فرعونیوں سے تن تنہا مجاہدانہ آویزش' کس مبتدا کی خبر ہے؟ حضرت سلیمانؑ کا آغازِ عمر میں علم وفہم' فصلِ مقدمات کی قوت کس نتیجہ کے آثار ہیں؟ حضرت یحییٰ علیہ السلام کی دعائیہ پیدائش' بچپن ہی میں ان کی نیکی' سعادت مندی' نرم خوئی' پاکی' کس مقصد کی تمہید ہے؟ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش اور بچپن ہی میں نیکی' سلامت روی' تورات کی حقیقت رسی' کس روزِ روشن کی صبح ہے؟ اور خود محمد رسول اللہ ﷺ کے لیے دعائے خلیلؑ' نویدِ مسیحاؑ' رویائے آمنہ اور احوالِ ولادت وتربیت' مراسمِ شرک سے اجتناب' اخلاقِ حسنہ' دیانت' آثارِ خیر وبرکت' نبوت سے پہلے ہی تنہائی پسندی خلوت گزینی' حقیقت کی تلاش اور غور وفکر کس خورشیدِ جہانتاب کا مطلعِ انوار ہے۔

حضرت اسماعیلؑ کا یہ حال ہے:

﴿فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِیْمٍ ○ فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْیَ قَالَ یٰبُنَیَّ اَنِّیْٓ اَرٰی فِی الْمَنَامِ اَنِّیْٓ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰی قَالَ یٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِیْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِیْنَ ○﴾ (الصّٰفّٰت:۱۰۱'۱۰۲)

''تو ہم نے ابراہیم کو ایک بردبار لڑکے کی خوش خبری دی تو جب وہ اس کے ساتھ دوڑنے کی عمر کو پہنچا تو اس نے کہا کہ اے میرے بیٹے! میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ تجھ کو میں ذبح کر رہا ہوں اب تو بتا تیری کیا رائے ہے؟ اس نے جواب دیا اے میرے! باپ کر ڈال جو تجھ سے کہا گیا' تو مجھے خدا نے چاہا تو صبر کرنے والوں میں پائے گا۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ خطاب ہے:

﴿وَ لَقَدْ مَنَنَّا عَلَیْکَ مَرَّةً اُخْرٰی ○ اِذْ اَوْحَیْنَآ اِلٰٓی اُمِّکَ مَا یُوْحٰٓی ○﴾ (طٰہٰ:۳۷'۳۸)

''اور ہم نے تجھ پر دوسری دفعہ احسان کیا جب تیری حفاظت اور پرورش کے متعلق' تیری ماں کے دل میں بات ڈال دی جو ڈالی گئی۔''

حضرت یحییٰؑ کی نسبت یہ ارشاد ہے:

﴿یٰیَحْیٰی خُذِالْکِتَابَ بِقُوَّةٍ وَ اٰتَیْنٰهُ الْحُکْمَ صَبِیًّا ○ وَ حَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا وَ زَکٰوةً وَ کَانَ تَقِیًّا ○ وَ بَرًّا بِوَالِدَیْهِ وَ لَمْ یَکُنْ جَبَّارًا عَصِیًّا ○ وَ سَلَامٌ عَلَیْهِ یَوْمَ وُلِدَ﴾ (مریم:۱)

''اے یحییٰؑ کتاب (توراۃ) کو مضبوطی سے پکڑ' اور ہم نے اس کو فیصلہ کرنے کی قوت بچپن ہی میں دے دی اور اپنے پاس سے رحم و مہر اور ستھرائی اور تھا پرہیزگار' اور اپنے ماں باپ کا فرمان بردار اور نہ تھا زبردستی کرنے والا' نافرمان' سلامتی ہو اس پر جس دن پیدا ہوا۔'' نیز حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق ہے:

﴿کَیْفَ نُکَلِّمُ مَنْ کَانَ فِی الْمَهْدِ صَبِیًّا ○ قَالَ اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰهِ اٰتٰنِیَ الْکِتَابَ وَ جَعَلَنِیْ نَبِیًّا ○ وَ جَعَلَنِیْ مُبٰرَکًا اَیْنَمَا کُنْتُ﴾ (مریم:۲۹'۳۱)

''ہم کیسے اس سے بات کریں جو ہنوز گہوارہ میں بچہ ہے عیسیٰ علیہ السلام نے کہا میں خدا کا بندہ ہوں' اس نے مجھے کتاب دی اور مجھے نبی ٹھہرایا' اور مبارک بنایا' میں جہاں ہوں۔''

اور مکہ کا ''الامین'' نبوت کے پہلے کی اپنی پوری زندگی موقع شہادت میں بے خطر پیش کر دیتا ہے:

﴿فَقَدْ لَبِثْتُ فِیْکُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ﴾ (یونس:۱۶)

''تو اس (پیغمبری کے دعویٰ) سے پہلے میں تم میں ایک عمر گزار چکا ہوں کیا تم نہیں سمجھتے۔''

انبیاء علیہم السلام کے احوالِ مبارکہ کے یہ جزئیات' باہم مل کر اپنی نسبت خود کلیہ بنا کر پیش کرتے ہیں۔

غیبی علم

نبوت کا دوسرا سب سے اہم خاصہ اس کا غیبی علم ہے یعنی وہ علم جو عام انسانوں کی طرح وجدان' احساس یا عقل و قیاس سے نہیں بلکہ براہِ راست صدائے غیب یا رؤیائے صادقہ یا فرشتوں کے ذریعہ سے خدائے پاک سے حاصل ہوتا ہے اسی کے آغاز سے نبوت کی استعداد بالقوہ کا عملی ظہور شروع ہو جاتا ہے اس مسئلہ کو پوری طرح سمجھنے

کے لیے کسی قدر تفصیل کی ضرورت ہے۔

علمِ انسانی کے ماخذ

علم انسانی کی دو قسمیں ہیں' ایک وہ جو بلا واسطہ ہوتا ہے اور دوسرا وہ جو کسی واسطہ سے حاصل ہوتا ہے۔ بے واسطہ علم کی بھی تین قسمیں ہیں۔

(۱) وجدان: انسان کو اپنے جسمانی وجود اور اس جسمانی وجود کی اندرونی کیفیات کا علم سب سے زیادہ یقینی طور سے ہوتا ہے ہر شخص کو اپنے وجود کا یقین ہے اور اس کے اندر بھوک' پیاس' بیماری' صحت' غم' خوشی' خوف وغیرہ اندرونی تغیرات کا علم اس کو بلا واسطہ از خود ہو جاتا ہے۔

(۲) فطرت: اس میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے کہ ہر نوع مخلوق کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کچھ ایسی نوعی خصوصیتیں عطا ہوتی ہیں' جو دوسری نوعوں میں نہیں پائی جاتیں اور ان ہی سے باہم نوعوں کا اختلاف اور امتیاز ظاہر ہوتا ہے' ان نوعی خصوصیتوں کا علم ہر نوع کے افراد کو بلا کسی ذریعہ اور واسطہ کے از خود ہوتا ہے اور اسی کو بعض علما کی اصطلاح میں فطری یا نوعی الہام اور اہلِ فلسفہ کی اصطلاح میں ''جبلت'' کہتے ہیں' حیوانات کو اپنے متعلق بہت سی باتوں کا علم از خود فطرۃً ہوتا ہے' پرندوں کے بچوں کو دانہ چگنا اور اڑنا کون سکھاتا ہے' آبی جانوروں کو تیرنے کی تعلیم کون دیتا ہے۔ شیر کے بچہ کو درندگی کا سبق کس معلم نے پڑھایا' انسان کے بچہ کو پیدا ہوتے ہی رونا' سونا' دودھ پینا کون سکھا دیتا ہے۔

(۳) بداہت: انسان کو کچھ ہوش وتمیز آنے کے بعد بلا دلیل بعض ایسی باتیں از خود یا ادنیٰ تامل اس طرح معلوم ہو جاتی ہیں کہ ان میں پھر کسی قسم کا شک وشبہ راہ نہیں پاتا۔ دو اور دو چار ہوتے ہیں' برابر کا برابر' برابر ہوتا ہے۔ ایک ہی وقت میں ایک ہی چیز سیاہ سپید دونوں نہیں ہو سکتی' ہر بنی ہوئی چیز کا کوئی بنانے والا ہوتا ہے' وغیرہ بہت سے ایسے ضروری مقدمات اور کلیات جن پر انسان کے استدلال کا تمام تر مدار ہے۔ اس کو بداہتہً معلوم ہو جاتے ہیں۔

یہ تو بلا واسطہ علم کی تین قسمیں تھیں۔ اس کے بعد علم انسانی کی وہ قسمیں ہیں جن کا علم اس کو کسی واسطہ سے ہوتا ہے۔ انسان کے پاس اس قسم کے دو واسطے ہیں ایک احساس اور دوسرا عقل' پہلے سے وہ گرد وپیش کی مادی چیزوں کا اور دوسرے سے ان مادی چیزوں کا جو سامنے موجود نہیں یا سرے سے خارج ہیں' موجود نہیں بلکہ عالم غیب میں ہیں یا صرف ذہن میں ہیں علم حاصل کرتا ہے۔

(۴) انسان کے جسم کے اندر پانچ قسم کی جسمانی قوتیں ہیں' باصرہ' سامعہ' شامہ' ذائقہ' لامسہ۔ باصرہ دیکھتی' سامعہ سنتی' شامہ سونگھتی' ذائقہ چکھتی اور لامسہ چھوتی ہے' ان ہی کا نام حواسِ خمسہ ہے' انسان کے پاس یہی پانچ آلات ہیں جن کے ذریعہ سے وہ ان مادی چیزوں کے متعلق علم حاصل کرتا ہے جو اس کے ان آلات سے آ کر ٹکراتی ہیں' اسی کا نام احساس ہے ہم چکھ کر مزا پاتے' سن کر آواز پہچانتے' دیکھ کر صورت جانتے چھو کر سختی ونرمی

دریافت کرتے اور سونگھ کر بو معلوم کرتے ہیں' ان حواس کے ذریعہ سے بھی جو علم ہم کو ہوتا ہے وہ اکثر یقینی اور شاذ و نادر غلط بھی ہوتا ہے کیونکہ وہ کبھی کبھی کسی سبب سے دھوکا بھی کھاتے ہیں اور دریافت میں غلطی بھی کرتے ہیں اور دلائل سے ان کا یہ دھوکا اور ان کی غلطی ثابت ہوتی ہے' بیماری میں قوتِ ذائقہ بدل گئی ہے اور اس نے میٹھے کو کڑوا بتایا ہے' تیز حرکت میں قوتِ باصرہ نے ہم کو دھوکا دیا ہے' ریل میں ہم کو ساکن اور ٹھہری ہوئی چیز چلتی ہوئی معلوم ہوتی ہے' چلتا ہوا جہاز ہم کو ٹھہرا ہوا معلوم ہوتا ہے' محترک چنگاری کا نقطہ تیز سیدھی حرکت میں ہم کو آتشیں خط اور گول حرکت میں آتشیں دائرہ معلوم ہوتا ہے۔ آسمان کے چمکتے ہوئے بڑے بڑے ستارے کتنے چھوٹے معلوم ہوتے ہیں لیکن کیا درحقیقت وہ ایسے ہی چھوٹے ہیں۔

(۵) علم بالواسطہ کی دوسری قسم وہ ہے جس کو ہم اپنی عقل و قیاس' غور و فکر اور استدلال کے ذریعہ سے حاصل کرتے ہیں' اس کی بنیاد درحقیقت ان ہی معلومات پر ہوتی ہے جن کا علم ہم کو اپنے وجدان' الہامِ فطری (یا جبلت) بداہتِ اوّلیہ' اور احساس سے پہلے ہو چکا ہے اور ان ہی معلوم شدہ امور پر غیر معلوم امور کو تمثیل یا استقراء کے ذریعہ سے قیاس کر کے ان معلوم شدہ امور کے خصوصیات اور آثار کا حکم ان غیر معلوم لیکن مشابہ و مماثل امور پر لگا کر نیا نتیجہ حاصل کرتے ہیں' وہ غیر معلوم امر جس پر معلوم امور کے ذریعہ ہم کوئی حکم لگاتے ہیں' اگر مادی ہوتا ہے تو نتیجہ چنداں غیر مشکوک نہیں ہوتا' سوائے اس کے کہ جزئیات کا استقراء پورا نہ کیا گیا ہو یا تمثیل تام نہ ہو' یا تجربہ و مشاہدہ نے دھوکا دیا ہو یا کوئی اور اصولی غلطی ہو گئی ہو' طبیعات اور سائنس کے مسائل اکثر اسی طرح معلوم کیے گئے ہیں لیکن اگر وہ امر مجہول' غیر مادی ہے تو مادی امور پر اس غیر مادی کو قیاس کر کے اس کی نسبت جو کچھ کہا جائے گا اس کا مرتبہ ظن و تخمین سے آگے نہیں بڑھتا مگر یہ کہ وہ تمام تر فطریات یا بدیہیات و محسوسات پر علانیہ منتہی ہو۔ مابعد الطبیعیہ اور فلسفۂ الٰہیات کے مسائل اسی طریقۂ استدلال سے حاصل ہوتے ہیں اور اسی لیے ان میں اختلافات کی بڑی گنجائش نکلتی ہے کہ ان کے آخری نتیجہ اور ابتدائی بنیادی وجدانی یا بدیہی یا حسی مقدمات کے درمیان قیاسات کی کئی منزلیں ہیں اور ان میں سے ہر منزل خطروں سے لبریز ہے' مشابہت و مماثلت میں دھوکا ہو سکتا ہے' عقلی اور وجدانی اور حسی اشیا کے خواص کے درمیان اختلاف اور فرق ہو سکتا ہے' غور و فکر' بحث و نظر' تحقیق' جستجو اور ترتیبِ مقدمات جو قیاسِ عقلی کے کارکن اور فاعل ہیں' وہ اپنے کام میں دھوکا کھا سکتے ہیں اسی لیے یہ علوم شکوک و شبہات سے لبریز ہیں۔

ذرائعِ علم کے حصول کے زمانے اور ان کے مراتب

سطور بالا سے ہویدا ہے کہ ہمارے سب سے زیادہ یقینی علوم ہمارے وجدانیات اور فطریات ہیں جو ہم کو قدرت کی طرف سے سب سے پہلے عنایت ہوتے ہیں کہ ہمارے وجود کی بقا اس علم پر موقوف ہے جیسے بھوک اور پیاس کا احساس اور اس علم کا یقینی ہونا بھی ضروری ہے ورنہ ہم اپنا وجود قائم نہ رکھ سکیں گے' ہم کو جو بھوک پیاس لگتی

ہے' کیا اس کے یقینی اور قطعی علم میں ہم سے غلطی ہوسکتی ہے اور کیا کسی کے شک دلانے سے کہ ممکن ہے کہ تم کو بھوک نہ ہو ممکن ہے کہ تم کو پیاس نہ ہو' کسی بھوکے یا پیاسے کو اپنی بھوک اور پیاس کے متعلق شک ہوسکتا ہے' اور یہ احساس اور علم وجود کے ساتھ ساتھ انسان کو ملتا ہے' یہاں تک کہ آج کا پیدا شدہ بچہ بھی اس کا احساس کرتا اور علم رکھتا ہے ورنہ وہ اپنے وجود کو قائم نہ رکھ سکے۔

وجدانیات وفطریات کے بعد محسوسات کا علم انسان کو ملتا ہے۔ دیکھنا' سننا' چکھنا' سونگھنا' چھونا یہ ہمارے پانچ حواس ہیں جو ہمارے مادی علم کے آلات ہیں اور جن کے بغیر کوئی باہر کا علم ہمارے اندر نہیں آ سکتا' یہ احساسات بھی ایک ہی دفعہ نہیں کمال پا جاتے بلکہ ضرورت کے مطابق حسبِ استعداد ملتے اور ترقی پاتے ہیں اور پیدائش کے چند ماہ بعد یہ تکمیل کو پہنچتے ہیں' کیونکہ وجود کی بقا اور ضروریات کی تکمیل ابھی سے ان پر رفتہ رفتہ موقوف ہوتی جاتی ہے۔

محسوسات کے بعد بدیہیات اوّلیہ کا درجہ آتا ہے' انسان کو اپنے اس علم میں بھی وہی اذعان وقطعیت ہوتی ہے۔ دو دو چار ہوتے ہیں' دس پانچ کا دونا ہے' ایک چیز ایک ہی وقت میں دو جگہ نہیں ہوسکتی' ایک چیز ایک ہی وقت میں سیاہ وسپید نہیں ہوسکتی' ان بدیہی علوم کو ہر شخص مانتا اور تسلیم کرتا ہے مگر اس کا علم انسان کو بچپن میں نہیں ہوتا بلکہ تمیز ورشد کے بعد ہوتا ہے کیونکہ اسی وقت اس کی ضرورت پیش آتی ہے' اگر یہ علوم اس سن میں اس کو عطا نہ ہوں تو وہ دنیا کے ضروری کاروبار چلانے کے لائق نہ ہو اور نہ دوسرے علوم کی دریافت کی اس میں استعداد پیدا ہو' فطری احمق اور بے وقوف ان ہی کو کہتے ہیں جن میں ان بدیہیات کا علم کم یا بالکل نہیں ہوتا۔

سب سے اخیر میں اس علم کا درجہ آتا ہے جو وجدانیات' فطریات' بدیہیات اور محسوسات پر قیاس کے ذریعہ سے حاصل ہوتا ہے اور جس کو علمِ معقولات کہتے ہیں۔ اسی علم اور اسی کی قوت کی کمی بیشی کا نتیجہ ہے کہ انسانی عقلیں درجہ اور مرتبہ میں متفاوت ہوتی ہیں' ایک طرف تو (کمی کی سمت میں) وہ حماقت تک پہنچ جاتی ہیں اور دوسری طرف (سمتِ کمال میں) عاقل' عاقل تر اور عاقل ترین طبقہ تک اونچی ہو جاتی ہیں' یہاں تک کہ وہ درجہ بھی آتا ہے کہ کسی کی عقل اس مرتبہ تک جا پہنچتی ہے جہاں کوئی اس کا دوسرا حریف اور ہم سر نہیں ہوتا' ایک جاہل حبشی سے لے کر ارسطو اور بوعلی سینا تک سب انہی عقلی مدارج کے مختلف انسانی نظائر ہیں' بایں ہمہ یہ ظاہر ہے کہ اس علم کا طریقہ نہایت پرخطر اور منزلِ مقصود ہمیشہ مشکوک رہتی ہے۔

عام طور سے انسانی علم کے پانچ ذریعے اور طریقے سمجھے جاتے ہیں لیکن درحقیقت ایک اور ذریعہ بھی ہے' جس کا تعلق تمام تر ماورائے مادہ سے ہے' غور کیجیے کہ آپ کا سب سے پہلا علم یعنی وجدانیات آپ کے اندرونی حواس کا نتیجہ ہے دوسرا یعنی فطریات کا علم خالقِ فطرت خود آپ کے اندر ودیعت رکھتا ہے' تیسرا علم یعنی محسوسات کا علم آپ کے ان ظاہری حواس کا نتیجہ ہے جو گو باہر ہیں مگر آپ کے جسم کے اندر ہیں' آپ کا چوتھا ذریعہ علم یعنی بدیہیاتِ اولیہ آپ کے حواس اور ذہن کا ایک مشترکہ فیصلہ ہیں' پانچواں ذریعۂ علم جو آپ کی عقل وذہن کی قیاس

آرائی ہے وہ آپ ہی کے اندر کے دماغی قویٰ کا عمل ہے تھوڑے سے تامل سے معلوم ہوگا کہ آپ کا علم وجدان سے لے کر ذہن تک بتدریج مادیت سے ترقی کر کے ماورائے مادہ کے قریب تک پہنچتا ہے وجدان تمام تر ہماری اندرونی جسمانی مادیت ہے جس میں کوئی شک نہیں' محسوسات بھی ہمارے ہی جسم کے مادی آلات علم کے نتائج ہیں' بدیہیات ہمارے حواس سے جو مادی ہیں اور ہمارے ذہن سے جو غیر مادی ہیں مشترک تعلق رکھتے ہیں' یعنی بدیہیات مادی اور غیر مادی ذرائع علم کے بین بین ہیں اور معقولات تمام تر ذہنی اور غیر مادی ہیں۔ تاہم اس غیر مادی قوت کا مرکز ہمارا مادی جسم ہی ہے اور اس حد تک اس غیر مادی قوت کا ارادہ سے تعلق بہر حال ہوتا ہے۔

غیر مادی علم

اب اس کے بعد اس علم کا درجہ آتا ہے جس کی سرحد اس کے بعد آتی ہے اور جس کا تعلق مادہ سے اتنا بھی نہیں ہوتا جتنا معقولات اور ذہنیات کا ہے' وہ تمام تر مادہ اور مادیات سے پاک ہوتا ہے اس کو مادہ سے اسی قدر لگاؤ ہوتا ہے کہ وہ علم مادی دل و دماغ کے آئینہ پر اوپر سے آ کر اپنا عکس ڈالتا ہے۔

اس غیر مادی علم کے بھی بہ ترتیب مختلف درجے ہیں' جن کو فراست' حدس' کشف' الہام اور وحی کہتے ہیں اور جس طرح انسانی علم کے مذکورہ بالا پانچوں ذریعے انسان کے جسمانی قویٰ سے متعلق تھے' اسی طرح یہ غیر مادی ذرائع انسان کے روحانی قویٰ سے وابستگی رکھتے ہیں اور جس طرح آپ نے دیکھا ہے کہ وجدانیات سے لے کر عقلیات تک بہ ترتیب ہمارا ذریعۂ علم خالص مادی کامل مادی' کم مادی اور برائے نام مادی تک ترقی کرتا چلا گیا ہے' اسی طرح فراست' حدس' کشف' الہام اور وحی بھی برائے نام مادی و روحانی سے لے کر پھر روحانی' کامل روحانی اور خالص روحانی کے ذریعہ تک ترقی کرتے چلے گئے ہیں۔

فراست کے لفظی معنی ''تاڑ جانے'' کے ہیں' تاڑ جانے کی قوت ہر شخص میں نمایاں نہیں ہوتی' مگر جس میں نمایاں ہوتی ہے اس کی یہ کیفیت ایک ملکہ کے ذریعہ سے حاصل ہوتی ہے' جو تجربہ کی کثرت اور عمل کی مہارت اور کمال کے بعد انسان کو حاصل ہو جاتا ہے اور جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کسی چیز کے دیکھنے' سننے' چکھنے' سونگھنے یا چھونے کے ساتھ ہی صرف بعض علامتوں کے جان لینے سے دوسری متعدد ضروری علامتوں پر تفصیلی نظر ڈالے بغیر اتنی جلدی انسان صحیح نتیجہ تک پہنچ جاتا ہے کہ دیکھنے والوں کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا وہ غیب کی بات بیان کر رہا ہے حالانکہ اس کا علم تمام تر ظاہری علامتوں اور نشانوں پر مبنی ہوتا ہے جن کو ہر شخص دیکھ سکتا ہے مگر دیکھتا نہ تھا' ایسے ماہرِ فن اور ذی فراست اشخاص برابر ہر شخص کے مشاہدہ میں آتے رہتے ہیں جس کو جس چیز یا فن میں یہ ملکہ پیدا ہو جاتا ہے' اس کی فراست اس کو حاصل ہو جاتی ہے' جرائم کے پتا لگانے والے ماہرین اور جاسوس اپنے فن کی فراست میں یہ کمال رکھتے ہیں کہ صورت دیکھی اور تاڑ گئے' اسی طرح ہر علم و فن کے ماہروں کو اپنے اپنے فن کے اندر یہ ملکہ حاصل ہو جاتا ہے' اخیار اور نیکوکاروں کو اپنی جماعت کے افراد کے پہچان لینے اور جان لینے کی طاقت بھی اسی طرح۔

حاصل ہوتی ہے اور اسی کو ایک حدیث میں ان الفاظ میں ادا کیا گیا ہے:

((اتقوا فراسة المؤمن فانه ينظر بنور الله)) (ترمذی)

''مومن کے تاڑ لینے سے ڈرو کہ وہ خدا کی روشنی سے دیکھتا ہے۔''

(۲) فراست کے بعد حدس کا درجہ ہے فراست کے ابتدائی مقدمات حواس پر مبنی ہوتے ہیں لیکن حدس کے ابتدائی مقدمات ذہنی اور عقلی ہوتے ہیں اور ان ہی ذہنی اور عقلی مقدمات کے غور و فکر' تلاش اور ترتیب سے نتیجہ حاصل ہوتا ہے مگر فطری کمال یا فن کی حاصل کردہ مہارت کے سبب سے غور و نظر' فکر و تلاش اور ترتیبِ مقدمات کے منطقیانہ مرحلوں کو ذہنِ رسا اس تیزی اور سرعت کے ساتھ طے کر کے آخری نتیجہ تک پہنچ جاتا ہے کہ خود اس کو بھی اس کا احساس نہیں ہوتا کہ اس نتیجہ کے حاصل کرنے میں اس نے کوئی دماغی عمل بھی کیا ہے' یہ چیز بھی اکثر کامل العقل اور صائب الرائے انسانوں کو فطرۃً عطا ہوتی ہے اور دنیا کے مشہور عقلا اور دانایانِ روزگار کے واقعات میں اس کی کثرت سے مثالیں ملتی ہیں۔

(۳) کشف کے لفظی معنی تو کھولنے اور پردہ اٹھانے کے ہیں' مگر اس سے مقصود یہ ہے کہ مادیت کے ظلمانی پردہ کو چاک کر کے مادی چیز روحانی عالم میں مشاہدہ کے سامنے آ جاتی ہے وہ کبھی اصلی صورت میں اور کبھی اپنی مثالی صورت میں نظر آتی ہے' عام لوگوں کے سمجھنے کے لیے اس کی بہترین مثال خواب کی ہے فرق صرف اتنا ہے کہ خواب عالمِ خواب کی بات ہے اور کشف عالمِ بیداری کی' جس طرح عام لوگوں کو خواب میں جب ظاہری حواس بیکار ہو جاتے ہیں' ایسی چیزیں معلوم ہوتی ہیں جو کبھی کبھی عین واقعہ ثابت ہوتی ہیں' اس طرح خاص لوگوں پر بیداری ہی میں ظاہری حواس کے تعطل سے ایسا سماں پیش آتا ہے ہر شخص کے تجربہ میں ایسے متعدد حیرت انگیز واقعات گزرتے رہتے ہیں۔

(۴) الہام کے لفظی معنی دل میں ڈالنے کے ہیں اور اس سے مراد وہ علم ہے' جو محنت' تلاش' تحقیق' غور اور ترتیبِ مقدمات کے بغیر دل میں آ جاتا ہے اور ممکن ہے کہ اس کی صحت بعد کو حسی تجربوں اور عقلی دلیلوں سے بھی ثابت ہو جائے مگر خود وہ علم پہلے پہل ذہن میں کسی حسی تجربہ یا عقلی دلیل کے نتیجہ کے طور پر نہیں آتا بلکہ خود بخود دل میں آ جاتا ہے' کیوں آتا ہے اور کہاں سے آتا ہے' اس کے جوابات مختلف ہو سکتے ہیں' مگر یہ واقعہ ہے کہ وہ آتا ہے اور اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا اس کی ابتدائی اور معمولی مثالیں وہ خیالات ہیں جو محققین' علما' شعرا اور موجدین کے ذہن میں پردۂ عدم سے پہلے پہل آتے ہیں اور وہ ان کو دنیا کے سامنے اپنی ایجادات کی صورت میں پیش کرتے ہیں۔

(۵) وحی کے لغوی معنی کسی کا اپنے دلی منشا کو لبوں کو جنبش دیے بغیر اخفا اور آہستگی کے ساتھ دوسرے پر ظاہر کر دینا ہیں اور اصطلاحاً اس کے معنی خدا کا اپنے دلی منشا سے اپنے خاص بندوں کو کسی غیبی ذریعہ سے مطلع کرنا ہیں یہ علم و اطلاع کے روحانی ذریعوں کی آخری سرحد ہے۔

جس طرح علم کی تین جسمانی قسمیں یعنی وجدانیات' حسیات اور بدیہیات عام انسانوں کے لئے ذریعۂ یقینی ہیں' اسی طرح روحانی ذرائع علم کے یہ تین ذریعے کشف' الہام اور وحی انبیاء علیہم السلام کے لیے یقینی ہیں اور جس طرح علم کے مادی ذریعوں میں سے یقین کا سب سے پہلا ذریعہ وہ ہے جو تمام تر مادی ہے یعنی وجدان' پھر حسِ ظاہر اور پھر بدیہیات' اسی طرح علم کے روحانی واسطوں میں سب سے زیادہ یقینی وہ ہے جو تمام تر روحانی ہے یعنی وحی پھر الہام پھر کشف۔

ہم نے علم کے روحانی ذرائع کی جو تین قسمیں کی ہیں یعنی وحی' الہام' اور پھر کشف' یہ قرآن پاک کی اصطلاحیں نہیں ہیں' اس کی اصطلاح میں روحانی ذریعۂ علم کا نام مکالمۂ الٰہی (خدا سے بات کرنا ہے) اور اس کی حسب ذیل تین قسمیں بیان کی ہیں۔

(۱) وحی (اشارہ) سے بات کرنا' یعنی دل میں کسی معنی کا بغیر آواز اور الفاظ کے آ جانا' یہ اگر حالتِ بیداری میں ہے تو کشف ہے اور اگر خواب میں ہے تو رؤیا ہے۔

(۲) خدا کا پردہ کے پیچھے سے بات کرنا یعنی متکلم نظر نہیں آتا' مگر غیب سے آواز آتی ہے اور الفاظ سنائی دیتے ہیں' اس کو الہام کہہ لو۔

(۳) فرشتہ کے ذریعہ سے بات کرنا یعنی فرشتہ خدا کا پیغام لے کر سامنے نظر آتا ہے اور اس کے منہ سے وہ الفاظ ادا ہوتے ہیں جن کو سن کر نبی محفوظ کر لیتا ہے' اسی کو عام طور سے وحی کہتے ہیں' کیونکہ قرآن پاک کا نزول اسی آخری طریقہ سے ہوا ہے لیکن اس شہرتِ عام کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ اور دوسرے دو طریقے وحی کی قسمیں نہیں ہیں' وحی کی ان اقسام کا ذکر سورۂ شوریٰ میں ہے:

﴿وَ مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ﴾ (الشوریٰ:۵۱)

''اور کسی آدمی کی یہ تاب نہیں کہ اللہ اس سے بات کرے لیکن وحی (اشارہ) سے یا پردہ کے پیچھے سے یا کسی قاصد کو بھیجے تو وہ خدا کے حکم سے' خدا جو چاہے اس کو وہ وحی کر دیتا ہے بے شک اللہ بلند اور حکمت والا ہے۔''

مکالمۂ الٰہی کے یہ تینوں طریقے یعنی وحی (اشارہ) سے بات کرنا' پردہ کے پیچھے سے بات کرنا اور فرشتہ کے ذریعہ سے بات کرنا' وحی کی یہ تین مختلف قسمیں بھی ہیں اور پھر ان تینوں کا اجمالاً مشترک نام بھی وحی ہے یعنی یہ منقسم بھی ہے اور اپنی تین قسموں میں سے بھی ایک پر اس کا اطلاق ہوتا ہے' اسی آیت میں دیکھو کہ فرشتے کے ذریعہ سے کلام کو بھی وحی فرمایا گیا ہے اور تینوں مذکورہ بالا طریقوں میں جس طریقے سے بھی آنحضرت ﷺ کو غیبی تعلیم و اطلاع دی گئی ہے۔ اس کو بھی وحی کے لفظ سے تعبیر کیا ہے یعنی وہ عام مکالمہ الٰہی کے مرادف بھی مستعمل ہوا ہے۔

﴿مَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ○ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ○﴾ (النجم:۳۔۴)

''نبی خواہشِ نفس سے کلام نہیں کرتا بلکہ وہ وحی ہوتی ہے جو اس کو کی جاتی ہے۔''

الغرض اس امتیاز کے لیے علمی اصطلاحات میں ان تینوں طریقوں کے لیے کشف' الہام اور وحی کے تین علیحدہ علیحدہ الفاظ وضع کر دیے گئے ہیں تا کہ بول چال میں ہر روحانی طریقۂ گفتگو دوسرے سے ممتاز ہو جائے' بیداری میں اشارہ سے بات کرنا کشف ہے اور خواب کے عالم میں رؤیا ہے' پردہ کے پیچھے سے آواز کا آنا الہام ہے اور فرشتہ کی درمیانگی سے بات کرنا وحی ہے۔ (۱)

نکتہ: اوپر کی آیت میں جہاں اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد فرمایا کہ کسی بندہ کی یہ تاب نہیں کہ خدا اس سے بات کرے لیکن ان تین طریقوں سے' اس کے آخر میں فرمایا ہے کہ وہ سب سے بلند اور حکیم ہے یعنی اس کی بلندی و برتری کا اقتضا تو یہ ہے کہ وہ کسی کو اپنے مکالمہ کے شرف کا مستحق نہ سمجھے' مگر اس کی حکمت کا اقتضا یہ ہے کہ وہ اپنے بندگانِ خاص سے عام بندوں کی ہدایت و رہنمائی کے لیے ان تین غیر معمولی طریقوں میں سے کسی طریقہ سے گفتگو فرمالے۔

بہر حال غیبی ذریعۂ اطلاع کی یہ سب سے بلند قسم جس کو اصطلاح میں وحی کہتے ہیں' اس کا تجربہ عام لوگوں کو نہیں لیکن اس سے نیچے درجہ کے غیبی ذرائعِ اطلاع کا تجربہ ہر شخص کو تھوڑا بہت ہے اور ہر انسان کی زندگی میں جو بعض پراسرار اور نا قابلِ فہم واقعات پیش آتے ہیں ان پر غور کرنے سے غیب کے اس اعلیٰ ترین ذریعۂ علم کا دھندلا سا خاکہ ذہن میں آ سکتا ہے جس سے غیر جسمانی اور غیر حسی مادی ذرائعِ علم کے سمجھنے اور باور کرنے میں جو استبعاد معلوم ہوتا ہے وہ دور ہو سکتا ہے خصوصاً اس عہد میں جب سائیکالوجی کی تحقیقات سے نفس کی بہت سی نامعلوم طاقتوں کا پتا چل رہا ہے اور اسپر چولزم کے ذریعہ ارواح سے خطاب و کلام کی سلسلۂ جنبانی ہو رہی ہے اور جدید روحانیات کا فن ایک مستقل سائنس کی صورت اختیار کر رہا ہے۔

انبیاء علیہم السلام کو اپنے کشف' الہام اور وحی پر اتنا ہی یقین ہوتا ہے جس قدر عام انسانوں کو اپنے وجدانیات' محسوسات' فطریات اور بدیہیات پر۔ انبیا کا یہ روحانی علم ایسا ہی اندرونی ہوتا ہے جیسا عام انسانوں میں وجدانیات' فطریات اور بدیہیات و محسوسات کا علم ہوتا ہے جس طرح کسی شخص کو اس علم میں دھوکا نہیں ہو سکتا کہ اس کو بھوک یا پیاس معلوم ہو رہی ہے یا اس کو غم یا خوشی ہے۔ اسی طرح نبی کو بھی اپنے روحانی وجدانیات میں دھوکا نہیں ہوتا اور جس طرح تم کو اپنے فطریات میں یہ مغالطہ نہیں ہوتا کہ دو اور دو چار نہیں ہوتے۔ اسی طرح اس کو بھی پیغمبرانہ فطریات میں مغالطہ واقع نہیں ہوتا اور جس طرح تم کو اپنے محسوسات میں اگر کسی کو سامنے دیکھ رہے ہو' یا کسی کی آواز سن رہے ہو' شبہ نہیں ہوا کرتا' اس کو بھی اپنے روحانی محسوسات میں شبہ نہیں ہوا کرتا' غرض وہ اپنے ان جملہ غیبی اور روحانی ذرائعِ علم میں ہر لغزش' فریب' خطا اور غلطی سے اسی طرح پاک ہوتا ہے جس طرح تم اپنے

(۱) ان اصطلاحات کی بحث کے لیے اصولِ فقہ کی اہم کتابوں کی طرف توجہ کرنی چاہیے' کم از کم اس موقع پر تحریر ابن ہمام المتوفی ۸۶۱ھ کی شرح التقریر والتحریر لابن امیر الحاج المتوفی ۸۷۹ھ جلد سوم ص ۴۹۵ مطبوعہ امیریہ بولاق مصر ۱۳۱۷ھ دیکھنی چاہیے۔

وجدانیات، فطریات، محسوسات میں غلطی اور خطا سے پاک ہوتے ہو۔

علم غیب

اسلام کے عقیدہ میں غیب کا علم خدا کے سوا کسی کو نہیں، قرآن پاک میں بار بار آنحضرت ﷺ کو اس اعلان کی ہدایت ہوئی ہے۔

﴿فَقُلْ اِنَّمَا الْغَیْبُ لِلّٰهِ﴾ (یونس:۲۰)

''تو کہہ دے اے پیغمبر کہ غیب خدا کے لیے ہے۔''

﴿قُلْ لَّا یَعْلَمُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ الْغَیْبَ اِلَّا اللّٰهُ﴾ (النمل:۶۵)

''کہہ دے کہ آسمانوں میں اور زمین میں خدا کے سوا کوئی نہیں جس کو غیب کا علم ہو۔''

رسول کہتے ہیں۔

﴿وَ لَآ اَعْلَمُ الْغَیْبَ﴾ (الانعام:۵۰)

''اور میں غیب نہیں جانتا۔''

لیکن اسی کے ساتھ دو موقعوں پر یہ بھی کہا گیا ہے کہ بایں ہمہ خدا اپنے برگزیدہ پیغمبروں کو غیب کی اطلاع دیتا ہے۔ سورۂ جن میں ہے۔

﴿فَلَا یُظْهِرُ عَلٰی غَیْبِهٖٓ اَحَدًا ○ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰی مِنْ رَّسُوْلٍ﴾ (الجن:۲۶،۲۷)

''تو اللہ اپنے غیب کی بات کسی پر ظاہر نہیں کرتا لیکن اس پیغمبر پر جس کو پسند کرے۔''

دوسری جگہ سورۂ آل عمران میں ہے۔

﴿وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِیُطْلِعَكُمْ عَلَی الْغَیْبِ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ یَجْتَبِیْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ یَّشَآءُ﴾ (آلِ عمران:۱۷۹)

''اور نہ تھا اللہ کہ غیب کی باتوں پر تم کو مطلع کرتا لیکن یہ کہ اللہ اپنے پیغمبروں میں سے جس کو چاہے چن لیتا ہے۔''

ان دو آیتوں سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے برگزیدہ پیغمبروں کو غیب کی باتوں کی اطلاع دیتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ جن آیتوں میں غیب دانی کی کلیۃً اور قطعاً نفی کی گئی ہے اس سے مراد ذاتی اور حقیقی علم ہے یعنی خدا کے سوا بالذات کسی کو غیب کا علم نہیں، البتہ خدا کے واسطہ اور ذریعہ سے اور اس کی تعلیم و اطلاع سے پیغمبروں کو اس کا علم حاصل ہوتا ہے ساتھ ہی آیت الکرسی میں فرما دیا گیا:

﴿وَ لَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ﴾ (البقرہ:۲۵۵)

''اور وہ خدا کے ایک ذرۂ علم کا بھی احاطہ نہیں کر سکتے، لیکن اتنے کا جتنے کا وہ چاہے۔''

یعنی اپنے علومِ غیب سے جتنا اور جس قدر وہ پسند کرتا ہے اور مصلحت سمجھتا ہے' وہ ان کو بذریعہ وحی ان سے واقف کرتا رہتا ہے' بایں ہمہ بعض باتوں کی نسبت جیسا کہ سورۂ ہود اور لقمان میں ہے' اللہ تعالیٰ نے قطعی طور سے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ ان کا علم کسی کو نہیں۔ مثلاً قیامت' بارش' موت' شکمِ مادر میں لڑکا ہے یا لڑکی؟ کل کیا ہوگا؟ ان باتوں کو خدا تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا اسی طرح بعض آیتوں میں آنحضرت ﷺ کو خطاب کر کے کہا گیا ہے کہ اس کا تم کو علم نہ تھا' جیسا کہ غزوۂ تبوک میں عدم شرکت کے بعض عذر خواہ لوگوں کے متعلق سورۂ توبہ میں ہے کہ انہوں نے جھوٹی قسمیں کھا کر اجازت حاصل کر لی' خدا نے فرمایا:

﴿عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَ تَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ﴾ (التوبہ:۴۳)

''خدا نے تجھ سے درگزر کیا' کیوں تو نے ان کو اجازت دی تا آنکہ تجھے معلوم ہو جاتا جو سچ بولے اور جھوٹوں کو جان لیتا۔''

﴿لَقَدِ ابْتَغَوُا الْفِتْنَةَ مِنْ قَبْلُ وَ قَلَّبُوْا لَكَ الْاُمُوْرَ حَتّٰى جَآءَ الْحَقُّ وَ ظَهَرَ اَمْرُ اللّٰهِ وَهُمْ كٰرِهُوْنَ﴾ (التوبہ:۴۸)

''انہوں نے پہلے فتنہ پیدا کرنا چاہا اور تیرے سامنے واقعات الٹ دیے یہاں تک کہ حق بات آ گئی اور خدا کی بات کھل گئی اور وہ ایسا نہیں چاہتے تھے۔''

آگے چل کر ہے:

﴿مَرَدُوْا عَلَى النِّفَاقِ لَا تَعْلَمُهُمْ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ﴾ (التوبہ:۱۰۱)

''یہ نفاق پر اڑے ہیں' تو ان کو نہیں جانتا ہم جانتے ہیں۔''

ان آیتوں سے یہ واضح ہے کہ پیغمبروں کو غیب کا کلی علم نہیں ملتا' بلکہ ان کو غیب کی اطلاع دیے جانے کے موقع کی دونوں آیتوں میں رسول ہی کا لفظ استعمال کرنا اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ جن امورِ غیب کی اطلاع پیغمبروں کو دی جاتی ہے ان کا تعلق فریضۂ رسالت اور اس کی مصلحتوں اور شریعتوں سے ہے۔

غیب کی حقیقت

علمِ غیب کے اس نادیدہ راستہ میں اتنی منزل طے کر لینے کے بعد یہ سوال سامنے آتا ہے کہ قرآن پاک کی اصطلاح میں غیب کس کو کہتے ہیں؟ قرآن مجید کے الفاظ کے استعمال کے تمام مواقع پر غور کرنے سے اس کے اجمالی اور تفصیلی دونوں معنی واضح ہوتے ہیں' اجمالاً اس کا اطلاق ان امور پر ہوتا ہے جن کا علم انسان اپنے علم کے عام اور طبعی و فطری ذریعوں سے حاصل نہیں کر سکتا۔ گزر چکا ہے کہ انسانی علم کے طبعی ذریعے' وجدان' حواس اور عقل واستدلال وغیرہ ہیں' ان طبعی ذریعوں سے جو ہر انسان کو ملے ہیں' جو علم حاصل نہیں ہوتا' اس کو علمِ غیب کہتے ہیں

یعنی اس شے یا ان اشیاء کا علم جو انسان کے ظاہری و باطنی حواس اور دماغی قویٰ کی نگاہوں کے سامنے نہ ہے غائب ہیں اور اس کا مقابل لفظ ''شہادت'' ہے۔ جس کے معنی حاضر ہونے کے ہیں یعنی وہ اشیاء جو ہر انسان کے حواس اور قوائے دماغی کے سامنے ہیں اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے کو بار بار ﴿عَالِمُ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ﴾ کہا ہے (الانعام' الرعد' الحشر' التغابن) یعنی انسانوں کے طبعی ذرائع علم کے سامنے جو حاضر ہے' اور جو غائب ہے ان سب کا عالم اور واقف کل وہی ہے' الغرض اجمالاً علم غیب اسی غیبی طریقۂ علم کا نام ہے جو عام انسانوں کو نہیں ملا ہے۔

تفصیلی حیثیت سے قرآن پاک میں غیب کا اطلاق چار چیزوں پر ہوا ہے۔

(۱) زمانۂ ماضی کے واقعات جن کا علم بعد کو نہ تو حواس کے ذریعہ ہوسکتا ہے کہ حواس سے صرف شاہد (سامنے موجود) کا علم ہوتا ہے اور نہ عقل وفکر کے ذریعہ ہوسکتا ہے اگر ہوسکتا ہے تو تحریر و روایت کے ذریعہ' لیکن جس کے لیے تحریر و روایت کا ذریعہ یقینی طور سے مسدود ہو' اس کے لیے ان کا علم اگر ہوسکتا ہے تو غیبی ہی ذریعہ سے ہوسکتا ہے۔

حضرت نوحؑ کے مختصر قصہ کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿تِلْكَ مِنْ اَنْبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَآ اِلَيْكَ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَآ اَنْتَ وَ لَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا﴾ (ہود:۴۹)

''یہ غیب کی بعض خبریں ہیں ہم ان کو وحی کرتے ہیں' تیری طرف تو تو ان کو پہلے سے جانتا ہی نہ تھا اور نہ تیری قوم جانتی تھی۔''

حضرت مریمؑ کے قصہ میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ وَ مَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ اَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ وَ مَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ﴾ (آل عمران:۴۴)

''یہ غیب کی خبروں میں سے ہے اس کو ہم تیری طرف وحی کرتے ہیں اور نہ تو ان کے پاس موجود تھا جب وہ اپنے قلم (قرعہ کے طور پر) ڈال رہے تھے کہ کون مریم کو پالے اور نہ تو ان کے پاس اس وقت تھا جب وہ جھگڑ رہے تھے۔''

دیکھو کہ محسوس واقعات کے علم کا طبعی طریقہ اس وقت موجود رہ کر دیکھنا اور سننا تھا' اس کی آنحضرت ﷺ سے نفی کی گئی کہ آپ وہاں یقیناً اس وقت موجود نہ تھے' اب رہ گیا کسی دوسرے انسانی ذریعہ سے سننا' اس کی بھی نفی پہلے ہی سے ہے کہ تیری قوم میں سے بھی کسی کو معلوم نہ تھا' اور نہ دوسروں سے معلوم کیا' اب اس کا علم جس غیر طبعی طریقہ سے رسول کو دیا گیا' وہ وحی کا ذریعہ ہے۔

اسی طرح حضرت یوسفؑ کے پورے واقعہ کے ذکر کے بعد فرمایا:

﴿ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ وَ مَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ اَجْمَعُوْٓا اَمْرَهُمْ وَ هُمْ

يَمْكُرُوْنَ﴾ (یوسف:۱۰۲)

''یہ غیب کی خبروں میں سے ہے ہم اس کو تیری طرف وحی کرتے ہیں اور تو اس وقت ان کے پاس نہ تھا جب وہ اپنا کام طے کرنے لگے اور چال چل رہے تھے۔''

اس میں بھی علمِ شاہد کی نفی کر کے علمِ غائب کو ثابت کیا گیا ہے' بہر حال ان تینوں آیتوں سے واضح ہے کہ ماضی کے واقعات کے غیر طبعی طریقۂ علم کو بھی علم غیب کہا گیا ہے۔

(۲) اسی طرح آئندہ مستقبل میں جو واقعات ہونے والے ہیں ان کو بھی غیب کہا گیا ہے ان کا علم دلائل و قیاس کے طبعی ذرائع کے علاوہ غیر طبعی ذریعہ سے ہوا ہو' تو اس کو بھی علمِ غیب کہیں گے' قرآن پاک میں ایک موقعہ پر ان کفار کے جواب میں جو نشانیوں کے طالب تھے یہ کہا گیا۔

﴿فَقُلْ اِنَّمَا الْغَيْبُ لِلّٰهِ فَانْتَظِرُوْٓا اِنِّىْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ﴾ (یونس:۲۰)

''تو کہہ دے کہ غیب کا علم خدا ہی کے لیے ہے' انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں ہوں۔''

مستقبل کے منتظرہ واقعات کو اس آیت میں ''غیب'' کہا گیا ہے' اسی طرح قیامت کو بار بار غیب کہہ کر غیر خدا سے اس کے علم کی نفی کی گئی ہے۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ﴾ (لقمان:۳۴)

''خدا ہی کے پاس قیامت کا علم ہے۔''

﴿يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰهَا قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّىْ﴾ (الاعراف:۱۸۷)

''وہ قیامت کو پوچھتے ہیں' کہ اس کا وقوع کب ہوگا کہہ دے کہ اس کا علم میرے پروردگار کے پاس ہے۔''

اسی طرح مستقبل کے دوسرے واقعات کے علم کی بھی انسانوں سے نفی کی گئی ہے۔

﴿وَ مَا تَدْرِىْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا وَ مَا تَدْرِىْ نَفْسٌۢ بِاَىِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ﴾ (لقمان:۳۴)

''کوئی نہیں جانتا کہ کل وہ کیا کرے گا اور نہ کوئی یہ جانتا ہے کہ وہ کس سرزمین میں مرے گا۔''

ان چیزوں پر بھی غیب کا اطلاق کیا گیا ہے جو گو ماضی اور مستقبل نہیں بلکہ زمانۂ حال میں موجود ہیں' تاہم انسان کے حواسِ خمسہ اور عقل کی محدود طاقت سے ان کا علم نہیں ہو سکتا' ہم کو دیکھنے اور سننے کی طاقت دی گئی ہے مگر اس کے لیے کسی نہ کسی مسافت' عدمِ حجاب اور دیگر چند شرائط کی قید لگا دی گئی ہے' جن کے بغیر ہماری یہ طاقت بالکل بیکار ہے' ہم دلی میں بیٹھ کر' بمبئی کے پیش نظر مناظر کو نہیں دیکھ سکتے' اور نہ بغیر آلات کے ہم یہاں سے وہاں کی آواز آج بھی سن سکتے ہیں اس لیے زمانۂ حال کے علم کے لیے بھی جو طبعی شرائط اور قیود ہیں' ان کے بغیر جو علم حاصل ہوگا'

وہ غیب ہوگا۔

حاملہ عورت سامنے موجود ہے مگر اس کے بطن کے پے در پے حجابات کے اندر جن کو آنکھیں چاک نہیں کر سکتیں، کیا ہے کس کو معلوم۔

﴿وَ یَعْلَمُ مَا فِی الْاَرْحَامِ﴾ (لقمان:۳۴)

''اور اللہ جانتا ہے رحموں کے اندر جو ہے۔''

آسمان و زمین میں اس وقت جو کچھ ہے وہ سب زمانۂ حال میں سب کے سامنے موجود ہے تاہم اس کا علم ہمارے حواس اور عقل کی محدود دسترس سے اس وقت تک باہر ہے، جب تک ہمارے دیکھنے، سننے اور جاننے کے لیے خدا نے جو طبعی شرائط بتا دیئے ہیں، وہ پورے نہ ہوں۔

﴿وَ لِلّٰهِ غَیْبُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ﴾ (ہود:۱۲۳)

''اور خدا ہی کے لیے ہے آسمانوں اور زمین کا غیب۔''

﴿اِنَّ اللّٰهَ یَعْلَمُ غَیْبَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ﴾ (الحجرات:۱۸)

''بے شک خدا جانتا ہے آسمانوں اور زمین کا غیب۔''

(۴) عالمِ غیب کی آخری چیز وہ امور ہیں، جو غیر مادی ہونے کی وجہ سے ہمارے حواس اور عقل کے تنگ دائرۂ عمل سے قطعاً باہر ہیں، ہم فرشتوں کو نہیں دیکھتے، خدا کی رؤیت کی صلاحیت نہیں رکھتے، جنت اور دوزخ ہم کو یہاں نظر نہیں آ سکتی یہ تمام امور بھی غیب ہیں۔

﴿اَلَّذِیْنَ یَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَیْبِ﴾ (الانبیآء:۴۹)

''تو جو لوگ اپنے رب سے ڈرتے ہیں، غیب میں۔''

﴿اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ﴾ (البقرہ:۳)

''وہ لوگ جو ایمان لاتے ہیں غیب میں۔''

﴿جَنّٰتُ عَدْنِ ِ الَّتِیْ وَعَدَ الرَّحْمٰنُ عِبَادَهٗ بِالْغَیْبِ﴾ (مریم:۶۱)

''وہ جنت جس کا وعدہ اس مہربان نے اپنے بندوں سے کیا ہے، غیب میں۔''

غیب میں'' کے معنی ہیں بے جانے، بن دیکھے، حواس سے علم حاصل کئے بغیر اور باوجود اس کے کہ وہ چیزیں اس عالم میں دیکھی نہیں جا سکتی ہیں۔

پیغمبر کو اللہ تعالیٰ غیب کی جن باتوں سے آگاہ کرتا ہے وہ ان چاروں قسم کے امور غیب ہوتے ہیں بعض گزشتہ قوموں اور پیغمبروں کے عبرت انگیز اور نصیحت آمیز حالات سے بھی روایت اور تحریر کے ذریعہ سے بغیر وحی کے واسطہ سے ان کو مطلع کرتا ہے جیسا کہ قرآن مجید کے حوالوں سے اوپر گزر چکا، آئندہ مستقبل میں دنیا کے فتنوں، امت محمدیہ کے انقلاب، قیامت کے مناظر اور اس کے بعد کے پیش آنے والے واقعات کا علم آپؐ کو دیا گیا،

جیسا کہ ان دنیاوی پیشین گوئیوں اور قیامت ومحشر کے ان مناظر سے ظاہر ہے جو قرآنِ پاک اور احادیثِ صحیحہ میں صریح مذکور ہیں' اسی طرح حال کے ان احوال ومناظر کا علم بھی ثابت ہے جو باوجود سامنے موجود ہونے کے حساس وتعقل کے طبعی شرائط نہ پائے جانے کے سبب سے عام انسانوں کو نظر نہیں آتے' قبروں کا انکشاف' پس پردہ رُویت' دوسروں کے موجودہ احوال سے واقفیت وغیرہ' اس علم غیب میں سے بھی پیغمبروں کو عطا ہوتا ہے اور سب سے آخر میں وہ مغیبات ہیں جن کا احساس وتصور ہمارے مادی ذرائع علم سے قطعاً خارج ہے' تاہم وہ بھی اس کو لھائے اور بتائے جاتے ہیں' خود خدا کا دیدار' فرشتوں کی رؤیت' جنت ودوزخ کا مشاہدہ وغیرہ' ان تمام امورِ غیب ں سے اللہ تعالیٰ جس رسول کے لیے جس قدر مناسب اور سزاوار سمجھتا ہے' اس کا علم وحی کے مختلف اقسام کے ریعہ سے اس کو عطا فرماتا ہے۔

ی اور ملکۂ نبوت

حکمائے اسلام نے وحی کی حقیقت ''ملکۂ نبوت'' کے لفظ سے ظاہر کی ہے اس کی تشریح یہ ہے کہ ترتیبِ ائنات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کائنات میں علم اور تعقل نے پستی سے بلندی کی طرف رفتہ رفتہ ترقی کی ہے۔ جمادات بے حس ہیں ان کے اوپر نباتات ہیں جن میں صرف محدود احساس ہوتا ہے اور دماغی قویٰ' حافظہ' ز کر اور غور وفکر کی قوت سے وہ محروم ہیں' ان سے اونچے حیوانات ہیں' جن میں یہ تمام قویٰ ناقص طریقے سے نمودار وتے ہیں اور آخر میں ان سے بالاتر ہستی یعنی انسان میں جا کر یہ قویٰ پورے کمال میں ظاہر ہوتے ہیں' ان قویٰ کی ِقی یہیں تک محدود نہیں ہے بلکہ جس طرح نباتات میں قوتِ احساس ہے' جس سے جمادات محروم ہیں اور یوانات میں حافظہ' تصور' تعقل وغیرہ کی وہ قوتیں ہیں جو نباتات میں نہیں' انسان میں وہ دماغی وذہنی قویٰ ہیں' جو یوانات میں نہیں' اسی طرح انبیا میں علم وتعقل کی ایک ایسی قوت موجود ہوتی ہے جو عام انسانوں میں نہیں ہوتی اور ی کا نام ملکۂ نبوت ہے۔

حواس صرف مادیات کو دریافت کرتے ہیں۔ دماغی قویٰ مادیات سے بلند ذہنیات اور عقلیات کو اور ملکۂ وت اس سے بھی اونچا جاتا ہے' وہ ذہنیات وعقلیات سے بلند تر حقائق یعنی غیبیات کو دریافت کرتا ہے' اس ذریعۂ لم میں غور وبحث اور منطقیانہ فکر ونظر اور ترتیبِ مقدمات کی ضرورت نہیں پڑتی بلکہ حقائق اس طرح سامنے آتے ں جس طرح وجدانیات' فطریات' بدیہیات اور محسوسات سامنے آتے ہیں اور ان ہی کی طرح وہ یقینی بھی ہوتے ں اور چونکہ اس ذریعہ میں علم انسانی کے عام ذریعے اور طریقے یعنی وجدان' فطرتِ نوعی' بداہتِ ادلیہ' احساس اور ور وفکر سے معلومات حاصل نہیں کی جاتیں بلکہ خود علام الغیوب وہ علم ان انسانی وسائط کے بغیر ان کو عطا کرتا ہے' رع کی زبان میں اسی کو وحی والہام کہتے ہیں' علمِ کلام کی اصطلاح میں ملکۂ نبوت اور عام محاورہ میں اس کو غیبی علم لہہ لیجیے۔

لیکن اہلِ نقل کی اصطلاح میں وحی کی یہ صورت نہیں' بلکہ اللہ تعالیٰ پیغمبروں کو وقتاً فوقتاً احکام اور ارادوں سے براہِ راست فرشتوں کے ذریعہ سے مطلع کرتا رہتا ہے۔ یہی وحی ہے۔

امعانِ نظر سے معلوم ہوگا کہ اہلِ عقل و نقل کے اختلاف کا منشا یہ ہے کہ آیا یہ وحی خود پیغمبر کے مافوق اور غیر معمولی وہبی علم و فہم کا نتیجہ ہوتی ہے یا خود براہِ راست وقتاً فوقتاً تعلیمِ ربانی کا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہو کہ جس طرح عام انسانوں میں علم و فہم کی قوت آغازِ پیدائش ہی میں فطرۃً ودیعت کر دی جاتی ہے۔ اسی طرح انبیا میں منشائے الٰہی جاننے کی قوت بھی شروع ہی میں ودیعت کر دی جاتی ہے یا یہ کہ فطرۃً تو ویسے ہی عام انسانی طریقہ کا طبعی علم و فہم رکھتے ہیں' مگر اللہ تعالیٰ نبوت کے بعد اپنے منشائے الٰہی سے ان کو کسی غیبی ذریعہ سے وقتاً فوقتاً آگاہ کرتا رہتا ہے۔

لیکن واقعہ یہ ہے کہ حقیقت' عقل کی نقل سے اور نقل کی عقل سے علیحدگی میں نہیں بلکہ اتحاد میں ہے۔ وہ لوگ جو عقل و نقل دونوں کے جامع ہیں' وہ ان دونوں کو مجتمع کرتے ہیں۔

یارِ ما ایں دارد و آں نیم ہم

انبیاء علیہم السلام میں اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے بدءِ فطرت اور آغازِ پیدائش سے ان امور کے متعلق جن کا ان کی رسالت و نبوت سے تعلق ہے اور جن کو دین کہتے ہیں وہ کلی استعداد اور عمومی فہم ہوتا ہے' جس سے غیر انبیا محروم ہیں اور اس پوشیدہ قوت کا عملی ظہور اس وقت سے شروع ہوتا ہے جب وہ نبوت کے منصب پر عملاً سرفراز ہوتے ہیں' اسی کا نام ''ملکۂ نبوت'' ہے اور اہم امورِ دین کے متعلق ان کو وقتاً فوقتاً جو غیبی اطلاع ملتی رہتی ہے' اس کا نام ''وحی'' ہے۔

آج کل قرآن فہمی اور عقل کے مدعیوں اور نقل کے لفظی پابندوں میں جو اختلاف ہے وہ دراصل انہی دو قوتوں کے درمیان تمیز نہ کرنے کا نتیجہ ہے' نقل کے لفظی پابند یہ سمجھتے ہیں کہ ہر لفظ جو نبی کے منہ سے نکلتا ہے وہ اس معنی میں وحی ہے جس معنی میں قرآن ہے کہ وہ براہِ راست خدا کی غیب کی اطلاع ہے اور عقل کے مدعی یہ سمجھتے ہیں کہ قرآن بے شک خدا کی براہِ راست وحی ہے۔ مگر اس کے ماسوا رسول جو کچھ کہتا ہے وہ اس کے پیغمبرانہ نہیں بلکہ انسانی و بشری علم و فہم کا نتیجہ ہے لیکن حقیقت ان دونوں کے ماوراء ہے جیسے وحیِ قرآنی' وحی براہِ راست ہے اسی طرح نبی کے دوسرے احکام اس کے عام انسانی و بشری علم و فہم کا نہیں بلکہ اس کی پیغمبرانہ وہبی قوتِ علم و فہم کا نتیجہ ہیں' جو وحی کی ایک دوسری قسم اس لیے کہی جا سکتی ہے کہ اس کا منشا ملکۂ نبوت کے ذریعہ وحیِ ربانی کی ترجمانی ہے اس لیے پیغمبر کی وحی اور ملکۂ نبوت دونوں کے احکام واجب الاتباع ہیں۔

کتاب اور سنت

اس تقریر کا منشا یہ ہے کہ پیغمبر کو جو علم حاصل ہوتا ہے اس کی دو قسمیں ہیں' ایک وحیِ حقیقی یعنی وہ علم جس کو اللہ تعالیٰ وقتاً فوقتاً اپنے خاص الفاظ میں پیغمبر پر نازل کرتا رہتا ہے اور جس کے مجموعہ کو کتابِ الٰہی' صحیفۂ ربانی' توراۃ'

انجیل، زبور اور قرآن کا نام دیا گیا ہے، دوسرا وہ علم جو پیغمبر کے ملکۂ نبوت یا نورِ نبوت یا فہمِ نبوت کا نتیجہ ہوتا ہے پہلا علم اصلی اور دوسرا ضمنی ہے یا یوں کہو کہ پہلا اصولی اور دوسرا فروعی ہے یعنی اول پیغمبر پر شریعت کے غیر متبدل اور ازلی احکام کلیہ اور مہمات کو واضح کرتا ہے اور دوسرا علم پہلے علم کے غیر متبدل کلی اصول کے ماتحت اس کے مقصود کی صحیح تشریح اور اس کے جزئیات کی ضروری تفصیل کرتا ہے اور غیر اہم متبدل امور کے متعلق ہنگامی اوقات میں مصلحتی احکام بتاتا ہے اور اسی دوسری قسم کا علم ہے جو روایات اور احادیث کی صورت میں ہے اور جس کو اہل اصول اصطلاحاً سنت کہتے ہیں، کتاب اصولی احکام ہیں اور سنت ان اصولی احکام کی عملی تشریح اور بیان ہے، کتاب براہِ راست وحیِ الٰہی کا نتیجہ ہے اور سنت ملکۂ نبوت اور فہمِ نبوی کا، کتاب بلفظہٖ وحی ہے اور سنت بالمعنی۔

وحیِ متلو اور وحیِ غیر متلو

بعض علمائے اصول نے کتاب اور سنت دونوں کو وحی مانا ہے اور ان دونوں کے درمیان تفریق یہ کی ہے کہ کتاب اس وحی کا نام ہے جس کی تلاوت کی جاتی ہے اور سنت اس وحی کو کہتے ہیں جس کی تلاوت نہیں کی جاتی، اس تشریح کا مقصود حقیقتاً تلاوت وعدم تلاوت کا فرق نہیں ہے بلکہ یہ کہ کتاب میں معنی کے ساتھ الفاظ بھی وحی کیے گئے ہیں اور وہ الفاظ بھی محفوظ ہیں ان کا حرف حرف اور نقطہ نقطہ ﴿وَ اِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوْنَ﴾ کی پیشین گوئی میں داخل ہے اور اس لیے اس میں الفاظ کی کمی وبیشی اور حذف واضافہ محال ہے اور سنت میں الفاظ کی نہیں بلکہ صرف معانی کی حفاظت ہے اسی لیے کتاب مدوّن، مکتوب اور محفوظ کی گئی اور نماز میں اس کی قرأت کا حکم ہے اور یوں بھی عام طور سے اس کی تلاوت مسنون ہے اور سنت کی وحی بالفاظہا مقصود نہیں، اس لیے اس کی لفظی حفاظت کو اتنی اہمیت نہیں دی گئی اور نہ نماز میں اس کے الفاظ قرأت کیے جاسکتے ہیں، اور نہ ان کی تلاوت کی جاتی ہے اور نہ ان کو کتاب الٰہی کہا جاسکتا ہے مگر معناً اصولی حیثیت سے ان کی حفاظت خود قرآن نے اپنے اندر کر لی ہے اور جزئیات کی حیثیت سے گو الفاظ میں نہیں مگر عمل میں خود رسول اور اس کے پیروؤں اور پھر ان کے پیروؤں کے مسلسل تعامل سے، یہاں تک کہ آج بھی تمام مسلمانوں کے عمل درآمد سے عملی تواتر کی صورت میں محفوظ ہے اور بعد کے اماموں نے اچھی طرح تحقیق کر کے الفاظ اور کتبِ حدیث کے اوراق میں بھی ان کو محفوظ کر دیا ہے۔

سنت کو وحی کہنا اس لحاظ سے ہے کہ اس کے جزئیات اصولاً وحیِ حقیقی یعنی کتاب کے اندر داخل ہیں اور اس کی کلیت میں سنت کے تمام احکام مندرج ہیں۔ بنا بریں چونکہ سنت وحی کے کلی منشا کے اندر داخل ہے، وہ بھی ضمنی حیثیت سے وحی کہی جاسکتی ہے لیکن چونکہ اس میں الفاظ کی تعیین خدا کی طرف سے نہیں، اس لیے وہ غیر متلو ہے۔

اس فرق کا راز یہ ہے کہ کتاب کی اصلی حیثیت کلی قانون کی ہے۔ قانون کے اصل منشا کی حفاظت اور وضاحت کے لیے نہ صرف اس کے ایک ایک لفظ کے محفوظ رہنے کی ضرورت ہوتی ہے بلکہ اس کے ایک ایک نقطہ، شوشہ، وقف، وصل، فصل، عطف، قطع، تقدم، تاخر یعنی آج کل کی اصطلاح میں ایک ایک ڈیش اور کامے کی بعینہٖ

حفاظت کی ضرورت ہے، ورنہ ذرا سے تغیر میں قانون کا مطلب کچھ کا کچھ ہو جا سکتا ہے، اور سنت کی یہ کلی قانونی حیثیت نہیں ہے بلکہ وہ اس کلی قانون کی تشریحات، تفصیلات اور جزئیات ہیں، جو درحقیقت اس کلی قانون کے اندر مندرج تھے مگر چونکہ عام لوگوں کی فہم میں نہیں آتے تھے یا عام لوگ ان کو نہیں سمجھتے تھے، اس لیے صحابہؓ کے دریافت پر یا خود حضور ﷺ نے اس کی ضرورت محسوس فرما کر اس کو کھول کر بیان فرما دیا کہ پھر اشتباہ نہ رہ جائے۔

اسی مقام پر ایک اور نکتہ بھی ہے کہ کتابِ الٰہی میں جو حکم جن الفاظ میں ادا ہوا ہے وہ اگر بعض کم فہم لوگوں کی سمجھ میں نہیں آیا اور انہوں نے آنحضرت ﷺ سے اس کی تشریح چاہی اور انہیں نہیں معلوم ہوا کہ اس خاص جزئی واقعہ کا کیا حکم ہے، اور قرآن پاک کی کس اصل سے ماخوذ و مستنبط ہوگا اور اس لیے انہوں نے آنحضرت ﷺ سے دریافت کیا تو اس کے جواب میں اگر آنحضرت ﷺ قرآن پاک کے بعینہٖ ان ہی الفاظ کو بے کم و بیش دہرا دیتے تو یہ بیکار ہوتا کہ انہی الفاظ کے نہ سمجھ سکنے کے سبب سے تو سوال کی نوبت آئی اس لیے ضرور تھا کہ آنحضرت ﷺ الفاظ کو بدل کر اور طریقۂ تعبیر کو تغیر دے کر ان الفاظ کی تشریح فرمائیں اور یہی احادیث ہیں۔

درحقیقت احادیث میں قانون الٰہی اور کتابِ ربانی ہی کے مفہوم و منشا کو رسول اللہ ﷺ نے سمجھنے والوں کی سہولت، گمراہوں کی تکمیل ہدایت اور اصل منشائے الٰہی کی پوری توضیح اور کہیں پوری تاکید کی خاطر مختلف لفظوں، مختلف عبارتوں اور مختلف تعبیروں سے ادا فرمایا ہے۔ اس لیے اصل مفہوم و منشاء کے لحاظ سے احادیث کے معانی ضمناً وحی ہیں لیکن الفاظِ عبارت اور تعبیر کی حیثیت سے یعنی لفظاً وحی نہیں ہیں بلکہ فہمِ نبوی، اجتہادِ نبوی اور ملکۂ نبوت کے غیر خطا پذیر نتائج ہیں، اسی لیے ان کو اصطلاح میں ''وحی غیر متلو'' کہتے ہیں۔

ہم اس فرق کی ایک مثال دے کر اپنے مطلب کو زیادہ واضح کر دینا چاہتے ہیں، قرآن پاک میں والدین کی خدمت اور اطاعت کا حکم ہے اور ساتھ ہی یہ بھی اشارہ ہے کہ والدین کی رضامندی گناہوں کی مغفرت کا سبب ہے،(۱) یہ وحیِ الٰہی کا حقیقی منشا ہے آنحضرت ﷺ نے اس منشاءِ الٰہی کو ان الفاظ اور مختلف تعبیروں سے ادا فرمایا ''ماں کے پاؤں کے نیچے جنت ہے'' کبھی ارشاد ہوا ''رب کی خوشنودی باپ کی خوشنودی میں ہے۔'' ایک صحابی نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! میرے حسنِ سلوک کا سب سے زیادہ حق دار کون ہے؟ فرمایا ''تیری ماں، تیری ماں، تیری ماں'' ایک دفعہ آنحضرت ﷺ تشریف فرما تھے، صحابہؓ حضوری کے شرف سے ممتاز تھے کہ زبان مبارک سے یہ الفاظ ادا ہوئے۔ ''وہ ذلیل ہوا، وہ ذلیل ہوا، وہ ذلیل ہوا'' حاضرین نے عرض کی یا رسول اللہ! کون؟ ارشاد ہوا وہ جس نے اپنی ماں یا باپ کی ضعیفی پائی اور پھر ان کی خدمت گزاری کر کے جنت نہ حاصل کر لی۔ ایک اور مجلس

---

(۱) مجھے یہی شبہ تھا کہ میں اس رائے میں منفرد ہوں۔ مگر بحمد اللہ کہ تلاش و تفحص سے ثابت ہوا کہ دیگر متعدد علمائے اصول کا یہی مسلک ہے چنانچہ یہ خیال اجمالاً سب سے پہلے امام شافعی کی کتاب الرسالۃ (ص ۲۔۶۲)، ۲۹ مطبعہ علمیہ مصر ۱۳۱۴ھ میں موجود ہے اور سب سے زیادہ مفصل امام شاطبی اندلسی المتوفی ۷۹۰ھ کی اہم تصنیف الموافقات فی اصول الاحکام جلد اول ص ۱۷۵، ۲۲۱ و مطبعہ سلفیہ ۱۳۲۸ھ میں موجود ہے اور شاہ ولی اللہ صاحب کی حجۃ اللہ البالغہ میں بھی اس کا ایک باب ہے۔

میں صحابہؓ نے پوچھا کہ یارسول ﷺ نیکی کے کاموں میں خدا کو سب سے زیادہ کون سا کام پسند ہے۔ فرمایا۔ وقت پر نماز ادا کرنا۔ دریافت کیا اس کے بعد' فرمایا۔ ماں باپ کے ساتھ حسنِ سلوک کرنا۔

ان تمام احادیث پر معمولی سی غور وفکر کی نظر بھی یہ راز ظاہر کردے گی کہ یہ کل حدیثیں ذیل کی آیتوں کی تشریح وبیان ہیں۔

﴿وَ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا﴾ (البقرہ:۸۳النساء:۳۶)

''ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو۔''

﴿وَ لَا تَقُلْ لَّهُمَا اُفٍّ﴾ (بنی اسرائیل:۲۳)

''وہ بوڑھے ہوجائیں تو ان کو اف نہ کہو۔''

﴿وَ نَتَجَاوَزُ عَنْ سَيِّاٰتِهِمْ﴾ (الاحقاف:۱۶)

''یہ (ماں باپ کے خدمت گزار) وہ ہیں جن کی بدیوں سے ہم درگزر کرتے ہیں۔''

یہی حال دوسرے قرآنی احکام کے بیان وتشریحات کا ہے۔ (۱)

احادیث' قرآن کا بیان ہیں

قرآن پاک اور احادیث دونوں پر جن کی عمیق ووسیع نظر ہے ان کو یہ برملا معلوم ہوتا ہے کہ احادیثِ صحیحہ کے تمام فرعی اور ثانوی احکام قرآن پاک کے عمومی اور کل احکام کے تحت میں مندرج ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے اپنے الفاظ میں صرف ان کی تشریح فرمائی ہے۔ اس قسم کی حدیثوں کی عموماً تین شکلیں ہیں۔ ایک وہ جن میں آنحضرت ﷺ نے اپنے الفاظ میں حکم بیان فرمانے کے بعد خود قرآن پاک کی کوئی آیت اس کے ساتھ پڑھ دی۔ اس قسم کی حدیثوں کے بیان ہونے میں کس کو شبہ ہوسکتا ہے' دوسری شکل یہ ہے کہ آپ نے آیت نہیں پڑھی' مگر خود اس حکم میں ایک دو لفظ ایسے فرمادیے جو کسی آیت کا جزو ہیں جس سے یہ اشارہ ہوتا ہے کہ یہ حکم فلاں آیت کی تشریح ہے' اس صورت میں بھی اصل وفرع کی تمیز اہلِ علم کے لیے آسان ہے' تیسری شکل یہ ہے کہ آپؐ نے کسی آیت یا اشارہ کے بغیر صرف حکم بیان فرمادیا' اس قسم کی حدیثوں کے ماخذ کی تلاش دقتِ نظر کا کام ہے' ان کا پتا زبانِ نبوت اور فہمِ رسالت کے طرزِ اسلوب کے سمجھنے والے راسخینِ فی العلم ہی پاسکتے ہیں۔

الہام واجتہاد وحکمت

امام شافعی نے کتاب الرسالۃ میں احادیث وسنن کی تین قسمیں بیان کی ہیں' ایک وہ جو بعینہٖ قرآن پاک میں مذکور ہیں' دوسری وہ جو قرآن پاک کے مجمل حکم کی تشریح ہیں' تیسری وہ جن کا ذکر (بظاہر) قرآن پاک میں تفصیلاً ہے نہ اجمالاً' یہی تیسری قسم قابلِ بحث ہے' امام صاحب نے اس کے متعلق ائمہ سلف کے چار نظریے نقل کیے ہیں۔ (۱)

(۱) کتاب الرسالۃ امام شافعی ص ۸۔

(۱) اللہ تعالیٰ نے رسول کی کلی اطاعت فرض کی ہے اور اس کے علم میں پہلے ہی سے یہ ہے کہ رسول جو کچھ کہے اور کرے گا۔ اس میں رضائے الٰہی کی توفیق اس کے ساتھ شامل ہوگی' حاصل یہ ہے کہ پہلے ہی سے رسول کو یہ توفیقِ ربانی عنائت کی گئی کہ وہ رضائے الٰہی کو دریافت کرے۔

(۲) رسول نے کوئی ایسا حکم نہیں دیا ہے جس کی اصل کتاب اللہ میں نہ ہو (مقصود یہ ہوا کہ اس کے احکام بھی دراصل کتاب اللہ ہی سے ماخوذ ہیں' گو بظاہر کم بینوں کو ایسا نظر نہ آئے)۔

(۳) تمام احادیثِ نبوی القاء فی الروع ہیں (یعنی رسول کے دل میں خدا نے ڈال دیے ہیں' اور یہ اس حکمت کا نتیجہ ہیں جو آپ کے دل میں ڈالی گئی)۔

(۴) اس قسم کے تمام امور جو احادیث میں ہیں۔ کتابِ الٰہی سے جداگانہ' مستقل پیغام ربانی کے ذریعہ رسول کو معلوم ہوئے ہیں۔

چوتھے نظریہ کو چھوڑ کر بقیہ تین رائیں میرے خیال میں تقریباً ایک ہی ہیں' پہلے نظریہ کا منشا یہ ہے کہ صریح وحی کے علاوہ جو وقتاً فوقتاً نبی پر آتی رہتی ہے اس کو ابتدا ہی سے ایک توفیقِ ازلی بھی عنایت ہوتی ہے جس سے وہ پیش آمدہ امور میں رضائے الٰہی کو دریافت کر کے فیصلہ کرتا ہے' تیسرے نظریہ میں اسی توفیق علم کو الہام' القاء فی الروع اور دل میں ڈال دیے سے تعبیر کیا گیا ہے اور دوسرے نظریہ کا منشا یہ ہے کہ رسول کے جو احکام بظاہر کتاب اللہ میں نہ ہوں' ان کی اصل بھی درحقیقت کتاب اللہ میں ہے اور رسول اسی اصل سے اپنے احکام مستنبط کرتا ہے مگر ظاہر ہے کہ یہ استنباط' عام انسانی و بشری فہم سے نہیں ہوتا' ورنہ اس کا غلطی سے پاک ہونا مشتبہ رہے گا' بلکہ وہ ''پیغمبرانہ قوتِ فہم'' کا نتیجہ ہوگا اور جب ایسا ہے تو اس ''پیغمبرانہ قوتِ فہم'' کی تعبیر خواہ الہام سے کرو' القا سے کرو یا اس کو حکمتِ نبوی کا نتیجہ کہو یا توفیقِ الٰہی کہو' بات ایک ہی ہوئی۔

میرے نزدیک صحیح مسلک یہ ہے کہ رسول کے تمام صحیح ربانی احکام بھی عموماً اس کے صحیفۂ ربانی سے ماخوذ و مستنبط ہیں اور ان کے جزئیات کتابِ الٰہی کے کلیات کے تحت میں مندرج ہیں اور رسول کا یہ اخذ' استنباط اور فہم اس کی پیغمبرانہ قوتِ علم کا نتیجہ ہیں جس کو حکما ملکۂ نبوت اور اہلِ شرع حکمت' الہام اور شرحِ صدر وغیرہ الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں اور جو خطا اور غلطی سے یکسر پاک ہے۔

اجتہادِ نبوت

اس موقع پر علمائے اصول کی ایک اور اصطلاح ''اجتہادِ نبوی'' کی تشریح ضروری ہے' علمائے اصول لکھتے ہیں کہ جب کوئی نیا واقعہ آنحضرت ﷺ کے سامنے پیش آتا اور وحی نازل نہ ہوتی تو آنحضرت ﷺ اجتہاد فرماتے یعنی گزشتہ وحی شدہ احکام کے تطابق سے آپ حکم دے دیتے تھے (یہ فقہا کا طریقۂ تعبیر ہے ورنہ یوں کہنا چاہیے کہ رسول اپنی اس حکمتِ ربانی کے فیض سے مدد لے کر جو خدا نے ان کے سینہ میں ودیعت رکھی تھی' گزشتہ وحی

کے کلیات کی روشنی میں اس کا فیصلہ فرماتے تھے) بہر حال خواہ فقہا کے طریق پر اجتہادِ نبوی کو نصوصِ قرآنی سے مستنبط سمجھئے یا شاہ ولی اللہ صاحب کے نظریہ کے مطابق رسول کے علمِ سینہ اور وحی شدہ اصول کلی کے جزئیات تسلیم کیجئے، ہر حال میں وہ نتیجہ امت کے لیے واجب العمل اور خطا سے پاک ہے کیونکہ یہ مقدمہ اپنی جگہ پر ثابت ہے کہ انبیا گناہوں سے معصوم، ضلالت و گمراہی سے پاک اور ہوائے نفسانی سے مبرا ہوتے ہیں، اس لیے امورِ رسالت اور امور دین میں ان کی کوئی رائے غلط نہیں ہو سکتی کہ ان کی غلطی سے پوری امت کا غلطی پر قائم ہو جانا مسلم ہے، حالانکہ ان کی بعثت کی غرض ہدایت ہے، ضلالت نہیں، ان وجوہ سے ان کا اجتہاد اگر کبھی کسی ایسے نتیجہ پر پہنچ جاتا ہے جو مصلحتِ الٰہی کے مطابق نہیں ہوتا تو ہمیشہ اللہ تعالیٰ اس پر تنبیہ فرما کر ان کو اپنی مرضی سے مطلع فرما دیتا ہے۔ اس کی مثالیں آئندہ آئیں گی۔

الغرض بعض امور میں خیر کے کسی خاص پہلو کو پیش نظر رکھ کر اس سے بہتر پہلو سے تغافل ہونے یا غیب اور مستقبل سے عدمِ واقفیت کے سبب سے نبی کا اجتہادی خطا کرنا ممکن ہے، مگر اس خطا پر نبی کا قائم رکھا جانا ناممکن ہے، ایسی صورت میں نبی کا ہر ایسا اجتہادی حکم جس پر وحیِ الٰہی نے فوراً کوئی تنبیہ نہیں کی، یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ حکم حکمِ الٰہی کے منشا کے مطابق اور خطاء و غلطی سے مبرا ہے اور اس کے دوسرے معنی وحیِ خفی یا باطنی وحی کے ہیں۔ (۱) میری رائے میں یہ اصطلاح بھی معناً گزشتہ اصطلاحوں کے قریب قریب ہے اس لیے اس اجتہادِ نبوی کے معنی الہام، حکمت، ملکۂ نبوت، فہمِ نبوی وغیرہ گزشتہ اصطلاحات سے عملاً الگ نہیں کہ اس کی حیثیت بھی وحیِ ثانوی کی قرار پا جاتی ہے۔

اس مبحث پر شاہ ولی اللہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ میں جو خیال ظاہر فرمایا ہے اس کا ترجمہ ہم ذیل میں درج کرتے ہیں۔

❀ ❀ ❀ ❀

---

(۱) سطور بالا میں ہم نے جو کچھ لکھا ہے اس کے حوالہ کے لیے دیکھو شرح تحریر ابن ہمام المتوفی ۸۶۱ھ مسمی بہ التقریر والتحبیر للعلامہ ابن امیر الحاج المتوفی ۸۷۹ھ ج ۳ ص ۲۹۹، ۲۹۴ مطبعہ امیریہ مصر ۱۳۱۷ھ اور التلویح فی کشف حقائق التنقیح والتوضیح فی حل غوامض التنقیح ج ۲ ص ۴۵۲ مطبع مکتب صنائع قسطنطنیہ ۱۳۱۰ھ بحث الرکن الثانی فی السنۃ۔

ساتواں مبحث احادیثِ نبوی سے شریعت کے اخذ کرنے میں

علومِ نبوی ﷺ کے اقسام

رسول اللہ ﷺ کی جو روایتیں حدیث کی کتابوں میں جمع کی گئی ہیں ان کی دو قسمیں ہیں۔

(۱) ایک وہ جن کا تعلق تبلیغ رسالت سے ہے۔ اور یہ آیت:

﴿مَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَ مَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا﴾ (الحشر:۷)

''پیغمبر تم کو جو کچھ دے اس کو لے لو اور جس چیز سے منع کرے اس سے باز آ ؤ۔''

اسی قسم کے متعلق نازل ہوئی ہے۔

علومِ معاد یعنی قیامت اور آخرت کے احوال جزا اور سزا اور عجائب الملکوت (یعنی دوسرے عالم کے احوال وکیفیات) اسی قسم سے تعلق رکھتے ہیں اور ان سب کا دارومدار صرف وحی پر ہے اور ان اصول کے مطابق جن کا ذکر اوپر گزر چکا' قوانینِ شریعت اور عبادات ومعاملات کی جزئیات کا ضبط بھی اسی قسم میں داخل ہے' لیکن ان میں سے بعض چیزوں کا دارومدار وحی پر اور بعض کا اجتہاد پر ہے۔ لیکن رسول اللہ ﷺ کا اجتہاد بھی وحی کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ خداوند تعالیٰ نے آپ کو غلط رائے قائم کرنے سے محفوظ رکھا ہے اور یہ ضروری نہیں ہے کہ آپؐ کا ہر اجتہاد کسی خاص نص وآیت سے استنباط کا نتیجہ ہو جیسا کہ خیال کیا جاتا ہے بلکہ آپ کے اجتہاد کی زیادہ تر صورت یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے شریعت اور وضعِ قانون کے مقاصد' انسانوں کی آسانی اور بھلائی اور اصولی مقاصد کا قانون آپؐ کو تعلیم کر دیا تھا' وہ مقاصد جن کا ماخذ وحی تھا آپ اس کلی واصولی قانون کے ذریعہ سے جو آپ کو سکھایا گیا تھا' ان کی تشریح فرما دیا کرتے تھے' حکمت کی متفرق باتیں اور عام مصلحتیں جن کے لیے آپؐ نے نہ کوئی وقت مقرر کیا نہ ان کے حدود بتائے مثلاً اخلاقِ صالحہ اور اخلاقِ غیر صالحہ کا بیان بھی تبلیغِ رسالت سے تعلق رکھتا ہے لیکن ان میں اکثر کا دارومدار اجتہاد پر ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ خداوند تعالیٰ نے آپؐ کو باہمی معاملات واجتماع کا کلی قانون تعلیم کر دیا تھا اور آپؐ نے حکمت کی باتیں اسی کلی قانون سے جو آپؐ کو تعلیم کر دیا گیا تھا مستنبط کیں اور ان کے متعلق ایک کلیہ بنایا' فضائلِ اعمال اور ان پر عمل کرنے والوں کے مناقب بھی اسی قسم سے تعلق رکھتے ہیں اور میرے خیال میں ان میں بعض کا دارومدار وحی پر اور بعض کا اجتہاد پر ہے' ان قوانین کا بیان اوپر گزر چکا اور ہم اسی قسم کی شرح کرنا اور ان کے معانی کو بیان کرنا چاہتے ہیں۔

(۲) دوسری وہ روایتیں ہیں، جو تبلیغ رسالت سے تعلق نہیں رکھتیں، رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد کہ میں صرف ایک آدمی ہوں، جب تمہارے دین کے متعلق تم کو کوئی حکم دوں تو اس پر عمل کرو اور جب میں تم کو اپنی رائے سے کوئی حکم دوں تو یہ سمجھو کہ میں صرف ایک آدمی ہوں۔ اور چھوہاروں کے جوڑ لگانے کے واقعہ میں آپ کا یہ فرمانا کہ میں نے ایک خیال قائم کیا تھا میرے خیال پر تم لوگ عمل نہ کرو۔ البتہ جب خدا کی کوئی بات بیان کروں تو اس پر عمل کرو کیونکہ میں خدا پر جھوٹ نہیں باندھتا۔ اسی قسم سے تعلق رکھتا ہے، طب کے متعلق حدیثیں اور آپ کا ارشاد کہ تم سیاہ رنگ اور ایسے گھوڑے پر سوار ہو جس کی پیشانی میں تھوڑی سی سفیدی ہو، اسی قسم میں داخل ہے اور اس کا دار و مدار تجربہ پر ہے۔

آپ نے جو کچھ عادۃً کیا، عبادۃً نہیں، اتفاقاً کیا، قصداً نہیں، وہ بھی اسی قسم میں داخل ہے، آپ نے جو واقعات ایسے بیان کئے جن کا تمام قوم میں چرچا تھا مثلاً ام زرع اور خرافہ کے قصے، وہ بھی اسی قسم سے تعلق رکھتے ہیں اور اسی بات کو حضرت زیدؓ بن ثابت نے جب ان سے چند لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کی حدیثیں بیان کرنے کی درخواست کی، اس طرح بیان کیا ہے کہ میں آپؐ کا پڑوسی تھا، اور جب آپؐ پر وحی نازل ہوتی تھی تو آپؐ مجھ کو بلا بھیجتے تھے اور میں آپؐ کے حکم سے اس کو لکھا کرتا تھا لیکن جب ہم دنیا کا ذکر کرتے تھے تو آپ بھی ہمارے ساتھ اس کا ذکر فرماتے تھے اور جب ہم آخرت کا ذکر کرتے تھے تو آپ بھی ہمارے ساتھ اس کا ذکر کرتے تھے اور جب ہم کھانے کا ذکر کرتے تھے تو آپ بھی ہمارے ساتھ اس کا ذکر کرتے تھے، تو کیا میں ان تمام چیزوں کو بطور حدیث بیان کروں؟

اسی میں وہ چیزیں بھی داخل ہیں جن کو آپؐ نے اپنے زمانہ کی جزئی و عارضی مصلحت کے طور پر کیا ہے اور وہ تمام امت کے لیے ضروری نہیں ہیں مثلاً فوجوں کی آراستگی اور جنگی علامت کی تعیین کے وہ احکام جن کو خلیفہ دیتا ہے اور حضرت عمرؓ کے اس قول کے کہ ''اب ہم کو حج میں اکڑ کر چلنے کی کیا ضرورت؟ ہم ایک قوم (کفار قریش) کے سامنے اس کی نمائش کرتے تھے لیکن اب خدا نے ان کو ہلاک کر دیا'' بھی یہی معنی ہیں کہ وہ اس کو ایک جزئی اور عارضی مصلحت سمجھتے تھے، لیکن چونکہ اپنے اس اجتہاد پر پورا اطمینان نہ تھا۔ اس لیے ان کو یہ خوف ہوا کہ خاص اس کا کوئی اور سبب ہو، اس لیے اس میں دست اندازی نہیں کی، اسی طرح دوسرے احکام بھی اسی پر محمول کیے گئے ہیں، مثلاً آپؐ کا یہ ارشاد کہ ''جو شخص جس کو قتل کرے۔ اس کا ہتھیار اسی کا حق ہے'' نیز آپؐ کے مخصوص فیصلے بھی اسی قسم میں داخل ہیں کہ آپ مقدمات کے ان فیصلوں میں گواہوں اور قسموں کے مطابق فیصلے کرتے تھے آپؐ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے جو یہ فرمایا تھا کہ ''واقعہ میں حاضر جو کچھ دیکھتا ہے اس کو غائب نہیں دیکھتا'' اس کے معنی بھی یہی ہیں۔ (انتہی کلامہ)

شاہ صاحب کے نظریہ کا خلاصہ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کے ارشادات کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ جن کا تعلق پیغمبرانہ فرائض، تبلیغِ رسالت اور مہماتِ امورِ دین سے ہے، یہ تمام باتیں براہِ راست وحی و تعلیم سے ماخوذ ہیں

دوسری وہ جو عام انسانی باتیں ہیں' ان کی متعدد صورتیں ہیں۔

(۱) کسی جزئی عارضی مصلحت کی بنا پر کوئی حکم جیسے حج میں آپ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ قریش کے سامنے اکڑ کر سعی کریں' تاکہ قریش یہ نہ سمجھیں کہ مدینہ کی آب وہوا نے ان کو کمزور کر دیا ہے۔

(۲) وہ امور جن کو دین ورسالت سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں' بلکہ زمانہ کے حالات کے ساتھ وہ بدلتے رہتے ہیں مثلاً جنگ کا طریق' ہتھیار کے اقسام' حکومت کے صیغوں کی ترتیب وغیرہ۔

(۳) وہ امور جن کو آپ اپنی شخصی' قومی یا ملکی عادت کے مطابق کرتے تھے' جن کو دین ورسالت سے کوئی واسطہ نہیں مثلاً وضع ولباس' فرش پر نشست' مکمل اوڑھنا' دسترخوان اور چمچوں کا عدم استعمال' عمامہ باندھنا' تہبند' اونٹ پر سوار ہونا وغیرہ۔

(۴) وہ امور جو عرب میں بطور قصہ کے مشہور تھے اور آپ نے بھی ان کو اسی طرح تفننِ طبع کے لئے یا کسی اخلاقی نتیجہ کی خاطر بیان فرمایا' مثلاً ام زرع اور ان کی نو سہیلیوں کی کہانی' خرافہ کی داستان' بنی اسرائیل کی بعض حکایتیں۔

(۵) عربوں کے بعض تجربی مسلمات اور علاج ومعالجہ کی بعض باتیں۔

(۶) زراعت وغیرہ کے متعلق بعض ذاتی رائیں' مثلاً مدینہ میں قاعدہ تھا کہ فصل کے موقع پر نر چھوہاروں کے پھول مادہ چھوہاروں کے درختوں میں ڈالے جاتے تھے۔ آپ نے یہ طریقہ دیکھا تو اس کو محض رسمی بات سمجھ کر فرمایا کہ اگر ایسا نہ کیا کرو تو کیا ہو۔ مدینہ والوں نے آپ کے اس ہلکے سے اشارہ کو حکم کے طور پر مانا اور اس سال یہ ترکیب چھوڑ دی' نتیجہ یہ ہوا کہ اس سال پیداوار کم ہوگئی' لوگوں نے آ کر عرض کی' فرمایا میں نے ایسا خیال کیا تھا۔ اَنْتُمْ اَعْلَمُ بِاَمُوْرِ دُنْیَاکُمْ ''تم اپنے دنیاوی کاروبار اور معاملات سے زیادہ واقف ہو۔'' یہ امور تغیر اور ردوبدل کے قابل ہو سکتے ہیں۔

الغرض یہ وہ امور ہیں جن میں رسول کے ارشادات کی حیثیت' انسانی باتوں کی ہے لیکن ان کے علاوہ دوسرے امور جن کا تعلق دین ورسالت ونبوت سے ہے مثلاً عقائد' عبادات' اخلاق اور اخبارِ معاد اور معاملات کے بعض ضروری حصے' یہ سب کے سب وحی اور تعلیم ربانی سے ہیں جو دائمی اور ناقابل تغیر ہیں۔

ان ناقابلِ تغیر امور کی تعلیم واطلاع کی دو صورتیں ہیں' ایک براہِ راست وحیِ الٰہی جو وقتاً فوقتاً پیغمبر کی تعلیم و اطلاع کے لیے خدا کی طرف سے آیا کرتی تھی اور دوسری اجتہادِ نبوی' یہاں بحث اسی دوسری چیز سے ہے۔ شاہ صاحب اس کے متعلق دو باتیں فرماتے ہیں۔

(۱) یہ کہ اجتہادِ نبوی کی صورت وحقیقت مجتہدین کے اجتہاد کی طرح نہیں ہے' مجتہدین کا اجتہاد کسی خاص نص سے استنباط کا نام ہے اور پیغمبروں کے اجتہاد کی صورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اجمالی طور سے شریعت کے کلی اصول وقواعد کا علم' منصبِ نبوت کے ساتھ ساتھ عطا فرما دیا ہے' اسی علم کے مطابق آپ وحی کی توضیح' احکامِ

منصوصہ کی تفصیل، کسی کلیہ کے جزئیات، مسائل کی تشریح، اپنے الفاظ میں فرمادیا کرتے تھے۔

(۲) پیغمبروں کا یہ اجتہاد دوسرے عام انسانی مجتہدین کے اجتہادات کے برخلاف خطاو غلطی سے یکسر پاک ومنزہ ہوتا ہے کیونکہ ان کی رائے خطاو غلطی پر باقی رکھے جانے سے محفوظ بنائی گئی ہے، اسی لیے ان کا پیغمبرانہ اجتہاد بھی بمنزلۂ وحی کے ہے۔

''پیغمبرانہ اجتہاد'' کی جو تشریح شاہ صاحب نے فرمائی ہے، اس کو پیش نظر رکھ کر یہ فیصلہ نہایت آسان ہے کہ دوسرے لوگ ملکۂ نبوت، الہام، القا، حکمتِ ربانی، فہمِ نبوی سے جو کچھ مراد لیتے ہیں اس میں اور اجتہاد نبوی میں عملاً کوئی فرق نہیں ہے کہ اس اجتہاد سے مقصود وہ قوتِ علمیہ یا الہامیہ یا نبویہ ہے، جس کو اللہ تعالیٰ خاص پیغمبر کے سینہ میں ودیعت رکھتا ہے، اس لیے مجتہدانہ اجتہاد اور پیغمبرانہ اجتہاد کے درمیان صرف لفظ کی مشارکت ہے معنی کی نہیں، مزید بحث آگے آئے گی۔

ایک نکتہ کی طرف یہاں اور اشارہ کردینا ہے، آنحضرت ﷺ کے سوا اور جتنے صاحب کتاب انبیاؑ آئے ان کی وحی کتاب اور نتائج حکمتِ نبوی میں فرق وامتیاز باقی نہیں رہا، چنانچہ توراۃ وانجیل وزبور میں یہ سب باتیں ملی جلی ہیں جیسا کہ ان کے پڑھنے سے ہر شخص کو نظر آسکتا ہے۔ مگر محمد رسول اللہ ﷺ چونکہ آخری اور غیر منسوخ کتاب لے کر آئے تھے اس لیے آپؐ کی کتاب کی ہر طرح حفاظت کی گئی اور ہر تخلیط اور آمیزش سے محفوظ رکھی گئی، بلکہ اسی لیے آغازِ اسلام میں آپؐ نے نتائجِ حکمتِ نبوی کی تحریر سے لوگوں کو باز رکھا تاکہ کتاب کے ساتھ ان کی آمیزش نہ ہو، بعد کو جب یہ خطرہ باقی نہیں رہا تو اکثروں کے نزدیک یہ ہے کہ آپؐ نے ان کی اجازت دے دی اور بعض متشدد صحابہؓ اور علما کے نزدیک یہ اجازت مخصوص لوگوں کے لیے تھی۔ عام نہیں، لیکن یہ اختلاف تحریر وکتابت میں ہے، ان کی صحیح طور سے حفاظت وروایت وتبلیغ میں نہیں، اس لیے اس خدمت کو تمام صحابہ، تابعین اور تبع تابعین اور علمائے صالحین نے ہمیشہ ادا کیا۔

عصمت وبے گناہی

نبی کی تیسری اہم خصوصیت اس کی معصومی اور بے گناہی ہے، یہود میں چونکہ پیشین گوہونے کے علاوہ نبی کا کوئی صحیح تخیل نہیں، اس لیے ان کی کتابوں میں انبیائے کرام علیہم السلام کی طرف ایسی باتیں منسوب کی گئی ہیں جو ان کی شان نبوت کے سراسر منافی ہیں، عیسائیوں میں صرف ایک مسیحؑ کی ذات معصوم مانی جاتی ہے لیکن اسلام میں یہ عقیدہ ہر نبی اور رسول کی نسبت عام ہے اس کے نزدیک تمام انبیا اور رسول گناہوں سے پاک اور معصوم تھے ان سے بتقاضائے بشریت بھول چوک ہوسکتی ہے مگر اللہ تعالیٰ اپنی وحی سے ان کی ان غلطیوں کی بھی اصلاح کرتا رہتا ہے۔ نبوت کے متعلق عقلی حیثیت سے بھی جب تک عصمت کا اصول مان نہ لیا جائے، نبی اور عام حکیم ومصلح میں فرق نمایاں نہیں ہوسکتا اور نہ نبیوں اور رسولوں کی کامل صداقت وصحت پر اعتبار کیا جاسکتا ہے۔ اسی لیے اسلام نے اس

عقیدہ کا بھی بڑا اہتمام کیا ہے۔ ایک ایک کر کے تمام پیغمبروں کے مقدس احوال کا تذکرہ کیا ہے اور ان واقعات کی تردید کی ہے جو شانِ عصمت کے خلاف ہیں اور جن کو لوگوں نے ان کے سوانح میں شامل کر دیا ہے۔

عرب کے مشرکوں کا یہ عقیدہ تھا کہ کاہن جو غیب کا حال بتاتے ہیں اور شاعر جو پر جوش اور پر تاثیر کلام نظم کرتے ہیں یہ شیطانوں سے سیکھ کر بتاتے اور کرتے ہیں اور یہی بات وہ محمد رسول اللہ ﷺ کی نسبت بھی (نعوذ باللہ) کہتے تھے قرآن نے ان کے جواب میں کہا' درخت اپنے پھل سے اور شے اپنے آثار سے پہچانی جاتی ہے۔

﴿اِنَّهٗ لَيْسَ لَهٗ سُلْطَانٌ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ اِنَّمَا سُلْطَانُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يَتَوَلَّوْنَهٗ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِهٖ مُشْرِكُوْنَ۝﴾ (النحل:۹۹'۱۰۰)

''شیطان کا زور ایمان والوں پر نہیں چلتا اور نہ ان پر جو اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں اس کا زور انہی پر چلتا ہے جو اس سے دوستی کرتے ہیں اور اپنے رب کا شریک ٹھہراتے ہیں۔''

اس کے بعد آخر تک اس خیال کی تردید کی ہے اور پھر خاتمہ اس پر ہے:

﴿وَاصْبِرْ وَ مَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ وَ لَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِيْ ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُوْنَ۝ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّ الَّذِيْنَ هُمْ مُّحْسِنُوْنَ﴾ (النحل:۱۲۷'۱۲۸)

''اور صبر کر اور تیرا صبر کرنا بھی خدا ہی کی مدد سے ہے اور نہ تو ان پر غمگین ہو اور نہ ان کے فریب سے تنگدل ہو بے شک خدا ان کے ساتھ ہے جو پرہیزگار ہیں اور جو نیکوکار ہیں۔''

اس آیت سے ظاہر ہوا کہ انبیائے کرام شیطانوں کے فریب سے آزاد متقی' پرہیزگار اور نیکوکار ہوتے ہیں۔

سورہ شعراء میں اسی شبہ کا جواب تمام پیغمبروں کے حالات کو سنا کر آخر میں یہ کہہ کر دیا ہے۔

﴿هَلْ اُنَبِّئُكُمْ عَلٰى مَنْ تَنَزَّلُ الشَّيٰطِيْنُ تَنَزَّلُ عَلٰى كُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ يُّلْقُوْنَ السَّمْعَ وَ اَكْثَرُهُمْ كٰذِبُوْنَ۝﴾ (الشعراء:۲۲۱-۲۲۲)

''کیا میں تمہیں بتاؤں کہ شیطان کس پر اترتے ہیں ان پر اترتے ہیں جو جھوٹ گھڑتے ہیں' گنہگار ہوتے ہیں لوگوں کو یہ یقین دلانے کے لیے کہ وہ غیب کی باتیں سن رہے ہیں' کان میں ڈالتے ہیں اور وہ اکثر جھوٹے ہوتے ہیں۔''

سورۂ جاثیہ میں مخالفین کے جواب میں کہا گیا ہے:

﴿وَيْلٌ لِّكُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ۝ يَّسْمَعُ اٰيٰتِ اللّٰهِ تُتْلٰى عَلَيْهِ ثُمَّ يُصِرُّ مُسْتَكْبِرًا كَاَنْ لَّمْ يَسْمَعْهَا فَبَشِّرْهُ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ۝﴾ (الجاثیہ:۷-۸)

''پھٹکار ہو اس پر جو جھوٹ گھڑنے والا گنہگار ہے خدا کی آیتوں کو جو اس کو پڑھ کر سنائی جاتی ہیں' وہ سنتا ہے' اور پھر اپنے غرور پر اڑا رہتا ہے' گویا اس نے سنا نہیں تو اس کو دردناک عذاب کی بشارت دے دو۔''

اس کے معنی یہ ہوئے کہ انبیا علیہم السلام جھوٹ گھڑنے والے اور گنہگار نہیں ہوتے کہ اگر ایسے ہوں تو نرشتوں کے بجائے وہ شیطانوں کے قرین و رفیق ثابت ہوں اور ان کی سچائی اور صداقت مشتبہ ہو جائے اور نیز یہ کہ نبوت کی حقیقت کذب و گنہگاری کے صریح منافی ہے۔

ایک اور موقع پر ارشاد ہوا:

﴿مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَ الْحُكْمَ وَ النُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ (آل عمران:۷۹)

''اس آدمی کے جس کو اللہ کتاب اور فیصلہ اور نبوت دے یہ شایان نہیں کہ وہ لوگوں سے کہے کہ خدا کو چھوڑ کر میرے بندے ہو جاؤ۔''

یعنی پیغمبروں کی دعوت کا منشا خدا کی بندگی کا اعلان ہے نہ کہ لوگوں کو اپنا بندہ اور پرستار بنانا' اور یہ گناہ ان سے سرزد نہیں ہوتا اور ایک آیت میں فرمایا:

﴿وَ مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّغُلَّ وَ مَنْ يَّغْلُلْ يَاْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ○ اَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللّٰهِ كَمَنْۢ بَآءَ بِسَخَطٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ مَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ وَ بِئْسَ الْمَصِيْرُ ○ هُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَ اللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ○ لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَ يُزَكِّيْهِمْ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ اِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ○﴾ (آل عمران:۱۶۱'۱۶۴)

''کسی پیغمبر کا یہ کام نہیں کہ وہ کچھ چوری سے چھپا لے اور جو کوئی چھپا لے گا' قیامت کے دن لے کر اس کو حاضر ہوگا' پھر اس وقت ہر شخص کو اس کے کام کا پورا بدلہ ملے گا اور ان پر ظلم نہ ہوگا' کیا جو خدا کی خوشنودی کی پیروی کرے وہ اس جیسا ہو سکتا ہے جو خدا کا غضب کمائے اور اس کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ برا ٹھکانا ہے انسانوں کے خدا کے نزدیک کئی درجے ہیں اور خدا ان کے کام سے خبردار ہے۔ بے شبہ اللہ نے ایمان والوں پر احسان کیا کہ ان میں انہی میں سے ایک ایسے رسول کو بھیجا جو ان کو اس کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور ان کو پاک وصاف بناتا اور کتاب و حکمت سکھاتا ہے اور بے شک وہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔''

ان آیتوں میں گوہر نبی سے غلول (مال چھپانے) کی نفی کی ہے اور فرمایا ہے کہ نبی جو خدا کی خوشنودی کی ہمیشہ پیروی کرتے ہیں وہ ان کے مانند نہیں ہو سکتے جو خدا کی خفگی کماتے ہیں' مگر خصوصیت کے ساتھ آنحضرت ﷺ کی طرف اشارہ ہے اور بتایا گیا ہے کہ نبی کی یہ شان نہیں کہ اس سے ایسا جرم سرزد ہو سکے' کیونکہ اللہ کی رضامندی کا طالب اس کی ناخوشی کے کام کا مرتکب نہیں ہو سکتا' اور جو دوسروں کو احکامِ الٰہی سنائے' خود اس سے ان احکام کی خلاف ورزی ممکن نہیں اور جو دوسروں کو پاک وصاف کرنے پر مامور ہے وہ خود گنہگار و ناپاک نہیں ہو سکتا۔

انبیا علیہم السلام کے لیے بار بار قرآن نے ''چن کر پسند کرنے'' کا لفظ استعمال کیا ہے جو سرتاسر ان کی عصمت اور

گناہوں سے محفوظ و پاک رہنے پر دلالت کرتا ہے' عام پیغمبروں کے متعلق یہ آیت ہے:

﴿اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلاً وَّ مِنَ النَّاسِ﴾ (الحج:۷۵)

''خدا فرشتوں میں اپنے پیغمبر چن کر پسند کرتا ہے اور آدمیوں میں سے۔''

چند مخصوص پیغمبروں کی شان میں ہے۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰٓى اٰدَمَ وَ نُوْحًا وَّ اٰلَ اِبْرَاهِيْمَ وَ اٰلَ عِمْرَانَ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ﴾ (آل عمران: ۳۳)

''اللہ نے آدم' نوح' آل ابراہیم اور آل عمران کو تمام اہل دنیا سے چن کر پسند کیا۔''

خاص حضرت ابراہیمؑ کے متعلق ارشاد ہوا:

﴿وَ لَقَدِ اصْطَفَيْنَاهُ فِي الدُّنْيَا﴾ (البقرہ:۱۳۰)

''ہم نے اس کو دنیا میں چن کر پسند کیا۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نسبت فرمایا۔

﴿اِنِّي اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسٰلٰتِيْ وَ بِكَلَامِيْ﴾ (الاعراف:۱۴۴)

''ہم نے تجھ کو اپنے کلام اور پیغاموں کے لیے لوگوں میں سے چن کر پسند کیا۔''

ایک آیت میں پیمبروں کے لیے اصطفاء کے ساتھ خیر (بہتر اور نیکوکار) کی صفت ظاہر کی گئی ہے:

﴿وَاذْكُرْ عِبَادَنَآ اِبْرَاهِيْمَ وَ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ اُولِي الْاَيْدِيْ وَ الْاَبْصَارِ اِنَّآ اَخْلَصْنٰهُمْ بِخَالِصَةٍ ذِكْرَى الدَّارِ ○ وَ اِنَّهُمْ عِنْدَنَا لَمِنَ الْمُصْطَفَيْنَ الْاَخْيَارِ﴾ (صٓ:۴۵'۴۷)

''ہمارے خاص بندوں ابراہیمؑ اور اسحاقؑ اور یعقوبؑ کو یاد کرو۔ جو ہاتھوں (قوت عمل) والے اور آنکھوں (قوتِ علم) والے تھے ہم نے ان کو آخرت کی خالص نصیحت کے لیے خالص کیا اور وہ ہماری بارگاہ میں چنے ہوئے نیکوکاروں میں تھے۔''

سورۂ انبیاء میں اکثر پیغمبروں کے تذکرہ کے بعد فرمایا:

﴿وَ كُلًّا جَعَلْنَا صَالِحِيْنَ ○ وَ جَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا وَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرٰتِ وَ اِقَامَ الصَّلٰوةِ وَ اِيْتَآءَ الزَّكٰوةِ وَ كَانُوْا لَنَا عٰبِدِيْنَ﴾ (الانبیاء:۷۲'۷۳)

''ان میں سے ہر ایک کو ہم نے صالح بنایا اور ہم نے ان کو وہ پیشوا بنایا جو ہمارے حکم سے لوگوں کو راہ دکھاتے تھے اور ہم نے ان کو نیک کاموں کے کرنے کی اور نماز کھڑی کرنے اور زکوٰۃ دینے کی وحی کی اور وہ ہمارے پرستار تھے۔''

کیا اس سے زیادہ ان کی عصمت اور بے گناہی کی شہادت ہو سکتی ہے کہ وہ امام و پیشوا اور صالح اور خدا کے پرستار بنائے گئے۔ سورۂ انعام میں بہت سے پیغمبروں کے نام گنا کر سب کو صالح فرمایا گیا:

﴿كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ﴾ (انعام:۸۵)

''یہ سب صالحوں میں تھے۔''

پھر آگے چل کر فرمایا :

﴿كُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعٰلَمِيْنَ﴾ (انعام:۸۶)

''ہر ایک کو دنیا والوں پر فضیلت دی۔'' پھر ان کا ذکر کر کے فرمایا:

﴿وَاجْتَبَيْنٰهُمْ وَ هَدَيْنٰهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ﴾ (انعام:۸۷)

''اور ہم نے ان کو برگزیدہ کیا اور ان کو سیدھی راہ چلایا۔'' صالح ہونا برگزیدہ ہونا اور راہ راست پر ہونا سراسر عصمت اور بے گناہی ہے۔

شقی وسعید اور گنہگار و نیکوکار دونوں کی سیرتوں اور زندگیوں کا فرق اتنا نمایاں ہے کہ ان میں التباس اور اشتباہ ممکن نہیں، تاریخ وسیر کی خاموش اور خلق کی گویا زبانیں چیخ چیخ کر اس فرق وامتیاز کی منادی کرتی رہتی ہیں، اس اصول کو قرآن پاک نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے۔

﴿اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ اجْتَرَحُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَوَآءً مَّحْيَاهُمْ وَ مَمَاتُهُمْ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ﴾ (جاثیہ:۲۱)

''کیا وہ جو گناہوں کے مرتکب ہیں، یہ گمان کرتے ہیں کہ ہم ان کو ان کی طرح جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے بنائیں گے ان دونوں کی زندگی اور موت یکساں ہو، یہ ان کا فیصلہ کتنا برا ہے۔''

اس آیت پاک سے معلوم ہوا کہ ان دونوں کی زندگی اور موت دونوں ممتاز ہوتی ہیں۔

انبیاء کے وصف میں فرمایا:

﴿اَلَّذِيْنَ يُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللّٰهِ وَ يَخْشَوْنَهٗ وَ لَا يَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ﴾ (احزاب:۳۹)

''جو اللہ کے پیغاموں کو پہنچاتے ہیں اور اس سے ڈرتے ہیں اور اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے۔''

آنحضرت ﷺ کے اہلِ بیت اور بیویوں کو جو عزت اور شرف حاصل ہے وہ نبوت ورسالت ہی کی نسبت سے ہے، ازواجِ مطہرات کی شان میں ہے:

﴿يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَيْتُنَّ﴾ (احزاب:۳۲)

''اے پیغمبر کی بیویو! تم عام عورتوں میں سے کسی ایک کی طرح نہیں ہو اگر تم متقی ہو۔''

پھر اہلِ بیتِ نبوی کو خطاب کر کے فرمایا کہ ارادۂ ربانی یہ ہے کہ وہ تم کو برائی سے پاک اور صاف ستھرا بنائے۔

﴿اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَ يُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا﴾ (احزاب:۳۳)

''اللہ یہی چاہتا ہے کہ تم سے ناپاکی کو دور کر دے اے نبی کے گھر والو! اور تم کو بالکل صاف ستھرا بنا دے۔''

ظاہر ہے کہ اگر انبیاء علیہم السلام کے ازواج و اولاد کی شرافت کے لیے گناہ اور بدی کی نجاست مخل ہے تو خود انبیاؑ کا کیا ذکر ہے' ایک دوسری آیت میں حضرت عائشہؓ کو تہمت سے بری کر کے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿اَلْخَبِیْثٰتُ لِلْخَبِیْثِیْنَ وَ الْخَبِیْثُوْنَ لِلْخَبِیْثَاتِ وَ الطَّیِّبَاتُ لِلطَّیِّبِیْنَ وَ الطَّیِّبُوْنَ لِلطَّیِّبَاتِ اُولٰٓئِکَ مُبَرَّءُوْنَ مِمَّا یَقُوْلُوْنَ﴾ (النور:۲۶)

''گندیاں' گندوں کے واسطے اور گندے گندیوں کے لیے اور ستھریاں ستھروں کے واسطے اور ستھرے ستھریوں کے واسطے یہ ان کی تہمت سے پاک ہیں۔''

یہاں طیب' پاک اور ستھرے سے ظاہر ہے کہ آنحضرت ﷺ کی طرف اشارہ ہے اور اسی ستھرے پن' پاکی' اور طہارت سے ازواج کے اخلاقی ستھرے پن' پاکی اور طہارت پر استدلال کیا گیا ہے۔

انبیا درحقیقت مقتدیٰ اور پیشوا اور نمونہ بن کر اس دنیا میں بھیجے جاتے ہیں' اسی لیے فرمایا:

﴿لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ﴾ (احزاب:۲۱)

''تمہارے لیے خدا کے رسول میں اچھی پیروی ہے۔''

نیز ان کی اطاعت واجب ہے:

﴿وَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِیُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰہِ﴾ (النساء:۶۴)

''ہم نے کوئی نبی نہیں بھیجا لیکن اس لیے کہ خدا کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے۔''

اور خاص آنحضرت ﷺ کی نسبت تصریح ہے کہ آپؐ کی پیروی خدا کا محبوب بننے کا مستحق ٹھہراتی ہے۔

﴿اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ﴾ (آل عمران:۳۱)

''اگر تم خدا کو چاہتے ہو تو تم میری پیروی کرو' خدا تم کو چاہے گا۔''

کیا کسی گنہگار اور عصیان کار کی زندگی' پیروی' اتباع اور نمونہ بننے کی صلاحیت رکھتی ہے' تاریکی سے روشنی کبھی نکلی' اور گندگی سے پاکی کبھی پیدا ہوئی اور گنہگاروں کی دعوت سے کبھی نیکوکاری پھیلی ہے؟ برائی اور گنہگاریوں کا اصلی سرچشمہ اور منبع شیطان یا انسان کی خود قوتِ شر ہے' لیکن خدا کے خاص بندے اس کے دامِ فریب سے آزاد ہیں۔

﴿اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْھِمْ سُلْطَانٌ وَّ کَفٰی بِرَبِّکَ وَکِیْلًا﴾ (بنی اسرائیل:۶۵)

''یقیناً میرے بندوں پر تیرا (اے شیطان) کوئی زور نہیں' تیرا پروردگار (اپنے بندوں کی طرف سے) سب کچھ کر دینے کو بس کافی ہے۔''

کیا انبیائے کرام علیہم السلام سے بڑھ کر کوئی بندۂ رب ہو سکتا ہے۔

انسانوں کی گمراہی اور عصیان کاری' وسوسۂ شیطانی کا نتیجہ ہوتی ہے' خواہ یہ شیطان خود اپنے دل کے اندر (خناس) چھپا ہو' یا انسان اور جن کی صورت میں ہو۔ ہر ایک کے فتنہ سے ان کی (انبیاؑ کی) ذات پاک اور بلند ہے۔

آنحضرت ﷺ کو بعض خودغرض لوگوں نے بعض مشوروں میں پھسلانا چاہا' مگر خدا نے پھسلنے نہ دیا اور فرمایا کہ میری جو رحمت اور مہربانی تجھ پر مبذول ہے' وہ ہر وقت تیری دست گیر ہے اور گمراہی سے تیری نگہبان ہے اور کتاب الٰہی اور حکمت و دانائی جو تجھے عطا ہوئی وہ تیری پاسبان ہے:

﴿وَ لَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَ رَحْمَتُهٗ لَهَمَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ يُّضِلُّوْكَ وَ مَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَ مَا يَضُرُّوْنَكَ مِنْ شَيْءٍ وَ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ عَلَّمَكَ مَالَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ وَ كَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا﴾ (نساء:۱۷)

''اور اگر تجھ پر اللہ کا فضل اور مہربانی نہ ہوتی' تو ایک گروہ نے تیرے گمراہ کرنے کا ارادہ کیا تھا اور وہ گمراہ نہیں کریں گے لیکن خود اپنے آپ کو' اور تجھے کچھ بھی نقصان نہ پہنچا سکیں گے اور خدا نے تجھ پر کتاب اور حکمت اتاری ہے اور اس نے وہ سکھایا جو تو نہیں جانتا تھا اور تجھ پر خدا کا بڑا فضل ہے۔''

اور یقیناً موقع و محل کی شہادت سے اس سب سے بڑے فضل سے یہاں مراد عصمت ہے۔

خود نفس انسانی بھی اپنی جھوٹی تمناؤں' خودغرضانہ آرزوؤں اور خوش نما خیالوں سے لوگوں کو دھوکا دیتا ہے لیکن انبیا علیہم السلام اس فریبِ تمنا سے بھی پاک ہیں' بشریت کے اقتضا سے یہ تو ممکن نہیں کہ خود اپنے مشن اور جس دعوتِ حق کو لے کر وہ آئے ہیں۔ اس کی جلد از جلد کامیابی اور لوگوں کے بسرعت قبول ایمان کے متعلق ان کے دل میں تمنائیں اور آرزوئیں نہ پیدا ہوں' لیکن وہ مصلحتِ الٰہی کے مطابق نہیں ہوتیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ ان خیالات اور تمناؤں کو ان کے دلوں سے نکال دیتا ہے اور اپنے فیصلہ کو برجا رکھتا ہے' فرمایا:

﴿وَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّ لَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطَانُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ﴾ (حج:۵۲)

''اور ہم نے تجھ سے پہلے کوئی نبی یا رسول نہیں بھیجا لیکن یہ کہ جب وہ خیال باندھتا ہے تو شیطان اس کے خیال میں کچھ ملا دیتا ہے تو خدا شیطانوں کی ملاوٹ کو مٹا دیتا ہے اور اپنے حکموں کو مضبوط کر دیتا ہے اور خدا دانا اور حکمت والا ہے۔''

اس سے معلوم ہوا کہ انبیائے کرام غلط خیال آرائی کے گناہ سے بھی محفوظ رکھے جاتے ہیں۔

آنحضرت ﷺ کے متعلق فرمایا گیا:

﴿مَاضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَ مَا غَوٰى﴾ (نجم:۲)

''اے مسلمانو! تمہارا صاحب نہ گمراہ ہوا نہ بھٹکا۔''

اس عدم گمراہی اور عدم ضلالت کا تعلق کسی خاص عہد اور وقت سے نہیں ہے' بلکہ اس آیت میں آنحضرت ﷺ کے ہر عہدِ سابق اور زمانۂ ماضی سے ضلالت اور غوایت کی پوری نفی کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ آپ کا دامن سدا ان کانٹوں سے پاک رہا۔

بعض شبہات کا ازالہ

قرآن پاک میں بعض ایسے الفاظ ہیں جن سے ایک ظاہر بین کو یہ دھوکا ہو سکتا ہے کہ بعض پیغمبروں کے دامن پر عدمِ معصومیت کے بھی داغ ہیں مگر علمائے محققین نے ان میں سے ہر ایک شبہ کا تشفی بخش جواب دے دیا ہے اور خصوصیت کے ساتھ علامہ ابن حزم اندلسی نے الفصل فی الملل والنحل۔ (جلد چہارم) میں' قاضی عیاض مالکی نے شفاء (قسم ثالث' باب اول) میں' خفاجی نے شرح شفا (جلد چہارم) میں اور متاخرین میں ملا دوست محمد کابلی نے تحفۃ الاخلاء فی عصمۃ الانبیاء۔ میں ایک ایک شبہ کو پوری طرح رد کیا ہے جس سے ظاہر بینی کا پردہ آنکھوں کے سامنے سے ہٹ جاتا ہے اور اصل حقیقت ظاہر ہو جاتی ہے' ان میں سے ہر شبہ کا ذکر کرنا اور اس کا رد کرنا ایک طول عمل ہے مختصراً اصولی طور سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس مسئلہ میں جو غلط فہمیاں کسی کو پیش آتی ہیں ان کے دو اسباب ہیں' اور ان اسباب کی تشریح کر دینا ہی ان غلط فہمیوں کو دور کر دینا ہے۔

(۱) سب سے پہلی بات یہ ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ انبیاء علیہم السلام کا پایہ بندوں میں بلکہ تمام مخلوقات میں خواہ کس قدر بلند ہو' اور ان کا دامن گناہ و عصیان کے گرد و غبار سے کتنا ہی پاک ہو' تاہم اس ذوالجلال والاکرام کے سامنے ان کی حیثیت ایک عبد' ایک بندہ اور ایک عاجز مخلوق کی ہی ہے' ایک عبد و غلام خواہ کس قدر اطاعت کیش' کتنا ہی وفا شعار اور مطیع و فرمان بردار ہو' تاہم اپنے آقا کے سامنے اس کو اپنے قصور کا معترف اپنی تقصیر کا مقر' اپنی کوتاہیوں پر خجل اور اپنی فروگزاشتوں پر نادم ہی ہونا چاہیے' اسی لیے حضرت ابراہیمؑ جن کی نیکی اور پاکی کی شہادت سے قرآن بھرا ہوا ہے وہ خدا کی عظمت و جلال اور اس کی رحمت و شفقت کے ذکر میں فرماتے ہیں:

﴿وَالَّذِیْٓ اَطْمَعُ اَنْ یَّغْفِرَ لِیْ خَطِیْٓئَتِیْ یَوْمَ الدِّیْنِ﴾ (شعراء:۸۲)

''اور وہ خدا جس سے جزا کے دن اپنی بھول چوک کی معافی کی پوری امید رکھتا ہوں۔''

نبی کا یہ اعتراف و اقرار اور خجالت و ندامت' اس کا نقص نہیں بلکہ اس کی بندگی اور عبودیت کا کمال ہے اور آقا کو حق پہنچتا ہے کہ اس کے غلام' اطاعت و فرمان برداری کے جس حیرت انگیز رتبہ تک بھی پہنچے ہیں' وہ ان سے اطاعت کیشی اور وفا شعاری کے اس سے بھی بلند رتبہ کا مطالبہ کرے کہ اس کے دربار میں ان کے عروج و ترقی کی کرسی اور بھی اونچی ہوتی جائے' بعض آیتوں میں اگر کسی پیغمبر کو خدا سے مغفرت مانگنے کی ہدایت کی گئی ہے تو اس کا سبب گناہ کا وجود نہیں بلکہ ہر قدم پر گزشتہ رتبۂ اطاعت پر قناعت کر لینے پر تنبیہ اور مزید اطاعت کا مطالبہ ہے تاکہ وہ اس کے مزید تقرب کا ذریعہ بن سکے آنحضرت ﷺ کو خطاب ہوتا ہے۔

﴿اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ○ وَ رَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ○ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ وَاسْتَغْفِرْهُ اِنَّهٗ کَانَ تَوَّابًا○﴾ (نصر:۱،۳)

''جب اللہ کی مدد آ چکی اور (مکہ) فتح ہو چکا اور لوگوں کو اللہ کے دین میں گروہ در گروہ جاتے دیکھ چکا تو اپنے پروردگار کی پاکی بیان کر اور اس سے معافی چاہ کہ وہ بندے کے حال پر رجوع ہونے والا ہے۔''

غور کرو کہ خدائی مدد آنا' مکہ فتح ہونا' بت پرستی کی بیخ کنی اور لوگوں کا مسلمان ہو جانا کوئی جرم ہے جس سے کوئی معافی چاہے' اسی طرح سورۂ فتح میں فرمایا:

﴿اِنَّا فَتَحْنَا لَکَ فَتْحًا مُّبِیْنًا○ لِّیَغْفِرَلَکَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِکَ وَ مَا تَاَخَّرَ وَ یُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَیْکَ وَ یَهْدِیَکَ صِرَاطًا مُّسْتَقِیْمًا○ وَ یَنْصُرَکَ اللّٰهُ نَصْرًا عَزِیْزًا○﴾ (الفتح: ۱، ۲)

''ہم نے تجھ کو کھلی فتح دی تا کہ اللہ تیری اگلی پچھلی خطا کو معاف کرے اور اپنا احسان تجھ پر پورا کرے اور تجھ کو سیدھی راہ چلائے اور تجھ کو مضبوط مدد دے۔''

دوبارہ غور کرو کہ مکہ کی فتح کامل نصیب ہونے کو حضور کی معافی سے بجز اس کے کیا تعلق ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندہ کے حسنِ خدمت کو قبول فرما کر اپنی خوش نودی کا اظہار فرماتا ہے۔

اس استغفار سے مقصود نعوذ باللہ پیغمبر کی گنہگاری کا ثبوت نہیں بلکہ اس کی عبدیتِ کاملہ کا اظہار ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام جن کے خدا کے بیٹے ہونے کے عیسائی اور فرشتے جن کے خدا کی بیٹیاں ہونے کے اہلِ عرب قائل تھے اور ان کو خدا کا درجہ دیتے تھے' ان کے متعلق قرآن نے کہا:

﴿لَنْ یَّسْتَنْکِفَ الْمَسِیْحُ اَنْ یَّکُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَ لَا الْمَلٰٓئِکَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ وَ مَنْ یَّسْتَنْکِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَ یَسْتَکْبِرْ فَسَیَحْشُرُهُمْ اِلَیْهِ جَمِیْعًا﴾ (نساء:۱۷۲)

''مسیحؑ کو ہرگز اس سے عار نہ آئے گا کہ وہ خدا کا بندہ ہو' اور نہ مقرب فرشتوں کو اور جو اس بندگی سے عار کرے گا اور بڑائی چاہے گا تو خدا ان سب کو اپنے پاس اکٹھا کرے گا۔''

اس سے مقصود نعوذ باللہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی توہین نہیں بلکہ ان کی عبدیت اور بندگی کا اعلان ہے۔

الغرض انبیاء علیہم السلام کا خدا کے حضور میں اپنی کوتاہی کا اعتراف ان کی گنہگاری کا ثبوت نہیں بلکہ ان کی عبدیتِ کاملہ کا اظہار ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا کسی پیغمبر کی نسبت یہ فرمانا کہ میں نے تجھے معاف کیا' اس کی گنہگاری کا اعلان نہیں بلکہ اپنی پسندیدگی' رضا اور قبولِ تام کی بشارت ہے' سورۂ فتح کی جو آیتیں اوپر گزریں' ان کو پڑھو' تو ظاہر ہوگا کہ چونکہ بت پرستی کی آلائش سے مکہ کی تطہیر اور کل جزیرۂ عرب میں حق و باطل کی تمیز' مکہ کی فیصلہ کن فتح پر موقوف تھی۔ اس لیے جب وہ پیغمبر علیہ السلام اور مسلمانوں کی مسلسل کوششوں اور جان فروشیوں سے حاصل ہوئی تو خدا نے اعلان فرمایا کہ آج اس فتح سے نبوت کے فرض کی اور تجھ پر میرے سلسلۂ احسانات کی تکمیل ہوئی'

پھر خدا آپ سے صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمَ کی طرف ہدایت کا اور اپنی زبردست مدد کا وعدہ کرتا ہے حالانکہ ان میں سے ہر چیز آپ کو پہلے ہی عنایت ہو چکی تھی' کیا فتح مکہ سے پہلے آپ صراط مستقیم یعنی اسلام پر نہ تھے یا آپ کو زبردست مدد نہیں مل چکی تھی' یہ سب مرتبے حاصل تھے' مگر ان باتوں کے یہاں ذکر سے اللہ تعالیٰ کا مقصود یہ ہے کہ اس موقع پر اس طرح اپنی مزید رضامندی کا اظہار فرمائے اور رسول کی اگلی پچھلی تمام فروگزاشتوں پر (اگر ہوں) خطِ عفو پھیرنے کا اعلان کر کے ان کو نیا خلعتِ فاخرہ عطا اور نئے مراتبِ جلیلہ عنایت فرمائے۔

عبدیتِ کاملہ کا یہی راز و نیاز ہے جو حضرت مسیحؑ کے اس فقرہ میں نمایاں ہے' ایک سرداران کو اے نیک استاد' کہہ کر خطاب کرتا ہے' اس کے جواب میں وہ فرماتے ہیں:

''تو کیوں مجھ کو نیک کہتا ہے؟ کوئی نیک نہیں' مگر ایک یعنی خدا۔'' (لوقا: ۱۸:۱۹)

حضرت مسیحؑ کے اس فقرہ سے کسی کا یہ قیاس کرنا کہ وہ نیک نہ تھے' کس قدر غلط ہو گا' اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا اپنی مشہور دعا میں یہ کہنا:

''اور جس طرح ہم اپنے قرض داروں کو بخشتے ہیں' تو اپنے دین ہم کو بخش دے۔'' (متی ۶'۱۲)

ان کی گنہگاری کی دلیل نہیں بلکہ عبدیتِ کاملہ کے اظہار کا ثبوت ہے۔

نکتہ: عربی زبان میں گناہ کے لیے مختلف الفاظ ہیں مثلاً ذنب' اثم' حنث' جرم وغیرہ' ان میں سے ذنب کے سوا دوسرے الفاظ کا اطلاق اس حقیقی گناہ پر کیا جاتا ہے جو بالقصد اور جان بوجھ کر کیا جائے' لیکن ذنب کا اطلاق ہر غلط فعل پر ہوتا ہے خواہ وہ جان بوجھ کر کیا جائے یا بن جانے غلط فہمی سے ہو یا سوچ سمجھ کر' بھول چوک سے ہو یا قصداً' اور ان کاموں پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے جو درحقیقت عام امت کے لیے گناہ نہیں' لیکن انبیا کے حق میں اتنی غفلت بھی مؤاخذہ کے قابل ہے اسی معنی میں کہا گیا ہے کہ حَسَنَاتُ الْاَبْرَارِ سَیِّاٰتُ الْمُقَرَّبِیْنَ۔ ''نیکوں کی نیکیاں مقربین کی برائیاں ہیں۔'' ع

جن کے رتبے ہیں سوا ان کے سوا مشکل ہے

انبیاء علیہم السلام کے استغفار کے موقع پر ہمیشہ ''ذنب'' کا لفظ استعمال ہوا ہے' جرم' اثم یا حنث کا نہیں۔

ذنب کا لفظ بھول چوک اور غفلت سے لے کر عصیاں تک کو شامل ہے [1] اس لیے کسی نبی کو اگر خدا کی طرف سے استغفارِ ذنب کی ہدایت کی گئی تو اس کے معنی صریح عصیان و گناہ کے نہیں بلکہ یہی انسانی بھول' چوک اور فرو

(۱) اس فرق کو عام لغت نویسوں نے ملحوظ نہیں رکھا ہے مگر جن علمائے لغت نے الفاظ کے فروق پر کتابیں لکھی ہیں۔ انہوں نے اس کی تصریح کی ہے ہم یہاں پر بیروت کے مشہور عیسائی لغت نویس و ادیب الاب ہنریکوس لانمس کی کتاب فرائد اللغۃ فی الفروق کی عبارت نقل کرتے ہیں۔ **الاثم الذنب الذی یستحق العقوبة علیه و لا یوصف به الا المجرم و بین الاثم و الذنب فوق من حیث ان الذنب مطلق الجرم عمدا کان او سهو ابخلاف الاثم فانه ما یستحق فاعله العقاب فیختص بما یکون عمدا و الحنث ابلغ من الذنب لان الذنب یطلق علی الصغیرة و الحنث و الکبیرة' و الجرم لا یطلق الا علی الذنب الغیظ۔** (ص ۹۶۔۹۷ مطبوعہ کاثولیکیہ ۱۸۸۹ء)

گزاشت ہے جس کی اصلاح وتنبیہ اللہ تعالیٰ اپنے رحم وکرم اور لطف وعنایت سے فرماتا رہتا ہے اور اسی کے لیے استغفار کا حکم ان کو ہوتا رہتا ہے۔

اسی سے ایک اور نکتہ کی طرف اشارہ ہوتا ہے کہ بھول چوک اور بلا ارادہ غفلت گو امت کے حق میں قابلِ مؤاخذہ نہیں مگر انبیاء علیہم السلام کے بلند مرتبہ کے لحاظ سے یہ چیزیں بھی گرفت میں آتی ہیں کیونکہ ان کا قول وفعل شریعت بن جاتا ہے اس لیے شریعت کی حفاظت کے لیے ان کے ہر قول وفعل کی حفاظت بھی ضروری ہے' اس بنا پر اگر ان سے احیاناً کوئی ایسی بات ہو جاتی ہے تو فوراً اس پر تنبیہ کی جاتی ہے اور ان کو ہشیار کر دیا جاتا ہے اور اسی کے ساتھ ان کی یہ چیز معاف کر کے ان کو بشارت سنا دی جاتی ہے اور اس طرح ہر چھوٹے بڑے دانستہ اور نادانستہ تمام گناہوں سے ان کا دامن پاک وصاف رکھا جاتا ہے۔

﴿فَتَلَقّٰٓی اٰدَمُ مِنۡ رَّبِّہٖ کَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَیۡہِ﴾ (بقرہ:۹۳۷)

''تو آدم نے اپنے رب سے چند باتیں سیکھ لیں تو وہ اس کی طرف رجوع ہوا۔''

﴿ثُمَّ اجۡتَبٰہُ رَبُّہٗ فَتَابَ عَلَیۡہِ﴾ (طٰہٰ:۱۲۲)

''پھر خدا نے اس (آدمؑ) کو برگزیدہ کیا' پھر اس کی طرف رجوع ہوا۔''

﴿لَقَدۡ تَّابَ اللّٰہُ عَلَی النَّبِیِّ﴾ (التوبۃ:۱۱۷)

''یقیناً اللہ نبی کی طرف رجوع ہوا۔''

﴿فَاسۡتَجَبۡنَا لَہٗ وَ نَجَّیۡنٰہُ مِنَ الۡغَمِّ﴾ (انبیاء:۸۸)

''پھر ہم نے اس (یونس) کی دعا قبول کی اور اس کو غم سے رہائی دی۔''

﴿لِّیَغۡفِرَ لَکَ اللّٰہُ مَا تَقَدَّمَ مِنۡ ذَنۡۢبِکَ وَ مَا تَاَخَّرَ﴾ (الفتح:۲)

''تا کہ اللہ تیری اگلی پچھلی فرد گزاشت معاف کرے۔''

کامل اور عام عفو ومغفرت کا یہ مرتبۂ بلند خود بندہ کی زندگی میں انبیا کے سوا کسی دوسرے کو نصیب نہیں۔

(۲) انبیا کی معصومیت کے مسئلہ میں غلط فہمی کا دوسرا سبب یہ ہے کہ انبیا کی قبل از نبوت اور بعد از نبوت زندگیوں میں قوت اور فعل کا جو فرق ہے اس کو ملحوظ نہیں رکھا جاتا' علم اور جہل' ضلالت اور ہدایت' اضافی الفاظ میں سے ہیں' علم کی ہر حد کو علم کے مافوق درجہ کے لحاظ سے جہل اور ہدایت کے بلند سے بلند رتبہ کو اس سے بھی اوپر کے مرتبہ کے لحاظ سے ضلالت کہہ سکتے ہیں۔

انبیا علیہم السلام کی قبل از نبوت اور بعد از نبوت زندگیوں میں قوت اور فعلیت کا فرق ہے جس طرح تخم میں تمام برگ و بار پوشیدہ ہوتا ہے لیکن وہ اس وقت درخت نہیں ہوتا اور نہ اس میں تنا' شاخیں' پتے' پھول اور پھل ہوتے ہیں اور نہ اس کا عالم پناہ سایہ ہوتا ہے لیکن ایک وقت آتا ہے جب وہی تخم بڑھ کر ایک نیا درخت بن جاتا ہے' اس کے پتے آنکھوں میں ہریالی پیدا کرتے ہیں۔ اس کے پھول مشامِ جاں کو معطر کرتے ہیں اس کے پھل میں کام و

دہن میں شہد ٹپکاتے ہیں۔اس کے سایہ میں تھکے ماندے مسافر آرام پاتے ہیں' اسی طرح نبوت کی سابقہ اور لاحقہ زندگیوں میں عظیم الشان فرق ہے اور اسی فرق کی بنا پر اس کی قبل از نبوت زندگی' ظہورِ نبوت کے بغیر تاریکی اور ضلالت' اور بعد کی زندگی نور اور ہدایت معلوم ہوتی ہے جس طرح عام افراد کی زندگی اسلام و ایمان کے بغیر ضلالت اور اسلام و ایمان کے بعد ہدایت بن جاتی ہے اسی طرح انبیا کی زندگی ان کی نظر میں نبوت کے بغیر ضلالت اور نبوت کے بعد ہدایت ہوتی ہے۔غرض یہ ہے کہ ظہورِ نبوت سے پہلے کا زمانہ ان کی ضلالت کا اور بعد کا زمانہ ان کی ہدایت کا عہد کہلاتا ہے لیکن ضلالت اور ہدایت کا یہ مفہوم اس سے بالکل مختلف ہے جو غیر انبیا کے حق میں مستعمل ہے اللہ تعالیٰ جہاں آنحضرت ﷺ پر اپنے احسانات گناتا ہے فرماتا ہے:

﴿اَلَمْ یَجِدْکَ یَتِیْمًا فَاٰوٰی ○ وَ وَجَدَکَ ضَآلًّا فَھَدٰی ○ وَ وَجَدَکَ عَآئِلًا فَاَغْنٰی ○﴾ (ضحیٰ:۱)

''کیا اللہ نے تجھ کو یتیم نہ پایا' پھر پناہ دی اور اس نے تجھ کو بھولا پایا تو رہنمائی کی اور تجھ کو محتاج پایا تو بے نیاز کیا۔''

سطورِ بالا سے ظاہر ہے کہ یہاں ہدایت سے نبوت اور ضلالت سے قبلِ نبوت کی زندگی مراد ہے' جو نبوت کے بعد کی زندگی کے مقابلہ میں نسبتاً ضلالت ہی ہے۔

''ضلالت'' کے معنی عربی میں صرف صریح گمراہی ہی کے نہیں ہیں بلکہ نادانستہ بھولنے' بہکنے اور غفلت کرنے کے بھی ہیں۔عورتوں کی شہادت کے موقع پر ہے:

﴿اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰھُمَا فَتُذَکِّرَ اِحْدٰھُمَا الْاُخْرٰی﴾ (بقرہ:۲۸۲)

''بھول جاوے ایک عورت تو یاد دلا دے اس کو دوسری۔''

ایک اور آیت میں علمِ الٰہی کی تعریف میں ہے:

﴿لَا یَضِلُّ رَبِّیْ وَ لَا یَنْسٰی﴾ (طٰہٰ:۵۲)

''نہ چوکتا ہے میرا رب نہ بھولتا ہے۔''

ان آیتوں میں لفظ ضلالت کا استعمال بتاتا ہے کہ ''ضال'' کے معنی عربی زبان اور محاورۂ قرآن میں صرف گمراہ کے نہیں بلکہ بھول چوک کے بھی ہیں۔اسی طرح اس حالت کے بھی ہیں جس میں گمراہی کو گمراہی معلوم ہوتی ہے لیکن ہنوز ہدایتِ الٰہی کا نور اس کے سامنے نہیں چمکا' غلطی کا احساس ہوتا ہے' مگر اس غلطی کی جگہ ہنوز صحت نظر نہیں آئی ہے' جہل کی برائی تو معلوم ہوگئی ہے مگر ہنوز علم کا دروازہ نہیں کھلا ہے اور یہی قبلِ نبوت کی کیفیت ہوتی ہے' حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی نبوت سے پہلے ایک ستم شعار قبطی کو گھونسا مارا تھا جس کے صدمہ سے وہ اتفاقیہ مر گیا تھا' نبوت پا کر جب وہ لوٹے تو فرعون نے ان کو طعنہ دیا کہ تم میرے فراری مجرم ہو' حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا:

﴿فَعَلْتُھَآ اِذًا وَّ اَنَا مِنَ الضَّآلِّیْنَ﴾ (شعرآء:۲۰)

''میں نے اس حالت میں کیا تھا کہ میں چوکنے والوں میں سے تھا۔''

اس چوک اور ضلالت سے مقصد صرف یہی ہے کہ اس وقت میں نبوت کی عزت سے سرفراز نہ تھا' ورنہ ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے نبوت سے پہلے کوئی گمراہی کی بات نہیں کی تھی۔ نہ بت کو پوجا تھا' نہ فرعون کو سجدہ کیا تھا۔ نہ کوئی اور شرک کیا تھا کسی کے طمانچہ مارنے سے اتفاقیہ کسی کمزور کا مرجانا' مارنے والے کا کوئی بالقصد گناہ نہیں' جس کو ضلالت کہیں' اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اپنے کو اس وقت ضال کہنے سے مراد نبوت سے سابقہ زندگی ہے۔ اس قبل نبوت کی زندگی کو بعد نبوت کی زندگی کے لحاظ سے یہاں ''ضلالت'' کہا گیا ہے' دوسری جگہ اس کو ''غفلت'' (بے خبری) سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔ حضرت یوسفؑ کے قصہ میں آپ کو خطاب ہے:

﴿نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ وَ اِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغٰفِلِيْنَ﴾ (یوسف:۳)

''ہم تجھے بہترین قصہ سناتے ہیں' کیونکہ ہم نے تیری طرف یہ قرآن اتارا' اگرچہ اس قرآن کی وحی سے پہلے تو بے خبروں میں تھا۔''

اس ''بے خبری'' کے عالم کی تفسیر دوسری آیت میں ہے جس میں پیغمبر کی قبل از نبوت اور بعد از نبوت کی زندگی کا فرق ظاہر فرمادیا ہے۔

﴿وَ كَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَ لَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا وَ اِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ﴾ (شوریٰ:۵۲)

''اور اسی طرح ہم نے اپنے (خلوت خانہ) راز سے ایک روح تیری طرح وحی کی' تو نہیں جانتا تھا کہ کتاب کیا ہے اور نہ ایمان لیکن ہم نے اس کو نور بنا دیا جس سے جس کی چاہتے ہیں اپنے بندوں میں سے رہنمائی کرتے ہیں اور بے شک تو سیدھی راہ دکھاتا ہے۔''

''کتاب و ایمان'' کے نور و ہدایت ملنے سے پہلے کی یہی وہ کیفیت و حالت ہے جس کو کہیں ضلالت اور کہیں غفلت کہا گیا اس سے مقصود حقیقی گنہگاری' عصیان کاری اور باطنی گمراہی نہیں ہے' بلکہ طلبِ حق' تلاشِ معرفت اور انتظارِ حقیقت ہے کہ وہی ان کے حق میں ضلالت اور غفلت کا حکم رکھتا ہے' آخر وہ وقت آتا ہے جب روشنی چمکتی ہے روحانی سکون کا چشمہ بہتا ہے اور منزل رسی کے بعد دوسروں کی رہنمائی کا منصب عطا ہوتا ہے' یہ ہدایت کا دور ہے چنانچہ ایک موقع پر انبیا کے نبوت ملنے کو ہدایت کے لفظ سے ادا فرمایا گیا ہے۔

﴿وَ وَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ كُلًّا هَدَيْنَا وَ نُوْحًا هَدَيْنَا مِنْ قَبْلُ﴾ (انعام:۸۴)

''اور ہم نے ابراہیم کو اسحٰق اور یعقوب بخشے اور ان میں ہر ایک کو ہدایت دی اور ان سے پہلے نوح کو

ہدایت دی۔"

اس ہدایت دینے سے اگر نبوت عطا کرنا مراد ہے تو ظاہر ہے کہ عدم نبوت کا عہد "ضلالت" ہی کہلائے گا مگر اس سے مقصد صرف وہ حالت ہوگی جس میں ان کو ہنوز نبوت نہیں ملی تھی اور اس مرتبۂ بلند کا انتظار تھا۔

اس تشریح سے یہ واضح ہو گیا کہ انبیا کے حق میں ضلالت سے مقصود گنہگاری' عصیان کاری اور گمراہی نہیں بلکہ عدمِ نبوت کا دور اور رسالت کی زندگی سے پہلے کا عہد ہے جو نبوت و رسالت کی ہدایت کے مقابلہ میں نسبتًا ضلالت ہے۔

نبی کی بشریت

نبی کی معصومیت اور اس کے دوسرے مقدس خصوصیات کے باوجود اسلام کی تعلیم یہی ہے کہ نبی خدا کا مخلوق خدا کا بندہ اور آدمی ہی ہوتا ہے۔ وہ خدا' خدا کا اوتار' دیوتا یا فرشتہ نہیں ہوتا' بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ مسئلہ بھی ان مسائل میں سے ہے جن کی اصل حقیقت محمد رسول اللہ ﷺ سے پہلے افراط و تفریط کی تاریکی میں گم تھی اور آپ کے فیضِ علم سے وہ روشن ہوئی' اسلام سے پہلے یہودیوں کی طرح ایسے اہل مذہب بھی تھے جو پیغمبروں کو ایک پیشین گوئی کی صفت کے علاوہ ہر حیثیت سے معمولی انسان سمجھتے تھے' وہ ہر قسم کے گناہ بھی کرتے تھے وہ بداخلاقیوں کے بھی مرتکب ہوتے تھے' وہ کفر بھی کرتے تھے۔ تاہم پیغمبر سمجھے جاتے تھے۔ دوسری طرف عیسائی بھی تھے جو اپنے نجات دہندہ کو انسانیت سے پاک' خود خدا یا خدا کا جزء یا ناسوت و لاہوت کا ایک مجموعہ سمجھتے تھے۔ اور ہندو بھی تھے جو اپنے رہنماؤں کو دیوتا اور اوتار یعنی مجسم خدا یا انسان کے بھیس میں خدا سمجھتے تھے اور جن کو ہر قسم کی خدائی طاقتیں حاصل تھیں۔

اسلام نے اپنی تعلیم ان دونوں کے وسط میں پیش کی' وہ ایک طرف رسولوں کو مخلوق محض صرف انسان اور پورا بندہ اور خدا کے حکم کے سامنے عاجز و درماندہ تسلیم کرتا ہے لیکن دوسری طرف وہ ان کو خدا کا برگزیدہ' معصوم' نیک اور خدا کی قدرت سے فیض پا کر برکتوں' سعادتوں اور ہدایتوں کا مرکز اور اس کی اجازت سے عجیب و غریب امور صادر کرنے والا بتاتا ہے اور بے اعتدالی کے ان دونوں خیالات کی جو غلط فہمی پر مبنی ہیں' علانیہ تردید کرتا ہے۔ اہل عرب بھی ہندوؤں' یونانیوں اور عیسائیوں کی طرح یہ سمجھتے تھے کہ انسان کی رہنمائی کے لیے خود انسان نہیں بلکہ انسان سے مافوق ہستی ہونی چاہیے اور وہ ہستی صرف فرشتوں کی ہے۔ قرآن نے ان کے اس خیال کی بار بار تکذیب کی ہے اور کہا ہے کہ اگر زمین میں فرشتے آباد ہوتے تو فرشتہ کو ان کے پاس رسول بنا کر بھیجا جاتا اور انسانوں میں فرشتہ آتا بھی تو انسانیت ہی کے پیکر میں آتا تو ایسی حالت میں تم اس فرشتہ کو فرشتہ کب مانتے۔

حقیقت یہ ہے کہ پیغمبروں کے دو رخ ہوتے ہیں' ایک طرف تو وہ بشریت کے جامہ میں ہوتے ہیں اور انسانوں ہی کی طرح کھاتے پیتے' چلتے پھرتے' سوتے جاگتے' شادی بیاہ کرتے اور پیدا ہوتے اور مرتے ہیں'

دوسری طرف وہ اپنی روحانیت بے گناہی' پاک دامنی اور اختصاصِ نبوت میں انسانوں سے بلند تر ہیں' یہودیوں کی طرح جن کی نظر ان کے انسانی رخ پر پڑتی ہے وہ ان کو ہر طرح معمولی انسان سمجھتے ہیں اور عیسائیوں کی طرح جن کی نظر ان کے مافوق انسانی خصائص پر پڑتی ہے وہ ان میں الوہیت کے اوصاف ثابت کرنے لگتے ہیں حالانکہ حق ان دونوں کے بیچ میں ہے' وہ اپنے بشری اوصاف کے لحاظ سے بلاشبہ انسان ہوتے ہیں لیکن اسی کے ساتھ وہ اپنے مافوق بشری خصوصیات کی بنا پر فوق البشر ہوتے ہیں' یہی مغالطہ اپنے اپنے پیغمبروں کے متعلق کفار کو ہوتا تھا' پیغمبر ان کے سامنے جب اپنی نبوت اور خدا کی طرف سے آنے کا دعویٰ پیش کرتے تھے' تو وہ ان کی بشری خصوصیتوں کو دیکھ کر کہتے تھے کہ تم تو ہماری ہی طرح آدمی ہو تم خدا کے قاصد اور پیامبر کیسے ہو سکتے ہو' چنانچہ کفار نے بار بار پیغمبروں سے کہا:

﴿اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا﴾ (بنی اسرائیل:۹۴)

''کیا خدا نے بشر کو قاصد (رسول) بنا کر بھیجا۔''

وہ بشریت کو رسالت کے منافی سمجھتے تھے اس لیے رسول اللہ ﷺ نے اس کے جواب میں فرمایا:

﴿هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا﴾ (بنی اسرائیل:۹۳)

''میں تو نہیں ہوں مگر انسان رسول۔''

ان کو شبہ تھا کہ کیا گمراہ انسانوں کی رہنمائی انسان ہی کر سکتا ہے۔

﴿اَبَشَرٌ يَّهْدُوْنَنَا﴾ (تغابن:۶)

''کیا انسان ہماری رہنمائی کریں گے۔''

یہ وہی شبہ تھا جس میں پھنس کر عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی انسانیت سے منکر ہوئے کہ موروثی گنہگار انسان کو انسان کا بیٹا کیونکر نجات دے سکتا ہے اور یہ نہیں سمجھے کہ انسان موروثی گنہگار نہیں بلکہ وہ گنہگار بھی ہو سکتا ہے اور بے گناہ بھی' بے گناہی اور معصومیت کے لیے انسانیت سے پاک ہونا ضروری نہیں' یہی بات اور کفار کی سمجھ میں بھی نہیں آتی تھی اور انبیا کو ظاہری اور جسمانی طور سے اپنی ہی طرح انسان سمجھ کر' ان کو نبوت کا مستحق نہیں سمجھتے تھے اور کہتے تھے:

﴿اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا﴾ (ابراہیم:۱۰)

''تم تو نہیں ہو لیکن ہماری ہی طرح ایک بشر۔''

دوسروں کو نبی کے انکار کرنے پر اس طرح آمادہ کرتے تھے:

﴿هَلْ هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ﴾ (انبیاء:۳)

''نہیں ہے یہ لیکن تمہاری ہی طرح بشر۔''

﴿مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ﴾ (المؤمنون:۲۴)

''نہیں ہے لیکن تمہاری ہی طرح بشر۔''

انبیا کے سامنے وہ یہی دلیل پیش کرتے تھے۔

﴿مَآ اَنۡتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثۡلُنَا﴾ (شعراء:۱۵۴)

''تم تو ہماری ہی طرح بشر ہو۔''

﴿مَآ اَنۡتُمۡ اِلَّا بَشَرٌ مِّثۡلُنَا﴾ (یٰسٓ:۱۵)

''تم لوگ تو ہماری ہی طرح بشر ہو۔''

اور وہ اپنے اس دعویٰ کی صداقت کو بداہت اور مشاہدہ سے ثابت کرتے تھے۔

﴿مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثۡلَنَا﴾ (ہود:۲۷)

''ہم تو تم کو اپنی طرح بشر دیکھتے ہیں۔''

انبیا علیہم السلام نے ہمیشہ یہی جواب دیا کہ ہاں تمہاری ہی طرح ہم بشر ہیں' لیکن خدا کے فضل و کرم سے سرفراز ہیں۔اور یہی تم میں اور ہم میں فرق ہے فرمایا۔

﴿قَالَتۡ لَهُمۡ رُسُلُهُمۡ اِنۡ نَّحۡنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثۡلُكُمۡ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ يَمُنُّ عَلٰى مَنۡ يَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِهٖ﴾ (ابراہیم:۱۱)

''ان کے رسولوں نے جواب دیا کہ ہم تمہاری ہی طرح بشر ہیں لیکن خدا اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے احسان کرتا ہے۔''

ان کفار کی نظر صرف ان کے ایک رخ یعنی عام انسانی پہلو پر پڑتی تھی' انبیا نے جواب میں اس پہلو کے ساتھ اپنے دوسرے رخ کو بھی پیش کر دیا اور کہا کہ ہاں ہم انسان ہیں لیکن ایسے انسان جن پر اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کی بارش ہے یعنی نبوت سے سرفراز اور اس کی خصوصیتوں سے ممتاز ہیں۔

دوسرے نبیوں کی طرح ختم المرسلین محمد رسول اللہ ﷺ نے بھی یہ بار بار ارشاد فرمایا بلکہ وحیِ الٰہی نے آپ کی زبان سے یہ اعلان کر دیا کہہ دو کہ میں تمہاری ہی طرح ایک آدمی اور بشر ہوں' اس اعلان نے جو درحقیقت اس غلط عقیدہ کو مٹانے کے لیے تھا جو انبیا کی شانِ الوہیت کے متعلق عیسائیوں کے اثر سے لوگوں میں پھیل گیا تھا اور افسوس ہے کہ اس قسم کا غلط خیال اس نبی کی امت کے ایک گروہ میں بھی پایا جاتا ہے جو دنیا میں خدا کی توحیدِ کامل کا مبلغ بن کر آیا تھا' دوسری طرف اس اعلان سے ایک تفریط پسند گروہ نے یہ نتیجہ نکالا کہ پیغمبر اور عام انسانوں میں فرق و امتیاز نہیں اور نہ پیغمبروں کو عام انسانوں پر کوئی بلندی و برتری حاصل ہے۔الا یہ کہ پیغمبروں پر وحی آتی رہتی ہے اور عام انسان اس سے محروم ہیں' گویا اس کا منشا یہ ہے کہ پیغمبر میں صرف اس لمحہ اور آن میں منصبِ نبوت کا امتیاز پاتا جاتا ہے جس وقت کسی قسم کی وحی نازل ہوتی ہے اور اس سے پہلے اور اس کے بعد وہ عام انسان ہوتا ہے۔اس سے آگے بڑھ کر اسی لیے ایک اور مختصر سے فرقہ نے یہ دعویٰ کیا کہ محمد رسول اللہ ﷺ کا پیغمبرانہ حکم صرف وہی ہے جو

وحیِ قرآنی کی صورت میں آیا۔ اس کے علاوہ آپ کے تمام احکام جو قرآن سے باہر ہیں' وہ صرف حاکمانہ اور انتظامی امور ہیں جن کی پیروی کرنا نہ اسلامی شریعت ہے نہ اسلام کا جز ہے۔ یہ خیالات حقیقت میں دوسرے فرقہ کے مفرطانہ خیالات کے مقابلہ میں تفریطانہ ہیں اور یہ دونوں اعتدال کی حد سے باہر ہیں اور حقیقت ان کے بیچ میں ہے۔

قرآن پاک میں تین جگہ وہ آیتیں ہیں جن میں خاص آنحضرت ﷺ کی بشریت کا اعلان ہے مگر یہ ہر جگہ توحیدِ کامل کے بیان اور خدا کے مقابلہ میں رسولوں کی عبدیت کی تشریح اور اس عقیدۂ باطل کی تردید میں ہیں کہ رسولوں کے ہاتھوں میں یہ قوت ہونی چاہیے کہ وہ خدا سے زبردستی کسی بات کو منوالیں اور سعی وسفارش کر کے قصور معاف کرادیں۔ قرآن کریم کی تعلیم یہ ہے کہ ان کو جو کچھ حاصل ہے وہ خدائے تعالیٰ کی اجازت' اذن اور عطا سے ہے۔

سورۂ کہف میں ان مشرکوں کا ذکر ہے جو خدا کے بندوں کو خدا کا شریک ٹھہراتے ہیں:

﴿اَفَحَسِبَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اَنْ یَّتَّخِذُوْا عِبَادِیْ مِنْ دُوْنِیْٓ اَوْلِیَآءَ اِنَّآ اَعْتَدْنَا جَهَنَّمَ لِلْکٰفِرِیْنَ نُزُلًا﴾ (کہف:۱۰۲)

''کیا وہ جنہوں نے کفر کیا' یہ سمجھتے ہیں کہ وہ میرے بندوں (رسولوں اور فرشتوں) کو میرے سوا اپنا حمایتی بنائیں گے۔ ہم نے ان کافروں کے لیے جہنم تیار کی ہے۔''

قرآن اس خیال کو کفر قرار دیتا ہے' یہ رکوع کا شروع ہے اس کے بعد اللہ تعالیٰ کے غیر محدود اوصاف و کمالات کا ذکر ہے' پھر ارشاد ہے:

﴿قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ یُوْحٰٓی اِلَیَّ اِنَّمَآ اِلٰهُکُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ﴾ (کہف:۱۱۰)

''کہہ دے کہ میں تو تمہاری طرح ایک بشر ہوں' مجھ پر وحی کی جاتی ہے کہ تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے۔''

دوسری جگہ یہی تعلیم بعینہٖ سورۂ حم السجدہ (فصلت) میں ہے۔

﴿قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ یُوْحٰٓی اِلَیَّ اَنَّمَآ اِلٰهُکُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَاسْتَقِیْمُوْٓا اِلَیْهِ وَ اسْتَغْفِرُوْهُ وَ وَیْلٌ لِّلْمُشْرِکِیْنَ﴾ (حم السجدہ:۶)

''کہہ دے کہ میں تو تمہاری طرح ایک بشر ہوں' مجھ پر وحی کی جاتی ہے کہ تمہارا معبود ایک ہی ہے اس کی طرف سیدھے رہو اور اس سے اپنے گناہوں کی معافی چاہو' خرابی ہے شرک کرنے والوں کے لیے۔''

اس آیت کا منشا بھی یہی ہے کہ خدا تعالیٰ کے مقابلہ میں رسول اسی طرح ایک بندہ ہے جس طرح خدا کے دوسرے بندے۔ دعائیں خدا ہی سے مانگنی چاہییں اور اسی سے اپنے گناہوں کی معافی کی درخواست کرنی چاہیے۔ یہ اختیارات خاص خدا کے بندوں کے نہیں' اس تعلیم سے مقصود حقیقت میں عیسائیوں کے مسئلہ' کفار اور

ان کے عقیدہ کی تردید ہے کہ گناہوں کا معاف کرنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اختیار میں ہوگا اور مسلمانوں کو اپنے رسول کی نسبت اس قسم کی باطل عقیدت مندیوں سے بچانا ہے' چنانچہ تیسری جگہ قرآن پاک میں جہاں آنحضرت ﷺ سے کفار کا یہ مطالبہ مذکور ہے کہ تم خدا کے پیغمبر ہو تو ہمارے لیے سونے کی چھت بنا دو' جہاں نہریں نہیں وہاں نہریں جاری کر دو' ہمارے سنسان جنگلوں کو باغ و بہار بنا دو' اپنے ساتھ جلو میں فرشتوں کے پرے لے کر چلو' ہمارے سامنے آسمان پر چڑھ جاؤ اور وہاں سے ہاتھ میں کتاب لے کر سامنے اترو۔

﴿وَ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَکَ حَتّٰی تَفْجُرَلَنَا مِنَ الْاَرْضِ یَنْبُوْعًا ○ اَوْ تَکُوْنَ لَکَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِیْلٍ وَّ عِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهَارَ خِلٰلَهَا تَفْجِیْرًا ○ اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ کَمَا زَعَمْتَ عَلَیْنَا کِسَفًا اَوْ تَاْتِیَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِکَةِ قَبِیْلًا ○ اَوْیَکُوْنَ لَکَ بَیْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْتَرْقٰی فِی السَّمَآءِ وَ لَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِیِّکَ حَتّٰی تُنَزِّلَ عَلَیْنَا کِتَابًا نَّقْرَءُهٗ﴾ (بنی اسرائیل:۹۰'۹۳)

''اور انہوں نے کہا کہ ہم تم پر ایمان اس وقت تک نہیں لائیں گے جب تک تم ہمارے لیے زمین سے ایک چشمہ نہ بہا دو یا تمہارے لیے کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ نہ ہو جائے یا جیسا کہ تم کہتے ہو' آسمان کے ٹکڑے کر کے ہم پر نہ گراؤ یا خدا کو اور فرشتوں کو ضامن بنا کر نہ لے آؤ یا تمہارے لیے سونے کا ایک گھر نہ ہو جائے' یا تم آسمان پر نہ چڑھ جاؤ اور ہاں تمہارے آسمان پر چڑھنے کا ہم کو اس وقت تک یقین نہ آئے گا جب تک تم وہاں سے ایک نوشتہ نہ ہم پر اتار لاؤ' جس کو ہم پڑھ لیں۔''

یہ امور مشکل و محال نہ تھے لیکن نبوت کے اوصاف کو ان بازی گرانہ تماشوں سے تعلق نہ تھا اور اس سے زیادہ یہ کہ اس غلط عقیدہ کا ابطال کرنا تھا کہ پیغمبر میں براہِ راست کچھ خدائی اختیارات ہوتے ہیں اس لیے آپؐ کو یہ جواب سکھایا گیا کہ آپؐ فرمائیں۔

﴿قُلْ سُبْحَانَ رَبِّیْ هَلْ کُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا○ وَ مَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ یُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَ هُمُ الْهُدٰٓی اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا ○ قُلْ لَّوْ کَانَ فِی الْاَرْضِ مَلٰٓئِکَةٌ یَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّیْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَیْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَکًا رَّسُوْلًا○﴾ (اسرائیل:۹۳'۹۵)

''کہہ دے اے پیغمبر! سبحان اللہ میں تو ایک بشر ہوں' رسول اور لوگوں کو جب اس کے پاس ہدایت آئی ایمان لانے سے باز نہیں رکھا' مگر اس خیال نے کہ کیا خدا نے بشر کو رسول بنا کر بھیجا ہے۔ کہہ دے کہ اگر زمین پر فرشتے ہوتے تو ہم آسمان سے فرشتہ کو رسول بنا کر ان پر اتارتے۔''

آنحضرت ﷺ سے بحکمِ خدا معجزات بھی صادر ہوئے اور ان کی حیرت انگیزی کو انہوں نے تسلیم بھی کیا پھر بھی یہ خیال کہ ایک بشر رسول کیونکر ہو سکتا ہے' قائم رہا۔

کفار نے معجزات دیکھنے کے بعد بھی یہی کہا:

﴿هَلْ هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ اَفَتَاْتُوْنَ السِّحْرَ وَ اَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ﴾ (انبیاء:۱)

''یہ تو تمہاری ہی طرح بشر ہے کیا تم دیکھ بھال کر بھی جادو کے پاس آتے ہو۔''

معجزات کی حیرت انگیزی کو جادو کہہ کر تسلیم کیا' مگر پھر بھی ان کو بشریت رسالت کے منافی ہی معلوم ہوئی' ان سے کہا گیا کہ نبوت و رسالت کے اوصاف و خصائص تم سے زیادہ ان کو معلوم ہیں جن کو تم سے پہلے آسمانی کتابیں عطا ہوئیں یعنی یہود' ان سے پوچھ لو کہ رسول اور نبی بشر ہی ہوتے آئے ہیں۔

﴿وَ مَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَکَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِیْٓ اِلَیْهِمْ فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّکْرِ اِنْ کُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ (الانبیاء:۷)

''اور ہم نے نہیں بھیجا رسول بنا کر تم سے پہلے لیکن انسانوں ہی کو جن کو ہم وحی کرتے تھے' جاننے والوں سے پوچھو اگر تم نہیں جانتے۔''

یہی جواب سورۂ یوسف میں دیا گیا:

﴿وَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِکَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِیْٓ اِلَیْهِمْ مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰی﴾ (یوسف:۱۰۹)

''اور ہم نے تم سے پہلے جو رسول بھیجے' وہ بشر ہی تھے' آبادیوں کے رہنے والے ہم ان پر وحی کرتے تھے۔''

اس سے زیادہ تفصیل سورۂ نحل میں ہے:

﴿وَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِکَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِیْٓ اِلَیْهِمْ فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّکْرِ اِنْ کُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ○ بِالْبَیِّنٰتِ وَالزُّبُرِ وَ اَنْزَلْنَآ اِلَیْکَ الذِّکْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْهِمْ وَ لَعَلَّهُمْ یَتَفَکَّرُوْنَ ○﴾ (نحل:۴۳۔۴۴)

''اور ہم نے نہیں بھیجا تم سے پہلے لیکن انسانوں کو جن کی طرف ہم وحی کرتے تھے تو پوچھ لو کتاب والوں سے اگر تم نہیں جانتے۔ کھلی نشانیاں اور کتابیں دے کر اور ہم نے تم پر کتاب (ذکر) اتاری تا کہ تم کھول کر لوگوں سے بیان کرو جو ان کی طرف اتارا گیا اور تا کہ وہ سوچیں۔''

ہر شخص جو مثلیت اور بشریت کی ان آیتوں پر ایک نگاہ ڈالے گا وہ یہی سمجھے گا کہ ان آیتوں میں جس قسم کی مثلیت اور بشریت کا ذکر ہے اس کا تعلق ظاہری جسمانیت اور جسمانی قویٰ اور مخلوقیت سے ہے' ورنہ اخلاقی' روحانی' دماغی' قلبی' علمی اور عملی حیثیت سے ایک پیغمبر انسان رہ کر بھی غیر نبی انسانوں سے بلند تر اور علانیہ ممتاز ہوتا ہے' نبی اور غیر نبی میں صرف وحی کے امرِ فارق ہونے کے یہ معنی نہیں کہ نبی القائے ربانی سے متصف ہونے کے علاوہ بقیہ تمام اوصاف و کمالات یا عیوب و نقائص میں عام انسانوں کے برابر ہوتا ہے' یہ کہنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی یہ کہے کہ عالم و جاہل میں صرف علم کا فرق ہے' ورنہ دونوں برابر کے انسان ہیں' تو اس کے معنی یہ نہیں کہ علم و جہل کے علانیہ ممتاز و متضاد اوصاف میں بھی وہ دونوں برابر ہیں اور ان میں عقل' اخلاق' تہذیب' سلیقہ' رائے اور حکمت و دانائی کا کوئی فرق نہیں' حالانکہ ان میں علم و جہل کا فرق کہہ کر درحقیقت ان دونوں کے درمیان علم اور جہل کے

سینکڑوں اوصاف' لوازم اور خصائص کا فرق و امتیاز تسلیم کرنا ہے۔

اسی طرح نبی اور غیر نبی میں وحی کا فرق مان کر وحی والے اور بے وحی والے انسانوں میں خود وحی اور عدم وحی کے سینکڑوں لوازم' خصائص اور اوصاف کا فرق تسلیم کرنا پڑے گا' وحی و رسالت کو چھوڑ دو' دوسرے انسانی کمالات کو مثلاً لو تو بھی یہی ماننا پڑے گا کہ انسان کے لیے جتنے اوصاف و کمالات ممکن ہیں' ان سب کی اعلیٰ سے اعلیٰ جانب کمال تک پہنچنا ممکن ہے اور جو وہاں تک پہنچ جاتے ہیں وہ اپنے جسمانی اوصاف و خصائص کے لحاظ سے انسان ہونے کے باوجود اپنے دوسرے قویٰ میں عام انسانوں سے یقیناً بلند اور ممتاز ہوتے ہیں' کوئی کہہ سکتا ہے کہ جسمانی قوت کا ایرانی ہیرو رستم انسان نہ تھا' علم و عقل کا یونانی مجسمہ ارسطو انسانیت سے پاک تھا اور موجودہ دنیا کی بہت سی حیرت انگیز ایجادوں کا مخترع اڈیسن بشر نہیں' لیکن اس انسانیت اور بشریت کے اشتراک کے باوجود اپنے اپنے دائرہ میں' وہ عام انسانوں سے بلند تر اور ممتاز تر ہیں اور باایں ہمہ وہ اپنے جسمانی خصائص' چلنے پھرنے' اٹھنے بیٹھنے کھانے پینے' سونے جاگنے' دیکھنے بھالنے' صورت شکل' ہاتھ پاؤں' ہر ایک چیز میں وہ ایسے ہی انسان ہیں اور مخلوق انسان بلکہ مجبور انسان ہیں' جیسے دوسرے کمزور جاہل اور بلید الذہن انسان' یہی مثال ایک معنی میں انبیائے کرام علیہم السلام کی بھی ہے کہ وہ غیر نبی انسانوں کے ساتھ بہت سے انسانی اوصاف میں شریک ہونے کے باوجود وحی اور اس کے خصائص اور لوازم میں ان سے صریحاً الگ بلند اور اعلیٰ بلکہ بعض جسمانی خصائص میں بھی ان سے ممتاز ہیں آنحضرت ﷺ کو صومِ وصال رکھتے دیکھ کر جب صحابہ بھی آپ کی پیروی میں کئی کئی دن تک کا متصل روزہ رکھتے ہیں تو آپ ان کو منع کرتے ہیں اور اپنی نسبت فرماتے ہیں ((اَیُّکُمْ مِّثْلِیْ اَبِیْتُ یُطْعِمُنِیْ رَبِّیْ وَ یَسْقِیْنِیْ)) (۱) ''تم میں کون میرے مثل ہے میں رات گزارتا ہوں تو میرا رب مجھے کھلاتا پلاتا ہے۔'' کیا انسانوں کو بھی یہ روحانی غذا اور روحانی سیرابی میسر آتی ہے اور وحی کے علاوہ بعض دوسری حیثیتوں سے بھی مثلیت کی اس میں نفی نہیں ہے۔

اسی طرح نیند کی حالت میں بھی نبی کے قلب اور اس کے احساسات کا غافل نہ ہونا صحیح حدیثوں سے ثابت ہے' آپؐ نے فرمایا میری آنکھیں سوتی ہیں لیکن دل نہیں سوتا ﴿وَ کَذٰلِکَ الْاَنْبِیَآءُ تَنَامُ اَعْیُنُھُمْ وَ لَا تَنَامُ قُلُوْبُھُمْ﴾ (۲) ''اور اسی طرح سب انبیا ہیں کہ ان کی آنکھیں سوتی ہیں مگر ان کے دل نہیں سوتے۔'' کیا یہی کیفیت عام انسانوں کی نیند کی بھی ہے؟ آنحضرت ﷺ لوگوں کو نماز میں صفوں کو درست رکھنے کی تاکید کرتے ہیں تو فرماتے ہیں کہ تم کو اپنی پیٹھ کے پیچھے سے بھی ویسے ہی دیکھتا ہوں جیسے سامنے سے' کیا عام انسانوں کی قوتِ بصارت کا یہی عالم ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔ ﴿اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰی مَا یَرٰی﴾ ''کیا پیغمبر جو دیکھتا ہے تم اس میں اس سے جھگڑتے ہو۔'' ﴿وَ لَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِیْنِ﴾ ''اور اس نے اس (فرشتہ) کو آسمان کے

(۱) صحیح بخاری کتاب الصوم۔

(۲) صحیح بخاری باب الاسراء۔

کناروں میں دیکھا۔'' کیا عام انسان بھی یہ مشاہدہ کرتے ہیں' آنحضرت ﷺ کے انتساب سے امہات المؤمنین کو جو شرف حاصل ہوا۔ اس کا اقتضا یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے امہات المؤمنین کو خطاب کر کے فرمایا ﴿یٰنِسَآءَ النَّبِیِّ لَسْتُنَّ کَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنَ اتَّقَیْتُنَّ﴾ ''اے پیغمبر کی بیویو تم ایسی نہیں ہو' جیسی ہر عورت اگر خدا کا ڈر رکھو۔'' تو اگر پیغمبر کی بیویاں تقویٰ کے بعد عام عورتوں کے مثل نہیں ہیں تو خود پیغمبر تو بدرجہا اس کا سزاوار ہے کہ وہ ﴿کَاَحَدٍ مِّنَ الرِّجَالِ﴾ نہ ہو اور اپنے خصائص میں عام انسانوں سے بدرجہا بلند تر اور ممتاز ہو۔

الغرض نبی اور غیر نبی میں صرف وحی و نبوت کا جو فرق ہے اس کے یہی معنی ہیں کہ ان دونوں میں وحی و رسالت کے تمام لوازم' خصوصیات اور ضروری اوصاف میں فرق اور امتیاز ہے' اسی لیے کسی انسان کو صاحبِ وحی ہونے کے ساتھ ہی اس کو ان تمام اوصاف و لوازم اور خصوصیات کا مالک بھی ضرور ہی ماننا پڑے گا۔

اجتہادِ نبوی میں خطا

شبہ کا ایک اور سبب یہ ہے کہ قرآن مجید میں بعض جگہ آنحضرت ﷺ کو آپؐ کی چند فروگزاشتوں پر متنبہ کیا گیا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ خاص وحیِ الٰہی کے علاوہ آپؐ اپنی عقل و مصلحت سے جو حکم دیتے تھے وہ غلطیوں سے پاک نہیں ہوتا تھا۔ اس سلسلہ میں یہ بات تمام مسلمانوں کو تسلیم ہے کہ جن بعض امور میں آپؐ پر وحیِ قرآن نازل نہیں ہوتی تھی' ان میں آپ اپنے پیغمبرانہ علم و حکم اور فہم نبوی سے فیصلہ فرماتے تھے لیکن غور کے قابل یہ بات ہے کہ اگر آپؐ کو آپ کے اس فیصلہ پر خدائے تعالیٰ کی طرف سے کبھی کوئی تنبیہ نہ ہوئی ہوتی تو یہ کہا جا سکتا تھا کہ آپ کے تمام فیصلے صحیح اور منشائے الٰہی کے مطابق ہوتے تھے' مگر یہ بھی کہنے والا کہہ سکتا تھا کہ اجتہادِ نبوی کے فیصلوں کی صحت و خطا کی ذمہ داری خدا نے نہیں لی تھی' اس لئے تنبیہ نہ فرمائی گئی' مگر واقعہ ان دونوں کے خلاف ہے' صورت یہ ہے کہ بعض فیصلوں پر تنبیہ کی گئی ہے اور بعض پر نہیں اور اس سے بداہتہً ثابت ہوتا ہے کہ اجتہادِ نبوی میں غلطی ہو جانا ممکن ہے' مگر اس غلطی پر چند لمحوں کا قرار بھی ممکن نہیں' ادھر لغزش ہوئی اور ادھر علام الغیوب کی بے خطا وحی نے اس کی تنبیہ اور اصلاح کی۔ اس واقعہ سے دوسرا نتیجہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ تمام امور و احکام جن کو آپ نے اپنے پیغمبرانہ اجتہاد و علم و حکمت سے ارشاد فرمایا' ان پر عمل کیا اور وحیِ الٰہی نے ان پر خاموشی برتی تو منشائے الٰہی نے گویا ان کی صحت و صداقت پر اپنی خاموشی سے مہر کر دی اور ان کی حیثیت بمنزلہ وحی کے ہو گئی۔

آنحضرت ﷺ کی نبوت کی عمر ۲۳ سال ہے ان پورے ۲۳ سالوں میں ہزاروں واقعات اور امور پیش آئے جن پر آپؐ نے اپنے اجتہاد اور شرحِ صدر سے فیصلے صادر کیے مگر ان میں سے کل پانچ باتیں ایسی ہیں جن پر وحیِ الٰہی نے تنبیہ کی اور عجیب تر یہ ہے کہ ان میں سے کوئی بات بھی ایسی نہیں ہے' جس کا تعلق حکمِ دینی' شریعتِ ابدی' اعتقاد' عبادات یا شرعی معاملات سے ہو بلکہ وہ کل کے کل ایسے امور ہیں' جن کی حیثیت تمام تر شخصی یا جنگی ہے' اس سے بھی یہی نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ دین اور شریعت میں آپ کے یہ پیغمبرانہ اجتہادی فیصلے خطا و غلطی سے تمام تر

پاک تھے۔

اس خطا کے معنی

عام انسانوں کے اجتہادات میں جن اسباب سے غلطیاں واقع ہوتی ہیں وہ یہ ہیں کہ جن مقدمات پر ان کا اجتہاد مبنی ہوتا ہے وہ غلط ہوتے ہیں یا ان کا علم ان کو قطعی طور سے نہیں ہوتا' یا استقراءِ تام نہیں ہوتا' تمثیل پوری نہیں ہوتی' علتِ مشترکہ صحیح نہیں معلوم ہوتی مگر یہ تمام صورتیں اجتہادِ نبوی میں نہیں ہیں' کیونکہ اجتہادِ نبوی نہ ان طریقوں پر مبنی ہوتا ہے' نہ وہ غور و فکر' نظر و استدلال اور استقراء و تمثیل کے منطقی اور اصولی ذرائع پر قائم ہوتا ہے بلکہ وہ نورِ رسالت' فہمِ نبوت' حکمتِ ربانی اور شرحِ صدر پر مبنی و قائم ہوتا ہے' جن میں یہ پیچ کی منزلیں سرے سے نہیں ہوتی ہیں اسی لیے لفظ ''اجتہاد'' جو عام طور پر پہلے معنی میں مستعمل اور مشہور ہے اس سے اس مقام پر التباس سے بچنے کی خاطر احتراز کرنا بہتر ہے۔

ایک اور نکتہ بھی پیشِ نظر رہے' آنحضرت ﷺ کے پیغمبرانہ اجتہاد میں اگر غلطی ہوئی ہے تو اس غلطی کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ آپ نے جو پہلو اختیار فرمایا' وہ کوئی گناہ یا بدی یا بداخلاقی کا پہلو تھا' بلکہ یہ ہے کہ دو بہتر راستوں میں سے آپ نے بہترین راستے کو چھوڑ کر بہتر راستے کو اختیار کیا' اس پر اللہ تعالیٰ نے تنبیہ فرمائی اور بہتر کی جگہ بہترین کی تلقین کی۔

اس قسم کے جو چند واقعات پیش آئے ہیں ان پر ایک نظر ڈالنے سے یہ حقیقت منکشف ہو جاتی ہے کہ بہترین کو چھوڑ کر جس بہتر کو آپ نے اختیار فرمایا اس کا منشا ہمیشہ امت پر رحم و کرم اور شفقت کی نگاہ تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس ظاہری یا عارضی رحم و کرم و شفقت کی جگہ ان احکام کی تلقین فرمائی جن میں گو بظاہر سختی معلوم ہوتی ہے مگر علام الغیوب کی دائمی مصلحت کا تقاضا یہ تھا کہ وہ سخت پہلو اختیار کیا جائے۔

ذیل میں ہم ان اجتہادی امور کی تشریح کرتے ہیں' جن پر وحیِ الٰہی نے تنبیہ کی ہے۔

پانچ اجتہادی امور پر تنبیہِ الٰہی

جن اجتہادی امور پر وحیِ الٰہی نے تنبیہ کی ہے ان میں :

(۱) پہلا واقعہ یہ ہے کہ ہجرت کے قبل مکہ معظّمہ میں جب آنحضرت ﷺ اپنی دعوت کی تبلیغ فرما رہے تھے تو ایک دن قریش کے بڑے بڑے رؤسا آپؐ کی مجلس میں آ کر بیٹھے آپؐ ان کو سمجھا بجھا رہے تھے' بت پرستی کی برائیاں اور توحید کی خوبیاں ان پر ظاہر فرما رہے تھے اور دل سے چاہتے تھے کہ وہ اس دعوت کو قبول کر لیں کہ اتنے میں ایک مخلص لیکن غریب اور نابینا مسلمان عبداللہؓ بن ام مکتوم بھی آ کر بیٹھ گئے اور کچھ دریافت کرنا چاہا' قریش کے یہ رؤسا بے حد مغرور اور خود پسند تھے' وہ آپؐ کے جلسوں میں صرف اس لیے آنا پسند نہیں کرتے تھے کہ آپؐ کی مجلس میں بدحال' بے حیثیت اور ادنیٰ درجہ کے لوگ آیا کرتے ہیں۔ اس لیے اس موقع پر جب آنحضرت ﷺ کو ان

رئیسوں کی اثر پذیری کے کچھ امکانات نظر آ رہے تھے' عبداللہ ابن ؓ ام مکتوم کا آنا جانا اور پوچھنا ناگوار ہوا کہ ان کے آنے سے ان رئیسوں کی خود پسندی اور بڑائی کے جذبہ کو اشتعال ہوا' اور راستہ سے بدک گئے۔

عبداللہ بن ام مکتوم کی آمد اور دریافت پر یہ ناگواری جو بالکل نیک نیتی سے تھی' یعنی اس لیے تھی کہ آپ ؐ جانتے تھے کہ عبداللہ ؓ بن ام مکتوم تو مسلمان ہی ہیں۔ اس وقت ان کی بات کا جواب نہ دینے میں چنداں حرج نہیں' لیکن ان رئیسوں کی ناگواری پورے باشندگانِ مکہ پر اثر انداز ہوگی' اگر یہ مسلمان ہو گئے تو مکہ میں اسلام کی اشاعت کی راہ میں پھر کوئی روک باقی نہیں رہے گی' یہ سمجھ کر آنحضرت ﷺ عبداللہ ؓ ابن ام مکتوم کی طرف سے بے التفات ہو کر ان رئیسوں کی تبلیغ و موعظت کی طرف سرتاپا متوجہ رہے۔ اس پر وحی اِلٰہی نے حسبِ ذیل الفاظ میں تنبیہ کی:

﴿عَبَسَ وَ تَوَلّٰی ○ اَنْ جَآءَ هُ الْاَعْمٰی ○ وَ مَا یُدْرِیْکَ لَعَلَّهٗ یَزَّکّٰی ○ اَوْ یَذَّکَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّکْرٰی ○ اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰی ○ فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰی ○ وَ مَا عَلَیْکَ اَلَّا یَزَّکّٰی ○ وَ اَمَّا مَنْ جَآءَ کَ یَسْعٰی ○ وَهُوَ یَخْشٰی ○ فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰی ○ کَلَّآ اِنَّهَا تَذْکِرَةٌ ○ فَمَنْ شَآءَ ذَکَرَهُ﴾ (عبس: ۱۔۱۲)

''تیوری چڑھائی اور منہ پھیرا کہ وہ اندھا آیا اور تجھے کیا خبر کہ شاید وہ سنورتا یا سوچتا تو تیرا سمجھانا کام آتا' وہ جو پروا نہیں کرتا' تو تو اس کی فکر میں ہے اور اس کے نہ سنورنے کا تجھ پر کوئی الزام نہیں' وہ جو تیرے پاس دوڑا آیا اور (خدا سے) ڈرتا ہے تو اس سے تغافل کرتا ہے' یوں نہیں' یہ تو نصیحت ہے جو چاہے اس کو یاد کرے۔''

ان آیتوں میں آنحضرت ﷺ کے اس اجتہاد پر کہ ایک پرانے لیکن غریب مسلمان کی مزید ہدایت سے قریش کے رئیسوں کا سمجھانا زیادہ بہتر ہے' تنبیہ کی گئی اور اس نکتہ کو ذہن نشین کیا گیا کہ اسلام کی اصولی بنیادوں میں سے ایک یہ ہے کہ اس کے نزدیک امیر و غریب' آقا و غلام' اونچے اور نیچے کی کوئی تمیز نہیں۔ اِس کی نگاہ میں بینا اور نابینا دونوں برابر ہیں۔ یہ نکتہ تو اس وقت کے فیصلے میں آپ کے پیش نظر رہا کہ ایک مسلمان اندھے کی دل جوئی. سے ان رئیسوں کی جائز دلجوئی کر کے ان کو اسلام کی طرف مائل کرنا زیادہ بہتر ہے' مگر یہ نکتہ نظر انداز ہو گیا کہ اس طرزِ عمل سے خود اسلام کی بنیادی تعلیم پر کیا اثر پڑے گا۔ اس لیے وحیِ الٰہی نے تنبیہ کی کہ اسلام کا یہ پیغام دنیا کے لیے صدائے عام ہے جو چاہے قبول کرے۔ اس میں کوئی تمیز و تخصیص نہیں' علاوہ ازیں اس کا بھی اشارہ کیا کہ یہ رؤسائے قریش جن کے مسلمان ہونے کی آپ ؐ اس قدر کوشش فرما رہے ہیں وہ ایمان سے محروم ہی رہیں گے۔ اس لیے ان کی طرف مزید توجہ بے سود ہے اور ظاہر ہے کہ آپ ؐ ان کے حق میں دانائے غیب کے اس فیصلہ سے پہلے آگاہ نہ تھے اس لیے آپ ؐ اپنے موجود علم کے مطابق اپنے فعل کو صحیح سمجھ رہے تھے۔

دوسرا واقعہ

(۲) سب سے پہلی لڑائی میں مسلمانوں کے مالِ غنیمت حاصل کرنے اور بدر کے قیدیوں سے زرِفدیہ قبول کرنے کا ہے' اس وقت تک ظاہر ہے کہ مالِ غنیمت اور فدیہ کا قانون نازل نہیں ہوا تھا کہ ابھی اس کا موقع ہی نہیں آیا تھا' مسلمانوں کو مدینہ منورہ آ کر سب سے پہلے سریۂ نخلہ میں مال غنیمت ہاتھ آیا۔ اس کے بعد ہی بدر کے معرکہ میں پھر مال غنیمت ملا' اور ساتھ ہی قریش کے ستر قیدی بھی ہاتھ آئے جن میں اکثر مکہ کے دولت مند اور شرفا تھے۔ ان قیدیوں کی نسبت مسلمانوں کی مختلف رائیں تھیں' بعضے' ان کو آگ میں زندہ جلا دینا چاہتے تھے' کچھ لوگ فدیہ لے کر ان کو چھوڑ دینا چاہتے تھے جس سے ان کو چالیس ہزار درہم ملنے والے تھے' نفسیات کے ماہر جانتے ہیں کہ جو قوم مدت سے ہر قسم کی مصیبت اور تکلیف اٹھاتی رہتی ہے وہ بیکسی' مظلومیت' مغلوبیت اور غربت کے دور سے نکل کر جب پہلے پہل غالب اور دولت مند ہوتی ہے اور اس کو ملکی اور مالی قوت پر دسترس حاصل ہوتی ہے تو وہ لمحہ اس کی زندگی میں اخلاقی حیثیت سے بڑا ہی نازک ہوتا ہے۔ غلبہ' قوت اور دولت پا کر بھی اس کے نشہ میں وہ سرشار نہ ہو اور اپنے دل و دماغ پر قابو رکھے' یہ بڑا ہی مشکل کام ہے۔ جو مظلوم تھا وہ غالب ہو جائے اور جو ظالم تھا وہ مغلوب ہو جائے اور اس وقت ردِعمل اپنا کام کر کے مظلوم غالب میں اپنے ظالم مغلوب سے شدید انتقام لینے کا جذبہ نہ پیدا کرے' یہ کوئی آسان کام نہیں' سیاسی و مذہبی تاریخوں سے تین صدیوں تک برابر سخت سے سخت تکلیفیں اٹھائیں' لیکن قسطنطین کے زمانہ میں جب دفعتہً جو مظلوم تھے وہ غالب اور جو ظالم تھے وہ مغلوب ہو گئے' تو عیسائی قوم کا پچھلا جوہر ایک ایک کر کے رخصت ہو گیا اور ان لوگوں نے جو پہلے مظلوم تھے' انتقام کے نشہ میں چور ہو کر یہودیوں اور رومی بت پرستوں کے ساتھ وہ کچھ کیا جس سے اخلاقِ انسانی کی تاریخ آج بھی شرماتی ہے۔

غزوۂ بدر کی غیر متوقع فتح نے مظلوم و بے کس مسلمانوں کے لیے تاریخی دور کا وہی نازک موقع پیدا کر دیا۔ غریب و تنگ دست مسلمانوں کو جو سالہا سال سے کسبِ معاش سے محروم اور معمولی ضروریات کے بوجھ سے دبے ہوئے تھے' ان کو غنیمت اور فدیہ کی دولت ہاتھ آئی اور وہی قریش جن کے ظلم و ستم سے ان کے بدن زخمی اور ان کے سینے داغ دار تھے' وہ دفعتاً مغلوب ہو گئے ان کے بڑے بڑے سرداران کے ہاتھوں سے لڑائی میں مارے گئے اور ان کے ہاتھوں میں قید ہو کر ستر سردار صرف ان کے رحم و کرم پر زندہ تھے۔

اب تک مسلمان نہایت یک دلی' یک جہتی اور خلوص سے اپنی راہ طے کر رہے تھے اور یہ اخلاقی جوہر مظلوموں کی برادری میں اکثر پیدا ہو جاتے ہیں' لیکن دولت آ کر ان کے بجائے ان میں اختلاف' تفریق و حرص و طمع اور ذاتی اغراض کے جذبات پیدا کر دیتی ہے۔ اس اتفاقی دولت اور غیر متوقع فتح و غلبہ نے صحابۂ کرامؓ کے لیے امتحان کا وہی نازک موقع پیش کر دیا اور دنیا کے سب سے بڑے رہنما کی قوتِ رہنمائی کے اظہار کا بھی یہی موقع تھا' چنانچہ اس وقت مالِ غنیمت' زرِفدیہ اور قیدیوں کے ساتھ برتاؤ کے متعلق غالب و فاتح مسلمانوں میں اختلافِ

رائے رونما ہو گیا۔ آنحضرت ﷺ کے سامنے اس وقت اہم ترین کام تھا۔ آپ نے امرِ اوّل کی طرف توجہ فرمائی کہ مظلوم فاتح قوت پا کر اپنا جوہر نہ کھو بیٹھیں۔ چنانچہ حضرت عمر فاروقؓ نے ان قیدیوں کے قتل کی جو تجویز پیش کی تھی آپؐ نے رد فرما دی اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کی تجویز کہ فدیہ لے کر ان کو رہا کر دیا جائے قبول فرمائی اور ان سے فرمایا کہ اے ابوبکر تمہاری مثال ابراہیم اور عیسیٰ علیہ السلام کی ہے اور اے عمر تمہاری مثال نوحؑ اور موسیٰ علیہ السلام کی۔ (۱) آپ نے حضرت ابراہیمؑ کی نیک دلی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی رحم دلی کی مثال کی پیروی کی اور بدر کے ان قیدیوں کی جان بخشی فرمائی اور قتل کے بجائے زرِ فدیہ ادا کر دینے پر رہائی کا حکم دے دیا اور جو ان میں نادار تھے ان کو چند مسلمان بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھانے پر آزادی کا فرمان عطا کر دیا اور صحابہؓ کو تاکید کی کہ ان کے ساتھ بہتر سے بہتر سلوک کریں، چنانچہ بعضوں کا یہ حال تھا کہ وہ کھجور پر قناعت کرتے تھے اور اپنے قیدیوں کو روٹی کھلاتے تھے۔

لیکن وحیِ الٰہی کی نگاہ میں اس سے زیادہ اہم پہلو ان غریبوں کا دفعتاً مال و دولت کی حرص و طمع میں مبتلا ہو جانا تھا چنانچہ یہی صورت پیش آئی، مال غنیمت کے فراہم کرنے والوں نے دعویٰ کیا کہ اس پر ہم نے لڑائی میں قبضہ کیا ہے اس لیے ہمارا ہے، لڑنے والے نوجوانوں نے دعویٰ کیا کہ ہماری تلواروں سے فتح حاصل ہوئی ہے اس لیے اس کے اصلی حق دار ہم ہیں، جو لوگ رسول اللہ ﷺ کی حفاظت کر رہے تھے وہ کہتے تھے کہ سب سے نازک اور خطرناک فرض ہمارا تھا۔ اس لیے ہم کو ملنا چاہیے۔ (۲) یہی اختلاف زرِ فدیہ کی ملکیت کی نسبت بھی ہوا ہوگا۔ جیسا کہ سورۂ انفال کی ابتدائی آیتوں سے ظاہر ہوتا ہے۔

﴿یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْاَنْفَالِ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰہِ وَ الرَّسُوْلِ فَاتَّقُوْا اللّٰہَ وَ اَصْلِحُوْا ذَاتَ بَیْنِکُمْ وَ اَطِیْعُوْا اللّٰہَ وَ رَسُوْلَہٗٓ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ﴾ (انفال:۱)

(''اے پیغمبر) تجھ سے (تیرے ساتھی) غنیمت کا حکم پوچھتے ہیں تو کہہ دے کہ مال غنیمت اللہ کا ہے اور رسول کا ہے تو اللہ سے ڈرو اور آپس میں صلح کرو اور اللہ اور اس کے رسول کے حکم کی اطاعت کرو اگر تم مومن ہو۔''

حضرت عبادہؓ بن صامت سے پوچھا گیا کہ سورۂ انفال کے نزول کی کیا وجہ ہے، تو کہا:

فِیْنَآ اَصْحَابُ بَدْرٍ نَزَلَتْ حِیْنَ اخْتَلَفْنَا فِی النَّفْلِ وَ سَآءَ تْ فِیْہِ اَخْلَاقُنَا فَنَزَعَہُ اللّٰہُ مِنْ اَیْدِیْنَا فَجَعَلَہُ اللّٰہُ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰہُ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَسَمَہٗ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَیْنَ الْمُسْلِمِیْنَ عَنْ سَوَآءٍ.

''یہ سورہ ہم بدر والوں کے متعلق نازل ہوئی جب مال غنیمت میں ہم نے باہم اختلاف کیا اور اس میں

---

(۱) مستدرک حاکم ج ۳ ص ۲۱ کتاب المغازی حیدر آباد دکن۔

(۲) سیرت ابن ہشام ذکر الفی ببدر و الاساری ج ۱۰ ص ۳۹۱ مطبوعہ محمد علی۔

ہمارے اخلاق برے ہو گئے تو خدا نے اس کو ہمارے ہاتھوں سے چھین لیا اور رسول اللہ ﷺ کے اختیار میں دے دیا تو آپؐ نے تمام مسلمانوں کے مابین برابر تقسیم فرما دیا۔''

یہی وہ تنبیہ ہے جو وحیِ الٰہی نے آنحضرت ﷺ کے اس فیصلہ پر کی اور آیت اتری۔ (۱)

﴿مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗٓ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِى الْاَرْضِ تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا وَ اللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ وَ اللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ○ لَوْ لَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَآ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ فَكُلُوْا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلٰلًا طَيِّبًا وَّ اتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ○﴾

(انفال:۶۷۔۶۹)

''کسی پیغمبر کو زیبا نہیں کہ اس کے پاس قیدی ہوں' یہاں تک کہ خون بہائے زمین پر (یعنی نبی) تم لوگ دنیا کا سامان چاہتے ہو اور اللہ آخرت چاہتا ہے اور اللہ غالب اور دانا ہے' اگر خدا کی طرف سے یوں ہونا مقدر نہ ہو چکا ہوتا تو تمہارے اس لینے پر تم کو بڑی سزا ملتی تو اب جو تم نے لوٹ میں پایا حلال و پاک کر کے کھاؤ' اور اللہ کا ادب کرو اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔''

اسی قدر نہیں بلکہ ان قیدیوں کو جن سے زرِ فدیہ وصول ہوا یا وصول کیا جا رہا تھا' اس کے بعد ہی یہ تسلی دی گئی: (۲)

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّمَنْ فِيْٓ اَيْدِيْكُمْ مِنَ الْاَسْرٰٓى اِنْ يَّعْلَمِ اللّٰهُ فِىْ قُلُوْبِكُمْ خَيْرًا يُّؤْتِكُمْ خَيْرًا مِّمَّآ اُخِذَ مِنْكُمْ وَ يَغْفِرْ لَكُمْ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ (انفال:۷۰)

''اے پیغمبر! تمہارے ہاتھوں میں جو قیدی ہیں ان سے کہہ دو کہ اگر اللہ تمہارے دلوں میں نیکی پائے گا تو تم کو اس سے بہتر چیز دے گا جو تم سے لی گئی اور تم کو معاف کرے گا اور اللہ معاف کرنے اور رحم کرنے والا ہے۔''

بعضوں کو یہ شبہ ہوا ہے کہ یہ تنبیہ قیدیوں کے زرِ فدیہ لے کر رہا کرنے اور قتل نہ کیے جانے پر ہوئی' حالانکہ ظاہر ہے کہ جن قیدیوں سے زرِ فدیہ لیے جانے پر اللہ تعالیٰ نے ان سے ہمدردی فرمائی اور اگر وہ حسنِ نیت ظاہر کریں تو ان کی مغفرت کا وعدہ اور اس دنیاوی خزف ریزہ سے جو ان سے بطورِ فدیہ لیا گیا' ان کو بہتر دولت دیے جانے کی امید دلائی' کیا ان کا قتل زرِ فدیہ لینے سے کم سزا ہوتی؟ اور جن سے فدیہ لیا گیا' ان کے قتل کیے جانے پر ان کے قاتلوں پر اس سے زیادہ سرزنش اور ان مقتولوں سے اس سے زیادہ ہمدردی نہ کی جاتی۔

بہر حال وہی غنیمت اور زرِ فدیہ جس کو اس وقت آنحضرت ﷺ نے صاف وصریح وحی آنے سے پیشتر قبول فرما لیا تھا اور جس پر تنبیہ ہوئی' وہ آخر کار ''اجتہادِ نبوی'' کے مطابق مناسب موقع پر جائز اور حلال وطیب ہی

---

(۱) سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۳۹۱۔

(۲) مزید تفصیل کے لیے دیکھو سیرت النبی جلد اول میں غزوۂ بدر کا بیان۔

ٹھہرالیا اور غلطی، غلطی باقی نہیں رہی، مال غنیمت لینے کے متعلق کُلُوْا مِمَّا غَنِمْتُمْ۔ کا حکم اسی وقت آ گیا اور فدیہ لینے کی اجازت ﴿اِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَ اِمَّا فِدَآءً﴾ کے الفاظ میں بعد کو مناسب زمانہ میں آ گئی اور اس مال و دولت کی حرص وطمع سے اس وقت جو بداخلاقی پیدا ہونے والی تھی اس کا ازالہ ہمیشہ کے لیے اس طرح کر دیا کہ اس کی تقسیم کا ابدی قانون بنا دیا گیا۔ اس میں تمام ضروری مستحقین کے حصے لگا دیے گئے۔

تیسرا واقعہ

تیسرا واقعہ یہ ہے کہ آپؐ غزوۂ تبوک کے لیے جا رہے تھے جس میں بکثرت مسلمانوں کی شرکت کی ضرورت تھی کہ مقابلہ رومیوں کی دل بادل فوج سے تھا اور کسی منظّم سلطنت سے ٹکر لینے کا یہ پہلا موقع مسلمانوں کو پیش آیا تھا اور موسم بھی نہایت گرم اور سخت تھا، تیس ہزار مسلمانوں کی جمعیت روانہ ہوگئی، مگر کچھ مخلص مسلمان مجبوراً چھوٹ گئے اور اکثر منافقین نے جان بوجھ کر اس کی شرکت سے جی چرایا، آپ واپس آئے تو عدمِ شرکت کے قصور وار منافقین آ آ کر جھوٹی قسمیں کھا کھا کر اپنے عذرات بیان کرنے لگے، آپ نے ان کا اعتبار کر کے رحم فرما کر ان کے قصور سے درگزر کیا، اس پر تنبیہ ہوئی:

﴿سَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَوِ اسْتَطَعْنَا لَخَرَجْنَا مَعَكُمْ يُهْلِكُوْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ○ عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَ تَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ﴾ (التوبۃ:۶۔۷)

''وہ خدا کی قسمیں کھائیں گے کہ اگر ہم مقدور رکھتے تو ضرور تمہارے ساتھ نکلتے وہ اپنی جانوں کو برباد کرتے ہیں اور اللہ جانتا ہے کہ وہ جھوٹے ہیں اللہ تجھ کو بخشے تو نے ان کو رخصت کیوں دی جب تک تجھ پر وہ کھل نہ جاتے جو ان میں سچ بولتے اور تو جان لیتا جھوٹ بولنے والوں کو۔''

ظاہر ہے کہ آپؐ علم غیب سے واقف نہ تھے اور ان کے واقعی حالات سے بے خبر تھے۔ اس لیے بظاہر ان کے قول پر اعتبار ہی کرنا تھا اور وہی آپؐ نے کیا، مگر علام الغیوب نے حقیقت حال سے باخبر فرما کر ان کے جھوٹ کا پردہ چاک کیا، بہرحال یہاں بھی منشائے خطا اگر خطا سمجھی جائے تو وہی ترحم کی شان تھی۔

چوتھا واقعہ

منافقین کی نسبت آپؐ کو اطلاع دے دی گئی تھی کہ ان کے حق میں آپؐ کی دعائے مغفرت قبول نہ ہوگی۔ اور فرما دیا گیا تھا کہ:

﴿اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْلَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ﴾ (توبہ:۸۰)

''تو ان کی مغفرت کی دعا مانگے یا نہ مانگے اگر ستر دفعہ بھی ان کی مغفرت کی دعا مانگے تو ہرگز ان کو خدا نہ بخشے

گا یہ اس لیے کہ انہوں نے خدا کا اور اس کے رسول کا انکار کیا۔''

اس حکم کے آنے کے بعد عبداللہ بن ابی سلول کا انتقال ہوا' یہ منافقوں کا سردار تھا۔ اس کا لڑکا مخلص مسلمان تھا۔ اس نے آ کر آپ سے نمازِ جنازہ پڑھانے کی درخواست کی جس کو آپؐ فرطِ کرم سے رد نہ فرما سکے' حضرت عمرؓ نے عرض بھی کی کہ یا رسول اللہ اس کے عدمِ مغفرت کے متعلق تو حکم ہو چکا ہے' فرمایا میں ستر دفعہ سے بھی زیادہ اس کی مغفرت کی دعا مانگوں گا' بہر حال آیتِ بالا میں گو آپؐ کے مغفرت مانگنے اور نہ مانگنے دونوں کو بیکار و بے سود بتایا گیا تھا' مگر ان کے حق میں سرے سے دعائے مغفرت نہ مانگنے کی کوئی ممانعت نہ تھی۔ اس لیے آنحضرت ﷺ نے غایت شفقت سے اس بیکار فرض کو انجام دیا تا کہ اس کے مخلص مسلمان فرزند کی دل شکنی نہ ہو اور اس لیے تغافل فرمایا کہ ایک مخلص کی دل جوئی تو ہو گی مگر بیسیوں منافقین کو اپنے چھپانے میں کامیابی ہو جائے گی اور وہ مسلمانوں کے اندر رہ کر فتنوں کا باعث بنیں گے اس لیے حکم ہوا

﴿وَ لَا تُصَلِّ عَلٰٓی اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّ لَا تَقُمْ عَلٰی قَبْرِهٖ اِنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَمَاتُوْا وَ هُمْ فٰسِقُوْنَ﴾ (توبہ:۸۴)

''اور نہ کبھی ان میں سے کسی کے جنازہ کی نماز پڑھ اور نہ اس کی قبر پر کھڑا ہو' بے شک انہوں نے خدا اور اس کے رسول کا انکار کیا اور اسی گنہگاری کی حالت میں مرے۔''

پانچواں واقعہ

اس کی تفصیل یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اپنی بعض بیویوں کی خوش نودی اور رضامندی کے لیے کسی مباح چیز کو' جو آپؐ کو بہت مرغوب تھی اپنے اوپر حرام کر لیا تھا یعنی اس کے کبھی نہ استعمال کرنے کا عہد فرما لیا تھا' ظاہر ہے کہ ہر شخص پر مباح چیز کا کھانا فرض نہیں' اس کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنی خوشی سے یا کسی دوسرے کی رضامندی کے لیے اس کے نہ کھانے کا عہد کرے اس لیے اگر آنحضرت ﷺ نے بعض بیویوں کی خاطر جن کو وہ شے پسند نہ تھی' اس کو اپنے اوپر حرام کر لیا۔ تو ظاہر ہے کہ آپؐ کا اپنی بیویوں کی خاطر داری کے لیے ایسا کرنا الزام کے قابل نہیں کہ آپ نے بحیثیتِ شوہر کے ان کی اتنی دلجوئی کو بھی عورتوں کے ساتھ عدل و انصاف کے مناسب سمجھا' مگر اس مسئلہ کی ایک دوسری حیثیت بھی تھی' اور وہ یہ کہ بحیثیت ایک پیغمبر کے ایک حلال و جائز چیز کو اپنے اوپر حرام کر لیا اور اس کے نہ کھانے کا عہد کرنے سے آپ کی اقتدا میں امت کے عام افراد بھی اس کو ناجائز نہیں تو ناپسند ضرور ہی کرتے' اور یہ ایک طرح سے شریعتِ الٰہی میں تبدیل و تحریف کا مرادف ہو جاتا' اس لیے حکم آیا کہ ان امور میں پیغمبر کو کسی کی دل جوئی اور خاطر داری کی پروا نہ کرنی چاہیے۔ فرمایا:

﴿یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ تَبْتَغِیْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِكَ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ﴾ (تحریم:۱)

''اے پیغمبر! جس کو اللہ نے تیرے لیے حلال کیا ہے اس کو حرام کیوں کرتا ہے' اپنی بیویوں کی مرضی چاہتا ہے اور خدا بخشنے والا' مہربان ہے۔''

اس موقع پر اللہ تعالیٰ کا آپؐ کو نبی کہہ کر خطاب کرنا یہ واضح کرتا ہے کہ بحیثیت ایک انسان اور شوہر ہونے کے آپ ایسا کر سکتے تھے' مگر پیغمبر کی حیثیت سے آپؐ کو یہ اختیار نہیں۔

الغرض یہی وہ پانچ واقعے ہیں جن میں آپ کی اجتہادی خطا ثابت کی گئی ہے مگر تفصیلات سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ ان کو خطا کہنا درحقیقت مجاز ہے کہ پیغمبر کی بلندی و معصومی کو پیشِ نظر رکھ کر اس مجازی خطا کی بھی اجازت نہیں۔ اور اسی وحیِ الٰہی نے ان میں سے ہر موقع پر تنبیہ کی اور اپنے صحیح فیصلہ سے رہنمائی فرمائی۔ اب کیا کسی کا شبہ یہ بھی ہے کہ جس طرح آنحضرت ﷺ کو یہ معمولی مسامحات پیش آئے جن کی تنبیہ و اصلاح ہر وقت وحیِ الٰہی نے کی' ایسے ہی ممکن ہے کہ آپؐ کو اور بھی ایسے مسامحات پیش آئے ہوں جن کی تنبیہ و تصحیح کی حکمتِ الٰہی نے پروانہ کی اور خاموشی برتی' اگر کسی کو یہ شبہ ہے تو درحقیقت رسالت و نبوت کی مرتبہ شناسی اور دینِ الٰہی و شریعتِ ربانی کی حقانیت اور اللہ تعالیٰ کے طریقِ رشد و ہدایت کی معرفت سے وہ کوسوں دور ہے' رسولوں کی بعثت اس لیے ہے کہ وہ غلط کار انسان کو ان کی غلطی سے نکال کر حق و صواب کی تعلیم دیں نہ اس لیے کہ ان کے ذریعہ الٹے ہدایت کے بجائے مزید ضلالت کا اضافہ ہو' استغفر اللہ ثم استغفر اللہ!! اس لیے ناممکن ہے کہ رسولوں کے ہاتھوں اور زبانوں سے کوئی ایسا کام صادر ہو جو حکمتِ الٰہی کے مطابق نہ ہو اور پھر اللہ اس کی تصحیح اور رہنمائی سے تغافل برتے اور انسانوں کو اپنے رسولوں کے ذریعہ گمراہ ہونے دے۔

پیغمبرانہ اجتہاد و رائے علم کا وہ کوثر ہے جس کی دھاریں دماغ سے نہیں بلکہ دل کے سرچشمہ سے بہتی ہیں' جو انسانی رائے و تجربہ سے نہیں بلکہ الہامِ الٰہی' القائے ربانی' حکمتِ یزدانی' فہم رسالت' ملکۂ نبوت سے ماخوذ ہے اور جس کی نسبت محرمِ اسرارِ شریعت عمر فاروق رضی اللہ عنہ برسرِ منبر فرماتے ہیں:

يَآ اَيُّهَا النَّاسُ اِنَّ الرَّاىَ اِنَّمَا كَانَ مِن رَّسُوْلِهٖ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُصِيْبًا لِاَنَّ اللّٰهُ كَانَ يَرِيْهُ وَ اِنَّمَا هُوَ مِنَّا الظَّنَّ وَ التَّكَلُّفَ. (ابوداؤد کتاب الاقضیۃ)

''اے لوگو! آنحضرت ﷺ کی رائے غلطی سے پاک تھی کیونکہ اللہ تعالیٰ آپ کو راہ دکھاتا تھا اور ہماری رائے' ہمارا گمان اور از خود کہنا ہے۔''

وہ رائے نبوی جو خدا کے بتانے اور دکھانے سے قائم ہوئی ہو' ظاہر ہے کہ بمنزلۂ وحی کے ہے اور اس کا نام بشری اجتہاد اور انسانی رائے نہیں بلکہ نبوی اجتہاد اور پیغمبرانہ رائے ہے جو عملاً وحیِ الٰہی کی ہم مرتبہ اور کلامِ ربانی کی ہم پایہ ہے۔ حضرت عمرؓ نے اس خطبہ میں جو کچھ کہا ہے درحقیقت وہ خود کلام پاک سے مستنبط ہے' قرآن پاک میں ہے:

﴿اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ وَ لَا تَكُنْ

لِّلْخَآئِنِيْنَ خَصِيْمًا﴾ (النساء:۱۰۵)

''ہم نے تجھ پر کتاب سچائی کے ساتھ اتاری تا کہ لوگوں کے درمیان جو اللہ تجھ کو سوجھائے' فیصلہ کرے۔ اور تو نہ ہو دغابازوں کی طرف سے جھگڑنے والا۔''

اس سے ظاہر ہوا کہ آنحضرت ﷺ کو جو دکھایا' سوجھایا' اور رائے پیدا کرائی جاتی تھی' وہ خدا کی طرف سے ہوتی تھی' یہی پیغمبرانہ رائے ہے جس کی نسبت خود آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا:

اَنَا اَقْضِیْ بَیْنَکُمْ بَرَائِیْ فِیْمَا لَمْ یَنْزِلْ عَلَیَّ. (ابوداؤد' اقضیہ)

''میں تم لوگوں کے درمیان اس مسئلہ میں جس کی نسبت مجھ پر وحی نہیں ہوئی اپنے رائے سے فیصلہ کرتا ہوں۔''

یہ فیصلہ اگر غلط ہوتا تو فوراً وحیِ الٰہی دست گیری کرتی اور صحیح راستہ پر لے آتی جیسا کہ گزشتہ پانچوں واقعات سے ظاہر ہے

ایک غلط استدلال

اس آیت پاک سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ مقدمات کے فیصلوں میں آپ کو اراءتِ الٰہی ہوتی تھی یعنی خدا کی طرف سے آپؐ کو رائے سوجھائی جاتی تھی اور ظاہر ہے کہ اراءتِ الٰہی (خدا کی طرف سے سوجھایا جانا) تا کہ آپ کتابِ الٰہی کے مطابق فیصلہ کریں' غلط نہیں ہوسکتی' لیکن ابوداؤد وغیرہ میں ایک حدیث ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اہلِ مقدمہ سے فرمایا:

''میں ایک بشر ہوں' تم لوگ میرے پاس اپنے جھگڑے لے کر آتے ہو اور شاید تم میں سے بعض زیادہ زبان آور ہوں جو اپنی دلیل کو خوبی سے بیان کرسکتے ہوں' تو میں جیسا سنتا ہوں ویسا فیصلہ کردیتا ہوں تو میں اگر کسی کو وہ حق دلادوں جو اس کا نہیں' بلکہ اس کے بھائی کا ہے تو وہ نہ لے کہ میں اس کو آگ کا ٹکڑا کاٹ کر دے رہا ہوں۔'' (کتاب الاقضیہ)

اس سے ایک غلط فہم یہ استدلال کرسکتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے فیصلے ہمیشہ غلطی سے پاک نہیں ہوتے تھے اس لیے امت آپ کے قضایا اور فیصلوں کی پیروی پر مجبور نہیں' لیکن ایسا خیال کرنا سراسر مغالطہ ہے۔ اصل یہ ہے کہ مقدمات میں دو چیزیں ہوتی ہیں' ایک واقعہ کی اصلی روداد جس کو ہر مدعی اور مدعا علیہ اپنے دعویٰ کے مطابق بنا کر اپنے اپنے رنگ میں بیان کرتا ہے' اس کے بعد دوسری چیز اس بیان کردہ روداد کے مطابق صحیح اور عادلانہ حکم اور فیصلہ ہے جو تمام تر مقدمہ کی اس روداد پر مبنی ہوتا ہے جو حاکم و قاضی کے سامنے بیانات اور شہادتوں کے ساتھ پیش ہوتی ہے' یہ بات کہ واقعہ کی اصلی روداد کیا ہے اور ان میں سے کون صحیح کہہ رہا ہے' علمِ غیب سے تعلق رکھتی ہے جس کا دعویٰ کسی نبی کو نہیں' اور اگر ہو بھی تو یہ دعویٰ بجائے خود مسلم ہے کہ قاضی کا ذاتی علم دو انسانوں کے درمیان فیصلہ کا مبنیٰ

نہیں قرار پا سکتا' اس کے لیے فریقین کے بیانات' شہادتیں اور دلائل ہی بکار آمد ہیں' آنحضرت ﷺ کے ارشاد سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ امر اول کے متعلق عموماً آپ کو غیب کا علم عطا نہیں ہوا' لیکن دوسری چیز یعنی روداد کو آنحضرت ﷺ نے صحیح باور کیا اس کے مطابق آپ کا فیصلہ کبھی کبھی صحیح وصواب اور عادلانہ نہیں ہوتا تھا' یہ کہنا رسول و نبی کی شان کی توہین وتحقیر ہے اور اس ''اراءتِ الٰہی'' کے خلاف ہے جس کا شرف مقدمات کے فیصلے میں آپ کو بخشا جاتا تھا۔ اس لیے جو غلطی فیصلوں میں آپ سے ہو سکتی تھی وہ فریقین میں سے کسی ایک کی دلیل وشہادت کو سن کر اس کے صحیح یا غلط کے مطابق واقعہ یا مخالفِ واقعہ سمجھنے میں لیکن جس کو آپ نے صحیح باور فرما لیا اس کے مطابق مناسب و صحیح حکم وفیصلہ کرنے میں آپؐ سے کبھی غلطی نہ ہوئی اور نہ ہو سکتی تھی اور امت آپ کی پیروی آپ کے ان قضایا اور فیصلوں میں کرتی ہے نہ کہ نزاعِ مذکور کے گزشتہ واقعات اور گزشتہ مقدمات کے صحیح یا غلط باور کرنے میں ﴿فَشَتَّانَ بَیْنَهُمَا﴾

آنحضرت ﷺ کے اس اعلان میں نکتہ یہ ہے کہ شاید فریقین میں سے کوئی غلط بیان یا جھوٹا یا برسرِ باطل جو اپنے مقدمہ کی روداد زیادہ خوبی سے بنا کر آپؐ کی عدالت سے موافق فیصلہ حاصل کرے' یہ سمجھے کہ گو حقیقت میں میرا حق نہ تھا۔ لیکن اب عدالتِ نبوی نے میرے حق میں فیصلہ کر دیا تو میری ملکیت ثابت ہو گئی اور غصبِ حق کے گناہ سے برأت ہو گئی تو اس کا ایسا سمجھنا صحیح نہ ہوگا' گو قانوناً حکم نافذ ہو جائے گا۔ مگر عنداللہ جو برسرِ حق تھا' وہ حق ہی رہے گا اور جو برسرِ باطل تھا وہ باطل ہی رہے گا اور جو اصل مالک تھا وہی مالک رہے گا۔ اور جو غاصب ہے وہ غاصب ہی ٹھہرے گا' اسی اعلان کا اثر تھا کہ جب آنحضرت ﷺ نے ایک مقدمہ میں فریقین کو اس حقیقت سے مطلع فرمایا تو دونوں رو پڑے اور دونوں ایک دوسرے کے حق میں دست بردار ہونے پر آمادہ ہو گئے۔ (ابوداؤد کتاب الاقضیہ)

آنحضرت ﷺ رودادِ مقدمہ کو سامنے رکھ کر جو فیصلے صادر فرماتے تھے وہ تمام تر حق' منصفانہ اور صحیح ہوتے تھے اور ان کی اطاعت سے انحراف' کفر ونفاق تھا' اسی لیے ارشاد ہوا کہ:

﴿فَلَا وَ رَبِّکَ لَا یُؤْمِنُوْنَ حَتّٰی یُحَکِّمُوْکَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَهُمْ ثُمَّ لَا یَجِدُوْا فِیْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَیْتَ وَ یُسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا﴾ (نساء:۶۵)

''سو قسم ہے تیرے رب کی وہ مومن نہ ہوں گے جب تک وہ تجھ کو حکم نہ مانیں' پھر اپنے دلوں میں تیرے فیصلہ سے تنگی نہ پاویں اور مان کر قبول کریں۔''

﴿وَ مَا کَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّ لَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَی اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ یَّکُوْنَ لَهُمُ الْخِیَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ وَ مَنْ یَّعْصِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِیْنًا﴾ (احزاب:۳۶)

''اور کسی ایمان دار مرد یا عورت کا یہ کام نہیں کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی بات کا فیصلہ کر دے تو بھی اس کو اپنے کام کا اختیار رہے اور جو خدا اور اس کے رسول کے بے حکم چلا وہ صریح گمراہ ہوا۔''

کیا امت کو رسول کی اطاعت اور اس کے فیصلوں کے بے چون و چرا قبول کر لینے کا خدا کی طرف سے تاکیدی حکم برسرِ باطل پہلو پر ہوسکتا ہے' چنانچہ دوسری آیت میں اس کی تصریح کر دی گئی ہے کہ آپ کا کوئی فیصلہ کبھی ظالمانہ اور غلط نہیں ہوسکتا:

﴿وَ اِذَا دُعُوْٓا اِلَی اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ مُّعْرِضُوْنَ○ وَ اِنْ يَّكُنْ لَّهُمُ الْحَقُّ يَاْتُوْٓا اِلَيْهِ مُذْعِنِيْنَ ○ اَفِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ اَمِ ارْتَابُوْٓا اَمْ يَخَافُوْنَ اَنْ يَّحِيْفَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَ رَسُوْلُهٗ بَلْ اُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ○﴾ (نور:۴۸۔۵۰)

''اور جب وہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف بلائے جائیں تا کہ رسول ان کے درمیان فیصلہ کر دے تو ان میں کا ایک گروہ منہ پھیر لیتا ہے اور اگر ان کو کوئی حق پہنچتا ہو تو قبول کر کے چلے آئیں' کیا ان کے دلوں میں روگ ہے یا وہ ڈرتے ہیں کہ خدا اور اس کا رسول ان کے ساتھ ناانصافی کرے گا بلکہ وہی بے انصاف ہیں۔''

عقلِ بشری

اس میں بھی شک نہیں کہ وحی اور ملکۂ نبوت کے علاوہ نبی میں نبوت و رسالت کے فرائض سے باہر کی چیزوں میں وہی عقل ہوتی ہے جو عام انسانوں کی ہوتی ہے اور جس میں اجتہادی غلطی کا ہر وقت امکان ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحب کے نزدیک اجتہاد کی یہی وہ دوسری قسم ہے جس میں نبی سے بھی غلطی ہوسکتی ہے کہ اس کا مدار وحی و الہام اور ملکۂ نبوت پر نہیں۔ بلکہ انسانی علم و تجربہ پر ہوتا ہے اور یہی وہ قسم ہے جس کا اتباع پیروؤں پر واجب نہیں' اور اس کی بہترین مثال کھجور کی کاشت کا واقعہ ہے۔

صحیح مسلم میں ہے کہ آنحضرت ﷺ مدینہ منورہ کے بعض باغوں میں گزرے تو دیکھا کہ کچھ لوگ کھجور کے درختوں پر چڑھ کر کچھ کر رہے ہیں۔ آپؐ نے دریافت فرمایا کہ یہ کیا کر رہے ہیں؟ ایک ہمراہی نے کہا کہ یہ مادہ کھجوروں میں نر کھجوروں کے پھول ڈالتے ہیں کہ پھل زیادہ آئیں۔ فرمایا میں تو نہیں سمجھتا کہ اس سے کچھ فائدہ ہو گا۔ ایک روایت میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ اگر ایسا نہ کرتے تو بہتر ہوتا۔ اس نے جا کر باغ والوں سے آپؐ کا یہ فقرہ بیان کر دیا' صحابہؓ نے جو سرتاپا اطاعت تھے' اس پر عمل کیا' اور ایسا کرنا چھوڑ دیا' پھل اس سال کم آئے یا کم ٹھہرے' آپؐ کا پھر گزر ہوا تو ان لوگوں نے صورتِ حال عرض کی' آپؐ نے فرمایا میں نے تو یوں ہی ایک بات سمجھ کر کہہ دی تھی' اگر ان کو اس عمل سے فائدہ ہوتا ہے تو کریں' پھر فرمایا:

﴿اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ اِذَآ اَمَرْتُكُمْ بِشَیْءٍ مِّنْ دِيْنِكُمْ فَخُذُوْا بِهٖ وَ اِذَآ اَمَرْتُكُمْ بِشَیْءٍ مِّنْ رَّاْیِیْ فَاِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ﴾

''میں تو ایک آدمی ہوں' جب تمہارے دین کا کوئی حکم دوں تو اس کو قبول کرو اور جب اپنی رائے سے کچھ

کہوں تو میں ایک آدمی ہوں۔''

ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں۔ (۱)

﴿اَنْتُمْ اَعْلَمُ بِاُمُوْرِ دُنْیَاکُمْ﴾

''تم اپنے دنیا کے کاموں کو زیادہ جانتے ہو۔''

تیسری روایت کے یہ الفاظ ہیں۔

فَاِنِّیْ اَنَّمَا ظَنَنْتُ ظَنًّا فَلَا تُؤَاخِذُوْنِیْ بِالظَّنِّ وَ لٰکِنْ اِذَا حَدَّثْتُکُمْ عَنِ اللّٰہِ شَیْئًا فَخُذُوْا بِہٖ فَاِنِّیْ لَنْ اَکْذِبَ عَلَی اللّٰہِ عَزَّوَجَلَّ۔

''میں نے ایک گمان سا کیا تھا' گمان پر مجھ کو نہ پکڑو' ہاں جب خدا کی طرف سے کوئی بات کہوں تو اس کو لو کہ میں خدا پر جھوٹ نہ کہوں گا۔''

ان تینوں روایتوں میں آپ نے اپنے اس ارشاد کو ظن (گمان) رائے اور امرِ دنیا سے تعبیر فرمایا ہے اس سے یہ کلیہ سمجھ میں آتا ہے کہ امورِ دین و شریعت میں آپ کا ہر حکم واجب اور من جانب اللہ ہے' لیکن کھیتی باڑی' علاج و معالجہ وغیرہ خالص دنیاوی امور میں اگر آپ نے کچھ کہا ہے تو اس کی حیثیت فقط مشورہ اور رائے کی ہے یہی سبب ہے کہ صحابہ کرام جن باتوں میں اپنا مشورہ آپ کو دینا چاہتے تھے' پوچھ لیتے تھے کہ یا رسول اللہ! یہ وحی سے ہے یا رائے ہے' آپ جب فرما دیتے تھے کہ رائے سے ہے تو وہ اپنا مشورہ پیش کرتے اور آپ پسند فرماتے تو قبول فرماتے' غزوۂ بدر میں آپ نے ایک مقام پر پڑاؤ ڈالنا چاہا' ایک صحابیؓ نے آ کر عرض کی یا رسول اللہ! اس مقام کا انتخاب وحی سے ہے یا رائے سے ہے' فرمایا محض رائے سے ہے۔ تو عرض کی کہ جنگی نقطہ نظر سے یہ مقام بہتر نہیں' فلاں مقام بہتر ہے۔ آپ نے ان کی رائے پسند کی اور اس پر عمل فرمایا' اسی طرح صلح و جنگ اور حکومت کے دوسرے معاملات میں بھی صحابہ سے مشورہ لیا۔ اور عمل فرمایا ہے اور اسی میں خود حضور ﷺ کو ﴿وَ شَاوِرْھُمْ فِی الْاَمْرِ﴾ (آل عمران) یعنی امور حکومت یا عام امور میں صحابہ سے مشورہ لے لو' کا حکم خدا کی طرف سے ہے۔ چنانچہ غزوۂ احزاب میں خندق کھودنے میں سلیمان فارسیؓ کی رائے پر عمل کیا۔ لیکن امورِ جنگ و سیاست میں بھی جس بات کا حکم عقلِ بشری سے نہیں بلکہ وحیِ الٰہی یا فہمِ نبوی سے ہوا تھا۔ اس میں آپ نے نہ کسی سے مشورہ لیا اور نہ کسی مشورے کو قبول فرمایا۔ صلح حدیبیہ کے شرائط اور دفعات جو سراسر مصلحتِ الٰہی اور حکمتِ ربانی پر مبنی تھے' ان کے بدلنے پر حضرت عمرؓ اور دوسرے صحابہؓ نے کیا کیا زور نہیں لگایا۔ مگر آنحضرت ﷺ نے کچھ التفات نہ فرمایا۔ اور آخر مستقبل نے بتایا کہ فہمِ نبوت سراسر صحیح تھا۔ اسی طرح غزوۂ احد جیسے نازک موقع پر عبداللہ بن ابی کا تین سو آدمیوں کے ساتھ پھر جانا گوارا کیا مگر مدینہ سے باہر جا کر صف آرا ہونے سے باز نہ آئے اور پھر مستقبل نے مصلحتِ الٰہی

---

(۱) یہ تینوں روایتیں صحیح مسلم باب وجوب امتثال ماقالہ شرعًا دون ماذکرہ ﷺ من معائش الدنیا علی سبیل الرای ج ۲ ص ۳۰۵ مصر میں ہیں و ص ۲۶۴ طبع کراچی۔

کے راز کو فاش کیا۔

ایک ادنیٰ سا تامل عقلی حیثیت سے بھی یہ راز بتا دے گا کہ دنیا میں ہر صاحبِ فن کی ایک نہیں دو عقلیں ہوتی ہیں ایک اس فن کے متعلق جس کی استعداد اس کے اندر رکھی جاتی ہے اور پھر تعلیم و تربیت، مشق اور کثرتِ عمل سے وہ اتنی بلند اور پختہ ہو جاتی ہے کہ وہ اس فن کے بڑے بڑے عمیق اور مشکل دقائق کو ایک نظر میں معلوم کر لیتی ہے اور اس کے لاینحل عقدوں کو اشاروں میں حل کر دیتی ہے لیکن اس دائرہ کے باہر اس کی دوسری عقل عام انسانوں ہی کی طرح معمولی ہوتی ہے۔ ایک شخص جو فنِ تعمیر کی مہارت اور ہندسہ اور انجینئرنگ کی صناعی میں غیر معمولی عقل و ذہانت رکھتا ہے، بالکل ممکن ہے کہ کھجور کی کاشت میں اس کی عقل معمولی انسانوں سے بھی کم درجہ ہو، ایک فلسفی جو اپنے زورِ فکر سے افلاطون و ارسطو کی غلطیاں نکالتا ہو، وہ تعمیر کے فن میں ایک معمولی مزدور سے زیادہ کم عقل ہو، یہ روز مرہ کی پیش آنے والی مثالیں ہیں۔ اسی طرح برگزیدہ انسان جو روحانیت کے اسرار، معرفتِ ربانی کے حقائق، تزکیۂ نفس کے رموز، اخلاق و معاشرت کے آداب اور حقوق و شریعت کے مسائل میں دقیقہ رس فہم اور نکتہ داں عقل رکھتا ہو، اس کو تعمیر و کاشت کاری کے مسائل میں محض معمولی درک ہو بلکہ بالکل نہ ہو۔

اسی طرح انبیاء علیہم السلام امورِ دین و شریعت میں وحی اور ملکۂ نبوت سے جو کچھ فرماتے ہیں وہ عین مصلحت، عین حکمت، خطا اور غلطی سے سرتاپا مبرا اور پاک ہوتا ہے لیکن دوسرے امور مثلاً پہننے اوڑھنے، کھانے پینے، رہنے سہنے، سلطنت و سیاست، نظم و نسق، صلح و جنگ، سامان و اسلحہ، مرکب و سواری، صنعت و حرفت، طب و علاج وغیرہ دنیاوی امور کی نسبت کلی مصلحتیں بتا کر، جزئیات کی تفصیل سے انہوں نے احتراز فرمایا، اور کسی قطعی فیصلہ کا مسلمانوں کو پابند نہیں کیا، پہننے اوڑھنے کے متعلق صرف تین باتیں فرمائیں، پہلی یہ کہ وہ لباس اور طرزِ لباس نہ اختیار کیا جائے جس سے سترِ عورت نہ ہو۔ دوسری یہ کہ مرد وہ لباس اختیار نہ کریں جو عورتوں کے لیے زیبا ہے، نہ عورتیں وہ لباس اختیار کریں جو مردوں کے لیے مناسب ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ وہ لباس پسندیدہ نہیں جس سے غرور و نخوت نمایاں ہو۔ کھانے پینے میں چند حرام چیزوں کے سوا کسی کی ممانعت نہیں، نظم و نسق اور نظامِ حکومت و سلطنت میں چند کلی اصول تعلیم فرمائے، شہنشاہانہ اور جابرانہ حکومت نہ ہو، لوگوں میں مساوات ہو اور اہم امور میں اہلِ حل و عقد کا باہمی مشورہ ہو، وعلی ہذا القیاس۔

الغرض یہی وہ امور ہیں جن میں زمانہ اور تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ تغیر و انقلاب ہوتا ہے۔ اس لیے ان کو ہمیشہ کے لیے محدود کر دینا مصلحتِ الٰہی کے خلاف تھا۔

ملکۂ نبوت یا عقلِ نبوّت کا شرعی ثبوت

گزشتہ مباحث سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ نبی میں علم و فہم کے تین درجے ہیں وحی، ملکۂ نبوت اور عام عقلِ بشری، ان میں سے اول و آخر کے ثبوت کے لیے اب کسی استدلال کی ضرورت نہیں کہ اول تو یہ مسلمات سے ہیں

اور دوسرے اوپر کی تشریحات میں مستقل طور سے ان پر بحثیں ہو چکی ہیں لیکن اب تک ہم نے دوسری چیز یعنی ملکۂ نبوت کے لیے کوئی شرعی دلیل پیش نہیں کی ہے اس سلسلہ میں سب سے پہلی بات یہ کہنی ہے کہ جن علما نے اس کی حقیقت ظاہر کی ہے انہوں نے اپنے اپنے مذاق کے مطابق اس کے لیے الگ الگ اصطلاحیں قائم کی ہیں۔ مگر مفہوم و معنی کے لحاظ سے وہ دراصل ایک ہیں' سلف صالحین میں سے بعض نے اس کو القاء فی الروع (دل میں ڈالنا) نبی کی حکمتِ قلبیہ' توفیقِ ازلی اور قوتِ تبیین سے تعبیر کیا ہے'(۱) امام غزالی و امام رازی اور دوسرے متکلمین نے اس کو ملکۂ نبوت سے ادا کیا ہے' شاہ ولی اللہ صاحب اور علمائے اصول نے اس کو ''پیغمبرانہ قوتِ اجتہاد'' کہا ہے اور صوفیہ کی عام پسند اصطلاح میں اس کو علم لدنی کہا جاتا ہے' مگر ان سب کے معنی تقریباً ایک ہی ہیں یعنی نبی کے اندر کی وہ پیغمبرانہ عقلی قوت جو بشری عقل سے فوق ہے اور جس کے ذریعہ سے وہ وحی کی تشریح' اسرارِ شریعت کا بیان اور دقائقِ حکمت کی اپنی زبان سے توضیح کرتا ہے۔

انبیائے کرام کے ان ربانی انعامات کی فہرست پڑھیے' جن کا تذکرہ قرآن نے جابجا کیا ہے' تو وحی کی مخصوص نعمت کے بعد فہرست انعامات میں جو چیز نظر آئے گی وہ ''علمِ نبوت'' ہے جس کو کہیں ذکر (یادداشت) کہیں حکم (حق و باطل میں تمیز کا ملکہ) کہیں حکمت (دانائی) کہیں شرحِ صدر (سینہ کا کھول دینا) کہیں تفہیم (سوجھ بوجھ دینا) کہیں تعلیم (سکھا دینا) کہیں اراءت (دکھا دینا' سوجھا دینا) کہا گیا ہے ان سب مختلف الفاظ کا مفہوم وحی سے نیچے اور عقلِ بشری سے اوپر عقلِ نبوی کے سوا اور کیا ہے' ان سے مراد وحی تو اس لیے نہیں کہ ان کا ذکر وحی سے الگ ہوتا ہے اور عقلِ بشری اس لیے نہیں کہ عقلِ بشری خاص نبی پر کوئی انعام نہیں کہ یہ نعمت تو ہر انسان کو کچھ نہ کچھ ملی ہے۔ اس بنا پر اس سے مراد عقلِ نبوی اور حکمتِ نبوی کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔

حکمت

انبیاء علیہم السلام کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو نعمتیں عطا ہوتی ہیں ان میں ایک خاص نعمت کا ذکر قرآن پاک میں بار بار آتا ہے اور وہ حکمت ہے۔ آلِ ابراہیمؑ پر اللہ تعالیٰ نے جو احسانات کیے ان کا ذکر وہ ان الفاظ میں فرماتا ہے:

(۱) ﴿فَقَدْ اٰتَيْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ اٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا﴾ (نساء:۵۴)

''تو بے شبہ ہم نے ابراہیم کی اولاد کو کتاب اور حکمت دی اور ان کو بڑی سلطنت بخشی۔''

حضرت لقمانؑ کی نسبت ہے:

(۲) ﴿وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ﴾ (لقمٰن:۱۲)

''اور یقیناً ہم نے لقمان کو حکمت دی۔''

---

(۱) یہ تمام الفاظ امام شافعی کی کتاب الرسالہ میں مذکور ہیں۔

حضرت داؤدؑ کی شان میں ہے:

(۳) ﴿وَ شَدَدْنَا مُلْكَهٗ وَ اٰتَيْنٰهُ الْحِكْمَةَ وَ فَصْلَ الْخِطَابِ﴾ (صٓ:۲۰)

''اور ہم نے داؤد کی سلطنت مضبوط کی اور اس کو حکمت اور قولِ فیصل عطا کیا۔''

(۴) ﴿وَ قَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ وَ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَ الْحِكْمَةَ وَ عَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ﴾ (البقرہ:۲۵۱)

''اور داؤد نے جالوت کو مارا اور خدا نے داؤد کو سلطنت اور حکمت بخشی اور جو چاہتا ہے اس میں سے سکھایا۔''

حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں:

(۵) ﴿قَدْ جِئْتُكُمْ بِالْحِكْمَةِ وَ لِاُبَيِّنَ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ تَخْتَلِفُوْنَ فِيْهِ﴾ (زخرف:۶۳)

''میں تمہارے پاس حکمت لے کر آیا ہوں تا کہ جن باتوں میں تم باہم اختلاف رکھتے ہو کچھ باتیں ان میں سے کھول دوں۔''

خود اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر اپنا احسان جتاتا ہے تو فرمایا ہے:

(۶) ﴿وَ اِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ التَّوْرٰىةَ وَ الْاِنْجِيْلَ﴾ (مائدہ:۱۱۰)

''اور (یاد کر) جب میں نے تجھ کو کتاب اور حکمت اور توراۃ اور انجیل کی تعلیم دی۔''

عام انبیا کے متعلق ہے:

(۷) ﴿وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَاۤ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّ حِكْمَةٍ﴾ (اٰل عمران:۸۱)

''اور جب اللہ نے نبیوں سے وعدہ لیا کہ جو میں تم کو کوئی کتاب اور حکمت دوں۔''

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے آنحضرت ﷺ کے ظہور کی یہ دعا مانگی تھی:

(۸) ﴿رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ يُزَكِّيْهِمْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ﴾ (بقرہ:۱۲۹)

''ہمارے پروردگار! اور ان میں انہی میں سے ایک رسول بھیج جو ان کو تیری آیتیں سنائے اور کتاب اور حکمت سکھائے اور ان کو سنوارے بے شک تو غالب اور حکمت والا ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ دعا قبول فرمائی:

(۹) ﴿كَمَاۤ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَ يُزَكِّيْكُمْ وَ يُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ يُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ﴾ (بقرہ:۱۵۱)

''جس طرح ہم نے تم میں تم ہی میں سے ایک رسول بھیجا جو تم کو ہماری آیتیں سناتا اور تم کو سنوارتا ہے اور تم کو کتاب اور حکمت سکھاتا ہے اور وہ سکھاتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے۔''

اس دعائے ابراہیمی کے مطابق آنحضرت ﷺ کے ظہور کا احسان اللہ تعالیٰ نے سورۂ آل عمران میں ہم پر جتایا ہے:

(۱۰) ﴿لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَ يُزَكِّيْهِمْ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَ الْحِكْمَةَ وَ اِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنَ﴾ (آل عمران:۱۶۴)

''یقیناً اللہ نے ایمان والوں پر احسان کیا کہ ان میں انہی میں سے ایک رسول بھیجا جو ان کو اس کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور ان کو سنوارتا ہے اور ان کو کتاب اور حکمت سکھاتا ہے' اگرچہ وہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔''

اللہ تعالیٰ اپنا یہی احسان انہی الفاظ میں سورۂ جمعہ میں دہراتا ہے:

(۱۱) ﴿هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَ يُزَكِّيْهِمْ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ اِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنَ﴾ (جمعہ:۲)

''وہی اللہ جس نے ان پڑھ لوگوں میں انہی میں سے ایک رسول بھیجا جو ان کو اس کی آیتیں سناتا ہے اور ان کو پاک وصاف کرتا ہے اور کتاب وحکمت سکھاتا ہے اور وہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔''

خود آنحضرت ﷺ کو خطاب کر کے اپنا یہ احسان ان پر ظاہر فرمایا ہے:

(۱۲) ﴿وَ لَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَ رَحْمَتُهٗ لَهَمَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ يُّضِلُّوْكَ وَ مَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَ مَا يَضُرُّوْنَكَ مِنْ شَيْءٍ وَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ عَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ وَ كَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا﴾ (نساء:۱۱۳)

''اور اگر خدا کا فضل وکرم تجھ پر نہ ہوتا تو ان میں سے ایک جماعت ارادہ کر چکی تھی کہ وہ تجھے گمراہ کر دے اور وہ گمراہ نہیں کرتے لیکن اپنے آپ کو اور تجھے نقصان نہیں پہنچا سکتے خدا نے تجھ پر کتاب اور حکمت اتاری اور تجھ کو وہ سکھایا جو تو نہیں جانتا تھا اور تجھ پر خدا کا بڑا فضل تھا۔''

آنحضرت ﷺ سے خطاب ہے:

(۱۳) ﴿ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰۤى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ﴾ (بنی اسرائیل:۳۹)

''یہ وہ ہے جو خدا نے حکمت کی باتوں میں سے تم پر وحی کی ہے۔''

عام مسلمانوں سے ارشاد ہے:

(۱۴) ﴿وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَ مَآ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَ الْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهٖ﴾ (بقرہ:۲۳۱)

''اور اللہ کا جو احسان تم پر ہے اور اس نے تم پر جو کتاب اور حکمت اتاری ہے ان کو یاد کرو' خدا تم کو اس سے سمجھاتا

ہے۔''

خاص طور پر ازواجِ مطہرات کو خطاب کیا ہے:

(۱۵) ﴿وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِيْ بُيُوْتِكُنَّ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ وَ الْحِكْمَةِ﴾ (الاحزاب:۳۴)

''اور تمہارے گھروں میں اللہ کی جو آیتیں اور حکمت کی جو باتیں سنائی جاتی ہیں' ان کو یاد رکھو۔''

یہ نعمت حسبِ استعداد عام مسلمانوں کو بھی ملا کرتی ہے:

(۱۶) ﴿يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ وَ مَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا﴾ (البقرۃ: ۲۶۹)

''اور خدا جس کو چاہتا ہے حکمت بخشتا ہے اور جس کو حکمت بخشی گئی اس کو بڑی دولت (بھلائی) دی گئی۔''

اسی کے ذریعہ تبلیغ و دعوت کا حکم بھی ہوتا ہے:

(۱۷) ﴿اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَ جَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ﴾ (النحل:۱۲۵)

''اپنے پروردگار کے راستہ کی طرف تو حکمت اور اچھی نصیحت کے ذریعہ سے بلا اور ان سے عمدہ طریقہ سے مناظرہ کرو۔''

ایک جگہ قیامت اور عبرت کے واقعات پر حکمت کا اطلاق ہوا ہے:

(۱۸) ﴿وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنَ الْاَنْۢبَآءِ مَا فِيْهِ مُزْدَجَرٌ ۝ حِكْمَةٌۢ بَالِغَةٌ فَمَا تُغْنِ النُّذُرُ ۝﴾ (القمر:۴۔۵)

''اور ان کو اتنے احوال جتنے میں ڈانٹ ہو سکتی ہے پہنچ چکے ہیں مؤثر حکمت تو ان کو ڈر سنانے والے فائدہ نہیں پہنچا سکتے۔''

اوپر کی سطروں میں وہ تمام آیتیں لکھ دی گئی ہیں جن میں حکمت کا لفظ آیا ہے' ان میں کہیں ''حکمت'' کا لفظ تنہا آیا ہے۔ اور کہیں ''کتاب'' کے بعد آیا ہے' کتاب کے دو معنی قرآن میں ہیں۔ ایک ''صحیفۂ ربانی'' اور یہ اکثر آیا ہے اور دوسرے ''نوشتۂ الٰہی'' اور علمِ الٰہی جیسے ﴿لَوْ لَا كِتَابٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ﴾ (اگر خدا کا نوشتہ یا علم پہلے نہ ہوتا) مذکورہ بالا آیتوں میں کتاب سے تو بے شبہ آسمانی کتاب اور صحیفۂ ربانی یا یوں کہو کہ وحیِ کتابی مراد ہے جیسے توراۃ' قرآن وغیرہ لیکن حکمت کا مفہوم ان آیتوں میں کیا ہے۔

حکمت کے لغوی معنی ''دانائی کی بات اور کام'' کے ہیں' مگر یہاں اس سے کیا مقصود ہے اس تحقیق کے لیے ضرورت ہے کہ مستند اہلِ لغت اور ماہرینِ قرآن کے اقوال نقل کر کے تبصرہ کیا جائے۔ سب سے قدیم لغت نویس ابن درید المتوفی ۳۲۱ھ اپنی کتاب ''جمہرۃ اللغۃ'' میں حکمت کے حسب ذیل معنی لکھتا ہے:

فَكُلُّ كَلِمَةٌ وَ عَظَتْكَ اَوْ زَجَرَتْكَ اَوْ دَعَتْكَ اِلٰى مُكَرَّمَةٍ اَوْ نَهَتْكَ مِنْ قَبِيْحٍ فَهِيَ

حِکْمَۃُ وَ حُکْمُ (جلد۲ص۱۸۶حیدرآباد)

''ہر وہ بات جو تجھ کو سمجھائے یا تجھ کو تنبیہ کرے یا کسی اچھی خصلت کی طرف بلائے یا کسی بری چیز سے روکے وہ حکمت اور حکم ہے۔''

لغت کا امام جوہری اپنی صحاح اللغۃ میں لکھتا ہے:

اَلْحِکْمَۃُ مِنَ الْعِلْمِ وَ الْحَکِیْمُ اَلْعَالِمُ وَ صَاحِبُ الْحِکْمَۃِ وَ الْحَکِیْمُ اَلْمُتْقَنُ لِلْاُمُوْرِ.

(جلد۲ص۱۷۶مصر)

''حکمت یعنی علم، اور حکیم یعنی عالم اور حکمت والا اور حکیم کاموں کو خوبی سے کرنے والا۔''

عربی لغت کی مبسوط و مستند کتاب لسان العرب میں ہے:

وَ الْحِکْمَۃُ عِبَارَۃٌ عَنْ مَّعْرِفَۃِ اَفْضَلُ الْاَشْیَاءُ بِاَفْضَلِ الْعُلُوْمِ (ج۱۵ص۳مصر)

''اور حکمت بہترین چیز کو بہترین علم کے ذریعہ سے جاننے کو کہتے ہیں۔''

لغتِ قرآن کے مشہور امام راغب اصفہانی مفردات القرآن میں کہتے ہیں:

وَ الْحِکْمَۃُ اَصَابَۃُ الْحَقِّ بِالْعِلْمِ وَ الْعَقْلِ فَالْحِکْمَۃُ مِنَ اللّٰہِ تَعَالٰی مَعْرِفَۃِ الْاَشْیَآءِ وَ اِیْجَادِھَا عَلٰی غَایَۃِ الْاَحْکَامِ مِنَ الْاِنْسَانِ مَعْرِفَۃِ الْمَوْجُوْدَاتِ وَ فِعْلَ الْخَیْرَاتِ. (ص۱۲۶مصر)

''اور حکمت، علم اور عقل کے ذریعہ سے سچی اور صحیح بات کو پہنچنا ہے تو اللہ تعالیٰ کی حکمت چیزوں کا جاننا اور ان کو بکمال خوبی پیدا کرنا ہے اور انسان کی حکمت موجودات کو جاننا اور اچھی باتوں کا کرنا ہے۔''

یہ تو عربی لغت کے اماموں کی تصریحات تھیں، اب ان بزرگوں کے اقوال پر غور کرنا ہے جو زبان دانی کے ساتھ قرآن اور شریعت کے استدلالات اور محاوروں سے بھی کامل طور سے آگاہ تھے، ابن حبان اندلسی نے اپنی تفسیر بحر المحیط میں ان کے اکثر اقوال کو یکجا کر دیا ہے۔ (۱)

(۱) قَالَ مَالِکُ وَ اَبُوْ رَزِیْنَ اَلْحِکْمَۃُ اَلْفِقْہُ فِی الدِّیْنِ وَ الْفَھْمُ الَّذِیْ ھُوَ سَجِیَّۃٌ وَّ نُوْرٌ مِّنَ اللّٰہِ تَعَالٰی.

''امام مالک اور ابو رزین کا قول ہے، حکمت دین میں سمجھ اور اس فہم کو کہتے ہیں جو ایک فطری ملکہ اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک نور ہے۔''

(۲) وَ قَالَ مُجَاھِدُ: اَلْحُکْمُ فَھْمُ الْقُرْآنَ۔

''مجاہد کا قول ہے حکمت یعنی قرآن کا فہم۔''

---

(۱) زیر آیت ﴿وَ ابْعَثْ فِیْھِمْ رَسُوْلًا مِّنْھُمْ﴾ (الآیۃ) ج۱ص۳۹۳ مطبوعہ سعادت مصر۔

(۳) وَ قَالَ مُقَاتِلُ : اَلْعِلْمُ وَ الْعَمَلُ بِهٖ لَا يَكُوْنَ الرَّجُلُ حَكِيْمًا حَتّٰى يَجْمَعَهَا.

''مقاتل کا قول ہے' حکمت علم اور اس کے مطابق عمل کو کہتے ہیں' کسی شخص کو حکیم اس وقت تک نہیں کہا جاتا جب تک وہ علم اور عمل دونوں کا جامع نہ ہو۔''

(۴) وَقِيْلَ: اَلْحِكْمَةُ' اَلْقَضَآءُ.

بعضوں کا قول ہے: حکمت فیصلہ کرنا ہے۔

(۵) وَقِيْلَ: مَا لَا يَعْلَمُ اِلَّا مِنْ جِهَةِ الرَّسُوْلِ.

''کسی کا قول ہے۔ حکمت وہ ہے جو رسولوں کے سوا کسی اور ذریعہ سے معلوم نہ ہو سکے۔''

(۶) وَ قَالَ اَبُوْ جَعْفَرٍ مُحَمَّدُ بن يَعْقُوْبَ: كُلُّ صَوَابٍ مِّنَ الْقَوْلِ وَرَتْ فِعْلًا صَحِيْحًا فَهُوَ حِكْمَةٌ.

''ابو جعفر کا قول ہے۔ ہر وہ صحیح بات جو صحیح عمل پیدا کرے حکمت ہے۔''

(۷) وَ قِيْلَ وَضَعُ الْاَشْيَآءِ مَوَاضِعُهَا.

''کسی کا قول ہے چیزوں کو اپنی اپنی جگہ پر رکھنا حکمت ہے۔''

(۸) وَ قِيْلَ : كُلُّ قَوْلٌ وَ جَبَ فِعْلَهٗ.

''ایک اور شخص کا قول ہے۔ ہر وہ بات جس کا کرنا ضروری ہو' حکمت ہے۔''

امام ابن جریر طبری نے اپنی تفسیر میں حسب ذیل اقوال لکھے ہیں:

(۱) قَالَ (مَالِكُ) اَلْمَعْرِفَةِ بِالدِّيْنِ وَ الْفِقْهُ فِى الدِّيْنِ وَ الْاِتِّبَاعُ لَهٗ.

''مالک کا قول ہے:

دین کی معرفت اور دین میں سمجھ اور اس کی پیروی حکمت ہے۔''

(۲) قَالَ ابْنِ زَيْدٍ : اَلْحِكْمَةُ اَلدِّيْنِ الَّذِىْ لَا يَعْرِفُوْنَهٗ اِلَّا بِهٖ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُعَلِّمُهُمْ اِيَّاهَا قَالَ وَ الْحِكْمَةُ اَلْعَقْلُ فِى الدِّيْنِ وَ قَرَءَ وَ مَنْ يُّؤْتِ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِىَ خَيْرًا كَثِيْرًا وَ قَالَ بِعِيْسٰى وَ يُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ التَّوْرَاةَ وَ الْاِنْجِيْلَ وَ قَرَأَ ابْنُ زَيْدٍ وَ اتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاءَ الَّذِىْ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا قَالَ لَمْ يَنْتَفِعْ بِالْاٰيَاتِ حِيْنَ لَمْ تَكُنْ مَعَهَا حِكْمَةَ قَالَ وَ الْحِكْمَةُ شَىْءٌ يَّجْعَلَهُ اللّٰهُ فِى الْقَلْبِ نَوَّرُ لَهٗ بِهٖ.

''ابن زید کا قول ہے' حکمت دین کا وہ حصہ ہے جو صرف رسول سے معلوم ہوتا ہے وہی اس کو سکھاتا ہے نیز انہی کا قول ہے کہ حکمت دینی عقل کا نام ہے اور اس پر یہ آیت پڑھی کہ جس کو حکمت دی گئی اس کو بڑی دولت دی گئی اور خدا نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق کہا کہ خدا ان کو کتاب اور حکمت اور توراۃ اور انجیل سکھاتا ہے۔ ابن زید نے یہ آیت بھی پڑھی کہ ان کو اس کا حال سناؤ جس کو ہم نے اپنی آیتیں دیں

تو وہ ان سے الگ ہو گیا۔ یعنی ان آیتوں سے نفع نہیں اٹھایا کیونکہ ان کے ساتھ حکمت نہ تھی' انہی کا قول ہے کہ حکمت وہ چیز ہے جس کو اللہ اپنے بندہ کے قلب میں رکھتا ہے اور اس سے اس کو روشن کرتا ہے۔''

(۳) عَنْ قَتَادَةَ: وَالْحِكْمَةُ اَیُّ السُّنَّةُ.

''قتادہ سے مروی ہے' حکمت یعنی سنتِ نبوی۔''

آخر میں امام طبری اپنا فیصلہ سناتے ہیں:

(۴)قَالَ ابْنُ جَرِیْرَ الطَّبْرِیُّ: وَ الصَّوَابُ مِنَ الْقَوْلِ عِنْدَنَا فِی الْحِكْمَةِ اَنَّهَا الْعِلْمُ بِاَحْكَامِ اللّٰهِ الَّتِیْ لَا یُدْرِكُ عِلْمُهَا اِلَّا بِبَیَانِ الرَّسُوْلِ ﷺ وَ الْمَعْرِفَةِ بِهَا وَ مَا دَلَّ عَلَیْهِ ذٰلِكَ مِنْ نَظَائِرِهٖ وَ هُوَ عِنْدِیْ مَاْخُوْذٌ مِنَ الْحَكَمِ الَّذِیْ بِمَعْنَی الْفَصْلِ بَیْنَ الْحَقِّ وَ الْبَاطِلِ.

''ہمارے نزدیک صحیح بات یہ ہے کہ حکمت ان احکامِ الٰہی کے علم کا نام ہے جو صرف رسول کے بیان (تشریح) سے معلوم ہوتے ہیں اور ان کی اور جو ان کی مثالیں اور نظیریں ہیں' ان کی معرفت کو کہتے ہیں اور ''حکمت'' کا لفظ میرے نزدیک حکم سے ماخوذ ہے جس کے معنی حق و باطل میں تمیز کرنے کے ہیں۔''

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تصنیف کتاب الرسالہ میں قتادہ کے مسلک کو پسند کیا ہے' لکھتے ہیں:

(۵)وَ سَمِعْتُ مَنْ اَرْضٰی مِنْ اَهْلِ الْعِلْمِ بِالْقُرْاٰنِ یَقُوْلُ: اَلْحِكْمَةُ سُنَّةُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ. (ص۲۴)

''میں نے قرآن کے ان اہل علم سے جن کو پسند کرتا ہوں یہ سنا کہ حکمت آنحضرت ﷺ کی سنت کا نام ہے۔''

امام شافعی اس کتاب میں آگے چل کر بعضوں کا قول نقل کرتے ہیں:

۵۔ وَ سُنَّةُ الْحِكْمَةَ الَّتِیْ فِیْ رَوْعِهٖ عَنِ اللّٰهِ عَزَّ وَ جَلَّ. (ص۲۸)

''اور آپ کی سنت وہ حکمت ہے جو آپ کے دل میں خدا کی طرف سے ڈالی گئی۔''

ائمہ لغت اور علمائے قرآن کے ان تمام اقوال پر ایک غائر نظر ڈالو' تو معلوم ہو گا کہ یہ کل کے کل ایک ہی مفہوم کی مختلف تعبیریں اور ایک ہی حقیقت کی متعدد تفسیریں ہیں' حکمت عقل و فہم کی اس کامل ترین حقیقت کا نام ہے جس سے صحیح و غلط' صواب و خطا' حق و باطل اور خیر و شر کے درمیان تمیز و فیصلہ بذریعہ غور و فکر' دلیل و برہان اور تجربہ و استقراء کے نہیں بلکہ منکشفانہ طور سے ہو جاتا ہے اور اسی کے مطابق اس صاحبِ حکمت کا عمل بھی ہوتا ہے۔

ہر فن کے واقف کار دو قسم کے ہوتے ہیں' ایک وہ جو کسی فن کو باقاعدہ حاصل کرتے' اس کی مشق کرتے اور اس میں مہارت و کمال بہم پہنچاتے ہیں۔ دوسرے وہ جو اس فن کی فطری استعداد اور قابلیت رکھتے ہیں اور تجربہ و دلیل کے بغیر خود اپنی فطری صلاحیت' صحیح وجدان اور سلیم ذوق سے اس فن کی کسی شے کو دیکھنے کے ساتھ اس کے

متعلق بچی تلی بات دیتے ہیں اور حرف حرف صحیح دیتے ہیں' اسی کا نام آپ صحتِ وجدان اور سلامتِ ذوق رکھتے ہیں' شاعری' انشاء پردازی اور دوسرے فنون لطیفہ میں اس کی مثالیں بکثرت دیکھی اور سنی جاتی ہیں۔ اسی طرح بعض لوگوں میں اشیا کے حق و باطل اور افعال کے خیر و شر کی تمیز کا صحیح وجدان اور صحیح ذوق ہوتا ہے' وہ ان امور کے دقیق سے دقیق مسئلہ کے متعلق اپنے ربانی ذوق و وجدان سے ایسی صحیح رائے دیتے ہیں جو دوسرے لوگ وسیع مطالعہ اور غور و فکر کے بعد بھی نہیں دے سکتے' یہی وہ معرفت اور نورِ الٰہی ہے جو جدوجہد اور سعی و محنت سے نہیں بلکہ عطاو بخشش سے حاصل ہوتی ہے اور اسی کا نام ''حکمت'' ہے۔

دوسری زبانی استعدادوں اور فطری بخششوں کی طرح حکمت کا عطیہ بھی سب کو یکساں نہیں ملتا بلکہ حسبِ استعداد اور معمولی حکمت سے لے کر اعلیٰ ترین اور کامل ترین حکمت تک لوگوں کو عطا ہوتی ہے۔ اس کے مختلف درجے اور مرتبے عام انسانوں کو مل سکتے ہیں اور ملتے ہیں' لیکن اس کا اعلیٰ ترین اور کامل ترین درجہ اور مرتبہ انبیاء علیہم السلام کو حاصل ہوتا ہے۔

مگر یہ نکتہ یاد رکھنا چاہیے کہ جس طرح اس ربانی عطیۂ آسمانی' فہم دینی عقل اور نورانی قوت پر ''حکمت'' کا اطلاق ہوتا ہے اسی طرح اس قوت (حکمت) کے آثار و نتائج اور اس کی تعلیمات پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے' چنانچہ دوسری آیت جس میں حضرت لقمانؑ کو حکمت دیے جانے کا بیان ہے' اس کے بعد اس حکمتِ لقمانی کی حسبِ ذیل تعلیمات کا ذکر بھی کیا گیا ہے' اللہ کا شکر ادا کرنا' شرک کی ممانعت' والدین کی خدمت' اچھوں کی پیروی' خدا کا ہمہ گیر علم' نماز کا حکم' صبر' فخر و غرور کی ممانعت' میانہ روی' آہستہ بولنا' اسی طرح تیرہویں آیت میں حکمتِ محمدی کی حسب ذیل تعلیمات کی تفصیل بھی کی گئی ہے۔ شرک کی ممانعت' والدین کے ساتھ احسان' قرابت داروں اور بیکسوں سے نیک سلوک' اسراف کی برائی' نرمی کی بات کرنا' میانہ روی' اولاد کے قتل کی مذمت' کسی کی جان نہ لینا' مقتول کا بدلہ لینا' یتیم کے ساتھ اچھا برتاؤ' عہد پورا کرنا' ناپ تول ٹھیک رکھنا۔ بے جانی چیز کی پیروی نہ کرنا' فخر و غرور کی مذمت' ان تمام باتوں کو بیان فرما کر اللہ کہتا ہے:

﴿ذٰلِکَ مِمَّآ اَوْحٰٓی اِلَیْکَ رَبُّکَ مِنَ الْحِکْمَةِ﴾ (بنی اسرائیل:۳۹)

''یہ ہیں حکمت کی وہ بعض باتیں جو خدا نے تجھ پر وحی کی ہیں۔''

حکمت کی ان بعض باتوں کی تفصیل سے اندازہ ہوتا ہے کہ حکمت کے مظاہر اور نتائج کس قسم کی باتیں ہوتی ہیں یہ عموماً وہی باتیں ہوتی ہیں جن کی عالمگیر صداقت اور سچائی کو خود فطرتِ انسانی اور حسِ اخلاقی تسلیم کرتی ہے' یہی سبب ہے کہ تیسری اور چوتھی آیت میں حکمت کا اطلاق زبور پر اور پانچویں اور چھٹی آیت میں انجیل پر ہوا ہے کہ ان میں اسی قسم کی دلآویز نصیحتوں اور عالمگیر صداقتوں کی تعلیم ہے اور خود قرآن پاک نے بھی اپنی صفت ''حکمت والا قرآن'' ظاہر کی ہے ﴿تِلْکَ اٰیٰتُ الْکِتَابِ الْحَکِیْمُ﴾ (لقمان: و یونس:۱) ﴿وَ الْقُرْاٰنِ الْحَکِیْمُ﴾ (یٰسٓ) ﴿و الذکر الحکیم﴾ ان آیتوں سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ ''حکمت'' کی بعض اہم تعلیموں کو وحیِ الٰہی

خود اپنے اندر کبھی شامل کر کے ان کو آبِ مقطر بنا دیتی ہے' یہ چیز انبیا کو کتابِ الٰہی کے ساتھ ساتھ عام طور پر ملتی ہے فرمایا:

﴿وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّ حِكْمَةٍ﴾ (آل عمران:۸۱)

''اور یاد کرو جب خدا نے پیغمبروں سے عہد لیا کہ البتہ جو میں تم کو کتاب اور حکمت دوں۔''

بہر حال یہ حکمت کی قوت انبیاء علیہم السلام کو بدرجۂ اتم حاصل تھی اور اسی کا نتیجہ تھا کہ ان کی ہر بات دانائی اور ان کا ہر کام دانش مندی پر مبنی ہوتا تھا اور چونکہ یہ قوت ان کو حاصل تھی' اس لیے اس کے آثار اور نتائج بھی اقوال و اعمال کی صورت میں ظاہر ہوئے جن کا نہ صرف اقرار و اعتراف ہے۔ ان پر عمل بھی نبوت کی تصدیق میں داخل ہوا۔ پندرہویں آیت میں ہے۔

﴿وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِيْ بُيُوْتِكُنَّ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ وَ الْحِكْمَةِ﴾ (احزاب:۳۴)

(''اے محمد رسول اللہ کی بیویو!) تمہارے گھروں میں خدا کی جو آیتیں اور حکمت کی باتیں سنائی جاتی ہیں' ان کو یاد رکھو۔''

محمد رسول اللہ ﷺ کی ازواجِ مطہرات کو آیاتِ الٰہی کے علاوہ کس حکمت کے یاد رکھنے کا حکم دیا گیا۔ ظاہر ہے کہ وہ خود محمد رسول اللہ ﷺ کی حکمت و دانائی کی باتیں تھیں' اب اگر وہ باتیں امور دین سے متعلق نہ ہوتیں تو ان کے لیے ان کا یاد رکھنا کیوں ضروری قرار دیا جاتا۔ اسی طرح آٹھویں' نویں' دسویں اور گیارہویں آیت میں آنحضرت ﷺ کی صفت میں ہے۔

﴿يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ﴾ (جمعہ:۲)

''وہ مسلمانوں کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔''

محمد رسول اللہ ﷺ کتاب کے بعد کس حکمت کی تعلیم دیتے تھے؟ ظاہر ہے کہ خود اپنی حکمت کی' تو جس حکمت کی تعلیم وہ دیتے تھے وہ خود ان کے اندر بھی تھی کہ جو چیز ان کے پاس نہ تھی دوسروں کو کیا بخش سکتے تھے اور جب یہ قوت آپ کے پاس تھی تو اس کے آثار و نتائج بھی اقوال و افعال کی صورت میں نمایاں ہوں گے۔ جن کی آپ تعلیم فرماتے تھے اور اپنے ان امور حکمت کی تعلیم سے آپؐ کا مقصد بھی یہی ہو سکتا تھا کہ مسلمان ان پر عمل کریں۔

پانچویں آیت میں ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں:

﴿قَدْ جِئْتُكُمْ بِالْحِكْمَةِ وَ لِاُبَيِّنَ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ تَخْتَلِفُوْنَ فِيْهِ﴾ (الزخرف:۶۳)

''میں تمہارے پاس حکمت لے کر آیا ہوں تا کہ جن باتوں میں تم باہم اختلاف رکھتے ہو کچھ باتیں ان میں سے کھول دوں۔''

اس سے معلوم ہوا کہ حکمت کا ایک فریضہ تبیین بھی ہے یعنی کسی مجمل' ذو معنین اور مختلف فیہ مسئلہ کی تشریح و

تفصیل جس سے وہ اجمال اور اختلاف جاتا رہے اور اصل مقصود کی تشریح ہو جائے۔ چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے تورات کے بعض احکام کی جن میں یہود مختلف رائے تھے، تفصیل فرمائی اور ان کی غلطی دور کی۔

بارہویں آیت میں ہے:

﴿وَ لَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَ رَحْمَتُهٗ لَهَمَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ يُّضِلُّوْكَ وَ مَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَ مَا يَضُرُّوْنَكَ مِنْ شَيْءٍ وَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ عَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ وَ كَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا﴾ (نساء:۱۱۳)

''اگر خدا کا فضل و کرم تجھ پر نہ ہوتا تو ان میں سے ایک گروہ نے چاہا تھا کہ تجھ کو گمراہ کر لے اور وہ گمراہ نہیں کرتے لیکن اپنے آپ کو اور تجھے ذرا سا بھی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ اللہ نے تجھ پر کتاب اور حکمت اتاری اور تجھ کو سکھایا جو تو نہیں جانتا تھا۔ اور اللہ کا فضل تجھ پر بڑا ہے۔''

ان آیتوں میں بیان ہے کہ منافقین کا ایک گروہ آپ کو غلط رائے دے کر بہکانا چاہتا تھا مگر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ان کی یہ چال کارگر نہ ہوئی اور وہ تجھ کو بہکا نہ سکے، اس کی وجہ یہ تھی کہ اللہ کا تجھ پر فضل و کرم ہے اور وہ فضل و کرم یہ ہے کہ اس نے تجھ پر کتاب اور حکمت اتاری اور تجھے وہ علم بخشا جو پہلے نہ تھا، اس سے ظاہر ہوا کہ گمراہی سے آپ کی یہ حفاظت، خطا سے یہ عصمت اور علم کی یہ بخشش آپ کو کتاب اور حکمت دونوں کے ملنے کے سبب سے حاصل ہوئی ہے۔ الغرض اس حفاظت و عصمت کے حصول میں کتابِ الٰہی کے ساتھ، حکمتِ ربانی کے انعام کو بھی دخلِ کامل ہے۔

یہ تو وہ نبوی حکمت تھی جس کا سرچشمہ صرف سینۂ نبوت تھا۔ لیکن یہ فیض حسبِ استعداد پیغمبر کی اتباع میں دوسروں کو بھی ملتا ہے جس کا یہ اثر ہوتا ہے کہ وہ سچی اور صحیح بات کو بہت آسانی سے سمجھ لیتے، قبول کر لیتے اور اس پر عمل کرتے ہیں۔

تبلیغِ اسلام کے تین ذریعوں حکمت، موعظت اور خوش خلقی سے مناظرہ کرنے میں سب سے اول حکمت کو جگہ دی گئی ہے:

﴿اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَ جَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ﴾ (النحل:۱۲۵)

''تو اپنے رب کے راستہ کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ دعوت دے اور ان سے مناظرہ بطریقِ احسن کرے۔''

سچی، صحیح اور صاف بات دل تک پہنچ جاتی اور بہت جلد اپنا اثر دکھاتی ہے، فرمایا:

﴿حِكْمَةٌۢ بَالِغَةٌ﴾ (قمر:۵)

''دل کو پہنچ جانے والی حکمت۔''

یہ حکمت ہر نیکی کی جڑ اور ہر بھلائی کی اصل ہے۔ پھر اس سے بڑھ کر دنیا میں اور کیا دولت ہو سکتی ہے اس لیے ارشاد ہوا۔

﴿وَ مَنْ یُّؤْتَ الْحِکْمَةَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا کَثِیْرًا﴾ (بقرہ:۲۶۹)

''جس کو حکمت دی گئی اس کو بہت نیکی (دولت) دی گئی۔''

اس سلسلہ میں دو مشہور اور مستند حدیثوں کا حوالہ بھی مناسب ہے جس سے حکمت کی حقیقت واضح ہو گی اور کم از کم قرنِ اول میں اس لفظ کا مفہوم ظاہر ہو گا۔ آنحضرت ﷺ نے وفد کے ایک خطیب کا بیان سن کر فرمایا:

((اِنَّ مِنَ الشِّعْرِ الْحِکْمَةَ اِنَّ مِنَ الْبَیَانِ لَسِحْرًا))

''بعض شعر حکمت ہوتے ہیں اور بعض تقریریں جادو ہوتی ہیں۔''

ایک حدیث میں بعض اشعار کو حکمت اور بعض تقریروں کو جادو کہا گیا ہے اس تقابل سے ظاہر ہے کہ حکمت کا عربی مفہوم اس کے اردو مفہوم سے بلند تر ہے لیکن سحر و جادو کے مافوق انسانی تصور کی طرح ''حکمت'' کے عربی مفہوم میں کوئی مافوق بشری تخیل ضرور ہے۔ اسی سے سمجھ میں آ سکتا ہے کہ عربی میں حکمت کے معنی عقل و فہم وغیرہ کے معمولی الفاظ سے کوئی بلند اور غیر معمولی حقیقت ہے اور اردو میں اس حقیقت کو ''حکمت'' کے ساتھ لفظ ''الہامی'' بڑھا کر ادا کیا جا سکتا ہے۔ یعنی ''الہامی حکمت''۔

حضرت عبداللہؓ بن مسعود سے روایت ہے کہ ایک موقع پر آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا' رشک و حسد اگر جائز ہے تو صرف دو شخصوں پر' ایک اس پر جس کو مال کی دولت ملی تو وہ اس کو صحیح مصرف میں لٹاتا ہے اور دوسرے ﴿رَجُلٌ اٰتَاهُ اللّٰهُ الْحِکْمَةَ فَهُوَ یَقْضِیْ بِهَا وَ یُعَلِّمُهَا﴾ (صحیح بخاری کتاب العلم) اس شخص پر جس کو حکمت ملی ہے' تو وہ اس کے ذریعہ سے فیصلہ کرتا ہے اور دوسروں کو سکھاتا ہے' اور اس میں معلم ہونے کی شان پیدا ہوتی ہے' جب عام انسان کا یہ درجہ ہے تو انبیاء علیہم السلام کو یہ دولت کس بہتات سے ملی ہو گی اور وہ یقیناً آنحضرت ﷺ کے حصہ میں بھی آئی۔ اب اس حصولِ دولت یعنی عطائے حکمت کا نتیجہ بھی آپ سے ظاہر ہونا چاہیے اور وہ فیصلہ اور تعلیم ہے' آپ کے یہ ملہمانہ فیصلے اور حکیمانہ تعلیمات تمام تر وحیِ ربانی کی عملی اور زبانی شرح اور بیان ہیں۔

کتاب و حکمت کی تعلیم

اوپر کی چار آیتوں ۸'۹'۱۰'۱۱ میں خفیف سے تغیر کے ساتھ حسب ذیل آیت ہے:

﴿یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَ یُزَکِّیْهِمْ وَ یُعَلِّمُهُمُ الْکِتَابَ وَ الْحِکْمَةَ﴾ (جمعہ:۲)

''وہ رسول ان (ان پڑھوں) کو خدا کی آیتیں سناتا اور ان کو سنوارتا اور ان کو کتاب اور حکمت سکھاتا ہے۔''

ان آیتوں میں آنحضرت ﷺ کے تین کاموں کا ذکر ہے۔

(۱) خدا کی آیتوں کو پڑھنا اور دوسروں کو سنانا۔

(۲) ان کو شرک اور بداخلاقی کی نجاستوں سے پاک وصاف کرنا اور سنوارنا۔

(۳) ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دینا۔

سوال یہ ہے کہ پہلی اور تیسری آیتیں ایک ہی معنی رکھتی ہیں یا دو۔ اگر ایک معنی رکھتی ہیں تو اس بے سود تکرار کا فائدہ کیا کیوں نہ دوسری جگہ یَتْلُوْا (یعنی تلاوت کرتا ہے) ہی کا لفظ رکھ دیا گیا اور اگر دو الگ الگ معنی رکھتی ہیں جیسا کہ ہر صاحب نظر سمجھ سکتا ہے تو ان دونوں معنوں میں کچھ نہ کچھ فرق ضرور ہوگا۔ اگر رسول کا فرض محض وحی کی زبان سے سنی ہوئی آیتیں پڑھ کر دوسروں کو سنا دینا ہے اور اسی پر اس کی تبلیغ کا فریضہ ختم ہو جاتا ہے' تو اس کا تیسرا فرض الفاظ کی تلاوت سے آگے بڑھ کر کتاب اور حکمت کے سبق کی تعلیم کیونکر قرار دیا جا سکتا ہے۔ بالکل ظاہر ہے کہ تعلیم کا مفہوم تلاوت سے بہت کچھ زیادہ ہے' خصوصاً جب کہ تعلیم کا لفظ تلاوت کے بعد آیا ہے' وحی کے الفاظ سنا دینے سے تلاوت کا فرض ادا ہو جاتا ہے مگر تعلیم کا فرض ہنوز باقی رہتا ہے۔ کتاب کی تعلیم کے معنی تلاوت کی طرح کتاب کے الفاظ سنا دینا اور پڑھا دینا یا دوسروں کو یاد کرا دینا نہیں بلکہ الفاظِ قرانی کی تلاوت کے بعد جو آپ کا پہلا کام تھا' اس کے مشکل مطالب کو حل کرنے' مجمل معنی کو سمجھانے اور اپنی زبان اور عمل سے ان کی شرح و تفصیل کر دینے کا نام کتاب و حکمت کی تعلیم ہے اور یہ آپ کا دوسرا یا تیسرا فریضہ تھا اور یہی وہ تعلیم تھی جس کا ان آیتوں میں بار بار ذکر ہے۔ اب جب ان مطالب و معانی کی شرح و تفسیر بھی آپ کے فرائضِ نبوت میں داخل تھی تو اس پیغمبرانہ شرح و تفصیل کی حیثیت بھی دینی ہوگی' اور اس کی تعمیل بھی امت کے لیے ضروری ہوگی' آپ کی اسی زبانی و عملی شرح و تفصیل کو صحابہؓ اور تابعین نے اپنی روایت و عمل کے ذریعہ سے محفوظ رکھا اور وہ ''احادیث و سنن'' کے نام سے موسوم ہے۔

اس تفصیل کے بعد ''حکمت'' کے ان معنوں پر ایک نظر دوبارہ ڈال لیجیے جو ائمہ لغت اور علمائے قرآن نے بیان کیے ہیں تو آپ کو یقین آ جائے گا کہ وہ کل ایک ہی حقیقت کی مختلف تعبیریں اور ایک ہی معنی کی متعدد تفسیریں ہیں' آنحضرت ﷺ کے اقوال و افعال جن کے اصطلاحی نام احادیث و سنن ہیں' کتابِ الٰہی کی عملی و زبانی تشریحات ہیں' کتابِ الٰہی' وحیِ ربانی کا نتیجہ ہے اور احادیث و سنن سینۂ نبوی کی ملہمانہ حکمت کا' اس مقام پر امام شافعی کی یہ تحقیق پیش نظر رہے:

((وَ سُنَّتَهُ اَلْحِكْمَةُ الَّتِیْ اَلْقٰی فِی رَوْعِهٖ عَنِ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ)) (کتاب الرسالۃ مصر ص ۲۷)

''اور آپؐ کی سنت وہ حکمت ہے جو آپ کے قلب میں خدا کی طرف سے ڈالی گئی۔''

اور اسی مفہوم کو مجاہد اس طرح ادا کرتے ہیں کہ اَلْحِكْمَةُ فَهْمُ الْقُرْاٰنِ۔ ''حکمت فہم قرآن کا نام ہے۔'' دوسری عبارت میں یوں کہو کہ قرآن کے معانی و مطالب کی تشریح حکمت ہے اور اس تشریح کا نام جو رسول کے قول و عمل سے ادا ہوئی' سنت ہے اور اس معنی کو امام مالک اور ابورزین اور ابن زید وغیرہ دوسری صدی کے علمائے قرآن

ان عبارتوں میں ادا کرتے ہیں کہ حکمت' معرفتِ دین' فقہ دین اور اس علمِ دین کو کہتے ہیں' جس کو رسول نے بیان کیا اور حکمت اس نور کا نام بھی ہے جو اللہ تعالیٰ کسی قلب میں پیدا کر کے اس کو منور کر دیتا ہے۔

خلاصۂ بحث یہ ہے کہ اصل حکمتِ نبوی وہ نورِ نبوت اور الٰہامی معرفت ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ ﷺ کے قلب وسینہ میں ودیعت کیا تھا اور چونکہ آپ کے سنن واقوال آپؐ کی اسی ودیعت شدہ حکمت نبوی کی پیدا وار اور آثار ونتائج ہیں اس لیے ان پر بھی حکمت کا اطلاق جائز ہے' اس تفصیل کے بعد ظاہر ہوگا کہ بعض اماموں اور عالموں نے حکمت کی تشریح میں اصل معنی کی طرف توجہ کی ہے اور بعض نے ثانوی معنی کو بیان کیا ہے اور دونوں حق پر ہیں۔

علم

علم کے لغوی معنی جاننے کے ہیں مگر ہر فن کے تعلق سے جاننے کی نوعیت اور معلومات کی حیثیت مختلف ہوگی' انبیا کے تعلق سے جب اس کا استعمال ہوگا تو اس سے طبعاً خدا کی توحید' ذات وصفات' دین وشریعت کے احکام اور اخلاقی تعلیمات مراد ہوں گی۔ حضرت ابراہیمؑ توحید پر استدلال کر کے اپنے باپ سے فرماتے ہیں:

﴿یٰٓاَبَتِ اِنِّیْ قَدْ جَآءَنِیْ مِنَ الْعِلْمِ مَالَمْ یَاْتِکَ﴾ (مریم:۴۳)

''اے میرے باپ! میرے پاس علم کا وہ حصہ آیا ہے جو تیرے پاس نہیں آیا۔''

حضرت خضرؑ کے متعلق ہے:

﴿وَ عَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا﴾ (کہف:۶۵)

''اور ہم نے اپنے پاس سے اس کو علم سکھایا۔''

خدا کے پاس سے تو ہر چیز ہے پھر ''اپنے پاس سے علم سکھانے'' کا مفہوم کیا ہے؟ ہر وہ شے جو انسان کی ذاتی محنت' کوشش اور جدوجہد وغیرہ معمولی ذرائع کے بغیر حاصل ہوتی ہے وہ من جانب اللہ کہی جاتی ہے' اسی طرح خدا کے پاس سے علم عطا ہونے کے معنی اس علم کے ملنے کے ہیں' جو انسان کے طبعی ذرائع' علم واستدلال اور تلاش و تحقیق کے بغیر خود بخود عطا ہو۔ یہی علمِ خداداد ہے اور اسی لیے صوفیا کی اصطلاح میں اس کو علمِ لدنی (پاس والا علم) کہتے ہیں۔

حضرت داؤد اور سلیمان علیہما السلام کی نسبت ہے۔

﴿وَ لَقَدْ اٰتَیْنَا دَاوٗدَ وَ سُلَیْمٰنَ عِلْمًا﴾ (نمل:۱۵)

''اور بے شبہ ہم نے داؤد اور سلیمان کو علم دیا۔''

حضرت یوسفؑ کے آغازِ نبوت کے موقع پر ہے:

﴿وَ کَذٰلِکَ یَجْتَبِیْکَ رَبُّکَ وَ یُعَلِّمُکَ مِنْ تَاْوِیْلِ الْاَحَادِیْثِ وَ یُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَیْکَ﴾

(یوسف:٦)

''اور اسی طرح تیرا پروردگار تجھ کو نوازے گا اور تجھ کو باتوں کی حقیقت رسی (تاویل) سکھائے گا اور تجھ پر اپنا انعام پورا کرے گا۔''

ان آیتوں میں اس علم کا ذکر نہیں جس کا منشا وحیِ موقّت ہے' کیونکہ ان میں سیاقِ کلام سے علم کے یک بارگی دیے جانے کا ذکر ہے جو وحی موقّت کی شان نہیں' خصوصاً آخری آیت میں تو تاویلِ احادیث کا علم بیک دفعہ دیے جانے کی تصریح ہے۔ اسی لیے حضرت یوسفؑ ایک خواب کی تعبیر بیان کر کے دوسرے موقع پر کہتے ہیں:

﴿ذٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِیْ رَبِّیْ﴾ (یوسف:۳۷)

''یہ وہ ہے جو میرے پروردگار نے مجھے سکھایا ہے۔''

یہ کہیں بیان نہیں کیا گیا ہے کہ خواب کی تعبیر بتلاتے وقت ان پر وحی آ کر حقیقت سے ان کو مطلع کرتی تھی بلکہ خود ان کے اندر یہ علمی قوت ہمیشہ کے لیے ودیعت کر دی گئی تھی' اسی قسم کا وہ علم ہے جس کے نسبت سے بعض انبیا کو بچپن ہی میں عَلِیْمٌ (جاننے والے) کا خطاب ملا۔

﴿وَ بَشَّرُوْهُ بِغُلٰمٍ عَلِیْمٍ﴾ (الذّٰریٰت:۲۸)

''اور فرشتوں نے اس کو ایک بڑے صاحب علم فرزند کی خوش خبری دی۔''

﴿اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمٍ عَلِیْمٍ﴾ (الحجر:۵۳)

''ہم تجھے ایک بڑے صاحبِ علم فرزند کی خوش خبری دیتے ہیں۔''

یہاں لفظ علیم اختیار کیا گیا ہے' عالم نہیں' اور یہ لفظ عالم سے زیادہ علم پر دلالت کرتا ہے' ان آیتوں سے ظاہر ہوا کہ وحیِ موقّت جو گاہ گاہ آتی ہے' اس کے علاوہ علم کا ایک دائمی عطیہ بھی نبی کی شان ہے۔

علم و حکم

بہت سے انبیا کے متعلق علم کے ساتھ حکم کا عطا ہونا بھی بیان ہوا ہے' حکم کے معنی لغت میں فیصلہ اور حق و باطل میں تمیز کرنے کے ہیں جس کا ترجمہ اردو میں سمجھ اور بوجھ کا نتیجہ (یعنی فیصلہ) کر سکتے ہیں' امام راغب اصفہانی مفردات القرآن میں لکھتے ہیں:

وَ الْحُكْمُ بِالشَّیْءِ اَنْ تَقْضِیَ بِالشَّیْءِ بِاَنَّهٗ كَذَا اَوْلَیْسَ كَذَا سَوَآءٌ اَلْزَمْتَ ذٰلِكَ غَیْرَهٗ اَوْلَمْ تُلْزِمْهُ. (۱۲٦۔مصر)

''کسی شے پر حکم کرنا' یہ فیصلہ کرنا ہے کہ یہ شے ایسی ہے یا ایسی نہیں ہے۔ عام اس سے کہ اس فیصلہ کا تم دوسرے کو پابند کر سکو یا نہ کر سکو۔''

عربی لغت کی مشہور کتاب لسان العرب میں ہے:

اَلْحُكْمُ اَلْعِلْمُ وَ الْفِقْهُ وَ الْقَضَاءُ بِالْعَدْلِ. (ج۵۱:۳)

''حکم کے معنی علم، سمجھ اور منصفانہ فیصلہ کرنا ہے۔''

ان انبیاء علیہم السلام کو جن پر کسی کتاب کا نازل ہونا ثابت نہیں، اس علم اور حکم کا عطا ہونا ثابت ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ وحیِ کتاب کے علاوہ کسی اور عطیۂ علم و حکم کی طرف اشارہ ہے چنانچہ حضرت یوسفؑ کی شان میں ہے:

﴿وَ لَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗۤ اٰتَیْنٰهُ حُكْمًا وَّ عِلْمًا﴾ (یوسف:۲۲)

''اور جب یوسفؑ جوانی کی قوت کو پہنچا تو ہم نے اس کو حکم اور علم دیا۔''

حضرت لوطؑ کی شان کے متعلق ہے:

﴿وَ لُوْطًا اٰتَیْنٰهُ حُكْمًا وَّ عِلْمًا﴾ (انبیاء:۹)

''اور لوط کو ہم نے حکم اور علم دیا۔''

حضرت داؤدؑ اور سلیمانؑ کے ذکر میں ہے:

﴿فَفَهَّمْنٰهَا سُلَیْمٰنَ وَ كُلًّا اٰتَیْنَا حُكْمًا وَّ عِلْمًا﴾ (انبیاء:۷۹)

''تو ہم نے سلیمان کو وہ فیصلہ سمجھایا اور ہر ایک کو ہم نے حکم اور علم دیا تھا۔''

حضرت یحییٰؑ کی نسبت ہے:

﴿یٰیَحْیٰى خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ وَّ اٰتَیْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِیًّا﴾ (مریم:۱۲)

''اے یحییٰ! کتاب (توراۃ) کو مضبوطی سے پکڑ اور ہم نے اس کو حکم بچپن میں عطا کر دیا۔''

ایک جگہ اللہ تعالیٰ بنی اسرائیل پر اپنی نعمتیں ان الفاظ میں شمار کرتا ہے:

﴿وَ لَقَدْ اٰتَیْنَا بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ الْكِتٰبَ وَ الْحُكْمَ وَ النُّبُوَّةَ﴾ (جاثیہ:۱۶)

''اور بلاشک ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب اور حکم اور نبوت دی۔''

اس سے معلوم ہوا کہ کتاب اور حکم اور نبوت تین چیزیں ہیں، یہاں کسی کو یہ شبہ نہ ہو کہ ان آیتوں میں حکم سے مراد دنیاوی حکومت اور سلطنت ہے کہ اس معنی میں یہ لفظ خالص اور قدیم عربی میں نہیں آیا ہے۔ یہ اہلِ عجم کا محاورہ ہے قرآن نے ہر جگہ اس کو فیصلہ اور قوتِ فیصلہ کے معنی میں استعمال کیا ہے جیسے:

﴿فَاحْكُمْ بَیْنَنَا بِالْحَقِّ﴾ (صٓ:۲۲)

''ہمارے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کر۔''

﴿فَاحْكُمْ بَیْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ﴾ (صٓ:۲۶)

''تم لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کرو۔''

﴿وَ اِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَیْنَهُمْ بِالْقِسْطِ﴾ (مائدہ:۴۲)

''اور تو ان کے درمیان فیصلہ کرے تو انصاف کے ساتھ فیصلہ کر۔''

حضرت داؤد اور سلیمانؑ ایک مقدمہ کا فیصلہ کرتے ہیں:

﴿وَ دَاوٗدَ وَ سُلَیْمٰنَ اِذْ یَحْکُمَانِ فِی الْحَرْثِ﴾ (انبیاء:۷۸)

''اور داؤد اور سلیمان کو جب وہ دونوں کھیت کا فیصلہ کر رہے تھے۔''

﴿وَ مَا اخْتَلَفْتُمْ فِیْهِ مِنْ شَیْءٍ فَحُکْمُهٗۤ اِلَی اللّٰهِ﴾ (شوریٰ:۱۰)

''اور جس کسی چیز میں تم نے اختلاف کیا تو اس کا فیصلہ اللہ کی طرف ہے۔''

سب سے بڑھ کر یہ کہ یہی تین باتیں سورۂ انعام میں بہت سے پیغمبروں کے نام گنا کر کہی گئی ہیں۔

﴿اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْکِتٰبَ وَ الْحُکْمَ وَ النُّبُوَّةَ﴾ (انعام:۸۹)

''یہ وہ لوگ تھے جن کو ہم نے کتاب اور حکم اور نبوت بخشی۔''

جن پیغمبروں کے نام اوپر گنائے گئے ہیں اور جن کی طرف وہ لوگ کہہ کر اشارہ کیا گیا ہے یہ ہیں ابراہیم' اسحٰق' یعقوب' نوح' داؤد' سلیمان' یوسف' ایوب' موسیٰ' ہارون' زکریا' یحییٰ' عیسیٰ' الیاس' اسماعیل' الیسع' یونس' لوط علیہم السلام ان اٹھارہ ناموں میں حکم بمعنی حکومت وسلطنت اگر ہو تو اس کے مستحق صرف دو ہیں' سلیمانؑ اور داؤدؑ اور چاہے کسی طرح کسی تاویل سے یوسفؑ اور موسیٰ علیہ السلام کو بھی شامل کر لیجیے۔ باقی چودہ نام ان پیغمبروں کے ہیں جن کو اس کا کوئی حصہ نہیں ملا تھا۔ اس لیے لامحالہ حکم کا لفظ قرآن میں عربیت کے اصلی اور صحیح وصریح معنی میں مستعمل ہے اور اس لفظ سے خدا کا جو مقصود ہے وہ کتاب کے ساتھ ساتھ ان پیغمبروں کو برابر حیثیت میں ملا تھا' غلط فہمی کا پردہ چاک کرنے کے لیے ایک اور آیت کریمہ پر نظر ڈالیے۔

﴿مَا کَانَ لِبَشَرٍ اَنْ یُّؤْتِیَهُ اللّٰهُ الْکِتٰبَ وَ الْحُکْمَ وَ النُّبُوَّةَ ثُمَّ یَقُوْلَ لِلنَّاسِ کُوْنُوْا عِبَادًا لِّیْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰکِنْ کُوْنُوْا رَبّٰنِیّٖنَ بِمَا کُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْکِتٰبَ وَ بِمَا کُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ﴾ (آل عمران:۸)

''کسی بشر کے لیے یہ زیبا نہیں کہ اللہ اس کو کتاب' حکم اور نبوت دے' پھر وہ لوگوں سے کہے کہ تم خدا کو چھوڑ کر میرے بندے بنو' بلکہ جو تم کتاب (توراۃ) سکھاتے تھے اور جو تم پڑھتے تھے اس کے ذریعہ سے تم خدا والے بنو۔''

ان آیتوں میں مخاطب اہل کتاب ہیں اور جس مقدس بشر کا ان میں ذکر ہے' بظاہر اس سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں وہ نہ ہوں تو خود محمد رسول اللہ ﷺ ہیں اور یہ اس وقت کی بات ہے جب یہود کی پوری قوت مدینہ کے اطراف اور حجاز میں موجود تھی اور اسلام ہنوز ان کے مقابلہ میں کمزور و ناتواں تھا' ایسی صورت میں جس حکم کے ملنے کا ذکر ان آیتوں میں ہے وہ کتاب اور نبوت ہی کی جنس کی کوئی چیز ہو سکتی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو تو حکومت وسلطنت کا ادنیٰ شائبہ بھی عطا نہیں ہوا تھا۔ اور آنحضرت ﷺ کو اس وقت تک جب بنی اسرائیل اپنی ممتاز قوت کے ساتھ مدینہ اور حجاز میں موجود تھے' یہ رتبہ نہیں ملا تھا آیت ﴿اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰهِ﴾ میں بھی حکم سے مراد وہی

فیصلہ اور قضائے ربانی ہے حکومت وسلطنت نہیں، تسکین کے لیے اس آیت کے آگے پیچھے کے الفاظ پر نظر ڈالو۔

﴿قُلْ اِنِّیْ عَلٰی بَیِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّیْ وَ کَذَّبْتُمْ بِهٖ مَا عِنْدِیْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰهِ یَقُصُّ الْحَقَّ وَهُوَ خَیْرُ الْفَاصِلِیْنَ﴾ (انعام:۷)

''کہہ دے (اے پیغمبر!) کہ میں اپنے پروردگار کی کھلی دلیل پر ہوں اور تم اس کو جھٹلاتے ہو۔ میرے پاس وہ نہیں جس کی تم جلدی کرتے ہو فیصلہ کسی کا نہیں لیکن اللہ کا' وہ حق بیان کرتا ہے اور سب فیصلہ کرنے والوں سے وہ بہتر ہے۔''

ان وجوہ سے اس میں کوئی شک نہیں رہتا کہ انبیاء علیہم السلام کو منصبِ نبوت اور وحیِ کتاب کے ساتھ حکم کی سند بھی ملتی ہے جس سے صاف وصریح معنی کلامِ عرب اور لغت اور قرآن کے قرینوں سے علم وفہم' فیصلہ اور حق و باطل میں تمیز ہے اور اس لیے رسول کی اس قوت وطاقت کے نتائج بھی ہمارے لیے واجب العمل ہیں۔

شرحِ صدر

ربانی علم ومعرفت کا ایک اور مقام شرحِ صدر ہے' شرحِ صدر کے معنی ''سینہ کھولنے'' کے ہیں' عام خیال یہ ہے کہ سینہ کی تنگی اور ضیق' جہل و نادانی کی علامت ہے اور سینہ کی کشادگی اور فراخی علم کی وسعت اور معرفت کی فراوانی پر دلالت کرتی ہے۔ اسی لیے شرحِ صدر کے اصطلاحی اور مجازی معنی علم کی کثرت اور آگاہی کی وسعت کے ہیں اور خاص طور سے اس علم ومعرفت اور اطلاع وآگاہی پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے جو کسی دقیق اور مشکل مسئلہ کے متعلق دفعتاً اور یک بیک قلب میں وارد ہو جاتی ہے اور اس حل سے اس کی تسلی وتسکین ہو جاتی ہے اور اس کے شکوک وشبہات دور ہو کر اس کو یقین کی راحت ومسرت حاصل ہو جاتی ہے' جمہرہ ابن درید میں ہے:

وَ الشَّرْحُ مِنْ قَوْلِهِمْ شَرَحْتُ لَکَ الْاَمْرُ اَیْ اَوْضَحْتُهٗ وَ کَشَفْتُهٗ وَ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ فَانْشَرَحَ اِذَا تَسَعَ بِقَبُوْلِ الْخَیْرِ. ۲، ۳۴)

''شرح اہل عرب کے اس محاورہ سے ہے کہ میں نے تیرے لیے بات کی شرح کر دی یعنی اس کو واضح کر دیا اور کھول دیا اور اللہ نے اس کے سینہ کو کھول دیا تو وہ کھل گیا۔ یعنی جب نیکی کے قبول کرنے کے لیے وسیع ہو گیا۔''

صحاح جوہری میں ہے:

اَلشَّرْحُ اَلْکَشْفُ تَقُوْلُ شَرَحْتُ الْغَامِضَ اِذَا فَسَرْتَهٗ.

''شرح یعنی کشف (کھولنا) تم کہتے ہو میں نے اس پوشیدہ مسئلہ کی شرح کر دی یعنی اس کی تفسیر کر دی۔''

لسان العرب میں ہے:

اَلشَّرْحُ اَلْکَشْفُ یُقَالُ شَرَحَ فُلَانٌ اَمْرِیْ اَوْضَحَهٗ وَ شَرَحَ مَسْئَلَةٌ مُشَکَّلَةٌ بَیَّنَهَا وَ شَرَحَ الشَّیْئُ بِشَرْحِهٖ شَرْحًا وَ شَرَحَهٗ فَتَحَهٗ بَیَّنَهٗ وَ کَشَفَهٗ وَ کُلُّ مَافَتَحَ مِنَ الْجَوَاهِرِ فَقَدْ شَرَحَ اَیْضًا تَقُوْلُ شَرَحْتُ الْغَامِضَ اِذَا فَسَرْتُهٗ وَ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ بِقَبُوْلِ الْخَیْرِ بِشَرْحِهٖ شَرَحًا فَانْشَرَحَ وَ سَعَهٗ بِقَبُوْلِ فَاتَّسَعَ

''شرح یعنی کشف ہے' کہا جاتا ہے کہ فلاں نے اس کی بات کی شرح کردی یعنی اس کو واضح کردیا اور مشکل مسئلہ کی شرح کردی یعنی اس کو بیان کردیا' اور کسی چیز کی شرح کردی یعنی تفصیل کردی اور کھول دیا اور جواہر میں سے جو کھولا جائے تو اس کی شرح کی گئی تم بولتے ہو پوشیدہ مسئلہ کی شرح کردی تفسیر کردی اور خدا نے اس کے سینہ کو کھول دیا کسی نیک بات کے قبول کرنے کے لیے تو وہ کھل گیا یعنی اس کو قبولِ حق کے لیے وسیع کردیا تو وہ وسیع ہوگیا۔''

قَالَ ابْنُ الْاَعْرَابِیُّ اَلشَّرْحُ اَلْحِفْظُ وَ الشَّرْحُ اَلْفَتْحُ وَ الشَّرْحُ اَلْبَیَانُ' وَ الشَّرْحُ اَلْفَهْمُ.

''ابن اعرابی نے کہا' شرح کے معنی ہیں' یاد رکھنا' کھولنا' بیان کرنا' سمجھنا۔''

قرآنِ مجید میں ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے نبوت کا منصب ملتے وقت دعا مانگی:

﴿رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ ○ وَ یَسِّرْلِیْ اَمْرِیْ ○ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِیْ ○ یَفْقَهُوْا قَوْلِیْ ○﴾ (طٰہٰ:۲۵'۲۸)

''اے میرے رب! میرے سینہ کو میرے لیے کھول دے اور میرے کام کو میرے لیے آسان کردے اور میری زبان کی گرہ کھول دے تاکہ لوگ میری بات کو پوری طرح سمجھیں۔''

دعا کے پہلے جملہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے لیے شرح صدر کی استدعا کی ہے اور آخر میں فصاحت بیان کی یعنی اول میں صحیح معنی کے القاء اور آخر میں ان کے لیے صحیح الفاظ کے انتخاب کی دعا کی ہے تاکہ ان کی دعوت وتبلیغ کو مخاطب سمجھ سکیں یہ دولت محمد رسول اللہ ﷺ کو بن مانگے ملی' خدا نے فرمایا:

﴿اَلَمْ نَشْرَحْ لَکَ صَدْرَکَ ○ وَوَضَعْنَا عَنْکَ وِزْرَکَ ○﴾ (الانشراح:۱'۲)

''کیا ہم نے (اے محمدؐ!) تیرے لیے سینہ کو کھول نہیں دیا اور تیرے بوجھ کو تجھ سے اتار لیا۔''

شرح صدر اور ''سینہ کھولنے'' کی جو تشریح احادیثِ صحیحہ میں مذکور ہے اس کے لیے عام اصطلاح شقِ صدر ہے یعنی عالم رؤیا یا بیداری میں فرشتوں نے آکر سینۂ مبارک کو واشگاف کیا' اس کو آبِ زم زم سے دھویا اور سونے کے طشت میں ایمان اور حکمت بھر کر لائے اور ان سے سینۂ مبارک کو معمور کرکے شگاف کو برابر کردیا۔[1] اگر یہ واقعہ اپنی ظاہر حقیقت پر محمول کیا جائے تو بالکل کھلی ہوئی بات ہے کہ سینہ مبارک کو واقعتاً چاک کرکے اور زم زم کے پانی سے پاک وصاف کرکے ایمان اور حکمت اس میں بھری گئی اور اگر تمثیل کے رنگ میں لیا جائے تو بھی یہ حقیقت

(۱) صحیح بخاری وصحیح مسلم ونسائی ابواب معراج واسراء فرائض الصلوۃ ومسند احمد بروایت انس بن مالک وسنن ترمذی تفسیر سورۂ انشراح۔

ماننی پڑے گی کہ سینہ صافی ایمان وحکمت سے معمور کیا گیا' بہر حال شرحِ صدر کی حقیقت ایمان اور حکمت کی ربانی بخشش ہے۔

شرح صدر کے اس مذکورۂ بالا معنی کو جوشقِ صدر کے واقعہ کی تفصیل سے واضح ہے اگر کوئی تسلیم کرنے پر آمادہ نہ ہوتو بھی بحمداللہ کہ اس کی تسکین کا سرمایہ قرآن پاک میں موجود ہے۔ سورۂ زمر میں ہے۔

﴿اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ﴾ (الزمر:۲۲)

''بھلا جس کا سینہ اللہ نے اسلام کے لیے کھول دیا تو وہ اپنے پروردگار کی طرف سے ایک روشنی میں ہے۔''

اسلام کے لیے سینہ کے کھول دینے سے مقصود یہ ہے کہ اسلام کی حقیقت مؤثر طریقہ سے اس پر اس طرح کھل گئی کہ اس کو اسلام کی سچائی کا پوری طرح یقین آ گیا' اور اس کو اپنے اس یقین پر کامل تسکین حاصل ہوگئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کو اپنی منزلِ مقصود کے ہر قدم پر اللہ کی روشنی حاصل ہے۔ یہی شرح صدر کی حقیقت ہے اور اس روشنی کی کمی وبیشی درجوں اور منصبوں کے مطابق ہوتی ہے۔

اس سلسلہ میں حدیث کے دو ایسے موقعوں کا ذکر کرنا ہے جن سے لفظ ''شرح صدر'' کے معنی کی پوری تشریح ہو جاتی ہے یہاں یہ نکتہ پیش نظر رہے کہ ان حدیثوں سے معنوی احتجاج یہاں مقصود نہیں' بلکہ صدر اول کے کلامِ عرب سے شرح صدر کے محاورہ کی تشریح مقصود ہے۔

(۱) پہلا واقعہ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد عرب کے بعض قبیلے زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کرتے ہیں حضرت ابوبکر صدیقؓ ان پر فوج کشی کا ارادہ کرتے ہیں' حضرت عمر فاروقؓ آ کر عرض کرتے ہیں کہ یا خلیفہ رسول اللہ! ان سے جہاد کیونکر ممکن ہے' آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ جس نے لا الہ الا اللہ کہا اس نے اپنی جان ومال کو مجھ سے بچالیا' حضرت صدیقؓ جواب دیتے ہیں خدا کی قسم! میں اس سے لڑوں گا جو زکوٰۃ اور نماز میں فرق کرتا ہے۔ نماز خدا کا حق ہے اور زکوٰۃ بندوں کا حق ہے' اگر وہ بکری کا ایک بچہ بھی جس کو وہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں دیتے تھے اب نہ دیں گے تو میں ان سے لڑوں گا۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ فرماتے ہیں:

فَوَ اللّٰهِ مَا هُوَ اِلَّا اَنْ قَدْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَ اَبِیْ بَكْرٍ فَعَرَفْتُ اَنَّهُ الْحَقَّ.

''تو خدا کی قسم' نہ تھا یہ لیکن یہ کہ کھول دیا تھا اللہ نے ابوبکرؓ کے سینہ کو تو میں نے جان لیا وہی حق ہے۔''

(۲) دوسرا واقعہ یہ ہے کہ جنگ یمامہ میں قرآن کے بہت سے حافظ شہید ہوئے۔ اس وقت حضرت عمرؓ نے آ کر حضرت ابوبکرؓ کو مشورہ دیا کہ قرآن پاک کو ایک ترتیب سے کاغذ پر لکھ لیا جائے' حضرت ابوبکرؓ نے جواب دیا کہ میں وہ کام کیونکر کروں جس کو خود رسول اللہ ﷺ نے نہیں کیا' لیکن حضرت عمرؓ اپنے مشورہ کے بہتر ہونے پر اصرار کرتے رہے' یہاں تک کہ حضرت ابوبکرؓ کی سمجھ میں بھی بات آ گئی' اس موقع پر حضرت ابوبکرؓ کہتے ہیں:

فَلَمْ يَزَلْ عُمَرُ يُرَاجِعُنِیْ حَتّٰى شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرِیْ لِذٰلِكَ وَ رَاَيْتُ فِیْ ذٰلِكَ الَّذِیْ رَاٰى

عُمَرُ (صحیح بخاری جمع القرآن)

''تو عمرؓ بار بار مجھ سے کہتے رہے یہاں تک کہ خدا نے اس کے لیے میرے سینہ کو کھول دیا اور میں نے بھی وہی دیکھا جو عمرؓ دیکھتے تھے۔''

ان دونوں موقعوں پر لفظ شرح صدر اپنے استعمال کا محل اور اپنی حقیقت کو ظاہر کر رہا ہے یہی شرحِ صدر ہے جس کو قرآن نے جیسا کہ اوپر سورۂ زمر کے حوالہ سے گزرا' نورِ ربانی یا نورِ بصیرت کہا ہے۔

آنحضرت ﷺ کو شرحِ صدر کی جو وسعت عطا ہوئی تھی۔ اس کے سمجھنے سے پہلے بلاغت کا ایک مسئلہ سمجھ لینا چاہیے' جب کوئی لفظ متعلقات کے صلہ اور مفعول کے ساتھ مقید ہو کر بولا جاتا ہے تو اس معنی کی تخصیص و تحدید ہو جاتی ہے لیکن وہی لفظ جب متعلقات کے صلہ اور مفعول کی قید کے بغیر بولا جائے گا تو وہ عموم کے ساتھ فعل کے ثبوت کا فائدہ دے گا مثلاً علم (جاننا) مفعول کو چاہتا ہے۔ جس چیز کا علم ہوتا ہے اس کو عبارت میں مفعول بناتے ہیں اور اس عبارت میں اس علم سے مقصود اسی خاص شے کا علم ہوتا ہے جس کو مفعول بنایا ہے لیکن اگر مفعول کو حذف کر دیں تو اس کا مقصد کسی خاص علم کے بجائے مطلق اور عام علم کا ثبوت ہوگا' ایک جگہ قرآن میں ہے ﴿يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا﴾ (الروم) وہ ''حیاتِ دنیا کا ظاہری پہلو جانتے ہیں'' ظاہر ہے کہ اس علم کا تعلق صرف ایک چیز کے علم سے ہے یعنی دنیا کی ظاہری زندگی کے علم سے عام علم سے نہیں' لیکن دوسری جگہ ہے۔ ﴿اَلَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ کیا وہ جانتے ہیں اور جو نہیں جانتے (یعنی جو علم رکھتے ہیں اور جو علم نہیں رکھتے) دونوں برابر ہو سکتے ہیں'' یہاں یہ ذکر نہیں کہ کس خاص بات کو جانتے ہیں بلکہ مقصود عام علم ہے' تو یہاں معنی یہ ہوں گے کہ جو ہر طرح کے علم والے ہیں اور جو مطلق بے علم ہیں' دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔ بلاغت کی کتابوں میں ﴿هُوَ يَاْمُرُ وَ يُعْطِيْ وَ يَمْنَعُ هُوَ اَضْحَكَ وَ اَبْكٰى﴾ کی مثالوں سے اس مفہوم کی توضیح کی گئی ہے۔

اس تمہید کے بعد شرحِ صدر کے گزشتہ استعمالوں اور مثالوں پر نظر ڈالیے ہر جگہ آپ کو یہ معلوم ہوگا کہ جس بات کے سمجھنے کے لیے سینہ کھولا جاتا ہے اس پر لام آتا ہے یا قرینہ سے سمجھا جاتا ہے کہ مثلاً اسلام کے لیے سینہ کھول دیا' جمعِ قرآن کے لیے سینہ کھول دیا' مانعینِ زکوٰۃ کے قتال کے لیے سینہ کھول دیا' مگر حضرت موسیٰ علیہ السلام اور آنحضرت ﷺ کے لیے قرآن میں جس شرحِ صدر کا ذکر ہے اس میں اس بات کا ذکر نہیں ہے جس کے لیے ان انبیاء علیہم السلام کے سینہ کھولے گئے' اس سے یہ مقصود ہے کہ ان انبیاء کو امورِ دین میں مطلق اور عمومی شرحِ صدر عنایت ہوا اور یہیں سے عام امت اور انبیا کے فرقِ مراتب کا اظہار ہوتا ہے کہ امت کے عام افراد کو خاص خاص امور کے سمجھنے کے لیے شرحِ صدر ملتا ہے اور انبیا کو اپنے دائرہ میں کلی اور عمومی حیثیت سے یہ چیز عنایت ہوتی ہے۔

ایک اور لطیف پہلو بھی یہاں ذکر کے قابل ہے' حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا اور حضرت محمد رسول اللہ ﷺ پر احسان دونوں موقعوں پر لی اور لک ہے' حضرت موسیٰ علیہ السلام کہتے ہیں' میرے لیے سینہ کو کھول دے۔ اور آنحضرت ﷺ کے لیے خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ کیا میں نے تیرے لیے تیرے سینہ کو کھول نہیں دیا۔ سوال یہ ہے کہ ''میرے

لیے'' اور تیرے لیے'' کے اضافہ کی ضرورت اور اس ''لام'' کی حاجت کیا تھی؟ مفسرین میں امام زمخشری نے اس سوال کے جواب دینے کی کوشش کی ہے اور لکھا ہے کہ یہ صرف تاکید کے لیے ہے حالانکہ یہ لام تملیک کے بجائے لام افادہ ہے جیسا کہ ﴿خَلَقَ لَكُمْ مَّافِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا﴾ میں ہے مقصد یہ ہے کہ یہ شرحِ صدر کی دولت تجھ کو تیرے لیے ملی ہے یعنی تیرے کشفِ علم کے لیے یا تائید کے لیے فائدہ کے لیے اور یہ کشفِ علم اور شرحِ صدر خود تیری ذات کے لیے ہے کہ وہ کامل سے کامل تر ہو کر ظاہر ہوا۔

اب آخری سوال یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کو دین کا جو یہ عمومی شرحِ صدر عنایت ہوا' اس کا کوئی اثر و نتیجہ بھی تو نمایاں ہوگا' دراصل اسی کے یہ آثار و نتائج ہیں جو افعال و اقوال اور ''احادیث و سنن'' کی صورت میں ہمارے سامنے ہیں۔

تبیینِ کتاب

آنحضرت ﷺ دنیا میں جس شریعت کو لے کر آئے وہ آخری اور ابدی تھی اور ایسی آخری اور ابدی شریعت کے لیے یہ ضروری تھا کہ وہ زیادہ تر زور شریعت کے کلی اور ابدی اصول و مبادی پر دے' چنانچہ اس آخری وحیِ الٰہی نے اپنی کتاب کو صرف اصول و کلیات تک محدود رکھا اور جزئیات کے لیے اپنی آیتوں میں ایسے اشارے رکھے جن کے سہارے سے وہ دل جو علم و معرفت سے پرنور اور حکم و حکمت سے معمور اور شرحِ صدر اور تائیدِ ربانی سے فیض یاب ہوں وہ علٰی قدرِ مراتب جزئیات کو صحیح طور سے جان لیں' چنانچہ یہ رتبہ سب سے پہلے خود نبی کو ملا اور چونکہ وہ خطا سے معصوم ہے' اس لیے اس کے اس منصب کے نتائج بھی خطا سے محفوظ ہیں' پھر رسول اللہ ﷺ کے وسیلہ سے یہ منصب خلفائے راشدین' اکابر صحابہؓ' ائمہ تابعین و مجتہدین عظام اور علمائے اعلام کو ہمیشہ ملتا رہا۔ اسی کا اصطلاحی نام اجتہاد ہے جس کو ہر زمانہ کے فیض یابانِ علومِ نبوت اور حاملینِ اسرارِ شریعت خدا کی دی ہوئی بصیرت کے مطابق اس کی وحی کی روشنی میں ہمیشہ انجام دیتے رہے ہیں اور دیتے رہیں گے' یہی سبب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کی توضیح و تفسیر کی ذمہ داری بھی خود اپنے اوپر لی ہے' فرمایا:

﴿لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ○ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَ قُرْاٰنَهٗ ○ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ○ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ○﴾ (قیامۃ:۱۶'۱۹)

''تو قرآن کو وحی کے ساتھ اپنی زبان کو اس غرض سے حرکت نہ دے تاکہ تو اس کی (تلاوت و اشاعت میں) جلدی کرے' بے شک ہم پر ہے قرآن کا جمع کرنا اور اس کو پڑھانا اور جب ہم نے اس کو پڑھا دیا تو تو اس کی پڑھائی کی پیروی کر پھر ہم پر ہے اس کی شرح کرنا۔''

اس بیان و شرح کی ذمہ داری کبھی بذریعہ وحی ادا ہوئی ہے جو قرآن میں مذکور ہے' پھر کبھی رسول کی تقریر و عمل سے پوری ہوئی ہے جو عملی تواتر سے منقول اور احادیث و سنن کے مستند دفتر میں موجود ہے۔

یہ امر کہ اس بیان وشرح کی طاقت اور اس شرح و بیان کا اختیار رسول کو خدا کی طرف سے عطا ہوا تھا حسب ذیل آیت سے ثابت ہے:

﴿وَ اَنْزَلْنَآ اِلَیْکَ الذِّکْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَانُزِّلَ اِلَیْھِمْ وَ لَعَلَّھُمْ یَتَفَکَّرُوْنَ﴾ (نحل:٦)

''اور ہم نے تیری طرف یہ نصیحت (کی کتاب) اتاری تا کہ لوگوں کی طرف جو اتارا گیا ہے تو اس کو کھول کر بتادے شاید وہ سوچیں۔''

بیان اور تبیین کے لفظی معنی کھولنے اور واضح کرنے کے ہیں اور ان کا استعمال دو معنوں میں ہوتا ہے' ایک' اعلان اور اظہار کے معنی میں یعنی اخفا کے مقابل دوسرے توضیح وتفسیر کے معنی میں قرآن پاک میں یہ لفظ ''تبیین'' اپنے دونوں معنوں میں آیا ہے۔ اب یہ تمیز کہ کس آیت میں کیا معنی مراد ہیں' سیاق اور موقع ومحل سے ہوسکتی ہے مثلاً ایک جگہ قرآن پاک میں ہے۔

﴿یٰٓاَھْلَ الْکِتٰبِ قَدْ جَآءَ کُمْ رَسُوْلُنَا یُبَیِّنُ لَکُمْ کَثِیْرًا مِّمَّا کُنْتُمْ تُخْفُوْنَ مِنَ الْکِتٰبِ وَ یَعْفُوْا عَنْ کَثِیْرٍ﴾ (مائدہ:۱۵)

''اے کتاب والو! تمہارے پاس ہمارا رسول آیا کہ کتاب کی جو باتیں تم چھپاتے تھے وہ ان کو تمہارے لیے ظاہر کردے اور بہت سی باتوں سے درگزر کرے۔''

یہاں ''تبیین'' صریح طور سے اخفا کے مقابلہ میں ہے اس لیے یہاں ''تبیین'' کے معنی یقینی طور پر اظہار و اعلان کے ہیں' لیکن یہی لفظ دوسری جگہ سورۂ نحل میں اس طرح آیا ہے:

﴿وَ مَآ اَنْزَلْنَا عَلَیْکَ الْکِتٰبَ اِلَّا لِتُبَیِّنَ لَھُمُ الَّذِی اخْتَلَفُوْا فِیْہِ وَ ھُدًی وَ رَحْمَۃً لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ﴾ (النحل:٦٤)

''اور ہم نے تجھ پر کتاب نہیں اتاری لیکن اس لیے تا کہ تو واضح کردے اس کو جس میں انہوں نے اختلاف کیا اور ایمان والوں کے لیے رہنمائی اور رحمت بنا کر اس کو اتارا۔''

اختلاف کے مقابلہ میں اظہار اور اعلان کی نہیں بلکہ توضیح وتشریح کی ضرورت ہے کہ جس امر میں اختلاف ہو وہ اس توضیح وتفسیر کے بعد دور ہوجائے' اب پہلی آیت پر غور کرنا چاہیے جو اسی سورہ میں ایک اور مقام پر ہے۔

﴿وَ اَنْزَلْنَآ اِلَیْکَ الذِّکْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْھِمْ وَ لَعَلَّھُمْ یَتَفَکَّرُوْنَ﴾ (النحل:۴۴)

''اور ہم نے اے پیغمبر! تیری طرف نصیحت کی کتاب (قرآن) کو اتارا کہ لوگوں کی طرف جو اتارا گیا' تو اس کو ان کے لیے کھول کر بتادے شاید کہ وہ سوچیں۔''

سوال یہ ہے کہ اس آیت پاک میں بیان کرنے کے معنی ظاہر کرنے کے ہیں یا تشریح وتفصیل کرنے کے! ہمارا دعویٰ ہے کہ ظاہر کرنے کے بجائے یہاں غور وفکر کی مناسبت اور قرینہ کے سبب سے تشریح وتفصیل کے معنی لینا صحیح ہے' امر مخفی کا اظہار سننے اور ماننے کے تو مناسب ہوسکتا ہے مگر سوچنے اور غور وفکر کرنے کے لیے یہاں تشریح و

تفصیل کی ضرورت ہے نہ کہ اظہار و اعلان کی۔ اب جب کہ آنحضرت ﷺ کے لیے تفصیل و تبیین کا منصب خدا کی طرف سے ثابت ہے تو اس تفصیل و تبیین کی پیروی اور اتباع بھی خدا ہی کے احکام کی پیروی ہوگی اور آپؐ کی یہ تبیین و تشریح آپ کے نورِ حکمت کا فیضان ہوگا' جس کے اشارے خود کتابِ الٰہی کے اندر آپ کو موجود نظر آتے تھے۔

اراءت

انسانی الفاظ میں یہ قدرت نہیں کہ ان کے ذریعہ سے کوئی ایسا قانون وضع کیا جا سکے جو ایک طرف اختلافِ فہم سے محفوظ رہے اور دوسری طرف اس میں یہ وسعت ہو کہ تمام آئندہ پیش آنے والے واقعات پر جن کے جزئیات کی کوئی حد نہیں پوری طرح حاوی ہو سکے' لیکن فہمِ انسانی کے اختلاف کے جو نقائص قانون میں ہوتے ہیں گو ان کو تمام تر دور نہیں کیا جا سکتا' تاہم ان کو کم کیا جا سکتا ہے' اسلام نے اپنے قانونِ الٰہی سے جو بہر حال انسانی بول چال کے الفاظ میں ہے اس اختلافِ فہم کے نقص کو کم کرنے کے لیے یہ کیا کہ اپنے رسول کی معرفت زبانی اور عملی طور سے اس کی تشریح و تبیین کرا دی' گو انسانی ذرائع حفظ و روایت کی فطری کمزوریوں کے سبب سے اس تشریح و تبیین میں بھی اختلافِ فہم پیدا ہو گیا' مگر یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اگر یہ تشریح و تبیین نہ ہوتی تو اختلافات کی خلیج اس سے زیادہ عمیق اور وسیع ہوتی۔

روزمرہ کے پیش آتے رہنے والے جزئیات کے فیصلہ کی یہ صورت رکھی گئی کہ آنحضرت ﷺ کی عدالت میں روزانہ اس قسم کے واقعات اور مقدمات پیش ہوتے رہے اور آپؐ وحیِ کتاب کے اصول و کلیات کے ماتحت اپنے نورِ بصیرت اور فہمِ حکمت سے ان کے فیصلے فرماتے رہے' خلفائے راشدین نے اپنے اپنے عہد میں ان نو بنو اور تازہ بتازہ واقعات کے فیصلوں کے لیے اولاً وحیِ کتابی کو اور اس کے بعد آنحضرت ﷺ کے ان قضایا اور فیصلوں کو جو فہمِ نبوت' نورِ بصیرت اور اراءتِ الٰہی کے ذریعہ فیصل ہوئے تھے اپنا ماخذ قرار دیا' اور یہی اصول بعد کے فقہا اور مجتہدین نے اختیار کیا اور ہر نئے واقعہ کو وحیِ کتاب اور فیصلۂ نبوی کے معصوم و مسلم معیار پر جانچ کر ان میں سے کسی نہ کسی مماثل اور مشابہ پر قیاس کر کے اپنے فیصلے دیے اور جو چیزیں ان میں نہ ملیں ان کو معمولی عدل و انصاف' رسم و رواج' عقل و فکر و استحسان وغیرہ کے اصول پر سمجھ کر ان کا فیصلہ کیا' یہی مجموعہ آج فقۂ اسلامی کہلاتا ہے۔

وحیِ الٰہی قرآن پاک میں ہے کہ آنحضرت ﷺ کے قضایا اور فیصلے احادیث و سنن کی صحیح روایتوں میں محفوظ ہیں' وحیِ الٰہی کی صداقت میں تو کلام نہیں ہو سکتا۔ اب رہ گئی آنحضرت ﷺ کے قضایا اور فیصلوں کی پیروی تو اس کے متعلق بھی وحیِ الٰہی ناطق ہے۔

﴿اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَیْکَ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْکُمَ بَیْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰکَ اللّٰهُ﴾ (النساء:۱۰۵)

(''ہم نے اے پیغمبر!) تیری طرف سچائی کے ساتھ کتاب اتاری تا کہ لوگوں کے درمیان جو تجھ کو اللہ سوجھائے اس کے ذریعہ فیصلہ کرے۔''

اس کتاب الٰہی کے نزول کی غرض ہی یہ بتائی گئی ہے کہ تو اے پیغمبر! اس کے احکام اور قوانین کو لے کر اس فہم کے ذریعہ جو کچھ اللہ تعالیٰ تجھ کو سجھائے اور دکھائے تو لوگوں کے درمیان فیصلہ اور انصاف کرے' اللہ تعالیٰ کا اپنے پیغمبر کو یہی سوجھانا اور دکھانا جو کچھ تھا' وہ آپ کے عمل اور قضایا اور فیصلوں کی صورت میں محفوظ ہے اور اسلام کے قانون کا وحیِ الٰہی کے بعد دوسرا ماخذ ہے۔

آنحضرت ﷺ کے عدل وانصاف پر خود منافقین تک کو بھروسہ تھا' چنانچہ ان کا قاعدہ تھا کہ جب ان کا حق کسی پر ہوتا تو دوڑے ہوئے عدالتِ نبوی میں حاضر ہوتے' کیونکہ سمجھتے تھے کہ یہ حق آپ ہی کی عدالت سے ہم کو ملے گا' لیکن جب ان پر کسی کا حق نکلتا تو وہ ٹال جاتے اور دوسرے طریقہ سے فیصلہ چاہتے' اس پر اللہ تعالیٰ نے ان کی سرزنش کی:

﴿وَ اِذَا دُعُوْٓا اِلَی اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ لِیَحْكُمَ بَیْنَهُمْ اِذَا فَرِیْقٌ مِّنْهُمْ مُّعْرِضُوْنَ○ وَ اِنْ یَّكُنْ لَّهُمُ الْحَقُّ یَاْتُوْٓا اِلَیْهِ مُذْعِنِیْنَ○ اَفِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ اَمِ ارْتَابُوْٓا اَمْ یَخَافُوْنَ اَنْ یَّحِیْفَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ وَ رَسُوْلُهٗ بَلْ اُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ○ اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِیْنَ اِذَا دُعُوْٓا اِلَی اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ لِیَحْكُمَ بَیْنَهُمْ اَنْ یَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ○ وَ مَنْ یُّطِعِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ یَخْشَ اللّٰهَ وَ یَتَّقْهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ○﴾ (نور:۴۸'۵۲)

''اور جب وہ اللہ تعالیٰ اور رسول کی طرف بلائے جائیں کہ رسول ان کے درمیان فیصلہ کر دے تو ان میں سے کچھ لوگ منہ موڑتے ہیں اور اگر ان کو کچھ حق پہنچتا ہو تو فرماں بردار بن کر رسول کے پاس چلے آئیں۔ کیا ان کے دل میں بیماری ہے یا وہ شک میں ہیں یا وہ ڈرتے ہیں کہ خدا اور اس کا رسول ان کے ساتھ بے انصافی کرے گا' بلکہ وہی لوگ بے انصاف ہیں' ایمان والوں کی بات یہ تھی کہ جب ان کو خدا اور رسول کی طرف بلایا جائے تا کہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کر دے تو وہ کہیں کہ ہم نے سنا اور مان لیا' انہی لوگوں کا بھلا ہے اور جو کوئی اللہ کے اور اس کے رسول کے حکم پر چلے اور اللہ سے ڈرتا ہے اور اللہ سے بچ کر نکلے وہی لوگ ہیں مراد کو پہنچے۔''

ان آیات سے معلوم ہوا کہ رسول کے تمام فیصلے منصفانہ ہوتے تھے اور رسول کے فیصلوں کی اطاعت خود خدا کے حکم کی اطاعت ہے بلکہ ایمان کی دلیل اور نشانی ہے۔

﴿فَلَا وَ رَبِّكَ لَا یُؤْمِنُوْنَ حَتّٰی یُحَكِّمُوْكَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَهُمْ ثُمَّ لَا یَجِدُوْا فِیْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَیْتَ وَ یُسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا﴾ (نساء:۶۵)

''تو قسم ہے تیرے رب کی وہ مومن نہ ہوں گے جب تک وہ تجھے اپنے جھگڑوں کا منصف نہ بنائیں اور

پھر جو تو فیصلہ کرے اس سے اپنے دل میں خفگی نہ پائیں اور پوری طرح تسلیم کریں۔"

﴿وَ مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّ لَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗۤ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ وَ مَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا﴾ (احزاب:۳۶)

"اور مومن مرد یا مومن عورت کا یہ کام نہیں کہ جب اللہ اور اس کا رسول فیصلہ کر دے تو ان کو اپنے کام کا اختیار رہے اور جس نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی وہ کھلا گمراہ ہوا۔"

یہ اطاعت اور مطلقاً سرافگندگی اور تمام فیصلوں کے قطعی حق اور منصفانہ فیصلہ ہونے کی ربانی ذمہ داری ہر حاکم وقت اور سلطانِ زمانہ کے لیے نہیں' یہ انبیا کے لیے خاص ہے' دو شخصوں کے باہمی جزئی و شخصی مقدمات کا فیصلہ ظاہر ہے کہ خود اللہ تعالیٰ وحیِ قرآنی کے ذریعہ نہیں کرتا تھا بلکہ رسول کے فہمِ نبوت' نورِ نبوت' فیضِ حکمت' شرحِ صدر' تبیینِ حقیقت اور اراءت (دکھانا اور سوجھانا) کے ذریعہ فرماتا تھا' لیکن کلیات کی حیثیت سے وہ یقیناً وحیِ قرآنی کے مطابق ہوتا تھا اور ان کلیات کے مطابق ان جزئیات کا فیصلہ خود اللہ تعالیٰ آپ کو سوجھاتا تھا۔

آپ ؐ کے ان قضایا اور فیصلوں کی رضامندانہ اطاعت ہر مسلمان پر قیامت تک ضروری ہے' آپ ؐ کی زندگی کے بعد ان فیصلوں کی اطاعت یہ ہے کہ اس قسم کے مقدمات اور معاملات میں ہم وہی فیصلے جاری کریں جو آپ ؐ نے اپنی زندگی میں ان کے متعلق کیے کہ آپ ؐ کے فیصلے بحکمِ خدا غلطی سے پاک' ظلم سے بری اور بے انصافی سے منزہ تھے اور دنیا میں رسول کے سوا کسی انسان کو اس بے گناہی اور عصمت کا درجہ اور رتبہ حاصل نہیں۔

رسول کا وجود مستقل ہدایت ہے

اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں کو امام و پیشوا اور ہادی و رہنما فرمایا ہے یعنی نبوت اور وحی سے سرفراز ہونے کے بعد ان کی ذات مجسم ہدایت و رہنمائی اور امامت و پیشوائی کے لیے خاص ہو جاتی ہے۔ ان کی بعثت اسی لیے ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کی راہنمائی فرمائیں اور ان کو ضلالت و گمراہی سے بچائیں' جس امت میں مبعوث ہوتے ہیں اس کے سامنے رہنمائی کے دو چراغ روشن ہوتے ہیں' ان دونوں کی روشنی مل کر ایک ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو جنہیں یہودی اپنی شرارت اور سازش سے گمراہ بنانا چاہتے تھے' خطاب کر کے فرماتا ہے:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تُطِيْعُوْا فَرِيْقًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ يَرُدُّوْكُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ كٰفِرِيْنَ ○ وَ كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ وَ اَنْتُمْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ اٰيٰتُ اللّٰهِ وَ فِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ﴾ (اٰل عمران:۱۰۰)

"اے مومنو! اگر تم اہل کتاب کے کسی گروہ کا کہا مانو گے تو وہ ایمان لا چکنے کے بعد تمہیں مرتد کر کے کافر بنا دیں گے اور تم کو کیونکر کفر کرنا چاہیے' درآں حالیکہ تم کو اللہ کی آیتیں سنائی جاتی ہیں اور تم میں اللہ کا رسول موجود ہے۔"

آیت کے آخری ٹکڑے سے ثابت ہوا کہ کفر سے بچانے والی دو مستقل چیزیں مسلمانوں کے پاس تھیں ایک تو آیاتِ الٰہی جو ان کو سنائی جاتی تھیں اور دوسری خود رسول کا مستقل وجود جو اپنی تعلیم و تلقین، فیضِ صحبت اور اثر سے ان کو بہکنے نہ دیتا اور ضلالت سے مانع آتا تھا' اگر صرف کتابِ الٰہی اس کام کو انجام دے سکتی' تو رسول کے ذکر کی حاجت' بلکہ خود بعثت کی ضرورت کیا تھی' اس سے یہ واضح ہوا کہ اللہ کی کتابِ صامت (قرآن) اس کی کتابِ ناطق (رسول) سے مل کر اپنے فریضہ کو انجام دیتی ہے اور غالباً اس حدیث صحیح کے بھی یہی معنی ہیں جس کا اعلان آپؐ نے حجۃ الوداع سے واپسی میں اپنی وفات سے کچھ مہینوں پہلے فرمایا:

﴿اِنِّیْ تَارِکٌ فِیْکُمَا الثَّقَلَیْنِ کِتَابُ اللّٰہِ وَ سُنَّتِیْ﴾

''مسلمانو! میں تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑے جاتا ہوں' اللہ کی کتاب اور اپنی سنت (یعنی اپنی عملی زندگی)''

ظاہر ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد آپؐ کا ظاہری وجود چھپ گیا' مگر آپؐ کی عملی زندگی جس کو سنت کہتے ہیں' قائم و باقی ہے اور وہ بھی قرآن کے بعد ہماری ہدایت کا دوسرا سرچشمہ ہے۔

تزکیہ

انبیا علیہم السلام کا عموماً اور آنحضرت ﷺ کا خصوصاً ایک اور امتیازی وصف تزکیہ ہے' تزکیہ کے معنی پاک و صاف کرنے کے ہیں' نبوتِ محمدیہ کے اس وصف کا ذکر ان آیتوں میں ہے جن میں آپ کی یہ توصیف کی گئی ہے' ایک رسول جو لوگوں پر خدا کی آیتیں تلاوت کرتا ہے اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور ان کو پاک و صاف کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ آپؐ کا یہ تیسرا وصف دو پہلے اوصاف سے الگ ہے' یہ پاک و صاف کرنا آیاتِ الٰہی کی تلاوت اور کتاب و حکمت کی تعلیم کے بعد نبی کی عملی کیفیت کو ظاہر کرتا ہے کہ آپؐ کی تعلیم و تربیت' فیضانِ صحبت' حسنِ اخلاق پند و موعظت اور تبلیغ و دعوت کی تاثیر سے برے اچھے' بد نیک اور اشرار اخیار بن جاتے ہیں۔

انبیاء علیہم السلام کی ہر تاریخ اس واقعہ کو ظاہر کرتی ہے کہ وہ بدکار اور گمراہ قوموں میں مبعوث ہوئے' ہر طرح کی اذیتیں اٹھائیں' تکلیفیں سہیں' مصیبتیں جھیلیں اور آخر تاریکی کو روشنی سے' جہالت کو علم سے اور کفر کو توحید سے بدل کر رہے اور مدت تک ان کی تاثیر کا فیض جاری رہا' ان کا یہ وصفِ تزکیہ وحی و الہام کے علاوہ ان کے جسم و جان اور زبان و دل کی کیمیا اثری کا نام ہے' خواہ ان کی زبان اس وقت وحیِ الٰہی سے مترنم ہو یا خاموش' ہر آن آفتابِ حق کی کرنیں مطلعِ نبوت سے نکل نکل کر دلوں کی سرزمین کو روشن کرتی رہتی تھیں۔

نور

اسی لئے نبوت کا سینہ صدق و صفاء کا آئینہ ہوتا ہے' نبی کا مجسم پیکر ظلمت کدۂ عالم کا چراغ اور علم و ہدایت کا مطلعِ نور ہوتا ہے جس طرح اس کا صحیفہ الہامی اور وحی ربانی نور ہوتی ہے' وہ خود بھی سراپا نور ہوتا ہے۔ جس سے

اندھے دیکھتے گمراہ راہ پاتے اوران کے طالب روشنی حاصل کرتے ہیں' خود آپ کومخاطب کرکے فرمایا گیا۔

﴿یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰکَ شَاهِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِیْرًا ۝ وَ دَاعِیًا اِلَی اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَ سِرَاجًا مُّنِیْرًا ۝﴾ (احزاب:۴۵'۴۶)

''اے نبی! ہم نے تجھ کو بتانے والا خوش خبری سنانے والا' چوکنا کرنے والا' خدا کی طرف اس کے حکم سے بلانے والا اور روشن کرنے والا چراغ بنا کر بھیجا۔''

یہ آس پاس کی چیزوں کو روشن کرنے والا چراغ خود رسول کی ذات ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر آپ کے جسم و جان' زبان و دل' خلق و عمل' علم و فہم میں روشنی نہیں تو آپ کی ذات جو ان ہی چیزوں کا مجموعہ ہے' روشن چراغ کیونکر ثابت ہوگی اور جب آپ کی ذاتِ مبارک کی یہ تمام چیزیں انوارِ الٰہی ہیں' تو ان انوار میں سے ہر نور کی روشنی میں چلنا ہدایت ہے اوران میں سے کسی سے قطع نظر کرنا بھی ظلمت کے ایک گوشہ میں قدم دھرنا ہے۔

آیات وملکوت کی رؤیت

جس طرح انبیاء علیہم السلام اپنی قوتِ سامعہ سے ندائے غیب کو سنتے اور صدائے وحی کی سماعت کرتے ہیں۔ اس طرح ان کی آنکھیں بہت کچھ دیکھتی ہیں جو عام انسان نہیں دیکھتے حضرت ابراہیمؑ کے ذکر میں ہے:

﴿وَ کَذٰلِکَ نُرِیْٓ اِبْرٰهِیْمَ مَلَکُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ لِیَکُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِیْنَ﴾ (انعام:۷۶)

''اور اسی طرح ہم ابراہیم کو آسمانوں اور زمین کی مملکت دکھاتے تھے تاکہ وہ یقین کرنے والوں میں ہو۔''

استعدادِ نبوت کی ترتیب اور نشو ونما کے لیے یہ رؤیت و بصیرت کی مافوق قوت ان کو عطا ہوئی' حضرت موسیٰ علیہ السلام کو طور پر جو کچھ نظر آیا وہ جلوہ گریِ حسن و عشق کی مشہور کہانی ہے' آنحضرت ﷺ کے مشاہداتِ روحانی کا تذکرہ معراج کے تعلق سے ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

﴿لِنُرِیَهٗ مِنْ اٰیٰتِنَا﴾ (بنی اسرائیل:۱)

''تاکہ ہم اس (رسول بندہ) کو اپنی نشانیاں دکھائیں۔''

دوسری جگہ ہے:

﴿مَا کَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰی ۝ اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰی مَا یَرٰی ۝ وَ لَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰی ۝﴾ (نجم:۱)

''دل جھوٹ نہیں بولا جو اس نے دیکھا' کیا اس پر اس سے جھگڑتے ہو؟ اور دوسری بار اس کو اترتے دیکھا۔''

﴿مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَ مَا طَغٰی لَقَدْ رَاٰی مِنْ اٰیَاتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰی﴾ (نجم:۱)

''نگاہ نہ بہکی اور نہ سرکش ہوئی' اس نے اپنے رب کی بڑی نشانیاں دیکھیں۔''

ایک اور مقام پر ہے:

﴿وَ لَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِیْنِ﴾ (تکویر:۲۳)

''اور اس نے یقیناً اس کو آسمان کے کھلے کنارے میں دیکھا۔''

یہ مشاہدۂ وحی والہام کے علاوہ نبوت کے دوسرے حاسۂ بصارت کے امتیاز کو ظاہر کرتا ہے.

سماعِ غیب

جس طرح آیات وملکوت کا مشاہدہ انبیا کے حاسۂ بصارت کا امتیازی وصف ہے' اسی طرح غیب کی آواز اور وحی کی صدا کو سننا بھی ان کے حاسۂ سماعت کا خصوصی امتیاز ہے۔ قرآن پاک میں اس کی تصریحات موجود ہیں کہ انبیاء خدا سے ہم کلام ہوتے تھے اور وحی کو پاتے تھے ﴿وَ كَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰی تَكْلِیْمًا﴾ (نساء:۱۶۴) ''اور خدا نے موسیٰ علیہ السلام سے بات کی۔''

حضور کو حکم ہوا:

﴿وَ لَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ یُّقْضٰۤی اِلَیْكَ وَحْیُهٗ﴾ (طٰہٰ:۱۱۴)

''اور اس سے پہلے کہ قرآن کی وحی تجھ پر پوری ہو' قرآن کے پڑھنے میں جلدی نہ کرو۔''

خدا نے پیغمبروں کو پکارا اور انہوں نے اس کی آوازیں سنیں ﴿نَادَیْنَا﴾ ہم نے پکارا' بار بار یہ مضمون قرآن میں پیغمبروں کے متعلق آئے ہیں۔

تبلیغ ودعوت

نبی کا سب سے پہلا اور اہم فرض تبلیغ اور دعوت ہے یعنی جو سچائی اس کو خدا سے ملی ہے اس کو دوسروں تک پہنچا دینا اور جو علم اس کو عطا ہوا ہے اس سے اوروں کو بہرہ ور کرنا' خدا کا جو پیغام اس تک پہنچا ہے وہ لوگوں کو سنا دینا اس نے اس کو جس صداقت سے آگاہ کیا ہے اس سے اپنے ہم جنسوں کو باخبر کرنا' جو مالی' جانی' زبانی' روحانی اور اخلاقی طاقتیں اس کو بخشی گئی ہیں' ان کو اس راہ میں صرف کرنا اور اس سمجھانے بجھانے اور راہِ راست پر لانے میں صداقت کی ہر تاثیر سے کام لینا' اس اعلان اور دعوت میں جو تکلیف بھی پیش آئے اس کو راحت جاننا' جو مصیبت بھی درپیش ہو اس کو آرام سمجھنا' جو کانٹے بھی اس وادی میں اس کے تلووں میں چبھیں' ان کو رگِ گل سمجھنا' اس حق کی آواز کو دبانے کے لیے جو قوت بھی سر اٹھائے اس کو کچل دینا' اور مال ومنال اہل وعیال' غرض جو چیز بھی اس سفر میں سنگِ راہ ہو کر سامنے آئے اس کو ہٹا دینا اور اس کی اس ساری کوشش کا مقصد خدا کی رضامندی' مخلوق کی خیر خواہی اور اپنے فرضِ رسالت کی ادائیگی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

یہ ہے انبیاء کی تبلیغ و دعوت کا مفہوم' دنیا میں جس قدر پیغمبر آئے انہوں نے اپنے فرض کو اسی ایثار و قربانی کے ساتھ انجام دیا اور ایک لمحہ بھی اپنے فرض کے ادا کرنے میں کوتاہی نہ کی اور آج دنیا میں جو کچھ خدا کی محبت' بھائیوں کا پیار' انسانوں کی ہمدردی بے کسوں کی مدد' غریبوں کی اعانت اور دوسری نیکیوں کا اس سطح زمین پر وجود ہے وہ سب بواسطہ یا بلا واسطہ' دانستہ یا نادانستہ انہی کی دعوت و تبلیغ اور جدوجہد کا اثر اور نتیجہ ہے۔

دنیا کے بڑے سے بڑے مفکر' بڑے سے بڑے شاعر' بڑے سے بڑے حکیم اپنا فرض خود سمجھ لینا یا زیادہ سے زیادہ دوسروں کو سمجھا دینا سمجھتے ہیں' لیکن انبیاء علیہم السلام جس صداقت کو پاتے ہیں' اس کو دوسروں کے سمجھانے اور ہر ممکن طریق سے اس کے پھیلانے اور اہل دنیا کو اس کے باور کرانے میں اپنی پوری قوت صرف کر دیتے ہیں' وہ ہر مشکل کو جھیل کر نافہموں کو حقیقت سمجھاتے اور اندھوں کو راہ راست دکھاتے ہیں۔

انبیاء علیہم السلام کی تعریف میں خدا فرماتا ہے:

﴿اَلَّذِیْنَ یُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللّٰهِ وَ یَخْشَوْنَهٗ وَ لَا یَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ حَسِیْبًا﴾ (احزاب:۳۹)

''جو اللہ کے پیغاموں کو پہنچاتے ہیں اور اسی سے ڈرتے ہیں اور اس کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے اور اللہ بس ہے حساب (اعمال) کے لیے۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوتا ہے:

﴿اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى﴾ (طٰہٰ:۲۴)

''فرعون کے پاس جا کہ اس نے سرکشی کی۔''

آنحضرت ﷺ کو حکم ہوتا ہے کہ پیغامِ ربانی کی بے محابا تبلیغ کریں اور دشمنوں سے نہ ڈریں کہ ان کی حفاظت کا خود شہنشاہِ دو عالم ذمہ دار ہے:

﴿یٰۤاَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ وَ اِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسٰلَتَهٗ وَ اللّٰهُ یَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ﴾ (مائدہ:۱۰)

''اے پیغمبر! تیرے رب کے پاس سے جو تیری طرف اترا ہے اس کو پہنچا دے اور تو نے نہ کیا تو اس کے پیغام کے پہنچانے کا فرض ادا نہیں کیا' اور اللہ تجھ کو لوگوں سے بچائے گا۔''

انبیا کی تبلیغ و دعوت میں تبشیر اور انذار دونوں ہوتے ہیں' تبشیر یعنی بشارت دینا اور خوش خبری سنانا اور انذار یعنی خدا کے جلال سے ڈرانا' عذابِ الٰہی کا خوف دلانا اور لوگوں کو ان کے انجامِ بد سے آگاہ کرنا' اور انبیا کی آمد اس شان سے اس لیے ہوتی ہے کہ خدا کی حجت بندوں پر تمام ہو جائے۔

﴿رُسُلًا مُّبَشِّرِیْنَ وَ مُنْذِرِیْنَ لِئَلَّا یَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ﴾ (نساء:۲۳)

''یہ سب پیغمبر خوش خبری سناتے اور ہشیار و بیدار کرتے ہوئے آئے تا کہ پیغمبروں کے آنے کے بعد

لوگوں کے لیے خدا پر کوئی حجت نہ رہے۔''

ان سب نے پیغامِ الٰہی پہنچانے کے ساتھ اپنی خیر خواہی' دل سوزی واخلاص مندی کا اعلان کیا۔

﴿اُبَلِّغُکُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّیْ وَ اَنَا لَکُمْ نَاصِحٌ اَمِیْنٌ﴾ (اعراف:۶۸)

''میں تم کو اپنے رب کے پیغام پہنچاتا ہوں اور میں تمہارا' امانت دار خیر خواہ ہوں۔''

﴿یٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُکُمْ رِسَالَةِ رَبِّیْ وَ نَصَحْتُ لَکُمْ وَ لٰکِنْ لَّا تُحِبُّوْنَ النّٰصِحِیْنَ﴾ (اعراف:۷۹)

''اے میرے لوگو! میں نے اپنے رب کا پیام تم کو پہنچا دیا' اور تمہاری خیر خواہی کر چکا لیکن تم خیر خواہوں کو پیار نہیں کرتے۔''

﴿یٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُکُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّیْ وَ نَصَحْتُ لَکُمْ فَکَیْفَ اٰسٰی عَلٰی قَوْمٍ کٰفِرِیْنَ﴾ (اعراف:۹۳)

''اے میرے لوگو! میں نے اپنے رب کے پیام تم کو پہنچا دیے اور تمہاری خیر خواہی کر چکا تو پھر کیسے نہ ماننے والے لوگوں پر غم کھاؤں۔''

یہ بھی فرمایا کہ

﴿لَآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْهِ اَجْرًا اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَی الَّذِیْ فَطَرَنِیْ﴾ (ہود:۵۱)

''میں اپنی نصیحت کی تم سے مزدوری نہیں مانگتا' میری مزدوری تو اس پر ہے جس نے مجھ کو پیدا کیا۔''

﴿لَآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْهِ مَالًا اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَی اللّٰهِ﴾ (ہود:۲۹)

''میں اپنی تبلیغ کے بدلہ تم سے مال و دولت کا خواہاں نہیں ہوں میری مزدوری تو خدا پر ہے۔''

ایک شبہ کا ازالہ

اس سلسلہ میں ہم کو ایک اور غلط فہمی کو دور کرنا ہے جو بعضوں کو حضور کی صفتِ تبلیغ کے سمجھنے میں پیش آئی ہے قرآن مجید میں متعدد آیتیں اس معنی کی آئی ہیں کہ رسول کا فرض صرف پیغام پہنچا دینا (ابلاغ) ہے۔ اس سے آج کل کے بعض کوتاہ بینوں کو یہ دھوکا ہوا کہ رسول کا فرض وحیِ الٰہی کی تبلیغ ہے۔ یعنی قرآن پاک کے الفاظ کو بعینہٖ انسانوں تک پہنچا دینا اس کا کام ہے۔۔۔۔۔ اس کے معانی کی تشریح اور مطالب کی توضیح نہ اس کا منصب ہے نہ اس کا اس کو حق ہے۔ ان کے نزدیک مبلغ رسول کی حیثیت صرف ایک قاصد اور نامہ بر کی ہے جو ایک جگہ خط تو پہنچا دیتا ہے مگر اس خط کے مفہوم و معنی کی تشریح کا اس کو حق نہیں ہوتا' بلکہ اس کو یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ اس بند لفافہ میں کیا ہے۔

شاید ان کو یہ دھوکا اس آیت کے علاوہ لفظ رسول سے بھی ہوا ہے جس کے لفظی معنی پیغامبر اور قاصد کے ہیں'

لیکن وہ لوگ یہ خیال نہیں کرتے کہ جہاں اس کو رسول کہا گیا ہے ''نبی'' (خبر پانے والا) بھی تو کہا گیا ہے۔ مبشر (خوش خبری سنانے والا) نذیر (ڈرانے والا) سراج منیر (روشن کرنے والا چراغ) صاحب حکمت' صاحبِ خُلقِ عظیم' صاحبِ مقامِ محمود' مجتبیٰ (مقبول) مصطفیٰ (برگزیدہ) مبین (بیان اور شرح کرنے والا) معلم (سکھانے والا) مزکی (پاکی وصاف کرنے والا) داعی الی اللہ (اللہ کی طرف بلانے والا) حاکم (فیصلہ کرنے والا) مطاع (واجب الاطاعۃ) آمر (حکم دینے والا) اور ناہی (روکنے والا) بھی تو کہا گیا ہے کیا یہ اوصاف والقاب اس کی اسی حیثیت کو ظاہر کرتے ہیں کہ وہ صرف ایک پیغام پہنچانے والا قاصد ہے جس کو اصل پیغام کے مفہوم ومعنی سے ایک معمولی قاصد اور نامہ بر کی طرح کوئی سروکار نہیں اس کے پیغام کے مفہوم ومعنی کی تشریح وتفسیر کا آج تو ہر عربی داں کو حق حاصل ہے اور اس کی اصل حقیقت تک پہنچ جانے کا ہر مدعی کو دعویٰ ہے' مگر خود صاحبِ پیغام کو اپنی پیغامبری کے وقت نہ مفہوم ومعنی کا علم تھا اور نہ اس کی تشریح کا اس کو حق تھا۔ ﴿اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ عُجَابٌ﴾ ہم نے پچھلے صفحات میں جو کچھ لکھا ہے اس سے اس غلط خیال کی پوری تردید ہو جاتی ہے۔

ان کے اشتباہ کی ایک اور وجہ یہ ہے کہ اسلام میں شرع اور وضعِ قانون کا حق صرف اللہ تعالیٰ کے لیے تسلیم کیا گیا ہے کہ وہی اصلی شارع ہے۔ اب اگر رسول کے لیے بھی وحیِ کتابی سے الگ شرع بنانے کا حق تسلیم کیا جائے تو خدا کے سوا ایک اور شارع تسلیم کرنا ہوگا۔ اس کا پہلا جواب تو یہ ہے کہ ہم رسول کو شارع نہیں شارح قرار دیتے ہیں' کیا عدالت کی کرسی پر بیٹھ کر جج جب حکومت کے قانون کی توضیح وتشریح کرتا ہے' تو وہ اپنے اس عمل سے سلطانِ وقت بن کر واضعِ قانون کا منصب حاصل کرتا ہے یا صرف قانون کے مفہوم کا شارح ہوتا ہے؟ یہی حیثیت آسمانی عدالت کے اس قاضی کی ہے جس کو ہم نبی اور رسول اور معلم اور مبین کہتے ہیں۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے ہر پیام اور مقصد اور مفہوم اور فیصلہ سے صرف وحی کے اسی طریقۂ خاص کے ذریعہ اپنے پیغمبر کو مطلع نہیں فرماتا جس طریقِ خاص سے قرآن مجید نازل ہوا ہے بلکہ وہ اپنی تینوں قسموں کے ذریعہ سے اپنے اغراض اس رسول پر واضح کرتا ہے اور ان میں سے ہر طریق کی وحی کی اطاعت تمام امت پر فرض ہے' خواہ وہ وحی ہو' جو الفاظِ الٰہی کی قید کے ساتھ آئی ہو' جس کو قرآن کہتے ہیں' یا ربانی مفہوم ومعنی رسول کے الفاظ میں ادا ہوں' جس کو حدیث وسنت کہتے ہیں' الغرض خواہ وہ کتابِ الٰہی کے ذریعہ سے ہو یا حکمتِ ربانی کے فیض سے ہو۔

قرآن مجید کی وہ آیتیں جن کے معنی یہ ہیں کہ ہمارے رسول پر صرف پیغام پہنچانا ہے' ان کا یہ منشا نہیں کہ وہ صرف پیغام پہنچانے والا ہے' خوش خبری سنانے والا نہیں' ہشیار و بیدار کرنے والا نہیں' پیغامِ الٰہی کے الفاظ سنانے کے بعد ان کی تعلیم دینے والا نہیں' آیاتِ الٰہی کی تبیین کرنے والا نہیں' رہنما و ہادی نہیں۔ نجاستوں سے پاک و صاف کرنے والا نہیں' ایسا کہنا قرآن کا انکار اور عقل وفہم کا ماتم ہے' قرآن میں کئی جگہ ہے:

﴿اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرٌ﴾ (صٓ: الرعد۔ نازعات)

''تو تو صرف ڈر سنانے والا ہے۔''

ایک جگہ ہے۔

﴿اِنَّمَآ اَنَا مُنْذِرٌ﴾ (صٓ :۷۸)

''میں تو صرف ڈر سنانے والا ہوں۔''

۱ کیا ان آیتوں کا مفہوم یہی ہے کہ ڈر سنانے کے سوا' رسول کا کام بشارت اور خوش خبری سنانا نہیں اور وہ صرف منذر ہے مبشر نہیں' اصل یہ ہے کہ اس قسم کی آیتوں۔

﴿اَنَّمَا عَلٰی رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ﴾ (مائدہ:۹۲)

''ہمارے رسول پر صرف پیغام پہنچا دینا ہے۔''

کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ وہ صرف پیغام رساں اور قاصد ہے مبین اور شارح نہیں بلکہ یہ ہے کہ اس کا کام صرف خدا کا پیغام پہنچا دینا ہے' زبردستی لوگوں کے دلوں میں اس پیغام کا اِتار دینا نہیں' بزور لوگوں کو مسلمان بنا دینا نہیں' جبراً منوالینا نہیں' اور نہ پیغام پہنچا دینے کے بعد لوگوں کے کفر و انکار اور عدمِ ایمان کی ذمہ داری اس پر ہے۔ قرآن میں جہاں جہاں اس معنی کی آیتیں آئی ہیں ان کا منشا یہی اور صرف یہی ہے۔ قرآن پاک کی تیرہ مختلف آیتوں میں یہ بات کہی گئی ہے اور ہر جگہ یہی ایک مفہوم ہے۔

﴿وَ قُلْ لِّلَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ وَ الْاُمِّیّٖنَ ءَ اَسْلَمْتُمْ فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا وَ اِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَیْکَ الْبَلٰغُ وَ اللّٰهُ بَصِیْرٌۢ بِالْعِبَادِ﴾ (ال عمران:۲۰)

''کتاب والوں اور ان پڑھوں سے کہہ دے کیا تم نے اسلام قبول کیا' اگر کیا تو ہدایت پائی اور اگر منہ پھیرا تو تجھ پر (اے رسول) صرف پیام پہنچانا ہے اور اللہ بندوں کا دیکھنے والا ہے۔''

مفہوم بالکل صاف ظاہر ہے کہ اسلام کی ہدایت قبول کرنے میں کوئی زبردستی نہیں۔ اگر لوگ قبول کریں تو انہوں نے حق کی راہ پائی اور اگر انکار کریں تو رسول کا کام صرف پیغام پہنچا دینا تھا' وہ اس نے پہنچا دیا' اس کا فرض ادا ہو چکا' اب خدا جانے اور اس کے بندے جانیں۔

﴿فَاِنَّمَا عَلَیْکَ الْبَلٰغُ وَ عَلَیْنَا الْحِسَابُ﴾ (الرعد:۴۰)

''تو تیرا فرض صرف پیغام پہنچا دینا ہے اور ہمارا فرض ان سے حساب لینا ہے۔''

﴿فَذَکِّرْ اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَکِّرٌ ○ لَسْتَ عَلَیْهِمْ بِمُصَیْطِرٍ ○ اِلَّا مَنْ تَوَلّٰی وَ کَفَرَ ○ فَیُعَذِّبُهُ اللّٰهُ الْعَذَابَ الْاَکْبَرَ ○ اِنَّ اِلَیْنَآ اِیَابَهُمْ ○ ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا حِسَابَهُمْ ○﴾ (الغاشیہ)

''تو (اے پیغمبر!) تو نصیحت کر' تو تو صرف نصیحت کرنے والا ہے ان پر داروغہ نہیں لیکن جس نے منہ پھیرا اور انکار کیا تو خدا اس کو بڑی سزا دے گا' بے شک پھر ہماری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے اور ہمیں پر ان کا حساب ہے۔''

یہی مفہوم سورۂ شوریٰ میں ہے کہ رسول کا کام صرف سمجھانا اور تبلیغ کرنا ہے' وہ سلطان' کارفرما اور فرماں روا بنا کر نہیں بھیجا گیا کہ لوگوں سے بزور اپنی بات منوالے:

﴿فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَمَآ اَرْسَلْنَاکَ عَلَیْهِمْ حَفِیْظًا اِنْ عَلَیْکَ اِلَّا الْبَلٰغُ﴾ (الشوریٰ:۴۸)

''تو اگر وہ انکار کریں تو ہم نے تجھ کو ان پر نگہبان بنا کر نہیں بھیجا تیرا کام صرف پہنچا دینا ہے۔''

کافروں نے جب کبھی رسولوں کو جھٹلایا' انہوں نے یہی کہا کہ ہمارا کام پہنچا دینا ہے' ماننے نہ ماننے کا تمہیں اختیار ہے۔

﴿قَالُوْا مَآ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا وَ مَآ اَنْزَلَ الرَّحْمٰنُ مِنْ شَیْءٍ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَکْذِبُوْنَ ○ قَالُوْا رَبُّنَا یَعْلَمُ اِنَّآ اِلَیْکُمْ لَمُرْسَلُوْنَ ○ وَ مَا عَلَیْنَآ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ ○﴾ (یٰسٓ:۱۵۔۱۷)

''کافروں نے کہا تم تو ہماری ہی طرح آدمی ہو' خدا نے کچھ نہیں اتارا تم جھوٹ کہتے ہیں' رسولوں نے کہا ہمارا پروردگار خوب جانتا ہے کہ ہم بے شبہ تمہاری طرف بھیجے گئے ہیں اور ہمارا فرض صرف کھول کر پہنچا دینا ہے۔''

خود اللہ تعالیٰ نے بھی رسولوں کو تسلی دی ہے کہ ان منکروں کے انکار سے دل شکستہ نہ ہوں' اگلے پیغمبروں کے منکروں نے بھی یہی کیا تھا' پیغمبروں کا فرض لوگوں سے منوانا نہیں بلکہ ان تک خدا کا پیغام پہنچانا ہے۔

﴿وَ قَالَ الَّذِیْنَ اَشْرَکُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا عَبَدْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَیْءٍ نَّحْنُ وَ لَآ اٰبَآؤُنَا وَ لَا حَرَّمْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَیْءٍ کَذٰلِکَ فَعَلَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَهَلْ عَلَی الرُّسُلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ﴾ (النحل:۳۵)

''اور مشرکوں نے کہا' اگر خدا چاہتا تو ہم اس کے سوا کسی اور کو نہ پوجتے' نہ ہم اور نہ ہمارے باپ دادا' اور نہ اس کے حکم کے بغیر کسی چیز کو حرام کرتے (خدا کہتا ہے) کہ ایسا ہی کیا تھا ان کے پہلوں نے' تو ہمارے پیغمبروں پر کھول کر پہنچا دینے کے سوا کچھ ہے۔''

﴿وَ اِنْ تُکَذِّبُوْا فَقَدْ کَذَّبَ اُمَمٌ مِّنْ قَبْلِکُمْ وَ مَا عَلَی الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ﴾ (العنکبوت:۱۸)

''اگر تم جھٹلاؤ تو (کیا ہے) تم سے پہلے بھی قومیں جھٹلا چکی ہیں' اور رسول پر نہیں لیکن کھول کر پہنچا دینا۔''

رسول کا کام پہنچا دینا ہے' باقی علام الغیوب جو چاہے سو کرے۔

﴿مَا عَلَی الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ وَ اللّٰهُ یَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَ مَا تَکْتُمُوْنَ﴾ (المائدۃ:۹۹)

''رسول پر نہیں ہے لیکن پہنچا دینا' اور اللہ جانتا ہے جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو چھپاتے ہو۔''

بقیہ آیتیں حسب ذیل ہیں جو ایک ہی مفہوم کو ادا کرتی ہیں۔

﴿وَ اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاحْذَرُوْا فَاِنْ تَوَلَّیْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا عَلٰی رَسُوْلِنَا

الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ﴾ (المائدۃ:۹۲)

''اور اللہ کا فرماں اور رسول کی بات مانو اور بچو اور اگر تم نے منہ پھیرا تو جان لو کہ ہمارے رسول پر صرف کھول کر پہنچا دینا ہے۔''

﴿قُلْ اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَیْهِ مَا حُمِّلَ وَ عَلَیْكُمْ مَا حُمِّلْتُمْ وَ اِنْ تُطِیْعُوْهُ تَهْتَدُوْا وَ مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ﴾ (النور:۵۴)

''کہہ دے اے پیغمبر! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو پھر اگر وہ منہ پھیریں تو رسول پر وہ ہے جس کا بوجھ اس پر ہے اور تم پر وہ ہے جس کا بوجھ تم پر ہے اور اگر اس کی اطاعت کرو گے تو ہدایت پاؤ گے اور رسول پر نہیں لیکن کھول کر پہنچا دینا۔''

﴿كَذٰلِكَ یُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَیْكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْلِمُوْنَ ○ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَیْكَ الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ○﴾ (النحل:۱۱)

''اسی طرح اللہ تم پر اپنا احسان پورا کرے گا تا کہ تم مسلمان ہو جاؤ اور اگر انہوں نے منہ پھیرا تو تجھ پر کچھ نہیں ہے مگر کھول کر پہنچا دینا۔''

﴿وَ اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ فَاِنْ تَوَلَّیْتُمْ فَاِنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ﴾ (التغابن:۱۲)

''اور خدا کا کہا مانو اور رسول کی فرمان برداری کرو۔ اگر تم نے منہ پھیرا تو ہمارے رسول پر صرف کھول کر پہنچا دینا ہے۔''

پیغمبر کا قول ہے:

﴿فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ مَّآ اُرْسِلْتُ بِهٖٓ اِلَیْكُمْ﴾ (ہود:۵۷)

''تو اگر تم منہ پھیرو تو میں جو پیام دے کر تمہارے پاس بھیجا گیا تھا وہ میں نے تم کو پہنچا دیا (یعنی میرا فرض ختم ہو چکا)۔''

ان تمام آیتوں کا تعلق نبوت کے منکروں سے ہے یہاں یہ نکتہ بھی لحاظ کے قابل ہے کہ جو لوگ ہنوز نبوت کے منکر ہوں ان سے رسول کا تعلق صرف تبلیغ و نصیحت' پند و موعظت اور سمجھانے کا ہے لیکن جو خوش قسمت اقرارِ نبوت کی سعادت حاصل کر لیں تو پھر ان کا تعلق رسول سے اتباع و پیروی اور اطاعت کا ہو جاتا ہے اور اس کے بعد رسول ان کو تبلیغ ہی نہیں بلکہ امر و نہی بھی کرتا ہے کوئی حکومت دوسرے ملک کے باشندے کو زبردستی اپنی رعایا نہیں بناتی' لیکن اگر کوئی شخص از خود اس حکومت کی رعایا بن جائے تو پھر اس کو اس کے قانون کی پیروی پر بزور مجبور کیا جائے گا کہ رعایا بننے کے معنی ہی اس کے قانون کے قبول کرنے کے ہیں۔

انبیا کی تعلیم کا امتیازی نتیجہ

دنیا میں جس قدر پیغمبر آئے وہ ایک ہی دین اور ایک ہی عقیدہ لے کر آئے' وہی توحید' وہی نبوت' وہی عبادت' وہی اخلاق' وہی جزا وسزا اور عمل کی پرسش' اس لحاظ سے انبیا کی تعلیم میں کوئی اصولی فرق نہیں' اس لیے فرمایا کہ ﴿شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا﴾ (الٰایتہ) یعنی خدا نے تمہارے لیے وہی دین مشروع کیا جو نوحؑ وغیرہ دوسرے پیغمبروں کو دیا تھا اور اسی کا نام اسلام ہے' لیکن انبیا کی تعلیم کا اہم الاصول اور سب سے ضروری جز توحید ہے اور وہی نبوت کے ساز کا اصلی اور ازلی ترانہ ہے۔

ممکن ہے کہ دنیا میں اسلام سے پہلے بہت سے اچھے لوگ گزرے ہوں اور ان کی دعوت بھی مفید ہو' ان کے اخلاقی وعظ بھی دل پسند ہوں' وہ یونان کے حکیم ہوں یا ہندوستان کے اوتار لیکن ان کی تعلیم میں اگر توحید کی دعوت شامل نہیں تو وہ نبوت کے رتبہ کے قابل نہیں کہ پیغمبرانہ تعلیم کی پہچان ہی توحید کی دعوت ہے' اگر یہ نہیں تو نبوت بھی نہیں فرمایا:

﴿وَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنَ﴾ (الانبیاء: ۲۵)

''اور ہم نے تجھ سے پہلے کوئی رسول نہیں بھیجا لیکن اس کو یہ وحی کی کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں' میری ہی پرستش کرو۔''

﴿وَ لَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ﴾ (النحل:۳۶)

''اور ہر قوم میں ہم نے ایک رسول بھیجا کہ خدا کی عبادت کرو اور بتوں سے پرہیز کرو۔''

اس سے معلوم ہوا کہ تعلیمی حیثیت سے نبوت کی شناخت اسی سے ہو سکتی ہے اسلام سے پہلے جس مدعیِ نبوت کی تبلیغ کا اہم ترین جز وتوحید نہیں' اس کو دعوائے نبوت کا کوئی حق نہیں۔

نبوت کی غرض وغایت

انبیاء علیہم السلام کی آمد کی غرض وغایت کو شاعرانہ زبان اور خطیبانہ جوشِ بیان میں بہت کچھ بتایا جا سکتا ہے لیکن یہاں مقصود یہ ہے کہ ان اغراض کو گنایا جائے جو محمد رسول اللہ ﷺ کی وحیِ مبارک کی زبان سے ادا ہوئے ہیں' اصل دعویٰ وہی ہے جس کو مدعی ظاہر کرتا ہو نہ کہ گواہ۔

انبیا کی بعثت کی سب سے پہلی غرض اس روزِ الست کے بھولے ہوئے ازلی عہد و پیمانِ بندگی کی یاددہانی ہے:

﴿وَ اِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَ اَشْهَدَهُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى شَهِدْنَا اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيَامَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ﴾ (الاعراف:

۱۷۲)

''اور جب تیرے رب نے بنی آدم کی پیٹھوں سے ان کی نسلوں سے عہد لیا اور ان کو خود اپنے اوپر آپ گواہ کیا کہ کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں' انہوں نے کہا کیوں نہیں تو ہے' ہم نے گواہی دی کہ قیامت کے دن یہ نہ کہو' ہم اس کو بھول گئے تھے۔''

اس لیے ضرور ہوا کہ ان کو موقع بموقع ان کا یہ وعدہ یاد دلایا جائے۔

یہی وجہ ہے کہ رسول کی بعثت کی ایک غرض یہ بھی بتائی گئی ہے کہ اس کا وجود بنی آدم پر اتمامِ حجت ہے' ممکن ہے کہ آدم کے فرزند یہ بجا عذر کریں کہ ہمارے پاس کوئی یاد دلانے والا نہیں آیا اس لیے فرمایا:

﴿رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ﴾ (نساء:۱۶۵)

''رسول خوش خبری سنانے والے اور ڈرانے والے تا کہ رسولوں کی آمد کے بعد لوگوں کے لیے خدا پر کوئی حجت باقی نہ رہے۔''

تذکیر کے بعد نبی کا فرضِ اولین ہدایت اور رہنمائی ہے کہ وہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کی صفت ہادی کا مظہر اور مورد ہے اسی لیے ایک آیت میں نبی اور رسول کے لیے ہادی کا لفظ آیا ہے' فرمایا:

﴿وَ لِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ﴾ (الرعد:۷)

''اور ہر قوم کے لیے ایک راہ دکھانے والا آیا۔''

سورۂ شوریٰ میں فرمایا:

﴿وَ اِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ﴾ (شوریٰ:۵۲)

''اور تو اے پیغمبر سیدھی راہ دکھاتا ہے۔''

سورۂ انبیاء میں بہت سے پیغمبروں کے ذکر کے بعد ہے:

﴿وَ جَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا﴾ (انبیاء:۷۳)

''اور ہم نے ان پیغمبروں کو ایسا پیشوا بنایا جو ہمارے حکم سے راہ دکھاتے تھے۔''

اسی طرح ان آسمانی کتابوں کو جو ان کو دی گئی تھیں بار بار ہدی (ہدایت) کہا گیا ہے اور کہیں ان کو ضیا اور نور (روشنی) کے الفاظ سے یاد کیا گیا ہے۔

اس ہدایت و رہنمائی کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ وہ بندگانِ الٰہی کو باطل کے اندھیرے سے نکال کر حق کی روشنی میں لاتے ہیں۔ لوگ جب فاسد خیالات' بے ہودہ افکار' بے سود اعمال کی تاریکیوں میں پھنس کر فطری بصیرت اور روحانی معرفت کے نور سے محروم ہو جاتے ہیں' انبیا ان اندھوں کے ہاتھ پکڑ کر ان کو ظلمات سے انوار میں لاتے ہیں' ان کو شک کی جگہ یقین' جہل کی جگہ علم' باطل کی جگہ حق اور ظلمت کے بجائے نور عطا کرتے ہیں۔

﴿هُوَ الَّذِیْ یُنَزِّلُ عَلٰی عَبْدِهٖۤ اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ لِّیُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ﴾ (الحدید: ۹)

''وہی اللہ جو اپنے بندہ پر کھلی آیتیں اتارتا ہے تا کہ وہ تم کو تاریکیوں سے نور میں لائے۔''

اس دنیا کی نجات صرف اعتدال میں ہے' جب کبھی مزاجِ انسانی کی طرح اس کے ان عناصر میں جن سے اس کی ترکیب ہوئی ہے افراط وتفریط پیدا ہوگی' روئے زمین پر فساد رونما ہوگا' انسانی جماعتوں اور قوموں میں بھی یہ ترازو جب اعتدال کے معیار پر پوری نہ ہوگی کبھی دونوں پلے برابر نہ ہوں گے' آسمان سے زمین تک ایک ایک ذرہ اعتدال کی ترازو میں تلا ہوا ہے کیمسٹری اور علم الفلک کا واقفِ کار اس ترازو کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے اور حیرت کرتا ہے کہ کہیں ایک ذرہ کی کمی بیشی نہیں ہے جس طرح اس مادی دنیا میں یہ حیرت انگیز توازن ہے ٹھیک اسی طرح روحانی اور اخلاقی دنیا میں بھی اس توازن کی ضرورت ہے۔ عقائد ہوں کہ عبادات' اخلاق ہوں کہ معاملات اسی توازن کا نام حق اور عدل ہے۔ فرمایا:

﴿وَ السَّمَآءَ رَفَعَهَا وَ وَضَعَ الْمِیْزَانَ ۝ اَلَّا تَطْغَوْا فِی الْمِیْزَانِ ۝ وَ اَقِیْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَ لَا تُخْسِرُوا الْمِیْزَانَ ۝﴾ (الرحمٰن: ۷'۹)

''اور آسمان کو اونچا کیا اور ترازو رکھی کہ اس ترازو میں کمی بیشی نہ کرو اور تول کو ٹھیک رکھو اور ترازو کو گھٹاؤ نہیں۔''

یہ توازن اور برابر تول جو بے ارادہ اور بے اختیار دنیا کے ذرہ ذرہ اور اس کی ایک ایک حرکت اور ایک ایک کام میں خالقِ فطرت کے اندازہ اور تقدیر سے قائم ہے یہی توازن اور برابر کی تول رسولوں کے ذریعہ آئی ہوئی میزانِ شریعت کے مطابق ذی ارادہ اور خود اختیار انسانوں کی ایک ایک حرکت اور ایک ایک جنبش میں ہونی چاہیے۔ بے ارادہ دنیا کی میزان کا نام قانونِ فطرت ہے' اور بالارادہ دنیا کی میزان کا نام قانونِ شریعت ہے' بے ارادہ دنیا کا نظامِ عدل اسی خدائی میزان فطرت سے چل رہا ہے اگر اس میزان میں ایک ذرہ بھی کمی بیشی ہو جائے تو عالم کا نظام درہم برہم ہو جائے' اسی طرح انسانی دنیا کی سکینت' طمانیت اور امن وامان کا نظام اسی میزانِ شریعت کے ذریعہ قائم ہو سکتا ہے اگر یہ نہ ہو تو اس کے نظام کا درہم برہم ہونا بھی لازمی ہے۔ فرمایا:

﴿لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَ اَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِیْزَانَ لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ﴾ (الحدید: ۲۵)

''ہم نے بے شبہ اپنے پیغمبروں کو کھلی دلیلیں دے کر بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان اتاری تا کہ لوگ عدل کو قائم کریں۔''

انبیا کی بعثت کی یہ غرض وغایت کہ لوگ شریعت کی میزان کے مطابق عدل اور توازن کو قائم رکھیں' اس موجودہ دنیا ہی کے نظام کی امن وسلامتی کے لیے ہے' آج یورپ کے اتحاد کی گونج نے دنیا کے گوشہ گوشہ کو پرشور بنا

دیا ہے' آج رسولوں کی اہمیت اوران کی تعلیمات کی ضرورت پر شکوک وشبہات کی ژالہ باری ہورہی ہے لیکن وہمی و خیالی مباحث سے قطع نظر کر کے عملی حیثیت سے دنیا کی ایک ایک آبادی کا جائزہ لو' آج جہاں کہیں بھی سچائی کی روشنی اور حقیقت کی کوئی کرن چمکتی ہے وہ اسی مطلعِ خورشید سے چھن کر نکلی ہے کوئی دیندار ہو یا ملحد' خوش عقیدہ ہو یا بے عقیدہ' یونان کا حکیم ہو یا افریقہ کا جاہل' یورپ کا متمدن ہو یا صحاری کا وحشی' رومی ہو یا زنگی' عیسوی ہو یا موسوی' بت پرست ہو یا موحد' مجوسی ہو یا ہندو' مسلم ہو یا غیر مسلم' شہری ہو یا دیہاتی' ہمالیہ کی چوٹی پر آباد ہو یا زمین کی گہرائی میں کہیں بھی کوئی بھی ہو اگر وہ اللہ کے نام کی عظمت سے واقف ہے اور نیکی اور بدی کی تمیز سے آشنا ہے تو وہ خدائی رسولوں اور ربانی پیغمبروں کے علاوہ کس معلم کی کوششوں کا ممنون ہے' آج جہاں بھی عدل ومیزان کا وجود ہے وہ کسی یونانی حکیم یا یوروپین فلاسفر کی تعلیم وتصنیف اور تقریر وخطبہ کا اثر نہیں ہے بلکہ طبقۂ انبیا ہی کے بے واسطہ یا بواسطہ تعلیمات کا نتیجہ ہے۔ آج دنیا کے گوشہ گوشہ میں کیسے ہی بدترین مبلغ سہی' مگر نیکی' عدل' احسان' ہمدردی' نیکو کاری' حسنِ خلق کی تعلیم' تبلیغ اور دعوت ان ہی کی زبانوں سے ہورہی ہے جو رسولوں کے پیرو اور پیغمبروں کے تابع ہیں جو عقیدہ کے ملحد ہیں ان کی بھی نیکوکاری ان ہی پیغمبروں کے نادانستہ فیضانِ تعلیم کا نتیجہ ہے' اس بنا پر جو لوگ ذہنی طور پر پیغمبروں کے منکر ہیں وہ بھی عملی طور سے ان کی تعلیم کے مقر اور معترف ہیں' اس لیے انبیا کا وجود تمام دنیا کے لیے رحمت بن کر ظاہر ہوا ہے اور قرآن نے آسمانی کتابوں کو بار بار ﴿رَحْمَةً وَّ هُدًى﴾ رحمت اور رہنمائی کی غرض سے بھیجنے کا جو اعلان کیا ہے وہ تمام تر اسی غرض وغایت کی تشریح ہے اور اسی لیے خاتمِ نبوت محمد رسول اللہ ﷺ کی ذات والا صفات تمام عالم کے لیے رحمت بن کر آئی۔ خدا نے فرمایا:

﴿وَ مَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِیْنَ﴾ (الانبیاء:۱۰۷)

''اور ہم نے تجھ کو (اے محمد ﷺ) تمام دنیا کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔''

تائید ونصرت

انبیاء علیہم السلام جو مقصد لے کر آتے ہیں' خواہ کسی قدر مشکلات پیش آئیں' کتنی ہی رکاوٹیں ہوں' کتنی ہی تکلیفوں اور زحمتوں کا سامنا ہو' بالآخر وہ مقصد کامیاب ہی ہوتا ہے' پیغمبروں کی سیرت اوران کی دعوت کی تاریخ خود اس دعویٰ پر گواہ صادق ہے' قرآن نے کہا:

﴿وَ لَقَدْ سَبَقَتْ کَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِیْنَ ○ اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ○ وَ اِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغَالِبُوْنَ﴾ (الصّٰفّٰت:۱۷۱'۱۷۳)

''اور ہماری بات اپنے رسول بندوں کے لیے پہلے ہی طے ہو چکی ہے کہ یقیناً انہی کی مدد ہوتی ہے اور ہمارا ہی لشکر غالب ہوتا ہے۔''

نہ صرف اس دنیا میں بلکہ حشر کے دن بھی انہی کو اوران کے ذریعہ اہلِ ایمان کو کامیابی ہوگی۔

﴿اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَ یَوْمَ یَقُوْمُ الْاَشْھَادُ ○ یَوْمَ لَا یَنْفَعُ الظّٰلِمِیْنَ مَعْذِرَتُھُمْ وَ لَھُمُ اللَّعْنَۃُ وَ لَھُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ ○﴾ (المؤمن:۵۱،۵۲)

''بے شبہ ہم اپنے رسولوں کی اور ایمان والوں کی مدد اس دنیا میں کرتے ہیں اور اس دن بھی جب گواہ کھڑے ہوں گے جس دن گنہگاروں کو ان کے بہانے کام نہ دیں گے ان پر پھٹکار ہوگی اور ان کے لیے برا گھر ہوگا۔''

پیغمبروں پر ایسے بھی سخت وقت آتے ہیں' جب ان کو اپنی قوم کے قبولِ ہدایت کی طرف سے پوری مایوسی ہو جاتی ہے اور امید کی روشنی کسی طرف سے دکھائی نہیں دیتی اور عذاب میں دیر ہونے کے سبب ان کے منکر یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ ان کو عذاب کی دھمکی جھوٹ دی گئی تو دفعتاً امید کا دروازہ کھلتا ہے اور خدا کی تائید و نصرت کے پرے اس طرح آتے دکھائی دیتے ہیں کہ صالح لوگوں کے دل قبول کے لیے کھول دیے جاتے ہیں اور معاندوں پر کسی نہ کسی طرح عذاب آ کر ان کا استیصال ہو جاتا ہے۔ فرمایا:

﴿حَتّٰٓی اِذَا اسْتَایْئَسَ الرُّسُلُ وَ ظَنُّوْٓا اَنَّھُمْ قَدْ کُذِبُوْا جَآءَ ھُمْ نَصْرُنَا﴾ (یوسف:۱۱۰)

''یہاں تک کہ پیغمبروں کو اپنی قوم کے ایمان سے مایوسی ہونے لگی اور ان کے منکروں کو یہ خیال ہونے لگا کہ ان سے جھوٹ کہا گیا تو ہماری مدد آ گئی۔''

اللہ تعالیٰ کی اسی تائید و نصرت اور حفاظتِ دعوت کا یہ یقین ان کو ہوتا ہے کہ وہ ہر مشکل کو اس راہ میں جھیل لیتے ہیں اور اپنے سروں کو ہتھیلیوں پر لیے پھرتے ہیں' مخالفوں کی فوج و لشکر' تیغ و خنجر اور خوف و خطر کے باوجود اپنی دعوت و تبلیغ کے فریضہ سے باز نہیں آتے اور کسی دام پر بھی مخالفوں سے صلح پر آمادہ نہیں ہوتے' منکروں کو شروع شروع میں ان کی ظاہری بیچارگی اور تنہائی کو دیکھ کر' ان کی ناکامی کا گمان ہوتا ہے' لیکن اللہ تعالیٰ ان کے سوءِ ظن کی تردید کر کے فرماتا ہے:

﴿فَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰہَ مُخْلِفَ وَعْدِہٖ رُسُلَہٗ﴾ (ابراہیم:۴۷)

''سو مت خیال کر کہ اللہ اپنے رسولوں سے وعدہ خلافی کرے گا۔''

ازل کے دن ہی یہ قانون بن چکا ہے کہ سچائی کے ان پکارنے والوں ہی کی آخر جیت ہوگی۔

﴿کَتَبَ اللّٰہُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَ رُسُلِیْ﴾ (المجادلہ:۲۱)

''اللہ لکھ چکا کہ میں ہی غالب ہوں گا اور میرے رسول۔''

خاتمہ

اس تفصیل اور تشریح سے مقصود ناظرین کو نبوت کے اصلی کمالات کا ایک جلوہ دکھانا تھا۔

فلسفی را از پیمبر دا شناس
آ بگینہ را زگوہر دا شناس
آ بگینہ رانہ پنداری بدست
جز دمے کہ گوہرے آری بدست
چوں گہر آمد بدستت شب چراغ
آ بگینہ شدسیہ چوں پرِّ زاغ
فلسفی اندر بنِ چاہِ نژند!
نردباں دارد بخورشیدِ بلند
نردبانش می برد تاچند ارش
پس بخاک افتدنگوں گشتہ سرش
واں پیمبر خود زبامِ آسماں
رشتۂ افگندہ سوئے خاکیاں
رشتۂ جاں رابدیں رشتۂ تباب
پس برآ تا بارگاہِ آفتاب
زآسمان پیغمبر آوازت دہد
فلسفی از خاک پروازت دہد
ایں زدورت رہ نماید سوئے جاں
واں نخواند خود ترا ز کوئے جاں[1]

❀ ❀ ❀ ❀

(۱) از دیوان فارسی مولانا حمید الدین رحمۃ اللہ علیہ المتوفی ۱۹ جمادی الثانیہ ۱۳۴۹ھ ۱۹۳۰ء ص ۴۶، ۴۷ مطبوعہ مطبع شمسی، حیدرآباد دکن۔

شبِ ظلمت

پیغمبرِ اسلام کی بعثت کے وقت دنیا کی مذہبی اور اخلاقی حالت

اگر یہ سچ ہے کہ دنیا کی ہر شے اپنے ضد سے پہچانی جاتی ہے، بارش کی خنکی سخت حبس کے بعد ہی زیادہ خوش گوار معلوم ہوتی ہے، روشنی کی پوری قدر شبِ تار ہی میں ہوتی ہے اور فضا جس قدر تاریک ہو بجلی کی چمک اتنی ہی زیادہ درخشاں نظر آتی ہے تو اس میں شبہ نہیں کہ ہر اصلاحی تحریک کی وقعت اور عظمت کے جانچنے میں یہ لحاظ رکھنا چاہیے کہ دنیا اس وقت کتنی گمراہی میں مبتلا اور اصلاح کی محتاج تھی، اور ایسی اصلاح کی محتاج تھی، جس کے لیے پیغمبرانہ دست و بازو کی حاجت تھی اور وہ بھی ایک ایسے پیغمبر کے دست و بازو کی جس کے متعلق خود خدا یہ فرما چکے۔

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰہَ یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْھِمْ﴾ (الفتح:۱)

''جو تیرے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں وہ خدا کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں اور ان کے ہاتھوں کے اوپر خدا کا ہاتھ ہے۔''

اسلام یا محمد رسول اللہ ﷺ کے پیغام اور تعلیم کے متعلق ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ وہ دنیا کی ایک عظیم الشان روحانی و اخلاقی و معاشرتی دعوت تھی، اس بنا پر ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ظہورِ اسلام کے وقت دنیا کی کیا حالت تھی؟ اس وقت کی دنیا کے متعلق اگر یہ کہا جائے کہ وہ ایک ایسا کرۂ ارضی تھا جس پر آفتاب نہیں چمکتا تھا تو بالکل سچ ہوگا، تمام دنیا میں سچے اور صحیح عقیدہ کا کہیں وجود نہ تھا، توحید کی روشنی سے دنیا کا ذرہ ذرہ محروم تھا، مصر و یونان و روم میں سورج، چاند اور مختلف سیاروں اور ستاروں کی خدائی تھی، ان ہی کے معبد تھے اور انہی کے ناموں پر بے گناہ انسانوں اور جانوروں کی قربانیاں چڑھائی جاتی تھیں، ہر جگہ پتھر کی مورتوں اور مٹی کی صورتوں اور سونے چاندی اور جواہرات کے بتوں کی پوجا کی جاتی تھی۔

اس وقت کی دنیا میں اخلاق کے تین معلم تھے، رواقی، عیسائی اور بودھ مت کے پیرو۔ اور یہ تینوں کے تینوں تجرد، رہبانیت اور جوگی پن میں مبتلا ہو کر اس طرح عضوِ معطل ہو گئے تھے کہ دنیا کا دستِ ترقی شل ہو کر رہ گیا تھا اور ایسی سخت سنگ دلانہ ریاضتوں کو نیکی اور عبادت کا مترادف سمجھ رکھا تھا کہ آج ان کی تفصیلات سننے سے بھی رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔

یہ سچ ہے کہ مسیحؑ نے چھ صدی قبل تزکیۂ نفس کے کچھ درس دیے تھے لیکن مدت ہوئی دنیا اس سبق کو بھلا چکی تھی

یہ بھی سچ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے اس سے بھی پیشتر ہدایت ونجات کی ایک شمع جلائی تھی، لیکن فتنوں اور ہنگاموں کی آندھی پر چراغِ طور بھی جل کر گل ہو گیا تھا۔ اور پھر یہ بھی سچ ہے کہ مدت مدید ہوئی کہ زردشت نے روحانیت کی آگ سلگائی تھی، لیکن یہ شعلہ بھی انسانی خون کے چھینٹوں سے سرد ہو چکا تھا، یہ بھی سچ ہے کہ اس سے پہلے بودھ نے آریہ ورت کے پہاڑوں اور غاروں میں روح کا دارالامن ڈھونڈ نکالا تھا، مگر حوادث کے طوفان نے ان پہاڑوں کو بے نام ونشان صحرا اور ان غاروں کو درندوں کا بھٹ بنا دیا تھا، ہر قوم دوسری قوم سے برسرِ پیکار اور ہر قبیلہ دوسرے قبیلہ کے خون کا پیاسا تھا، حرص وطمع اور کشت وخون کی گرم بازاری تھی نفسِ انسانی کی ملکوتی طاقت جذباتِ خبیثہ کے دیوتا کے سامنے پامال ہو چکی تھی، عدل وراستی اور پاک بازی وپارسائی کے عطرِ معنبر کی خوش بو انسان کے جامۂ خاکی سے اڑ چکی تھی، توحید اور خدا پرستی کا نور دیوتاؤں، دیبیوں، ستاروں، شہیدوں، ولیوں اور مجسموں کی پرستش کی عالم گیر تاریکی میں چھپ گیا تھا، غرض دنیا کے حالات ہر طرح سے اس ضرورت کے متقاضی تھے کہ کوئی عالم کا مصلح، اخلاق کا معلم، حق کا داعی، بنی نوعِ انسان کا نجات دہندہ آخری بار وجود میں آئے اور انسانیت کے شیرازہ میں جو عرصۂ دراز سے پراگندہ اور منتشر ہو رہا تھا پھر نظم وانتظام پیدا کر دے اور روحانیت وخدا پرستی کے خزاں رسیدہ باغ کو از سرِ نو پر بہار بلکہ سدا بہار اور دنیا کے ظلمت کدہ کو پھر مطلعِ انوار بنا دے۔

یہ اس عہد کی دنیا کی حالت کا ایک اجمالی خاکہ تھا تفصیل کے لیے ہمیں مختلف قوموں اور ان کے مذہبوں میں سے ایک ایک قوم اور اس کے مذہب کی تاریخ پر نظر کرنی چاہیے۔

ظہورِ اسلام کے وقت دنیا کی تمدنی اور مذہبی حالت کیا تھی

محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے وقت مصر یونان، کلد انیا، اسیریا اور بابل کی عظمت افسانۂ پارینہ بن چکی تھی، خود عرب ومضافاتِ عرب میں جو نامور حکومتیں کبھی تھیں مثلاً نابتی، حمیری، سبائی وغیرہ مدت گزری ان کا خاتمہ ہو چکا تھا۔

اس موقع پر صرف یہ دیکھنا مقصود ہے کہ صبحِ سعادت کے طلوع کے وقت کون کون سی قومیں دنیا میں حکمران تھیں اور ان کی مذہبی واخلاقی حالت کیا تھی اور دنیا کے مذاہب اس وقت کی روحانی حالت کے سنبھالنے کی کہاں تک استطاعت رکھتے تھے، اس وقت روئے زمین کی اہم طاقتیں دو ہی تھیں، فارس اور روم۔ فارس کا مذہب مجوسیت تھا جس کا دائرہ عراق سے لے کر ہندوستان کی سرحد تک محیط تھا اور روم کا مذہب عیسوی تھا جو یورپ، ایشیا اور افریقہ کے تینوں براعظموں کو گھیرے تھا، لیکن مذہبی حیثیت سے دو اور قومیں بھی ذکر کے قابل ہیں جن میں سے ہر ایک کو اپنی اپنی جگہ قدامت کا دعویٰ ہے اور وہ یہود اور ہندو ہیں۔

مجوسِ فارس

عرب کی پہلی ہمسایہ سلطنت فارس تھی، جس کے تمدن کا ستارہ ایک زمانہ میں اوجِ کمال پر تھا مگر عہدِ بعثت

سے سوڈیڑھ سو برس پہلے سے ساسانی شان وشوکت اور کیانی جاہ وجلال مٹتے مٹتے سایہ سارہ گیا تھا' مسلسل بغاوتوں' سفاکانہ خون ریزیوں اور سیاسی بدامنیوں نے اس کو تہ وبالا کر دیا تھا' بادشاہوں کے ظلم وستم اور امرا کی عیاشیوں اور خودغرضیوں نے صداقت' اخلاص اور ہر قسم کے اخلاقی جوہر کو جس کے خمیر سے قوم کی زندگی تعمیر ہوتی ہے فنا کر دیا تھا۔

ایران میں بابل کے اثر سے ستارہ پرستی بہت عام تھی' اسی کا اثر ہے کہ فارسی لٹریچر میں افلاک اور ستاروں کی کارفرمائی آج تک نمایاں ہے' زردشت نے اس تاریکی میں اپنی آگ روشن کی' اور نور وظلمت یا خیر وشر کے دو خالق یزدان واہرمن اس کے دو خدا اور آگ اس کی مسجود بنی' اسلام سے کچھ صدیاں پیشتر مانی نے مسیحیت اور مجوسیت کی آمیزش سے مذہب کا ایک نیا مرقع تیار کیا تھا جس میں نور وظلمت کے فلسفہ کا ایسا گورکھ دھندا بنایا تھا جس سے اخیر اخیر تک اس قوم کو نکلنا نصیب نہ ہوا' (۱) اس کی تعلیم یہ تھی کہ دنیا سے گوشہ گیری کر کے اس کو ویران' برباد اور ترکِ ازدواج سے نسلِ انسانی کو منقطع کر دیا جائے تاکہ بدی کا خاتمہ ہو جائے۔ (۲) اخلاقی حیثیت سے محرمات کا وجود ہمیشہ ان کے ہاں مختلف فیہ رہا' باپ کا بیٹی کو اور بھائی کا بہن کو اپنی زوجیت میں لینا وہاں کوئی غیر معمولی بات نہ تھی' (۳) یہ سن کر کس قدر حیرت ہوگی کہ یزدگرد ثانی جو پانچویں صدی عیسوی کے وسط میں وہاں کا بادشاہ تھا' اس نے اپنی بیٹی سے اپنا عقد کیا پھر اس کو قتل کر ڈالا' عورتوں کو اس قوم اور اس مذہب میں جو حیثیت حاصل تھی' وہ ان افسانوں اور مقولوں سے ظاہر ہے جو ایرانی ادبیات کا اب بھی جز ہیں اور جو شاہنامہ کے اوراق میں اب بھی ہر شخص کو نظر آ سکتی ہے' عورتوں کی بے وفائی' بداخلاقی اور ان پر عدم اعتماد پرانے ایرانی تمدن کا سب سے بڑا جزو تھا۔

سلاطین اور امرا درجہ بدرجہ رعایا کے خدا اور دیوتا تھے جن کو سجدے کیے جاتے تھے' (۴) ان کی الوہیت کے گیت گائے جاتے تھے' ان کے دربار میں کوئی بیٹھ نہیں سکتا تھا' ان کے خلاف کوئی لب کشائی کی جرأت نہیں کر سکتا تھا' ان کے جرائم پر ان کو سزا نہیں دی جا سکتی تھی' رعایا ان کے مظالم کے سامنے دم نہیں مار سکتی تھی۔

ملک کا بڑا حصہ رومی عیسائیوں کی دائمی جنگ سے پریشان حال تھا اور گرجاؤں اور آتش کدوں کی باہمی آویزش کا غیر مختتم سلسلہ قائم تھا' جب رومی فاتح ہوتے تو آتش خانے ٹوٹ کر کلیسے بن جاتے اور جب ایرانی غالب آتے تو کلیسے ٹوٹ کر آفتاب دیوتا کے معبد اور آتش خانے تعمیر ہو جاتے' یہودیوں پر جو مظالم توڑے جاتے تھے' اس کا ایک مختصر سا نقشہ توراۃ کے قصۃ البر میں نظر آتا ہے اور بعد کو مفتوح عیسائیوں پر وہ جس جس طرح ظلم

(۱) کتاب الفہرست ابن ندیم ذکر مانی وکتاب البدء والتاریخ مقدسی ذکر فرقہ مانویہ۔

(۲) تاریخ عزر اخبار الفرس ثعالبی مطبوعہ پیرس ص ۵۰۲۔

(۳) تاریخ عزر اخبار الفرس ثعالبی مطبوعہ پیرس ص ۲۷' ابوداؤد میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ میں حکم دیا کہ مجوسیوں کو اس فعلِ شنیع سے باز رکھا جائے (کتاب الخراج والامارۃ والفیٔ جلد دوم ص ۲۶۔)

(۴) مورخوں' تاریخ عالم ج ۸ ص ۸۴۔

کرتے تھے' اس کی تفصیل گبن کے اوراق میں منتشر طور پر ملے گی۔

بعثت سے پہلے جہانبانی کا قرعہ قباد اول بن فیروز کے نام پڑا' بیرونی حملوں اور اندرونی بدنظمیوں کا سلسلہ روز بروز بڑھتا گیا۔ آخر رعایا نے قباد کو قید کر دیا۔ (۱) قباد نے قید خانہ سے بھاگ کر تاتاریوں کے پاس پناہ لی اور ان کی اعانت سے دوبارہ تاج حاصل کیا' لیکن ملک پر اس سے بھی زیادہ یہ مصیبت نازل ہوئی کہ اس کے عہد میں مزدک نام ایک شخص پیدا ہوا جو اس امر کی تعلیم دیتا تھا کہ دولت اور عورت کسی خاص شخص کی ملک نہیں' بلکہ ان کو تمام جماعت میں مشترک ہونا چاہیے۔ چنانچہ ایک شخص کی بیوی مزدک کے عقائد کی رو سے ہر شخص کے ساتھ ہم بستر ہو سکتی تھی' عیش پرست اور ہوس ران امرا اور عوام دونوں نے اس کو خوشی خوشی قبول کیا' (۲) اس مذہب نے بہت جلد شاہی سایہ میں ترقی حاصل کی اور خود قباد نے اس دین کی ترویج و اشاعت میں نمایاں حصہ لیا' قوم کی اخلاقی حالت پر اس تعلیم کا جو اثر پڑ سکتا ہے وہ ظاہر ہے' نتیجہ یہ ہوا کہ سارا ملک عیش پرستی اور ہوس رانی کے نشہ میں سرشار ہو گیا۔

۵۳۱ء میں قباد کی جگہ خسرو نوشیرواں نے لی' ایرانیوں میں اس کی عدل پروری اب تک مشہور ہے مگر اس کو یہ مبارک لقب اپنے عزیزوں اور افسروں اور ہزاروں بے گناہوں کے قتل کی بدولت ملا' مزدکی فتنہ کو اس نے تلوار کے زور سے دبانا اور کیشِ زردشتی کو دوبارہ فروغ دینا چاہا' مگر خود اس کا بیٹا نوشزاد تثلیث پرستی کی طرف مائل تھا اس کی پاداش میں قید ہوا اور قید سے بھاگ کر ایک عیسائی فوج لے کر زردشتیوں سے صف آرا ہوا اور مارا گیا۔ (۳)

۵۷۹ء میں نوشیرواں نے وفات پائی اور ایران کا پایۂ تخت ہرمز چہارم کے حصہ میں آیا' اغیار کی دست اندازیوں کے ساتھ اندرونی بدنظمی اور باہمی خانہ جنگی' بادشاہوں کی تغافل شعاری' امرا کی عیش پرستی اور عوام کے اخلاقی انحطاط میں برابر ترقی ہی ہوتی گئی' یہاں تک کہ ۶۳۶ء میں مجاہدینِ اسلام کی فتح مندی کی طوفانی صرصر کے سامنے ملکِ فارس کی یہ ٹمٹماتی ہوئی شمع ہمیشہ کے لیے بجھ گئی۔

اوپر کے بیانات سے معلوم ہوا ہوگا کہ ایران کی سرزمین نغمۂ توحید سے کبھی گوش آشنا نہیں ہوئی' اخلاق کے متعدد ابواب ہیں جو ان کے آئین میں کبھی داخل نہیں ہوئے' یزدان و اہرمن نور و ظلمت اور خیر و شر کی بھول بھلیوں نے ان کو ہمیشہ سرگرداں رکھا' حکومت اور شاہی کے متعلق ان کا تخیل خدائی کا ہم رتبہ تھا' اسلام و فارس کی جنگ میں مغیرہ بن شعبہ مسلمانوں کی طرف سے سفیر بن کر جب سپہ سالارِ ایران کی بارگاہ میں گئے اور آزادی کے ساتھ جا کر اس کے برابر بیٹھ گئے تو ایرانی امیروں کو اس میں اپنے نائب السلطنت کی توہین نظر آئی اور مغیرہ کو سامنے سے ذلت کے ساتھ اٹھا دیا' انہوں نے جواب میں کہا' ہم عربوں میں دستور نہیں کہ ایک خدا بن کر بیٹھے اور دوسرے اس کے

(۱) عزر اخبار الفرس ثعالبی ص ۵۰۰' پیرس۔
(۲) انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا طبع یازدہم جلد ۲۱ ص ۲۲۳۔
(۳) عزر اخبار الفرس ثعالبی ص ۵۹۸ پیرس۔

سامنے غلامی اور بندگی کریں۔ (۱) آنحضرت ﷺ کی ولادت سے تقریباً ڈیڑھ صدی پیشتر سے ایران میں جس قسم کا سیاسی انحطاط شروع ہو گیا تھا وہ روز بروز بڑھتا ہی گیا' اس سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ فارس کے روحانی آتش کدہ میں اب زندگی کی کوئی چنگاری باقی نہیں رہ گئی تھی۔ اسی لیے جب اسلام کا نور طلوع ہوا تو اس کے شیوع کے لیے کوئی دوسرا پردہ بیچ میں حائل نہ ہوا' سرجان میلکم جن کا مسیحی تعصب عساکرِ اسلامی کو ان کی زبان سے قزاقانِ عرب کا لقب دلواتا ہے' فتحِ فارس کے متعلق حسب ذیل رائے دیتے ہیں:

''یزدجرد ثالث کا عہدِ حکومت اس لیے یادگار ہے کہ اسی زمانہ میں فارس کی قدیم شہنشاہی کا تختہ برہنہ تن ''سوسمارخواروں'' کے ایک دستہ نے الٹ دیا کہ اسی تحقیر آمیز لقب کے ساتھ عرب قبائل کے یہ مغرور ہمسائے ان کا ذکر کرتے تھے اس انقلابِ عظیم کی علت کوئی معمولی سبب نہیں ہو سکتا (مسلمان) فارسی مؤرخین کچھ تو اپنے حبِ وطن اور کچھ اپنی وہم پرستی کی بنا پر اس واقعہ کو ایک معجزۂ عظیم خیال کرتے ہیں جن کے ذریعہ سے خدا نے محمد کی صداقت کو ظاہر کر دیا لیکن جو لوگ دنیاوی حیثیت سے اس واقعہ پر غور کرتے ہیں انہیں فوراً نظر آ جاتا ہے کہ فارس کی ایسی سلطنت جو عیش پرستی کے ہاتھوں لاغر و نحیف ہو چکی ہو' جس میں اندرونی مناقشات کے باعث بدنظمیاں پھیلی ہوئی ہوں' جو بیرونی محاربات سے یکسر خستہ و ناتواں ہو اور جو اپنی کبرسنی اور نقاہت سے قعرِ زوال کی جانب خمیدہ پشت ہو اس کے لیے پرجوش قزاقانِ عرب کی مدافعت کرنا سخت دشوار تھا۔'' (۲)

مگر سوال یہ ہے کہ پاک نژاد ساسانیوں کی خستگی و ناتوانی' نقاہت و کمزوری' ''قزاقانِ عرب'' ہی کی ترقی کی کیوں تمہید بنی؟ کیا نہتے عربوں کے پاس اس سے زیادہ سامان جنگ اور سپاہی تھے' جو عراق و ایران کے آخیر آخیر معرکوں میں بھی ایرانی عربوں کے مقابلہ میں لاتے رہے۔ واقعہ یہ ہے کہ زرتشت کی آگ میں اب گرمی نہیں باقی رہی تھی۔ نور و ظلمت' خیر و شر' نیکی و بدی کے فلسفہ نے ایران کی ہر قسم کی عملی طاقت فنا کر دی تھی ''یزدان اور اہرمن'' کی دوعملی حکومت نے روحانی امن و امان کی سلطنت برباد کر دی تھی' بیسیوں چھوٹے بڑے فلسفیانہ مذہبی فرقے پیدا ہو گئے تھے جن میں سب سے اہم مانوی فرقہ تھا جو عیسائیت اور مجوسیت کا معجونِ مرکب تھا' آخر میں مزدکی فرقہ کی بہیمانہ تعلیم نے ایران کی اخلاقی روح کو اور بھی موت کے قریب کر دیا۔ (۳) نوشیرواں نے تلوار کی نوک سے اس فتنہ کو دبایا اور اس کے صلہ میں ''بادشاہِ عادل و دادگر' کا خطاب بھی پایا' تاہم ایران کی روحانی زندگی ان خون کے چھینٹوں کے بعد بھی اسی طرح تشنہ لب رہی جس طرح پہلے تھی اور منتظر تھی کہ دنیا کے خشک صحرائے عرب سے چشمہ ابل کر ادھر آئے تو وہ اپنی پیاس بجھائے۔

---

(۱) تاریخ طبری واقعات ۱۴ھ ص ۲۷۴ مطبع بریل۔

(۲) ملکم صاحب کی تاریخ ایران جلد اول ص ۱۳۳۔

(۳) تفصیل کے لیے فہرست ابن ندیم دیکھو ص ۴۴۲ مصر۔

عیسائی روم

آغازِ اسلام کے وقت جس قدر ایران کی جسمانی و روحانی شہنشاہی کے اوراق منتشر و پراگندہ تھے' روم کی قبائے سلطنت اس سے کچھ کم کرم خوردہ نہ تھی' حالانکہ یہ وہی رومۃ الکبریٰ ہے جو یونان کے زوال کے بعد دنیا کی سب سے بڑی سلطنت سمجھی جاتی تھی اور جس کے ایک تاجدار جولیس سیزر کا نام ہمیشہ کے لیے قیصر کی صورت میں بادشاہ و شہنشاہ کا مرادف بن گیا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اسی سلطنت میں مبعوث ہو کر دنیا کو امن و سلامتی کا پیام سنا کر رخصت ہوئے ان کے رفع و صعود کے بعد ہی ان کے شاگردوں میں فرقہ آرائیاں شروع ہوئیں۔ بالآخر پال نے جو ایک نو عیسائی یہودی تھا اس طرح عیسائیوں پر غلبہ پایا کہ اس کے بدعات کی خاک میں اصلی عیسویت ہمیشہ کے لیے دفن ہو گئی اور باپ بیٹے اور روح القدس کا مشرکانہ عقیدہ اس میں داخل ہو گیا اور توراۃ جس کا کوئی نقطہ خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی مٹا نہیں سکتے تھے۔ (۱) وہ ان کی روحانی شاگردی کے مدعی (پال) کے ہاتھوں ہمیشہ کے لیے لعنت قرار پائی۔ (۲) ۳۲۵ھ میں رومی سلطنت کے مشرقی و مغربی دو حصے ہو گئے' مشرقی حصہ کے تاج دار قسطنطین اعظم نے عیسائی مذہب اختیار کیا اور رفتہ رفتہ پوری رومی حکومت میں یہ مذہب پھیل گیا مگر درحقیقت اس مشرقی تاجدارِ روم کے اس قبولِ مذہب کا جذبہ اخلاص و صداقت سے زیادہ سیاست اور سلطنت کی مصلحت پر مبنی تھا' نتیجہ یہ ہوا کہ اب باپ بیٹے اور روح القدس کی تثلیثی الوہیت میں ہر نیا ملک جو فتح ہوتا اس کا دیوتا کسی نہ کسی نام اور رسم سے اس مذہب میں شامل ہو جاتا تختِ سلطنت کے غیر متوقع حصول نے مذہبی خاکساروں میں یہ حوصلہ پیدا کر دیا کہ کلیساؤں نے مذہبی شہنشاہی کا خواب دیکھنا شروع کر دیا اس کے لیے عقائد کی وہ لڑائیاں کھڑی کی گئیں کہ شاہانہ سایہ میں بیٹھ کر کونسلوں نے خدا کے دین کا خاکہ تیار کیا' اتحاد اور اجتماع کی ہر نئی کوشش نئی مذہبی تفریق کا پیش خیمہ ثابت ہوئی اور ایک عیسوی مذہب ایک صدی کے اندر اندر بیسیوں فرقوں میں تقسیم ہو گیا۔

۳۳۷ء میں قسطنطین کی وفات پر مذہبی خانہ جنگی کے ساتھ ساتھ رومیوں کی سیاسی خانہ جنگیوں کی زیرِ خاکستر آگ بھی زور و شور سے شعلہ زن ہوئی' اعیانِ سلطنت میں مختلف گروہ بندیاں ہو گئیں اور باہمی نفاق اور فتنہ و فساد کا بازار گرم ہو گیا بالآخر سلطنت روم مختلف صوبوں میں منقسم ہو کر مختلف دعویٰ داران حکومت کے حصہ میں آئی' (۳) نا قابل فرمان رواؤں کی کمزوری دیکھ کر ایک طرف گوتھ' ونڈال وغیرہ بعض وحشی قوموں نے حملے شروع کیے اور دوسری طرف خود دور افتادہ صوبوں کی رعایا بغاوت پر آمادہ ہو گئی' نتیجہ یہ ہوا کہ پانچویں صدی عیسوی کے آخر میں سلطنتِ روم کا مغربی بازو جو برطانیہ اور فرانس وغیرہ پر مشتمل تھا بالکل کٹ گیا اور خود روم کا دارالحکومت

(۱) انجیل متی ۵۔۱۷۔۱۔

(۲) یہ مضامین عیسائیوں کی انجیل کے حصہ' اعمال اور خطوط میں جا بجا بتصریح مذکور ہیں۔

(۳) گبن کی تاریخ زوال و انحطاطِ سلطنتِ روم جلد اول ص' ۴۸۸' ۴۹۱۔

دشمنوں کے حملوں سے محفوظ نہ رہ سکا۔ (۱) اس وقت یعنی پانچویں صدی کے بیچ میں لوگوں کو صاف نظر آ رہا تھا کہ ان کے مورثِ اعلیٰ نے جو بارہ کرگسوں کو خواب میں دیکھا تھا اور جس کی بنا پر اس زمانے کے کاہنوں نے یہ پیشین گوئی کی تھی کہ یہ سلطنت بارہ صدیوں تک قائم رہے گی' اب اس پیشین گوئی کے پورا ہونے کا وقت آ گیا' مؤرخ گبن اس زمانہ کی تصویر ان لفظوں میں کھینچتا ہے:

''اس پیشین گوئی نے جس پر اس قوم نے اپنے عروج و اقبال کے زمانہ میں کبھی اعتنا بھی نہ کی تھی' اب بارہ صدیوں کے خاتمہ پر جب کہ ہر طرف سے ذلت اور بدقسمتی کا سامنا تھا اہلِ روم کو یاس آمیز جذبات سے پر کر دیا لیکن ان کے زوال کی علامتیں کرگسوں کے خواب سے زیادہ واضح و نمایاں موجود تھیں' رومن حکومت مخالفوں کی نظروں میں روز بروز زیادہ کمزور اور خود اپنی رعایا کی نظر میں ظالمانہ اور ناقابلِ برداشت ہوتی جاتی تھی' کفایت شعاری جتنی زیادہ ضروری ہوتی جاتی تھی' اسی نسبت سے اس کی جانب سے بے اعتنائی بڑھتی جاتی تھی اور جس نسبت سے رعایا کے مصائب روز افزوں تھے اسی نسبت سے ٹیکس میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔''(۲)

امرا نے اپنے مصارف کا بار بھی عام رعایا پر ڈالنا شروع کیا' جس کے باعث وہ اپنی قلیل آمدنی سے بھی محروم ہو گئی' محصول کی صورت میں رعایا پر اس قدر جبر کیا جاتا تھا کہ اس کے دل میں حکومت کی طرف سے نفرت و عداوت پیدا ہو گئی یہاں تک کہ وہی رومن قوم جو کبھی اپنے اس لقب پر فخر کرتی تھی اب اپنے کو اس قوم کی طرف منسوب کرتے شرمانے لگی اور رومن حکومت پر ہر وحشی سے وحشی سلطنت کی محکومیت کو ترجیح دینے لگی' امرا' وزرا اور سلاطین خود اپنی ناعاقبت اندیشیوں سے رعایا کو اپنا دشمن بناتے اور جب بغاوت ہوتی تو فوج کشی کرتے اور ناکام رہتے' غرض اندرونی بدنظمیوں سے ملک کی یہ نوبت پہنچ گئی تھی کہ گبن کے الفاظ میں:

''اگر اس وقت روم کے تمام بیرونی وحشی مخالفین فنا بھی ہو جاتے تو ان کی مجموعی معدومیت بھی سلطنت کے مغربی بازو کو زوال و بربادی سے نہیں بچا سکتی تھی۔''(۳)

پانچویں صدی کے خاتمہ پر مغربی حصہ کے نکل جانے کے بعد مشرقی صوبوں تک یعنی ڈینیوب سے لے کر دجلہ و نیل تک کی سرزمین روم کے ماتحت رہ گئی تھی' لیکن اس کی حالت بھی روز بروز نازک سے نازک تر ہوتی جاتی تھی' مؤرخین کا بیان ہے کہ رومن فوج کی مجموعی تعداد جو ایک زمانہ میں ۶۴۵۰۰۰ تھی اب شاہ جسٹنین کے زمانہ (یعنی ۵۲۷ء) میں گھٹ کر ایک چوتھائی سے بھی کم یعنی ۱۵۰۰۰۰ رہ گئی تھی اور وہ بھی نہایت متفرق اور ابتر حالت میں' رعایا کی جیبیں خالی تھیں' فوج کی تنخواہیں چڑھی ہوئی تھیں اور امرا و اعیانِ سلطنت اپنے ذاتی مصارف کے لیے ہر طرح کے جعل و فریب' رشوت ستانی اور لوٹ مار کو جائز رکھتے تھے۔ فوج میں یوں تو بہت سے سپاہیوں کے

---

(۱) گبن کی تاریخ زوال و انحطاط سلطنت روم جلد دوم باب ۳۶' و باب ۳۸۔

(۲) گبن کی تاریخ زوالِ انحطاطِ سلطنتِ روم جلد دو۔ ص ۴۶۱۔

(۳) گبن کی تاریخ زوال و انحطاطِ سلطنت روم ج ۲ ص ۴۶۱۔

نام لکھے ہوئے تھے لیکن میدانِ جنگ میں جانے کے وقت بہت تھوڑے سے لوگ تیار ہوتے۔ فوجی افسر فنِ جنگ کے بجائے اپنا وقت باہمی حسد و رقابت میں صرف کرتے اور ہر افسر کی یہ کوشش رہتی کہ دوسرے افسر کی بدنامی و ذلت سے فائدہ اٹھا کر خود ترقی و منصب حاصل کرے۔ (۱)

اندرونی بدنظمیوں پر مستزاد یہ تھا کہ بیرونی غنیم اہلِ روم کو ایک دم کے لیے چین سے بیٹھنے نہیں دیتے تھے' روم و فارس کے درمیان مدت سے لڑائیوں کا ایک غیر منقطع سلسلہ جاری تھا۔ پھر لومبارڈس' گوتھیس' ونڈالس وغیرہ کے پیہم حملے روم کی رہی سہی قوت کو اور بھی پامال کر رہے تھے۔

الغرض چھٹی صدی عیسوی کے خاتمہ پر یعنی خاتم النبیین ﷺ کی ولادت سے دو چار سال بعد روم بقول گبن کے اپنے زوال کے پست نقطہ تک پہنچ گیا تھا اور گبن کی زبان میں اس کی مثال بعینہٖ اس عظیم الشان درخت کی ہوگئی تھی جس کے سایہ میں ایک وقت تمام اقوامِ عالم آباد تھیں' مگر اس پر ایسی خزاں آئی کہ برگ و بار کے ساتھ اس کی شاخیں اور ٹہنیاں بھی رخصت ہوگئی تھیں اور اب خالی تنا خشک ہو رہا تھا' خود پایۂ تخت کے اندر غنیم کے گھس آنے کا ایسا خوف تمام آبادی پر چھایا ہوا تھا کہ تقریباً کل کاروبار بند ہو گئے تھے' وہ بازار اور تماشا گاہیں جہاں دن رات چہل پہل رہتی تھی' اب ویران اور سنسان پڑی تھیں' عیش پرستی کا یہ عالم تھا کہ لوگ ایک عرصہ سے تاہل کے بجائے تجرد کی زندگی زیادہ پسند کرتے تھے تاکہ زیادہ آسانی اور آزادی کے ساتھ اپنے شہوانی جذبات کی تشفی کر سکیں۔ (۲)

ملک کی عام سیاسی و اخلاقی حالت سے قطع نظر کر کے جب ہم مذہبی پہلو پر نظر کرتے ہیں تو اس سے بھی زیادہ دل خراش تصویر نظر آتی ہے' بت پرست رعایا کو چھوڑ کر جو ستاروں' دیوتاؤں اور بتوں کی پوجا میں بدستور مصروف تھی اور لوگ جنہوں نے عیسائیت قبول کر بھی لی تھی وہ بھی باپ بیٹا' روح القدس اور مریم کی خدائی کے معتقد تھے' حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور مریم و روح القدس کی شخصیت اور مرتبہ کی تعیین نے بیسیوں فرقے پیدا کر دیے تھے' جن میں زبانی مناظروں سے گزر کر جنگ و جدل کی نوبت آ گئی' یہاں تک کہ ۵۱۴ء میں خود عیسائیوں کے دو گروہوں کے درمیان ایک عظیم الشان مذہبی جنگ چھڑی جس میں ۶۵۰۰۰ عیسائیوں کو خارج البلد ہونا پڑا۔ (۳)

اس جنگِ عظیم کے علاوہ ہمہ وقت ہر فریق دوسرے فریق کے خون کا پیاسا رہا کرتا اور بار بار چھوٹی چھوٹی باتوں پر کشت و خون کی نوبت آ جاتی' پادریوں نے اپنے منصبِ مذہبی کو حصولِ جاہ کا ایک ذریعہ قرار دے لیا تھا۔ اس بنا پر محض حبِ جاہ کی خاطر وہ ہر طرح کی ناجائز کوششوں میں مصروف رہتے' ان پادریوں کے ایک اسقفِ اعظم' سینٹ سرل نے جو جو سفاکیاں کی ہیں' ان کی تفصیل کے لیے ایک پوری کتاب درکار ہے' ایک مرتبہ اس نے اپنے

(۱) حوالہ مذکور ج ۳ ص ۱۱۳۔
(۲) گبن ج ۳ ص ۳۷۲۔
(۳) گبن ج ۳ ص ۳۴۴۔

مریدوں کو ہمراہ لے کر غیر مسلح یہودیوں پر دھاوا کیا' اور ان سب کو جلا وطن کر دیا' ان کا مال و اسباب سرل کے مریدوں کے ہاتھ لگا اور ان کے معابد زمین کے برابر کر دیے گئے' سرل کا حریف ارسٹس نامی پادری تھا۔ ایک روز جب ارسٹس راستہ سے گزر رہا تھا ۵۰۰ راہبوں کی جماعت اس پر ٹوٹ پڑی اور اپنی سنگ باری سے اس کو خون میں نہلا دیا۔ (۱) سرل کی ایک خاتون دوست بلیشیا نامی تھی' ایک روز وہ اپنی درس گاہ سے واپس آ رہی تھی کہ راہبوں کے ایک بہت بڑے گروہ نے اس پر حملہ کر دیا' گاڑی سے اتار کر برہنہ کی گئی اور اس حالت میں تمام شہروں کی سڑکوں پر گھسیٹتے ہوئے اس کلیسا میں لائے جہاں پہنچ کر پادری پیٹر کے گرز سے اس کا خاتمہ کر دیا گیا' قتل کے بعد اس کا گوشت ہڈیوں سے جدا کیا گیا' نعش کے ٹکڑے ٹکڑے کیے گئے اور آلائشِ جسم کو آگ میں ڈال دیا گیا' (۲) یہ واقعات ایسے ہیں جن کے ذکر سے آج قلم لرزتا ہے مگر یہ عیسائی مذہب کے علم برداروں کا سب سے روشن کارنامہ ہے۔

یہی حالت ان تمام ملکوں کی تھی جہاں رومیوں کے زیرِ سایہ عیسوی مذہب پھیلا ہوا تھا' یعقوبی' نسطوری اور دوسرے فرقے جو سرکاری عیسوی مذہب سے الگ تھے' وہ دور دراز صوبوں اور ملکوں میں اپنی اپنی پناہ ڈھونڈتے تھے' نائیس کی کونسل کے بعد آریوس اور اس کے حریفوں میں جو معرکہ آرائیاں ہوئیں انہوں نے اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ ''شہزادۂ امن'' کا مذہب ان جنگجویوں کے ہاتھوں تباہ و برباد ہونے سے بچ نہیں سکتا۔

مسٹر مارس جو پیغمبر اسلام کو نعوذ باللہ بہت بڑا مکار قرار دیتے ہیں' اپنی تاریخ ہندوستان میں ضمناً ایک موقع پر تحریر کرتے ہیں:

''اس نازک موقع پر (یعنی ظہورِ اسلام کے وقت) ان بے باکانہ بدعات کے درمیان جو چرچ کو نجس کر رہے تھے اور اختلافات کے اس غیر منقطع سلسلہ کے درمیان جو چرچ میں ایک ہلچل ڈالے ہوئے تھے اگرچہ مشرق میں اصلی مسیحیت کی شعاع نظر آتی تھی لیکن بہت ہی مدھم' روم کے قیصروں کی قوت کچھ تو اندرونی نزاعوں اور کچھ بیرونی حملوں کے باعث اپنی بنیاد سے اکھڑ کر قعرِ فنا کی طرف تیز رفتاری کے ساتھ جا رہی تھی' یہود بے صبری کے ساتھ گلیلی کے اس حقیر شخص کے مذہب پر نظر کر رہے تھے جس کے دین کو اب شاہِ قسطنطین کے مسیحی ہو جانے کے بعد پوری شان و شوکت اور شاہی عظمت حاصل ہو گئی تھی' اور ہر اس تحریک کی مدد کے لیے تیار تھے جو ایسے قابلِ نفرت مذہب کا خاتمہ کرنا چاہے' اہلِ فارس نہایت غیظ و غضب کے ساتھ ان پر جوش و نا روادار فتح مند عیسائیوں کو دیکھ رہے تھے جنہوں نے ان کے معبود آتشِ شمسی کی بے حرمتی کی تھی اور شرک کی ساری دنیا اپنے برباد شدہ معبودوں اور ڈھئے ہوئے معبدوں پر ماتم کر رہی تھی' ان کے انتقام کے لیے آمادہ اور مستعد تھی۔ (۳)

---

(۱) ایضاً ص ۳۲۷۔

(۲) ایضاً ص ۳۲۳ نیز ڈریپر تاریخ معرکہ آرائیِ مذہب و سائنس ص ۱۵۵۔

(۳) مارس کی تاریخ ہندوستان ج اول ص ۱۸۳۔

مارس صاحب واقعات کی نقشہ کشی میں خواہ کتنا ہی مسیحی رنگ بھریں لیکن نفسِ واقعات کی صحت ان کو شاید ہم سے بھی زیادہ مسلم ہے۔

بہر حال مؤرخین کا بیان ہے کہ تیسری صدی سے لے کر ساتویں صدی تک مسیحیت کی جو حالت رہی ہے وہ اس کے لیے باعثِ ننگ ہے' مشرکانہ رسوم نے مذہب کی جگہ لے لی تھی اصل رومی بت پرستانہ عقیدوں نے مسیحی مذہب کا روپ بھر لیا تھا حضرت مسیحؑ کے ناسوتی اور لاہوتی دو عنصروں کی تحلیل اصر کو قابو میں لانے کے لیے کی گئی' جس سے حضرت مسیحؑ کے ''وہی ایک ہے'' کی تعلیم ہمیشہ کے لیے ان کے مذہب سے ہٹ گئی' ضعیف الاعتقادی اس درجہ بڑھ گئی تھی کہ قبر پرستی عام ہو گئی تھی اور ہر بڑے پادری سے اس کی وفات کے بعد دعا مانگی جاتی تھی' ملک شام میں جو بڑے پادری اور بطریق تھے' ان کے معتقدان کو سجدے کرتے تھے (۱) مسیح و مریم' روح القدس اور حواریین اور مسیحیت کے دیگر اساطین کے مجسمے بنا کر ان کی پرستش اس کثرت سے ہونے لگی کہ اس کی نظیر زمانۂ بعد کے رومن کیتھولک فرقہ کے بت پرستی میں بھی نہیں ملتی۔ (۲)

سیل صاحب اپنے ترجمۂ قرآن کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

''گرجا کے پادریوں (Clergymen) نے مذہب کے ٹکڑے کر ڈالے تھے اور امن و محبت اور نیکی کو مفقود کر دیا تھا' اصل مذہب کو بھول گئے تھے اور اس کے متعلق اپنی خیال آرائیوں پر جھگڑتے تھے اسی تاریک زمانہ میں اکثر وہ توہمات جو رومن چرچ کے لیے باعثِ ننگ ہیں' مذہبی صورت میں قائم کیے گئے' خصوصاً ولیوں اور مجسموں کی پرستش نہایت بے شرمی سے ہونے لگی' نیس کی کاؤنسل کے بعد مشرقی چرچ روزانہ کے مناظرات میں مشغول ہو گیا اور ایرینس سلینس نسطورینس اور یوٹیکینس کے جھگڑوں میں ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا' انصاف علانیہ فروخت کیا جاتا تھا اور ہر طرح کی بدعنوانیاں ہوتی تھیں۔ مغربی چرچ میں ڈینس اور سیسی نینس نے بشپ کی جگہ حاصل کرنے کے لیے قتل تک نوبت پہنچا دی اور آخر ڈینس کی فتح ہوئی' اس موقع پر کہا جاتا ہے کہ سیسی نینس (Sicininus) کے گرجا میں ایک روز میں ۱۳۷ آدمی قتل کیے ہوئے پائے گئے اور کوئی حیرت نہیں کہ یہ لوگ ان جگہوں کے اس قدر خواہاں ہوتے تھے اس لئے کہ اس ذریعہ سے ان کو گرانبہا تحفے ملتے تھے' اپنی گاڑیوں پر نہایت تزک و احتشام سے نکلتے تھے اور ان کے دسترخوان پر بادشاہوں سے زیادہ شان و شوکت ہوتی تھی۔ ان مناقشات کا سبب زیادہ تر شہنشاہ ہوا کرتے تھے' جسٹنین کے وقت میں حالت اور زیادہ خراب ہو گئی' اس کے نزدیک اپنے عقیدہ کے مخالفوں کو مار ڈالنا کوئی جرم نہ تھا۔

بادشاہوں اور پادریوں میں عقائد اور اخلاق کی جو خرابیاں پھیلی تھیں اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ عوام کی حالت بھی مبتذل ہو گئی۔ ان کا مقصد صرف روپیہ پیدا کرنا رہ گیا خواہ کسی ذریعہ سے ہو اور اس روپیہ کو وہ نفاست اور عیاشی

---

(۱) سنن ابن ماجہ باب حق الزوج علی المرأۃ۔

(۲) سیل صاحب کا انگریزی ترجمہ قرآن مقدمہ ص ۲۵' ۲۶

میں اڑاتے تھے' عقائد کی خرابی کے علاوہ روم و فارس کی سلطنتیں بھی کمزور ہوگئی تھیں' شہنشاہِ قسطنطین کے بعد روم کی سلطنت روز بروز کمزور ہوتی گئی' عام طور سے اس کے جانشین بزدلی اور مظالم کے لیے مشہور تھے۔ آنحضرت ﷺ کے وقت تک ملک کا مغربی حصہ ''گاتھ (Goth) لوگوں نے روند ڈالا تھا' یونانیوں کی عیش پسندی اور اخلاقی خرابیوں نے ان کی قوت کو زائل کر دیا تھا۔'' رومیوں نے عیسوی مذہب کو جس صورت میں قبول کیا تھا' اس کی تصویر ڈریپر کے الفاظ میں حسبِ ذیل ہے:

''دونوں (عیسائیت اور بت پرستی) کی باہمی کشمکش کا یہ نتیجہ ہوا کہ دونوں کے اصول شیر و شکر ہو گئے اور ایک نیا مذہب پیدا ہو گیا جس میں بت پرستی و عیسائیت دونوں کی شانیں پہلو بہ پہلو جلوہ گر تھیں۔ (۱) جوں جوں زمانہ گزرتا گیا وہ مذہبی عقائد جن کی تفصیل ٹرٹلین نے بیان کی ہے' متغیر ہو کر ایک عام پسند مگر پایۂ اخلاق سے گرے ہوئے مذہب کی شکل اختیار کرتے گئے' ان عقائد میں قدیم یونانی اصنام پرستی کا عنصر مخلوط ہو گیا' عقیدۂ تثلیث قدیم مصری روایات کے سانچہ میں ڈھال لیا گیا مریم عذرا کو خدا کی ماں کا لقب دیا گیا۔ (۲)

اسی زمانہ میں ایک گروہ ''مریمی'' کے نام سے پیدا ہوا جو حضرت مریمؑ کو بھی شریکِ الوہیت کر کے بجائے اقانیمِ ثلاثہ کے اقانیمِ اربعہ کا اعتقاد رکھتا تھا' جس کی تردید قرآن پاک نے سورۂ آل عمران میں فرمائی ہے اسی کے ساتھ اور بہت سے معتقدات رومی بت پرستوں سے لے کر عیسائیت میں داخل کئے گئے اور نام بدل بدل کر رومی بت پرستوں کے دیوتاؤں کے رسوم مقدس عیسائی کلیساؤں میں جگہ پانے لگے اور ان مسائل میں مختلف فرقوں کے اندر اختلافاتِ باہمی نہایت شد و مد سے پیدا ہوئے' یہاں تک کہ ان مذہبی مناقشات کے تصفیہ کے لیے حکومت کو بارہا دست اندازی کرنا پڑتی تھی' رفتہ رفتہ رشوت ستانی کا بازار گرم ہو گیا اور یہ حالت ہو گئی کہ جو شخص کسی بڑے دنیاوی عہدہ دار کے پاس جتنا رسوخ و تقرب حاصل کر سکتا اسی نسبت سے اس کو بڑی دینی خدمت مل جاتی۔ (۳)

یہ تو مسیحی دنیا کے مشرقی حصہ کا حال تھا' مغربی حصہ کی حالت اس سے بھی زیادہ خراب تھی' یہاں رومن امپائر کی ماتحتی میں مذہبی مناصب کے لیے کشت و خون ایک عام و معمولی واقعہ تھا' یہاں تک کہ بعض دفعہ مقتولین کی تعداد کسی سخت خون ریز جنگ کے مقتولوں کے مساوی پہنچ جاتی' چنانچہ ایک مرتبہ جب ایک اعلیٰ مذہبی عہدہ کے لیے دو پادریوں کے درمیان مقاتلہ ہوا تو صرف ایک دن میں ۱۳۷ آدمی کام آئے۔ (۴) اس سفاکانہ جدوجہد کا باعث صرف یہ تھا کہ اس زمانہ کے مذہبی عہدے اکتسابِ زر حصولِ لذائذ اور کسبِ جاہ کے بہت بڑے ذرائع تھے' چنانچہ جتنی نفیس غذائیں پادریوں کے دسترخوان پر رہتی تھیں۔ اتنی بادشاہوں کو بھی نصیب نہیں ہوتی تھیں۔ (۵)

---

(۱) معرکۂ مذہب و سائنس' ڈریپر ص ۶۲۔
(۲) ایضاً ص ۶۵۔۶۶۔
(۳) سیل صاحب کا انگریزی ترجمہ قرآن مقدمہ ص ۲۶۔
(۴) ایضاً ص ۲۶۔
(۵) ایضاً ص ۲۶۔۶۷۔

سلاطین اور مذہب کے حاملین کے اخلاق کا پرتو عام رعایا اور پیروؤں پر لازمی طور پر پڑتا ہے نتیجہ یہ ہوا کہ بداخلاقی' اسراف اور ہوس پرستی' مسیحی دنیا کی آب و ہوا میں سرایت کر گئی۔ لوگ ہر طرح کے ناجائز وسائل سے روپیہ کماتے اور کمال بیدردی کے ساتھ اپنے مسرفانہ لہوولعب اور عیاشیوں میں اڑا ڈالتے۔ (۱)

پوپوں نے اور ان کے بعد درجہ بدرجہ مذہبی عہدہ داروں نے اپنی اپنی جگہ پر شہنشاہانہ بلکہ خدائی کے اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لیے تھے' جو وہ زمین پر کھولتے تھے' وہ آسمان پر کھولا جاتا تھا اور جو یہاں بند کرتے تھے وہ وہاں بھی بند ہو جاتا تھا۔ قرآن مجید نے ان کی اسی حالت کا ذکر اس آیت میں کیا ہے کہ ﴿اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَ رُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ ''انہوں نے خدا کو چھوڑ کر اپنے عالموں اور درویشوں کو اپنا خدا بنا لیا تھا۔''

دینداری کا سب سے اہم جزو تجرد کی زندگی اور رہبانیت تھی' ہر قسم کے آرام و آراسائش سے جسم کو محروم کر کے ہر قسم کی تکلیف و عذاب میں اپنے کو تمام عمر مبتلا رکھنا بہترین عبادت تھی' کسی نے تمام عمر غسل نہ کرنے کی قسم کھا لی تھی کسی نے اپنے کو دلدل میں ڈال دیا تھا' کوئی اپنے کو بوجھل زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھا' کسی نے سایہ میں بیٹھنے کو اپنے اوپر حرام کر لیا تھا کسی نے اپنے کو اندھیری کوٹھڑی میں بند کر لیا تھا۔ ماں باپ' عزیز و اقارب' اہل و عیال' دینداری و تقویٰ شعاری کی راہ کے کانٹے تھے' ان سے پرہیز بلکہ ان سے نفرت کمالِ تقویٰ سمجھا جاتا تھا اور اسی پر فخر کیا جاتا تھا۔

ہندوستان

دنیا کے ان متمدن ملکوں میں جہاں کوئی بااثر مذہب قائم تھا' ایک ہندوستان بھی ہے' ہندوستان کے تمدن کے پانچ مختلف دور گزرے ہیں' ایک اصلی ہندو ویدک عہد جو دو ہزار سال ق. م سے لے کر تقریباً چودہ سو سال ق. م تک رہا' دوسرا دور جنگ یعنی جس میں کوروؤں اور پانڈوں وغیرہ کے مناقشات رہے اور جو چودہ سو ق م سے لے کر تقریباً ایک ہزار قبل مسیح تک رہا' تیسرا دور عقلیت جس میں حکماء و عقلیین کا دور دورہ تھا اور جو ایک ہزار قبل مسیح سے لے کر تقریباً تیسری صدی کے نصف تک رہا۔ چوتھا دور بودھ جس میں اس مذہب کا عروج تقریباً دو سو پچاس قبل مسیح سے لے کر پانچویں صدی عیسوی کے خاتمہ تک رہا' پانچواں دور پرانک جس میں بجائے' ویدیا گوتم بدھ کی تعلیمات کے پرانوں کی تلقین پر عمل درآمد تھا اور یہ عہد تقریباً پانچویں صدی عیسوی کے اواخر سے لے کر مسلمانوں کے داخلۂ ہند تک قائم رہا۔

مؤرخین کا اجماع ہے کہ قدیم ہندوستان کی تاریخ میں سب سے زیادہ تاریک اور نقائص سے معمور آخری دور ہے جو تقریباً ۵۰۰ء سے شروع ہوتا ہے' اس دور کی نمایاں خصوصیات حسب ذیل تھیں:

---

(۱) تاریخِ اخلاقِ یورپ لیکی کی دوسری جلد میں یہ واقعات مفصل لکھے ہیں۔

(۱) شرک جو ابتدا ہی سے ہندوستان کے خمیر میں داخل تھا' اب وہ حدِ اعتدال سے باہر ہو گیا چنانچہ وید میں جو ۳۳ دیوتاؤں کی تعداد تھی وہ اب بڑھتے بڑھتے ۳۳ کروڑ دیوتاؤں تک پہنچ گئی۔ (۱)

(۲) ویدک عہد میں اصنام کی پرستش کا رواج نہ تھا لیکن اس زمانہ میں مندروں کے اندر بت پرستی علی العموم رائج ہو گئی تھی۔ (۲)

(۳) مندروں کے محافظین بداخلاقی کے سرچشمے تھے جو لاکھوں کروڑوں ناواقف پرستش کرنے والوں کو مذہب کے نام سے خوب لوٹتے۔ (۳)

(۴) ویدک عہد میں ساری ہندو قوم میں یگانگی تھی' لیکن اب ذات پات کی تفریق شروع ہو گئی جو نظامِ معاشرت کے لیے تباہ کن تھی۔ (۴)

(۵) عورتوں کو محکومیت و غلامی کا درجہ دیا گیا۔ (۵)

(۶) قوانین اس قدر غیر معقول و نامنصفانہ وضع کیے گئے جن سے علانیہ بعض ذاتوں کی پاس داری و حمایت اور بعض پر جبر و ستم مقصود تھا' مثال کے لیے چند قوانین درج ذیل ہیں:

(ا) برہمن کو کسی حالت میں خواہ وہ کتنے ہی سنگین جرائم کا مرتکب رہ چکا ہو' سزائے موت نہیں دی جا سکتی۔

(ب) کسی اونچی ذات کے مرد کا کسی نیچی ذات کی عورت کے ساتھ زنا کرنا کوئی جرم نہیں۔

(ج) کسی بودھ راہبہ تک کی عصمت دری کی سزا میں کچھ جرمانہ کافی تھا۔

(د) اگر کوئی اچھوت ذات کا شخص کسی اعلیٰ ذات والے کو چھو لے تو اس کی سزا موت ہے۔

(ہ) اگر کوئی نیچی ذات والا اپنے سے اونچی ذات والے کو مارے تو اس کے اعضا قطع کر ڈالنا چاہیے اگر اسے گالی دے تو اس کی زبان کاٹ ڈالنی چاہیے اور اگر اسے تعلیم دینے کا دعویٰ کرے تو گرم تیل اس کے منہ میں ڈالنا چاہیے۔ (۶)

(۶) راجاؤں کے محل میں بادہ نوشی کثرت سے رائج تھی اور رانیاں اسی حالتِ خمار میں جامۂ عصمت اتار ڈالتی تھیں۔ (۷)

(۷) شاہراہوں پر آوارہ گرد جرائم پیشہ افراد کا مجمع لگا رہتا تھا۔ (۸)

---

(۱) آر سی دت کی ہندوستانِ قدیم ج ۳ ص ۲۷۶۔

(۲) ایضاً ص ۲۸۱۔

(۳) ایضاً ص ۲۸۳۔

(۴) ایضاً ص ۳۰۷۔

(۵) ایضاً ص ۳۳۔

(۶) آر سی دت کی ہندوستان قدیم ص ۳۴۲' ۳۴۳۔

(۷)' (۸) ایضاً ص ۴۶۹۔

(۸) خدا کی تلاش آبادیوں اور بازاروں میں کرنے کے بجائے جنگلوں اور پہاڑوں میں کی جاتی تھی، جسم کو سخت سے سخت ایذا اور تکلیف دینا ان کی بہترین عبادت تھی۔

(۱۰) اوہام اور خیالاتِ فاسدہ، بھوتوں، پریتوں اور سینکڑوں قسم کے ظنون واوہام ان کا مذہب تھا اور آسمان سے لے کر زمین تک ہر چیز ان کا خدا تھی، اور ہر ایک کے سامنے سربسجود ہونا ان کا دھرم تھا، بتوں، دیوتاؤں، دیبیوں کا شمار اندازہ وقیاس سے باہر تھا اور ان کے افسانوں کا گیت ان کا ترانۂ حمد تھا، ظہورِ اسلام کے بعد بھی جو عرب سیاح یہاں آتے رہے انہوں نے تپسیا کرنے والے جوگیوں کے وہ دردناک حالات لکھے ہیں جن کی حالت پر رحم و افسوس آتا ہے۔ (۱) اور اسی طرح وہ عرب سیاح جو سندھ اور دکن کے شہروں اور ساحلوں سے گزرے ہیں، انہوں نے معبدوں میں پجاری عورتوں اور دیوداسیوں کی جو اخلاقی کیفیتیں لکھی ہیں (۲) وہ حد درجہ شرمناک ہیں اور اس سے زیادہ شرمناک یہ ہے کہ یہ سب خدا کی خوشنودی اور مذہبی عقیدہ کی رو سے انجام دیا جاتا تھا۔

عورتیں جوؤں میں ہاری جاتی تھیں، ایک عورت کے کئی شوہر ہوتے تھے۔ (۳) وہ بیوہ ہو کر زندگی کی ہر لذت سے عمر بھر کے لیے قانوناً محروم کر دی جاتی تھیں، اور اسی لیے شوہر کے مرنے پر بعض عورتیں زندہ درآتش ہونا پسند کرتی تھیں، لڑائی میں شکست کے خوف کی صورت میں ان کو خود ان کے باپ بھائی اپنے ہاتھوں سے قتل کر ڈالتے تھے، یہاں کے بعض فرقوں میں عورتیں مرد کو اور مرد عورتوں کو ننگا کر کے ان کی پوجا کرتے تھے۔ (۴) اور مذہبی تہواروں میں شراب پی پی کر ایسے بدمست ہوتے تھے کہ پھر انہیں ماں، بہن، بیٹی اور اپنی پرائی کی تمیز باقی نہیں رہتی تھی اور اس کو وہ نیکی کا کام سمجھتے تھے، شودروں کے نام سے ایک پوری قوم کی قوم ایسی غلامی میں مبتلا تھی کہ تعلیم و تربیت، تہذیب واخلاق اور دین وایمان ہر چیز سے محروم رہنا اس کا فرض تھا، وید کی آواز بھی اس کے کان میں پڑ جائے تو اس میں سیسہ پگھلا کر ڈال دینے کا حکم تھا۔

راجاؤں کی بیویوں کی کوئی تعداد قانوناً مقرر نہ تھی، قانون کی بنیاد مساواتِ انسانی پر نہیں بلکہ ذاتوں پر تھی، عورتیں فروخت کی جاتی تھیں۔

اس مختصر خاکہ سے معلوم ہوگا کہ بدءِ اسلام سے ایک صدی پیشتر سے دیوتاؤں کی یہ جنم بھومی بھی شیطانوں کے اس جال میں گرفتار تھی جس کے شکار فارس وروم ہو رہے تھے۔

یہود

دنیا کی آبادی اور اصلاح کی سب سے زیادہ امید اس قوم سے ہو سکتی ہے جو سام کی اولاد میں سب سے

(۱) دیکھو ابوزید سیرانی سفرنامہ ص ۱۱۵، ۱۱۸ پیرس وآثار البلاد قزوینی ص ۸۱۔

(۲) سفرنامہ ابوزید ص ۱۳۰ واحسن التقاسیم مقدسی ص ۴۸۳

(۳) مہابھارت کے قصہ کا آغاز پڑھو۔

(۴) سیتارتھ پرکاش سملاں گیارہ ص ۳۷۹، ۳۷۸ مطبوعہ سیوک اسٹیم پریس لاہور ۱۹۱۲ء۔

پہلے وحیِ الٰہی کی امانت دار بنی' اسی لیے قرآن نے ان سے کہا ﴿وَ لَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۭ بِهٖ﴾ (البقرہ:۴۱)
''اور سب سے پہلے تم ہی پیغامِ الٰہی کے منکر نہ بنو'' مگر یہ قوم سخت جان ہونے کے ساتھ سنگ دل بھی ثابت ہوئی۔ اس نے پتھروں کے سینوں کو پھٹتے اور ان کی چھاتیوں سے میٹھے پانی کا دودھ بہتے دیکھا اور پیا' مگر پھر بھی اس کے سینہ کا دل پتھر ہی رہا' قرآن نے اپنے زمانہ میں اس کو طعنہ دیا:

﴿فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً﴾ (البقرہ:۷۴)
''ان کے دل پتھروں کے مانند بلکہ ان سے بھی بڑھ کر سخت ہیں۔''

اس نے مختلف زمانوں میں اپنے پیغمبروں کو جھٹلایا' ان کو تکلیفیں دیں۔ بلکہ ان کو قتل تک کر ڈالا' حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے بعد کوئی پیغمبر ان میں ایسا نہ آیا جس نے ان کی سنگ دلی کا ماتم نہ کیا ہو اور ان کی سرکشی پر ان کے حق میں بددعا نہ کی ہو چنانچہ قرآن مجید نے کہا:

﴿لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰى لِسَانِ دَاوٗدَ وَ عِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوا وَّ كَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ○ كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ○﴾ (مائدہ:۷۸'۷۹)
''بنی اسرائیل میں سے جنہوں نے کفر کیا ان پر داؤدؑ اور مریم کے بیٹے عیسیٰ علیہ السلام کی زبان سے لعنت کی گئی یہ اس لیے کہ انہوں نے نافرمانی کی اور حد سے آگے بڑھتے تھے اور ایک دوسرے کو اس برائی سے جو وہ کرتے تھے' منع نہیں کرتے ان کا کام کتنا برا ہے۔''

حضرت داؤدؑ نے زبور میں کئی دفعہ بنی اسرائیل کی سرکشی اور نافرمانی کا ماتم اپنے سوز و گداز کی لے میں کیا ہے زبور ۷۸ میں ہے۔

''اے میرے گروہ! میری تعلیم پر کان رکھو' میرے منہ کی باتیں کان دھر کے سنو تا کہ آنے والی پشت سے وہ فرزند جو پیدا ہوں سیکھیں اور وہ خدا پر توکل کریں اور خدا کے کاموں کو بھلا نہ دیں اس کے حکموں کا تحفظ کریں اور اپنے باپ دادوں کی طرح ایک شریر اور سرکش نسل نہ ہوں نہ ایسی نسل کہ جس نے اپنا دل مستعد نہ کیا اور ان کے جی خدا سے نہ لگے رہے باوجود اس سبب کے' پھر انہوں نے گناہ کیے اور اس کے عجائب قدرتوں کے سبب اعتقاد نہ کیا' لیکن انہوں نے اپنے منہ سے اس کے (خدا کے) ساتھ ریاکاری کی اور اپنی زبانوں سے اس سے جھوٹ بولے اور وہ اس کے عہد میں وفادار نہ رہے کیونکہ ان کے دل ان کے ساتھ نہ رہے کتنی بار انہوں نے بیابان میں اس (خدا) سے بغاوت کی اور ویرانہ میں اسے بیزار کیا' تس پر بھی انہوں نے خدا تعالیٰ کو آزمایا اور اسے بیزار کیا اور اس کی شہادتوں کو حفظ نہ کیا بلکہ برگشتہ ہوئے اور اپنے باپ دادوں کے مانند بے وفائی کی' وہ ٹیڑھی کمان کے مانند ایک طرف چلے گئے۔''

زبور ۸۱ میں ہے۔

''اے میرے لوگو! سنو کہ میں تجھ پر گواہی دوں گا' اے اسرائیل اگر تو میری سنے گا تو تیرے درمیان کوئی دوسرا معبود نہ ہو تو کسی اجنبی معبود کو سجدہ نہ کر' خداوند تیرا خدا میں ہوں جو تجھے مصر کی زمین سے باہر لایا۔ اپنا منہ کھول کہ اسے بھر دوں گا پر میرے لوگوں نے میری آواز پر کان نہ دھرا اور اسرائیل نے مجھے نہ چاہا' تب میں نے ان کے دلوں کی سرکشی کے بس میں چھوڑ دیا۔''

بہت سے بنی اسرائیل جو حضرت داؤدؑ سے باغی ہو کر لڑنے پر آمادہ تھے' حضرت داؤدؑ نے ان کے متعلق یہ دعا کی کہ:

''تو وہ خدا نہیں جو شرارت سے خوش ہو' شریر تیرے ساتھ رہ نہیں سکتا' جو شیخی باز ہیں تیری آنکھوں کے سامنے کھڑے نہیں رہ سکتے' تو سب بدکرداروں سے عداوت رکھتا ہے تو ان کو جو جھوٹ بولتے ہیں' نابود کر دے گا' اے خداوند اپنی صداقت میں میرا رہبر ہو' میرے دشمنوں کے سبب سے میرے سامنے اپنی راہ کو سیدھا کر' ان کے باطن میں سراسر کھوٹا پن ہے' اے خدا تو انہیں ملزم جان ایسا ہو کہ وہ اپنی مشورتوں سے آپ ہی گر جائیں ان کو ان کے گناہوں کی کثرت کے سبب نکال پھینک کہ انہوں نے تجھ سے سرکشی کی ہے۔'' (زبور:۵)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بھی انجیل میں بنی اسرائیل کو لعنت کی اور فرمایا:

''اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس کہ تم سفیدی پھری قبروں کے مانند ہو جو باہر سے بہت اچھی معلوم ہوتی ہیں پر بھیتر مردوں کی ہڈیوں' اور ہر طرح کی ناپاکی سے بھری ہیں' اسی طرح تم بھی ظاہر میں لوگوں کو راست باز دکھائی دیتے ہو باطن میں ریاکار اور شرارت سے بھرے ہو۔

''اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس کیونکہ نبیوں کی قبریں بناتے اور راست بازوں کی گوریں سنوارتے ہو اور کہتے ہو کہ ہم اپنے باپ دادوں کے دنوں میں ہوتے تو نبیوں کے خون میں ان کے شریک نہ ہوتے' اسی طرح تم اپنے اوپر گواہی دیتے ہو کہ تم نبیوں کے قاتلوں کے فرزند ہو' بس اپنے باپ دادوں کا پیمانہ بھرو' اے سانپو' اے سانپوں کے بچو! تم جہنم کے عذاب سے کیونکر بھاگو گے۔'' (متی ۲۳' ۳۷' ۲۳)

بعینہٖ یہی الزام قرآن نے بھی ان کو دیا ہے:

﴿وَ یَقْتُلُوْنَ النَّبِیّٖنَ بِغَیْرِ الْحَقِّ ذٰلِکَ بِمَا عَصَوا وَّ کَانُوْا یَعْتَدُوْنَ﴾ (البقرہ:۶۱)

''اور وہ ناحق پیغمبروں کو مار ڈالتے ہیں اس لیے کہ وہ نافرمان اور حد سے بڑھنے والے ہیں۔''

﴿قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْبِیَآءَ اللّٰہِ مِنْ قَبْلُ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ﴾ (البقرہ:۹۱)

''کہہ کہ پھر کیوں اللہ کے نبیوں کو تم پہلے قتل کرتے رہے' اگر تم مومن تھے۔''

آل عمران میں اس سے بھی بڑھ کر ہر حق کے داعی اور خیر کے مبلغ کے قتل کر دینے کا ان پر بجا الزام ہے۔

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْفُرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰہِ وَ یَقْتُلُوْنَ النَّبِیّٖنَ بِغَیْرِ حَقٍّ وَّ یَقْتُلُوْنَ الَّذِیْنَ یَاْمُرُوْنَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ فَبَشِّرْھُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ﴾ (آل عمران:۲۱)

''بے شک وہ لوگ جو اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے اور پیغمبروں کو ناحق قتل کرتے اور ہر اس شخص کی زندگی کے دشمن بن جاتے ہیں جو ان کو عدل و نیکی کی بات سمجھائے تو ان کو دردناک سزا کی خوش خبری سنا دے۔''

سورۂ بقرہ اور آل عمران میں یہودیوں کے ایک ایک عیب کو کھول کھول کر بیان کیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دین وملت کا قوام کتنا بگڑ گیا تھا۔ ان کی مذہبی سنگ دلی اور تعصب کا سب سے دردناک سانحہ وہ ہے جو اسلام سے ۵۰۔۶۰ برس پہلے یمن میں پیش آیا کہ یہودی حمیریوں نے نجران کے عیسائیوں کو گڑھوں میں آگ جلا کر ان میں جھونک دیا اور وہ کنارے بیٹھے اس حسرت ناک منظر کا تماشا دیکھتے رہے' چنانچہ قرآن مجید نے اس پر درد داستان کو ان لفظوں میں انہیں یاد دلایا:

﴿قُتِلَ اَصْحَابُ الْاُخْدُوْدِ ○ النَّارِ ذَاتِ الْوَقُوْدِ ○ اِذْ هُمْ عَلَيْهَا قُعُوْدٌ ○ وَّ هُمْ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ شُهُوْدٌ ○ وَّ مَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّآ اَنْ يُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ﴾ (البروج:۴۔۸)

''گڑھے والے لوگ مارے گئے' بھڑکتی آگ کے گڑھے جب وہ ظالم ان کے کنارے بیٹھے ایمان والوں کے ساتھ جو کر رہے تھے اس کو دیکھ رہے تھے' ان کا گناہ یہی تھا کہ وہ غالب اور خوبیوں والے خدا پر ایمان رکھتے تھے۔''

جزئیات کو چھوڑ کر کلی طریقہ سے ان میں حسب ذیل نقائص تھے:

(۱) ان کو اپنے محبوب خدا اور خاص خدا کے کنبہ ہونے پر بے انتہا غرور تھا وہ سمجھتے تھے کہ ہم کچھ کریں ہم سے قیامت میں مواخذہ نہ ہوگا۔

﴿نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَ اَحِبَّآءُ وْهُ﴾ (المائدہ:۱۸)

''ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے پیارے ہیں۔''

﴿وَ قَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً﴾ (البقرہ:۸۰)

''اور کہا کہ ہم کو دوزخ کی آگ ہرگز نہیں چھوئے گی لیکن چند روز۔''

وہ سمجھتے تھے کہ جنت کی نعمتیں صرف انہی کے لیے خاص ہیں' قرآن نے کہا:

﴿قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ﴾ (البقرہ:۹۴)

''کہہ دے کہ اگر آخرت کا گھر تمام لوگوں کو چھوڑ کر صرف تمہارے ہی لیے ہے تو موت کی آرزو کیوں نہیں کرتے' اگر تم سچے ہو۔''

وہ سمجھتے تھے کہ نبوت اور رسالت صرف ان کے گھر کی چیز ہے کسی دوسرے کا اس میں حق نہیں' قرآن نے

ان کے جواب میں کہا:

﴿ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَآءُ﴾ (جمعۃ:۴)

''یہ خدا کی مہربانی ہے وہ جس کو چاہے دے۔''

جوان میں پڑھے لکھے عالم تھے وہ خدا کے احکام کو اپنے منشا اور دولت مندوں کی خوش نودی کے لیے اپنی باطل تاویلوں سے ادلتے بدلتے رہتے تھے اور اپنی تصنیفات اور اجتہادات کو کتاب الٰہی کا درجہ دیتے تھے:

﴿یُحَرِّفُوْنَ الْکَلِمَ مِنْ ۢ بَعْدِ مَوَاضِعِہٖ﴾ (المائدہ:۴۱)

''وہ لفظوں کو اپنی مناسب جگہوں سے ہٹا دیتے ہیں۔''

﴿فَوَیْلٌ لِّلَّذِیْنَ یَکْتُبُوْنَ الْکِتٰبَ بِاَیْدِیْھِمْ ثُمَّ یَقُوْلُوْنَ ھٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ لِیَشْتَرُوْا بِہٖ ثَمَنًا قَلِیْلًا فَوَیْلٌ لَّھُمْ مِّمَّا کَتَبَتْ اَیْدِیْھِمْ وَ وَیْلٌ لَّھُمْ مِّمَّا یَکْسِبُوْنَ﴾ (البقرہ:۷۹)

''تو پھٹکار ہو ان پر جو اپنے ہاتھوں سے کتاب لکھتے ہیں پھر کہتے ہیں' یہ خدا کی طرف سے ہے تا کہ وہ اس سے دنیا کا معمولی فائدہ اٹھائیں تو پھٹکار ہے ان پر جو وہ لکھتے ہیں اور پھٹکار ہو ان پر جو وہ کماتے ہیں۔''

جوان میں ان پڑھ اور جاہل تھے وہ اپنے سنے سنائے قصوں پر ایمان رکھتے تھے۔

﴿وَ مِنْھُمْ اُمِّیُّوْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ الْکِتٰبَ اِلَّآ اَمَانِیَّ وَ اِنْ ھُمْ اِلَّا یَظُنُّوْنَ﴾ (البقرہ:۷۸)

''اور ان میں بعض ان پڑھ ہیں جن کو کتاب کا علم نہیں لیکن بناوٹی باتیں معلوم ہیں' وہ صرف ان کے خیالات ہیں۔''

احکامِ الٰہی میں سے جو آسان اور ضرورت کے مطابق حکم ہوتا اس کو قبول کرتے اور دوسرے حکموں کو پسِ پشت ڈالتے۔

﴿نَبَذَ فَرِیْقٌ مِّنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ کِتَابَ اللّٰہِ وَ رَآءَ ظُھُوْرِھِمْ کَاَنَّھُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ﴾ (البقرہ:۱۰۱)

''جن کو خدا کی کتاب دی گئی تھی ان میں سے ایک فریق اللہ کی کتاب پس پشت ڈالتا ہے' گویا کہ وہ جانتا ہی نہیں۔''

﴿اَفَکُلَّمَا جَآءَ کُمْ رَسُوْلٌ ۢ بِمَا لَا تَھْوٰٓی اَنْفُسُکُمُ اسْتَکْبَرْتُمْ فَفَرِیْقًا کَذَّبْتُمْ وَ فَرِیْقًا تَقْتُلُوْنَ﴾ (بقرہ:۸۷)

''کیا جب کوئی رسول تمہارے پاس وہ لے کر آیا جو تمہاری نفسانی خواہش کے موافق نہ ہو' تم نے غرور کیا تو کچھ کو جھٹلایا اور کچھ کو مار ڈالتے ہو۔''

ایک دفعہ جب آنحضرت ﷺ مدینہ تشریف لا چکے تھے اور یہود نے بھی آپؐ کی ملکی سرداری کو ایک گونہ

قبول کرلیا تھا تو ایک زنا کا مقدمہ آپؐ کی عدالت میں لائے' آپؐ نے پوچھا کہ تمہارے مذہب میں اس جرم کی سزا کیا ہے؟ بولے ہم مجرم کو کوڑے مارتے ہیں' اور اس کی تشہیر کرتے ہیں' آپؐ نے ان سے توراۃ طلب فرمائی جب وہ لائے اور اس جرم کے متعلقہ حکم کی آیتوں کو پڑھ کر سنانے لگے تو بیچ سے سنگ ساری کا حکم چھپا دیا مگر ایک نومسلم یہودی عالم نے اس حکم کو پڑھ کر بتا دیا۔ آپ نے فرمایا خداوندا میں پہلا شخص ہوں گا جو تیرے مردہ حکم کو زندہ کرے گا (صحیح بخاری و مسلم کتاب الحدود ابوداؤد باب رجم الیہود بین۔)

آپس میں قتل وخون ریزی کا بازار ان میں گرم تھا۔ ایک طاقت ور قبیلہ دوسرے کمزور قبیلہ کو گھر سے بے گھر کر دیتا تھا اور پھر کوئی گرفتار ہو جاتا تو فدیہ دے کر اس کو چھڑا بھی لیتے تھے' قرآن نے کہا:

﴿ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَ تُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ تَظٰهَرُوْنَ عَلَيْهِمْ بِالْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ وَ اِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى تُفٰدُوْهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَ تَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ﴾ (بقرہ:۸۵)

''پھر تم ہی لوگ آپس میں ایک دوسرے کو قتل کرتے اور ایک گروہ کو ان کے گھروں سے نکالتے ہو' ان کے برخلاف گناہ اور ظلم سے مدد کرتے ہو' اور اگر وہ تمہارے پاس قیدی بن کر آتے تو تم فدیہ دے کر چھڑاتے ہو' حالانکہ ان کا نکالنا تم پر حرام تھا' کیا تم کتاب کے کچھ حکموں کو مانتے اور کچھ کا انکار کرتے ہو۔

(۲) دوسری چیز مال و دولت کی حرص وطمع تھی۔ اس کی وجہ سے ان میں ہر قسم کا لالچ اور اخلاقی کمزوری پیدا ہوگئی تھی کسی بڑے کام کی خاطر وہ اپنی راحت وآرام اور جسم وجان کو قربان نہیں کر سکتے تھے۔

﴿وَ لَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ وَ مِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا يَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ﴾ (البقرہ:۹۶)

''ان کو سب لوگوں سے زیادہ زندگی کا لالچی پاؤ گے مشرکوں سے بھی زیادہ' ان میں ایک ایک چاہتا ہے کہ اس کو ہزار برس کی زندگی ملے۔''

عربوں کے ساتھ ان کے لین دین کے تجارتی تعلقات قائم تھے' مگر وہ سخت نادہند تھے اور سمجھتے تھے کہ عربوں کے ساتھ جس قدر سختی اور بددیانتی کا برتاؤ کیا جائے وہ مذہباً منع نہیں' قرآن نے اس معاملہ میں عیسائی اہلِ کتاب کی تعریف کے بعد اسرائیلی اہلِ کتاب کی نسبت فرمایا:

﴿وَ مِنْهُمْ مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِدِيْنَارٍ لَّا يُؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ اِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَآئِمًا ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَيْسَ عَلَيْنَا فِى الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ وَ يَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَ هُمْ يَعْلَمُوْنَ﴾ (آل عمران: ۷۵)

''کتاب والوں میں بعض ایسے ہیں کہ اگر ان کو ایک دینار بھی امانت رکھنے کے لیے دو' وہ تم کو اس وقت

تک واپس نہ دیں جب تک تم ان کے سر پر کھڑے نہ رہو اس لیے کہ وہ کہتے ہیں کہ ان جاہل عربوں کا ہم پر حق نہیں' اور وہ جان بوجھ کر خدا پر جھوٹ بولتے ہیں۔''

توراۃ میں ''اپنے بھائی'' کے علاوہ ''اجنبی'' سے سود لینے کی اجازت کا مطلب وہ یہ لیتے تھے کہ یہود' یہود سے نہ لیں اور اہل عرب جو یہود نہ تھے' ان سے بھاری بھاری شرحِ سود وصول کرنا جائز سمجھتے تھے اور تعجب پر تعجب یہ تھا کہ ان کے علما ان کو اس سے باز نہیں رکھتے تھے' اس حرام خوری اور ان کے علما کی اس خاموشی پر ان کو قرآن نے بار بار ٹوکا:

﴿وَ تَرٰی كَثِیْرًا مِّنْهُمْ یُسَارِعُوْنَ فِی الْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ وَ اَكْلِهِمُ السُّحْتَ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ○ لَوْ لَا یَنْهٰهُمُ الرَّبّٰنِیُّوْنَ وَ الْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَ اَكْلِهِمُ السُّحْتَ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا یَصْنَعُوْنَ○﴾ (المائدہ۶۲:۶۳)

''اور ان میں سے بہتوں کو تو دیکھے گا کہ وہ گناہ اور ظلم کرنے میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی کوشش کرتے ہیں اور ان کے کرتوت کتنے برے ہیں' ان کے درویش اور عالم گناہ کی بات بولنے اور حرام کھانے سے کیوں نہیں باز رکھتے ان کے کام درحقیقت کتنے خراب ہیں۔''

﴿سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ﴾ (مائدہ:۴۲)

''جھوٹ کو سننے والے اور حرام کو کھانے والے ہیں۔''

﴿وَ اَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَ قَدْ نُهُوْا عَنْهُ وَ اَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ﴾ (نساء:۱۶۱)

''اور ان کے سود لینے کے سبب' حالانکہ وہ اس سے روکے گئے تھے اور لوگوں کا مال ناجائز طریقوں سے کھا جانے کی وجہ سے۔''

اسی لیے وہ تورات کی آیتوں میں تحریف اور ان کے معنوں میں تاویل کر کے ایسے فقہی حیلے تراشتے تھے کہ ان سے ہر حکم کو اپنے مطلب کے مطابق بنا لیتے تھے' خدا نے فرمایا:

﴿اِنَّاۤ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِیْهَا هُدًی وَّ نُوْرٌ یَحْكُمُ بِهَا النَّبِیُّوْنَ الَّذِیْنَ اَسْلَمُوْا لِلَّذِیْنَ هَادُوْا وَ الرَّبّٰنِیُّوْنَ وَ الْاَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ﴾ (المائدۃ:۴۴)

''ہم نے توراۃ اتاری جس میں ہدایت اور روشنی ہے اسی کے مطابق نبی جو تابعدار تھے یہودیوں کا فیصلہ کرتے تھے' ان کے درویش و عالم بھی خدا کی کتاب کے جن حصوں کو انہوں نے بچا رکھا تھا ان میں سے فیصلہ کرتے۔''

اس کے بعد اس کے احکام کے اجرا اور خاص کر قصاص کا ذکر کیا اور فرمایا:

﴿وَ مَنْ لَّمْ یَحْكُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ﴾ (المائدہ:۴۴)

''اور جو خدا کے اتارے ہوئے حکم کے مطابق فیصلہ نہ کرے وہی لوگ کافر ہیں۔''

ان میں مشرکانہ بت پرستی کے بھی بعض اثرات پیدا ہو گئے' وہ جبت اور طاغوت کی پرستش میں مبتلا تھے' قرآن ان کو خطاب کر کے کہتا ہے:

﴿یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ﴾ (النساء:۴۷)

''اے کتاب والو! ہم نے جو اتارا وہ تمہاری کتاب کی تصدیق کرتا ہے اس پر ایمان لاؤ۔''

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَكَ بِهٖ وَ یَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ یَّشَآءُ﴾ (النساء:۴۸)

''بے شک خدا شرک کو معاف نہیں کرتا اور اس کے سوا جس کو چاہے معاف کر دے۔''

﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْنَ اُوْتُوْا نَصِیْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ یُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَ الطَّاغُوْتِ وَ یَقُوْلُوْنَ لِلَّذِیْنَ كَفَرُوْا هٰۤؤُلَآءِ اَهْدٰى مِنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سَبِیْلًا﴾ (النساء:۵۱)

''کیا تو نے ان کو نہیں دیکھا جن کو کتاب کا ایک حصہ دیا گیا' وہ بتوں اور شیطانوں پر ایمان رکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ کافر مسلمانوں سے زیادہ صحیح راستہ پر ہیں۔''

اوہام و خرافات پر ان کا ایمان تھا۔ تعویذ' گنڈا' جادو اور عملیات پر فریفتہ تھے اور سمجھتے تھے کہ یہ حضرت سلیمانؑ کی تعلیم ہے۔ (بقرہ ۱۰۲) لبید اعصم وغیرہ مدینہ میں بہت سے عامل تھے جو کنگھیوں اور بالوں میں منتر پڑھ کے پھونکتے تھے۔ (۱)

عرب سے باہر یہودی' یونانیوں اور رومیوں کی حکومتوں میں یورپ' افریقہ اور ایشیا کے مختلف ملکوں اور شہروں میں اس طرح پراگندہ اور منتشر تھے کہ عرب سے باہر دنیا کی قوموں میں ان کا کوئی شمار نہ تھا' عرب کے اندر جو یہود زمانۂ دراز سے آباد تھے ان کا بڑا شغل زراعت اور تجارت تھا' سودی کاروبار کرتے تھے' غریب عربوں کو اپنے گراں شرح سود اور قرضوں کے بار میں اس طرح دبائے ہوئے تھے کہ ان کی حالت ان کے سامنے غلاموں کی سی تھی' اس سلسلہ میں صرف ایک واقعہ کا ذکر پوری حالت کے اندازہ کے لئے کافی ہوگا۔

محمدؓ بن مسلمہ انصاری اور ان کے رفقا جو مدینہ کے یہودی سردار کعب بن اشرف کے قتل پر مامور ہوئے تھے' وہ اس سے ملنے اور بات چیت کرنے گئے' انہوں نے اس سے کہا۔ اے کعب! اس شخص (محمد رسول ﷺ) نے تو صدقہ وصول کر کر کے ہم کو دق کر ڈالا' اب میں تم سے کچھ قرض لینے آیا ہوں۔ اس نے کہا خدا کی قسم! مجھے معلوم تھا کہ تم اس سے آخر بیزار ہو جاؤ گے' (۲) انہوں نے کہا کہ میں نے اس کی پیروی اختیار کی ہے لیکن میں اس کو چھوڑنا نہیں چاہتا' انتظار ہے کہ معاملہ کی صورت کس رخ پلٹتی ہے میں تم سے کچھ غلہ قرض لینے آیا ہوں' اس نے کہا مگر تم کفالت میں کیا چیز رہن رکھو گے' انہوں نے کہا تم بتاؤ کیا چاہتے ہو' اس نے کہا اپنی بیویاں گروی رکھو' انہوں نے جواب دیا ہم اپنی بیویاں کیسے گروی رکھ سکتے ہیں کہ تمام عرب میں تمہارے حسن کا جواب نہیں' بولا اچھا تو اپنے

(۱) صحیح بخاری جلد دوم کتاب الطب باب السحر ص ۲۵۷۔

(۲) صحیح بخاری جلد دوم قتل کعب بن اشرف ص ۵۷۶۔

لڑکوں کو گروی رکھو' کہا ہم اپنے لڑکوں کو کیسے گروی رکھیں' ان کی کوئی بے عزتی نہ کرے' یہ ہمارے لیے بڑی شرم کی بات ہے' ہاں اپنے ہتھیار گروی رکھ سکتے ہیں۔ (۱)

اس سوال و جواب سے اندازہ ہوگا کہ یہود کی اخلاقی حالت کتنی پست اور ذلیل ہو چکی تھی کوئی غیر عورت اگر ان کے بازار کی طرف جا نکلتی تو اس کی عزت بچنی مشکل ہو جاتی۔ (۲) کسی بچہ کو معمولی سے زیور کے لالچ میں موقع پاتے تو بیدردی سے قتل کر کے زیور اتار لیتے۔ (۳) علما اور پیشوایانِ دین کی وہی کیفیت تھی' جس کا ماتم اس وقت سے چھ سو برس پیشتر حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کیا تھا' لفظی موشگافیوں اور ظاہری دینداری کے سوا روح و اخلاق کا جوہر ان سے کھو گیا تھا' اسلام جو ابراہیمؑ حنیف کے ترانۂ توحید اور طور کی صدائے غیبی کی آوازِ بازگشت تھا' وہ ان کے نزدیک عرب کے بت پرستوں کے جاہلانہ مذہب سے زیادہ برا تھا وہ کہتے تھے' کہ ''ان مسلمانوں سے یہ مشرک زیادہ راہ راست پر ہیں (۴) اسلام کی اس مصالحانہ دعوت

﴿یٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَ لَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّ لَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ (آل عمران:۶۴)

''اے کتاب والو! آؤ اس ایک بات پر ہم سب متحد ہو جائیں جو ہم میں تم میں مشترک ہے کہ ہم خدا کے سوا کسی کو اپنا معبود نہ بنائیں اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہرائیں اور نہ ہم خدا کو چھوڑ کر ایک دوسرے کو اپنا رب بنائیں۔''

میں بھی عداوت اور دشمنی ہی کی جھلک دکھائی دیتی تھی اس لیے مدینہ میں اسلام کی صلح کی ہر کوشش کو وہ ٹھکراتے رہے کیونکہ روحانی عظمت کے مقابلے میں اس دعوت کے قبول کرنے میں ان کو اپنی قومی و مالی و تجارتی عظمت کی بربادی نظر آتی تھی۔

عیسائیوں کی نقل میں وہ بھی عزیر علیہ السلام (عزرا) کو خدا کا بیٹا کہتے تھے ﴿وَ قَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ۨ ابْنُ اللّٰهِ﴾ (التوبہ:۳۰) اپنی دولت و ثروت کے غرور میں وہ کہتے تھے ﴿يَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ﴾ (مائدہ:۶۴) خدا کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں۔'' قرآن کی دعوت کے جواب میں کہتے تھے کہ ہم پر اس دعوت کا اثر نہیں ہو سکتا کہ ہمارے دل نامختون ہیں ﴿وَ قَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ﴾ (بقرہ:۱۱) ان فقروں سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ اب دنیا میں نیابتِ الٰہی کے منصب کے قابل نہیں رہے تھے۔

عرب کے باہر یہودیوں کی پراگندہ ٹولیاں مختلف سلطنتوں کے سایہ میں پناہ گزیں تھیں' ان کا مذہبی مرکز ان

(۱) دیکھو کتب سیر میں غزوۂ بنی نضیر کے اسباب۔
(۲) صحیح بخاری جلد دوم باب من اقاد یحجر ص ۱۰۱۶۔
(۳) نساء ۸۔
(۴) سیرت ابن ہشام ذکر بیعتِ عقبہ۔

کے ہاتھ سے نکل چکا تھا' سیاسی اہمیت وہ مدت ہوئی کہ کھو چکے تھے' ان کے مذہبی فرقوں کی تعداد بڑھتی جاتی تھی جن میں باہمی عداوت قائم تھی اور اس وقت سے چھ سو برس پہلے کی طرح بنی اسرائیل اب پھر ایک نبیِ اعظم کی بعثت کا بیتابانہ انتظار کر رہے تھے (بقرہ:۸۹) خود عرب میں یہود اس وقت اسی نبی کے جلد پیدا ہونے کی بشارت کا اپنی مجلسوں میں تذکرہ کرتے رہتے تھے جس کی پیشین گوئیوں سے توراۃ کے صحیفے بھرے تھے اور ان ہی سے سن سن کر یثرب کے اوس وخزرج ایک نبی کی پیشین گوئی سے باخبر تھے۔

دنیا کی ان مختلف قوموں کے حالات پر ایک اجمالی نظر ڈالنے کے بعد ضرورت ہے کہ اس قوم کے حالات پر یک تفصیلی نظر ڈالی جائے' جس کے وطن کے افق سے نبوت کی صبحِ سعادت طلوع ہونے والی تھی۔

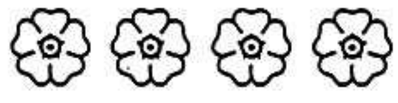

ظہورِ اسلام کے وقت عرب کی مذہبی و اخلاقی حالت

یمن میں جب وہ مشہور سیلاب آیا جس کی بلندی سطح زمین سے ایک سو بیس فٹ تھی تو اس کا پائے تخت مآرب اور اس کے اضلاع دفعتاً برباد ہو گئے' یہ دوسری صدی عیسوی کا واقعہ ہے'(۱) قرآن مجید نے اسی سیلاب کو سیلِ عرم کہا ہے' اس سیلاب کا ایک یہ نتیجہ ہوا کہ آٹھ بڑے بڑے خاندان جلاوطن ہو کر ادھر ادھر نکل گئے جس سے نظامِ سلطنت میں ضعف آ گیا' چھٹی صدی عیسوی میں یہاں کے فرمان روا ذونواس سے جو مذہباً یہودی تھا رعایا نے بغاوت کی اور شاہِ حبش سے اعانت چاہی اس نے ۵۰۹ء میں ایک فوج بھیجی جس نے ذونواس کو معزول کر دیا اور اس خاندان کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا' ۶۰۳ء میں قبیلۂ حمیر کے ایک باحوصلہ شخص ذویزن نے فارس کی مدد سے اپنا ملک واپس لیا' لیکن چند روز کے بعد وہ قتل کر دیا گیا' اور یمن شاہنشاہیٔ فارس کا ایک معمولی صوبہ رہ گیا۔

جو قبیلے یمن سے نکلے' ان میں سے ایک نے دوسری صدی عیسوی میں حیرہ میں جہاں اب کوفہ آباد ہے ایک سلطنت قائم کی لیکن وہ فارس کے زیر اثر اور مذہبی خیالات میں مجوس سے متاثر تھی' دوسرا قبیلہ شام میں جا کر آباد ہوا جو غسانی خاندان کہلاتا ہے'(۲) چونکہ یہ خاندان رومیوں کے زیرِ اثر تھا' اس لیے رفتہ رفتہ عیسائی ہو گیا' اور اسلام کے زمانہ تک عیسائی رہا۔

غرض عرب کے اصلی تمدن پر بیرونی اثر جو کچھ پڑا تھا وہ مجوسیت یا نصرانیت کا تھا' یہودی معتقدات اور خیالات کا اثر بھی بہت کچھ تھا' جس کی وجہ یہ تھی کہ عرب کا ایک بڑا حصہ یعنی وادی القریٰ اور خیبر و فدک تمام تر یہودی آبادیاں تھیں اور خود مدینہ میں یہودی ہی صاحبِ اقتدار اور صاحبِ حکومت تھے' باقی تمام ملک میں مشرکانہ رسوم جاری اور جاہلانہ مذاہب پھیلے تھے' لوگ بتوں' پتھروں' درختوں' ستاروں' فرشتوں اور جنوں کی پرستش کرتے تھے۔

خدا کا اعتقاد

تاہم اس میں شبہ نہیں کہ عرب زمانۂ دراز سے ایک خدائے برتر پر اعتقاد رکھتے تھے' آج کل عرب کے جو

---

(۱) اس بند کے انہدام کی تاریخ کی تعیین مشکل ہے اور اسی لیے اس کی تعیین میں کئی نظریے ہیں' ایک اس کو دوسری صدی عیسوی کا واقعہ بتاتا ہے تو دوسرا پانچویں صدی عیسوی کا اصلیت معلوم ہوتی ہے کہ اس بند کے مختلف حصے مختلف زمانوں میں منہدم ہوتے رہے اور بنتے رہے آخری دفعہ پانچویں صدی عیسوی میں بالکل برباد ہو گیا۔ (سلیمان)

(۲) اکثر علمائے انساب کا بیان ہے کہ یہ قبائل یمن سے آئے تھے لیکن میں نے ارض القرآن میں بدلائل اس سے اختلاف کیا ہے (سلیمان)

ریم کتبات دستیاب ہوئے ہیں اس پر اللہ کا لفظ خدا کے معنی میں لکھا ہوا ہے البتہ اس کا املا اللہ نہیں بلکہ ھلہ ہے' رب شمال کے عرب جو نابتی کہلاتے ہیں ان کے ناموں کے ساتھ اللہ کا لفظ بھی شامل ہوتا تھا مثلاً زید اللہی عبد لہی۔ (۱) خود قرآن مجید میں خدا کفار کی نسبت کہتا ہے۔

﴿وَ لَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ﴾ (لقمان:۲۵)

''اور جو تم ان سے پوچھو کہ آسمان اور زمین کو کس نے پیدا کیا ہے تو بول اٹھیں گے کہ خدا نے' تم کہو کہ خدا کا شکر ہے۔''

یہ اصل میں حضرت ابراہیمؑ کی تعلیم تھی' لیکن رفتہ رفتہ شرک کا اعتقاد پیدا ہوا' یعنی یہ کہ خدائے اعظم کے سوا ور بھی چھوٹے چھوٹے خدا ہیں گو اللہ ان سب میں بڑا ہے' یہ اعتقاد اس قدر راسخ ہو گیا کہ معبودوں کے انکار سے سی قدر رنج ہوتا تھا جس قدر خود خدا کے انکار سے ہو سکتا تھا بلکہ چونکہ ان کے نزدیک دنیا کا کاروبار اور روزمرہ کی ضرورتیں ان ہی چھوٹے چھوٹے خداؤں سے انجام پاتی تھیں اور کام اکثر ان ہی خداؤں سے پڑتا تھا اس لیے اللہ کا خیال کچھ یونہی سا رہ گیا تھا' ان ہی خداؤں کی پرستش کرتے تھے' ان ہی پر قربانی چڑھاتے تھے' ان ہی سے حاجتیں مانگتے تھے' اللہ تو زمین و آسمان بنا کر بے کار سا ہو چکا تھا' جو کچھ کرتے تھے یہی خدایانِ اصغر کرتے تھے' یہی سبب تھا کہ کوئی شخص اللہ کا خالی نام لیتا تھا تو لوگ بہت کبیدہ ہوتے تھے:

﴿وَاِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَاَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَاِذَا ذُكِرَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ﴾ (الزمر:۴۵)

''اور جب خالی اللہ کا نام لیا جاتا ہے تو یہ لوگ جو قیامت کے معتقد نہیں ہیں' ناک بھوں چڑھاتے ہیں لیکن جب خدا کے سوا اوروں (معبودوں) کا بھی ذکر کیا جائے تو دفعۃً وہ کھل جاتے ہیں۔''

اور سمجھتے تھے کہ ان چھوٹے معبودوں کی نذر و نیاز قربانی سے خدا خوش ہوگا اور وہ اس کے دربار میں سفارش کریں گے چنانچہ وہ کہتے تھے:

﴿مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى﴾ (الزمر:۳)

''اور ہم ان بتوں کو اس لیے پوجتے ہیں کہ وہ ہم کو خدا کے قریب کر دیں۔''

ملائکہ کی الوہیت

شرک کے علاوہ خدائے اعظم کی نسبت یہ مانتے تھے کہ اس کے بال بچے بھی ہیں' چنانچہ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہتے تھے:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ لَيُسَمُّوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ تَسْمِيَةَ الْاُنْثٰى﴾ (النجم:۲۷)

(۱) مذاہب و اخلاق کی انسائیکلوپیڈیا ج اول ص ۴۲۴ بحوالہ پروفیسر نولدیکی۔

﴿اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْاُنْثٰى ○ تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى﴾ (النجم۲۱:۲۲)

''جولوگ قیامت پرایمان نہیں لاتے وہ فرشتوں کوخدا کی بیٹیاں کہتے ہیں۔تمہارے تو لڑکے ہوں اور خدا کے لڑکیاں یہ تو کچھ اچھی تقسیم نہیں۔''

اس لیے جس طرح بعض یہود حضرت عزیرؑ کواور نصاریٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کوخدائی کا مستحق سمجھتے تھے وہ فرشتوں کوخدا کی اولاد سمجھ کران کی الوہیت کے بھی قائل تھے:

﴿وَ لَا يَاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُ الْمَلٰٓئِكَةَ وَ النَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا﴾ (آل عمران:۸۰)

''اورنہ خداتم کواس کا حکم دیتا ہے کہ فرشتوں اور پیغمبروں کوخدا ٹھہراؤ۔''

﴿وَ جَعَلُوْا لَهٗ مِنْ عِبَادِهٖ جُزْءًا اِنَّ الْاِنْسَانَ لَكَفُوْرٌ مُّبِيْنَ ○ اَمِ اتَّخَذَ مِمَّا يَخْلُقُ بَنٰتٍ وَّ اَصْفٰىكُمْ بِالْبَنِيْنَ ○﴾ (الزخرف۱۵:۱۶)

''اوران مشرکوں نے خدا کے بندوں میں سے خدا کا ایک حصہ بنایا' بے شک انسان کھلا نافرمان ہے' کیا خدا جو پیدا کرتا ہے وہ اپنے لیے لڑکیاں لے اورتم کولڑکے دے کرعزت دے۔''

﴿وَ جَعَلُوا الْمَلٰٓئِكَةَ الَّذِيْنَ هُمْ عِبٰدُ الرَّحْمٰنِ اِنَاثًا اَشَهِدُوْا خَلْقَهُمْ سَتُكْتَبُ شَهَادَتُهُمْ وَ يُسْئَلُوْنَ ○ وَ قَالُوْا لَوْ شَآءَ الرَّحْمٰنُ مَا عَبَدْنٰهُمْ﴾ (الزخرف:۱۹'۲۰)

''اوران مشرکوں نے فرشتوں کو جو رحمت والے خدا کے بندے ہیں' لڑکیاں قرار دیا' کیا وہ ان کی پیدائش کے وقت موجود تھے ان کی گواہی لکھی اور باز پرس کی جائے گی اور کہتے ہیں کہ اگر خدا نہ چاہتا تو ہم ان کی پرستش نہ کرتے۔''

﴿فَاسْتَفْتِهِمْ اَلِرَبِّكَ الْبَنٰتُ وَ لَهُمُ الْبَنُوْنَ ○ اَمْ خَلَقْنَا الْمَلٰٓئِكَةَ اِنَاثًا وَّ هُمْ شٰهِدُوْنَ ○ اَلَآ اِنَّهُمْ مِّنْ اِفْكِهِمْ لَيَقُوْلُوْنَ ○ وَلَدَ اللّٰهُ وَ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ○﴾ (الصافات:۱۴۹۔۱۵۲)

''توان سے پوچھو کہ کیا تیرے رب کی لڑکیاں ہوں اوران کے لڑکے ہوں' کیا ہم نے فرشتوں کولڑکیاں پیدا کیا اور وہ حاضر تھے' ہاں یہ ان مشرکوں کی بناوٹ ہے وہ کہتے ہیں کہ خدا کے اولاد ہوئی اور وہ جھوٹے ہیں۔''

ان کا یہ بھی اعتقاد تھا کہ یہ فرشتے خدا کے ہاں اپنے پرستاروں کے سفارشی بنیں گے' خدا نے اس کی تردید میں کہا۔

﴿وَ كَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِى السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِىْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اَنْ يَّاْذَنَ اللّٰهُ﴾ (النجم:۲۶)

''اورآسمانوں میں کتنے فرشتے ہیں کہ ان کی سفارش خدا کی اجازت کے بغیر کچھ فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔''

قیامت میں فرشتوں سے پرسش ہوگی کہ یہ مشرک تمہاری پوجا کرتے تھے۔

﴿ثُمَّ يَقُوْلُ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اَهٰٓؤُلَآءِ اِيَّاكُمْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ﴾ (سبا:۴۰)

''پھر خدا فرشتوں سے کہے گا کہ کیا یہ انسان تم ہی کو پوجتے تھے۔''

جنات کی الوہیت

فرشتوں کی طرح وہ جنات کو بھی خدا کا عزیز و قریب سمجھتے تھے اور خدا کے ان سے رشتے لگاتے تھے۔

﴿وَ جَعَلُوْا بَيْنَهٗ وَ بَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا﴾ (الصّٰفّٰت:۱۵۸)

''اور مشرکوں نے خدا اور جنوں کے درمیان رشتہ داری بنائی۔''

اسی لیے وہ جنات کو خدا کی خدائی میں شریک کرتے تھے۔

﴿وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ الْجِنَّ وَ خَلَقَهُمْ وَ خَرَقُوْا لَهٗ بَنِيْنَ وَ بَنٰتٍۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ﴾ (انعام:۱۰۱)

''انہوں نے جنوں کو خدا کا شریک بنایا اور وہ خدا کی مخلوق ہیں اور بن جانے خدا کے لیے بیٹے اور بیٹیاں گھڑیں۔''

اور جب وہ خدا کے رشتہ دار اور خدائی کے شریک ٹھہرے تو ان کی عبادت اور پرستش بھی ضروری ہوئی' چنانچہ جاہلیت میں اہل عرب ان جنوں کی بھی پوجا کرتے تھے'(۱) ﴿بَلْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ الْجِنَّ اَكْثَرُهُمْ بِهِمْ مُّؤْمِنُوْنَ﴾ (سبا:۴۱) بلکہ یہ جن کو پوجتے تھے اور ان میں اکثر انہی پر ایمان رکھتے تھے' مسافر جب راستہ میں کہیں قیام کرتے تھے تو پہلے وہاں کے جنوں کی دہائی پکار لیتے تھے' قرآن میں ہے ﴿وَ اَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ يَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ فَزَادُوْهُمْ رَهَقًا﴾ (الجن:۶) ''اور بات یہ تھی کہ کچھ انسان بعض جنوں کی دہائی پکارا کرتے تھے اور انہوں نے ان کو اور مغرور بنا دیا۔'' چنانچہ بعض خوفناک مقامات میں خاص طور سے ان کے نام کی قربانی کی جاتی تھی' ان میں سے ایک مشہور مقام دراہم تھا۔ جہاں کے رہنے والے جنوں (سکان الدراہم) پر جانور ذبح کر کے چڑھائے جاتے تھے تا کہ قربانی کرنے والے ان کی شرارت سے محفوظ رہیں۔(۲) قبیلہ خزاعہ کی شاخ بنو ملیح خاص طور سے جنوں کی پوجا کرتی تھی اور کلبی کا بیان ہے کہ انہیں کے متعلق یہ آیت اتری ہے۔(۳)

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ﴾ (الاعراف:۱۹۴)

''خدا کو چھوڑ کر جن کو پکارتے ہو وہ تمہاری ہی طرح بندے ہیں۔''

بت پرستی

جن خداؤں کو یہ لوگ مانتے تھے' ان کے بت بنا لیے تھے اور جا بجا عظیم الشان بت کدے قائم ہو گئے تھے' یہ

(۱) صحیح مسلم کتاب التفسیر

(۲) لسان العرب لفظ ''مسکن''

(۳) کتاب الاصنام ہشام الکلبی مطبوعہ مصر ص ۳۴۔

رواج اس قدر عام ہو گیا تھا کہ جہاں کوئی خوب صورت پتھر مل گیا' اٹھا لیا اور اس کی پرستش شروع کر دی' اس سے زیادہ خوب صورت مل گیا تو اس کو پھینک دیا اور اس کی پرستش کرنے لگے' جہاں کوئی پتھر نہ ہاتھ آیا' خاک کا ایک تو بنا لیا' ایک بکری لا کر اس کا دودھ اس پر دوہا' پھر اس کے گرد طواف کیا' اور اب وہ ایک معبود بن جاتا تھا' چنانچہ ز بخاری کتاب المغازی باب وفد بنی حنیفہ میں یہ پوری تفصیل مذکور ہے۔

اس بت پرستی کی ابتدا یوں ہوئی کہ قبیلۂ خزاعہ کا ایک شخص جس کا نام عمرو بن لحی تھا اور جو قبیلہ جرہم کو شکست دے کر کعبہ کا متولی بن گیا تھا' ایک دفعہ بلقاء گیا۔ وہاں لوگوں کو بت پرست دیکھ کر بت پرستی کی طرف مائل ہوا او وہیں سے ایک بت لا کر کعبہ میں نصب کیا' چونکہ اس کا اثر تمام عرب پر تھا۔ اس لیے تمام عرب نے بت پرستی قبول کر لی اور گھر گھر بت خانے بن گئے' ان میں ہبل سب سے بڑا تھا۔ اس سے اتر کر منات' لات اور عزیٰ تھے۔

منات مدینہ منورہ سے سات میل پر تھا' انصار کے قبیلے یعنی اوس و خزرج اور آس پاس کے اور قبائل اسی کا ح کرتے تھے کعبہ کا حج بھی جب یہ لوگ کرتے تھے تو احرام یہیں آ کر اتارتے تھے حلفیہ معاہدے بھی یہیں ہوتے تھے' عبدالعزیٰ مزنی کہتا ہے۔ (۱)

اِنِّیْ حَلَفْتُ یَمِیْنٍ صِدْقٍ بَرَّۃٍ بِمَنَاتٍ عِنْدَ مَحْلِ آلِ الْخَزْرَجِ.

"میں نے مناۃ کی سچی قسم کھائی۔ اہل خزرج کے احرام اتارنے کی جگہ کے پاس۔"

لات قبیلۂ ثقیف کا معبود تھا جو مقام طائف میں نصب تھا۔ اہلِ طائف اس کو کعبہ کے برابر تسلیم کرتے تھے۔

عزیٰ ایک درخت تھا۔ اس کے پاس ایک بت تھا۔ یہ قبیلۂ غطفان کا بت تھا لیکن قریش بھی اس کی نہایت عزت کرتے تھے اور اس کی زیارت کو جاتے تھے۔ قریش جب کعبہ کا طواف کرتے تھے تو یہ پڑھتے تھے۔ (۲)

وَاللَّاتَ وَالْعُزّٰی وَ مَنَاۃَ الثَّالِثَۃَ الْاُخْرٰی اِنَّھُنَّ الْغَرَانِیْقَ الْعُلٰی وَ اِنْ شَفَاعَتُھُنَّ لَتُرْتَجٰی.

"لات' عزیٰ اور تیسرا مناۃ یہ بڑے برگزیدہ ہیں اور ان کی سفارش کی خدا کے ہاں امید ہے۔"

بت پرستی نے رفتہ رفتہ اور بہت سی برائیاں پیدا کر دیں' جانوروں سے گزر کر انسانوں کی قربانیاں ان پر چڑھائی جانے لگیں۔ آنحضرت ﷺ کے جد امجد عبدالمطلب نے جو اپنے صاحبزادے (عبداللہ) کی قربانی کرنی چاہی تھی' وہ اسی کہنہ رسم کی تقلید تھی۔

بحیرۃ' سائبہ' حام کے نام سے بتوں کے نام پر سانڈ چھوڑتے تھے کعبہ کے سامنے جو قربانی کرتے تھے' اس کا

---

(۱) یہ پوری تفصیل معجم البلدان لفظ مناۃ میں ہے۔

(۲) معجم البلدان لفظ لات و کتاب الاصنام للکلبی مطبوعہ دار الکتب المصریہ ۱۳۴۳ھ' ص ۱۹۔

خون کعبہ کی دیواروں پر ملتے تھے'(۱) بتوں کے سامنے شگون کے تیر رہتے تھے ان میں سے ایک پر ''ہاں'' ایک پر ''ناں'' لکھا رہتا تھا جو کام کرنا چاہتے پجاری سے کہتے کہ فال نکالے ''ہاں'' کا تیر نکلتا تو اس کام کو کرتے ورنہ باز رہتے۔

جاہلیت میں جن چیزوں کی پرستش کی جاتی تھی وہ مختلف قسم کی تھیں' اصنام واوثان' انصاب اور بیوت۔ اصنام واوثان جن کا واحد صنم اور وثن ہے یہ انسانی شکل وصورت کے بت تھے اگر وہ لکڑی کے ہوتے تو بَعِیم کہلاتے اور اگر رنگ اور مسالہ سے بنتے تو ان کو دمیہ کہتے اور انصاب اور نصب بن گھڑے پتھر ہوتے تھے جن کو کھڑا کر کے ان پر چڑھاوے چڑھاتے اور جانور ذبح کرتے تھے' بیوت جس کا واحد بیت ہے چند گھر تھے جیسے رضا' رمام' قلیس وغیرہ جن میں بت پرستانہ رسوم ادا کی جاتی تھیں' جن بتوں کے اردگرد چکر لگاتے تھے' ان کو دوار کہتے تھے اور ان پر جو قربانی کی جاتی تھی' اس کو عتیرہ کہتے تھے' پتھروں کا ڈھیر لگا کر اس کے چاروں طرف چکر لگاتے تھے اس ڈھیر کو رجمہ کہتے تھے' جاہلی شاعر کہتا ہے۔

كَمَا طَافَ بِالرَّجْمَةِ الْمُتَرَتِّجِمِ۔

''جیسے پتھروں کے ڈھیر کا طواف کرنے والا طواف کرے۔''(۲)

جن بتوں کی پرستش کی جاتی تھی' ان کی کوئی انتہا نہ تھی۔ ع

قبیلہ قبیلہ کا اک بت جدا تھا

خاص خانہ کعبہ اور اس کے اطراف میں تین سو ساٹھ بت تھے'(۳) ان میں سے قرآن پاک میں جن کے نام بتائے گئے ہیں وہ یہ ہیں۔ لات' عزیٰ' مناۃ' یغوث' یعوق' نسر' ود' سواع' بعل' لیکن جاہلیت کے پرانے مؤرخوں اور لغت نویسوں نے جاہلیت کے شخصی ناموں اور شعرا کے اشعار سے بہت سے نام ذکر کیے ہیں' ہشام کلبی کی کتاب الاصنام میں جو اس موضوع پر پہلی کتاب ہے اور جواب مصر میں چھپ بھی گئی ہے تقریباً تیس بتوں کے نام ہیں' علامہ ذکی پاشا جنہوں نے کلبی کی اس کتاب کو ۱۳۴۳ھ ۱۹۲۴ء میں تحشیہ اور تکملہ کے بعد شائع کیا ہے' اپنے تکملہ میں چھیالیس نام اور بڑھائے ہیں' یمن اور حجاز میں آثارِ قدیمہ کے محققوں نے عہدِ جاہلیت کے جو کتبے پڑھے ہیں' ان میں المقہ' عشتار' نکرہ' قینان وغیرہ بہت سے اور ناموں کا پتا لگایا ہے' میں نے ارض القرآن کی دوسری جلد میں جو ۱۳۳۶ھ ۱۹۱۸ء میں چھپی ہے' ان معلومات کو یکجا کر دیا ہے۔

ذیل میں ہم ان بتوں کی فہرست درج کرتے ہیں جن کے نام اب تک معلوم ہو چکے ہیں:

---

(۱) نیل المرام فی تفسیر آیات الاحکام ص ۱۱۱' ۱۱۰۔

(۲) ان الفاظ کے لیے دیکھو لسان العرب۔

(۳) صحیح بخاری باب فتح مکہ۔

بتوں کے نام	قبیلوں کے نام جوان کو خاص طور سے پوجتے تھے
لات	ثقیف
عزیٰ	قریش و بنوشیبان بن جابر۔
مناۃ	اوس وخزرج اور عام عرب۔
یغوث	بنومدحج واہل جرش۔
یعوق	بنوہمدان واہل خیوان۔
نسر	حمیر۔
ود	بنوکلب۔
سواع	بنولحیان۔
اساف	بت، جس پر حج میں قربانی ہوتی تھی۔
نائلہ	بت، جس پر حج میں قربانی ہوتی تھی۔
اقیصر	قضاعہ ولخم وجذام وعاملہ وعطفان۔
باجر	ازدوطی وقضاعہ۔
ذوالخلصہ	بنوامامہ، خثعم، بجالہ، ازدالسراۃ۔
رضا، یارضی	بنوربیعہ کا بت خانہ
رمام	حمیر کا بت خانہ
سنجہ	ایک مشہور بت
سعد	بنی لمکان بن کنانہ
سعیر	عنزہ
ذوالشریٰ	بنوحارث
عائم	ازدالسراۃ
عم انس (یا) عمیانس	خولان
قلس	طی
ذوالکفین	بنودوس
مناف	قریش

نہم	مزنیہ
ہبل	قریش
بعل	قبائل بنی عدنان
یعیوب	حدیلہ (بنی طی)
اشہل	بنوعبدالاشہل
اوال	بکروتغلب
بس	غطفان کا بت خانہ
بعیم	ایک لکڑی کا بت
بلج	ایک بت۔
جبہ	ایک بت۔
جریش یا حریش	ایک بت جس کی طرف عبد جریش کی نسبت ہے۔
جلسد	ایک بت کا نام۔
جہار	ہوازن کا معبود۔
دار	بنوعبدالدار۔
دوار	ایک بت کا نام
ذوالرجل	حجاز کا ایک بت
شارق	ایک بت کا نام جس کی طرف عبدالشارق کی نسبت ہے۔
شمس	بنوعبد شمس
صدا	عاد کا بت
صمودا	عاد کا بت
ضمار	عباس بن مرداس اسلمی کا قبیلہ
ضیزن	منذر اکبر
عبعب	قضاعہ
عوض	بکر بن وائل
عوف	ایک بت کا نام

فراض	سعدالعشیرہ
کثریٰ	جدیس وطسم
کسعہ	ایک بت کانام
محرق	بکربن وائل
مدان	عبدالمدان
مرحب	حضرموت
منہب	ایک بت کانام
ہبا	عاد
ذات الوداع	ایک بت کانام
یالیل	عبدیالیل
غبغب	اس پر جانور ذبح کیے جاتے تھے۔

ستارہ پرستی

عرب میں ستارہ پرستوں کا بھی ایک گروہ تھا' مختلف قبیلے مختلف ستاروں کی پوجا کرتے تھے' ان میں سب سے اہم سورج اور چاند تھے اسی لئے قرآن پاک نے خصوصیت کے ساتھ کہا:

﴿لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَ لَا لِلْقَمَرِ﴾ (حم السجدہ:۳۷)

''نہ سورج کو سجدہ کرو نہ چاند کو۔''

یمن میں سبا کی قوم سورج ہی کو دیبی مانتی تھی (النمل:۲۴) یمن کے بادشاہ شمر لیرعش نے سورج دیبی کا مندر بنوایا تھا۔ (۱) سورج اور چاند کے بعد ستاروں میں شعریٰ کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ اسی لیے قرآن پاک نے کہا:

﴿وَ اَنَّهٗ هُوَ رَبُّ الشِّعْرٰی﴾ (نجم:۴۶)

''اور وہی خدا شعریٰ کا مالک ہے۔''

صاعد اندلسی المتوفی ۴۶۲ھ نے اپنی کتاب طبقات الامم میں عرب کے حسبِ ذیل قبیلوں کو مختلف ستاروں کا پرستار بتایا ہے قبیلۂ حمیر سورج کو پوجتا تھا' کنانہ چاند کو' تمیم و برآن کو' لخم اور جذام مشتری کو طی سہیل کو قیس شعری العبور کو اسد عطارد کو۔ (۲)

---

(۱) تاریخ الملوک الارض حمزہ اصفہانی ص ۱۱ کلکتہ۔

(۲) طبقات الامم قاضی صاعد اندلسی ص ۴۳ بیروت۔

جن اور شیاطین اور بھوت پریت

جن اور شیطان کی نسبت عرب کے عجیب عجیب اعتقاد تھے وہ جن' شیطان اور بھوت پریت سب کو ایک ہی جنس سمجھتے تھے' گو اختلافِ صورت اور اشغال کی وجہ سے ان کے الگ الگ نام پڑ گئے تھے جو اجنّہ جنگلوں اور میدانوں میں رہتے تھے اور مسافروں کو اپنی صورتیں یا لباس بدل بدل کر دھوکا دیتے تھے' ان کا نام غول تھا' یہ مذکر بھی ہوتے تھے اور مؤنث بھی۔

عبید بن ایوب العنبری کہتا ہے۔

وَ غَوْلًا قَفَرَةٌ ذَكَرً وَّ اُنْثٰى كَانَ عَلَيْهِمَا قِطَعُ الْبَجَادَ

''اور بیابان کے دو غول' مرد بھی اور عورت بھی' گویا کہ ان دونوں پر کمبل کے ٹکڑے پڑے ہیں۔''

مؤنث کو سعلاۃ کہتے تھے۔

اَزَلُّ وَ سُعْلَاةُ وَ غَوْلُ بِقَفْرَةٍ اِذَا اللَّيْلَ وَ اَرَى الْجِنَّ فِيْهِ اَرَنَتْ

''میں پھسلتا ہوں اور چڑیل اور غول بیابان میں جب رات پردہ پوش ہوتی تھی تو اس میں آواز دیتے تھے۔''

عمرو بن یربوعِ ایک ممتاز شخص تھا اس نے سعلاۃ سے نکاح بھی کیا تھا اور اس سے اولاد بھی ہوتی تھی' راجز کہتا ہے۔

يَا قَاتَلَ اللّٰهَ بَنِي السُّعْلَاةَ۔ ''خدا سعلاۃ کے فرزندوں کو مارے۔''

بلقیس ملکۂ یمن (ان کے زعم میں) سعلاۃ ہی کے پیٹ سے تھی۔

یہ اکثر گانے گاتے تھے اور اہل عرب ان کے نغموں سے محظوظ ہوتے تھے۔

كَمْ جَبَبْتُ دُوْنَكَ مِنْ بِهِمَاءٍ مَظْلَمَةٍ اٰتِيْهِ اِذَا مَا مُغَنِّيٌ جَنَّهَ سْمِرًا.

''کتنی اندھیری گھپ راتوں میں! میں نے صحرا کو قطع کیا' جب وہاں کے جنات کا مغنی افسانہ گوئی کر رہا تھا۔''

یہ صحرانشین بدوؤں کی صحبتوں میں شریک ہوتے تھے' جاڑوں میں جب بدو آگ جلا کر بیٹھتے تھے تو یہ بھی آگ تاپنے کو آ جاتے تھے لیکن جب ان کو کھانے پر بلاتے تھے تو وہ عذر کرتے تھے کہ ہم آدمیوں کی غذا نہیں کھا سکتے۔

اَتَوْا فَاَرٰى فَقُلْتُ مَمْلُوْنَ اَنْتُمْ
فَقَالُوْا الْجِنَّ قُلْتُ عَمَّوًا ظِلَامًا
دَعَوْتُ اِلَى الطَّعَامِ فَقَالَ مِنْهُمْ
زَعِيْمٌ نَحْسَدُ الْاِنْسَ الطَّعَامًا

''وہ لوگ رات کو میرے پاس آئے تو میں نے کہا تم کون ہو' انہوں نے کہا ہم جن ہیں' میں نے کہا اس تاریکی میں خوش ہو' میں نے ان کو کھانے کے لیے بلایا تو ان میں سے ایک سردار نے کہا ہم انسانوں کے کھانے پر

حسد کرتے ہیں۔''

یہ زیادہ تر جہاں آباد تھے ان موضعوں کے نام بدی' بقار اور عبقر تھے۔

ع: جِنَّ الْبَدَی رَوَاسِیَا اَقْدَامَهَا

بدیٰ کے جن' جن کے قدم جمے تھے

ع: تَحْتَ السَّنُوْرِ جِنَّةَ الْبَقَارَ

زرہوں کے نیچے بقار کے بھوت تھے

ع: عَلَیْهِنَّ فَتْیَانِ کِجَنَّةَ عَبْقَرَ

اوران پر شہسوار جوان عبقر کے بھوت معلوم ہوتے تھے

ان کے اقسام حسب ذیل تھے:

جو آدمیوں کے ساتھ مل جل کر رہتے تھے' ان کو عامر کہتے تھے۔

جو بچوں کو ستاتے تھے' ان کا نام روح تھا۔

جو زیادہ شریر تھے ان کو شیطان کہتے تھے۔

اس درجہ سے بڑھ کر جو شریر ہوتا تھا اس کو عفریت کہتے تھے۔

یہ اکثر بچوں اور جوانوں کو اٹھا لے جاتے تھے' حضرت علیؓ کے ایک بھائی طالب تھے' یہ ان کو اٹھا لے گئے اور پھر ان کا پتا نہ لگا' عمرو بن عدی لخمی جو عرب کا بادشاہ تھا اس کو بھی اٹھا لے گئے لیکن کئی برس کے بعد جذیمہ ابرش کو لا کر دے گئے۔

اسی طرح خرافہ کا قصہ ہے جس کو جن اٹھا لے گئے' مدت کے بعد وہ آپس آیا تو عجیب عجیب باتیں بیان کرتا تھا۔ (۱) ان اجنہ یا شیاطین سے جن لوگوں کے تعلقات زیادہ بڑھ گئے تھے' ان میں سے تابط شرا اور ابو البلاد طہوی زیادہ مشہور ہیں' طہوی نے ایک دفعہ ایک بھوت کو مار ڈالا تھا۔ اس کے واقعات ایک نظم میں لکھے ہیں:

لَقِیْتُ الْغَوْلَ تَسْرِی فِیْ ظِلَامٍ

فَصَدَّتْ وَ انْتَحَیْتَ لَهَا بِعَضَبٍ

حِسَامَ غَیْرَ مَوْتَشَبَ یَمَانِیْ

فَقَدْ سَرَاتَهَا وَ الْبَرَدَ مِنْهَا

فَخَرَّتْ لِلْیَدَیْنِ وَ لِلْجَوَانِ. (۲)

---

(۱) شمائل ترمذی باب السمر۔

(۲) یہ تمام تفصیل کتاب الحیوان جاحظ سے ماخوذ ہے۔ اس نے کئی ورق میں نہایت تفصیل سے یہ واقعات لکھے ہیں دیکھو کتاب مذکور از ص ۴۸ تا صفحہ ۸۰ جز ششم مطبوعہ مطبع سعادت مصر۔

''میں غولِ بیابانی سے بلا جو رات کو اندھیرے میں چلتے ہیں' تو اس نے روکا اور میں یمن کی بنی ہوئی اصیل تلوار لے کر اس کی طرف بڑھا تو اس نے اس کے سر کو اور اس کی زرہوں کو کاٹ ڈالا اور وہ دونوں ہاتھوں اور سینہ کے بل زمین پر گر پڑا۔''

ان ہی اجنہ اور شیاطین کا زور توڑنے کے لیے قرآن نے قیامت کے اس سوال و جواب کا انداز اختیار کیا کہ ان کے دوست انسان وہاں بھی ان کی دوستی کا دم بھرتے جائیں گے اس سے اندازہ ہوگا کہ جاہل عربوں پر ان کا کس قدر استیلاء تھا:

﴿یٰمَعْشَرَ الْجِنِّ قَدِاسْتَکْثَرْتُمْ مِّنَ الْاِنْسِ وَ قَالَ اَوْلِیٰٓاءُ هُمْ مِّنَ الْاِنْسِ رَبَّنَا اسْتَمْتَعَ بَعْضُنَا بِبَعْضٍ﴾ (الانعام:۱۲۸)

''اے جنوں کے گروہ! تم نے انسانوں سے بہت کچھ وصول کیا۔ اور ان کے دوست دار انسان بولے' اے ہمارے رب! ہم میں سے ایک نے دوسرے کا کام نکالا۔''

کہانت

کہانت ایک سخت بلا تھی جو تمام ملک میں پھیلی ہوئی تھی' ہر جگہ ایک یا کئی کاہن ہوتے تھے جو آئندہ واقعات کی پیشین گوئیاں کرتے اور آسمانی خبریں بتاتے تھے اہلِ عرب کا اعتقاد اور خود کاہنوں کا دعویٰ تھا کہ ان کے ساتھ ایک ایک جن رہتا ہے [1] اور وہی ان کو القا کرتا ہے وہ اپنی شکل وصورت ایسی بناتے تھے کہ پہچان لیے جاتے تھے' چنانچہ ایک بار حضرت عمرؓ کے پاس سے ایک آدمی گزرا' انہوں نے قیافہ سے پہچان لیا کہ وہ کاہن ہے اس کو بلا کر پوچھا کہ تیرے جن نے تجھ سے عجیب تر بات کیا بیان کی اس نے کہا میں ایک روز بازار میں پھر رہا تھا کہ میرا جن گھبرایا ہوا آیا اور کہا:

اَلَمْ تَرَاِلَی الْجِنِّ وَ اَبْلَا سِهَا' وَ یَاسِهَامِنْ بَعْدِ اَنْکَاسِهَا وَ لَحُوْ قِهَا بِالْقَلَاصِ وَ اَحْلَاسِهَا.

''کیا تم جنوں کی سراسیمگی' ان کی نا امیدی اور ان کے کاروبار کی ابتری اور مقام اقلاص میں جا کر ان کے پناہ لینے کو نہیں دیکھتے۔''

حضرت عمرؓ نے فرمایا سچ ہے' میں ایک روز زمانۂ جاہلیت میں بتوں کے پاس سویا ہوا تھا کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک آدمی نے ایک گئو سالہ لا کر ذبح کیا۔ اس کے بعد ایک شخص زور سے چلایا:

یَا جَلِیْحُ اَمْرٌ نَجِیْحٌ رَجُلٌ فَصِیْحٌ یَقُوْلُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ.

''اے جلیح' کامیاب امر' ایک فصیح شخص لا الہ الا اللہ کہتا ہے۔''

---

(۱) کتاب البیان و التبیین للجا حظ جلد اول ص ۱۱۳ مطبوعہ مطبع علمیہ مصر۔

اس کے چند ہی دنوں کے بعد آنحضرت ﷺ کی بعثت ہوئی،(۱) صحیح بخاری وتفسیر سورۂ والضحیٰ، میں روایت ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت ﷺ کچھ علیل ہو گئے اور دو تین دن رات میں عبادت کے لیے نہیں اٹھے اس پر ایک عورت (یہ ابولہب کی زوجہ تھی) نے آ کر آنحضرت ﷺ سے کہا:

﴿اِنِّیۡۤ اَرۡجُوۡۤا اَنۡ یَّکُوۡنَ شَیۡطَانُکَ قَدۡ تَرَکَکَ﴾

''میرا خیال ہے کہ تیرے شیطان نے تجھ کو چھوڑ دیا۔''

یہ وہی خیال تھا۔ چونکہ کفار آپ ؐ کو کاہن خیال کرتے تھے اس لیے ان کا خیال تھا کہ آپ کے ساتھ کوئی جن یا شیطان رہتا ہے، قرآن پاک نے اسی کی تردید اس آیت میں کی ہے:

﴿هَلۡ اُنَبِّئُکُمۡ عَلٰی مَنۡ تَنَزَّلُ الشَّیٰطِیۡنُ ○ تَنَزَّلُ عَلٰی کُلِّ اَفَّاکٍ اَثِیۡمٍ ○ یُّلۡقُوۡنَ السَّمۡعَ وَ اَکۡثَرُهُمۡ کٰذِبُوۡنَ ○﴾ (الشعراء:۲۲۱،۲۲۳)

''کیا میں تمہیں بتاؤں کہ شیطان کس پر اترتے ہیں؟ شیطان ہر جھوٹے گنہگار پر اترتے ہیں۔ وہ سنی سنائی بات القا کرتے ہیں۔ اکثر وہ جھوٹے ہوتے ہیں۔''

یہ کاہن تمام مقدمات اور نزاعات کا فیصلہ بھی کرتے تھے اور اس بنا پر تمام ملک پر ان کا اثر چھایا ہوا تھا، ان میں سے حازی، شق، سطیح، عزیٰ بہت مشہور تھے، جاحظ نے ان کے کاہنانہ فقرے کتاب البیان میں نقل کیے ہیں۔

وَ الۡاَرۡضِ وَ السَّمَآءِ وَ الۡعِقَابِ وَ الصَّقۡعَآءِ وَاقِعَةٌ لِّلۡبَقۡعَآءِ لَقَدۡ نَفَرَ الۡمَجۡدِ بَنِی الۡعَشَرَاءِ لِلۡمَجۡدِ وَ الۡمَنَّاءِ.

''قسم ہے زمین اور آسمان کی اور عقاب اور آفتاب کی، ایک واقعہ میدان میں واقع ہوا کہ بزرگی بنو عشرا پر غالب آ گئی بوجہ بڑائی اور بلندی کے۔''

یہ کاہن جو خبریں بتاتے یا تلقین کرتے وہ بڑے تکلف کے مقفیٰ اور مسجع فقرے ہوتے، اس لیے جب ایک دفعہ آنحضرت ﷺ کے سامنے ایک ساقط الحمل بچہ کا مقدمہ پیش ہوا اور آپ نے اس کی دیت کا فیصلہ کیا تو ایک شخص نے عرب کے دستور کے مطابق اعتراضاً کہا۔

اَرَأَیۡتَ مَنۡ لَّا شَرِبَ وَ لَاۤ اَکَلَ وَ لَا صَاحَ فَاسۡتَهَلَّ اَلَیۡسَ دَمَهٗ بِطَلَ.

''غور فرمایئے کہ جس بچہ نے کھایا نہ پیا نہ چیخا نہ رویا کیا اس کا خون معاف نہ ہوگا۔''

آپ ؐ نے فرمایا یہ کاہنوں کے بھائیوں میں سے ہے (صحیح مسلم دیۃ الجنین وصحیح بخاری باب الکہانۃ) یہ کاہن بت خانوں میں رہتے تھے اور کسی خاص بت کے پجاری ہوتے تھے، جب لوگ ان سے غیب کی باتیں پوچھتے یا خود آئندہ کے متعلق پیش گوئی کرنے لگتے تو ایک خاص کیفیت اپنے اوپر طاری کرتے، مرد بھی کاہن ہوتے تھے

(۱) صحیح بخاری ج۱ ص۵۴۶۔

اور بعض عورتیں بھی ہوتی تھیں جو کاہنہ کہلاتی تھیں (۱) یہ مصیبتوں اور بلاؤں کے دور کرنے کے لیے بت پرستانہ علاج اور تدبیر بتاتے تھے' یہ اپنی کہانت کی اجرت میں بڑی بڑی رقمیں اور نذرانے وصول کرتے تھے۔ اسلام کے بعد ان میں جو مسلمان ہو گئے تھے وہ علانیہ اپنے خدع وفریب کا اعتراف کرتے تھے۔ (۲) ان کو نذر نیاز اور اجرت کی جو رقم یا تحفہ ملتا اس کا نام حلوان الکاہن تھا۔ یعنی کاہن کا منہ میٹھا کرنے کے لیے تحفہ' اسلام نے آ کر اس کو روک دیا۔ (۳)

غرض ان کاہنوں نے عوام فریبی کا بڑا جال پھیلا رکھا تھا اور یہ ان ہی کا اثر تھا کہ ملک کا ملک سینکڑوں قسم کی وہم پرستیوں میں مبتلا ہو گیا تھا۔

شعراء کی نسبت بھی عرب کا یہ خیال تھا کہ ہر شاعر کے ساتھ ایک شیطان رہتا ہے اور وہی اس کو اشعار القا کرتا ہے۔ چنانچہ مخبل شاعر کی شیطانہ عمرو کی بیٹی تھی اور اعشیٰ جو عرب کا مشہور شاعر تھا اس کے شیطان کا نام مسحل تھا۔ اعشی خود کہتا ہے:

دَعَوْتُ خَلِيْلِيْ مَسْحَلًا وَ دَعْوَالَهٗ
بِجِهَنَّامَ يُدْعىٰ لِلْهَجِيْنَ الْمُذَمَّمَ
حَبَّانِيْ اَخِي الْجِنِّيْ نَفْسِيْ فَدَاءَهٗ
يَا قَبْحُ جِيَاشَ الْعِشِيَّاتِ مَرْجَمُ

''میں نے اپنے دوست مسحل کو پکارا اور انہوں نے اپنے لئے جہنام کو پکارا اور یہ کمینہ بداطوار کے لیے بلایا جاتا ہے مجھ کو میرے جن دوست نے میری جان اس پر فدا ہو شاموں کے وقت سب سے بڑے خوش مارنے والا اور سخت پتھراؤ کرنے والے کو دیا۔''

جو اعلیٰ درجہ کا شاعر ہوتا تھا اس کا شیطان یا جن مذکر ہوتا تھا' ابوالنجم کہتا ہے:

اَنّٰى وَ كُلُّ شَاعِرٌ مِّنَ الْبَشَرِ شَيْطَانَهٗ اُنْثٰى وَ شَيْطَانِيْ ذَكَرِ.

''ہر شاعر کا شیطان تو مؤنث ہے مگر میرا شیطان مذکر ہے۔''

شنقنان اور شیصبان' روسائے شیاطین تھے جو شاعری سکھلاتے تھے' ایک شاعر کو اس پر فخر تھا کہ اس کا معلم اسی شیصبان کی اولاد سے ہے۔ (۴)

---

(۱) بخاری ج ۱ ص ۵۴۲ کتاب الطب باب الکہانۃ۔
(۲) صحیح بخاری ج ۱ ص ۵۴۲ کتاب الطب باب الکہانۃ۔
(۳) اعشیٰ کے دیوان مطبوعہ ویانا ص ۶۵ میں صرف پہلا شعر ہے اور اس کا بھی دوسرا مصرعہ اس طرح ہے جهنام جدعا للهجين المذمم۔
(۴) ابوداؤد مطبوعہ مجتبائی جلد ۲ ص ۳۶۶۔

وَ لِیَ صَاحِبُ مِنْ بَنِی الشَّیْصَبَانِ فَطَوْرًا اَقُوْلُ وَ طَوْرا ھٰؤُلَآءِ.

''میرا ساتھی شیصبان کی اولاد ہے' تو کبھی میں شعر کہتا ہوں کبھی وہ۔''

اوہام پرستی

سانپ کو قتل نہیں کرتے تھے یہ اعتقاد تھا کہ سانپ مارا جائے تو اس کا جوڑا آ کر بدلہ لیتا ہے'[1] یہ اعتقاد تھا کہ مرنے کے بعد روح ایک پرند بن کر اڑتی رہتی ہے اس کو ہامہ کہتے تھے' یہ اعتقاد تھا کہ پیٹ میں ایک سانپ رہتا ہے جو بھوک کے وقت کاٹتا ہے' جو کام کرنا چاہتے تھے پہلے شگون لے لیتے تھے مثلاً اس وقت کوئی پرندہ داہنی جانب سے اڑا تو مبارک سمجھتے تھے اور بائیں جانب سے اڑا تو اس وقت اس کام سے باز رہتے تھے' بکری کے جب بچہ پیدا ہوتا تو اگر نر ہوتا تو بت پر چڑھا دیتے' اونٹنی جب دس بچے جن لیتی اس کو چھوڑ دیتے' وہ سانڈ کی طرح چھوٹی پھرتی۔

کسی شخص کے پاس جب اونٹوں کی تعداد ہزار تک پہنچ جاتی تو ایک اونٹ کی ایک آنکھ پھوڑ دیتے کہ نظر نہ لگ جائے۔ جب کبھی قحط پڑتا تو بھیڑیا دنبہ کی دم میں گھاس پھونس باندھ کر آگ لگا دیتے اور سمجھتے کہ اس سے پانی برسے گا۔ سفر میں جاتے تو کسی درخت میں ڈورا وغیرہ باندھ کر گرہ لگا دیتے' واپس آ کر دیکھتے اگر کھل گئی ہے تو سمجھتے کہ ان کی بیوی نے بدکاری کی' سفر میں راستہ بھول جاتے تو کپڑے الٹ کر پہن لیتے اور سمجھتے کہ اس سے راستہ مل جائے گا' یہ خیال تھا کہ جو شخص لات و عزیٰ کو گالی دیتا ہے اس کو برص یا جذام ہو جاتا ہے۔[2] ہاتھوں میں پیتل کی انگوٹھی پہنتے تھے کہ اس سے ضعف جاتا رہتا ہے۔[3]

اس قسم کے سینکڑوں اوہام پھیلے ہوئے تھے جن کا شمار نہیں ہو سکتا۔

یہ تو ان کے مذہبی حالات تھے ان کی اخلاقی کیفیت بھی ایسی ہی پست تھی' ان کے اخلاقی معائب میں سب سے نمایاں چیز ان کی جنگجوئی تھی جس نے ان کو حد درجہ خون خوار' سنگ دل' اور سفاک بنا دیا تھا۔

جنگجوئی

ذرا ذرا سی بات پر لڑنا اور ایک دوسرے کا سر کاٹ لینا' ان کے نزدیک کوئی بات ہی نہ تھی' ہر قبیلہ دوسرے قبیلہ سے اور ہر خاندان دوسرے خاندان سے برسرِ پیکار تھا' ہر بچہ اپنے باپ اور عزیزوں کے قاتل سے انتقام لینے کے جذبہ میں پرورش پاتا تھا اور جوان ہو کر اس مقدس فرض کو انجام دیتا تھا اور اس طرح ایک ایک لڑائی کا سلسلہ برسوں تک قائم رہتا تھا۔ ان ہی لڑائیوں کو مؤرخین اور اہل ادب ایام العرب کہتے ہیں جن کی تعداد سینکڑوں سے

(۱) یہ باتیں بلوغ العرب اور اطوار العرب وغیرہ کتابوں میں مذکور ہیں۔

(۲) مسند دارمی ص ۸۹۔

(۳) ابن ماجہ ص ۸۸ التیق التمائم ابواب الطب۔

متجاوز ہے' میدانی نیشاپوری المتوفی ۵۱۸ھ نے کتاب الامثال میں ان میں سے ۳۲ لڑائیوں کے نام بتانے کے بعد یہ لکھا ہے:

هٰذَا الْفَنَّ لَا يَتَقَصَاهُ الْاَحْصَاءَ فَاقْتَصَرْتُ عَلٰى مَاذَكَرْتُ (جلد۲ص ۳۷۱ خبریہ مصر)

''یہ فن شمار کا استقصاء نہیں کرسکتا اس لیے جو کچھ میں نے بیان کیا ہے اسی پر میں نے قناعت کی۔''

یہ تمام لڑائیاں وہ ہیں جو اسلام سے چالیس پچاس برس پیشتر سے اسلام تک ہوئیں' ان میں سب سے زیادہ مشہور لڑائی عبس وذبیان کی ہے' جس کا واقعہ یہ ہے کہ ان دونوں قبیلوں کے دو گھوڑے داحس اور غبرا کا باہمی مقابلہ تھا' ان میں سے ایک فریق نے گھوڑ دوڑ کے قواعد کی خلاف ورزی کی اور لڑائی ہو پڑی' یہ لڑائی ان دونوں قبیلوں میں پورے چالیس برس تک قائم رہی دوسری مشہور لڑائی حرب بسوس ہے۔ اس کا واقعہ یہ ہے کہ بسوس نامی ایک قبیلہ کی عورت کی اونٹنی کلیب بن وائل کے چراگاہ میں جا پڑی' کلیب نے اپنے تیر سے اس کے تھن کو زخمی کیا۔ اس بات نے قبیلہ میں آگ لگا دی۔ کلیب جان سے مارا گیا اور بکر وتغلب میں خون ریز جنگ ہوئی۔ عکاظ کے میلہ میں سلیم اور غطفان کے سرداروں میں کچھ مناقشہ ہوا چند روز کے بعد موقع پا کر ایک قتل کر دیا گیا۔ اس کے انتقام میں خون کی ندیاں بہہ گئیں' بکر وتمیم میں ایک چراگاہ کے معاملہ میں خون ریز لڑائی ہوئی' اوس وخزرج مدینہ کے دونوں قبیلوں میں جو ہولناک لڑائیاں ہوتی رہیں۔ ان میں سب سے مشہور یوم بعاث ہے جس میں دونوں قبیلوں کے اکثر سردار کام آئے' اس لڑائی کا خاتمہ انصارِ مدینہ کی بیعت پر ہوا۔ قریش کی مشہور لڑائیوں کا نام ایام فجار ہے' ایک مشہور لڑائی کا نام ذی قار ہے۔

الغرض معمولی سے اشتعال سے قتل تک نوبت پہنچتی تھی۔ قتل سے انتقام کا جذبہ پیدا ہوتا تھا اور لڑائیوں کا ایک غیر منقطع سلسلہ قائم ہو جاتا تھا۔ [1] ان میں لڑنا اور مر جانا اور مارنا جاہلیت کا شرف اور قبیلہ کی آن سمجھی جاتی تھی اور اس خون آشامی کا ذوق ان کی فطرتِ ثانیہ بن گئی تھی' ان لڑائیوں میں سفاکی' بے رحمی اور قتل وغارت کی بدترین مثالیں پیش آتی رہتی تھیں۔

شراب خوری

شراب جو ہر قسم کے فسق وفجور اور مظالم اور بدکاری کا سرچشمہ ہے' عربوں میں اس کا اس قدر رواج تھا کہ ہر گھر ایک میکدہ بن گیا تھا۔ اس کا نہ پینا اس قدر نامانوس بات تھی کہ جن چند آدمیوں نے اسلام سے پہلے اس کے پینے سے پرہیز کیا تھا ان کے نام یاد رکھے گئے ہیں' دوست واحباب کسی گھر میں جمع ہوتے' شراب کا دور چلتا' ساتھ ہی جوا کھیلتے اس میں اونٹوں کی ہار جیت ہوتی جو جیتتا وہ جیتے ہوئے اونٹوں کو اسی وقت ذبح کر کے کھلا دیتا۔ کبھی نشہ میں سرشار ہو کر خود صاحبِ خانہ اٹھ کھڑا ہوتا اور اپنے اونٹوں کو کاٹ کاٹ کر ڈھیر کر دیتا' لوگ گوشت بھونتے'

(۱) ان لڑائیوں کے مفصل حالات کے لیے دیکھو عقد الفرید ابن عبدربہ جلد ۳ اور امثال میدانی لفظ ''یوم''

کباب لگاتے اور کھاتے اور اپنی اس بے جا فیاضی پر فخر کرتے رہتے' سامنے فاحشہ مغنیہ عورتیں گاتی بجاتیں اور وہ اسی مخموری کے عالم میں بے شرمی کی باتیں کرتے' جاہلیت کا مشہور شاعر طرفہ کہتا ہے۔

فَاِنْ تَبْغَنِیْ فِیْ خَلْقَةِ الْقَوْمِ تَلْقَنِیْ
وَ اِنْ تَقْتَنِصَنِیْ فِی الْحَوَانِیْتَ تَصْطَدِ

''پس اگر تو مجھے لوگوں کے حلقہ میں ڈھونڈے تو پائے گا۔ اور اگر شراب خانوں میں مجھے شکار کرنا چاہے تو کر سکتا ہے۔''

مَتٰی تَاْتِنِیْ اَصْبَحْکَ کَاْسًا رَوِیَّه
وَ اِنْ کُنْتَ عَنْهَا غَائِبًا فَاغْنِ وَازْوَدِ

''جب بھی تو میرے پاس آئے میں تجھے شراب کا پیالہ پلاؤں گا' اور اگر تو اس سے بے نیاز ہو کر آئے تو جا اور بے نیازی کر۔''

نَدَا مای بِیْضٌ کَالنُّجُوْمِ وَقَیْنَةٌ
تَرَوْحُ اِلَیْنَا بَیْنَ بُرْدٍ وَ مَجْدَلِ

''میری محفلِ شراب کے ہم نشین ستاروں کی طرح گورے چٹے ہیں اور ایک مغنیہ ہے جو شام کو ہمارے پاس یمنی چادر اور زعفرانی کپڑوں میں آتی ہے۔''

رَحِیْبُ قَطَابُ الْجَیْبَ مِنْهَا رَفِیْقَةٌ
بِحِسِّ النَّدَامٰی' بِضَّةُ الْمُتَجَرِّدِ

''اس کے گریبان کا شگاف بڑا ہے' شرابی رفیقوں کی دست درازی سے مانوس اور اس کے بدن کے برہنہ حصے لطیف ہیں۔''

اِذَا نَحْنَ قُلْنَا اَسْمِعِیْنَا اَنِیْرَتْ لَنَا
بِاَعْلٰی رِسْلِهَا مَطْرُوْقَةُ لَمْ تَشَدَّدِ

''جب ہم کہتے ہیں کہ ہمیں سناؤ تو آہستہ آہستہ نزاکت کے ساتھ آگے بڑھتی ہے۔''

وَ مَا زَالَ تَشْرَابِیَ الْخُمُوْرَ وَ لَذَّتِیْ
وَ بَیْعِیْ وَ اَنْفَاقِیْ طَرِیْقِیْ وَ مُتْلَدِّیْ

''اور میری شراب نوشی اور لذت اندوزی اور اپنی حاصل کردہ اور موروثی دولت کو خرچ کرنا میرا شعار ہے۔''

وَ لَوْلَا ثَلٰثٌ هُنَّ مِنْ لَذَّةِ الْفَتٰی
وَ جَدَکَ لَمْ اَحْفَلْ مَتٰی تَامَ عَوْدِیْ

''اور اگر تین باتیں نہ ہوتیں' جو ایک شریف کا لطفِ ذوق ہیں تو تیری قسم' میں اپنی موت کی پروانہ کرتا۔''

فَمِنْهُنَّ سَبَقِیْ الْعَاذِلَاتِ بِشَرْبَةٍ
كَمَيْتَ مَتٰى مَاتَمْلَ بِالْمَاءِ تَزْبَدِیْ

''ان میں سے ایک تو نصیحت کرنے والیوں کی بات کا خیال کیے بغیر سرخ وسیاہ رنگ کا پیالہ پی لینا جس میں پانی ملانے سے جوش آئے۔''

وَ تَقْصِيْرَ يَوْمُ الدَّجْنِ وَ الدَّجْنُ مُعْجَبٌ
بِبَهْكَتَةٍ تَحْتَ الْخِبَاءِ الْمُعَمَّدِ

''اور دوسری بات گھنگھور گھٹا کے دن کو اور وہ کیسا پر لطف دن ہوتا ہے کسی بلند خیمہ کے نیچے حسین معشوقہ سے لطف اندوزی میں چھوٹا کرتا ہے۔''

كَرِيْمٌ يَرْوِیْ نَفْسَهٗ فِیْ حَيَاتِهٖ
سَتَعْلَمُ اِنْ مِتْنَا غَدًا اَيُنَا الصَّدِیْ

''میں وہ فیاض ہوں جو اپنی زندگی میں اپنے آپ کو شراب پلا کے سیراب کرتا ہوں موت کے بعد معلوم ہوگا کہ ہم میں پیاسا کون ہے۔''

وَ بَرَكَ هَجُوْرٌ قَدْ اَثَارَتْ مَخَافَتِیْ
بِوَادٍ بِهَا اَمْشِیْ بِعَضْبٍ مُجَرَّدٍ

''اور کتنے بیٹھے ہوئے سوئے اونٹ تھے کہ میرے خوف نے ان کے اگلوں کو بھڑکا دیا' جب میں تلوار لے کر چلا۔''

فَمَرَّتْ كَهَاتِ ذَاتَ خَيْفٍ جَلَالَةٌ
عَقِيْلَةُ شَيْخٍ كَالْوَبِيْلِ يَلْتَدِدٍ

''تو ایک موٹی اونٹنی جو ایک بڈھے کی جولٹھ کی طرح جھگڑالو تھا' قیمتی چیز تھی' سامنے آ گئی۔''

وَ قَالَ اَلَا مَاذَا تَرَوْنَ بِشَارِبٍ
شَدِيْدٌ عَلَيْنَا بَعَيْنِهٖ مُتَعَمِّدٍ

''اور جب میں نے تلوار سے کونچیں کاٹ کر اونٹنی کو گرا دیا' تو اس بڈھے نے کہا کہ اس بدمست کو دیکھو جو جان بوجھ کر ہم پر ظلم کر رہا ہے۔''

فَظَلَّ الْاِمَاءَ يَمْتَلِلْنَ حِوَارَهَا
وَ يَسْعٰى عَلَيْنَا بِالسَّدِيْفِ الْمُسَرْهَدِ

''تو لونڈیاں اونٹنی کے بچہ کو (جو اس کے پیٹ سے نکلا تھا) بھوننے لگیں اور چربی دار کوہان کا گوشت

لے کر ہمارے پاس دوڑا جانے لگا۔"

لبید بن ربیعہ جو عرب کا مشہور شاعر اور سبعہ معلقہ کی محفل کا چوتھا ممبر ہے کہتا ہے:

بَلْ اَنْتَ لَا تَدْرِیْنَ کَمْ مِنْ لَیْلَةٍ
طَلَقَ لَذِیْذُ لَهْوِهَا وَ نِدَامُهَا

۔۔۔۔۔"بلکہ تو نہیں جانتی کہ کتنی کھلی ہوئی راتیں جن کی دلچسپی اور ہم نوشی پر لطف تھی۔"

قَدَبْتُ سَامِرُهَا وَ غَایَةُ تَاجِرٌ
وَ اُفِیَتْ اِذْ رُفِعَتْ وَ عَزَا مُدَامُهَا

"میں ان کا قصہ گو تھا اور شراب نوش کی منزل میں آتا جاتا رہا جب جھنڈا بلند ہوا اور اس کی شراب گراں ہو گئی۔"

اَعْلَی السَّبَا بِکُلِّ اَدْکَنِ عَاتِقٍ
اَوْجَوْنَةٌ قَدَحْتُ وَ فَضَّ خَتَامُهَا

"میں اس کی قیمت کو اور گراں کر رہا تھا' پرانی خاکی رنگ کی مشک یا خم کو خرید کر جو پیالوں میں بھری جاتی اور اس کی مہر توڑی جاتی۔"

وَ صَبُوْحٌ صَافِیَةٌ وَ جَذْبَ کَرِیْنَة
بِمُوْ تَرْتَا تَالَهٗ اَبْهَامُهَا

"اور کتنی صبح کی صاف شراب اور مغنیہ کا عود کو کھینچ کر اپنے انگوٹھے سے دبانا۔"

بَادَرَتْ حَاجَتُهَا الدُّجَاجُ بِسَحْرَةٍ
لَاعِلٌ مِنْهَا حِیْنُ هَبَّ نِیَامُهَا

"میں نے شراب کی ضرورت مرغِ سحر کی آواز سے پہلے پوری کی تاکہ میں اس کے سونے والوں کے جاگنے سے پہلے دہرا لوں۔"

تغلب ان قبیلوں میں تھا۔ جنہوں نے عیسائی مذہب قبول کر لیا تھا لیکن اس مذہب نے بھی عربوں کو اس بری بات سے باز نہیں رکھا تھا بلکہ شراب کی درآمد زیادہ تر انہی عیسائیوں کے ملک شام سے ہوتی تھی' تغلب کا سب سے بڑا شاعر اپنے فخریہ انداز میں کہتا ہے۔

اَلَا هَبِّیْ بِصِحْنِکَ فَاصْبَحِیْنَا
وَ لَا تُبْقِیْ خُمُوْرَ اِلَّا نَدَرَیْنَا

"ہاں اپنا پیالہ لے کر اٹھ جا اور مجھے صبح کو شراب پلا اور اندریں (شام کا گاؤں) کی کوئی شراب چھوٹنے نہ پائے۔"

مَشَعْشَةٌ كَاَنَّ الْحَصُّ فِيْهَا

اِذَا مَا الْمَاءُ خَالِطُهَا سَخِيْنَا

''پانی میں ملی ہوئی گویا اس میں کسم کے پھول پڑے ہیں' جب گرم پانی اس میں ملاؤ۔''

تَجُوْرُ بِذِی اللَّبَانَه عَنْ هَوَاهُ

اِذَا مَا ذَاقَهَا حَتّٰی يِلِيْنَا

'غرض مند کو اس کی غرض بھلا دے' اگر اس کو چکھ لے یہاں تک کہ اس کو نرم کر دے۔''

تَرَی اللَّحْرَ الشَّحِيْحَ اِذَا مَرَّتْ

عَلَيْهِ لِمَالِهٖ فِيْهَا مَهِيْنَا

''تنگ دل بخیل پر بھی اگر اس کا ایک دور گزار دیا جائے تو وہ اپنی دولت کو لٹا دے۔''

صَبَيْتِ الْكَأْسَ عَنَّا اُمَّ عَمْرُوْ

وَ كَانَ الْكَأْسُ مُجْرَاهَا الْيَمِيْنَا

''اے عمرو کی ماں! تو نے ہم سے پیالہ ہٹا لیا حالانکہ پیالہ کا دور داہنی طرف سے تھا۔''

وَ مَا شَرَّ الثَّلٰثَةِ اَمَّ عَمْرُو

بِصَاحِبِكِ الَّذِیْ لَا تَصْبَحِيْنَا

''حالانکہ تیرا وہ ہم نشین جس کو تو نہیں پلاتی تین میں سب سے بدتر نہیں۔''

كَأْسٌ قَدْ شَرِبْتُ بِبَعْلَبَكْ

وَ اُخْرٰی فِی دِمَشْقَ وَ قَاصِرِيْنَا

''اور کتنے پیالے بعلبک میں پیئے اور کتنے دمشق اور قاصرین میں۔''

ان اشعار سے اندازہ ہوگا کہ جاہلیت میں شراب نوشی کا کیا عالم تھا' شراب فروشوں کی دوکانیں کسی ممتاز مقام پر ہمیشہ کھلی رہتی تھیں اور نشان کے لیے وہاں جھنڈا اڑا کرتا تھا جس کو غایۃ کہتے تھے (دیکھو اوپر لبید کا دوسرا شعر) انتہا یہ ہے کہ تجارت کا لفظ شراب نوشی کا مترادف بن گیا تھا۔ ایک جاہلی شاعر عمرو بن قمہ کہتا ہے:

اِذَا سَحَبَ الرَّيْطَ وَ الْمَرْوَطَ اِلَی

اَدْنٰی تَجَارَی وَ انْفَضَ اللَّمَمَ

''یاد رہے وہ دن جب میں اپنی چادر گھسیٹتا ہوا قریب ترین شراب خانہ میں جاتا تھا اور اپنے گیسوؤں کو جھاڑتا تھا۔''

بدر میں قریش کے دولت مند رؤسا مارے گئے تھے' ان کے مرثیے میں قریش کا ایک شاعر خاص طور سے ان کی بزمِ شراب اور مجلسِ رقص وسرود کی بربادی کا ماتم کرتا ہے:

وَ مَاذَا بِالْقَلِيبِ قَلِيبُ بَدْرٍ
مِنَ الْقَيْنَاتِ وَ الشُّرْبُ الْكِرَامِ(۱)

''بدر کے گڑھے میں (جس میں مقتولین کی لاشیں ڈالی گئی تھیں) ناچنے والیوں اور فیاض شرابیوں کا ماتم ہے۔''

شراب کے رواج عام کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ عربی زبان میں شراب کے ڈھائی سو نام ہیں اور علامہ مجدالدین فیروز آبادی نے خاص ان ناموں پر ایک مستقل کتاب لکھی ہے' تمام گھروں میں شراب کی مجلسیں قائم ہوتیں۔ گھر کی عورتیں اور چھوٹے بچے ساقی بنتے تھے۔ یہ شعر اوپر گزر چکا ہے جس میں شاعر اپنی بیوی سے کہتا ہے۔

صَبَيْتِ الْكَأْسَ عَنَّا أُمَّ عَمْرَوْ
وَ كَانَ الْكَاسَ مَجْرَاهَا الْيَمِينَا

''اے ام عمرو! تو نے ہم سے شراب کا پیالہ ہٹالیا حالانکہ پیالہ کی گردش داہنی طرف سے تھی۔''

حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ اسلام لانے سے پہلے میں اپنے باپ (عباس) کی زبان سے کم سنی میں سنا کرتا تھا۔

اسْقِنَا كَأْسًا دِهَاقًا.

''شراب کا ایک لبریز پیالہ ہم کو پلا۔''(۲)

صحیح بخاری کتاب الاشربۃ میں حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ جب شراب حرام ہوئی تو اس وقت ایک مجلس قائم تھی جس میں حضرت ابودجانہؓ' ابوطلحہؓ' سہیل بن بیضاءؓ شریک تھے اور میں جو کہ سب سے کم سن تھا ساقی گری کی خدمت انجام دے رہا تھا۔

شراب کس بے تکلفی سے پی جاتی تھی' کس درجہ کے لوگ پیتے تھے' کس قسم کے افعال اس حالت میں سرزد ہوتے تھے' اس کا اندازہ صحیح بخاری کی ایک روایت سے ہوگا۔(۳) جو حرمت شراب سے قبل کا واقعہ ہے۔

غزوۂ بدر میں حضرت علیؓ کو مال غنیمت میں سے ایک اونٹنی ملی تھی' خمس میں سے ایک اور اونٹنی آنحضرت ﷺ نے عطا فرمائی' حضرت علیؓ کا نکاح حضرت فاطمہؓ سے ہو چکا تھا اور دعوتِ ولیمہ کی تیاری کر رہے تھے' ارادہ تھا کہ جنگل میں جا کر اذخر (ایک گھاس کا نام ہے) لائیں اور زرگروں کے ہاتھ فروخت کریں' اس ارادہ سے باہر نکلے تو دیکھا کہ ان کی اونٹنیوں کے کوہان کسی نے کاٹ لیے ہیں اور پیٹ چاک کر کے کلیجہ نکال لیا ہے لوگوں سے پوچھا یہ کس کا کام ہے؟ معلوم ہوا کہ پاس ہی ایک گھر میں حضرت حمزہؓ چند انصاریوں کے ساتھ شراب پی رہے تھے

(۱) صحیح بخاری باب الہجرۃ جلد اول ص ۵۵۸۔
(۲) ایضاً باب ایام الجاھلیۃ جلد اول ص ۵۴۱۔
(۳) صحیح بخاری کتاب الغزوات غزوۂ بدر ص ۵۷۔

ایک مغنیہ نے گاتے گاتے یہ مصرع گایا۔

اَلَا یَا حَمْزُ لِلشَّرْفِ النَّوَاءِ ''اے حمزہ! موٹی اونٹنیوں کے لیے۔''

حضرت حمزہؓ تلوار لے کر اٹھے اور اونٹنیوں کے پیٹ چاک کر کے ان کے کلیجے نکال لیے' حضرت علیؓ نے جا کر آنحضرت ﷺ کو خبر کی اور یہ ماجرا بیان کیا۔ آنحضرت ﷺ نے چادر اوڑھی اور حضرت علیؓ اور زیدؓ کو لے کر حضرت حمزہؓ کے پاس گئے' حضرت حمزہؓ مخمور تھے' آنحضرت ﷺ کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا اور کہا ''تم سب میرے باپ کے غلام ہو۔ آنحضرت ﷺ یہ حالت دیکھ کر چلے آئے۔

حضرت حمزہؓ نے ۳ھ میں شہادت پائی ہے' اس وقت تک شراب حرام نہیں ہوئی تھی۔

شراب کی حرمت جس تدریج سے نازل ہوئی ہے اس سے اندازہ ہوگا کہ تمام ملک کس طرح اس میں مبتلا تھا کس طرح وہ مقبولِ عام ہو چکی تھی کہ اس کی حرمت کی طرف ذہن منتقل نہیں ہوتا تھا اور کنائے اور اشارے سے گزر کر جب تک صاف صاف ممانعت نہیں کر دی گئی' لوگ سمجھ نہیں سکے۔

ابوداؤد کتاب الاشربہ میں روایت ہے کہ جب شراب کی ممانعت نازل ہوئی تو حضرت عمرؓ نے کہا۔ اے خدا! شراب کے بارہ میں ہم کو صاف صاف بتا دے۔ ان کے اصلی الفاظ یہ ہیں۔

اَللّٰھُمَّ بَیِّنْ لَنَا فِی الْخَمْرِ بَیَانًا شِفَآءً.

''اے خدا! شراب کے بارے میں ہمارے لیے شافی بیان کر دے۔''

اس پر سورۂ بقرہ کی یہ آیت اتری:

﴿یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْخَمْرِ وَ الْمَیْسِرِ قُلْ فِیْھِمَآ اِثْمٌ کَبِیْرٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَ اِثْمُھُمَآ اَکْبَرُ مِنْ نَّفْعِھِمَا﴾ (البقرۃ:۲۱۹)

''لوگ تم سے شراب اور قمار بازی کی نسبت سوال کرتے ہیں تو کہہ دو کہ ان دونوں میں بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے لیے فائدے بھی ہیں لیکن فائدے سے گناہ بڑھ کر ہے۔''

اس آیت کے اترنے کے بعد بھی لوگ شراب پیتے پلاتے رہے' یہاں تک کہ ایک دفعہ ایک انصاری نے حضرت علیؓ اور حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف وغیرہ کی دعوت کی' شراب کا دور چل رہا تھا کہ مغرب کی نماز کا وقت آ گیا۔ ایک صاحب (۱) نے امامت کی مگر نشہ کے خمار میں ﴿یٰٓاَیُّھَا الْکَافِرُوْنَ﴾ کے سورہ کو کچھ کا کچھ پڑھ گئے اور

(۱) شراب کی حرمت کی یہ تدریجی صورت حضرت عمرؓ (ترمذی تفسیر مائدہ ابوداؤد کتاب الاشربہ) حضرت ابوہریرہؓ (مسند احمد ج ۲' ص ۳۵۱) اور حضرت علیؓ (ابوداؤد کتاب الاشربہ) سے مروی ہے یہ بات کہ وہ کون صحابی تھے جنہوں نے نشہ کی حالت میں غلط سلط سورہ پڑھ دی تھی' روایات سے صاف طور پر ظاہر نہیں ہوتی' ایک روایت میں حضرت علیؓ کا نام ہے اور دوسری میں عبدالرحمٰن بن عوفؓ کا نام اور تیسری میں کوئی مہاجر مذکور ہے' حضرت الاستاذ نے سیرۃ جلد دوم (تاریخ احکام ذکر حرمت شراب) میں ابوداؤد کتاب الاشربہ کے حوالہ سے حضرت علیؓ کا نام لکھ دیا تھا مگر مزید تحقیق سے یہ نسبت مشکوک معلوم ہوتی ہے۔ اس خاص روایت کا مرکزی راوی عطا بن السائب بن ابی عبدالرحمٰن ہے ابوعبدالرحمٰن سلمی حضرت علیؓ سے روایت کرتا ہے' اس سے یہ روایت مختلف طریقوں سے آئی ہے اور ہر ایک میں شراب پینے والوں اور حالت نشہ میں نماز پڑھانے والے کے نام کا اختلاف ہے' چنانچہ ہر روایت کے اصلی الفاظ ہیں۔ ←

اس پر یہ آیت اتری۔

﴿لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَ اَنْتُمْ سُكَارٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ﴾ (النساء:۴۳)

''نشہ کی حالت میں نماز نہ پڑھو یہاں تک کہ تم جو کہو اس کو سمجھ بھی سکو۔''

اس کے بعد جب نماز کا وقت آتا تو منادی اعلان کرتا تھا کہ کوئی مخمور نماز میں شامل نہ ہونے پائے۔

لیکن چونکہ اب بھی ممانعت کا کوئی عام حکم نہ تھا اس لیے نماز کے علاوہ اور اوقات میں لوگ پیتے پلاتے رہتے تھے حضرت عمرؓ نے پھر دعا کی' اتفاق سے اسی زمانہ میں بعض انصار نے حضرت سعدؓ بن وقاص کی دعوت کی' اس میں شراب کا دور بھی چلا' یہ پی کر بدمستی میں کہنے لگے کہ مہاجر انصار سے بہتر ہیں اس پر بات بڑھی اور مار پیٹ تک نوبت پہنچی' اس پر حکم آیا (صحیح مسلم فضائل سعدؓ بن وقاص)

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَ الْمَيْسِرُ وَ الْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾ (المائدہ:۹۰)

''اے ایمان والو! بے شک شراب' جوا' بت اور پانسے ناپاک اور شیطان کے کام ہیں' تو ان سے بچو تا کہ فلاح پاؤ۔''

← وہ روایتیں جن میں حضرت علیؓ کا نام ہے:

۱. عَنْ اَبِی جَعْفَرِ الرَّازِی عَنْ عَطَاءَ بْنِ السَّائِبِ عَنْ اَبِی عَبْدَالرَّحْمٰنِ السَّلْمِیْ عَنْ عَلِیِّ بْنِ اَبِی طَالِبٍ قَالَ صَنَعَ لَنَا عَبْدَالرَّحْمٰن بْن عَوْفٍ طَعَامًا فَدَعَانَا وَ سَقَانَا مِنَ الْخُمْرِ فَاَخَذَتِ الْخَمْرُ مِنَّا وَ حَضَرَتِ الصَّلٰوةَ فَقَدْ مَوْمِی فَقَرأتُ قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكَافِرُوْنَ لَا اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ وَ نَحْنُ نَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَ اَنْتُمْ سُكَارٰى. (ترمذی تفسیر نساء)

''ابوجعفر رازی نے عطا بن سائب سے عطا نے ابوعبدالرحمٰن سلمی سے ابوعبدالرحمٰن سلمی نے حضرت علیؓ بن ابی طالب سے روایت کی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے ہمارے لیے کھانا تیار کرایا اور ہم کو مدعو کیا اور شراب پلائی جب ہم شراب کے نشہ میں چور ہو گئے اور نماز کا وقت آیا تو لوگوں نے مجھ کو امام بنایا اور میں نے ﴿قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكَافِرُوْنَ لَا اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ وَ نَحْنُ نَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ﴾ پڑھی اس پر خدا نے یہ آیت ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَ اَنْتُمْ سُكَارٰى﴾ یعنی مسلمانو! نشہ کی حالت میں نماز نہ پڑھو۔''

۲. عَنْ سُفْيَانَ حَدَّثَنَا عَطَاءَ بْنِ السَّائِبِ عَنْ اَبِی عَبْدَالرَّحْمٰنِ السَّلْمی عَنْ عَلِیٍّ اَنَّ رَجُلًا مِنَ الْاَنْصَارِ دَعَاهُ وَ عَبْدُالرَّحْمٰنِ بْنِ عَوْفٍ فَسَقَا هُمَا قَبْلِ اَنْ تَحْرِمَ الْخَمْرُ فَاَمَّهُمْ عَلِیٌّ فِی الْمَغْرَبِ. فَقَرَأَ ﴿قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ﴾ فَخَلَطَ فِيْهَا فَنَزَلَتْ لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَ اَنْتُمْ سُكَارٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ. (ابوداؤد کتاب الاشربہ) ←

''سفیان نے عطا بن سائب سے' عطا نے ابوعبدالرحمٰن سلمی سے ابوعبدالرحمٰن سلمی' نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے یہ روایت کی ہے کہ انصار کے ایک شخص نے ان کو اور عبدالرحمٰن بن عوف کو مدعو کیا اور تحریمِ شراب سے پہلے ان دونوں کو شراب پلائی' پھر علیؓ نے نماز مغرب کی امامت کی اور ﴿قُلْ یٰٓاَیُّھَا الْکٰفِرُوْنَ﴾ پڑھی لیکن اس میں گڈمڈ کر دیا' اس پر آیت اتری۔ ﴿لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوۃَ وَ اَنْتُمْ سُکٰرٰی حَتّٰی تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ﴾ نشے کی حالت میں نماز کے پاس نہ جاؤ یہاں تک کہ جو کچھ کہتے ہو اس کو جان لو۔''

وہ روایتیں جن میں عبدالرحمٰن بن عوفؓ کا نام ہے:

۳. عَنْ سُفْیَان عَنْ عَطَاءَ بْنِ السَّائِبِ عَنْ اَبِی عَبْدَالرَّحْمٰنَ السَّلْمَی عَنْ عَلِیّ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ دَعَانَا رَجُلٌ مِنَ الْاَنْصَار قَبْل اَنْ تَحْرِمَ الْخَمْرُ فَتَقَدَّمَ عَبْدَالرَّحْمٰنِ ابْنِ عَوْفٍ وَ صَلّٰی بِھِمُ الْمَغْرِبُ فَقَرَأَ قُلْ یٰٓاَیُّھَا الْکَافِرُوْنَ فَالْتَبَسَ عَلَیْہِ فَنَزَلَ ﴿لَاتَقْرَبُو الصَّلٰوۃَ وَ اَنْتُمْ سُکَارٰی﴾ (مستدرک حاکم کتاب الاشربہ)

''سفیان نے عطا بن سائب سے عطاء نے ابوعبدالرحمٰن سلمی سے' ابوعبدالرحمٰن سلمی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کی کہ تحریمِ شراب سے پہلے' انصار کے ایک شخص نے ہم کو مدعو کیا تو عبدالرحمٰن بن عوف نے امامت کی اور ان کو مغرب کی نماز پڑھائی اور ﴿قُلْ یآ اَیُّھَا الْکٰفِرُوْنَ﴾ پڑھی لیکن اس میں خلط ہو گیا۔ اس پر یہ آیت اتری ﴿لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوۃَ وَ اَنْتُمْ سُکَارٰی﴾ نشے کی حالت میں نماز نہ پڑھو۔''

۴. سفیان عن عطاء بنِ السائب عن بن عَبْدَالرَّحْمٰنِ عَنْ عَلِیّ رَضِیَ اللّٰہ عَنْہ اَنَّہٗ کَانَ ھُوَ وَ عَبْدَالرَّحْمٰنَ وَ رَجُلٌ آخِرٌ یَشْرَبُوْنَ الْخَمْرُ فَصَلّٰی بِھِمْ عَبْدَالرَّحْمٰنِ بْنِ عَوْفَ فَقَرَأَ قُلْ یَآ اَیُّھَا الْکٰفِرُوْنَ فَخَلَطَ فِیْھَا فَنَزَلَتْ ﴿لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوۃَ﴾ (مستدرک حاکم کتاب الاشربہ)

''سفیان نے عطا بن السائب سے عطاء نے ابن عبدالرحمٰن سے ابن عبدالرحمٰن نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ وہ اور عبدالرحمٰن ابن عوف اور ایک دوسرے آدمی شراب پی رہے تھے اور ان کو عبدالرحمٰن بن عوف نے نماز پڑھائی اور ﴿قُلْ یَآ اَیُّھَا الْکَافِرُوْنَ﴾ پڑھی جس میں خلط ملط کر دیا اس پر یہ آیت اتری۔''

۵. خَالِد بْنِ عَبْدَاللّٰہِ عَنْ عَطَاءَ بْنِ السَّائِبِ عَنْ أَبی عَبْدَالرَّحْمٰنِ أَنَّ عَبْدَالرَّحْمٰنَ صَنَعَ طَعَامًا قَدَعَا نَاسًا مِنْ اَصْحَابِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مِنْھُمْ علی بن ابی طالب رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ فَقَرَأُ ﴿قُلْ یَآ اَیُّھَا الْکٰفِرُوْنَ وَ لَا اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ وَ نَحْنُ عَابِدُوْنَ مَا عَبَدْتُّمْ فَنَزَلَتْ لَا تَقْرَبُوْا الصَّلٰوۃَ الآیۃ﴾ (مستدرک حاکم کتاب الاشربہ)

''خالد بن عبداللہ' عطا بن سائب سے عطا ابی عبدالرحمٰن سے روایت کرتے ہیں کہ عبدالرحمٰن نے کھانا تیار کرایا اور ←

صحابہ میں سے چند لوگوں کو بلایا پھر انہوں نے امامت کرائی اور ﴿قُلْ یٰٓاَیُّھَا الْکَافِرُوْنَ لَا اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ وَ نَحْنُ عَابِدُوْنَ مَا عَبَدْتُّمْ﴾ پڑھی اس پر یہ آیت اتری۔''

وہ روایت جس میں نام کی تعیین نہیں۔

٦. سَفْیَان عَنْ عَطَاءَ بْنِ السَّائِب عنْ اَبی عَبْدَالرَّحْمٰنِ عَنْ عَلِیٍّ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ دَعَانَا رَجُلٌ مِّنَ الْاَنْصَارِ قَبْلَ تَحْرِیْمَ الْخَمْرِ فَحَضَرَ صَلٰوۃَ الْمَغْرِبِ فَتَقَدَّمَ رَجُلٌ فَقَرَأَ قُلْ یٰٓاَیُّھَا الْکٰفِرُوْنَ فَالْتَبَسَ عَلَیْہِ فَنَزَلَتْ لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوۃَ الآیۃ. (مستدرک حاکم تفسیر نساء)

''سفیان' عطا بن سائب سے' عطاء ابوعبدالرحمٰن سے وہ حضرت علیؓ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا' تحریمِ شراب سے پہلے ہم کو انصار کے ایک شخص نے مدعو کیا نمازِ مغرب کا وقت آیا تو ایک آدمی نے امامت کی اور ﴿قُلْ یٰٓاَیُّھَا الْکَافِرُوْنَ﴾ پڑھی لیکن اس میں خلط ملط کر دیا اس پر یہ آیت اتری ﴿لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوۃَ﴾ (الآیۃ)۔''

ان چھ روایتوں میں مختلف قسم کے اختلافات ہیں۔

(۱) پہلی اور پانچویں روایت میں ہے کہ داعی عبدالرحمٰن بن عوفؓ تھے' دوسری' تیسری اور چھٹی میں ہے کہ داعی کوئی انصاری تھے' چوتھی میں دعوت کے بغیر مجلسِ شراب کا ذکر ہے۔

(۲) پہلی اور دوسری میں ہے کہ امام حضرت علیؓ تھے' جنہوں نے نشہ میں کچھ کا کچھ پڑھ دیا' تیسری' چوتھی' پانچویں میں ہے کہ وہ امام عبدالرحمٰن بن عوفؓ تھے اور چھٹی میں حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ کوئی آدمی امام تھا۔

(۳) اور روایتوں میں ہے کہ اس دعوت کی مجلس میں شراب تھی' چھٹی میں شراب کا مطلق ذکر نہیں ہے بلکہ وہ شخص جو امام بنا تھا وہی شاید کہیں سے پی کر آیا ہو گو کہ حرمتِ شراب سے پہلے پینا کوئی شرعی جرم نہیں تاہم حضرت علی رضی اللہ عنہ کا پینا جو بچپن سے آنحضرت ﷺ کی صحبت و تربیت میں پل کر جوان ہوئے قیاس کے خلاف ہے' خصوصاً اس آیت کے بعد ﴿قُلْ فِیْھِمَآ اِثْمٌ کَبِیْرٌ﴾ (کہہ دے کہ شراب اور جوئے میں بڑا گناہ ہے) حضرت علیؓ کا پینا اور بھی زیادہ واقعہ کی صورت میں شک پیدا کرتا ہے' پھر جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس روایت میں مختلف قسم کے ایسے اختلافات ہیں جو ناقابلِ تطبیق ہیں ان اختلافات کا راز اس وقت کھل جاتا ہے۔ جب ان کے راویوں پر نظر ڈالی جاتی ہے' سب سے پہلا راوی ابوعبدالرحمٰن سلمی جس کا نام عبداللہ بن حبیب ہے۔ وہ پہلے حضرت علیؓ کا طرف دار حامی (شیعہ) تھا' بعد کو عثمانی (بنوامیہ کا طرف دار) اور حضرت علیؓ کا مخالف ہو گیا۔ پھر اس کا یہ دعویٰ کہ اس نے حضرت علیؓ سے سنا ہے' محدثین میں مسلم نہیں' بخاری نے اس کو مانا ہے لیکن ابن ابی حاتم نے اس سے انکار کیا ہے' روایت کے دوسرے راوی عطا بن سائب کا حافظہ خراب ہو گیا تھا' اس لیے لوگوں نے اس کو چھوڑ دیا تھا' گو سفیان کی اس سے روایتیں حافظہ کی خرابی سے پہلے کی سمجھی جاتی تھیں' مگر اوپر کی روایتوں میں دیکھو کہ خود سفیان کی روایتوں میں بھی وہی ناقابل تطبیق اختلاف موجود ہے' ان وجوہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مختلف فیہ جزئیات غیر مسلم ہیں اور واقعہ کی اصلی صورت وہی ہے جو چھٹی روایت میں ہے کہ وہ

مجلس محض دعوت کی تھی جس میں حضرت علیؓ اور دوسرے صحابہ موجود تھے کہ نماز کا وقت آ گیا اور ایک صاحب جو مخمور تھے۔ نماز پڑھانے کھڑے ہو گئے اور آیتیں غلط سلط پڑھ دیں چونکہ اس واقعہ کے راوی حضرت علیؓ تھے اور وہ دعوت میں شریک تھے اس لیے یا تو ابو عبدالرحمٰن سلمٰی عثمانی نے فرقہ داری کے جذبہ میں یا عطاء نے ذرا سی بھول میں واقعہ کی نسبت ادھر سے ادھر کر دی۔

اس آخری چھٹی روایت کی تائید حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے ہوتی ہے جس کی سند پورے سلسلہ سے الگ اور مستقل ہے:

۷. عَنْ اَبِی هُرَیْرَةَ قَالَ حُرِّمَتِ الْخَمْرُ ثَلاث مَرَّاتٍ قَدَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ الْمَدِيْنَةَ وَ هُمْ يَشْرَبُوْنَ الْخَمْرُ وَ يَأْكُلُوْنَ الْمَيْسَرُ فسَئَالُوا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْهُمَا فَأَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَى نَبِيِّهٖ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ﴿يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَ الْمَيْسِرِ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَ اِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِن نَّفْعِهِمَا الاية﴾ فَقَالَ النَّاسُ مَاحُرِّمَ عَلَيْنَا اِنَّمَا قَالَ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَ كَانُوْا يَشْرَبُوْنَ الْخَمْرَ حَتّٰى اِذَا كَانَ يَوْمَ مِنَ الْاَيَّامِ صَلَّى رَجُلٌ مِنَ الْمُهَاجِرِيْنَ اَمَّ صَحَابِهٖ فِى الْمَغْرِبِ خَلَطَ فِى قِرَأتِهٖ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ فِيْهِمَآ اٰيَةَ اَغْلَظَ مِنْهَا يَا يُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَاتَقْرَبُوْا الصَّلٰوةَ وَ اَنْتُمْ سُكَارٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ وَ كَانَ النَّاسُ يَشْرَبُوْنَ حَقَّ يَاْتِىَ اَحَدَهُمُ الصَّلٰوةَ وَ هُمْ مُغْلَقٌ ثُمَّ اَنْزَلَتْ اٰيَةً اَغْلَظُ مِنْ ذٰلِكَ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَ الْمَيْسَرُ وَ الْاَنْصَابُ وَ الْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ فَقَالُوْا اَنْتَهَيْنَا دِيْنَارِهٖ مسند احمد جلد ۲.

''حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا کہ شراب تین بار حرام کی گئی رسول اللہ ﷺ مدینہ تشریف لائے تو لوگ شراب پیتے تھے اور جوئے کا مال کھاتے تھے لوگوں نے آپؐ سے ان دونوں کے متعلق سوال کیا خدا نے آپؐ پر یہ آیت نازل فرمائی ﴿يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَ الْمَيْسِرِ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَ اِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا. الآية﴾ لیکن لوگوں نے کہا خدا نے ہم پر حرام نہیں کی صرف یہ کہا کہ ان دونوں میں بہت بڑا گناہ ہے۔ اب بھی لوگ شراب پیتے رہے یہاں تک کہ ایک دن ایک مہاجر نے نماز مغرب پڑھائی اور اپنی قرأت میں خلط کر دیا' اس لیے خدا نے شراب کے متعلق اس سے زیادہ سخت آیت اتاری ﴿يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَ اَنْتُمْ سُكَارٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ﴾ اب بھی لوگ شراب پیتے رہے البتہ جب کوئی نماز پڑھنے جاتا تھا' تو ہوش کی حالت میں جاتا تھا' پھر اس سے زیادہ سخت آیت نازل ہوئی ﴿يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَ الْمَيْسِرُ وَ الْاَنْصَابُ وَ الْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾ اب لوگوں نے کہا کہ خداوند ہم باز آئے۔''

اس کے بعد شراب قطعاً حرام ہوگئی' حرمت شراب کی یہ آخری آیت جس وقت اتری ہے حضرت ابوعبیدہؓ امین الامت اور ابی بن کعبؓ جو سید القراء تھے' ابوطلحہؓ کے گھر میں مہمان تھے اور شراب کا دور چل رہا تھا' ساقی گری کی خدمت حضرت انسؓ سے متعلق تھی۔ چنانچہ صحیح بخاری کتاب الاشربہ میں خود حضرت انسؓ کی زبانی روایت ہے:

كُنْتُ اَسْقٰى اَبَا عُبَيْدَةٍ وَ اَبَا طَلْحَةٍ وَ اَبِى بْنِ كَعْبٍ فَجَآءَ هُمْ اٰتٍ فَقَالَ اِنَّ الْخَمْرَ حُرِمَتْ.

''میں ابوعبیدہ اور ابوطلحہ اور ابی بن کعب کو شراب پلا رہا تھا کہ ایک شخص نے آ کر کہا کہ شراب حرام ہو گئی۔''

حافظ ابن حجر نے اس حدیث کی شرح میں صحیح مسلم اور دیگر حدیث کی کتابوں کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اس جلسہ میں گیارہ بزرگ شریک تھے جن میں حضرت معاذ بن جبلؓ بھی شریک تھے۔ اس موقع پر لحاظ کے قابل یہ بات ہے کہ اگرچہ یہ مدتوں کی عادت تھی اور اس وقت بھی خمار میں جھوم رہے تھے۔ (۱) تاہم جوں ہی یہ آواز آئی کہ رسول اللہ ﷺ نے شراب کی ممانعت کر دی' کسی نے پوچھ گچھ تک نہ کی اور دفعتاً جام و سبو توڑ ڈالے یہ صرف ابوطلحہؓ کے گھر کا حال نہ تھا بلکہ تمام مدینہ کے گلی کوچوں میں شراب کی ندیاں بہہ گئیں' بخاری باب المظالم میں ہے:

← اس میں حضرت علیؓ کا کہیں ذکر بھی نہیں' حضرت علیؓ جیسے قرآن کے صاحب فہم کی نسبت یہ خیال کرنا کہ پہلی آیت کے اشارہ سے وہ شراب کی حرمت کو نہ سمجھ سکے تھے' قبول کے قابل نہیں' محدثین میں حاکم نے مستدرک میں چھٹی روایت کو لکھ کر بیان کیا ہے کہ اس واقعہ میں حضرت علیؓ کا نام شامل کرنا خوارج کی کارستانی ہے جس کی تردید اس روایت سے ہو جاتی ہے جس کو خود علیؓ روایت فرماتے ہیں' حاکم کہتے ہیں۔

وَفِى هَذَا الْحَدِيْثِ فَائِدَةٌ كَثِيْرَةٌ وَ هِىَ اَنَّ الْخَوَارِجَ تَنْسَبُ هَذَا السَّكْرَ وَ هَذِهِ الْقِرَاءَةَ اِلَى اَمِيْرِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلِىِّ بْنِ اَبِىْ طَالِبٍ دُوْنَ غَيْرِهٖ وَ قَدْ بَرَّاَهُ اللّٰهُ مِنْهَا فَاِنَّهٗ رَاوِىُّ هَذَا الْحَدِيْثِ. (مستدرک تفسیر نساء ج ۲ ص ۳۰۷)

''اور اس حدیث میں بہت بڑا نکتہ ہے اور وہ یہ ہے کہ خوارج نے نشہ اور اس غلط قرأت کو امیر المومنین علیؓ بن ابی طالب ہی کی طرف منسوب کیا تھا تو خدا نے ان کو اس الزام سے بری کر دیا کہ وہی اس حدیث کے راوی ہیں۔''

درحقیقت وہ واقعہ کے صرف راوی تھے لیکن عثمانی اور خارجی راوی نے خود حضرت علیؓ کو صاحب واقعہ بنایا۔

(۱) فتح الباری جلد ۱۰ مطبوعہ مصر طبع اول ص ۳۱ بحوالہ روایت ابی عاصم۔

فَجَرَّتْ فِیْ سَلَکِ الْمَدِیْنَۃِ۔ ''مدینہ کی گلیوں میں شراب بہتی پھرتی تھی۔''

ان ندیوں کی روانی سے اندازہ ہوگا کہ عرب میں شراب نوشی کی کثرت کا کیا عالم تھا۔

قمار بازی

شراب خوری کے ساتھ ساتھ ان میں قمار بازی کا بھی عام رواج ہو گیا تھا' عرب کے مال و دولت کا تمام تر سرمایہ اونٹوں کے چند گلوں تک محدود تھا اس لیے جوا بھی انہی کے ذریعہ سے کھیلا جاتا تھا' چنانچہ لبید جاہلی شاعر اپنے حریف سے کہتا ہے:

اَعَیَّرْتَنَا اَلْبَانِھَا وَ لَحُوْمِھَا

وَ ذٰلِکَ عَارَ یَا بْنِ رِیْطَۃِ ظَاھِرَ

''کیا تو ہم پر عیب لگاتا ہے کہ ہم اونٹ کا دودھ اور گوشت کھاتے ہیں اے ابن ریطہ ہم پر یہ عیب نہیں لگ سکتا۔''

نَحَابِی بِھَا اَکْفَآءَنَا وَ نَھِیْنُھَا

وَ نَشْرَبُ فِی اَثْمَانِھَا وَ نُقَامِرَ

''ہم ان کو اپنے ہمسروں کو بطور عطیہ کے دیتے ہیں اور ان کو مہمانی میں صرف کرتے ہیں اور ان کی قیمت سے شراب پیتے اور جوا کھیلتے ہیں۔''

اس غرض سے اونٹوں کو ذبح کر کے ان کے گوشت کو دس ٹکڑوں میں تقسیم کر دیتے تھے اور ان ہی ٹکڑوں پر پانسے ڈالتے تھے' ان پانسوں کی صورت یہ تھی کہ دس تیر مقرر کر لیتے جن کے نام یہ ہیں۔ قد' توام' رقیب' حلس' میل' معلیٰ' منافس' مینح' سفیح وغد' ان میں ہر تیر کے مختلف حصے معین کر لیتے تھے اور جب جوا کھیلتے تھے تو ان کو ایک تھیلے میں ڈال کر ایک منصف شخص کے ہاتھ میں دے دیتے تھے' وہ ان کو گڈمڈ کر کے ایک ایک تیر کو ایک ایک شخص کے نام پر نکالتا جاتا تھا' جن کے نام پر وہ تیر نکلتے تھے' جن کے حصے مقرر تھے' وہ کامیاب ہوتے تھے اور جن تیروں کا کوئی حصہ نہ تھا وہ جن کے نام پر نکلتے ان کو ناکامیابی ہوتی تھی۔ اس طرح گوشت کے جو ٹکڑے جمع ہو جاتے تھے ان کو فقیروں اور محتاجوں اور دوستوں میں تقسیم کر دیتے تھے چونکہ یہ فیاضی کے اظہار کا ایک طریقہ تھا' اس لیے قمار بازی کی مجلسوں میں شریک نہ ہونا ایک قومی عار تھا اور اس قسم کے لوگوں کو نہایت بخیل خیال کرتے تھے اور ان کو ''برم'' کا خطاب دے رکھا تھا'[1] جو لوگ یہ خطاب حاصل کر لیتے تھے' ان سے شادی بیاہ کرنا ننگ و عار خیال کیا جاتا تھا' چنانچہ ایک جاہلی شاعر اپنی بیوی کو وصیت کرتا ہے۔

وَ اِذَا ھَلَکْتُ فَلَا تَرِیْدِی عَاجِزًا

غَسًّا وَ لَا بَرْمًا وَ لَا مَعْزَالَا

---

(۱) یہ پوری تفصیل تفسیر کبیر ج ۲ ص ۳۳۱ میں ہے۔

''اگر میں ہلاک ہو جاؤں تو عاجز' کمزور اور جوئے میں نہ شریک ہونے والے اور سفر میں قوم سے علیحدہ رہنے والے سے نکاح نہ کرنا۔''

جوئے کی ایک صورت جس کو ''رہان'' کہتے تھے یہ تھی کہ کسی شرط پر بازی لگاتے تھے اور جب وہ شرط پوری نہیں ہوتی تھی تو جس چیز پر بازی لگائی جاتی تھی اس کو لے لیتے تھے' چنانچہ جب رومیوں اور ایرانیوں میں جنگ ہوئی اور باوجود رومیوں کی شکست کے قرآن مجید نے پیشین گوئی کی کہ ان کو چند سال میں ایرانیوں پر غلبہ حاصل ہو جائے گا تو کفار نے حضرت ابوبکرؓ سے اسی قسم کی شرط لگائی اور اس فتح کے لیے چھ برس کی مدت مقرر کی گئی چنانچہ جب یہ مدت گزر چکی اور رومیوں کو فتح وظفر نصیب نہیں ہوئی تو حضرت ابوبکرؓ کو بازی ہار جانا پڑی۔ (۱) رفتہ رفتہ اس قمار بازی کا مذاق ان میں اس قدر عام ہو گیا تھا کہ لوگ مال و دولت کھو چکنے کے بعد بی بی اور بال بچوں پر بازی لگا دیتے تھے (۲) یہ قمار بازی اور وہ بھی شراب کی بدمستی کے عالم میں اکثر مار پیٹ اور لڑائی پر ختم ہوتی تھی' عیس و ذبیان کی چہل سالہ جنگ گھوڑ دوڑ ہی کی قمار بازی کا نتیجہ تھی' حصولِ دولت اور کسبِ شہرت کے اس غلط طریقہ سے خاندان کے خاندان تباہ ہو جاتے تھے۔

سود خوری

عرب میں سود خواری کا عام رواج تھا۔ تمام دولت مند سود پر لین دین کرتے تھے' حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب نے جو قریش کے سردار اور آنحضرت ﷺ کے چچا تھے' تجارت کا کاروبار نہایت وسیع پیمانہ پر پھیلا رکھا تھا اور اس تعلق سے سود خوری میں نہایت شہرت رکھتے تھے' چنانچہ آنحضرت ﷺ نے جب حجۃ الوداع میں سود کی حرمت کا اعلان کیا تو سب سے پہلے انہی کے سود کو باطل قرار دیا' حضرت عثمانؓ اور خالدؓ بن ولید سود پر قرض دیتے تھے' مسعود ثقفی طائف کا مشہور رئیس تھا اور اس کے بھائی عبد یالیل اور حبیب بن ربیعہ نہایت دولت مند تھے۔ بنو مغیرہ ان ہی لوگوں میں سود پر داد و ستد کرتے تھے چنانچہ جب طائف فتح ہوا اور یہ چاروں بھائی اسلام لائے تو انہوں نے مغیرہ سے سود کا تقاضا کیا اس پر یہ آیت نازل ہوئی:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ ذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰٓوا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴾ (البقرۃ: ۲۷۸)

''مومنو! خدا سے ڈرو اور بقیہ سود کو اگر تم مسلمان ہو تو چھوڑ دو۔''

ان کے علاوہ طائف ایک سرسبز اور دولت مند شہر تھا' اس لیے وہاں کے لوگ عموماً سود پر بیوپار کرتے تھے' چنانچہ آنحضرت ﷺ نے ان سے جن شرائط پر مصالحت کی' ان میں ایک ضروری شرط یہ بھی تھی کہ وہ لوگ سود

(۱) ترمذی ص ۱۶۰ جوئے کی صورت کو رہان کہتے تھے اور اب تک وہ حرام نہیں ہوئی تھی۔

(۲) تفسیر کبیر ج ۲ ص ۵۴۱۔

خوری نہ کریں گے۔ (۱) اسی طرح یمن کے نجرانی سوداگر بھی سودی کاروبار کرتے تھے ان سے بھی یہی شرط کی گئی۔ (۲)

سود کا عام اور متداول طریقہ تو یہ تھا کہ ایک معین شرح پر قرض دیتے تھے اور راس المال کے ادا کرنے کے لیے میعاد مقرر کر دیتے تھے، جب میعاد گزر جاتی تھی تو اس کا تقاضا کرتے تھے اگر مدیون اس کو ادا نہیں کر سکتا تھا تو میعاد میں اور اضافہ کر دیتے تھے اور اس کے عوض میں شرح سود بڑھا دیتے تھے لیکن اس نے ترقی کر کے ایک نہایت ظالمانہ صورت اختیار کر لی تھی، جو سود در سود سے بھی زیادہ خطرناک تھی یعنی ایک متعینہ مدت کے لیے کسی کو مثلاً سو روپیہ دیتے تھے لیکن مدت گذر چکتی اور تقاضا کرنے پر مدیون اس رقم کو ادا نہیں کر سکتا تھا تو میعاد اور بڑھا دیتے تھے۔ لیکن اس کے معاوضہ میں راس المال میں بھی اضافہ کروا لیتے تھے، یہاں تک کہ کبھی کبھی یہ اضافہ دوگنی چوگنی مقدار تک پہنچ جاتا تھا، اس طرح اضافہ ہوتے ہوتے مدیون کی کل جائیداد مستغرق ہو جاتی تھی، یہ معاملہ زیادہ تر غریبوں اور کاشت کاروں کے ساتھ پیش آتا تھا جس کا نتیجہ یہ تھا کہ غریبوں اور کاشت کاروں کا تمام طبقہ دولت مندوں اور خصوصاً یہودیوں کے ہاتھ میں گرو تھا۔ قرآن مجید کی یہ آیت اسی طریقۂ سود کو مٹانے کے لیے نازل ہوئی:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوٓا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً وَّ اتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾
(آل عمران:۱۴)

''مسلمانو! دونا، چار گنا، سود نہ کھاؤ، اور خدا سے ڈرو، یقین ہے کہ تم کامیاب ہو جاؤ۔''

سود کے علاوہ قرض کے متعلق اور بھی مختلف قسم کی ناجائز سختیاں پیدا ہو گئی تھیں مثلاً اگر راہن میعاد کے اندر مال مرہونہ کو چھڑا نہ سکتا تھا تو مرتہن اس کا مالک ہو جاتا تھا۔ (۳) مال و دولت سے گزر کر عورتیں اور بال بچوں تک کو رہن رکھواتے۔ (۴)

لوٹ مار

عرب میں روز کی لوٹ مار نے اگرچہ ہر قبیلہ کو غارت گر اور راہزن بنا دیا تھا، تاہم بعض قبائل میں اس قسم کے خاص خاص جتھے قائم ہو گئے تھے جنہوں نے راہزنی کو اپنا ذریعۂ معاش اور عام مشغلہ بنا لیا تھا۔ اس قسم کے لوگوں کو ''لصوص'' کہتے تھے اور قبیلہ طے کو عرب میں عام طور پر جو شہرت حاصل تھی، وہ اس گروہ کی بدولت تھی۔

یہ گروہ شہر سے باہر میدانوں میں، جنگلوں میں، پہاڑوں کے کھوؤں میں رہتا تھا اور ادھر سے جو مسافر یا قبیلے

(۱) فتوح البلدان بلاذری فتح طائف۔
(۲) ابوداؤد کتاب الامارت۔
(۳) موطا امام مالک ص ۳۰۴۔
(۴) بخاری قتل کعب بن اشرف۔

گزرتے تھے ان کو لوٹ لیتا تھا۔ اس کا استیصال صرف ایک پرزور نظامِ حکومت ہی سے ہوسکتا تھا جو عرب میں مفقود تھا' چنانچہ قبیلۂ طے کے عیسائی سردار عدی بن حاتم مسلمان ہوکر جب آپؐ سے ملنے آئے اور آپؐ نے ان سے یہ پیشین گوئی کی کہ وہ دن آئے گا جب حیرہ سے ایک پردہ نشین عورت بے خوف وخطر حضرموت تک کا سفر کرے گی' تو چونکہ وہ قبیلہ طے کے ایک رئیس تھے اور ان کو اس قبیلہ کے ڈاکوؤں کا حال معلوم تھا اس لیے ان کو تعجب ہوا کہ ہیں! طے کے لصوص کیا ہوجائیں گے۔

ہر قبیلہ دوسرے قبیلہ کے مال ودولت' مویشی بلکہ اہل وعیال تک پر ڈاکا ڈالنے کے لیے تیار رہتا تھا تاجروں اور سوداگروں کے قافلے بغیر کسی بھاری انعام کے کسی میدان سے بسلامت گزر نہیں سکتے تھے' ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ کی عورتوں اور بچوں کو پکڑ کر کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت کردیتا تھا اور مویشیوں کو ہانک کر لے جاتا تھا' چنانچہ ''صبح'' کا وقت جب کہ رات بھر چلنے کے بعد مسافر' آرام کرتے تھے' اس کام کے لیے مخصوص ہوگیا تھا' چنانچہ صبح کا وقت عربی میں لوٹنے کے معنی میں جاہلیت میں عام طور سے بولا جاتا تھا' کامیاب ڈاکو اپنے کارناموں کو نظم کرتے تھے اور فخریہ پڑھتے تھے' ایک قبیلہ کا شاعر حارث نامی ڈاکو کے سلامت نکل جانے پر کہتا ہے:

يَا لَهْفَ ذِيَابَةَ لِلْحَارِثِ
اَلصَّابِحِ فَالْغَانِمِ فَالْاٰئِبِ

''اے زیابہ کا افسوس حارث کے لیے جو صبح کو ڈاکا ڈالنے والا' پھر لوٹنے والا' پھر بسلامت واپس جانے والا ہے۔''

حج کے تین مہینوں میں البتہ وہ اس پیشہ سے باز رہتے تھے' لیکن اس سے زیادہ مدت پر وہ صبر نہیں کرتے تھے اور چونکہ ہر قبیلہ دوسرے قبیلہ کے مال ودولت اور مویشی پر موقع پاکر اسی طرح تصرف کرتا تھا' اس لیے وہ اس کو عیب نہیں بلکہ بہادری کا کام سمجھتے تھے اور اس طرح ملک میں مسلسل قتل وغارت اور لوٹ مار کر طریقہ جاری تھا۔

چوری

ڈاکے کے علاوہ اقتصادی حالات کی مجبوری سے بدوؤں میں چوری کا رواج بھی تھا' مختلف قبیلوں کے ایسے بہادر جو قبیلہ میں کوئی نمایاں حیثیت نہیں رکھتے تھے وہ خصوصیت کے ساتھ اس پیشہ کو اختیار کرتے تھے اور تنہا بڑے بڑے خطرناک موقعوں پر جاکر اس کام کو انجام دیتے تھے اور اس پر فخر کرتے تھے' ان میں سے سلیک بن السلکہ اور تابط شرًّا اشہرتِ عام رکھتے تھے' تابط شرا کا ایک قطعہ حماسہ میں ہے جس میں اپنی چوری اور حیلہ گری کا ذکر بڑے فخر سے کیا ہے۔

قریش میں تجارت کے سبب سے دولت بھی تھی اور خود خانہ کعبہ میں تحفوں اور نذرانوں کا خزانہ جمع رہتا تھا' اس لیے ان میں چوری کے مواقع بھی زیادہ تھے' چنانچہ کلبی نے متعدد ممتاز قریشیوں کے نام بتائے ہیں جنہوں نے

اس خزانہ سے سونے کا ہرن چرالیا تھا۔ (۱) بلکہ اس کے لیے خاص طور سے ابولہب کا نام لیا جاتا ہے۔ (۲)

عام بدو عربوں میں یہ برائی جتنی عام ہوگئی تھی' اس کا اندازہ اس سے ہوگا کہ آنحضرت ﷺ ان مردوں اور عورتوں سے جو اسلام قبول کرنے آتے تھے' دوسری باتوں کے ساتھ یہ معاہدہ بھی لیتے تھے کہ آئندہ وہ چوری نہ کریں گے۔ (۳) بلکہ خود قرآن پاک نے آپ کو اس کا معاہدہ لینے کا حکم دیا تھا۔ (۴)

چوری کرنے کے عجیب عجیب طریقے ایجاد کر لیے تھے' ایک شخص نے اپنی چھڑی کے کنارے ایک ٹیڑھا لوہا (مجن) لگا رکھا تھا حج کے زمانہ میں آتا اور جب حاجیوں کو غافل پاتا تو اس لوہے کے سہارے سے ان کے اسباب کو کھینچ لیتا۔ (۵)

جس طرح عرب میں طے کے ڈاکو لوٹ مار میں مشہور تھے اسی طرح بعض قبائل چوری میں شہرتِ عام رکھتے تھے چنانچہ اسلم' غفار' مزینہ اور جہنیہ کے قبیلے تمام عرب میں اس بنا پر بدنام تھے کہ وہ خاص طور پر حاجیوں کے مال و اسباب کی چوری کیا کرتے تھے۔ (۶)

چونکہ یہ چوری عربوں کی اقتصادی کمزوری کا نتیجہ تھی اس لیے اس کے لیے غیر و بیگانہ کی تخصیص نہ تھی' بلکہ اس کا اثر اعزہ و اقارب' ہمسایہ' دوست و آشنا' خاندان' غرض سب پر پڑتا تھا' چنانچہ مدینہ میں بشر' بشیر' مبشر تین آدمی تھے جن کو بنی ابیرق کہا جاتا تھا' ان میں بشیر منافق تھا اور آنحضرت ﷺ کی ہجو میں شعر کہہ کر دوسروں کی طرف منسوب کر دیتا تھا' یہ لوگ نہایت تنگ دست اور فاقہ مست تھے' انہوں نے رفاعہ نامی ایک شخص کے بالاخانہ سے جس میں ہتھیار و تلوار اور زرہ وغیرہ بھی رکھی ہوئی تھی نقب لگا کر چوری کی' آپؐ نے رفاعہ کے ہتھیار واپس دلائے۔ لیکن رفاعہ نے ان کو خدا کی راہ میں وقف کر دیا اور بشیر بھاگ کر مشرکین سے جاملا۔ (۷)

مردوں کے علاوہ عورتیں بھی اس مرض میں گرفتار تھیں' اسی لیے قرآن پاک نے عورتوں سے بیعت لیتے وقت یہ عہد لینے کی بھی تاکید کی کہ ﴿وَ لَا یَسْرِقْنَ﴾ (الممتحنۃ:۱۲) ''یعنی وہ چوری نہ کریں گی۔'' شرفا اگر اس الزام میں پکڑے جاتے تو وہ چھوڑ دیے جاتے تھے۔ اس لیے یہ برائی رکنے نہیں پاتی تھی۔ چنانچہ اسلام کے بعد بھی جب قبیلۂ مخزوم کی ایک عورت نے چوری کی تو اس پر قریش کو سخت تردد ہوا اور لوگوں نے کہا اس کے متعلق آنحضرت ﷺ کی خدمت میں کون سفارش کرے گا؟ لوگوں نے اسامہ بن زیدؓ کو منتخب کیا جن کو آپؐ بہت پیار

---

(۱) فتح الباری جلد ۱۲ ص ۷۷۔

(۲) کتاب المعارف لابن قتیبہ۔

(۳) صحیح بخاری کتاب الحدود ص ۱۰۰۴' ۱۰۰۳۔

(۴) سورہ ممتحنہ رکوع ۲۔

(۵) مسلم باب فی صلوۃ الکسوف۔

(۶) مسلم و بخاری کتاب ''المناقب باب اسلم و غفار۔

(۷) ترمذی ص ۴۹۴ کتاب التفسیر سورۂ نون۔

کرتے تھے' انہوں نے سفارش کی تو آپؐ نے فرمایا تم حدود اللہ کے متعلق سفارش کرتے ہو؟ پھر کھڑے ہو کر خطبہ دیا اور اس میں فرمایا کہ گزشتہ قومیں صرف اسی لیے ہلاک ہو گئیں کہ جب شریف آدمی چوری کرتا تھا تو اس کو چھوڑ دیتے تھے اور ضعیف چوری کرتا تھا تو اس کو سزا دیتے تھے۔ خدا کی قسم اگر فاطمہ بنت محمد بھی چوری کرتی تو میں اس کا ہاتھ بھی کاٹ لیتا۔ (۱) خود شہر کے اندر اس قسم کی وارداتوں کی یہ حالت تھی کہ صفوان بن امیہ ایک روز ایک بیش قیمت چادر اوڑھ کر سو رہے تھے ایک شخص نے موقع پا کر اس کو اڑا لیا وہ گرفتار کر کے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں لایا گیا تو آپ نے اس کے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا صفوان کو اس پر رحم آیا اور آ کر عرض کی کہ یا رسول اللہ ایک چادر کے لیے ایک عرب کا ہاتھ کاٹا جائے گا' آپؐ نے فرمایا میرے پاس لانے سے پہلے ہی اس کا خیال رکھنا تھا۔ حاکم تک معاملہ پہنچنے کے بعد کسی کو سفارش کا حق حاصل نہیں۔ (۲)

سفاکی و بے رحمی و وحشت

رات دن کی لوٹ مار اور کشت و خون سے ان میں درندوں کے تمام اوصاف پیدا ہو گئے تھے زندہ اونٹ اور دنبہ کے کوہان اور چکیاں کاٹ کر کباب لگاتے اور یہ ان کی بڑی مرغوب غذا تھی۔

زندہ جانوروں کو درخت وغیرہ سے باندھ دیتے اور ان پر تیر اندازی کی مشق کرتے' لڑائیوں میں حاملہ عورتوں کے پیٹ چاک کر ڈالتے اور مقتولوں کے ناک کان کاٹ لیتے اور عورتیں ان کے ہار بنا کر پہنتیں' منت مانتے کہ دشمن کو قتل کریں گے تو اس کی کھوپڑی میں شراب پئیں گے۔

سزا دینے کا ایک یہ طریقہ تھا کہ مجرم کو دو درختوں کی ٹہنیاں جھکا کر اس کے اعضا ان میں باندھ دیتے اور پھر ٹہنیوں کو چھوڑ دیتے' مجرم کا بدن چر کر ٹہنیوں کے ساتھ رہ جاتا۔

کبھی کبھی عورتوں کو گھوڑے کی دم سے باندھ کر گھوڑے کو سرپٹ دوڑا دیتے' ان کے بدن کے ٹکڑے اڑ جاتے۔ اس قسم کی سزائیں اکثر عرب کے سلاطین اور رؤسا دیا کرتے تھے۔

کبھی آدمی کو کسی کوٹھری میں قید کر کے اس کا کھانا پانی بند کر دیتے تھے' یہاں تک کہ وہ اسی طرح بھوک پیاس سے تڑپ تڑپ کر مر جاتا تھا۔ اس طریقۂ سزا کا نام ان کے یہاں ''صبر'' تھا' مردوں کی قبر پر اونٹ باندھ دیتے تھے اور اس کو کھانے کو نہیں دیتے تھے وہ چند روز میں مر جاتا' سمجھتے تھے کہ یہ مردے کی سواری بنے گا' اس اونٹ کو ''بلیّہ'' کہتے تھے۔

زنا اور فواحش

زنا اور فسق و فجور عام تھا اور یہ واقعات فخریہ اشعار میں بیان کیے جاتے تھے' امرؤ القیس عرب کا سب سے

(۱) بخاری ج ۲ ص ۱۰۰۳ کتاب الحدود۔
(۲) دار قطنی ص ۳۷۴ کتاب الحدود۔

بڑا شاعر تھا' اس کے ساتھ شاہزادہ اور والیٔ ملک بھی تھا۔ اس نے اپنی پھوپھی زاد بہن عنیزہ اور عورتوں کے ساتھ جو افعال شنیعہ اور بے حیائیاں کیں اپنے قصیدہ لامیۃ میں فخر کے ساتھ تفصیل سے لکھی ہیں' باوجود اس کے اس قصیدہ کے اشعار عرب میں بچہ بچہ کی زبان پر تھے۔

ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ اہلِ جاہلیت بالاعلان زنا کو جائز نہیں سمجھتے تھے لیکن چھپے چوری کرنے کو جائز سمجھتے تھے اور کہتے تھے کہ کھلم کھلا کرنا تو کمینہ پن ہے لیکن چھپ کر کرنے میں مضائقہ نہیں۔ (۱) فاحشہ عورتیں گھروں کے سامنے جھنڈیاں لگا کر بیٹھتی تھیں۔ (۲) اور صاحبِ الرایات کہلاتی تھیں' ان کی اولاد اصلی اور حلالی اولاد کے برابر سمجھی جاتی تھی' اسلام سے پہلے ایسی عورتیں خود مکہ معظّمہ میں تھیں' ان میں سے ایک کا نام عناق تھا۔ مرثد غنوی نے آنحضرت ﷺ سے اجازت مانگی کہ میں عناق سے نکاح کرلوں' اس پر یہ آیت اتری:

﴿وَ الزَّانِيَةُ لَايَنْكِحُهَآ اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِكٍ﴾ (النور:۳)

''اور زانیہ عورت سے زانی یا مشرک ہی نکاح کرتے ہیں۔''

بڑے بڑے روٴسا گھر کی لونڈیوں کو یہ حکم دیتے تھے کہ بدکاری کے ذریعہ سے جا کر کچھ کما لائیں اور ان کی نذر کریں' عبداللہ بن ابی مدینہ کا رئیس تھا اور اس درجہ کا شخص تھا کہ ہجرت سے پہلے تمام انصار نے تاج بنوالیا تھا کہ اس کو بادشاہ بنا کر پہنائیں گے۔ چنانچہ صحیح بخاری میں یہ واقعہ منقول ہے' عبداللہ بن ابی کی دو لونڈیاں تھیں۔ ایک کا نام مسیلہ اور دوسری کا نام امیمہ تھا' وہ ان دونوں کو زنا کاری کرنے پر مجبور کرتا تھا۔ اس پر قرآن مجید کی آیت اتری: (۳)

﴿وَ لَا تُكْرِهُوْا فَتَيَاتِكُمْ عَلَى الْبِغَآءِ﴾ (النور:۳۳)

''اپنی لونڈیوں کو زنا پر مجبور نہ کرو۔''

موجودہ طریقہ کے علاوہ نکاح کی اور چند قسمیں جاری تھیں' جو حقیقت میں بدکاری ہی کی قسمیں تھیں' مثلاً ایک یہ کہ کوئی شجاع اور بہادر شخص ہوتا تو اپنی عورت کو اس کے پاس بھیج دیتے کہ اس سے ہم بستر ہو' بچہ پیدا ہوتا تھا تو سمجھتے تھے کہ اس میں بھی وہی اوصاف آجائیں گے جس کا یہ نطفہ ہے۔

دوسرا طریقہ یہ تھا کہ چند آدمی جن کی تعداد ایک وقت میں دس سے زیادہ نہیں ہوتی تھی' کسی عورت کے پاس جاتے اور سب اس سے ہم صحبت ہوتے' جب وہ حاملہ ہو جاتی اور بچہ جنتی تو سب کو بلوا بھیجتی اور کسی ایک سے کہتی کہ یہ بچہ تمہارا ہے اس کو قبول کرنا پڑتا اور پھر وہ اس کا بیٹا سمجھا جاتا۔

تیسرا طریقہ یہ تھا کہ فاحشہ عورتیں جو سرِ بازار جھنڈیاں لگا کر بیٹھتی تھیں' ان کے لڑکا پیدا ہوتا تو قیافہ شناس کو

---

(۱) تفسیر طبری محصنٰت غیر مسافحات ج ۵ ص ۱۳ مصر۔

(۲) صحیح بخاری کتاب النکاح جلد ۲ ص ۷۶۹۔

(۳) ابوداؤد کتاب النکاح' صحیح مسلم باب التفسیر۔

بلوا بھیجتیں وہ صورت شکل دیکھ کر بتاتا کہ فلاں شخص کا نطفہ ہے' عورت اس کو بلا کر کہتی کہ یہ تمہارا بچہ ہے۔ صحیح بخاری کتاب النکاح میں یہ تینوں طریقے تفصیل سے مذکور ہیں۔

ایک اور قسم عارضی نکاح کی جاری تھی اور وہ یہ تھی کہ کسی عورت سے مدتِ معینہ کے لیے نکاح کر لیتے تھے' اس مدت کے گزرنے کے بعد اس کی اجرت دے کر اس کو الگ کر دیتے تھے اس کو متعہ کہتے تھے۔ اسلام نے شروع میں اس کو ضرورۃً چندے باقی رکھا' پھر ہمیشہ کے لیے اس کو حرام کر دیا۔

بے شرمی و بے حیائی

شرم وحیا کا وجود نہ تھا' حج کعبہ میں ہزاروں لاکھوں آدمی جمع ہوتے لیکن قریش کے سوا باقی سب مادرزاد ننگے ہو کر کعبہ کا طواف کرتے' عورتیں' جب ننگی ہو کر طواف کرتیں تو لوگوں سے کہتیں کہ کوئی ہم کو اتنا کپڑا دیتا کہ سترِ عورت ہو جاتا' پھر یہ شعر پڑھتیں۔

اَلْیَوْمَ یَبْدُوْ بَعْضُہٗ اَوْ کُلُّہٗ
فَمَا بَدَا مِنْہُ فَلَآ اَحِلُّہٗ

''آج بدن کا کچھ حصہ کھلے گا یا سارا جو کھلا ہے اس سے لطف اٹھانے کی میں اجازت نہیں دیتی۔''

صحیح مسلم باب التفسیر میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے یہ روایت نقل کی ہے۔

نہاتے وقت اوٹ نہیں کرتے تھے' کھلے میدان میں بے ستر ہو کر نہاتے تھے۔ (۱)

پاخانہ پیشاب کے وقت پردہ نہیں کرتے تھے' (۲) جلسوں میں بیٹھتے تو بیویوں سے ہم صحبتی کے تمام واقعات بیان کرتے (۳) سوتیلی ماؤں پر وراثتاً قبضہ کر کے ان کو بیوی بناتے۔

عورتوں پر ظلم

عورتوں کی حالت نہایت خراب تھی' مورث کے متروکہ میں سے ان کو کچھ نہیں ملتا تھا' عرب کا قول تھا کہ میراث اس کا حق ہے جو تلوار پکڑ سکتا ہے' اسی بنا پر چھوٹے بچے بھی وراثت سے محروم رہتے تھے۔

لڑائیوں میں مفتوحہ قبیلہ کی عورتیں عین میدانِ جنگ میں فاتحین کے تصرف میں آ جاتیں اگر صلح ہو جاتی اور عورتیں واپس دے دی جاتیں تو باوجود اس کے کہ سب کے ناموس برباد ہو چکے ہوتے' بدستور گھروں میں لے لی جاتیں اور یہ کوئی عیب نہیں خیال کیا جاتا تھا۔ فاتحین اس تصرف پر فخر کرتے اور اس کو اشعار میں ظاہر کرتے' بنوضبہ نے جب بنو عامر پر فتح پائی تو ان کی عورتوں کو عین میدانِ جنگ میں رسوا کیا' فرزوق نے اس شعر میں اسی واقعہ کی

(۱) نسائی باب الاستتار عند الغسل۔
(۲) ابوداؤد کتاب الطہارۃ۔
(۳) ابوداؤد کتاب النکاح باب مایکرہ عن ذکر الرجل ما یکون من اصابتہ ہے۔

طرف اشارہ کیا ہے۔

فَظَلَّتْ وَ ظَلَّتْ يَرْكَبُوْنَ هَبِيْرَهَا
وَ لَيْسَ لَهُمْ اِلَّا عَوَالِيْهَا سِتَرَ

''تو لوگ عورتوں پر متصرف ہو گئے اور کوئی اگر پردہ بیچ میں تھا تو وہ صرف نیزے تھے۔''

قبیلۂ قیس اور بنو دارم میں جو معرکہ ہوا وہ رحرحان کے نام سے مشہور ہے اس کی نسبت جریر کہتا ہے:

نَكَحْتُ نِسَآءَ هُمْ بِغَيْرِ مَهُوْرٍ۔ ''ان کی عورتوں سے بغیر مہر کے نکاح کیا۔''

عمرو بن معدیکرب' عرب کے مشہور بہادر اور شاعر تھے ان کی بہن ریحانہ کی عصمت اسی طرح جب برباد ہوئی تو عمرو نے کہا۔

اَمَّنْ رَيْحَانَةَ الدَّاعِيَ السَّمِيْعُ
يُؤَرِّقُنِيْ وَ اَصْحَابِيْ هَجُوْعُ
اِذَا لَمْ تَسْتَطِعْ اَمْرًا فَدَعْهُ
وَ جَاوَزَهُ اِلٰى مَا تَسْتَطِيْعُ

''کیا ریحانہ کی طرف سے کوئی پکارنے والا ہے جس نے کو مجھے بے خواب رکھا ہے لیکن میرے احباب سوتے ہیں' اگر تم کسی کام کو نہ کر سکو تو اس کو چھوڑ کر وہ کرو جو کر سکتے ہو۔''

طلاق کے لیے کوئی مدت اور عدت نہ تھی' یعنی جب تک شوہر چاہے' عورت نہ شوہر کے پاس رہ سکتی تھی' نہ کسی اور سے شادی کر سکتی تھی۔

نکاح کے لیے کوئی حد نہ تھی' غیلانؓ بن سلمہ ثقفی جب اسلام لائے تو ان کی دس بیویاں تھیں' وہب اسدیؓ نے اسلام قبول کیا تو آٹھ بیویاں ان کے عقد نکاح میں تھیں۔ (۱)

دو حقیقی بہنوں سے ایک ساتھ نکاح کرتے' باپ مر جاتا تو اس کی بیویاں (بجز حقیقی ماں کے) تصرف میں آتیں اور اس کی جائز بیویاں سمجھی جاتی تھیں۔

ایام کے زمانہ میں عورتوں کو الگ کر دیتے اور ان کے ساتھ کھانا پینا چھوڑ دیتے۔

عورت جب بیوہ ہو جاتی تو گھر سے باہر ایک نہایت تنگ کوٹھری رہنے کو اور خراب سے خراب کپڑے پہننے کو دیے جاتے' خوشبو وغیرہ قسم کی کوئی چیز استعمال نہ کر سکتی' اس حالت کے ساتھ جب پورا سال گزر جاتا تو ایک بکری یا گدھا لاتے اس سے وہ اپنے جسم کو مس کرتی پھر کوٹھری سے باہر نکلتی اور اس کے ہاتھ میں مینگنی دی جاتی' وہ مینگنی کو پھینک دیتی' اس وقت سوگ سے نکل آتی اور قدیمی حالت قائم ہوتی۔ (۲) عورت کا جو مہر مقرر ہوتا وہ باپ کو ملتا'

(۱) ابوداؤد کتاب النکاح۔

(۲) ابوداؤد کتاب النکاح باب احداد المتوفی عنہا زوجہا۔

عورت کو اس سے سروکار نہ ہوتا۔

غرض مجموعی حیثیت سے عورت بدترین مخلوق اور ہر قسم کے جبر و تعدی کا تختہ گاہ مشق تھی، رفتہ رفتہ یہاں تک نوبت پہنچی کہ جس کے گھر میں لڑکی پیدا ہوتی اس کو سخت رنج ہوتا اور شرم کے مارے لوگوں سے چھپتا پھرتا۔

﴿وَ اِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ ○ يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ اَيُمْسِكُهٗ عَلٰى هُوْنٍ اَمْ يَدُسُّهٗ فِى التُّرَابِ﴾ (النحل:۵۸۔۵۹)

''اور جب ان میں سے کسی کو لڑکی کی خوش خبری سنائی جاتی ہے تو اس کا منہ کالا پڑ جاتا ہے اور غصہ کے گھونٹ پی کر رہ جاتا ہے۔ اس خوش خبری کے رنج سے لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے (اور سوچتا ہے) کہ ذلت کے ساتھ اس کو قبول کرے یا زندہ زمین میں دفن کر دے۔''

ابوحمزہ ایک رئیس تھا۔ اس کے لڑکی پیدا ہوئی تو اس نے گھر میں رہنا چھوڑ دیا اس پر اس کی بیوی یہ اشعار پڑھ پڑھ کر بچی کو لوریاں دیتی تھی۔

مَا لِاَبِیْ حَمْزَةَ لَایَاْتِیْنَا
یَبِیْتُ فِیْ بَیْتِ الَّتِیْ تَلِیْنَا

''ابوحمزہ کو کیا ہو گیا ہے کہ ہمارے پاس نہیں آتا۔ اور ہمسایہ کے گھر میں رات بسر کرتا ہے۔''

غَضْبَانَ اَلَّا نَلِدَ الْبَنِیْنَا
تَاللّٰهِ مَاذَاکَ بِاَیْدِیْنَا

''اس پر ناراض ہے کہ ہم بیٹے نہیں جنتے۔ خدا کی قسم یہ ہمارے اختیار کی بات نہیں۔''

وَ نَحْنُ کَالزَّرْعِ لَزَارِعِیْنَا
تُنْبِتُ مَا قَدْ زَرَعُوْهُ فِیْنَا

''ہم بطور کھیت کے ہیں۔ ہم میں جو بویا جائے گا وہی اگے گا۔''

رفتہ رفتہ دختر کشی کی رسم جاری ہو گئی، لڑکی پیدا ہوتی تو اس کو میدان میں لے جا کر گڑھا کھودتے اور زندہ گاڑ دیتے، اس کو عرب میں واد کہتے ہیں۔

ایک صاحب نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آ کر ظاہر کیا تھا کہ انہوں نے اپنے ہاتھوں سے آٹھ لڑکیاں زندہ دفن کیں۔ (۱) عورت کو وراثت کا کوئی حصہ نہیں ملتا تھا۔ ان کا قانون تھا کہ وراثت کا حق اسی کو ہے جو تلوار چلائے (۲) عورت بیوہ ہونے کے بعد اپنے شوہر کے وارثوں کی ملک سمجھی جاتی تھی، وہ اگر آ کر بیوہ پر چادر ڈال دیتا تو وہ اس کی جائز مدخولہ بن جاتی۔ (۳)

---

(۱) تفسیر ابن جریر و ابن کثیر سورۃ ﴿وَ اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ﴾

(۲) تفسیر ﴿يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِىْٓ اَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ﴾

(۳) تفسیر ﴿وَ لَا تَعْضُلُوْهُنَّ﴾

وحشت وجہالت

حرام وحلال کی کوئی تمیز نہ تھی، ہر چیز اور ہر جانور جو کھا سکتے تھے، کھاتے تھے، حشرات الارض عام غذا تھی، چھپکلی تک کھا جاتے تھے، خون کو جما لیتے اور قاشیں تراش تراش کر کھاتے، مردہ جانور کھانا عام بات تھی۔ (۱) چمڑے کو آگ میں بھون کر کھاتے، زندہ جانور کے گوشت کا ٹکڑا کھا لیتے تھے، گردن مروڑ کر، ڈنڈے سے مار کر درندوں کا مارا ہوا سب کھاتے۔ (۲) گدھے کا گوشت بھی کھاتے تھے۔ (۳)

عرب کا مشہور جاہلی شاعر اعشیٰ میمون جس نے آغازِ اسلام کا زمانہ پایا ہے اور اہلِ سیر نے آنحضرت ﷺ کی مدح میں اس کا ایک قصیدہ نقل کیا ہے اس میں وہ اسلام کی تائید میں اہلِ عرب کو جن باتوں کی طرف متوجہ کرتا ہے وہ یہ ہیں:

وَ اِیَّاکَ وَ الْمَیْتَاتُ لَا تَاْکُلُنَّهَا

وَ لَا تَاْخُذَنَّ سَهْمًا حَدَّید الْتَفْصَدا

''مرداروں سے پرہیز کر اور ان کو نہ کھا اور نہ تیز تیر سے جانور کو فصد دے کر مار کر کھا۔''

وَ ذَالنَّصْبِ الْمَنْصُوْبِ لَا تَنْسَکَنَّهٗ

وَ لَا تَعْبُدُ الْاَوْثَانَ وَ اللّٰهُ فَاعْبُدَا

''اور نہ کھڑے کیے ہوئے بتوں پر قربانی کر اور نہ بتوں کی پوجا کر، بلکہ اللہ کی عبادت کر۔''

وَ لَا السَّآئِلِ الْمَحْرُوْمِ لَا تَتْرَکَنَّهٗ

لِعَاقِبَةٍ وَ لَا الْاَسِیْرِ الْمُقَیَّدَا

''اور محروم بھیک مانگنے والے کو کسی اور انجام کے لیے مت چھوڑ اور نہ زنجیر میں بندھے ہوئے قیدی کو۔''

وَ لَا تَسْخَرَنَّ مِنْ بَائِسٍ ذِیْ ضَرَارَةٍ

وَ لَا تَحْسَبَنَّ الْمَرْءُ یَوْمًا مَّخَلَّدَا

''اور نہ کسی مصیبت زدہ مفلس سے ٹھٹھا کر اور نہ کبھی یہ سمجھ کہ آدمی ہمیشہ رہنے والا ہے۔''

وَ لَا تَقْرَبَنَّ جَارَةً اِنْ سَرَّهَا

عَلَیْکَ حَرَامٌ فَانْکَحَنَّ اَوْ تَاَبَّدَا

''اور نہ اپنی ہمسایہ خاتون سے بدکاری کر وہ تجھ پر حرام ہے تو یا نکاح کر اور یا کنوارہ رہ جا۔''

---

(۱) اسباب النزول سیوطی آیت ﴿حُرِّمَتْ عَلَیْکُمُ الْمَیْتَةُ﴾ ۲۔ تفسیر طبری سورۂ مائدہ بیان ماکولات۔

(۲) صحیح نسائی کتاب الصید والذبائح۔

(۳) دیوان اعشیٰ مطبوعہ ویانا ۱۹۲۷ء ص ۱۰۳۔

عربوں کی خصوصیات

خیر الامم بننے کی اہلیت

لیکن ان تمام مفاسد اور برائیوں کے باوجود اہلِ عرب میں کچھ ایسی خصوصیات بھی تھیں، جو دنیا کی تمام قوموں میں ان ہی کے ساتھ مخصوص تھیں اور ان کی ان ہی فطری اور طبعی خصوصیات و امتیازات کا اثر تھا کہ خلاقِ فطرت نے ان کو اپنی نبوت و رسالت اور تعلیم و شریعت کا اہل سمجھا اور ان کو اپنے اس خلعتِ خاص سے سرفراز کیا۔

صحتِ نسب

ان خصوصیات میں سب سے پہلی چیز ان کی صحیح النسبی ہے، شمالی عرب کے تمام قبیلے حضرت ابراہیمؑ کی اولاد اور ان کی نسل سے تھے اور یہ بات ایسی مشہور و متواتر روایتوں سے ثابت تھی کہ کسی نے تردید کی ہمت نہیں کی۔ توراۃ نے حضرت ابراہیمؑ کی جن اولادوں کے نام بتائے ہیں ان میں سے ایک ایک نام کا سراغ عرب کی پرانی آبادیوں میں ملتا ہے۔ چنانچہ ریورنڈ رفاسٹر نے ۱۸۴۴ء میں عرب کا جو تاریخی جغرافیہ لکھا ہے۔ اس میں پوری دلیل اور تفصیل اور شہادتوں کے ساتھ ان آبادیوں کا پتا لگایا ہے اور ان کی جگہیں متعین کی ہیں۔ قدیم یہودی مؤرخ یوسیفوس نے بھی یہی لکھا ہے (۱) اور آج کل ایک یہودی ڈاکٹر اسرائیل ولفنسون نے تاریخ الیہود فی بلاد العرب ایک کتاب لکھی ہے، اس میں بھی اس نے اس واقعہ کو تسلیم کیا ہے اور اس کی صحت پر دلیلیں پیش کی ہیں۔ (۲) اور بعض حال کے مناظر عیسائیوں کے علاوہ اس واقعہ کے تواتر میں کسی نے شک نہیں کیا ہے اور غالباً اسی لیے سینٹ پال نے اپنے خطوط میں عرب کی ہاجرہ کی تمثیل استعمال کی ہے (۳) اور قرآن پاک نے اہل عرب اور قریش کو خطاب کر کے صاف کہا ہے۔

﴿مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرَاهِيْمَ﴾ (الحج:۷۸)

''تمہارے باپ ابراہیم کا مذہب۔''

حضرت ابراہیمؑ تک نام بنام سلسلۂ نسبت کے پہنچنے میں پشتوں کی کمی و بیشی یا ناموں کا گھٹنا بڑھنا ممکن ہے مگر مجموعی حیثیت سے یہ دعویٰ کہ یہ حضرت ابراہیم کی اولاد تھے کسی حیثیت سے مشکوک نہیں ہے۔ خصوصاً جب اس کے

---

(۱) ترجمہ انگریزی ۱۸۲۲ء جلد اول ص ۲۵۔

(۲) تاریخ الیہود فی بلاد العرب لاسرائیل ولفنسون مطبوعہ مطبعۃ الاعتماد مصر صفحہ ۷۵، ۷۶

(۳) سینٹ پال گلتیوں کے نام باب ۴۔۵۔

ساتھ خارجی قرائن پر بھی نظر کر لی جائے کہ وہی تمدن اور طرزِ معاشرت جو تورات میں حضرت ابراہیمؑ اور ان کے اہل وعیال کا نظر آتا ہے' اسلام کے عہد تک بلکہ آج تک وہ اسی طرح عربوں میں قائم و باقی ہے' وہی خیمے ہیں' وہی صحرا ہیں' وہی مویشی ہیں' وہی بدویانہ زندگی ہے وہی رسم ورواج ہیں' جن کو اسلام نے آ کر اور زیادہ نکھار دیا۔ وہی بیت اللہ' حج وقربانی کی عبادتیں ہیں۔ اور یہ ایسا کھلا قرینہ ہے جو آج بھی یورپ کے محققوں کی نگاہوں کے سامنے ہے' مشہور جرمن محقق نولڈیک کہتا ہے:

''اور نیز عربوں میں قدیم سامی کیرکٹر اپنے خالص رنگ میں باقی سمجھا جاتا ہے اور ان کی زبان اصل زبان کے بہت قریب ہے۔''(۱)

اہلِ عرب کو اپنے حسب ونسب کی حفاظت کا جو خیال ولحاظ تھا اس کے ذکر سے عرب کی تاریخیں معمور ہیں' چنانچہ نسب پر فخر کرنا ان کی شاعری کا اور نسبی مفاخرت ان کی تقریر کا سب سے بڑا موضوع تھا' اپنے باپ دادوں کے مسلسل ناموں کو یاد رکھنا ان کا خاندانی فرض سمجھا جاتا تھا یہاں تک کہ انسانوں سے ہٹ کر جانوروں (گھوڑوں) تک کے نسب نامے وہ محفوظ رکھتے تھے' قبائل کے نسبی تعلقات کو یاد رکھنے والے خاص خاص لوگ ہر قبیلہ میں موجود رہتے تھے' اور یہی سبب ہے کہ آج بھی ان کے اکابر اور مشاہیر کا سلسلۂ نسب آپ کو معلوم ہو سکتا ہے اور اس پر بہت سی اہم کتابیں لکھی گئی ہیں اور یہ وہ خصوصیت ہے جو دنیا میں صرف اہلِ عرب کے ساتھ مخصوص ہے' یہود اور بنی اسرائیل بھی تو حضرت ابراہیمؑ کی نسل سے تھے مگر وہ بھی اس میں ان کی برابری نہیں کر سکتے کہ دوسری قوموں کے اختلاط اور میل جول اور کسی خاص وطن کے نہ ہونے کے سبب سے ان کی اکثر خاندانی خصوصیتیں مٹ گئیں۔

نسب بجائے خود کوئی فخر کی چیز نہیں۔ اسی لیے محمد رسول اللہ ﷺ نے عمل کے مقابلہ میں نسبی فخر کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اولاد کی ہدایت کے لیے جو دعا کی تھی اور ان کو جس بیت اللہ کی پاسبانی سپرد کی تھی اور ان میں ایک نبی کی بعثت کی جو دعا مانگی تھی اور خدا نے ان کی نسل کو دینی اور دنیاوی برکات کے عطا کرنے کا ان سے جو عہد کیا تھا ان سب کے پورا ہونے اور ان کے حقیقی مصداق بننے کے لیے نسلِ ابراہیم کی صحیح النسبی کی ضرورت تھی اور اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو اس شرف کے ساتھ مخصوص کیا۔

کسی پہلے مذہب میں داخل نہ تھے

اسی طرح ان کو ان تمام اثرات سے محفوظ رکھا جو قوموں کے عادات اور استعدادات کو بدل دیتے ہیں مثلاً وہ باوجود اس کے کہ وہ چہار طرف سے مختلف بڑے بڑے مذہبوں سے ٹکرا رہے تھے مگر کوئی مذہب ان کو فتح نہیں کر

(۱) انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا طبع یازدہم مضمون ''السنہ سامیہ''۔ میں نے ارض القرآن جلد اول ص ۱۰۷ سے ص ۱۱۶ تک اس پر مدلل بحث کی ہے اور علمائے یورپ کے حوالے یکجا کر دیے ہیں۔

سکا تھا۔ مجوسیت خلیج فارس سے لے کر یمن تک حکمران تھی' یہودیت یمن اور حجاز کی تجارت گاہوں پر قابض تھی' عیسائیت اپنی فوج ولشکر اور راہبوں اور قسیسوں کے دَل بادَل کے ساتھ یمن سے لے کر شام کے حدود تک پھیلی تھی اور بعض افراد اور بعض قبیلوں کو وہ برائے نام عیسائی بنا بھی چکی تھی' مگر پورا عرب بدستور اپنی خالص حالت پر باقی تھا' عرب میں جو نیک طبع اور دیندار لوگ ہوتے تھے وہ مجوسی یا یہودی یا عیسائی ہونے کے بجائے اپنے کو دینِ ابراہیمی کا پیرو کہتے تھے اور اسی لیے اپنے مذہب کا نام دینِ حنیفی رکھتے تھے' یہ سب اسی لیے ہو رہا تھا تا کہ خاتم الانبیاء ﷺ کے ذریعہ دینِ ابراہیمی کی دعوت وتجدید کا راستہ کھلا رہے۔

محکوم نہ تھے

عرب کا ملک تخلیقِ عالم کے آغاز سے اسلام تک ہر غیر قوم کی حکومت سے ہمیشہ آزاد رہا۔ شمالی عرب نے کبھی کسی قوم کی غلامی نہیں کی' بابل کے بخت نصر نے بنی اسرائیل کو زیروزبر کر دیا مگر عرب کی طرف آنکھ نہ اٹھا سکا۔ یونانیوں اور رومیوں نے مصر سے لے کر عراق کی سرحد تک صدیوں تک حکومت کی مگر خاص عرب کے اندر قدم نہ رکھ سکے' سکندر نے اور اس کے بعد رومی سپہ سالاروں نے جب ادھر نظر اٹھائی تو فطرت نے ہمیشہ ان کو شکست دی۔ عرب کا ملک دنیا کی دو عظیم الشان حکومتوں یعنی ایران وروم کی سرحد پر واقع تھا مگر وہ دونوں اپنی حرص وآز کا ہاتھ اس کی طرف بڑھانے سے قاصر رہیں' گستاخ عیسائی حبشیوں نے یمن فتح کرنے کے بعد ہاتھیوں کے ریلے کے ساتھ مکہ معظمہ پر چڑھائی کی۔ مگر قدرتِ الٰہی نے ان کو تباہ کر دیا۔ یہ تمام اہتمام وانتظام اس لیے تھا کہ کوئی دوسری جابرانہ قوت ان کے دل ودماغ کی استعداد کو برباد نہ کر سکے' ان کی آزادی کی روح برقرار اور ان کی فاتحانہ طاقت بدستور قائم رہے تا کہ یہ مخفی خزانہ خدا کے آخری مذہب کی حکومت کے قیام وبقا میں کارآمد ہو۔

کتابی فاسد تعلیم سے ناآشنا تھے

جس طرح وہ خارجی اثرات سے پاک تھے اسی طرح صحیفۂ فطرت کے سوا ہر قسم کے کتابی علم سے وہ ناآشنا تھے' یعنی اس ذریعہ سے بھی وہ دوسری قوموں کے دماغی اثرات سے محفوظ تھے اور علم کی جاہلانہ اور کج بحثانہ ذہنیت سے پاک تھے' وہ امی تھے تا کہ ایک امی معلم کی ربانی تعلیم کے قبول کرنے کے لیے ہر طرح تیار رہیں۔

وہ زمین کے وسط میں آباد تھے

عرب کا ملک پرانی دنیا کے وسط میں واقع ہے' ایک طرف ایشیا' دوسری طرف افریقہ اور تیسری طرف یورپ کا راستہ اس سے قریب ہے' پھر بحری جائے وقوع نے اس کو جزائر اور دور دراز ملکوں سے قریب کر دیا تھا۔ اس لیے عرب سے نکل کر وہ ایک طرف عراق ہو کر ایران' ترکستان' خراسان' سیستان' کابل' ہندوستان تک پہنچ گئے اور دوسری طرف شام ہو کر مصر' افریقہ' الجزائر' تیونس' مراکش اور اسپین تک جا پہنچے اور بحری راستوں سے ایک طرف تمام

جزائر افریقہ' حبشہ' زنجبار' پھر ادھر جزائر ہند' جاوا' سماٹرا اور چین تک ان کا گزر ہوا' اور دوسری طرف سائپرس' کریٹ اور سسلی تک ان کا پرچم لہرایا' یہ تمام مواقع اس لیے میسر آئے کہ عرب کا جائے وقوع اس دعوت کے لیے مناسب مرکز تھا' فرض کرو کہ اگر اس دعوت کی جگہ ہندوستان یا چین ہوتا تو اسپین اور سسلی تک پہنچنے کے لیے کتنا عرصہ درکار ہوتا' پھر یہ کہ اس وقت تک دنیا جن دو مشرقی اور مغربی طاقتوں کے زیرِ فرمان تھی' ان دونوں کے زور کو برابر طور سے اور ایک ساتھ توڑنے کے لیے عرب کے سوا دنیا میں کوئی جگہ موزوں نہ تھی' جہاں سے دونوں پر ایک ساتھ حملہ کرنا اور دنیا کو ان کے خون آشام پنجوں سے نجات دینا بآسانی ممکن ہوا۔

بعض اخلاقی خوبیاں

ان کے علاوہ اہلِ عرب کو خیر الامم بننے اور عالم کے لیے شاید نمونہ اور مصلح ہونے کے لیے کچھ اور اخلاقی خوبیوں کی بھی ضرورت تھی اور وہ ان میں بدرجۂ اتم موجود تھیں' ان خوبیوں کے بغیر وہ اسلام کی عظیم الشان تحریک کے علم بردار نہیں ہو سکتے تھے اور نہ وہ دنیا کی رہنمائی کا فرض انجام دے سکتے تھے۔

شجاع و بہادر تھے

وہ حد سے زیادہ شجاع و بہادر تھے' وہ خطرات سے بے خوف تھے' وہ لڑائی کو کھیل سے زیادہ وقعت نہیں دیتے تھے' یہی سبب ہے کہ وہ تمام دنیا کی قوموں اور سلطنتوں کے مقابلہ میں تنہا کھڑے ہوئے اور کسریٰ و قیصر کو انہوں نے ایک ساتھ چیلنج دیا اور اس تحریک کے پھیلانے میں تھوڑی تھوڑی غیر مسلح جمعیتوں سے ہزاروں اور لاکھوں کی فوج کا بے خطر مقابلہ کیا اور کامیاب ہوئے۔

پرجوش تھے

ساتھ ہی وہ پرجوش بھی تھے' اس لیے جس دعوت اور تحریک کو لے کر اٹھے اس کو پوری کوشش' عزم اور جوش کے ساتھ دنیا کے گوشہ گوشہ میں پھیلایا' ان کے عزم اور جوش کو نہ پہاڑ روک سکا اور نہ سمندر اس سے ٹکرا سکا' ہر جگہ وہ توحید کا علم لیے بحر و بر' دشت و جبل میں پھیل گئے اور اپنے عزمِ راسخ سے ارکانِ عالم کو متزلزل کر دیا۔

حق گو تھے

ان کی جسمانی شجاعت و بہادری کیسا تھ ان کا دل شجاع اور بہادر تھا' جو بات ان کے دل میں ہوتی تھی وہی ان کی زبان پر ہوتی تھی' اہلِ مدینہ میں جو نفاق کا عنصر پیدا ہو گیا تھا وہ یہود کے اثر کا نتیجہ تھا' ورنہ قریش اور عام اہلِ عرب میں یہ بات نہ تھی یا تو وہ کھلے دشمن تھے یا کھلے دوست۔ اپنے نزدیک وہ جس کو حق سمجھتے تھے' اس کے ظاہر کرنے میں ان کو کسی کا باک نہیں ہوتا تھا۔

عقل ودانش والے تھے

باوجود اس کے کہ وعموماً ظاہری نوشت وخواند سے عاری تھے مگر فطرت کے عطیہ' عقل ودانش سے وہ کافی طور پر بہرہ مند تھے' حضرت ابوبکر صدیقؓ' عمر فاروقؓ' عثمان غنیؓ' علی مرتضیٰؓ' طلحہؓ' زبیرؓ' خالدؓ' ابوعبیدہؓ بن الجراح وغیرہ سینکڑوں' ہزاروں صحابہ نے علم ومذہب' اخلاق اور سیاست میں جو نکتہ سنجیاں کیں وہ خود ان کی عقل ودانش کی گواہ ہیں۔ روم وایران کی متمدن قوموں سے جس طرح انہوں نے معاملہ' مراسلہ اور نامہ وپیام کیا اور علم وسیاست کے الجھے سے الجھے ہوئے مسئلہ کو جس طرح سلجھایا وہ خود اسی نتیجہ کو ظاہر کرتا ہے۔ ان کے شعراء کے کلام' ان کے مقرروں کی تقریریں' ان کے فصحا کے مقولے سنیے تو ان کی فطری صلاحیت کا اندازہ ہوگا کہ ظاہری تعلیم کے بغیر کیونکر یہ لعل وگوہر وہ اپنے منہ سے اگل سکے۔

ذہن اور حافظہ کے تیز تھے

فطرت کا قاعدہ ہے کہ اگر اس کے بعض قویٰ بیکار ہیں تو ان کی قوت دوسرے زیرِ عمل قویٰ کو وہ منتقل کر دیتی ہے اور جس عضو سے زیادہ کام لیا جاتا ہے... اس کی قوت کو وہ ترقی دیتی رہتی ہے' اسی اصول کے موافق ظاہری تعلیم اور نوشت وخواند سے محروم ہونے کے سبب سے جہاں عرب کے بعض قویٰ بیکار ہو رہے تھے' ان کو اپنی یادداشت کے لیے تحریری اوراق اور سفینوں پر بھروسہ کرنے کے بجائے خود اپنے دل ودماغ پر بھروسہ کرنے کی عادت تھی۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ان کا ذہن اور حافظہ بہت قوی تھا' یہی سبب ہے کہ ان کے شعرا اپنے بڑے بڑے قصیدوں کو زبانی پڑھتے تھے اور جو کچھ کہتے تھے اس کو برزبان یاد رکھتے تھے اور ان کی اسی قوت کا یہ فیض تھا کہ ان میں کا بڑا طبقہ تحریر کے بغیر قرآن پاک کی بڑی بڑی سورتوں کو یاد رکھتا تھا اور بہتیرے ایسے تھے جو پورے قرآن کو یاد رکھتے تھے اور یہ ان ہی کی تقلید ہے کہ دنیا کے ہر حصہ میں ایسے ہزاروں مسلمان پائے جاتے ہیں جو پورے قرآن کے حافظ ہوتے ہیں اور اہلِ عرب کی اسی خصوصیت کا مظہر یہ بھی تھا کہ احادیث وسیر اور واقعات کا بڑا سرمایہ تحریر کے علاوہ زبانی ایک دوسرے کو پوری ذمہ داری اور حفاظت کے ساتھ منتقل ہوتا رہا اور سینکڑوں اصحاب ایسے تھے جو ہزاروں لاکھوں احادیث کو ایک ایک حرف اور ایک ایک لفظ کی پابندی کے ساتھ یاد رکھتے تھے' اہل عرب کی ان خصوصیات نے اسلام کی حفاظت اور اشاعت کا نہایت اہم فرض انجام دیا۔

فیاض تھے

اہلِ عرب کی ایک خاص امتیازی صفت ان کی فیاضی تھی' مہمان نوازی ان کی سب سے بڑی خصوصیت تھی' ہمسایوں اور پناہ گزینوں کی امداد میں وہ اپنی جان تک لڑا دیتے تھے' اپنی شہرت اور ناموری کے لیے اونٹوں کو ذبح کر کے کھلا دینا' جوئے میں جیتی ہوئی دولت کو احباب کے جلسۂ دعوت میں اڑا دینا اور اس پر فخر کرنا ان کی قومی صفت

تھی۔اور یہی اوصاف ان کی شاعرانہ طبع میں سب سے زیادہ نمایاں نظر آتے ہیں۔اسلام نے ان کی اسی صفت کو تھوڑی سی اصلاح کے بعد خدا کی راہ میں خیرات وصدقات زکوٰۃ سے بدل دیا اور اسلام کی مشکل کشائی میں اس نے سب سے زیادہ مدد دی۔

مساوات پسند تھے

چونکہ وہ کبھی کسی دوسری قوم کے محکوم نہیں ہوئے تھے اور نہ کسی ایک مطلق العنان بادشاہ کے تابع فرمان بنے تھے اس لیے ان کی خودداری کا جذبہ بیدار تھا' وہ غلام بننا نہیں جانتے تھے وہ اپنے کو ذلیل کرنا پسند نہیں کرتے تھے اور وہ بڑے سے بڑے شخص کے سامنے برابری کے ساتھ بے باکانہ بیٹھ کر باتیں کرتے تھے۔

عرب میں بیسیوں لڑائیاں صرف اسی خودداری کی حفاظت میں پیش آئی تھیں جس کا ایک منظر سبعہ معلقہ کے آخری قصیدہ میں نظر آتا ہے' اہل عرب کے اس جذبہ نے حق گوئی' مساوات اور جمہوریت پسندی وغیرہ اسلامی تعلیمات پھیلانے میں بڑی مدد دی۔

عملی تھے

اہلِ عرب کے فطری اخلاق وکردار کی آخری دفعہ یہ ہے کہ وہ طبعاً عملی اور عملیت پسند تھے اور اہلِ ایران اور اہلِ ہند کی طرح محض تخیل پسند' خیال آرا اور نظریہ باز نہ تھے۔وہ مجسم عمل تھے اور عملیت کو پسند کرتے تھے' وہ چون و چرا اور کیسے کیونکر کی فلسفیانہ الجھنوں سے پاک تھے' وہ دنیا کے کاروباری آدمیوں اور سپاہیوں کی طرح چند اچھی باتوں کو قبول کر کے ان پر فوراً عامل بن جاتے تھے۔یہی سبب ہے کہ عجمیانہ نکتہ آفرینی اور بال کی کھال نکال کر اس کی الجھنوں کے سلجھانے میں وہ کبھی گرفتار نہیں ہوئے' وہ ہمہ تن عمل اور صرف عمل تھے' اسی بنا پر شارع علیہ السلام نے ان کے سامنے عملی مذہب کو پیش کر کے ان کو سرتاپا عملی بنا دیا اور جو کچھ وہ تعلیم لائے تھے اس کا مجسم پیکر بن کر چند سال میں دنیا کے سامنے پیش کر دیا' دور دور سے بدوی آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آتے تھے اور شک وحجت اور مناظرہ وقیل وقال کے بغیر فرائض واخلاق کی عملی تعلیم حاصل کر کے اپنے قبیلہ میں واپس چلے جاتے تھے اور بالآخر اپنی عملی دعوت سے اپنے پورے قبیلہ کو مسلمان بنا لیتے تھے وہ اگر مگر اور ممکن وناممکن کی بحث میں نہیں پڑتے تھے' وہ تعلیم کو دیکھتے تھے اور سنتے تھے اور اسی غیر متزلزل یقین اور ایمان کے بھروسہ پر وہ مشکل سے مشکل اور خطرناک کام کر گزرتے تھے' اہلِ عرب کی اسی خصوصیت نے اسلام کی سادگی کو برقرار اور عجمی فلسفیت ونظریت سے اس کو پاک ومبرا رکھا اور ساتھ ہی چند سال کے اندر اندر مغرب ومشرق' شمال وجنوب میں اسلام کا پھریرا آسمان پر اڑنے گا۔

ان اوصاف کی مصلحت

اہل عرب کے ان تمام فطری وطبعی اوصاف واخلاق کو دیکھ کر یہ یقین کرنا پڑتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے

آخری دین کی اشاعت اور حفاظت کے لیے جس قوم کا انتخاب کیا تھا وہ ازل سے اس کے لیے منتخب ہو چکی تھی، باوجود ان کی ہر قسم کی گمراہیوں کے یہ چند اچھے اوصاف اس لیے ان میں ودیعت کیے گئے تھے تاکہ جب خدا کی بادشاہی کا دن آئے تو ان کی فطری استعداد کا سرمایہ اس کی امداد و اعانت کے لیے خزانۂ غیب کا کام دے، یہی وہ سرمایہ تھا جو اس وقت نہ ہند و عجم میں تھا، نہ روم و فرنگ میں، نہ ترک میں تھا، نہ زنگ میں تھا، وہ عرب اور صرف عرب میں تھا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی آخری نبوت کے لیے اسی قوم کو برگزیدہ کر کے یہ امانت اس کے سپرد کی۔

آنحضرت ﷺ نے ایک موقع پر ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ نے ابراہیمؑ کی اولاد میں اسمعیلؑ کو پسند کیا اور اسمٰعیلؑ کی اولاد میں بنی کنانہ کو اور بنی کنانہ میں سے قریش کو اور ان میں سے بنو ہاشم کو اور بنو ہاشم میں سے مجھ کو۔ ایک اور روایت میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ میں عبدالمطلب کے بیٹے عبداللہ کا بیٹا ہوں، اللہ نے تمام لوگوں کو پیدا کیا تو مجھے اس نے ان سب میں سب سے بہتر نسل میں رکھا۔ ان کو دو حصوں (عرب و عجم) میں تقسیم کیا تو مجھے اس حصہ میں (یعنی عرب میں) بنایا جو سب سے بہتر تھا۔ اس حصے کو بھی قبیلوں میں تقسیم کیا تو مجھے اس قبیلہ میں پیدا کیا جو سب سے بہتر تھا۔ اس قبیلہ کو گھرانوں میں تقسیم کیا تو مجھے سب سے بہتر گھرانے میں پیدا کیا، پھر اس گھرانے کو افراد پر تقسیم کیا تو مجھے اس گھرانے کا سب سے بہتر فرد بنایا۔ (۱)

❀ ❀ ❀

(۱) یہ دونوں حدیثیں ترمذی باب المناقب میں ہیں ۱۲۔

صبحِ سعادت

دنیا اور عرب کی سرزمین اسی ظلمت میں تھی کہ صبحِ سعادت نمودار ہوئی اور خورشیدِ نبوت کے طلوع کا غلغلہ برپا ہوا' ظلمتِ شب کافور ہوئی اور تھوڑی دیر میں ذرہ ذرہ سورج کی کرنوں سے پُرنور ہوگیا' یہ ظاہر ہے کہ یہ سورج گو دنیا کو روشن کرنے نکلا تھا' لیکن وہ نکلا عرب ہی کے افق سے تھا' اس لیے ضروری تھا کہ اس کے نور سے پہلے اسی ملک کی سرزمین روشن ہو۔

ایک قوم کا انتخاب

سرورِ کائنات ﷺ کو گو خدا نے تمام عالم کی اصلاح کے لیے بھیجا تھا اور اس بنا پر ایک ایسی شریعتِ کامل عطا کی جو نہ صرف عرب بلکہ تمام عالم کے لیے ابد تک کافی ہے' لیکن کوئی شریعت' کوئی قانون' کوئی دستورالعمل اس وقت تک مفید اور کارآمد نہیں ہوسکتا جب تک اس کے ساتھ ایسا گروہ موجود نہ ہو جو اس شریعت کی عملی تصویر ہو اور جس کی ہر بات' ہر ادا' ہر جنبش عملی خطیب بن کر گردوپیش کو اپنا ہم زبان اور اپنا ہم عمل بنالے۔

اس بنا پر خاتمِ انبیا ﷺ کا سب سے اہم مقصد ایک خاص قوم کو تربیت دے کر اصلاحِ عالم کے لیے تیار کرنا تھا۔ (۱) دنیا کی اور قومیں باری باری اس منصب پر ممتاز ہو چکی تھیں' ایک زمانہ تھا جب بنی اسرائیل جیسی قوم جو آج تمام دنیا میں خوار و ذلیل ہے ﴿اَنِّی فَضَّلْتُکُمْ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ﴾ (ہم نے تم کو دنیا کی قوموں پر فضیلت دی) کا تاج پہن چکی تھی۔ لیکن اوپر تفصیلاً گزر چکا کہ اب تمام قوموں میں صلاحیت کا مادہ مفقود ہو چکا تھا' ایران تین ہزار برس تک ناز و نعمت میں پل کر ترقی کی روح فنا کر چکا تھا' رومیوں کے تمام قوائے عمل بوسیدہ ہو چکے تھے' ہندوؤں کا دل و دماغ وہم پرست ہو کر رہ گیا تھا۔ صرف ایک عرب تھا جو بن جتی زمین کی طرح مادہ ہائے نشو و نما

---

(۱) شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں کہ جو پیغمبر تمام عالم کے لیے مبعوث ہوتا ہے وہ علاوہ ان اصول کے جو اور مذاہب میں ہیں چند اور نئے اصول اختیار کرتا ہے۔ جن میں سے ایک یہ ہے:

یدعوا قوما الی السنة الراشدة و یزکیهم و یصلح شانهم ثم یتخذهم بمنزلة جوارحه فیجاهدبهم اهل الارض و یفرقهم فی البلا دو هو قوله تعالیٰ کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ. (حجۃ اللہ البالغہ صفحہ ۱۲۳۔ مطبوعات الحصنہ)

''وہ ایک قوم کو سنتِ راشدہ کی طرف دعوت دیتا ہے ان کو پاک اور درست کرتا ہے پھر ان کو اپنا دست و بازو بناتا ہے اور ان کو دنیا میں پھیلا دیتا ہے اور ان کے ذریعہ سے مجاہدہ کرتا ہے۔ جیسا کہ خدا نے کہا: تم بہترین امت ہو جو دنیا کے لیے پیدا کیے گئے ہو۔''

سے لبریز تھا اور ایک لوحِ سادہ کی طرح ہر قسم کی نقش آرائیوں کے قابل تھا' مشیتِ ایزدی نے اسی کو تا کا اور چند روز میں وہی عرب جو سرتاپا جہل' سرتاپا وحشت اور سرتاپا درندہ بن چکا تھا ﴿كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ (آل عمران:۱۱۰) کا مظہر بن گیا۔

ان لوگوں کا حلیہ و جمال اور خط و خال یہ تھا۔

﴿اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَ نَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ [1] (الحج:۴۱)

''ایسے لوگ کہ ہم اگر ان کو دنیا میں اقتدار دیں تو وہ نماز قائم کریں' زکوٰۃ دیں اچھی باتوں کا حکم دیں اور بری باتوں سے روکیں۔''

اصلاح و ہدایت کی مشکلات

ہر قوم کی اصلاح و ہدایت میں اول سخت اور متعدد مشکلات پیش آتی ہیں لیکن ان کی نوعیت ایک دو سے زیادہ نہیں ہوتی' لیکن عرب کی اصلاح میں ہر نوع' ہر حیثیت' ہر جہت کی گوناگوں اور لاعلاج مشکلات تھیں اور ایسی تھیں جن میں سے ایک کا حل کرنا بھی قدرتِ انسانی سے بالاتر تھا۔ بنواسرائیل ایک مدت سے مصر میں قبطیوں کی غلامی کر رہے تھے اور قبطیوں کے جور و ظلم کا طوفان ان کے سر سے گزر چکا تھا' حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان پر یہ احسانِ عظیم کیا کہ فرعون کے پنجۂ ستم سے ان کو چھڑا کر مصر سے نکال لائے' لیکن غلامی میں رہتے رہتے ان کی طبیعت میں اس قدر ذلت پسندی آ گئی تھی کہ جب ان سے کہا گیا کہ آگے کنعان کی زمین ہے۔ اس کو لڑ کر لے لو اور اسی پر تختِ سلطنت جماؤ تو انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے صاف کہہ دیا کہ تم اور تمہارا خدا دونوں جا کر لڑو' ہم تو یہاں سے آگے قدم نہیں بڑھاتے یہ ایک امتدادِ معاشرت کا اثر تھا جو مرتے مرتے ان لوگوں کی طبیعتوں سے نہیں گیا اور جب تک یہ پوری نسل اپنی موت مر کر منقرض نہیں ہو گئی بنواسرائیل کو کنعان کی زمین میں قدم رکھنا نصیب نہ ہوا۔

یہ صرف ایک مشکل کی مثال تھی۔ اب عرب کی مشکلات کا اندازہ کرو۔

جہالت

عرب کی قوم امیِ محض تھی' الوہیت' رسالت' کتاب' معاد' عبادت' ان میں سے کوئی چیز ایسی نہ تھی جس سے ان کے کان آشنا ہوں۔ اسلام کا ہر لفظ جو ان کے کان میں پڑتا تھا' ان کو ایک تعجب انگیز اور بالکل بیگانہ آواز معلوم ہوتی تھی' قرآن مجید نے ان کی اس جاہلانہ حیرت و استعجاب کو متعدد آیتوں میں ذکر کیا ہے:

﴿يٰسٓ ○ وَ الْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ ○ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ○ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ○ تَنْزِيْلَ الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ ○ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اُنْذِرَ اٰبَآؤُهُمْ فَهُمْ غٰفِلُوْنَ ○﴾ (یٰسٓ :۱-۶)

---

(۱) تم بہترین قوم ہو جو انسانوں کے لیے (پردۂ عدم سے) باہر لائی گئی ہو جو نیکیوں کا حکم دیتی اور برائیوں سے روکتی ہو۔

''قرآن حکیم کی قسم، تو بے شبہ پیغمبروں میں سے ہے، راہِ راست پر ہے یہ قرآن رحمت والے غالب خدا کے پاس سے اترا ہے تا کہ تو اس قوم کو آگاہ کرے جن کے اسلاف کو آگاہ نہیں کیا گیا اور اس لیے وہ غفلت میں پڑے ہیں۔''

یہ نبوت کے شرف سے محروم قوم ایک آسمانی مذہب کے تمام خصائص سے محض بیگانہ تھی:

﴿وَ عَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَ هُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ وَ قَالَ الْكَافِرُوْنَ هٰذَا سٰحِرٌ كَذَّابٌ ○ اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ عُجَابٌ ○ وَانْطَلَقَ الْمَلَاُ مِنْهُمْ اَنِ امْشُوْا وَ اصْبِرُوْا عَلٰٓى اٰلِهَتِكُمْ اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ یُّرَادُ ○ مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِی الْمِلَّةِ الْاٰخِرَةِ اِنْ هٰذَآ اِلَّا اخْتِلَاقٌ ○﴾ (صٓ :۴،۷)

''اور انہوں نے تعجب کیا کہ ان میں ایک پیغمبر ہو کر ان کے پاس آیا کافروں نے کہا یہ دروغ گو جادوگر ہے، اس نے اتنے خداؤں کو ایک خدا بنا دیا، یہ عجیب بات ہے، ان کے پنچ اٹھ کھڑے ہوئے کہ چلو اور اپنے معبودوں پر جمے رہو۔ اس میں اس (پیغمبر) کی کوئی غرض ہے، ہم نے تو سابق مذہب میں یہ نہیں سنا، یہ سب گھڑی ہوئی بات ہے۔''

﴿بَلْ عَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَ هُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ فَقَالَ الْكَافِرُوْنَ هٰذَا شَیْءٌ عَجِیْبٌ﴾ (قٓ :۲)

''بلکہ ان کو تعجب ہوا کہ ان ہی میں سے ایک ان کے پاس پیغمبر بن کر آیا، کافروں نے کہا یہ تو بڑے تعجب کی بات ہے۔''

صفاتِ الٰہی، آثارِ نبوت، احوالِ معاد، ان میں سے ہر بات کو سن کر وہ اسی طرح سرتاپا حیرت بن جاتے تھے اور نبوت کے متعلق یہ سمجھتے تھے کہ انسان تو اس کے سزاوار نہیں۔ اس منصب پر تو فرشتوں کو ممتاز ہونا چاہیے تھا:

﴿وَ قَالَ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَآءَ نَا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَیْنَا الْمَلٰٓئِكَةُ﴾ (الفرقان:۲۱)

''اور جو ایک دن ہمارے سامنے آنے کے منکر ہیں وہ کہتے ہیں کہ فرشتے پیغمبر بنا کر ہم پر کیوں نہ اتارے گئے۔''

﴿اِذْ جَآءَ تْهُمُ الرُّسُلُ مِنْۢ بَیْنِ اَیْدِیْهِمْ وَ مِنْ خَلْفِهِمْ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ قَالُوْا لَوْ شَآءَ رَبُّنَا لَاَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً فَاِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ﴾ (حم السجدۃ:۱۴)

''پیغمبر جب ان کے پاس سامنے سے اور پیچھے سے آتے ہیں کہ ایک خدا کے سوا کسی اور کو نہ پوجو تو وہ کہتے ہیں کہ خدا اگر کسی کو پیغمبر بنا کر بھیجنا چاہتا تو وہ فرشتوں کو اتارتا۔ ہم تو تمہاری باتوں کا انکار ہی کریں گے۔''

﴿وَ مَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ یُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَ هُمُ الْهُدٰٓى اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا ○ قُلْ لَّوْ كَانَ فِی الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ یَّمْشُوْنَ فِی الْاَرْضِ مُطْمَئِنِّیْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَیْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ

مَلَکًا رَّسُوْلًا ○﴾ (بنی اسرائیل:۹۴،۹۵)

''ہدایت آنے کے بعد صرف اس شبہ نے لوگوں کو ایمان لانے سے باز رکھا ہے کہ کیا خدا نے آدمی کو پیغمبر بنا کر بھیجا ہے۔ جواب میں کہہ دو کہ اگر زمین میں فرشتے چلتے پھرتے بستے ہوتے تو البتہ ہم آسمان سے کسی فرشتہ کو پیغمبر بنا کر بھیجتے۔''

نبی کا تخیل اگر ان کے ذہن میں کبھی آتا تھا تو بشریت سے ماوراصورت میں یعنی یہ کہ وہ انسانی ضروریات سے منزہ ہو اس کے پیچھے خدا اور فرشتوں کا پرا ہو آسمان اور زمین کے خزانے اس کے دستِ قدرت میں ہوں۔

﴿وَ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَکَ حَتّٰی تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ یَنْۢبُوْعًا ○ اَوْ تَکُوْنَ لَکَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِیْلٍ وَّ عِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِیْرًا ○ اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ کَمَا زَعَمْتَ عَلَیْنَا کِسَفًا اَوْ تَاْتِیَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِکَةِ قَبِیْلًا ○ اَوْ یَکُوْنَ لَکَ بَیْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰی فِی السَّمَآءِ﴾ (بنی اسرائیل:۹۰،۹۳)

''انہوں نے کہا اے پیغمبر ہم تجھ پر اس وقت تک ایمان نہ لائیں گے جب تک زمین سے ہمارے لیے تو چشمہ نہ بہا دے یا تیری ملکیت میں کھجوروں اور انگوروں کا کوئی باغ نہ ہو جس میں نہریں جاری کر دی ہوں یا جیسا کہ تو نے کہا ہے ہم پر بادل کا کوئی ٹکڑا نہ گرا دے یا خدا اور فرشتوں کا پرا بنا کر نہ لے آئے یا تیرے پاس کوئی سونے کا گھر نہ ہو یا تو آسمان پر نہ چڑھ جائے۔''

﴿وَ قَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ یَاْکُلُ الطَّعَامَ وَ یَمْشِیْ فِی الْاَسْوَاقِ لَوْ لَآ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مَلَکٌ فَیَکُوْنَ مَعَهٗ نَذِیْرًا اَوْ یُلْقٰٓی اِلَیْهِ کَنْزٌ اَوْ تَکُوْنُ لَهٗ جَنَّةٌ یَّاْکُلُ مِنْهَا﴾ (الفرقان:۷،۸)

''انہوں نے کہا یہ عجیب پیغمبر ہے یہ تو کھاتا پیتا ہے، بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔ اس پر کوئی فرشتہ کیوں نہ اترا جو اس کے ساتھ مل کر لوگوں کو ڈراتا یا اس کے پاس کوئی خزانہ کیوں نہیں ڈال دیا گیا یا اس کے لیے خاص کوئی باغ کیوں نہ ہوا جس سے یہ کھاتا۔''

پیغمبر کے لیے ان کے خیال میں یہ بھی ضروری بات تھی کہ وہ بڑا دولت مند ہو۔ اس کے قبضہ میں کوئی بڑی جائیداد ہو، میووں کے ہرے بھرے باغ اور سونے چاندی کے خزانے اس کے پاس ہوں، چنانچہ گزشتہ آیت میں کفار کے اس خیال کی طرف بھی اشارہ ہے اسی لیے مکہ اور طائف کے جو رؤسا دولت مند تھے وہ اس منصب کے سب سے زیادہ مستحق سمجھے جاتے تھے۔

﴿وَ قَالُوْا لَوْ لَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰی رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْیَتَیْنِ عَظِیْمٍ﴾ (الزخرف:۳۱)

''وہ کہتے ہیں کہ یہ قرآن مکہ یا طائف کے کسی بڑے آدمی پر کیوں نہیں اترا۔''

کسی کتاب کے نازل ہونے کے معنی ان کے خیال میں یہ تھے کہ آسمان سے کاغذوں میں ایک لکھی لکھائی، ترشی ترشائی جلد بندھی ہوئی ایک کتاب سب کے سامنے مجمع میں اتر آئے۔

﴿وَ قَالَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَوْ لَا نُزِّلَ عَلَیْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً﴾ (الفرقان:۳۲)

''کافروں نے کہا اس پر قرآن یک بارگی کیوں نہیں اترا۔''

﴿وَ لَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِیِّکَ حَتّٰی تُنَزِّلَ عَلَیْنَا کِتَابًا نَّقْرَؤُهٗ﴾ (بنی اسرائیل:۹۴)

''اور (کافروں نے کہا) ہم تیرے آسمان پر چڑھ جانے کے بھی اس وقت تک قائل نہیں ہوں گے جب تک ہم پر کوئی ایسی کتاب نہ اتار لائے جس کو ہم پڑھنے لگیں۔''

(۲)وَ لَوْ نَزَّلْنَا عَلَیْکَ کِتَابًا فِیْ قِرْطَاسٍ فَلَمَسُوْهُ بِاَیْدِیْهِمْ لَقَالَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ﴾ (الانعام:۷)

''اور اگر کاغذوں میں لکھی ہوئی کوئی کتاب ہم آسمان سے تم پر اتارتے جس کو وہ اپنے ہاتھوں سے چھو بھی سکتے تو کافر یہی کہتے کہ یہ تو کھلا ہوا جادو ہے۔''

غرض ایک آسمانی مذہب کی کیفیت سے بالکل بے خبر تھے' الوہیت اور صفاتِ الٰہی کے اسرار' نبوت کے خصائص' نزولِ کتاب کی حقیقت ہر چیز ان کے لیے حیرت واستعجاب کا سرمایہ تھی۔

﴿اَفَلَمْ یَدَّبَّرُوا الْقَوْلَ اَمْ جَآءَ هُمْ مَّالَمْ یَاْتِ اٰبَآءَ هُمُ الْاَوَّلِیْنَ ○ اَمْ لَمْ یَعْرِفُوْا رَسُوْلَهُمْ فَهُمْ لَهٗ مُنْکِرُوْنَ○﴾ (المؤمنون:۶۸'۶۹)

''کیا انہوں نے اس بات پر غور نہیں کیا یا ان کے پاس وہ تعلیم آئی ہے جو ان کے اسلاف کے پاس نہیں آئی یا انہوں نے اپنے رسول کو نہیں پہچانا تو یہ اس کے منکر ہیں۔''

اس بنا پر عرب کے مشرکین اور کفار کو ایک صدائے نبوت سے گوش آشنا ہونے کی حاجت تھی اور اس میں کئی برس صرف ہو گئے لیکن وہ لوگ جو اس صدا سے نامانوس نہ تھے' ان تک آواز پہنچنے کی دیر تھی کہ وہ سرتاپا لبیک تھے' حصہ اول میں گزر چکا ہے کہ سابقینِ اسلام عموماً وہی لوگ تھے جو اہلِ کتاب یا حنفا کے آغوش پروردہ تھے' اشخاص کے علاوہ قبائل کا بھی یہی حال تھا مشرکین کلامِ الٰہی کا جواب خندۂ تحقیر سے دیتے تھے اور رموزِ نبوت کے دانا چشمِ پرنم اور دلِ پرکیف سے۔

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهٖٓ اِذَا یُتْلٰی عَلَیْهِمْ یَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ سُجَّدًا وَّ یَقُوْلُوْنَ سُبْحٰنَ رَبِّنَآ اِنْ کَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُوْلًا○ وَ یَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ یَبْکُوْنَ وَ یَزِیْدُهُمْ خُشُوْعًا○﴾ (بنی اسرائیل:۱۰۷'۱۰۹)

''جن کو ان سے پہلے علم دیا گیا ہے (یہود و نصاریٰ) جب ان کو قرآن کی آیتیں سنائی جاتی ہیں تو منہ کے بل وہ سجدے میں گر پڑتے ہیں اور کہتے ہیں کہ پاک ہے ہمارا پروردگار' ہم سے ایک پیغمبر آخر الزمان کے بھیجنے کا جو وعدہ کیا تھا وہ ضرور پورا ہوا وہ منہ کے بل گر پڑتے ہیں اور یہ ان کے خشوع کو اور بڑھاتا ہے۔''

﴿وَ لَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰى ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ وَ رُهْبَانًا وَّ اَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ○ وَ اِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰٓى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ○﴾ (المائدہ:۸۲،۸۳)

''ان میں سب سے زیادہ مسلمانوں کے ساتھ محبت رکھنے والے وہ ہیں جو اپنے کو نصاریٰ کہتے ہیں' سبب یہ ہے کہ ان میں قسیس اور راہب ہیں اور وہ تکبر نہیں کرتے اور جب وہ کلام سنتے ہیں جو پیغمبر پر اترتا ہے تو ان کی آنکھوں کو دیکھے گا کہ حق کو پہچان کر آنسو بہاتی ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ خدایا ہم ایمان لائے ہم کو بھی شہادت دینے والوں میں لکھ دے۔''

مدینہ کے یہود جو اسلام سے سیاسی اور دینی کینہ اور تعصب رکھتے تھے اور اس بنا پر اسلام کے مقابلہ میں زبان سے اپنی کور باطنی کا اظہار وہ اپنا فرض سمجھتے تھے' وہ بھی چشمِ دل کو بینشِ حق سے باز نہیں رکھ سکتے تھے۔

﴿اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ وَ اِنَّ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَ هُمْ يَعْلَمُوْنَ﴾ (البقرہ:۱۴۶)

''جن کو ہم کتاب دے چکے ہیں وہ اس پیغمبر کو اسی طرح پہچانتے ہیں جس طرح وہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں' ان میں سے کچھ لوگ جان کر حق پوشی کرتے ہیں۔''

﴿وَ لَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ وَ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ﴾ (البقرہ:۸۹)

''اور جب خدا کے پاس سے پیغمبر وہ کتاب لے کر آیا جو خود ان کی آسمانی کتابوں کو سچ کر رہی ہے تو باوجود اس کے کہ وہ کافروں کو اس سے پہلے اسی کے نام سے دباتے تھے اب حق پہچان کر اس کا انکار کرتے ہیں۔''

قرآن مجید کی شہادتوں سے قطع نظر کر کے اگر واقعات پر غور کیا جائے تب بھی یہ حقیقت منکشف ہو جائے گی' مجرد دعوتِ حق سننے کے ساتھ جن اشخاص اور جن قبائل نے اسلام کو لبیک کہا ان کے حالات پیشِ نظر کر لینے کے بعد صاف ثابت ہوتا ہے کہ اسلام اپنے لیے صرف اثر پذیر دل اور ذوق آشنا نگاہ کا جویاں ہے' حضرت سعید بن زیدؓ' عثمان بن مظعونؓ' صہیب رومیؓ' ابو ذر غفاریؓ' سلیمان فارسیؓ وغیرہ جو سابقینِ اسلام ہیں' اسی قسم کے لوگ تھے' ابو جہل' ولید بن مغیرہ' عاص بن وائل وغیرہ قریش کے مشرکین و کفار خدا کا کلام تیرہ برس تک متصل سنتے رہے' لیکن ان کے دل کی سنگینی میں کوئی فرق نہ آیا' ورقہ' مکہ کا قریش عیسائی صرف ایک بار قرآن سنتا ہے اور ناموسِ اکبر کی آواز پہچان لیتا ہے' مکہ کے مشرک ترپن برس تک آپ کے چہرۂ پرنور کو دیکھتے رہے لیکن نورِ الٰہی کو نہ پہچان سکے اور عبداللہ بن سلامؓ یہودی عالم نے صرف ایک دفعہ جمالِ پُر انوار کو دیکھا اور پکار اٹھے کہ یہ حق کی تجلی ہے' روسائے

قریش ہر روز اپنی آنکھوں سے نزولِ وحی کا تماشا دیکھتے ہیں اور جنبش نہیں کرتے اور نجاشی حکومت کی مسند پر اور ہرقل شہنشاہی کے تخت پر بیٹھ کر غائبانہ کلام اللہ کی چند آیتیں سنتے ہیں اور تڑپ جاتے ہیں' قریش کے گھر یہ دولت خود اترتی ہے اور وہ اس کو ٹھکرا دیتے ہیں' لیکن مدینہ سے بنی اسرائیل کے پڑوسی جوان کی زبان سے آخری نبی کی بشارت سن چکے تھے اتفاقاً مکہ آتے ہیں اور اس دولتِ ابدی کو اپنے گھر اٹھا لے جاتے ہیں' طائف کے سنگدل جاہل' نبی پر پتھر برساتے ہیں اور اس کی ہنسی اڑاتے ہیں اور نجران کے عیسائی عالم مناظرہ کی غرض سے مدینہ آتے ہیں لیکن چہرہ پر پیغمبری کی معصومیت دیکھ کر دہل جاتے ہیں اور صلح کا ہدیہ پیش کرتے ہیں۔

قریش اور حجاز کے رازِ نبوت کے نامحرم دعوتِ حق کا جواب اکیس برس تک تیغ وسنان سے دیتے ہیں' لیکن یثرب' ہجر' یمن' عمان اور بحرین کے بڑے بڑے اور عظیم الشان قبائل جو یہود' نصاریٰ اور مجوسیوں کے اثر سے ان رموز سے کسی قدر آگاہ ہو چکے تھے وہ آوازِ حق پہنچنے کے ساتھ دفعتاً مسلمان تھے۔

آبائی دین ورسوم کی پابندی

ہر نئی تحریک کو غور سے دیکھو تو معلوم ہوگا کہ اس کے قبول کرنے میں جو چیز سب سے پہلے عائق ہوتی ہے وہ قومی رسم ورواج اور آبائی دین ومذہب کی پابندی ہے' انسانیت کے پاؤں میں اس سے بھاری کوئی زنجیر نہیں' دوست وآشنا کا چھوٹنا' ماں باپ سے علیحدگی' آل واولاد سے کنارہ کشی' مال ودولت سے دست برداری' جماعت کی مخالفت' قوم سے انقطاع' وطن سے دوری ایسی چیزیں نہیں ہیں جن کو ہر انسان آسانی سے برداشت کر سکے' ملکی رسم ورواج کی دیرینہ محبت اور آبائی کیش وآئین کی موروثی الفت' حق وباطل کی تمیز اور نیک وبد کی پہچان کی حس مٹا دیتی ہے' عام دنیا کی فطری حالت کے علاوہ' عرب کی قوم' قدامت پسندی اور قدیم حالت پر بقاء واستحکام میں خاص شہرت رکھتی ہے' دنیا کہاں سے کہاں بدلتی چلی گئی' پرانی نسل کی بدویانہ خصوصیتیں جو ہم توراۃ میں پڑھتے ہیں وہ تمام سامی قوموں سے مٹ گئیں۔ مگر عرب میں اس وقت بھی نمایاں تھیں اور آج بھی نظر کے سامنے ہیں' دینِ ابراہیم کے چند اصول حج' ختنہ اور قربانی وغیرہ ہزاروں برس کے بعد بھی عرب میں مٹ مٹا کر باقی رہ گئے تھے اور ان سے نہیں چھوٹے تھے' ان کے شعر وشاعری اور فخر ومباہات کا سب سے پرجوش مضمون آباء واجداد اور نام ونسب پر فخر وغرور تھا جس کو چھوڑنا ان کے نزدیک اپنی پرانی عزت وعظمت کی دیوار کو خود گرا دینا تھا۔

آنحضرت ﷺ نے جب مکہ میں دینِ حق کی منادی شروع کی تو اس کی شدید مخالفت جس بنا پر سب سے زیادہ کی گئی وہ یہی دینِ آبائی کے ترک کا مسئلہ تھا اور یہی دینِ جدید کے بطلان کی سب سے مستحکم دلیل ان کے پاس تھی' چنانچہ قرآن مجید نے بار بار ان کے اس قول کو دہرایا ہے اور اس کی لغویت کو ظاہر کیا ہے:

﴿وَ اِذَا قِیۡلَ لَهُمُ اتَّبِعُوۡا مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ قَالُوۡا بَلۡ نَتَّبِعُ مَاۤ اَلۡفَیۡنَا عَلَیۡهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَلَوۡ کَانَ اٰبَآؤُهُمۡ لَا یَعۡقِلُوۡنَ شَیۡئًا وَّ لَا یَهۡتَدُوۡنَ﴾ (البقرہ:۲۱)

''اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو اتارا ہے اس کی پیروی کرو' کہتے ہیں (نہیں) بلکہ ہم اس کی پیروی کریں گے جس پر اپنے باپ دادوں کو ہم نے پایا' کیا اگرچہ ان کے باپ دادا نہ کچھ سمجھتے ہوں اور نہ راہِ راست پر ہوں (تب بھی)۔''

﴿بَلْ قَالُوْٓا اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآنَا عَلٰٓی اُمَّةٍ وَّ اِنَّا عَلٰٓی اٰثٰرِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ ○ وَ كَذٰلِكَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِیْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَ نَا عَلٰٓی اُمَّةٍ وَّ اِنَّا عَلٰٓی اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ○ قَالَ اَوَلَوْ جِئْتُكُمْ بِاَهْدٰی مِمَّا وَجَدْتُّمْ عَلَيْهِ اٰبَآءَكُمْ قَالُوْٓا اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ○﴾ (زخرف:۲۲'۲۴)

''بلکہ وہ کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے بزرگوں کو ایک روش پر پایا ہے اور ہم ان ہی کے نقشِ قدم پر چل کر رہنمائی پائیں گے اور اسی طرح ہم نے اے پیغمبر تم سے پہلے کسی آبادی میں کوئی پیغمبر نہیں بھیجا لیکن اس کے دولت مندوں نے یہی کہا کہ ہم نے اپنے بزرگوں کو ایک روش پر پایا ہے اور ہم ان ہی کے نقش قدم کے پیرو ہیں' کہو اے پیغمبر کیا اگرچہ میں اس روش سے جس پر تم نے اپنے بزرگوں کو پایا زیادہ سیدھا راستہ لے کر تمہارے پاس کیوں نہ آؤں (تب بھی تم ان ہی کی پیروی کرو گے) انہوں نے کہا ہم تو (جو تم دے کر بھیجے گئے ہو) اس کا انکار ہی کرتے رہیں گے۔''

﴿وَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً قَالُوْا وَجَدْنَا عَلَيْهَآ اٰبَآءَ نَا وَاللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا قُلْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ (الاعراف:۲۸)

''اور جب وہ کوئی بے شرمی کی بات کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے بزرگوں کو اسی پر پایا اور اللہ نے ہم کو اسی کا حکم دیا ہے۔ کہہ دو اے پیغمبر کہ اللہ تو بے شرمی کی بات کا کبھی حکم نہیں دیتا' کیا تم اللہ پر وہ تہمت باندھتے ہو جو تم نہیں جانتے۔''

﴿وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰی مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَ اِلَى الرَّسُوْلِ قَالُوْا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا اَوَ لَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ شَيْئًا وَّ لَا يَهْتَدُوْنَ﴾ (المائدۃ:۱۰۴)

''اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو اتارا ہے اس کے پاس اور رسول کے پاس آؤ تو کہتے ہیں ہم نے اپنے باپ دادوں کو جس پر پایا وہی ہم کو کافی ہے' کیا ان کے باپ دادا کچھ نہ جانتے ہوں اور نہ سیدھے راستہ پر ہوں (تب بھی وہ انہی کی پیروی کریں گے۔)

﴿وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِی اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّ لَا هُدًی وَّ لَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ ○ وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَ نَا اَوَ لَوْ كَانَ الشَّيْطٰنُ يَدْعُوْهُمْ اِلٰی عَذَابِ السَّعِيْرِ○﴾ (لقمان:۲۰'۲۱)

''کچھ لوگ ایسے ہیں جو علم و ہدایت اور روشن کتاب کے بغیر اللہ کے بارہ میں جھگڑا کرتے ہیں اور جب

ان سے کہا جاتا کہ اللہ نے جو اتارا ہے اس کی پیروی کرو تو کہتے ہیں بلکہ ہم اسی کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادوں کو پایا' اگرچہ ان کو شیطان دوزخ کے عذاب ہی کی طرف کیوں نہ پکارے (تو وہ اسی کی پیروی کریں گے۔)''

کفار کے یہ سوال و جواب خود ظاہر کرتے ہیں کہ ان کو اپنے آبائی رسوم کا چھوڑنا کس درجہ محال نظر آتا تھا۔ آپ نے بعثت کے تین برس بعد جب بت پرستی کی علانیہ مذمت شروع کی تو قریش کی عدالت میں آپؐ پر سب سے بڑا جرم یہی قائم کیا گیا کہ یہ خاندانی دیوتاؤں کی تحقیر' بزرگوں کی توہین اور آبائی رسم و رواج کی مذمت کرتے ہیں۔ مکہ میں جب آپؐ نے علی الاعلان لوگوں کو اسلام کی دعوت دی اور بہت سے نیک لوگوں نے دعوت پر لبیک کہا تو قریش کے بڑے بڑے رئیسوں نے ابوطالب کے پاس جا کر آپ کے خلاف جو الزامات قائم کیے وہ یہ تھے: اے ابوطالب! تمہارا بھتیجا ہمارے دیوتاؤں کو برا کہتا ہے' ہمارے مذہب کی توہین کرتا ہے ہم کو بیوقوف اور نادان کہتا ہے اور ہمارے باپ دادوں کو گمراہ بتاتا ہے تو یا تو تم اس کو روکو یا ہم کو اور اس کو چھوڑ دو کہ باہم سمجھ لیں۔

یہ ان کی عدالت کا پہلا مطالبہ تھا' ابوطالب نے ان کو سمجھا بجھا کر واپس کیا' تو کچھ دنوں کے بعد پھر انہوں نے اپنا مطالبہ ان الفاظ میں پیش کیا' ''اے ابوطالب! تم نے اپنے بھتیجے کو اب تک منع نہیں کیا' اب خدا کی قسم ہم اپنے بزرگوں کی برائی' اپنی نادانی اور اپنے دیوتاؤں کی ہجو نہیں سن سکتے تو یا تو اس کو باز رکھو اور یا ہم سے لڑنے پر آمادہ ہو جاؤ۔'' اس اعلانِ جنگ سے کام نہ چلا تو وہ تیسری دفعہ ابوطالب کے پاس جاتے ہیں اور کہتے ہیں۔'' اے ابوطالب! ولید کا بیٹا عمارہ کیسا خوشرو جوان ہے تم اس کو متبنّٰی بنا لو اور اپنے بھتیجے کو قتل کے لیے ہمارے حوالہ کر دو کہ اس نے تمہارے اور تمہارے بزرگوں کے دین و مذہب کی مخالفت کی ہے' تمہاری قوم کی جماعت کو پراگندہ کر دیا اور ان کو بیوقوف اور نادان کہتا ہے' سب سے آخری دفعہ قریش کے رئیسوں نے خود آنحضرت ﷺ سے مل کر گفتگو کی اور کہا اے محمد! تمہارے سوا کسی قوم میں ایسا آدمی نہیں آیا جو اپنی قوم پر وہ مصیبت لایا ہو' جو تم لائے ہو' تم نے باپ دادوں کو برا کہا' ہمارے مذہب کی تحقیر کی' دیوتاؤں کو گالی دی' ہم کو بیوقوف اور نادان بنایا اور جماعت میں تفرقہ ڈالا۔ غرض کوئی برائی نہ تھی جو تم نے ہمارے ساتھ نہیں کی۔ (۱)

ان الزامات کی فہرست کی ایک ایک دفعہ پڑھو۔ معلوم ہوگا کہ آبائی دین' موروثی رسم و رواج اور خاندانی دیوتاؤں کی غلامی سے آزاد ہونا' ان پر کتنا بار تھا! اور وہ اس جرم کو کتنا سنگین سمجھتے تھے' موسمِ حج میں آنحضرت ﷺ جب لوگوں کے پاس جا جا کر توحید کا پیغام سناتے تھے تو ابولہب آپ کے اثر کو باطل کرنے کے لیے آپؐ کی تقریر کے بعد آپ کے پیچھے پیچھے صرف یہ کہتا جاتا تھا' لوگو! یہ وہی ہے جو تم کو تمہارے باپ دادوں کے مذہب سے برگشتہ کرتا پھرتا ہے۔ (۲) ابوطالب جنہوں نے ہر موقع پر آنحضرت ﷺ کی حمایت کی تھی اور وہ آپ کو اپنے دل و

(۱) یہ تمام واقعات ابن اسحاق اور سیرت کی تمام کتابوں میں بتفصیل مذکور ہیں۔

(۲) مستدرک حاکم ج۳ ص۱۵ کتاب الایمان۔

جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے وہ بھی آپ کی دعوتِ حق کو اپنے دینِ آبائی کے مقابلہ میں پذیرائی کے قابل نہ سمجھتے۔ بھتیجے نے بار بار کہا' چچا جان! کلمۂ شہادت ایک دفعہ پڑھ لیجیے کہ قیامت میں آپ کی شفاعت کی ایک سند مجھے ہاتھ آ جائے' ابوطالب نے جواب دیا۔ جانِ پدر! سب کچھ تم پر نثار' لیکن بزرگوں کے مذہب کو نہیں چھوڑ سکتا۔ عین اس وقت جب ابوطالب دنیا سے رخصت ہو رہے تھے اور نزع کی حالت تھی' آپؐ ان کے پاس تشریف لے گئے اور فرمایا کہ چچا جان! اب تو لا الہ الا اللہ کہہ دیجیے کہ میں خدا کے ہاں آپ کے ایمان کی شہادت دوں۔ ابوجہل اور عبداللہ بن امیہ نے جو ان کے پاس بیٹھے تھے کہا' ابوطالب کیا تم (اپنے باپ) عبدالمطلب کے دین سے پھر جاؤ گے آپؐ بار بار لا الہ الا اللہ پڑھنے کی درخواست کرتے تھے' اور یہ دونوں ان کو وہی عبدالمطلب کے دین سے علیحدگی پر شرم دلاتے تھے بالآخر ابوطالب نے یہی کہا کہ میں عبدالمطلب کے دین پر مرتا ہوں اور لا الہ الا اللہ نہیں کہا۔ یہ صحیح بخاری کی روایت ہے'(۱) صحیح مسلم میں اس کے بعد ہے کہ ابوطالب نے یہی کہا کہ "بھتیجے! جو فقرہ تم کہتے ہو۔ میں کہہ کر تمہاری آنکھیں ٹھنڈی کر دیتا لیکن قریش کہیں گے کہ ابوطالب موت سے ڈر گیا۔ (۲) ابن اسحاق میں ہے کہ انہوں نے آہستہ آہستہ وہ فقرہ کہہ دیا۔ (۳) بہرحال اس واقعہ سے جو دکھانا ہے وہ یہ ہے کہ اس حالت میں بھی مخالفین کے پاس اسلام سے باز رکھنے کے لیے اس سے زیادہ پرزور اور پراثر دلیل نہ تھی کہ ابوطالب کیا آبائی مذہب کو چھوڑ دو گے؟ اس سے معلوم ہوگا کہ اسلام کی اشاعت کے راستہ میں یہ تخیل کتنا بڑا پتھر تھا۔

توہم پرستی

عرب کی اصلاح و ہدایت کی راہ میں ایک اور عائق عرب کی توہم پرستی تھی' ہر قوم میں جاہلوں کا جس طرح یہ اعتقاد ہوتا ہے کہ فلاں دیوتا یا فلاں پیر کے خلاف اگر کچھ زبان سے نکلا تو فوراً بلائیں آ کر ہم کو لپٹ جائیں گی' عرب میں گھر گھر سینکڑوں بت اور بیسیوں صنم خانے تھے' دنیا کے تمام کام ان ہی اصنام اور بتوں سے متعلق سمجھے جاتے تھے' مدتوں سے یہ خیال راسخ چلا آتا تھا کہ فلاں بت کی پرستش یا خدمت گزاری میں اگر کوتاہی کی گئی تو آسمان سے پانی برسنا بند ہو جائے گا' فرزندِ نرینہ پیدا نہ ہوگا' باغوں میں پھل نہ آئیں گے' اسی بنا پر اسلام کے نام سے ان کو لرزہ آتا تھا' اور یہ تخیل صرف اسی وقت پیدا نہیں ہوا تھا بلکہ ایک مدت سے عرب میں چلا آتا تھا' حضرت ہودؑ کی دعوت کے جواب میں ثمود نے کہا:

﴿اِنْ نَّقُوْلُ اِلَّا اعْتَرٰىكَ بَعْضُ اٰلِهَتِنَا بِسُوْٓءٍ﴾ (ہود:۵۴)

"ہم تو اس کے سوا کچھ اور نہ کہیں گے کہ ہمارے کسی دیوتا نے تم کو ستایا ہے۔"

---

(۱) کتاب الجنائز باب قال المشرک عند الموت لا الہ الا اللہ۔

(۲) صحیح مسلم کتاب الایمان باب ۹۔

(۳) ابن ہشام وفات ابی طالب۔

ابتداءً جب آنحضرت ﷺ نے بتوں کے خلاف وعظ کہنا شروع کیا تو اکثر لوگوں نے (نعوذ باللہ) پاگل سمجھ لیا(۱) جاہلیت کے زمانہ کے بعض کافر احباب ہمدردی کی راہ سے جھاڑ پھونک کرنے آئے،(۲) ضمام بن ثعلبہؓ ایک صحابی تھے، وہ مسلمان ہوکر اپنے قبیلہ میں جب واپس گئے اور لات وعزیٰ کی مذمت شروع کی تو تمام قبیلہ خوف سے کانپ گیا کہ ضمام! ان کو برا نہ کہو، دیکھو کہیں تم کو برص، جنون یا جذام نہ ہو جائے۔(۳) حضرت زنیرہؓ مسلمان ہونے کے بعد بصارت سے محروم ہوگئی تھیں، کفار نے کہنا شروع کیا کہ لات وعزیٰ نے ان کو اندھا کر دیا ہے۔(۴) حضرت طفیلؓ بن عمرو دوسی مسلمان ہوکر جب اپنے وطن تشریف لے گئے اور اپنی بیوی کو اسلام کی دعوت دی تو انہوں نے کہا دیکھو ذوالشری (بت) کہیں برباد نہ کر دے۔(۵)

فتح مکہ کے بعد جب کہ دیوتاؤں کے زور وقوت کا راز افشا ہو چکا تھا اور اکثر قبائل نے اسلام قبول کر لیا تھا تاہم لات، عزیٰ، مناۃ، ذی الکفین، سواع کے بت خانوں کو وہ اپنے ہاتھ سے نہ توڑ سکے، خاص مدینہ سے راسخ الایمان مسلمان بھیجے گئے جنہوں نے اس فرض کو انجام دیا، پوجاریوں نے کوئی مزاحمت نہ کی، وہ سمجھتے تھے کہ ان دیوتاؤں کو کون توڑ سکتا ہے، جو اس گستاخی کا ارادہ کرے گا وہ خود تباہ وبرباد ہو جائے گا۔(۶)

توہم پرستوں میں کسی مذہب کی صحت وبطلان کی دلیل شواہدِ عقلی نہیں بلکہ دنیا کے ظاہری، مادی فوائد اور جانی ومالی خیر وبرکت ہوئی ہے لیکن قوانینِ گاہِ عالم میں ایک مذہب پرست بھی اسی طرح آلام ومصائب میں گرفتار ہوسکتا ہے جس طرح ایک غیر مسلمان۔ عرب کے بدو اور اعراب ابتداءً مسلمان ہونے کی ہمت بھی کرتے تھے تو معاً یہ توقع بھی کر لیتے کہ اب وہ ہر قسم کے آفاتِ ارضی وسماوی سے محفوظ ہیں اس بنا پر اگر کبھی ان کی اس توقع کو صدمہ پہنچتا تو دفعتاً وہ متزلزل ہو جاتے تھے، صحیح بخاری کتاب التفسیر میں ہے۔(۷)

كَانَ الرَّجُلُ يَقْدُمُ الْمَدِيْنَةَ فَإِنْ وَ لَدَتْ اِمْرَاَتُهُ غُلَامًا وَ نَتَجَتْ خَيْلُهُ قَالَ هٰذَا دِيْنٌ صَالِحٌ وَ اِنْ لَمْ تَلِدْ اِمْرَاَتُهُ وَ لَمْ تَنْتَجْ خَيْلُهُ قَالَ هٰذَا دِيْنٌ سُوْءٍ.

"باہر کا جو شخص مسلمان ہوکر مدینہ آتا تھا اس کی یہ حالت تھی کہ اگر اس کی بیوی لڑکا جنتی اور اس کی گھوڑی بچہ دیتی تو وہ کہتا کہ یہ نہایت عمدہ مذہب ہے لیکن اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ کہتا کہ یہ نہایت برا مذہب ہے۔"

قرآن مجید کی یہ آیت اسی قسم کے لوگوں کی شان میں نازل ہوئی ہے۔(۸)

---

(۱) ابن کثیر، زمخشری ابن حبان، بغوی وغیرہ تمام مفسرین نے لکھا ہے۔

(۲) دیکھو تفسیر آیہ ﴿مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ﴾ ونیز ﴿مَا بِصَاحِبِهِمْ مِنْ جَنَّةٍ﴾ صحیح مسلم باب تخفیف الصلوۃ والخطبۃ۔

(۳) مسند دارمی کتاب الصلوٰۃ۔

(۴) اسد الغابہ ترجمہ حضرت زنیرہؓ وسیرۃ ابن ہشام ذکر مستضعفین مسلمین۔

(۵) اسد الغابہ ذکر طفیل بن عمروؓ دوسی۔

(۶) ابن سعد وطبری ذکر اصنام۔

(۷) تفسیر سورہ حج جلد ثانی ص ۶۹۴۔

(۸) صحیح بخاری تفسیر سورۂ حج۔

﴿وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُ ِۨ اطْمَاَنَّ بِهٖ وَ اِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ ِۨ انْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ﴾ (الحج:۱۱)

''اور بعض لوگ وہ ہیں جو خدا کی بندگی کنارہ پر کھڑے ہو کر کرتے ہیں (یعنی دل سے نہیں کرتے) اگر ان کو فائدہ پہنچا تو ان کو اطمینان ہو جاتا ہے لیکن اگر مبتلائے مصیبت ہوئے تو فوراً رو برگشتہ ہو جاتے ہیں۔''

ہجرت کے بعد جب مسلمان مدینہ آئے اور اتفاق سے ایک عرصہ تک کسی مسلمان گھرانے میں کوئی لڑکا نہ پیدا ہوا تو دشمن اس واقعہ کو اپنی بددعاؤں کا نتیجہ سمجھتے تھے اور خوش ہوتے تھے' آخر چھ مہینے کے بعد عبداللہ بن زبیرؓ پیدا ہوئے تو مسلمان بے انتہا مسرور ہوئے۔ (۱) سوءِ اتفاق یہ کہ اول اول جو لوگ مدینہ میں آتے تھے' ان کو وہاں کی آب و ہوا راس نہیں آتی تھی' ابتدائے ہجرت میں جب حضرت ابوبکرؓ و حضرت بلالؓ آئے تو سخت بیمار ہو گئے۔ (۲) حضرت طفیل بن عمرؓ دوسی نے جب مدینہ کو ہجرت کی تو ان کو بھی مدینہ کی آب و ہوا ناموافق ہوئی' (۳) اگرچہ مخلصین اور اربابِ فہم پر اس قسم کی عارضی ناگواریوں کا کوئی اثر نہیں پڑ سکتا تھا' تاہم عام لوگ جن کی وہم پرستی فطرتِ ثانیہ ہو گئی تھی' وہ اس قسم کے اتفاقی واقعات سے بے حد متاثر ہوتے تھے' چنانچہ جب عکل و عرینہ کے چند لوگوں نے مدینہ میں آ کر اسلام قبول کیا اور آب و ہوا کی ناموافقت کے سبب سے بیمار ہو گئے اور آنحضرت ﷺ نے تبدیلِ آب و ہوا کی غرض سے ان کو اونٹوں کی چراگاہ میں بھیج دیا' تو گو وہ صحیح ہو گئے تاہم مرتد ہو گئے۔ (۴) اسی طرح ایک بدو نے آ کر آپؐ کے دستِ مبارک پر بیعت کی' لیکن سوءِ اتفاق سے دوسرے دن بخار میں مبتلا ہوا تو اپنی بیعت توڑنی چاہی آپؐ نے تین بار منع فرمایا لیکن اس کے اصرار سے آخر بیعت فسخ کر دی۔ اور فرمایا: (۵)

اَلْمَدِيْنَةُ كَالْكِيْرِ تَنْفِىْ خُبْثَهَا وَ تَنْصَعَ طِيْبُهَا.

''مدینہ آگ کی بھٹی ہے جو میل کو الگ کر دیتا ہے اور حقیقی جوہر کو خالص کر دیتا ہے۔''

ان ہی اسباب کی بنا پر آنحضرت ﷺ نے مدینہ کے متعلق یہ دعا فرمائی:

((اَللّٰهُمَّ حَبِّبْ اِلَيْنَا الْمَدِيْنَةَ كَحُبِّنَا مَكَّةَ اَوْاَشَدُّ اَللّٰهُمَّ وَ صَحِّحْهَا وَ بَارِكْ لَنَا فِىْ مُدِّهَا وَ صَاعِهَا وَ انْقُلْ حُمَّاهَا فَاجْعَلْهَا بِالْجُحْفَةِ)) (۶)

(۱) مستدرک حاکم ج ۳ و اصابہ ذکر عبداللہ بن زبیر۔
(۲) صحیح بخاری کتاب المرضٰی و باب مقدم النبی ﷺ المدینہ۔
(۳) صحیح مسلم کتاب الایمان۔
(۴) صحیح بخاری کتاب المحاربین۔
(۵) بخاری ج ۱ ص ۲۵۳ کتاب الحج فضائل مدینہ و باب اعتصام السنۃ۔
(۶) صحیح بخاری مقدم النبی المدینہ۔

''خداوند! مکہ کی طرح یا اس سے زیادہ ہمارے لیے مدینہ کو محبوب بنا دے اس کو امراض سے صحیح کر دے۔ اس کے پیمانے میں برکت دے اور اس کے بخار کو جحفہ میں منتقل کر دے۔''

قبائل کی خانہ جنگیاں

اسلام کی اشاعت کا ایک بڑا مانع عرب کی باہمی خانہ جنگیاں تھیں جو عرب کے خصائصِ قومی کا عنصرِ اعظم بن گئی تھیں' یہ خانہ جنگیاں ہزاروں برس سے چلی آتی تھیں اور ان کی وجہ سے قبائل میں ایسے مستمر اور ثابت الاساس انتقامی جذبات پیدا ہو گئے تھے جن کا ٹلنا قریباً محال تھا' ان ہی لڑائیوں نے ثار (انتقامِ خون) کی رسم پیدا کر دی تھی جس کا ذکر اوپر گزر چکا ہے یہ رسم ایسی سخت اور شدید الاثر تھی کہ ایک شخص کے خون کے لیے قبیلہ کا قبیلہ مٹ جاتا تھا۔ ہزاروں برس کے خون قومی فرض کی طرح باقی چلے آتے تھے جو درج رجسٹر ہوتے رہتے تھے اور بچہ بچہ کی زبان پر ہوتے تھے' جو بچہ پیدا ہوتا تھا وہ ہوش سنبھالنے کے وقت سب سے پہلے ثار کا لفظ سنتا تھا یعنی خاندان میں فلاں شخص قتل کیا گیا ہے اور اس کے خون کا انتقام اب تک باقی ہے' اس لیے بچہ بچہ کا نصب العین ابتدائے زندگی سے یہی ثار ہوتا تھا۔

اس بنا پر ایک شخص یا ایک خاندان جس خلوص اور عقیدت مندی کے ساتھ اسلام کی طرف جھکتا تھا' معاً اسی زور اور قوت کے ساتھ دوسرا فریق اسلام کی مخالفت اور اس سے سرکشی پر آمادہ ہو جاتا تھا' مکہ میں اسلام کی مخالفت کا صرف یہی راز تھا کہ خدا نے نبوت کے لیے ہاشم کا گھرانہ چن لیا تھا' بنی امیہ کی مخالفت اس کے لیے لامحالہ ہونی تھی۔

مدینہ میں اوس و خزرج دو قبیلے تھے' اسلام سے پہلے دونوں لڑ لڑ کر تھک گئے تھے' اسلام کی آواز آئی تو گو دونوں نے ایک ساتھ لبیک کہا' تاہم قبیلہ اوس کا ایک ایک فرد اگر ہمہ تن اخلاص و جوش تھا تو خزرج میں بیسیوں منافق تھے' انتہا یہ ہے کہ ابتدائے اسلام میں ہجرت سے پہلے دونوں قبیلوں کی نماز کی امامت کے لیے باہر سے ایک تیسرے قبیلہ کا آدمی بلوایا گیا تھا کہ خدا کے سامنے بھی ایک کو دوسرے کے پیچھے کھڑے ہونے سے عار تھا۔ (۱)

خزاعہ اور بنو بکر باہم شدید دشمن تھے اور ان میں باہم پرانی عداوت چلی آتی تھی' مدینہ آنے کے بعد آنحضرت ﷺ نے ان کو صلح کا پیام اور اسلام کی دعوت دی' خزاعہ نے اسلام کی دعوت قبول کی اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ بنو بکر قریش کے حلیف بن گئے۔

خوب غور کرو' انصار اسلام لا کر ہمہ تن نیکوکاری اور پاکیزہ نفسی کے پیکر بن گئے۔ لیکن ثار کے جذبات کس طرح آسانی سے دفعتاً مشتعل ہو جاتے تھے' ایک موقع پر ایک یہودی نے جنگ بعاث کا تذکرہ چھیڑ دیا' تو انصار کے دونوں قبیلوں اوس و خزرج کی تلواریں میان سے نکل آئیں۔ (۲) اور بڑی مشکل سے آنحضرت ﷺ نے ان

---

(۱) ابن ہشام ذکر بیعت عقبہ۔

(۲) اصابہ ج ۱ مطبوعہ مصر ص ۸۸ معجم صغیر طبرانی میں بھی ایک اور اسی قسم کا واقعہ مذکور ہے' معجم عبداللہ۔

کے جوش کو فرو کیا۔

حضرت عائشہؓ کے واقعۂ افک میں جب آنحضرت ﷺ نے منبر پر کھڑے ہو کر اس کی شکایت کی اور حضرت سعدؓ بن معاذ نے کہا یا رسول اللہ! اگر وہ (تہمت لگانے والا) ہمارے قبیلہ کا ہے تو میں اس کی گردن اڑا دیتا ہوں اور اگر ہمارے بھائی خزرج کے قبیلہ سے ہے تو آپ حکم دیں میں بجالاؤں گا۔ اس پر سعدؓ بن عبادہ جو قبیلہ خزرج کے رئیس تھے دفعتاً کھڑے ہو گئے اور کہا۔ (۱)

كَذَّبْتَ لِعُمْرِ اللّٰهِ لَا تَقْتُلَهٗ وَ لَا تَقْدِرُ عَلٰى قَتْلِهٖ وَ لَوْ كَانَ مِنْ رَّهْطِكَ مَآ اَحْبَبْتُ اَنْ يُّقْتَلَ.

''خدا کی قسم جھوٹ کہتا ہے تو اس کو قتل نہ کرے گا نہ کر سکتا ہے اور وہ شخص اگر تیرے قبیلہ کا ہوتا تو تو اس کا قتل کیا جانا پسند نہ کرتا۔''

اس پر اوس اور خزرج دونوں قبیلوں کے لوگ اٹھ کھڑے ہوئے' یہاں تک کہ قریب تھا کہ جنگ چھڑ جائے' چنانچہ صحیح بخاری حدیثِ افک میں ہے: (۲)

فَثَارَ الْحَيَانَ الْاَوْسَ وَ الْخَزْرَجَ حَتّٰى اَنْ يَّقْتَتِلُوْا' وَ رَسُوْلُ اللّٰهِ قَآئِمٌ عَلَى الْمِنْبَرِ.

''پس دونوں قبیلے اوس اور خزرج مشتعل ہو گئے یہاں تک کہ دونوں کشت وخون پر آمادہ ہو گئے اور آنحضرت ﷺ اس وقت منبر پر کھڑے تھے۔''

ایک بار محلم بن جثامہ لیثی نے عہدِ اسلام میں قبیلہ اشجع کے ایک شخص کو قتل کر ڈالا' آنحضرت ﷺ کے سامنے مقدمہ پیش ہوا' قبائل کے تعلقات کی بنا پر عیینہ نے مقتول اور اقرع ابن حابس نے قاتل کی طرف سے وکالت کی' بات بڑھی اور سخت شور وشغب ہوا تو آپؐ نے عیینہ سے فرمایا۔ ''دیت کیوں نہیں قبول کر لیتے۔'' اس نے کہا خدا کی قسم اس وقت تک دیت نہ قبول کروں گا جب تک اس کی بیویوں کو اس قدر نہ ستالوں' جس قدر اس نے ہماری بیویوں کو ستایا ہے' اس پر اور شور وغل ہوا' آپؐ نے پھر یہی الفاظ فرمائے اور عیینہ نے وہی پہلا جواب دیا' چونکہ یہ اسلام کا ابتدائی زمانہ تھا اور قتل کا یہ پہلا مقدمہ تھا جو آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پیش ہوا تھا۔ اس لیے قبیلۂ بنولیث کے ایک شخص نے جو مسلح کھڑا تھا' کہا کہ ابتدائے اسلام میں اس واقعہ کی مثال بکری کے اس ریوڑ کی سی ہے کہ اس کے پہلے حصہ کو تیر مارا گیا تو بدک کر بھاگ گیا' یعنی اگر قاتل کے موافق فیصلہ کیا گیا تو لوگ سمجھیں گے کہ اسلام قصاص کو دیت سے بدل دینا چاہتا ہے اور چونکہ دلوں میں اب تک انتقام کے جذبات تازہ ہیں اور لوگ دیت لینا پسند نہیں کرتے۔ اس لیے ان کو اسلام کے قبول کرنے میں تامل ہوگا' لیکن آنحضرت ﷺ چونکہ سفر میں تھے اس لیے دیت میں ۱۵۰ اونٹ اسی وقت دیے اور مدینہ پہنچ کر ۱۵۰ اونٹ کا وعدہ فرمایا۔

---

(۱) صحیح بخاری کتاب المغازی باب حدیث الافک۔

(۲) ابوداؤد (جلد ۲ ص ۱۵۵ کتاب الدیات۔

اہلِ عرب میں یہ جذبہ اس قدر ترقی کر گیا تھا کہ گو آپ نے فتح مکہ میں امنِ عام کی منادی کر دی اور تلواروں کے میان میں کر لینے کا حکم دے دیا' تاہم انتقام کا جوش اب تک تازہ تھا۔

قبیلۂ ہذیل کا ایک شخص اسلام لانے کی غرض سے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں جا رہا تھا' اس نے زمانۂ جاہلیت میں قبیلۂ خزاعہ کا کوئی جرم کیا تھا اور وہ لوگ انتقام کے لیے اس کو ڈھونڈ رہے تھے' سوءِ اتفاق سے وہ راہ میں مل گیا اور ان لوگوں نے اس کو فوراً قتل کر دیا کہ اگر بارگاہِ نبوت میں پہنچ گیا تو پھر اس کا موقع ہاتھ نہ آئے گا' آپ کو اس واقعہ کی خبر ہوئی تو سخت برہم ہوئے' ان لوگوں نے حضرت عمرؓ' حضرت ابوبکرؓ' حضرت علیؓ سے سفارش کی درخواست کی' آنحضرت ﷺ نے نماز کے بعد ایک خطبہ دیا جس کے الفاظ یہ تھے:

''خدا نے مکہ کو دارالحرام بنایا ہے' آدمیوں نے نہیں بنایا ہے' خدا نے کل چند گھنٹوں کے لیے اس کو میرے لیے حلال کر دیا تھا لیکن آج اس کی قدیم حرمت دوبارہ لوٹ آئی ہے اور خدا کے سب سے زیادہ نافرمان بندے تین آدمی ہیں ایک وہ جس نے حدودِ حرم میں کسی کو قتل کیا' دوسرا وہ جس نے اپنے قاتل کے سوا کسی دوسرے شخص کو مار ڈالا' تیسرا وہ جس نے زمانۂ جاہلیت کا انتقام لیا' تم نے جس شخص کو قتل کر ڈالا ہے میں اس کی دیت دوں گا۔''

چنانچہ آپؐ نے اس کی دیت ادا فرمائی۔ (۱) بنو ثعلبہ کے ایک آدمی نے جاہلیت میں اوس و خزرج کے ایک آدمی کو قتل کر دیا تھا' بنو ثعلبہ اسلام لا کر جب مدینہ آئے تو آنحضرت ﷺ خطبہ دے رہے تھے' ایک انصاری بے اختیار چلا اٹھے کہ یا رسول اللہ ﷺ یہ ہمارے مجرم ہیں ان سے قصاص دلوایئے۔ آنحضرت ﷺ نے ہاتھ اٹھا کر فرمایا ((اَلَا لَا یَجْنِیْ وَ الِدٌ عَلٰی وَلَدِہٖ)) یعنی لڑکے کے جرم کا بدلہ باپ سے نہیں لیا جائے گا۔ (۲)

ان واقعات سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ثار کا جذبہ کس طرح رگ رگ میں سرایت کر گیا تھا اور اس جذبہ کا مشتعل ہو جانا کس قدر آسان ہوتا تھا۔

خانہ جنگیوں پر ختم نہیں' یوں بھی تمام قبائل رقیب و حریفِ مقابل تھے' دو مختلف قبیلوں کے آدمیوں میں کسی ذاتی معاملہ پر بھی نزاع ہو جاتی تھی اور ان میں کوئی اپنے قبیلہ کا نام پکارتا تھا تو قومی جنگ کا سامان ہو جاتا تھا' ایک دفعہ ایک مہاجر نے ایک انصاری کو تھپڑ مار دیا' انصاری نے یاللانصار (انصاری کی دہائی) پکارا' مہاجر نے بھی یا للمہاجرین (مہاجرین کی دہائی) کا نعرہ مارا' آنحضرت کو خبر ہوئی آپ نے آ کر فرمایا کہ یہ کیا جہالت کی پکار ہے۔

مَا بَالُ دَعْوَی الْجَاهِلِيَّةِ.

''یہ کیا جہالت کا دعویٰ ہے۔''

لوگوں کو معلوم تھا کہ اسلام اس فعلِ شنیع کا سخت دشمن ہے۔ اس لیے جب تک وہ اپنا انتقام نہ لے لیتے ان کو اسلام لانے میں تامل ہوتا تھا' عمرو بن اقیش ایک صاحب تھے وہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور

(۱) مسند امام احمد حنبل جلد ۴ ص ۳۱۔

(۲) دار قطنی ج ۲ ص ۲۰۸۔

اسلام سے متاثر اوراس کے قبول کرنے کے لیے ہرطرح آمادہ تھے لیکن ایک عائق تھا جواس راہ میں حائل تھا یعنی ''ثار'' وہ جانتے تھے کہ اسلام لاکراس خاندانی فرض ادا کرنے کی ان کواجازت نہیں مل سکتی' ابن مندہ نے ان کے حال میں لکھا ہے:

و کان له ثار فی الجاهلية و کره ان یسلم حتی یاخذه.

''ان کا انتقام زمانۂ جاہلیت میں باقی رہ گیا تھا جب تک وہ نہ لے لیں' انہوں نے مسلمان ہونا پسند نہ کیا۔''

اسی طرح حضرت عمرو بن مالکؓ جب آنحضرت ﷺ کی خدمت میں اسلام لاکر اپنے قبیلہ میں واپس گئے اوراسلام کی دعوت دی تو قبیلہ والوں نے کہا' بنوعقل پر ہمارا ثار (انتقام) باقی ہے وہ لے لیں تو اسلام لائیں' چنانچہ انہوں نے اسی وقت بنوعقل پر جومسلمان ہو چکے تھے' حملہ کیا اوراس فرض سے سبکدوش ہوئے۔ (۱)

سیاسی مشکلات

جہالت' وحشت' پابندیٔ رسوم' آبائی اثر وغیرہ وغیرہ ان میں سے ایک چیز بھی مانعِ اصلاح نہ ہوئی' تاہم صرف سیاسی اسباب ایسے جمع تھے کہ قریش یا دیگر قبائلِ عرب کبھی اسلام کے آگے سر نہیں جھکا سکتے تھے' مکہ میں دو خاندان برابر کے رقیب تھے' امیہ اور ہاشم۔ اور آنحضرت ﷺ کی بعثت سے پہلے امیہ کا پلۂ ترجیح علانیہ گراں ہو چکا تھا۔ آنحضرت ﷺ نے جب نبوت کا اظہار کیا تو سب سے پہلے امیہ کے خاندان نے سرکشی کی اور فتح مکہ تک یہی خاندان تھا جو تمام لڑائیوں اور معرکہ آرائیوں کا علم بردار تھا' بنوامیہ کے بعد اور دوسرے جو خاندان بھی تھے اور جو حرم کے مناصب دوگانہ (رفادہ وغیرہ) کے ممتاز حصہ دار تھے' ان میں سے ہر ایک دیکھ رہا تھا کہ اس جدید انقلاب میں ان فوائد واقتدار کا بالکل خاتمہ ہے' ابوجہل سے جب ایک شخص نے کہا ''محمد کی دعوتِ اسلام کی نسبت تمہاری کیا رائے ہے۔'' تو اس نے صاف کہا کہ میں کیا کہوں محمد کے خاندان نے عزت وشرف میں برتری کا دعویٰ کیا اور ثبوت میں دعوتیں کھلائیں' اس کے جواب میں ہم نے اسی شان کی دعوتیں کھلائیں' انہوں نے خون بہا دیے ہم نے بھی دیے' انہوں نے زرپاشیاں کیں' ہم نے بھی کیں' ہم دونوں دوش بدوش ہو چکے تھے کہ دفعتاً ان کی طرف سے یہ دعویٰ پیش ہوا کہ ہمارے خاندان میں نبوت اور آسمان سے وحی بھی آ گئی۔ اب ہم کہاں تک برداشت کریں۔ خدا کی قسم! ہم کبھی محمد پر ایمان نہیں لا سکتے۔ (۲) یہی ابوجہل جب انصار کے ہاتھوں قتل ہوا تو اس نے مرتے وقت حسرت سے کہا کاش مجھ کو کاشت کاروں کے سوا کسی اور قوم نے قتل کیا ہوتا۔ (۳)

---

(۱) اصابہ فی احوال الصحابہ ذکر عمرو بن مالکؓ۔

(۲) ابن ہشام حصہ اول ص ۱۰۸ مطبوعہ مصر طبع اول۔

(۳) طبری واقعۂ خیبر۔

خوب غور سے دیکھو بدر' احد' حمرا الاسد' احزاب وغیرہ تمام لڑائیوں میں یہی اموی عنصر تھا جو کام کر رہا تھا' قریش کے قبیلہ سے باہر جو بڑے بڑے قبیلے تھے' مثل غطفان اور اسد وغیرہ وہ یا اہلِ مکہ کے خاندان کی کوئی شاخ تھی یا قریش کے حلیف و ہم عہد تھے' خیبر میں یہود تھے جو قوم کے لحاظ سے قریش سے الگ تھے' لیکن عرب تجارتی حیثیت سے تمام تر ان ہی یہودیوں کے زیرِ بار تھے' انہی سے قرض دام لیتے تھے۔ انہی کے ہاں مال و متاع رہن رکھتے تھے۔ (۱) خیبر اور غطفان ایک مدتِ دراز سے باہم حلیف تھے اس طرح مکہ سے لے کر خیبر اور نجد تک تمام عرب ایک سلسلۂ اتحاد میں مربوط تھا۔

کعبہ' تمام عرب میں قبلہ گاہِ اعظم تھا۔ ہر سال تمام ملک حج کرنے کے لیے آتا تھا اور آستانۂ کعبہ پر سر جھکاتا تھا' کعبہ کے مجاور معمولی پنڈوے نہ تھے بلکہ خیمہ و خرگاہ' تیغ و سپر' جاہ و حشم غرض ریاست و امارت کے تمام سر و سامان رکھتے تھے اس لیے تمام عرب میں ان کی شہنشاہی قائم تھی یہی بات ہے کہ جب تک مکہ فتح نہیں ہوا' اسلام کو چین نصیب نہ ہو سکا۔ لیکن اسلام کی مخالفت صرف قریش کی متابعت تک محدود نہ تھی' بلکہ بڑا سبب یہ تھا کہ اسلام سے خاص قریش کو جو نقصان پہنچ سکتا تھا' براہِ راست وہی تمام رؤسائے قبائل کو پہنچتا تھا۔ عرب کا ملکی نظام یہ تھا کہ تمام ملک میں قبائل پھیلے ہوئے تھے اور ہر قبیلہ کا ایک رئیس اعظم ہوتا تھا جو تمام قبیلہ پر حکمران ہوتا تھا اور مالِ غنیمت سے چوتھ وصول کرتا تھا جس کو مرباع کہتے تھے اس کے علاوہ غنائم میں سے جو عورت یا اور کوئی عمدہ چیز اس کو پسند آتی تھی' اس کو چھانٹ لیتا تھا۔ اس کا نام صفی تھا' یہ گویا چھوٹی چھوٹی حکومتیں تھیں' جو تمام ملک میں پھیلی ہوئی تھیں' یہ ریاست خاندانی اصول پر چلتی تھی۔ باپ کے مرنے کے بعد بیٹا رئیس منتخب ہوتا تھا' قبیلہ کے تمام معاملات ذاتی نزاعیں' قصاص یا خون بہا کے فیصلے سب رئیس کے ہاتھ میں فیصل ہوتے تھے' یہ رؤسا عام قوم سے بہت سے حقوق میں ممتاز ہوتے تھے۔

قبائل میں یہی امتیازِ مراتب تھا کہ جو قبائل زیادہ شریف مانے جاتے تھے ان میں سے ایک آدمی کو اگر کوئی دوسرا قبیلہ قتل کر دیتا تھا تو اس کا خون دوسرے قبیلہ کے دو خون کے برابر سمجھا جاتا تھا' اور اس لیے ایک کے بدلہ میں دو قتل کرتے تھے' یہ امتیاز اور فرقِ مراتب اس حد تک پہنچ گیا تھا کہ جب غزوۂ بدر میں قریش کی فوج میں سے عتبہ و شیبہ میدان میں آئے اور مبارز طلب ہوئے اور انصار ان کے مقابلہ کو نکلے تو عتبہ نے اس بنا پر ان کے مقابلہ سے انکار کر دیا کہ انصار اور قریش کا جوڑ نہیں۔

حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جبلہ بن الایہم خاندانِ غسان کا اخیر فرمان روا اسلام لایا اور مکہ میں آیا۔ ایک دن طواف میں اس کی چادر کسی شخص کے پاؤں کے نیچے آ گئی' جبلہ نے اس کے گال پر تھپڑ دے مارا' اس نے بھی برابر کا جواب دیا' جبلہ نے حضرت عمرؓ کے پاس جا کر شکایت کی' حضرت عمرؓ نے واقعہ سن کر کہا اس کا کیا قصور ہے' تم نے جو کیا' اس کی جزا پائی' جبلہ نے کہا میرا یہ رتبہ ہے کہ کوئی مجھ پر ہاتھ اٹھاتا تو قتل کر دیا جاتا' حضرت عمرؓ نے کہا کہ ہاں زمانۂ جاہلیت میں یہی قاعدہ تھا لیکن اسلام نے اس کا خاتمہ کر دیا' جبلہ نے کہا جو مذہب شرفاء کو ذلیل کر دیتا ہے

(۱) طبری واقعہ خیبر

میں اس سے باز آتا ہوں' یہ کہہ کر چوری سے روم چلا گیا اور عیسائی ہو گیا۔

عرب کا ہر رئیس قبیلہ درحقیقت جبلہ تھا اور اسلام قبول کرنے کے وقت اس کو یہی منظر نظر آتا تھا' اسلام ان تمام واقعات اور خصوصیات کو مٹاتا تھا۔ اس کے دربار میں شاہ و گدا' رئیس و عامی' شریف و حقیر کا ایک درجہ تھا۔ اس لیے عرب میں تمام رؤسائے قبائل کو صاف نظر آتا تھا کہ اسلام کا پھیلنا۔ ان کے ہر قسم کے فخر و امتیاز کا مٹ جانا تھا۔

عرب میں ایک دوسری حریف طاقت یہودیوں کی تھی جو حجاز سے لے کر شام کے دروازوں تک پھیلے تھے ان کے ہاتھ میں بڑے بڑے مضبوط قلعے تھے' فنِ جنگ سے واقف تھے' سامان و اسلحہ وافر رکھتے تھے' دولت کی بہتات تھی' باغوں اور زمینوں پر ان کا بھٹہ تھا' عرب کے تمام مادی ذرائع معاش کے وہ تنہا اجارہ دار تھے پھر اسلام آیا تو اس طرح کہ اس نے یہودیوں کی ایک ایک برائی کو طشت از بام کیا اور ان کے مذہبی وقار کے کھوکھلے پن کو علی الاعلان ظاہر کیا۔ اس لیے انہیں صاف نظر آتا تھا کہ یہ نئی طاقت ملک میں جڑ پکڑ کر ان کو بیخ و بنیاد سے اکھاڑ دے گی۔ چنانچہ قریظہ' بنی نضیر' بنی قینقاع اور یثرب' خیبر' فدک' تیما' وادی القریٰ وغیرہ کے یہودی زمین دار' سوداگر' مہاجن اور قلعہ نشین دل سے چاہتے تھے کہ اس قوت کو کسی طرح ابھرنے نہ دیں اور آخر لڑائیاں پیش آئیں اور دینِ توحید کے مقابلہ میں انہوں نے اہلِ شرک کا ساتھ دے کر خندق و احزاب و غطفان کے معرکے پیش کیے' عرب کے مختلف قبیلوں اور سرحدی صوبوں پر ایران اور روم کی سلطنتیں فرمان روائی کرتی تھیں' عراق' یمن اور بحرین پر ایران کی حکومت تھی اور حجاز کے شامی حدود پر قیصر کا قبضہ تھا' عرب کے مختلف ہمسایہ قبیلے انہی دو میں سے کسی ایک سلطنت کی حفاظت کا دم بھرتے تھے اور یہ دونوں سلطنتیں اس بیچ کے سرحدی ملک کی ایک ایک حرکت اور جنبش پر نظر رکھتی تھیں' اس لیے اس ملک میں ایک اتنی بڑی عظیم الشان تحریک کا قوت پکڑنا ان کو کسی طرح پسند نہیں آ سکتا تھا اسی لیے عرب میں اسلام کی قوت کا ان کو جب احساس ہوا تو انہوں نے اس کی دار و گیر کرنی چاہی' کسریٰ ایران نے یمن کے اپنے ایرانی گورنر کو لکھا کہ اس نئے مدعی کو پکڑ کر ہمارے سامنے حاضر کرو اور قیصر نے تو کھلم کھلا حملہ کی تیاری ہی کر دی تھی جس کے باعث تبوک کی فوج کشی ہوئی اور آخر آنحضرت ﷺ کے بعد مسلمانوں کو ان دونوں ہمسایہ طاقتوں سے نبرد آزما ہونا پڑا۔

ذریعۂ معاش

اسلام لانے کا ایک بڑا مانع یہ تھا کہ عرب کا ذریعۂ معاش عموماً قافلوں پر حملہ آوری اور سلبِ اموال اور رہزنی تھا اوپر ہم امالی قالی سے نقل کر آئے ہیں کہ عرب کا ذریعۂ معاش غارت گری تھا اور حج کے چار مہینوں میں جنگ و غارت سے باز رہنے میں ان کے ذرائع معاش مسدود ہو جاتے تھے اس ضرورت سے وہ حج کے مہینوں کو ادل بدل کر لیا کرتے تھے۔

اندرونی عرب تمام دشت وصحرا اور بالکل ویرانہ ہے' زراعت یا تجارت کی کوئی صورت نہیں' باوجود اس کے لاکھوں نفوس آباد ہیں۔ اس لیے ان کو غارت گری کرنی پڑی اور امتدادِ زمانہ سے یہ عادت ان میں راسخ ہوگئی تھی' رفتہ رفتہ ٹھگی' رہزنی اور سرقہ تمام ملک میں پھیل گیا تھا۔ یہاں تک کہ بڑے بڑے نامور شعرا چور اور رہزن ہوتے تھے۔

اکثر بڑے بڑے جتھے اس لیے قائم ہوتے تھے کہ بنجارے جو ملک میں پھر کر غلہ کی تجارت کرتے تھے ان کو لوٹ لیا کریں۔ آنحضرت ﷺ نے دومۃ الجندل پر جو سریہ بھیجا تھا اسی کے انسداد کی غرض سے بھیجا تھا' دومۃ الجندل مدینہ منورہ سے پندرہ منزل کے فاصلہ پر ہے تاہم یہ لوگ اس قدر فاصلہ سے خود مدینہ پر چھاپہ مارنے کی تدبیر کر رہے تھے کہ آپ کو خبر ہوگئی اور حفظِ ماتقدم کے لیے خود وہاں تک گئے اور چند روز قیام کر کے ان اطراف کا بندوبست کیا۔

حضرت مغیرہ بن شعبہؓ نے اسلام لانے سے پہلے چند شخصوں کو قتل کر کے ان کا مال چھین لیا تھا چنانچہ جب اسلام لائے اور اس واقعہ کا اظہار کر کے لوٹ کا مال بھی آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پیش کیا تو آپؐ نے فرمایا:

((اَمَّا الْاِسْلَامُ فَاَقْبَلُ وَ اَمَّا الْمَالُ فَلَسْتُ مِنْهُ فِیْ شَیْءٍ)) (صحیح بخاری کتاب الشروط ذکر صلح حدیبیہ)

''اسلام تو میں نے قبول کیا لیکن مال سے مجھ کو کسی قسم کا واسطہ نہیں۔''

ایک نکتہ یہاں خاص طور پر لحاظ کے قابل ہے' حدیثوں میں جو یہ وارد ہے کہ آنحضرت ﷺ اکثر بیعتِ اسلام کے وقت جن باتوں کا اقرار لیتے تھے' ان میں ایک یہ بھی ہوتا تھا کہ چوری نہ کریں گے' اس کی یہی وجہ تھی کہ ان جرائم کا رواج تھا ورنہ آج اگر شرفا سے بیعت کے وقت یہ اقرار لیا جائے تو لوگوں کو تعجب ہوگا کہ یہ بیعت لینے کی کیا چیز ہے۔

اسلام قبول کرنے کے ساتھ ان تمام جرائم سے توبہ کرنا ہوتا تھا' اس لیے عربوں کو اسلام قبول کرنے کے وقت یہ نظر آتا تھا کہ وہ تمام ذرائع معاش سے مجبور ہو جاتے ہیں یعنی وہ قافلوں پر حملہ نہیں کر سکتے کہیں ڈاکا نہیں ڈال سکتے' کسی کا مال نہیں چھین سکتے' تو اب ان کے لیے کیا باقی رہ جاتا ہے۔

قریش خود رہزن اور غارت گر نہ تھے' وہ شہر کی متمدن زندگی بسر کرتے تھے۔ تاہم دیگر اسباب کے ساتھ ان کے اسلام نہ قبول کرنے کی وجہ یہ بھی تھی کہ قبولِ اسلام کا اثر ان کے وسائلِ معاش پر بھی پڑ سکتا تھا' قریش کا ذریعۂ معاش صرف ان تجارتی تعلقات تک محدود تھا جو انہوں نے باضابطہ طور پر دوسرے قبائل اور ممالک سے قائم کر رکھے تھے اور یہ تمام قبائل اور ممالک مذہبی حیثیت سے اسلام کے دشمن اور حریفِ مقابل تھے اس بنا پر قریش کو خوف تھا کہ اگر وہ اسلام کے حلقہ میں داخل ہو جائیں گے تو دفعتاً یہ تمام تجارتی تعلقات منقطع ہو جائیں گے' چنانچہ علامہ ابن تیمیہؒ الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح (۱۳۸ جلد ۴) میں امام شافعی کی روایت سے لکھتے ہیں:

قَالَ الشَّافِعِیُّ کَانَتْ قُرَیْشٍ تَنْتَابُ الشَّامَ اِنْتِیابًا کَثِیْرًا وَ کَانَ کَثِیْرٌ مِّنْ مَعَائِشَهَا مِنْهُ وَ تَأْتِی الْعِرَاقَ فَیُقَالَ لَمَّا دَخَلَتْ فِی الْاِسْلَامِ ذَکَرْتَ لِلنَّبِیِّ ﷺ خَوْفِهَا مِنَ انْقِطَاعِ مَعَائِشَهَا بِالتِّجَارَةِ مِنَ الشَّامِ وَ الْعِرَاقِ اِذَا فَارَقَتَ الْکُفْرُوَ دَخَلَتْ فِی الْاِسْلَامِ وَ خِلَافَ مُلْکِ الشَّامِ وَ الْعِرَاقِ لِاَهْلِ الْاِسْلَامِ فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِذَا هَلَکَ کِسْریٰ فَلَا کِسْریٰ بَعْدَهٗ فَلَمْ یَبْقِ بِاَرْضِ الْعِرَاقِ کِسْریٰ یَثْبُتُ لَهٗ اَمْرٌ بَعْدَهٗ وَ قَالَ اِذَا هَلَکَ قَیْصَرٌ فَلَا قَیْصَرَ بَعْدَهٗ فَلَمْ یَکُنْ بِاَرْضِ الشَّامِ قَیْصَرٌ فَاَجَابَهُمْ عَلٰی مَا قَالُوْا.

''امام شافعی کا بیان ہے کہ قریش شام میں اکثر تجارتی حیثیت سے آمد و رفت رکھتے تھے اور ان کی معاش کا تعلق زیادہ تر اسی سے تھا اور اس غرض سے وہ عراق میں بھی آتے جاتے تھے' تو کہا جاتا ہے کہ جب قریش کے لوگ اسلام لائے تو آنحضرت ﷺ سے ان ذرائع معاش کے منقطع ہو جانے کا خوف ظاہر کیا اور شام و عراق کے بادشاہوں کی اس مخالفت کا ذکر کیا جو ان کو اہلِ اسلام کے ساتھ تھی اس پر آپ نے فرمایا کہ جب کسریٰ ہلاک ہو جائے گا تو پھر اس کے بعد دوسرا کسریٰ نہ ہوگا' چنانچہ عراق سے کسریٰ کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا اور آپ نے فرمایا کہ جب قیصر ہلاک ہو جائے گا تو پھر دوسرے قیصر کا وجود نہ ہوگا۔ چنانچہ ارض شام میں کوئی قیصر نہیں ہوا جس کی وہاں حکومت ہو' اس لحاظ سے آنحضرت ﷺ نے یہ جواب ان کے بیان کے موافق دیا ہے۔''

رفعِ شک

اس موقع پر ایک غلطی کا ذکر کرنا ضرور ہے جو عام طور پر یورپ میں پھیلی ہوئی ہے' اہلِ مغرب کا خیال ہے کہ اسلام کی اشاعت کی وجہ زیادہ تر یہ ہوئی کہ اس میں عرب کی ہر قسم کی خواہش ہائے نفسانی کے پورا کرنے کا سامان موجود تھا' عرب جنگ و جدل اور لوٹ مار کے شائق تھے' اسلام نے انہی چیزوں کو جہاد و غنیمت کی صورت میں بدل دیا' عرب سخت نفس پرست تھے' اسلام نے چار بیویاں اور لامحدود لونڈیوں کی اجازت دے دی' اہلِ عرب زاہدانہ زندگی سے بالکل آشنا نہ تھے اسلام نے بھی رہبانیت کی تحقیر کی' اب کیا چیز تھی جو اہلِ عرب کو اسلام سے روک سکتی تھی۔

لیکن یہ خیال تمام تر غلط ہے جہاد اور تعددِ ازواج اور اسریٰ کی بحث کتاب کے دوسرے حصوں میں آئے گی۔ یہاں اس قدر بیان کر دینا کافی ہے کہ جہاد یا تعددِ ازواج جو کچھ بھی تھا قدیم آزادی سے کوئی نسبت نہیں رکھتا تھا' جہاد صرف کافروں سے جائز تھا' فرض کرو ایک قبیلہ نے اسلام قبول کر لیا تو اس پر کوئی شخص ہتھیار نہیں اٹھا سکتا تھا اور اس کے مال و متاع سے تعرض نہیں کر سکتا تھا' لیکن قدیم رسم کے لحاظ سے اتحادِ مذہب کوئی روک نہ تھی' تمام قبائل بت پرستی میں متحد تھے لیکن ہمیشہ ایک دوسرے کو لوٹتے رہتے تھے۔ جہاد کے لیے اور بہت سی پابندیاں تھیں جو پہلے

بالکل نہ تھیں' جہاد میں صرف پاس پاس کے قبائل شریک ہوتے تھے' دور دور کے قبائل اس سے کیا فائدہ اٹھا سکتے تھے' جہاد میں جو لونڈیاں گرفتار ہوتی تھیں ان سے اس وقت تمتع جائز ہوتا تھا' جب ایک مہینہ کی مدت گزر جائے یا اگر حاملہ ہے تو بچہ پیدا ہو چکے لیکن اسلام سے پہلے فتح کے ساتھ ہی عورتوں کو تصرف میں لے آتے تھے اور اس پر فخر کرتے تھے' پہلے نکاح کے لیے تعداد کی کوئی قید نہ تھی' ایک ساتھ آٹھ آٹھ دس دس شادیاں کرتے تھے اب چار کی قید ہو گئی اور وہ بھی اس سخت شرط کے ساتھ کہ سب میں عدل و مساوات رہے اس لیے یہ کہنا کہ اسلام عرب کے مرغوبات کو قائم رکھتا تھا' تمام تر غلط ہے' برخلاف اس کے عرب کی ایک ایک چیز روایاتِ قدیمہ جہالت' عادات' رسوم' نفس پرستی' ہر چیز اسلام کے قبول کرنے میں مانع تھی۔

ہر قوم پر جو چیز سب سے زیادہ سختی کے ساتھ حکمران ہوتی ہے وہ قدیم عادات اور رسوم اور خیالات ہیں' آج یورپ علوم و فنون اور آزادیِ خیال میں اس حد تک ترقی کر گیا ہے لیکن جو بے ہودہ تعجب انگیز رسمیں پہلے قائم تھیں' اب بھی قائم ہیں' یا تو تعوّد کی وجہ سے ان کی برائیاں سرے سے نظر ہی نہیں آتیں یا آتی ہیں تو عادت کی حکومت کے مقابلہ میں آزادیِ خیال اور علوم و فنون سب عاجز ہو کر رہ جاتے ہیں۔

عرب میں جس قدر رسمیں قومی عادتیں تھیں اور جو ان کی ہستی کی عناصر بن گئی تھیں اسلام ایک ایک کا دشمن تھا' ثار یعنی انتقام خون عرب کے جذبات کا سب سے بڑا مظہر تھا۔ اسلام نے اس کو بالکل مٹا دیا' خاندانی فخر و مباہات ان کی قومی زندگی کی روح تھی جو فنا کر دی گئی' ابوسفیان رئیس العرب کو بلالؓ (جو حبشی غلام تھے) کے ساتھ بیٹھنا پڑا' یا تو قریش کو انصار کے مقابلہ میں تلوار اٹھانے سے بھی عار تھا یا اب قریش کی لڑکیاں غلاموں (زیدؓ و سالمؓ وغیرہ) کے گھروں میں آ گئیں' عکاظ وغیرہ کے میلے جہاں عرب سال کے سال جمع ہو کر اپنے مفاخر کی داستانیں سناتے تھے سب سرد پڑ گئے۔

اسلام ایک طرف تو عرب کے تمام مفاخر کو خاک میں ملاتا تھا۔ دوسری طرف خود اس میں ہوائے نفس اور تفریحِ طبع کا کوئی سامان نہ تھا' اسلام قبول کرنے کے ساتھ پانچ وقت کی نماز گلے کا ہار بن جاتی تھی' جو آزاد مزاجوں پر سخت گراں تھی۔

﴿وَ اِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخَاشِعِيْنَ﴾ (البقرہ:۴۵)

''اور وہ (نماز) خاشعین کے سوا اوروں پر یقیناً گراں ہے۔''

روزہ یعنی تیس دن تک متصل کھانا پینا چھوڑ دینا کوئی آسان کام نہ تھا' زکوٰۃ ایسا سخت ٹیکس تھا کہ محض اس کے ادا نہ کرنے پر حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ میں عام بغاوت ہو گئی' صرف حج ایک ایسا فرض تھا جو بظاہر زندہ دلی کا سامان رکھتا تھا' لیکن اب حج وہ جاہلیت کا حج نہیں رہا تھا' طوافِ عریاں کی اجازت نہیں رہی تھی' بڑی دلچسپی کی چیز بت تھے وہ ایک ایک کر کے حرم سے نکال دیے گئے۔ مقامِ منیٰ میں خاندانی واقعات کی رجز خوانی کا جو طریقہ چلا آتا تھا' بند کر دیا گیا۔ یہ فرائض اور اوامر کا حال تھا۔ اسی کے ساتھ محرکات اور نواہی کی وہ عالم گیری تھی کہ ان کے جاہلانہ خیال

کے مطابق زندگی نہیں بلکہ زندان بن گئی تھی' زنا حرام' شراب حرام' اطلس وحریر حرام' چنگ وعود حرام' تصویر حرام' پھر زندہ دلی اور لطفِ زندگی کے لیے باقی کیا رہ جاتا ہے۔

خوب غور سے دیکھو۔ تمام دیگر مذاہب نے عبادتوں میں بھی دلچسپی کا سامان رکھا ہے' عیسائیوں کی نماز گا کر ادا کی جاتی ہے' پارسیوں میں زمزمہ ہوتا ہے۔ ہندو بھی عبادت کے وقت بھجن گاتے ہیں اور سامنے دلفریب بت ہوتے ہیں۔ لیکن اسلام میں بظاہر دلآویزی اور دلفریبی کی ایک چیز بھی نہیں۔

مذکورہ بالا واقعات کی بنا پر یورپ کا یہ اعتراض کس قدر غلط اور تمام تر بے سروپا ہے کہ اسلام اس لئے پھیلا کہ وہ نفس پرستی کی ترغیب دلاتا اور اس کے سامان مہیا کرتا تھا۔

پھر کیا تھا؟ اس کا جواب آگے آتا ہے۔

تبلیغِ نبوی

اور اس کے اصول اور اس کی کامیابی کے اسباب

تمام گزشتہ موانع، عوائق، مشکلات اور دشواریوں کی دیواریں آہستہ آہستہ ایک ایک کر کے ٹوٹتی گئیں، اسلام پھیلا اور اس طرح پھیلا کہ آنحضرت ﷺ نے جب دنیا کو چھوڑا تو تمام عرب میں ایک بھی بت پرست نہ تھا۔ اس لیے پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کے اسباب کیا تھے؟ مخالفین کے نزدیک تو اس کا جواب صرف تلوار ہے، لیکن کارلائل کے بقول (۱) نہتے اور یکہ و تنہا اسلام کے ہاتھ میں یہ تلوار کس تلوار کے زور سے آئی؟ لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ تلوار صرف اسلام کی تبلیغی دعوت تھی، اس سے پہلے کہ ہم آگے بڑھیں، اسلام کی اس طاقت کی تشریح کر دینا مناسب ہے۔

فریضۂ تبلیغ

''تبلیغ'' کے لفظی معنی پیغام پہنچانے کے ہیں اور اصطلاح میں اس کے معنی یہ ہیں کہ جس کو ہم اچھا سمجھتے ہیں اس کی اچھائی اور خوبی کو دوسرے لوگوں اور دوسری قوموں اور ملکوں تک پہنچائیں اور ان کو اس کے قبول کرنے کی دعوت دیں، قرآن پاک میں تبلیغ کے ہم معنی چند اور الفاظ بھی ہیں جن میں سے ایک لفظ ''انذار'' ہے جس کے معنی ہشیار اور آگاہ کرنے کے ہیں دوسرا لفظ دعوۃ ہے جس کے معنی بلانے اور پکارنے کے ہیں اور تیسرا لفظ تذکیر ہے جس کے معنی یاد دلانے اور نصیحت کرنے کے ہیں، بعثتِ نبوی کے وقت دنیا میں دو قسم کے مذہب تھے، دو ایسے جو تبلیغی تھے یعنی عیسائیت اور بدھ مت، باقی زیادہ تر ایسے ہی تھے، جو تبلیغی نہیں، جیسے یہودیت، مجوسیت، ہندومت۔ جو دو تبلیغی سمجھے جاتے تھے، ان کی نسبت یہ فیصلہ مشکوک ہے کہ آیا یہ تبلیغ ان کے اصل مذہب کا حکم تھا یا بعد کے پیروؤں کا عمل ہے؟ کیونکہ ان کے مذہبی صحیفوں میں اس تعمیمِ دعوت کی کھلی ہوئی ہدایتیں اور ان کے بانیوں کی زندگی میں اس کی عملی مثالیں نہیں ملتیں، تمام مذاہب میں صرف اسلام ایک ایسا مذہب ہے جس نے تبلیغ کی اہمیت کو سمجھا اور اس کے متعلق اپنے صحیفہ میں کھلے احکام دیے اور اس کے داعی و حامل علیہ السلام نے اپنی زندگی میں اس کی عملی مثالیں پیش کیں۔

جن مذہبوں نے تبلیغ کو اپنا اصول نہیں ٹھہرایا، ان کے ایسا کرنے کی اصلی وجہیں دو ہیں، ایک یہ کہ ان کے

---

(۱) ہیرو اینڈ ہیرو ورشپ (محمد ﷺ)

نزدیک اس حق کے قبول کرنے کی عزت کا استحقاق پیدائش سے حاصل ہوتا ہے' کوشش سے نہیں' دوسرا سبب یہ ہے کہ جو حق ان کے پاس ہے وہ ان کے نزدیک اتنا پاک ومقدس ہے کہ ان کی خاص پاک و بزرگ ومحترم نسل وقوم کے علاوہ دوسری تمام قومیں جو ناپاک ونجس وکمتر ہیں ان تک اپنے پاک مذہب کو لے جانا خود اس مذہب کی پاکی کو صدمہ پہنچانا ہے یہی سبب ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے ایک دفعہ جب ایک کنعانی (متی ۱۵) یا یونانی (مرقس ۷) عورت نے ان سے برکت چاہی تو فرمایا۔ میں اسرائیل کے گھر کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے سوا اور کسی کے پاس نہیں بھیجا گیا (متی ۱۵۔۲۵) پھر فرمایا ''مناسب نہیں کہ لڑکوں کی روٹی (بنی اسرائیل کا مذہب) کتوں (غیر اسرائیلی قوموں) کو پھینک دیں۔'' (۲۷) پھر فرمایا۔ ''غیر قوموں کی طرف نہ جانا اور سامریوں کے کسی شہر میں داخل نہ ہونا بلکہ پہلے اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے پاس جاؤ اور چلتے ہوئے منادی کرو۔'' (متی ۱۰۔۶) پھر ارشاد فرمایا۔ ''وہ چیز جو پاک ہے کتوں کو مت دو' اور اپنے موتی سوٴروں کے آگے نہ پھینکو۔'' (متی ۷۔۶)

ہندوؤں نے اپنے مذہب کو تمام قوموں سے جو چھپا کر رکھا اس کا بھی یہی سبب تھا کہ وہ اپنا پاک دھرم ملیچھوں اور اچھوتوں کو سکھا کر اس کو ناپاک نہیں کرنا چاہتے تھے' یہودیوں کا بھی یہی خیال تھا کہ نامختون اس نعمت کے اہل نہیں۔

تبلیغ کی اہمیت

آنحضرت ﷺ نے دنیا کی تمام قوموں کو برابری اور مساوات کی ایک ہی سطح پر لا کھڑا کیا اور خدا کے پیغام کی منادی کا سب کو یکساں مستحق قرار دیا' اس لیے اپنی تبلیغ کے لئے قریش وغیر قریش' حجاز ویمن' عرب وعجم' ہند وروم کی تخصیص نہیں فرمائی' بلکہ دنیا کی ہر قوم' ہر زبان اور ہر گوشہ میں صدائے الٰہی کا پہنچانا فرض قرار دیا۔ ابتدائی وحی میں انجانوں کو ہشیار اور بے خبروں کو آگاہ کرنا سب سے پہلا حکم تھا ﴿یٰٓاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَاَنْذِرْ﴾ (المدثر) ''اے چادر پوش! اٹھ کھڑا ہو اور ہشیار و آگاہ کر۔'' پھر بار بار حکم ہوتا رہا کہ ﴿بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ﴾ ''جو تیری طرف اتارا گیا اس کو اوروں تک پہنچا۔'' ﴿فَادْعُ وَاسْتَقِمْ کَمَآ اُمِرْتَ﴾ (الشوریٰ) ''لوگوں کو دعوت دے اور مضبوط قائم رہ جس طرح تجھے حکم دیا گیا۔'' ﴿فَذَکِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّکْرٰی﴾ (اعلیٰ) ''لوگوں کو نصیحت کر اگر نصیحت فائدہ مند ہو۔'' ﴿وَ ذَ کِّرْ فَاِنَّ الذِّکْرٰی تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِیْنَ﴾ (ذاریات) ''اور نصیحت کر کہ نصیحت اہل ایمان کو فائدہ پہنچاتی ہے۔'' ﴿فَذَکِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ یَّخَافُ وَعِیْدِ﴾ (قٓ) ''قرآن سے سمجھاؤ اس کو جو میری دھمکی سے ڈرتا ہو۔'' اور ان کے علاوہ بیسیوں آیتوں میں اس فرض کی اہمیت ظاہر کی گئی' حضرت علیؓ سے آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''اے علی! تمہاری کوشش سے ایک آدمی کا بھی دینِ حق کو قبول کر لینا دنیا کی بڑی سے بڑی دولت سے بھی بڑھ کر ہے۔ (۱)

---

(۱) صحیح مسلم باب خیبر۔

اس سے زیادہ یہ کہ اسلام نے اپنے ہر پیرو پر خیر کی دعوت' امر بالمعروف' نہی عن المنکر اور تواصی بالحق یعنی باہم ایک دوسرے کو سچائی کی نصیحت کرنا' ضروری قرار دیا ہے اور مسلمانوں کا یہ فرض بتایا ہے کہ وہ اپنے ساتھ دوسروں کو بھی تاریکی سے نکالنے کی جدوجہد کریں۔

آنحضرت ﷺ کو حکم ہوتا ہے کہ ہر قسم کے خطرات سے بے پرواہو کر پیغامِ الٰہی لوگوں تک پہنچایئے' اور اگر ایسا نہ کیا تو رسالت کا فرض انجام نہیں دیا۔

﴿یٰۤاَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ وَ اِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ وَ اللّٰهُ یَعْصِمُکَ مِنَ النَّاسِ﴾ (مائدہ:٦٧)

''اے خدا کے پیغام پہنچانے والے تیرے پروردگار کے پاس سے جو کچھ تیری طرف اترا ہے اس کو پہنچا دے اگر تو نے ایسا نہیں کیا تو تو نے خدا کا پیغام نہیں پہنچایا' اور تجھ کو خدا لوگوں سے بچالے گا۔''

اس کی وسعت

اس کے بعد اس فریضۂ تبلیغ کی وسعت کی بحث ہے' پیغامِ الٰہی سچائی کا ایک بہتا چشمہ ہے جو آہستہ آہستہ قدرتی رفتار سے پہلے اپنی قریب کی زمین کو' پھر آگے کو' پھر اس سے آگے کو سیراب کرتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ زمین کے کناروں تک پہنچ جاتا ہے' آنحضرت ﷺ کو تبلیغ کا حکم اسی تدریج کے ساتھ ہوا' سب سے پہلے خاص اپنے گھر اور خاندان کے لوگوں کو سمجھانے کا حکم ہوا:

﴿وَ اَنْذِرْ عَشِیْرَتَکَ الْاَقْرَبِیْنَ﴾ (الشعراء:٢١٤)

''اور اپنے سب سے نزدیک کے اہل خاندان کو آگاہ وہشیار کر۔''

اس کے بعد یہ دائرہ بڑھ کر شہر مکہ اور اس کے اطراف کی آبادیوں تک پہنچتا ہے۔

﴿لِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰی وَ مَنْ حَوْلَهَا﴾ (الشوریٰ:٧)

''تاکہ تو مکہ اور جو اس کے آس پاس (کے بدوی) ہیں ان کو آگاہ وہوشیار کرے۔''

اب تبلیغ کا دائرہ اس سے بھی آگے بڑھتا ہے' اور ہر زندہ روح یعنی سمجھ بوجھ احساس وعقل وغیرہ حقیقی زندگی کی علامتیں جس میں موجود ہوں اس کی مخاطب ہوتی ہے:

﴿اِنْ هُوَ اِلَّا ذِکْرٌ وَّ قُرْاٰنٌ مُّبِیْنٌ ○ لِّیُنْذِرَ مَنْ کَانَ حَیًّا﴾ (یٰسٓ:٥)

''یہ قرآن تو صرف ایک نصیحت اور صاف صاف خدا کا کلام ہے تاکہ وہ اس کو ہشیار کرے جو زندہ ہے۔''

پھر جس حد تک بھی اس کی آواز پہنچ جائے سب سے اس کا خطاب ہے۔

﴿لِاُنْذِرَکُمْ بِهٖ وَ مَنْۢ بَلَغَ﴾ (الانعام:١٩)

''تا کہ میں تمہیں' آ گاہ وہشیار کروں اوران کو جن تک میری یہ آ گاہ وہشیار کرنے والی آواز پہنچے۔''

پھر تمام انسانوں تک اس کی وسعت ہوتی ہے۔

﴿هٰذَا بَلٰغٌ لِّلنَّاسِ﴾ (ابراہیم:۵۲)

''یہ قرآن تمام انسانوں کے لیے پیغام ہے۔''

آنحضرت ﷺ کو خطاب ہوا:

﴿وَ مَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا کَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّ نَذِیْرًا﴾ (سبا:۲۸)

''اور ہم نے تم کو انسانوں کے لیے خوش خبری سنانے والا اور ہشیار کرنے والا بنا کر بھیجا۔''

آپؐ کو حکم ہوا کہ تمام انسانوں کو خطاب کر کے یہ اعلان فرما دیں۔

﴿قُلْ یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعًا﴾ (الاعراف:۱۵۸)

''اے لوگو! میں تم سب کی طرف خدا کا پیغام دے کر بھیجا گیا ہوں۔''

اس سے زیادہ یہ ہے کہ تمام کائنات آپؐ کی دعوت وتبلیغ کے دائرہ میں داخل ہے' فرمایا۔

﴿تَبٰرَکَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِهٖ لِیَکُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا ۝ اَلَّذِیْ لَهٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ﴾ (الفرقان:۱)

''برکت والا ہے وہ خدا جس نے حق اور باطل میں امتیاز بتانے والی کتاب اپنے بندہ (محمد) پر نازل کی تا کہ وہ دنیا جہان کے لیے ہشیار وآ گاہ کرنے والا ہو۔ وہ خدا جس کی ملکیت میں آسمانوں اور زمین کی سلطنت ہے۔''

اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اس تبلیغ ودعوت کی وسعت اور اس میں کامیابی کی خوش خبری عین اسی وقت دے دی گئی تھی جب مسلمانوں کے دلوں میں ایک قسم کی مایوسی چھائی ہوئی تھی' چنانچہ آیت ذیل نازل ہوئی:

﴿اِنْ هُوَ اِلَّا ذِکْرٌ لِّلْعٰلَمِیْنَ ۝ وَلَتَعْلَمُنَّ نَبَاَهٗ بَعْدَ حِیْنٍ﴾ (صٓ:۸۷'۸۸)

''یہ قرآن تو دنیا کے لیے نصیحت ہے' اور تم ایک زمانہ کے بعد اس کی خبر جانو گے۔''

انبیا اور بانیانِ مذاہب کے عملی نمونوں اور مثالوں کی تلاش اور جستجو کرو تو یہ حقیقت اور زیادہ واضح ہو جائے گی کہ اسلام کے سوا اور جو مذہب تبلیغی سمجھے جاتے ہیں۔'' وہ حقیقت میں تبلیغی نہیں' خود بودھ نے ہندوؤں کے علاوہ کسی کو اپنی نجات کا راستہ نہیں بتایا اور نہ اس کا حکم دیا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اسرائیل کے علاوہ کسی دوسری قوم کو نہ اپنا وعظ سنایا اور نہ ان کو اپنا مخاطب بنایا اور نہ ان میں سے کسی کو اپنا شاگرد کیا نہ کسی دوسری قوم میں اپنی زندگی میں اپنا واعظ اور مبلغ بھیجا حالانکہ فلسطین میں رومیوں اور یونانیوں کی بڑی جماعت موجود تھی۔

آنحضرت ﷺ نے مکہ میں رہ کر اس کے آس پاس کے لوگوں کو بیدار وہشیار کیا' حج کے موسم میں عرب کے ایک ایک قبیلہ کے پاس جا کر حق کا پیغام پہنچایا اور اسی زمانہ میں یمن اور حبشہ تک آپؐ کی آواز پہنچ گئی اور لوگ

تلاشِ حق کے لیے آپؐ کے پاس آئے' مدینہ منورہ آئے تو قریش کو برسوں تک دوسرے قبیلوں تک اسلام کے پہنچنے میں سدِ راہ بنے رہے' پھر بھی مبلغ اور داعی بھیج بھیج کر قبیلوں تک آواز پہنچائی گئی اور بالآخر قریش کے خلاف اس لیے تلوار اٹھائی گئی کہ اسلام کو تبلیغ کی پرامن آزادی ملے' چھ برس کے جنگ وجدل کے بعد حدیبیہ میں قریش نے اسلام کے اس مطالبہ کو تسلیم کیا اور تبلیغ کی آزادی عطا کی' قرآن نے اسلام کی اس روحانی فتح' کو ''فتح مبین'' قرار دیا اور ﴿اِنَّا فَتَحْنَا لَکَ فَتْحًا مُّبِیْنًا﴾ نازل ہوئی (۱) اس کے بعد ہی عرب اور بیرون عرب میں اسلام کے واعظ' قاصد اور مبلغ بھیجے گئے اور دنیا کے امرا اور سلاطین کو دعوت اسلام کے خطوط لکھے گئے اور عربوں کے علاوہ دیلم' ایران' حبش اور روم کے طالبین اسلام آئے اور فیضانِ حق سے سیراب ہوئے' مشرکینِ عرب' یہود' عیسائی اور پارسی سب نے آپؐ کے زمانہ ہی میں آپؐ کے نور سے روشنی حاصل کی۔

لیکن نفسِ تبلیغ کی فرضیت واہمیت سے بھی زیادہ اہم چیز تبلیغ کے اصول ہیں۔

تبلیغ کے اصول

یہ نکتہ کہ کس طرح لوگوں کو کسی سچائی کے قبول کی دعوت دینی چاہیے' دنیا میں پہلی دفعہ محمد رسول اللہ ﷺ کی زبانِ وحی ترجمان سے ادا ہوا' وہ مذہب بھی جو تبلیغی ہونے کا دعویٰ رکھتے ہیں' یہ نہیں کہہ سکتے کہ ان کے صحیفوں نے ان کے لیے تبلیغ کے اہم اصول کی تشریح کی ہے لیکن صحیفۂ محمدی نے نہایت اختصار لیکن پوری تشریح کے ساتھ اپنے پیروؤں کو یہ بتایا ہے کہ پیغامِ الٰہی کو کس طرح لوگوں تک پہنچایا جائے اور ان کو قبولِ حق کی دعوت کس طرح دی جائے:

﴿اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ وَ الْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَ جَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ﴾ (النحل:۱۲۵)

''اپنے پروردگار کی راہ کی طرف لوگوں کو دانائی اور عمدہ نصیحت کے ذریعہ سے بلا اور ان سے مناظرہ خوش آئند طریق سے کر۔''

تبلیغ ودعوت کے یہ تین اصول مسلمانوں کو سکھائے گئے۔ عقل وحکمت' موعظۂ حسنہ اور مناظرہ بطریقِ احسن۔ مسلمان متکلموں نے بیان کیا ہے کہ تبلیغ ودعوت کے یہ تینوں اصول وہی ہیں جو منطقی استدلال میں عموماً کام میں لائے جاتے ہیں یعنی ایک تو برہانیات جن میں یقینی مقدمات کے ذریعہ سے دعویٰ کے ثبوت پر دلیلیں لائی جاتی ہیں' دوسرے خطابیات جن میں مؤثر اور دلپذیر اقوال سے مقصود کو ثابت کیا جاتا ہے اور تیسرے جدلیات جن میں مقبولِ عام اقوال اور فریقین کے مسلم مقدمات سے استدلال کیا جاتا ہے' قرآنِ پاک نے پہلے طریقہ کو حکمت' دوسرے کو موعظتِ حسنہ اور تیسرے کو جدال سے تعبیر کیا ہے اور استدلال کے یہی وہ تین طریقے ہیں جن سے ایک

(۱) صحیح مسلم باب صلح الحدیبیہ۔

شخص دوسرے کے سامنے اپنے مدعا کو ثابت کرتا ہے۔

خیر یہ تو فلسفیانہ نکتہ آفرینی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ جب ہم کسی کے سامنے کوئی بات پیش کر کے اس کے قبول کی دعوت دیتے ہیں تو عموماً تین طریقے برتتے ہیں' یا تو اس بات کے ثبوت اور تائید میں کچھ دل نشین دلیلیں پیش کرتے ہیں یا اس کو مخلصانہ نصیحت کرتے ہیں اور مؤثر انداز سے اس کو نیک و بد اور نشیب و فراز سے آگاہ کرتے ہیں یا یہ کرتے ہیں کہ اس کی دلیلیوں کو مناسب طریقہ سے رد کر کے اس کی غلطی کو اس پر واضح کرتے ہیں' پہلے طریقہ کا نام حکمت دوسرے کا نام موعظۂ حسنہ اور تیسرے کا نام جدال بطریقِ احسن ہے' تبلیغ و دعوت کے یہی تین طریقے اسلام نے بتائے ہیں۔

قول لَیِّن

حکیمانہ استدلال ہو' یا وعظ و نصیحت ہو یا جدل و مناظرہ ہو' ضرورت یہ ہے کہ داعی نرمی اور خیر خواہی سے باتیں کرے کہ سختی اور شدت کا طریق دوسرے کے دل میں نفرت اور عداوت کے جذبات پیدا کرتا ہے اور کیسی ہی اچھی اور سچی بات ہو لیکن اس قسم کے جذبات اس کے قبول کی استعداد اس سے سلب کر لینے اور سننے والے میں اپنی غلطی پر ضد اور ہٹ پیدا کر دیتے ہیں جس سے دعوت کا فائدہ اور نصیحت کا اثر باطل ہو جاتا ہے' اسی لئے قرآن پاک نے اپنے پیغمبروں کو اپنے مخالف سے مخالف دشمن سے بھی نرمی سے باتیں کرنے کی تاکید کی ہے' حضرت موسیٰ علیہ السلام و حضرت ہارون علیہما السلام کو فرعون جیسے سرکش کے سامنے پیغامِ ربانی لے کر جانے کی ہدایت ہوتی ہے تو ساتھ ساتھ یہ ارشاد بھی ہوتا ہے:

﴿اِذْهَبَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ○ فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى ○﴾ (طٰہٰ: ۴۳' ۴۴)

''تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ' اس نے سرکشی کی ہے تو اس سے نرم گفتگو کرنا' شاید وہ نصیحت قبول کرے یا (خدا سے) ڈرے۔''

دعوت و تبلیغ میں رفق و نرمی اور لطف و تحمل کی اس سے بہتر مثال نہیں ہو سکتی کہ نہ کوئی داعی اور واعظ پیغمبروں سے بہتر ہو سکتا ہے' اور نہ فرعون سے بڑھ کر کوئی مجرم ہو سکتا ہے' پھر ایسے مجرم کے سامنے اس لطف و نرمی سے وعظ و نصیحت کی تعلیم جب پیغمبروں کو ہوتی ہے تو عام داعیوں' مبلغوں اور واعظوں کو عام مخالفوں' مجرموں اور سرکشوں کے ساتھ بدرجہا رفق و ملاطفت سے اپنا فرض ادا کرنا چاہیے۔

اعراض اور قولِ بلیغ

آنحضرت ﷺ کو ان منافقوں کے بارہ میں جو آپؐ کی نافرمانی کے جرم کے مرتکب ہوئے تھے' یہ حکم ہوتا ہے:

﴿فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَ عِظْهُمْ وَ قُلْ لَّهُمْ فِیْٓ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًاۢ بَلِیْغًا﴾ (النساء:۶۳)

''تو ان سے درگزر کر اور ان کو نصیحت کر اور ان سے ایسی بات کہہ جو ان کے دلوں میں اثر کرے۔''

اس تعلیم میں تین ہدایتیں ہیں' اول یہ کہ دعوت و تبلیغ میں مخالفت کی بد سلیقگی' بد تہذیبی اور درشتی سے درگزر اور ان کو برداشت کرنا چاہیے' دوسرے یہ کہ ان کو نصیحت کرنا اور سمجھانا چاہیے اور تیسرے یہ کہ گفتگو کا وہ مؤثر طرز و انداز اختیار کرنا چاہیے جو دل میں گھر کرے۔

تیسیر و تبشیر

ان ہی ربانی ہدایتوں کی تعمیل میں جب آنحضرت ﷺ نے حضرت معاذ بن جبلؓ اور ابو موسیٰ علیہ السلام اشعریؓ کو یمن میں اسلام کی دعوت و تبلیغ کے لیے متعین فرمایا تو رخصت کرتے وقت یہ نصیحت فرمائی ﴿یَسِّرَا وَ لَا تُعَسِّرَا وَ بَشِّرَا وَ لَا تُنَفِّرَا﴾ دینِ الٰہی کو آسان کر کے پیش کرنا سخت بنا کر نہیں' لوگوں کو خوش خبری سنانا' نفرت نہ دلانا' یہ وہ تبلیغی اصول ہیں جو ایک داعی و مبلغ کی کامیابی کی جان ہیں' آنحضرت ﷺ نے صحابہؓ کے سامنے اور صحابہؓ نے عام مسلمانوں کے سامنے اسی اصول کے مطابق دینِ الٰہی کو پیش کیا اور کامیابی حاصل کی' دین کی جائز آسانی اور سہولت کو پیش کرنا اور اس کو سخت درشت اور مشکل نہ بنانا ہی اس کے قبول عام کی راہ ہے' ساتھ ہی اللہ تعالیٰ کے لطف و شفقت' رحم و کرم اور مہر و محبت کی دل نواز صداؤں سے دلوں کو پر امید اور مسرور بنانا اس سے بہتر ہے کہ بات بات پر خدا کی قہاری و جباری اور ہیبت و جلال کا ذکر کر کے دلوں کو خوف زدہ اور مایوس بنایا جائے۔

تدریج

تبلیغ کا ایک اور اصول آنحضرت ﷺ نے یہ تعلیم فرمایا کہ کسی نئی قوم کو دعوت دیتے وقت شریعت کے تمام احکام کا بوجھ ایک ہی دفعہ اس کی گردن پر نہ ڈالا جائے بلکہ رفتہ رفتہ وہ اس کے سامنے پیش کیے جائیں پہلے توحید اور رسالت کو پیش کرنا چاہیے' اس کے بعد عبادات کو' عبادات میں بھی اہم' پھر اہم کے اصول کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔ عبادات میں سب سے اہم نماز ہے پھر زکوٰۃ ہے' پھر دوسرے فرائض ہیں' حضرت معاذ بن جبلؓ کو یمن بھیجتے وقت آپؐ نے فرمایا تم یہودیوں اور عیسائیوں کی ایک قوم کے پاس جاؤ گے' تو ان کو پہلے اس کی دعوت دینا کہ خدا کے سوا کوئی خدا نہیں اور محمد اس کا رسول ہے' جب وہ یہ مان لیں تو ان کو بتاؤ کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر دن رات میں پانچ وقت کی نمازیں فرض کی ہیں اور جب وہ یہ بھی مان لیں تو ان کو بتاؤ کہ خدا نے ان پر صدقہ فرض کیا ہے' یہ صدقہ ان کے دولت مندوں سے لے کر ان کے غریبوں کو دے دیا جائے' جب وہ اس کو تسلیم کر لیں تو دیکھو صدقہ میں چن چن کر ان کے بڑھیا مال کو نہ لینا اور ہاں مظلوم کی بد دعا سے ڈرتے رہنا کہ اس کے اور خدا کے درمیان کوئی پردہ نہیں۔ (۱)

(۱) صحیح بخاری بعث معاذ الی الیمن جلد دوم صفحہ ۶۲۲۔

تالیفِ قلب

تبلیغ و دعوت کے سلسلہ میں اسلام نے ایک اور طریقہ بھی پیش کیا ہے جس کو تالیفِ قلب کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے ﴿وَ الْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ﴾ (التوبہ:۶۰) اس کے لفظی معنی ہیں ''دلوں کو ملانا'' اور اس سے مقصود اس شخص کے ساتھ جس کو اسلام کی طرف مائل کرنا ہو۔ لطف و محبت' امداد و اعانت اور غم خواری و ہمدردی کرنا ہے' کیونکہ انسان طبعًا شریفانہ جذبات کا ممنون ہوتا ہے اور یہ ممنونیت عناد اور ضد کے خیالات کو دور کر کے قبولِ حق کی صلاحیت پیدا کر دیتی ہے۔ آنحضرت ﷺ نے بہت سے لوگوں کو اپنے اس اعجاز سے اسلام کا حلقہ بگوش بنا لیا تھا چنانچہ مکہ کے بعض رئیس اسی جذبہ سے متاثر ہو کر اسلام لائے تھے آنحضرت ﷺ نے حنین کی غنیمت کا سارا مال ان ہی میں تقسیم کر دیا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ پھر حق کے خلاف ان کی گردنیں نہ اٹھ سکیں' (۱) صفوانؓ جو اسلام کے سخت مخالف اور آنحضرت ﷺ سے نہایت بغض رکھتے تھے' وہ کہتے ہیں کہ مجھ کو آنحضرت ﷺ نے دیا' جتنا دیا۔ اور مجھے ان سے سخت بغض تھا' لیکن آپ کے ان احسانات نے مجھے ایسا متاثر کیا کہ اب میری نگاہ میں ان سے زیادہ کوئی پیارا نہیں۔ (۲) ایک دفعہ ایک بدو نے آ کر کہا کہ ان دونوں پہاڑوں کے درمیان بکریوں کے جتنے ریوڑ ہیں مجھ کو عنایت کیجیے' آپؐ نے اس کو وہ سب دے دیئے' یہ فیاضی دیکھ کر اس پر ایسا اثر پڑا کہ اس نے اپنے پورے قبیلہ سے جا کر کہا' بھائیو! اسلام قبول کرو' محمد اتنا دیتے ہیں کہ ان کو اپنے فقر و افلاس کا ڈر ہی نہیں رہتا۔ (۳)

ایک یہودی کا لڑکا آنحضرت ﷺ کی خدمت کرتا تھا اور بیمار پڑا تو آنحضرت ﷺ اس کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے اور جا کر اس کے سرہانے بیٹھے۔ پھر فرمایا کہ لڑکے اسلام قبول کر لے' اس نے مستفسرانہ نگاہ سے باپ کی طرف دیکھا' اس نے کہا ابوالقاسم (آپؐ کی کنیت) کی بات مان لے' چنانچہ وہ مسلمان ہو گیا۔ اور جب آنحضرت ﷺ وہاں سے اٹھے تو زبان مبارک پر یہ فقرہ تھا کہ اس خدا کی حمد جس نے اس کو دوزخ سے بچا لیا۔ (۴)

دعوتِ عقل

اسلام نے تبلیغ و دعوت کے جو اصول بتائے ہیں ان کا لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ وہ ایک استدلالی اور عقلی مذہب ہو کہ بغیر اس کے حکمت و دانش مندی' وعظ و نصیحت اور جدل و مناظرہ کی بنیاد قائم نہیں رہ سکتی' اس بنا پر مذاہبِ عالم کی تاریخ میں نبوتِ محمدیہ سب سے پہلی ربانی آواز ہے جس نے حاکمانہ قانون (توراۃ) یا صرف

(۱) صحیح بخاری باب مذکور جلد دوم ص ۱۶۳۔
(۲) صحیح مسلم باب جودہ ﷺ ج ۲ ص ۲۹۰ مصر۔
(۳) ایضاً۔
(۴) صحیح بخاری کتاب الجنائز۔

لفظوں کے الٹ پھیر (انجیل) یا راجاؤں کے احکام (وید) کے بجائے عقلِ انسانی کو مخاطب کیا' غور وفکر کی دعوت دی' فہم وتدبر کا مطالبہ کیا' اس نے اپنی ہر تعلیم کے ساتھ اپنی تعلیم کی خوبی ومصلحت وحکمت خود ظاہر کی اور بار بار مخالفوں کو آیاتِ الٰہی میں غور وفکر کی ہدایت کی فرمایا:

﴿قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِّنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوْهُ لَنَا اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَخْرُصُوْنَ○ قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ﴾ (الانعام:۱۴۹'۱۵۰)

''کہہ اے پیغمبر کہ تمہارے پاس کوئی (یقینی) علم ہے کہ اس کو تم ہمارے لیے ظاہر کرو' تم گمان ہی کے پیچھے چلتے ہو اور تم تو اٹکل ہی کرتے ہو کہہ کہ اللہ ہی کی ہے' پہنچتی ہوئی دلیل۔''

نیز ارشاد ہوا:

﴿لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْۢ بَيِّنَةٍ وَّ يَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْۢ بَيِّنَةٍ وَ اِنَّ اللّٰهَ لَسَمِيْعٌ عَلِيْمٌ﴾ (الانفال:۴۲)

''تاکہ جو ہلاک ہو وہ دلیل سے ہلاک ہو' اور جو جیتا رہے وہ دلیل سے جیے اور اللہ ہی سننے والا' جاننے والا ہے۔''

غفلت شعار کافروں کی نسبت فرمایا:

﴿وَ كَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَ هُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ﴾ (یوسف:۱۰۵)

''اور آسمانوں میں اور زمین میں (خدا کی توحید کی) کتنی نشانیاں دلیلیں ہیں جن پر وہ گزر جاتے ہیں اور ان پر غور نہیں کرتے۔''

غور وفکر کرنے والے اہل ایمان کی تعریف میں فرمایا:

﴿اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَ النَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ○ الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَ يَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا﴾ (آل عمران:۱۹۰'۱۹۱)

''بے شبہ آسمانوں اور زمین کی بناوٹ اور رات اور دن کے الٹ پھیر میں عقل والوں کے لیے نشانیاں ہیں جو اللہ کو کھڑے بیٹھے اور اپنی کروٹوں میں یاد کرتے ہیں' آسمانوں اور زمین کی بناوٹ میں غور کرتے ہیں (اور کہتے ہیں) کہ اے ہمارے پروردگار تو نے یہ عالم' بیکار نہیں بنایا۔''

اس سے زیادہ عقلی اور عملی استدلال کی دعوت اور کیا ہو گی مگر بہر حال یہ خارجی استدلال تھا' اندرونی استدلال کی بھی اس نے دعوت دی۔ فرمایا:

﴿وَ فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ﴾ (الذاریات:۲۱)

''اور خود تمہارے اندر نشانیاں ہیں تم دیکھتے نہیں۔''

صحیفۂ محمدی کی نسبت ہر جگہ یہ الفاظ فرمائے:

﴿تَبْصِرَةً وَّ ذِكْرٰى لِكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيْبٍ﴾ (قٓ:۸)

''یہ بصیرت اور نصیحت ہے ہر رجوع ہونے والے بندہ کے لیے۔''

﴿هٰذَا بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ﴾ (الاعراف:۲۰)

''یہ تمہارے پروردگار کی طرف سے بصیرتیں ہیں۔''

﴿هٰذَا بَصَائِرُ لِلنَّاسِ﴾ (الجاثیہ:۲۰)

''یہ لوگوں کے لیے بصیرتیں ہیں۔''

﴿اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ﴾ (النساء:۸۸)

''کیا یہ قرآن میں تدبر نہیں کرتے۔''

﴿اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا﴾ (محمد:۲۴)

''کیا یہ قرآن غور نہیں کرتے یا دلوں پر ان کے تالے ہیں۔''

﴿وَ الْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ﴾ (یٰسٓ:۲)

''حکمت والے قرآن کی قسم۔''

﴿تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ﴾ (یونس ولقمان:۱)

''یہ حکمت والی کتاب کی آیتیں ہیں۔''

نہ صرف اسی قدر بلکہ خدا کا وجود' توحید' رسالت' قیامت' جزاء وسزا' عبادت' نماز' روزہ' حج' زکوٰۃ' اخلاق وغیرہ ہر تعلیم کی تلقین کرتے وقت اس نے اس کی صداقت کی عقلی دلیلیں پیش کی ہیں اور ہر مسئلہ کی مصلحتیں اور حکمتیں علی الاعلان ظاہر کی ہیں' آئندہ صفحوں میں ہر قدم پر اس کی دلیلیں آپ کو ملیں گی۔

مذہب میں زبردستی نہیں

یہ وہ حقیقت ہے جس کی صدا آج ہر در و دیوار سے آتی ہے لیکن شاید لوگوں کو معلوم نہیں کہ دنیا میں اس حقیقت کا اعلان سب سے پہلے محمد رسول اللہ ﷺ ہی کی زبانِ مبارک سے ہوا' اور ظاہر ہے کہ جو مذہب اپنی اشاعت کے لیے صرف دعوت وتبلیغ کا راستہ رکھتا ہو' جس نے اس کے اصول بتائے ہوں' جس نے عقل وبصیرت اور فہم وتدبر کے ہر معاملہ میں لوگوں سے مطالبہ کیا ہو' ہر قدم پر عقلی استعداد اور مصلحت وحکمت کا اظہار کیا ہو وہ کیونکر جبر واکراہ اور زور وزبردستی کے طریقہ کو اختیار کر سکتا تھا۔ اسلام نے نہ صرف یہ کہ مذہب کی جبری اشاعت کو ناپسند کیا بلکہ اس کا فلسفہ بتایا کہ مذہب زبردستی کی چیز نہیں' اسلام میں مذہب کا اولین جزو ایمان ہے' ایمان یقین کا نام

ہے اور دنیا کی کوئی طاقت کسی کے دل میں یقین کا ایک ذرہ بھی بزور پیدا نہیں کر سکتی بلکہ تیز سے تیز تلوار کی نوک بھی کسی لوحِ دل پر یقین کا کوئی حرف نقش نہیں کر سکتی فرمایا:

﴿لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْتَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ﴾ (البقرہ:۲۵۶)

''دین میں کوئی زبردستی نہیں' ہدایت' گمراہی سے الگ ہو چکی۔''

یہ وہ عظیم الشان حقیقت ہے جس کی تلقین انسانوں کو صرف محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ سے ہوئی۔ دوسری جگہ فرمایا:

﴿وَ قُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّ مَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ﴾ (الکہف:۲۹)

''اور کہہ دے کہ حق تمہارے پروردگار کی طرف سے ہے' تو جو چاہے قبول کرے اور جو چاہے انکار کرے۔''

ایمان اور کفران دو میں سے کسی ایک کو اختیار کرنے پر کوئی زبردستی نہیں ہے عقل و بصیرت والے اسے خود قبول کریں گے اور نافہم اس سے محروم رہیں گے اس لیے بار بار یہ واضح کیا گیا کہ رسول کا کام لوگوں تک خدا کا پیغام پہنچا دینا ہے' زبردستی منوانا نہیں۔

﴿اِنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ﴾ (المائدۃ:۹۲)

''ہمارے رسول پر تو یہی فرض ہے کہ وہ صاف صاف ہمارا پیغام پہنچا دے۔''

آنحضرت ﷺ کو جو قریش کے اعراض و مخالفت سے حد درجہ غمگین تھے' تسکین دی گئی:

﴿اِنْ عَلَيْكَ اِلَّا الْبَلَاغُ﴾ (الشوریٰ:۴۸)

''اے پیغمبر تیرا فرض صرف پیام پہنچا دینا ہے۔''

﴿اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَكِّرٌ ○ لَّسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ﴾ (الغاشیۃ:۲۱'۲۲)

''اے پیغمبر! تو تو صرف نصیحت کرنے والا ہے' تو ان پر داروغہ بنا کر نہیں بھیجا گیا۔''

﴿فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا اِنْ عَلَيْكَ اِلَّا الْبَلٰغُ﴾ (الشوریٰ:۴۸)

''پھر اگر وہ اسلام کی دعوت سے انکار کریں تو اے پیغمبر ہم نے تجھ کو ان پر داروغہ بنا کر نہیں بھیجا تیرے ذمہ صرف پیغام کا پہنچا دینا ہے۔''

کسی دین کو زبردستی پھیلانا اسلام کی نگاہ میں ایک ایسا فعل ہے جس سے رسول کی شان کو اس نے بہت بلند سمجھا ہے فرمایا۔

﴿وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ﴾ (یونس:۹۹)

''اگر تیرا پروردگار چاہتا کہ لوگوں کو زبردستی مومن بنا دے تو زمین سے سب لوگ ایمان لے آتے تو کیا اے پیغمبر تو

لوگوں پر زبردستی کرے گا کہ وہ ایمان لے آئیں۔''

اسلام میں حق کی حمایت اور باطل کی شکست کے لیے لڑنا جائز ہے اور آنحضرت ﷺ کو بھی مجبوراً لڑنا پڑا' اس سے مخالفوں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ یہ لڑائی صرف اس لیے تھی کہ اسلام کو تلوار کے زور سے لوگوں میں پھیلایا جائے' حالانکہ قرآن میں ایک آیت بھی ایسی نہیں جس میں کسی کافر کو زبردستی مسلمان بنانے کا حکم ہو' اور نہ آنحضرت ﷺ کی سیرت میں کوئی واقعہ ایسا ہے جس میں کسی کو زبردستی تلوار کے زور سے مسلمان بنایا گیا ہو' بلکہ اگر ہے تو یہ ہے:

﴿وَ اِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلَامَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ﴾ (التوبہ:۱)

''اور اگر (لڑائی میں) کوئی مشرک تجھ سے پناہ کا طالب ہو تو اس کو پناہ دے' یہاں تک کہ وہ خدا کا کلام سن لے' پھر اس کو وہاں پہنچا دے جہاں وہ بے خوف ہو' کہ یہ بے علم لوگ ہیں۔''

یہ نہیں کہا کہ جب تک وہ مسلمان نہ ہو جائے' اس کو پناہ نہ دو بلکہ یہ فرمایا کہ اس کو پناہ دے کر اس کی جائے پناہ تک پہنچا دیا جائے' اور اس کو کلامِ الٰہی سنایا جائے تا کہ اس کو غور و فکر کرنے کا موقع ملے' ظاہر ہے کہ جو مشرک اس طرح مسلمان ہو گا اس کے تبدیلِ مذہب کا محرک تلوار کے بجائے کوئی اور چیز (پیامِ حق) ہو گی۔

حقیقت یہ ہے کہ جہاد کی مشروعیت' مظلوموں کی حمایت' جلا وطنوں کے حق دلانے' حج کا راستہ کھولنے اور عقیدہ کی آزادی حاصل کرنے کے لیے ہوئی تھی' جیسا کہ اس کا مفصل بیان کتاب میں کہیں آئے گا' قرآن کی اس آیت میں:

﴿وَ قَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّ يَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ﴾ (الانفال:۳۹)

''اور ان کافروں سے لڑو' یہاں تک کہ فتنہ نہ رہے' اور دین پورا اللہ کے لیے ہو جائے۔''

''فتنہ'' سے مراد عقیدہ اور مذہب کی آزادی نہ ہونا ہے' حضرت ابن عمرؓ صحابہؓ کی خانہ جنگیوں میں شریک نہ تھے۔ ایک شخص نے ان سے آ کر کہا کہ کیا خدا نے فتنہ کے مٹانے کے لیے لڑنے کا حکم نہیں دیا اور اوپر کی آیت پیش کی' انہوں نے جواب دیا کہ ہم یہ فرض آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں ادا کر چکے' جب مسلمان کم تھے تو انسان اپنے دین کے سبب سے فتنہ میں مبتلا کیا جاتا تھا اس کو لوگ یا مار ڈالتے تھے یا قید کر لیتے تھے' یہاں تک کہ مسلمانوں کی تعداد بہت بڑھ گئی تو پھر فتنہ باقی نہ رہا۔ (۱)

میدانِ جنگ میں تبلیغ

ناواقفوں نے ایک اور مسئلہ کی بھی غلط تعبیر کی ہے' اسلام کی امن پسندی نے یہ قانون بنایا ہے کہ اگر کسی

(۱) صحیح بخاری جلد دوم تفسیر انفال ص ۶۷۰۔

مخالف قوم سے لڑائی آ پڑے تو میدانِ جنگ میں پہنچ کر بھی صلح وآشتی کا خیال دور نہ کیا جائے بلکہ تلوار کے فیصلہ سے پہلے دو باتیں ان کے سامنے پیش کرنی چاہئیں' اول یہ کہ کلمۂ شہادت پڑھ کر مسلمان ہو جاؤ اور لڑائی سے ہاتھ اٹھا کر ہمارے بھائی بن جاؤ' اگر ایسا کرو تو تم دین' حکومت اور عزت کے تمام حقوق میں ہمارے برابر ہو جاؤ گے' اگر یہ منظور نہ ہو تو اپنے مذہب پر قائم رہ کر ہماری سیاسی حکومت کو قبول کر لو' اس حالت میں تمہاری حفاظت کی ہر قسم کی ذمہ داری ہمارے سر ہو گی' اگر وہ ان دو میں سے کوئی بات قبول کر لیں تو ان سے لڑنا جائز نہیں۔ اسلام کی تاریخ میں ایسے کتنے منظر ہیں کہ کسی دشمن سے دشمن قوم نے اسلام یا محض اطاعت قبول کر لی ہے اور خون ریزی رک گئی اور لڑائی کا میدان محبت وآشتی کی بزم بن گئی۔

یہ قانون جو سرتا پا امن پسندی' سلامت طلبی اور خون ریزی سے بچنے کی آخری کوشش پر مبنی ہے اس کو مخالفوں نے اس صورت میں پیش کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے لوگوں کو تلوار کے زور سے مسلمان بنانے کی تعلیم دی' آنحضرت ﷺ کا دستور تھا کہ جب کسی فوج کو متعین کرتے تو سردار کو یہ ہدایت فرماتے۔

''جب تو مشرکوں میں سے کسی دشمن قوم سے مقابل ہو تو اس کو تین باتوں میں سے کسی ایک بات کے قبول کرنے کی دعوت دے ان میں سے جو بات بھی وہ مان لے اس کو قبول کر لے اور اس پر حملہ کرنے سے رک جا اس کو اسلام کی دعوت دے' اگر وہ قبول کر لے' تو پھر اس سے رک جا' اس کے بعد اس سے خواہش کر کہ وہ مسلمانوں کے ملک میں آ جاوے تو اس کا وہی حق ہو گا جو مسلمانوں کا ہے' اگر وہ نہ مانے تو اس کی حالت بدو مسلمانوں کی سی ہو گی' قانون اس پر مسلمانوں کا جاری ہو گا لیکن غنیمت اور فئی میں اس کا حصہ نہ ہو گا' جب تک وہ جہاد میں شرکت نہ کرے۔ اگر وہ اسلام قبول نہ کرے تو اس کو جزیہ دے کر ذمی بننے کو کہہ' اگر وہ اس کو مان لے تو اس سے بھی رک جاؤ۔ اگر وہ اس کو بھی نہ مانے تو پھر خدا کی مدد مانگ اور لڑائی شروع کر دے۔ (۱)

یہ وہ اصولِ جنگ تھے جس سے خون ریزی کی روک تھام مقصود تھی' نہ یہ کہ کسی کو مجبور کر کے بزورِ شمشیر مسلمان بنا لینا' صحابۂ کرامؓ کے زمانہ میں ایرانیوں سے جب لڑائی شروع ہوئی تو مسلمانوں نے تین روز تک میدانِ جنگ میں تلوار نہیں اٹھائی' حضرت سلمان فارسیؓ تین روز تک ان کو سمجھاتے رہے اور کہتے رہے کہ ''میں تمہاری قوم سے ہوں لیکن دیکھتے ہو کہ عرب میرے زیرِ فرمان ہیں' اگر تم بھی مسلمان ہو جاؤ تو تم کو بھی وہی حقوق ملیں جو ہمارے ہیں اور اگر تم اپنے ہی مذہب پر رہنا چاہو تو جزیہ دے کر رہ سکتے ہو' لیکن محکوم ہو کر رہو گے۔'' (۲) اس سے معلوم ہوا کہ جنگ میں دشمن کو بھی تبدیلیِ مذہب پر مجبور نہیں کیا گیا بلکہ اس کے سامنے دوسری راہیں بھی کھلی تھیں۔

ثمامہؓ بن اثال قبیلۂ بنی حنیفہ میں سے تھے اور یمامہ کے رئیس تھے' یہ وہ قبیلہ ہے جو آخر تک سرکش رہا اور اسی میں آنحضرت ﷺ کے آخر زمانہ میں مسیلمہ کذاب پیدا ہوا تھا' ثمامہؓ اتفاق سے مسلمانوں کے ایک لشکر کے ہاتھ

(۱) صحیح مسلم کتاب الجہاد والسیر۔

(۲) جامع ترمذی ابواب السیر۔

میں گرفتار ہو گئے اور مدینہ لا کر مسجد نبوی کے کھمبے سے باندھ دیے گئے' آنحضرت ﷺ نماز کے لیے تشریف لائے تو پوچھا کہ ثمامہ تمہاری کیا رائے ہے جواب دیا محمد! میری رائے اچھی ہے' اگر مجھے قتل کرو گے تو ایک خون والے کو قتل کرو گے اور اگر احسان کرو گے تو ایک شکر گزار پر احسان ہوگا' اور اگر زرِ فدیہ چاہتے ہو تو مانگو جو مانگو گے دیا جائے گا' آنحضرت ﷺ نے کچھ نہیں فرمایا' پھر اسی طرح دوسرے دن سوال و جواب ہوا' پھر تیسرے دن ہوا' تیسرے دن آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ثمامہ کو چھوڑ دو' لوگوں نے کھول دیا۔ وہ رسی سے کھل کر آزاد ہو چکے تھے' مگر سچائی کی زنجیر ان کے پاؤں میں پڑ گئی' مسجد نبوی کے قریب ایک نخلستان میں جا کر غسل کیا اور پھر مسجد میں آ کر کلمۂ شہادت پڑھ (۱) کر مسلمان ہو گئے کیا کسی کو زبردستی مسلمان بنانے کا اس سے بہتر موقع مل سکتا تھا؟ بدر کے قیدی گرفتار ہو کر آئے لیکن ان سے یہ نہیں کہا گیا کہ تلوار یا اسلام۔ اسی طرح جنگ کے دوسرے قیدیوں کے ساتھ بھی یہی برتاؤ رہا' قرآن پاک نے جنگ کے قیدیوں کے متعلق کہا ﴿فَاَمَّا مَنًّا بَعْدُ وَ اَمَّا فِدَآءً﴾ (محمد: ۴) لڑائی ختم ہونے کے بعد ان قیدیوں کو احسان دھر کر چھوڑ دو' یا فدیہ لے کر چھوڑ دو' یہ ارشاد نہ ہوا کہ اسلام یا تلوار۔

غزوۂ خیبر میں مسلمان روزانہ بعض قلعوں پر حملہ کرتے ہیں اور ناکام رہتے ہیں' بالآخر شیرِ خدا علیؓ مرتضیٰ کو حکم ہوتا ہے کہ فوج لے کر جائیں' وہ پوچھتے ہیں یا رسول اللہ! کیا میں ان سے لڑوں یہاں تک کہ وہ ہماری طرح ہو جائیں؟ فرمایا آہستگی سے روانہ ہو یہاں تک کہ ان کے میدان میں پہنچ جاؤ' پھر ان کو اسلام کی طرف بلاؤ اور اس میں ان کا جو حق ہوگا وہ ان کو بتاؤ۔ خدا کی قسم اگر ایک شخص کو بھی خدا تمہارے ذریعہ سے ہدایت دے دے تو اس سے بہتر ہے کہ تمہاری ملکیت میں سرخ اونٹ ہوں۔ (۲) لیکن خیبر کے یہود نے اسلام کا مذہب قبول نہیں کیا بلکہ اسلام کی حکومت قبول کر لی' اور مصالحت ہو کر تلوار نیام میں کر لی گئی۔

اسی طرح ایک مسلمان کو کسی دوسرے مسلمان پر ہتھیار اٹھانا جائز نہیں' بلکہ کفر کا موجب ہے' کفار کو مسلمانوں کا یہ طرزِ عمل معلوم تھا۔ اکثر لڑائیوں میں جب مشرک حملہ آور اپنی کمزوری محسوس کرتا تھا تو اپنی جان بچانے کے لیے کلمۂ توحید پڑھ دیتا تھا اور ایک بپھرے ہوئے مسلمان کو مجبوراً اپنے غصہ کو ضبط کر کے ہاتھ روک لینا پڑتا تھا۔

ایک دفعہ ایک صحابیؓ نے پوچھا کہ اگر لڑائی میں میرا حریف اپنی تلوار سے میرا ہاتھ اڑا دے اور جب میرے حملہ کی باری آئے تو درخت کی آڑ پکڑ کر کہے' میں مسلمان ہوتا ہوں' تو اے خدا کے رسول میں کیا کروں' اس کو قتل کر دوں؟ فرمایا نہیں' اس کا قتل جائز نہیں عرض کی یا رسول اللہ! میرا ہاتھ اس نے کاٹ دیا' فرمایا پھر بھی اس کا قتل جائز نہیں کہ اگر تم نے اب اس کو قتل کیا تو وہ وہ ہو گیا جو تم اس کے قتل سے پہلے تھے اور تم وہ ہو جاؤ گے جو وہ اس اقرارِ توحید سے پہلے تھا۔ (۳)

---

(۱) صحیح بخاری و سنن ترمذی ربط الاسیر۔

(۲) صحیح بخاری غزوۂ خیبر۔

(۳) صحیح مسلم کتاب الایمان۔

حضرت اسامہ بن زیدؓ آپؐ کے بڑے چہیتے خادم تھے' وہ ایک فوجی دستہ کے سپہ سالار بنا کر ایک لڑائی میں بھیجے گئے جب گھمسان کا رن پڑا تو ایک کافر ان کی زد میں آیا' انہوں نے حملہ کا قصد کیا تو وہ لا الہ الا اللہ پکار اٹھا' ایک انصاریؓ جو پہلے اس پر جھپٹے تھے' وہ تو رک گئے مگر اسامہؓ نے اس کافر کے اس کلمہ پڑھنے کو اس کی جان بچانے کے فریب پر محمول کر کے کچھ خیال نہ کیا اور نیزہ سے اس کا کام تمام کر دیا' آنحضرت ﷺ کو یہ خبر معلوم ہوئی تو اسامہؓ سے سخت آزردہ ہوئے' اسامہؓ نے عرض کی یا رسول اللہ (ﷺ)! اس نے صرف تلوار کے ڈر سے کلمہ پڑھا تھا۔ فرمایا اور کتنا بلیغ فقرہ فرمایا۔ ''اے اسامہ! تم نے کیا اس کا دل چیر کر دیکھ لیا تھا۔'' پھر برابر یہ فرماتے رہے اے اسامہ تم قیامت میں اس کے لا الہ الا اللہ کا کیا جواب دو گے' اسامہ کہتے ہیں کہ مجھ کو اتنی ندامت تھی کہ میں نے دل میں آرزو کی کہ کاش میں آج ہی مسلمان ہوا ہوتا۔ (۱)

دیکھو کہ واقعہ کی تصویر کتنی الٹ دی گئی ہے' واقعہ تو یہ تھا کہ اپنی حملہ آورانہ لڑائی کے گھمسان میں بعض کفار و مشرکین جن کو یہ معلوم تھا کہ کسی کلمہ گو کو مسلمان اپنے مذہب کے حکم کے بموجب قتل نہیں کرتے' جب وہ مسلمانوں کی زد میں پڑتے تھے تو اپنی جان بچانے کے لیے فوراً کلمۂ شہادت پڑھ دیتے تھے اور بیان اس صورت میں کیا جاتا ہے کہ اسلام نے کفار کو تلوار کی نوک سے کلمہ پڑھنے پر مجبور کیا' کیا یہ صداقت ہے؟

اسی طرح آنحضرت ﷺ کا ایک اور اعلان ہے جس کو اکثر غلط معنی میں پیش کیا گیا ہے آپ نے فرمایا ((اُمِرْتُ اَنْ اُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰی یَقُوْلُوْا لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ)) (الخ) مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے اس وقت تک لڑائی کروں جب تک وہ توحید کا اقرار نہ کریں اور جب وہ اقرار کر لیں تو انہوں نے اپنے جان و مال کو مجھ سے بچا لیا اور ان کی نیت کی پرسش خدا کا کام ہے' اس حدیث کا مقصد صرف اسی قدر ہے کہ مسلمان سے لڑنا تو جائز نہیں لیکن کسی غیر مسلم قوم سے بھی لڑنا اسی وقت جائز ہے جب تک وہ توحید کا اقرار نہ کرے اور جب اس نے یہ کر لیا تو پھر اس سے بھی لڑنا روا نہیں خواہ وہ حملہ کے ڈر سے لا الہ الا اللہ کہے یا سچے دل سے اس نے یہ اقرار کیا ہو اس کی تحقیق کہ کس نیت سے اس نے کلمہ پڑھا انسان کا فرض نہیں' خدا کا ہے' یہ بالکل ایک مصالحانہ اعلان ہے لیکن لوگ اس کو اس معنی میں پیش کرتے ہیں کہ گویا اسلام کا حکم یہ تھا کہ مسلمان دیوانہ وار تلوار لیے پھرتے اور جس کو پاتے اس کو ڈرا دھمکا کر کہتے کہ کلمہ پڑھو ورنہ سر قلم کر دیں گے۔ غور کرو' اگر یہ حکم ہوتا تو قیدی اقرارِ توحید کیے بغیر اس آسانی سے چھوڑے جاتے اور ہاری ہوئی قوموں سے اسلام نہیں صرف چند درہم کا جزیہ لے کر ان کو آزاد کر دیا جاتا؟ اور کیا مسلمانوں کو یہ اجازت ملتی کہ

﴿وَ اِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا﴾ (الانفال:۶۱)

''اگر کفار کا محارب فریق صلح کے لیے جھکے تو تو بھی جھک جا۔''

بلکہ اس کے بجائے یہ حکم ہوتا کہ جب تک وہ مسلمان نہ ہو جائیں ان سے صلح نہ کرنا اور نیز کیا مسلمانوں کو یہ

(۱) صحیح مسلم کتاب الایمان ص ۵۲' ۱ مصر۔

حکم ہوسکتا تھا کہ

﴿وَ اِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِکِیْنَ اسْتَجَارَکَ فَاَجِرْہُ حَتّٰی یَسْمَعَ کَلَامَ اللّٰہِ ثُمَّ اَبْلِغْہُ مَاْمَنَہٗ ذٰلِکَ بِاَنَّھُمْ قَوْمٌ لَّا یَعْلَمُوْنَ﴾ (توبہ:۶)

''اور اگر (لڑائی کے میدان میں) مشرکوں میں سے کوئی تجھ سے پناہ مانگے تو اس کو پناہ دے یہاں تک کہ وہ خدا کا کلام سن لے پھر اس کو اس کے امن کی جگہ پہنچا دے یہ اس لیے کہ یہ بے علم لوگ ہیں۔''

بلکہ یہ ہوتا کہ پناہ ملنے اور کلامِ الٰہی سننے کے بعد وہ مسلمان نہ ہو تو اس کو اس کی امن کی جگہ پہنچانے کے بجائے اس کو قتل کر کے جہنم میں پہنچا دو' مگر ایسا نہیں ہے' اس سے معلوم ہوا کہ اسلام کی امن پسندی اور رواداری کے مفہوم کو کس طرح الٹ پلٹ کر بیان کیا جاتا ہے' حالانکہ اسلام نے ان مشرکوں سے بھی جو ہمارے کسی دوست مشرک قبیلہ کے دوست ہوں اور ہم سے صلح و آشتی کے ساتھ رہنا چاہتے ہوں' لڑنے کو منع کیا ہے۔

﴿فَاِنِ اعْتَزَلُوْکُمْ فَلَمْ یُقَاتِلُوْکُمْ وَ اَلْقَوْا اِلَیْکُمُ السَّلَمَ فَمَا جَعَلَ اللّٰہُ لَکُمْ عَلَیْھِمْ سَبِیْلًا﴾ (نساء:۹۰)

''تو اگر وہ تم سے کنارہ پکڑیں' پھر نہ لڑیں اور تمہارے سامنے صلح کی طرح ڈالیں تو اللہ نے تم کو ان پر حملہ کرنے کی راہ نہیں دی۔''

یعنی پھر ان پر تلوار اٹھانا درست نہیں' حالانکہ اگر اسلام کی مذہبی جنگجوئی کے وہی معنی ہوتے کہ ''یا تلوار یا اسلام'' تو کیا اس امن پسندی' اس صلح جوئی اور اس ترکِ جنگ کی صورت ممکن ہوسکتی تھی۔

مسلح تبلیغی جماعتیں

غلط فہمی پھیلانے کا ایک اور واقعہ یہ ہے کہ تبلیغ و دعوت کے لیے جو جماعتیں ملک میں بھیجی جاتی تھی وہ مسلح ہوتی تھیں' لیکن یہ حقیقت بھلا دی جاتی ہے کہ یہ عرب کا واقعہ ہے' جہاں کوئی منظّم اور باضابطہ حکومت نہ تھی' جس پر تمام رعایا کی حفاظت کی ذمہ داری ہو' ایک ایک وادی میں ایک ایک قبیلہ اپنی اپنی الگ ریاست قائم کیے ہوئے تھا اور ہر قبیلہ دوسرے قبیلہ سے برسرِ پیکار تھا' راستوں پر رہزنوں اور ڈاکوؤں کا قبضہ تھا۔ جن سے اکا دکا آدمی کا صحیح و سالم بچنا ناممکن تھا' اسی لیے جب کہیں کوئی تبلیغی مہم بھیجی جاتی تھی تو بدامنی کے ملک میں رہنے والوں کے عام دستور کے مطابق وہ اپنی ممکن حفاظت کے لیے مسلح جاتی تھیں' اور اس بات کی دلیل کہ اس مسلح جماعت کا تبلیغ و دعوت کے سوا کوئی مقصد نہ تھا' اس سے ظاہر ہے کہ ان کی تعداد تھوڑی ہوتی تھی جو فوجی حملہ کے لیے کافی نہیں ہوسکتی تھی۔

غزوۂ بدر کے بعد جب قریش کا زور ٹوٹ گیا اور ملک میں اسلام بھی ایک قوت شمار ہونے لگا تو آنحضرت ﷺ نے بعض بعض قبیلوں کی درخواست پر مسلمانوں کی مختلف جماعتوں کو تبلیغ و تعلیم کے لیے ادھر ادھر بھیجا تب بھی وہ اکثر راستہ میں جان سے ماری گئیں' واقعۂ رجیع میں ستر داعیوں کا مارا جانا' واقعہ بئر معونہ میں چھ یا دس داعی

مسلمانوں کا قتل ہونا' سریہ ابن ابی العوجاء میں پچاس مسلمانوں کی شہادت' واقعۂ ذات اطلاح میں چودہ داعی مسلمانوں کا تیروں سے مارا جانا۔ عروہ بن مسعود ثقفی کا تیروں سے چھد جانا' اس دعویٰ کی شہادت ہے۔

تبلیغ ودعوت کی تنظیم

آنحضرت ﷺ جب تک مکہ معظّمہ میں تشریف فرما رہے' بنفسِ نفیس اس فرض کو انجام دیتے رہے۔ ایک ایک کے پاس جاتے اور حق کا پیغام سناتے' شہر سے نکل کر مکہ کے آس پاس جاتے اور آنے جانے والوں کو بشارت سناتے' مکہ سے نکل کر طائف گئے اور وہاں بھی اپنا فرض ادا کیا۔ یہ بھی خدا کی مصلحت تھی کہ اس نے اپنے آخری دین کا مرکز مکہ معظّمہ کو قرار دیا' جو عرب کا مرکزی شہر تھا' اور حج کے موسم میں تمام قبیلے خود یہاں آتے تھے' آپ سالہا سال حج کے موسم میں ایک ایک قبیلہ کے پاس جاتے اور خدا کی دعوت پیش کرتے' اسی سالانہ تبلیغ سے اسلام کو وہ جماعت ہاتھ آئی جس کا نام انصار ہے۔

الغرض ان تبلیغی سرگرمیوں سے مکہ میں سینکڑوں آدمی مسلمان ہو چکے تھے' مگر قریش کے ظلم سے وہ ملک چھوڑنے پر مجبور ہوئے' اور آنحضرت ﷺ کے مشورہ سے وہ حبشہ کی طرف روانہ ہوئے' اس سفر کی مصلحت بھی عجیب وغریب تھی۔ ان مظلوم مسلمانوں کی ہجرت نے یہ موقع بہم پہنچایا کہ وہ اس مسافرت میں جہاں جہاں سے گزرے اسلام کی آواز پہنچاتے گئے اور اس طرح یمن اور حبشہ دونوں ملکوں میں اسلام کی تحریک روشناس ہوئی۔

مکہ میں آنحضرت ﷺ کے بعد عام مسلمانوں میں سب سے پہلے مبلغ اور داعیِ حق حضرت ابوبکرؓ تھے مکہ کے بہت سے معزز گھرانوں کے پرجوش نوجوان ان ہی کی تبلیغ سے اسلام کے حلقہ بگوش ہوئے' حضرت عثمانؓ' حضرت طلحہؓ' حضرت زبیرؓ' حضرت ابوبکرؓ ہی کی کوششوں سے دائرۂ اسلام میں آئے' حضرت ابوبکرؓ کے بعد اسلام کے دوسرے مبلغ حضرت مصعبؓ بن عمیر ہیں' جن کے مؤثر وعظوں کو سن کر آنحضرت ﷺ کی ہجرت سے پہلے ہی مدینہ کے گھرانے کے گھرانے توحید کے پرستار ہو گئے تھے۔

مدینہ منورہ آ کر اسلام نے امن واطمینان کی سانس لی تو آنحضرت ﷺ نے ان نومسلموں کی تعلیم کے لیے جو اطرافِ ملک سے دارالاسلام میں آتے تھے' نیز ملک کے مختلف گوشوں میں اسلام کی تبلیغ کے لیے ایک جماعت قائم کی جس کا نام عام طور سے اصحابِ صفہ (چبوترے والے) مشہور ہے اس میں بعض اوقات سو سے زیادہ آدمی داخل رہے ہیں' یہ لوگ ملک میں اسلام کی دعوت کے لیے بھیجے جاتے اور خود نومسلموں کو تعلیم دیتے' بئر معونہ میں ستر کے قریب جو داعی اور مبلغ راہ میں بیدردانہ قتل ہوئے تھے' وہ اسی جماعت کے ارکان تھے۔

ان کے علاوہ اکابر صحابہؓ جو وقتاً فوقتاً مختلف ملکوں' بادشاہوں' قوموں اور قبیلوں میں اسلام کی دعوت لے کر پھیلے احادیث وسیر کی کتابوں میں ان کے نام متفرق طور سے ملتے ہیں۔ میں نے تھوڑی سی کوشش سے اس قسم کے پینتیس صحابیوں کے نام جمع کیے ہیں جنہوں نے از خود آنحضرت ﷺ کے حکم سے اس فرض کو انجام دیا' ان کے

نام یہ ہیں' ابوذرؓ غفاری' طفیل بن عمرو دوسیؓ' جعفر بن طیارؓ' عمرو بن عنبسہ سلمیؓ' ضماد بن ثعلبہؓ' خالد بن ولیدؓ' علیؓ بن ابی طالب' مہاجر بن ابی امیہؓ' زیاد بن لبیدؓ' خالد بن سعیدؓ' عدی بن حاتمؓ' علاءؓ بن حضرمیؓ' ابوموسیٰ اشعریؓ' معاذ بن جبلؓ' جریر بن عبداللہ بجلیؓ' دحیہؓ کلبی' عمرو بن امیہؓ ضمری' مغیرہؓ بن شعبہ' عمروؓ بن العاص' وبرؓ بن نخیس' عروہ بن مسعودؓ ثقفی' عامرؓ بن شہر' منقذ بن حبانؓ' ثمامہؓ بن اثال' محیصہؓ بن مسعود' احنفؓ' ابوزید انصاریؓ' عمرؓ بن مرہ' عیاشؓ بن ربیع مخزومی' واثلہؓ بن اسقع' عبداللہؓ بن حذافہ سہمی' حاطبؓ بن ابی بلتعہ' سلیطؓ بن عمرو بن عبد شمس' شجاعؓ بن وہب اسدی۔ ان ہی مبلغوں اور داعیوں اور قاصدوں کی پکار تھی' جس نے یمن' یمامہ' بحرین' حجاز' نجد' غرض پورے عرب کو بیدار کر دیا اور عرب سے باہر ایران' شام' مصر' حبش ہر جگہ اسلام کا پیغام پہنچ گیا۔

مبلغوں کی تعلیم و تربیت

سیرت کی دوسری جلد کے آغاز میں اشاعتِ اسلام کی تاریخ اور دعاۃ معلمین کی تعلیم و تربیت کا حال لکھا جا چکا ہے' سلسلۂ بیان کے لیے یہاں صرف اس قدر کہنا ہے کہ ان کو سب سے پہلے قرآن پاک کی سورتیں یاد کرائی جاتی تھیں' لکھنا پڑھنا بھی سکھایا جاتا تھا' آنحضرت ﷺ کے شب و روز کے ارشادات سننے کا موقع بھی ان کو ملتا تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسلامی تبلیغ کا درسِ اولین قرآن اور صرف قرآن تھا۔

دعوت بالقرآن

قرآنِ پاک اسلام کے دعویٰ اور دلیل دونوں کا مجموعہ ہے اور وہی اس کے مذہب کا صحیفہ ہے' خود آنحضرت ﷺ اور دوسرے مبلغ صحابہ بھی تبلیغ و دعوت میں صرف قرآن کی سورتیں پڑھ کر سناتے تھے اور جہاں ان کو اس کا موقع مل جاتا' وہاں اس کی تاثیر اپنا کام کر جاتی تھی' اور یہ فرض خود قرآن نے اپنا آپ قرار دیا تھا' اس کی تبلیغ کے لیے جہاد کی ضرورت تھی' مگر اس جہاد کا ہتھیار لوہے کی تلوار نہیں' بلکہ قرآن کی تلوار تھی جس کی ضرب کی روک خود اور سپر سے بھی ممکن نہ تھی' اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو اسی تلوار سے جہاد کا حکم دیا۔ فرمایا

﴿فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَ جَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا﴾ (الفرقان:۵۲)

''تو اے پیغمبر منکروں کا کہنا مان اور اس قرآن سے ان کے ساتھ بڑے زور سے جہاد کر۔''

اس پیغامِ الٰہی کے زمین میں اترنے کی غرض ہی یہ تھی کہ وہ خدا کے بھولے ہوئے بندوں کو ان کا عہد یاد دلائے' فرمایا:

﴿فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ﴾ (قٓ :۴۵)

''تو اے پیغمبر ان کو جو میری دھمکی سے ڈرتے ہوں قرآن کے ذریعہ سے یاد دلاؤ۔''

قرآن رحمت عالم کا پیام عمومی ہے اور یہی اس کے نزول کی غرض و غایت ہے' فرمایا۔

﴿تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا﴾ (الفرقان:۱)

''برکت والا ہے وہ جس نے حق و باطل میں امتیاز کرنے والی کتاب اپنے بندوں پر اس لیے اتاری کہ وہ تمام دنیا کو بیدار اور ہوشیار کرے۔''

یہی قرآن اسلام کی طاقت اور محمد رسول اللہ ﷺ کا اصلی ہتھیار تھا جس کی کاٹ نے کبھی خطا نہ کی۔

اشاعتِ اسلام کی قدرتی ترتیب

عرب میں صرف تین قومیں تھیں، جن کا اسلام لانا گویا تمام جزیرہ نمائے عرب کا اسلام لانا تھا یعنی مشرکین، یہود اور نصاریٰ، مشرکینِ عرب کا مرکز خانہ کعبہ تھا اور ان کے مذہبی پیشوا قریش تھے، یہود کا صدر مقام مدینہ اور خیبر تھا نصاریٰ اور مجوس شام اور یمن کے اطراف میں پھیلے ہوئے تھے۔

اس بنا پر اَلْاَ قْرَبُ فَا لْاَ قْرَبُ۔ کے لحاظ سے اشاعت اسلام کی قدرتی ترتیب یہ تھی کہ قریش اور کفار کو پہلے دعوتِ توحید دی جاتی، پھر یہود کو حلقہ بگوش اسلام بنایا جاتا۔ اس کے بعد نصاریٰ اور مجوس کو دعوت دی جاتی، چنانچہ آنحضرت ﷺ نے اسی ترتیب کے ساتھ اسلام کی اشاعت کی اور اسی بنا پر قرآن مجید کا طریقِ دعوت مختلف نظر آتا ہے تمام مکی سورتوں کے مخاطب کفارِ مکہ تھے، اسی لیے ان میں بت پرستی کی مذمت، توحید کی ترغیب، عجائبِ قدرت کا بیان، عذابِ الٰہی سے تخویف اور صنادیدِ قریش کی مخالفت کے جواب کے سوا کچھ نہیں، لیکن جب آنحضرت ﷺ مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو یہود سے سابقہ پڑا اور اب قرآن مجید کا طرزِ خطاب بدل گیا، چنانچہ ابتدائی مدنی سورتیں زیادہ تر یہود کی مذہبی تاریخ ان کی تحریفات، ان کی اخلاقی کمزوریوں اور قصص بنی اسرائیل پر مشتمل ہیں۔ سب سے اخیر میں نصاریٰ کی باری آئی اور فتحِ مکہ کے بعد قبائلِ عرب کے وفود کے سلسلہ میں نجران کے عیسائیوں کا وفد آیا، اسی زمانہ میں سورۂ آل عمران نازل ہوئی جس میں نصاریٰ کا ذکر ہے۔

مجوس عرب میں بہت کم تھے، بحرین اور یمن میں وہ خال خال پائے جاتے تھے وہ بھی ایرانی النسل تھے، خالص عرب نہ تھے اس لیے قرآن مجید نے خاص طور پر کسی سورہ میں ان سے خطاب نہیں کیا ہے، البتہ جا بجا مناسب موقعوں پر ان کا نام لیا ہے۔ اور ان کے عقائد کی تردید کی اور ان کو ثنویت یعنی دو خداؤں کی پرستش کے بجائے توحید کی دعوت دی ہے۔

قبولِ اسلام کے لیے کیا چیز درکار تھی

اگرچہ یورپ کا یہ عام دعویٰ ہے کہ عرب میں اسلام صرف تلوار کے زور سے پھیلا، لیکن ابتدا میں جن اشخاص اور جن قبائل نے اسلام قبول کیا، ان کے اوصاف پیش نظر کر لینے کے بعد صاف ثابت ہوتا ہے کہ اسلام، اپنے لیے صرف اثر پذیر دل کا جویاں تھا اور جب یہ آشیانہ مل جاتا تھا، تو اس کے سامنے یہ طائرِ قدس اپنے پر ڈال دیتا تھا، چنانچہ ابتدائے بعثت میں جن اشخاص نے اسلام قبول کیا، وہ وہی تھے جو نیک طبع، ایمان دار، راستی پسند اور حق جو تھے اور جو نبوت کے اوصاف و خصائص سے واقف تھے، گزشتہ آسمانی مذاہب سے کچھ نہ کچھ آگاہ تھے اور معاشرت اور

تمدن سے بہرہ ور تھے۔ اشخاص کے علاوہ جن قبائل اور آبادیوں نے اسلام کے قبول کرنے میں پیش دستی کی وہ بھی وہی تھیں، جن میں یہ خصوصیتیں پائی جاتی تھیں، عرب کے دو مختلف حصوں جنوبی وشمالی میں سب سے زیادہ اسلام کو کامیابی عرب کے جنوبی حصہ یعنی یمن، عمان، بحرین، یمامہ میں ہوئی اور شمالی حصہ میں سے مدینہ منورہ اور اس کے اطراف میں ہوئی کیونکہ وہ تمدنی حیثیت سے دنیا کی دو ممتاز متمدن قوموں، ایرانیوں اور رومیوں سے متاثر تھے اور مذہبی حیثیت سے یہودیوں اور عیسائیوں سے ان کا میل جول اور خلا ملا تھا، اہلِ مدینہ بھی یہودیوں کے تمدن و معاشرت، روایات اور رسم ورواج سے بہت کچھ متاثر تھے۔ (۱)

اسلام کو عربوں سے جس قدر لڑائیاں پیش آئیں وہ سب نجد اور حجاز میں پیش آئی، لیکن مسلمانوں کی کوئی جرار فوج مدینہ، یمن، عمان، یمامہ اور بحرین کو فتح کرنے کے لئے نہیں بھیجی گئی، انصارِ مدینہ نے خود مکہ میں آ کر اسلام کو لبیک کہا، اطرافِ مدینہ کے قبائل میں غفار نے خود مکہ آ کر قریش کی تلوار کی آگ میں کھڑے ہو کر لا الہ الا اللہ پڑھا، یمن سے دوس کے قبیلہ کے آدمیوں نے خود مکہ معظّمہ پہنچ کر ایمان کی دولت حاصل کی اور اس کے سردار نے اپنا قلعہ اسلام کی پناہ کے لیے پیش کیا، اشعر کا قبیلہ بھی اسی زمانہ میں غائبانہ مشرف بہ اسلام ہوا، ہمدان کا قبیلہ حضرت علیؓ کی دعوت پر ایک دن میں مسلمان ہو گیا۔

عمان کا بھی یہی حال ہوا، وہاں بھی اسلام نے صرف اپنی تبلیغی کوششوں کے ذریعہ سے اقتدار حاصل کیا، ایک بار آپ نے عرب کے کسی قبیلے کے پاس ایک آدمی بھیجا، وہ لوگ اس کے ساتھ سختی سے پیش آئے اور اس کو زدوکوب کیا، اس نے آ کر آپ سے یہ واقعہ بیان کیا، تو آپ نے فرمایا کہ اگر اہلِ عمان ہوتے تو تم کو نہ گالیاں دیتے نہ مارتے (مسلم فضائل اہل عمان)

یمامہ کے رئیس ثمامہؓ قید ہو کر مدینہ آئے، یہاں آزاد کر دیئے گئے، مگر مدینہ کی مسجد میں جو جلوہ انہوں نے دیکھا، اپنی ظاہری، مادی آزادی کے بعد بھی اس کی نورانی زنجیر سے انہوں نے رہائی نہ پائی، خود بخود مسلمان ہو گئے اور اپنے قبیلہ میں جا کر اسلام کے داعی بن گئے اور آخر خون کا ایک قطرہ گرے بغیر اسلام نے وہاں اکثریت حاصل کر لی۔

دیہاتوں میں سب سے پہلے قریۂ جواثی نے صدائے توحید پر لبیک کہا جو مضافاتِ بحرین میں تھا، اسی قریۂ جواثی کے باشندے فتح مکہ سے پہلے اسلام قبول کر چکے تھے، چنانچہ مسجد نبوی کے بعد عرب کے دیہاتوں میں سب سے پہلا جمعہ اسی گاؤں میں پڑھا گیا (۲) بارگاہِ نبوت میں عرب کے وفود اگرچہ فتح مکہ کے بعد حاضر ہوئے لیکن بحرین کے لوگوں نے اس میں تمام قبائل پر پیش دستی کی، چنانچہ ۵۰ھ میں سب سے پہلا وفد جو آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا وہ قبیلہ عبدالقیس کا تھا جو بحرین میں سکونت گزین تھا۔

---

(۱) مستدرک حاکم ج ۲ ص ۱۹۵ صحیح علی شرط مسلم۔

(۲) صحیح بخاری باب الجمعہ فی القریٰ والمدن۔

اہل یمن کا شمار اگرچہ مہاجرین اولین میں نہیں کیا جاتا لیکن جب آنحضرت ﷺ کی ہجرت کا حال معلوم ہوا تو اسی وقت حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ بھی یمن سے ۵۲ آدمیوں کو لے کر مدینہ کی طرف ہجرت کی غرض سے روانہ ہو گئے' بحری سفر تھا' وہ لوگ کشتی میں سوار ہوئے تو بادِ مخالف کے جھونکوں نے ان کو حبشہ میں پہنچا دیا جو مسلمانوں کا سب سے پہلا دارالہجرت تھا' وہاں حضرت جعفرؓ بن ابی طالب سے ملاقات ہوئی' تو انہوں نے کہا کہ آنحضرت ﷺ نے ہم کو یہیں اقامت کا حکم دیا ہے تم لوگوں کو بھی یہیں ٹھہر جانا چاہیے' چنانچہ وہ لوگ وہیں مقیم ہو گئے' اور فتحِ خیبر کے زمانہ میں مہاجرینِ حبشہ کے ساتھ آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ (۱) یہ حقیقت ہے کہ اسلام کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ جہالت اور وحشت تھی اور اس کی اشاعت کی سب سے بڑی محرک چیز تمدن' معاشرت اور اخلاق کی بلندی اور کتبِ آسمانی اور دیگر مذاہب سے واقفیت تھی' خود قرآن مجید نے اس کو ظاہر کیا ہے:

﴿اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ كُفْرًا وَّ نِفَاقًا وَّ اَجْدَرُ اَلَّا يَعْلَمُوْا حُدُوْدَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ﴾ (التوبہ:۹۷)

''دیہاتی بدوی کفر اور نفاق میں سب سے زیادہ سخت ہیں اور زیادہ اس کے اہل ہیں کہ وہ ان احکام کو نہ جانیں جو خدا نے اپنے رسول پر اتارے ہیں' اور اللہ جاننا اور حکمت والا ہے۔''

اور بھی اسی قسم کی آیتیں ہیں' جو لوگ بادیہ سے آ کر اسلام لاتے تھے اور کچھ مسائل سیکھ کر واپس چلے جاتے تھے ان سے بیعت لی جاتی تھی' اس کا نام بیعتِ اعرابی تھا' جو کم درجہ سمجھی جاتی تھی' اس بنا پر بادیہ میں الگ تھلگ رہنا صحابہ کے زمانہ میں معیوب سمجھا جاتا تھا' بلکہ بعض لوگ اس کو ارتداد کی علامت سمجھتے تھے۔ (۲)

اشاعتِ اسلام کے اسباب وذرائع

گزشتہ مباحث پر ایک غائر نظر ڈالنے کے بعد خود بخود یہ عقدہ کھل جاتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے دینِ حق کو عربوں میں کس طرح پھیلایا اور آپ کو کیونکر کامیابی ہوئی تاہم اگر واقعات کی روشنی میں ایک ایک صحابیؓ کے قبولِ اسلام کے اسباب کی تلاش کی جائے' تو حسبِ ذیل اسباب سامنے آئیں گے۔

(۱) اسلام کے نشر واشاعت کا سب سے مقدم اور اصلی سبب معجزۂ قرآنی تھا' قرآن مجید جس مؤثر اور دل کپکپا دینے والے طریقہ سے عقائد ومعارف واخلاق کی تلقین کرتا تھا۔ اس کے سامنے وہ تمام عوائق وموانع جن کا ذکر اوپر ہو چکا' فنا ہو جاتے تھے۔ جو لوگ سرے سے خدا کے منکر تھے قرآن مجید ان کے سامنے عالم کی بوقلمونی' مظاہرِ قدرت کی بوالعجبی' کائنات کی نیرنگی' اجرامِ فلکی کی جلوہ گری اور عناصر کی نگار آرائی سے اس طرح استدلال

(۱) صحیح مسلم فضائل جعفرؓ بن ابی طالب واسماءؓ بنت عمیس۔

(۲) صحیح مسلم الامارۃ اور سنن نسائی کتاب البیعۃ۔

کرتا تھا:

﴿كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَ كُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ﴾ (البقرہ:۲۸)

''تم خدا کا انکار کس طرح کرتے ہو' حالانکہ تم کبھی بے جان تھے تو اس نے تم کو زندگی بخشی' پھر ایک دن تم کو مردہ بنا دے گا۔ پھر زندہ کرے گا اور پھر اسی کے پاس واپس کیے جاؤ گے۔''

﴿اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَ النَّهَارِ وَ الْفُلْكِ الَّتِيْ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَ بَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ وَّ تَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ﴾ (بقرہ:۱۶۴)

''آسمان اور زمین کی پیدائش میں' شب و روز کے اختلاف میں' ان کشتیوں میں جو سمندر میں انسانوں کے لیے سودمند چیزوں کو لے کر چلتی ہیں' بادلوں سے پانی برسانے میں' اس پانی سے مردہ زمین کو زندہ کرنے میں اور اس زمین میں ہر قسم کے جانداروں کو پھیلانے میں ہواؤں کو چلانے میں' ان بادلوں میں جو فضائے آسمان میں مسخر ہیں دانش مندوں کے لیے یقیناً بڑی نشانیاں ہیں۔''

﴿وَ لَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا وَّ اِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ﴾ (آل عمران: ۸۳)

''آسمان و زمین میں جو بھی ہے برضا یا مجبوراً اسی کا اطاعت گزار ہے اور اسی کی طرف ایک دن سب لوٹائے جائیں گے۔''

﴿اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَ النَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ○ الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَ يَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا﴾ (آل عمران:۱۹۰'۱۹۱)

''آسمان و زمین کی خلقت اور شب و روز کے الٹ پھیر میں ان ارباب عقل کے لیے بے شبہ بڑی نشانیاں ہیں جو اٹھتے' بیٹھتے' لیٹتے (ہر حال میں) خدا کو یاد کرتے ہیں' اور آسمان و زمین کی خلقت پر غور کرتے ہیں کہ خدایا تو نے یہ بیکار پیدا نہیں کیا۔''

﴿هُوَ الَّذِيْ يُسَيِّرُكُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ حَتّٰٓى اِذَا كُنْتُمْ فِي الْفُلْكِ وَ جَرَيْنَ بِهِمْ بِرِيْحٍ طَيِّبَةٍ وَّ فَرِحُوْا بِهَا جَآءَتْهَا رِيْحٌ عَاصِفٌ وَّ جَآءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّ ظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ اُحِيْطَ بِهِمْ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ﴾ (یونس:۲۳)

''وہ وہ ہے جو تم کو خشکی اور دریا میں سفر کراتا ہے' یہاں تک کہ جب تم کشتی میں ہوتے ہو اور موافق ہوا

کشتی والوں کے لیے جاری ہے اور لوگ خوش ہو رہے ہیں کہ (دفعتاً) زور کا جھکڑ آیا' اور ہر طرف سے موجیں آ گئیں اور لوگوں کو یقین ہو چلا کہ اب وہ گھر گئے اس وقت وہ خدا کو مخلص ہو کر پکارنے لگتے ہیں۔"

﴿وَ مِنْ اٰیٰتِهٖۤ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْۤا اِلَیْهَا وَ جَعَلَ بَیْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّ رَحْمَةً اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ ○ وَ مِنْ اٰیٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَ اَلْوَانِكُمْ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّلْعٰلِمِیْنَ ○ وَ مِنْ اٰیٰتِهٖ مَنَامُكُمْ بِالَّیْلِ وَ النَّهَارِ وَابْتِغَآؤُكُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّسْمَعُوْنَ ○﴾ (الروم ۲۱'۲۳)

"اور خدا کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ تمہارے لیے تم ہی میں سے جوڑے بنائے کہ تم کو ان سے تسلی ہو' اور تم میں باہمی محبت اور ہمدردی پیدا کی' اس بات میں سوچنے والوں کے لیے نشانیاں ہیں اور اس کی نشانیوں میں سے آسمان اور زمین کا پیدا کرنا ہے اور تمہاری زبانوں اور رنگوں کا مختلف ہونا ہے' اس بات میں جاننے والوں کے لیے نشانیاں ہیں اور خدا کی نشانیوں میں سے تمہارا رات اور دن میں سونا' خدا کے فضل (روزی) کو ڈھونڈنا ہے اس میں سننے والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔"

خدا یا ایک قوتِ اعظم کا اعتراف خود انسان کی فطرت ہے لیکن غفلت شعاری اور آبائی اثر اور دیگر اسباب سے یہ فطرت کبھی کبھی مردہ اور بے حس ہو جاتی ہے' قرآن مجید اسی خفتہ حس کو بیدار کرتا ہے:

﴿اَفِی اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ﴾ (ابراہیم:۱۰)

"کیا خدا میں شک ہے جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے۔"

﴿كَیْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَ كُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْیَاكُمْ ثُمَّ یُمِیْتُكُمْ ثُمَّ یُحْیِیْكُمْ ثُمَّ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ﴾ (بقرہ:۲۸)

"اور کیسے تم خدا کا انکار کرتے ہو' حالانکہ تم بے جان تھے تو اس نے تم کو زندگی دی' پھر وہ تم کو موت دے گا' پھر وہ تم کو زندہ کرے گا' پھر تم اس کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔"

عرب میں ملحد کم تھے' زیادہ تر بلکہ تمام تر مشرکین تھے جو خدا کو اگرچہ مانتے تھے' لیکن یہ بھی مانتے تھے کہ اس کے سوا اور بھی خدا ہیں جو خدا کے شریک ہیں اور نظامِ عالم ان ہی کے ہاتھ سے انجام پاتا ہے' انسان کی فطرت ہے کہ جس سے براہِ راست اس کو کام پڑتا ہے اس کو زیادہ مانتا ہے' اسی سے زیادہ محبت کرتا ہے' اسی کی زیادہ پرستش کرتا ہے' چونکہ مشرکین کا اعتقاد تھا کہ بادلوں کی بارش' غلہ کی پیداوار' نباتات کی روئیدگی' سب اجرامِ فلکی یا اصنام کا کام ہے' اس لیے ان کو عبدیت کا جو کچھ تعلق تھا ان ہی معبودوں سے تھا' وہ انہی کی عبادت کرتے تھے' ان ہی سے محبت رکھتے تھے' ان ہی پر نذر چڑھاتے تھے' ان ہی کے سامنے قربانیاں کرتے تھے' معرکوں میں انہی کے نام کی جے

پکارتے تھے' اس بنا پر آنحضرت ﷺ کا اصلی کام اسی شرک اور اصنام پرستی کو مٹانا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں اصلِ وجودِ باری کے متعلق بہت کم استدلال ہے' زیادہ تر شرک کا ابطال اور اس کی تحقیر اور تہجین ہے۔

قرآن مجید طرح طرح سے نہایت مؤثر پیرایوں میں شرک کی لغویت کا اظہار کرتا تھا:

﴿اَمَّنْ جَعَلَ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّ جَعَلَ خِلٰلَهَا اَنْهٰرًا وَّ جَعَلَ لَهَا رَوَاسِیَ وَ جَعَلَ بَیْنَ الْبَحْرَیْنِ حَاجِزًا ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ ○ اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَ یَكْشِفُ السُّوْٓءَ وَ یَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ قَلِیْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ○ اَمَّنْ یَّهْدِیْكُمْ فِیْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ وَ مَنْ یُّرْسِلُ الرِّیٰحَ بُشْرًۢا بَیْنَ یَدَیْ رَحْمَتِهٖ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ تَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا یُشْرِكُوْنَ ○ اَمَّنْ یَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ یُعِیْدُهٗ وَ مَنْ یَّرْزُقُكُمْ مِنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ○﴾ (النمل ۶۱:۶۴)

''کیا وہ جس نے زمین کو قرارگاہ بنایا اور اس کے بیچ میں نہریں بہائیں اور اس کے لیے پہاڑوں کی میخیں گاڑیں اور دونوں دریاؤں میں اوٹ رکھا' کیا خدا کے ساتھ کوئی اور بھی خدا ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ان میں اکثر لوگ جانتے نہیں۔ کیا وہ جو پریشان خاطروں کی سنتا ہے جب وہ اس کو پکارتے ہیں' اور بلا کو ہٹا دیتا ہے اور تم کو دنیا کا حکمران بناتا ہے۔ کیا خدا کے ساتھ کوئی اور بھی خدا ہے؟ تم بہت کم سوچتے ہو' کیا وہ جو تم کو خشکی اور تری کی اندھیریوں میں راستہ دکھاتا ہے اور وہ جو کہ اپنی رحمت (بارش) کے آگے ہواؤں کو بھیجتا ہے' کیا خدا کے ساتھ کوئی اور بھی خدا ہے' مشرکین جن کو خدا کا شریک کہتے ہیں خدا ان سے برتر ہے' آیا کون ہے جو آفرینش کا آغاز کرتا ہے پھر اس کو لوٹاتا ہے' اور وہ کون ہے جو تم کو آسمان و زمین سے روزی دیتا ہے کیا خدا کے سوا کوئی اور ہے تو کہہ دے کہ اگر سچے ہو تو دلیل لاؤ۔''

کفار و مشرک عموماً قیامت کے منکر تھے' اور کہتے تھے کہ ﴿مَنْ یُّحْیِ الْعِظَامَ وَ هِیَ رَمِیْمٌ﴾ یعنی ''جب ہڈیاں گل سڑ چکیں تو اب کون ان کو جلائے گا'' قرآن مجید ان سے خطاب کرتا تھا:

﴿اَلَمْ یَكُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِیٍّ یُّمْنٰى ○ ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوّٰى فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَیْنِ الذَّكَرَ وَ الْاُنْثٰى ○ اَلَیْسَ ذٰلِكَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ یُّحْیِیَ الْمَوْتٰى ○﴾ (قیامۃ: ۳۷'۴۰)

''کیا انسان پہلے منی نہیں تھا' پھر گوشت کا لوتھڑا بنا' پھر خدا نے اس کو ٹھیک کیا اور اس سے دو جوڑ مرد اور عورت بنائے کیا وہ اس پر قادر نہیں کہ مردے کو زندہ کر دے۔''

غرض عقائد' عبادات' اخلاق' اعمال' ہر چیز کو قرآن اس مؤثر اور دل نشین طریقہ سے ادا کرتا تھا کہ دل میں گھر کر جاتا تھا اور رسم و عادات کا بند اس سیلاب کو کسی طرح روک نہیں سکتا تھا۔ اس پر بھی جو کفر پر ثابت قدم رہے وہ ذاتی اغراض کا اثر تھا' حقیقی جحود اور انکار نہ تھا۔

تمام بڑے بڑے صحابہؓ' بڑے بڑے روسائے قبائل' بڑے بڑے شعراء اور خطباء قرآن ہی سن کر ایمان

لائے' حضرت عمرؓ کس ارادہ سے چلے تھے لیکن جب قرآن مجید کی آیتیں سنیں تو کانپ اٹھے اور اسلام قبول کرلیا' عتبہ جو رئیسِ قریش اور علومِ عرب کا ماہر تھا جب اس نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آ کر کہا کہ تم نبوت کی دعوت سے باز آؤ' ہم تمہارے لیے سب کچھ مہیا کر دیتے ہیں آپؐ نے حٰمٓ السجدۃ کی ابتدائی آیتیں پڑھیں' جب یہ آیت آئی۔

﴿فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَقُلْ اَنْذَرْتُكُمْ صٰعِقَةً مِّثْلَ صٰعِقَةِ عَادٍ وَّ ثَمُوْدَ﴾ (حم السجدۃ:۱۳)

''تو اگر وہ منہ پھیریں تو کہہ دے کہ میں تم کو اس کڑک سے ڈراتا ہوں جو عاد و ثمود کی کڑک کی طرح ہے۔''

تو عتبہ نے بیتاب ہو کر آنحضرت ﷺ کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور کہا خدا کے لیے بس تم کو قرابت کی قسم دلاتا ہوں پھر واپس جا کر قریش سے کہا کہ محمد جو کلام پیش کرتے ہیں' وہ نہ تو شعر ہے' نہ جادو ہے اور نہ کہانت ہے (۱) (بلکہ کوئی اور چیز ہے) حضرت ابوذرؓ نے اسلام لانے سے پہلے اپنے بھائی انیس کو جو شعرائے عرب میں تھے' آنحضرت ﷺ کی خدمت میں تحقیقِ حال کے لیے بھیجا تھا' وہ خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے اور قرآن مجید سنا تو جا کر حضرت ابوذرؓ سے کہا کہ لوگ ان کو کاہن اور شاعر کہتے ہیں لیکن میں کاہنوں اور شاعروں دونوں کے کلام سے واقف ہوں' ان کا کلام دونوں سے الگ ہے' انیس کے بعد حضرت ابوذرؓ خود گئے اور واپس آئے تو ان کا آدھا قبیلہ اسی وقت مسلمان ہو گیا۔ (۲)

ولید بن مغیرہ (حضرت خالدؓ کا باپ) جو اسلام کا سب سے بڑا دشمن تھا' جب آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے یہ آیتیں پڑھیں:

﴿اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَ الْاِحْسَانِ وَ اِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى وَ يَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْكَرِ وَ الْبَغْيِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ﴾ (النحل:۹۰)

''خدا عدل کا' احسان کا اور رشتہ داروں کو عطا کرنے کا حکم دیتا ہے اور فحش سے' بری بات سے اور ظلم کرنے سے منع کرتا ہے۔ وہ تم کو سمجھاتا ہے کہ شاید تم سمجھ جاؤ۔''

ولید نے کہا پھر پڑھنا' آپؐ نے دوبارہ پڑھا' واپس گیا اور قریش سے جا کر کہا کہ یہ انسان کا کلام نہیں۔ (۳)

عثمان بن مظعونؓ بڑے پایہ کے صحابی اور سابقینِ اسلام میں ہیں یہی آیتیں ہیں جن کو سن کر ان کے دل نے سب سے پہلے اسلام کا جلوہ دیکھا' وہ خانہ کعبہ کو جا رہے تھے کہ آنحضرت ﷺ نے راستہ میں اپنے پاس بٹھا

---

(۱) علامہ ابن تیمیہ نے الجواب الصحیح جلد ۴ ص ۴۴ میں مسند ابو یعلیٰ وغیرہ سے روایت نقل کی ہے نیز یہ روایت مستدرک حاکم میں بھی ہے۔

(۲) صحیح مسلم فضائل حضرت ابوذرؓ

(۳) الجواب الصحیح جلد ۴ ص ۴۶ بحوالہ عبدالرزاق۔

لیا' پھر فرمایا کہ ابھی مجھ پر یہ کلام اترا ہے' یہ کہہ کر آپؐ نے اوپر والی آیتیں پڑھیں' عثمانؓ کہتے ہیں کہ یہ پہلا موقع تھا کہ اسلام نے میرے دل میں گھر کیا۔ (۱)

جبیرؓ بن مطعم نے کفر کے زمانہ میں آنحضرت ﷺ کو سورۂ طور پڑھتے سنا جب اس آیت پر پہنچے:

﴿اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَيْرِ شَیْءٍ اَمْ هُمُ الْخَالِقُوْنَ ○ اَمْ خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بَلْ لَّا يُوْقِنُوْنَ ○ اَمْ عِنْدَهُمْ خَزَآئِنُ رَبِّكَ اَمْ هُمُ الْمُصَيْطِرُوْنَ ○﴾ (الطّور:۳)

''کیا یہ لوگ از خود پیدا ہو گئے یا یہ خود خالق ہیں' کیا آسمان اور زمین کو ان ہی لوگوں نے پیدا کیا بلکہ (واقعہ یہ ہے کہ) ان میں ایمان نہیں کیا ان کے پاس خدا کے خزانے ہیں' کیا یہی لوگ سر براہِ کار ہیں۔''

تو خود جبیرؓ کا بیان ہے کہ مجھ کو یہ معلوم ہوتا تھا کہ میرا دل اڑنے لگا۔ (۲)

طفیل بن عمروؓ الدوسی مشہور شاعر اور شرفائے عرب میں تھے' ہجرت سے پہلے وہ مکہ گئے' لوگوں کو ان کے آنے کی خبر ہوئی تو ان کے پاس گئے اور آنحضرت ﷺ کی نسبت کہا کہ ان کے پاس نہ جانا' وہ لوگوں پر جادو کر دیتے ہیں' لیکن جب حرم میں اتفاقیہ آنحضرت ﷺ کی زبان سے قرآن سنا تو ضبط نہ کر سکے اور مسلمان ہو گئے۔ (۳)

ہجرت سے پہلے آنحضرت ﷺ نے جب طائف کا سفر کیا اور مشرکین کو اسلام کی دعوت دی تو اگرچہ ادھر سے اس کا جواب ڈھیلا اور پتھر تھا' تاہم خالد العدوانیؓ نے جو طائف کے رہنے والے تھے' آپؐ کو۔

﴿وَ السَّمَآءِ وَ الطَّارِقِ﴾ (الطارق:۱)

''قسم ہے آسمان کی اور رات کے چلنے والے ستارے کی۔''

پڑھتے سنا تو وہ اس قدر متاثر ہوئے کہ انہوں نے اسی حالتِ کفر میں پوری سورہ یاد کر لی اور آخر اسلام لائے۔ (۴)

حضرت ابوبکرؓ کو قیام مکہ کے زمانہ میں مشرکین نے اپنی پناہ میں لے لیا تھا' اسی زمانہ میں انہوں نے ایک مسجد بنوائی تھی اور اس میں نماز پڑھا کرتے تھے' لیکن نماز بلند آواز سے پڑھتے تھے جس کو سن کر محلّہ کے نوجوان اور عورتیں جمع ہو جاتیں اور قرآن سنتیں تو ان کا دل خود بخود اسلام کی طرف کھنچتا' چنانچہ اسی بنا پر کفار نے حضرت ابوبکرؓ سے شکایت کی کہ قرآن پکار کر نہ پڑھا کرو اس سے ہمارے بچے اور عورتیں مفتون ہوتی جاتی ہیں۔ (۵) انصارِ اول

(۱) مسند ابن حنبل ج اول ص ۱۳۸ و ادب المفرد امام بخاری باب البغی۔
(۲) صحیح بخاری التفسیر سورۂ طور۔
(۳) ان کے اسلام کا حال ابن القیم (زاد المعاد) نے بہ تفصیل لکھا ہے اور ابن اسحاق کے حوالہ سے لکھا ہے۔
(۴) مسند ابن حنبل ج ۴ ص ۳۳۵۔
(۵) بخاری شریف ذکر ہجرت۔

جب مقامِ عقبہ میں اسلام لائے تو قرآن ہی سن کر اسلام لائے تھے' جو لوگ داعی بنا کر بھیجے جاتے ان کو قرآن یاد کرایا جاتا اور وہ جہاں جاتے یہی کارگر آلۂ تسخیر لے کر جاتے' نجاشی کے دربار میں کفارِ قریش جب سفیر بن کر گئے' اور ان کی شکایت پر نجاشی نے مسلمانوں کو بلا کر باز پرس کی تو حضرت جعفر طیارؓ نے قرآن مجید کی چند آیتیں پڑھیں نجاشی بے اختیار رو پڑا اور کہا کہ خدا کی قسم یہ کلام اور انجیل ایک ہی چشمہ سے نکلے ہیں۔ (۱)

حبش میں جب آپؐ کی بعثت کا چرچا ہوا تو بیس شخص جو مذہباً عیسائی تھے' تحقیقِ حال کے لیے مکہ میں آئے اور آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپؐ نے ان کے سامنے قرآن مجید کی آیتیں پڑھیں ان کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے اور اسی وقت اسلام لائے' آنحضرت ﷺ کے پاس سے یہ لوگ اٹھے تو ابو جہل نے ان سے مل کر کہا کہ تم سخت احمق ہو' اتنے دور سے سفر کر کے آئے اور دم بھر میں اپنا مذہب بدل لیا' انہوں نے کہا ہم تم سے لڑنا نہیں چاہتے۔ (۲)

قرآن کی پیشین گوئیوں کی صداقت نے بھی لوگوں کے دلوں کو کھینچا' چنانچہ اہلِ ایران کے مقابلہ میں رومیوں کی فتح کی جو پیشین گوئی کی تھی جس دن یہ پیشین گوئی حرف بحرف پوری ہوئی' صدہا کافر مسلمان تھے۔ (۳)

ایک ضروری نکتہ

عام خیال یہ ہے کہ اہلِ عرب جو قرآن مجید سن کر اسلام قبول کر لیتے تھے' وہ صرف فصاحت و بلاغت کا کرشمہ تھا یعنی چونکہ عرب میں شعر و خطابت کا بہت چرچا تھا اور تمام ملک میں شاعری کا مذاق سرایت کر گیا تھا اس لیے جب وہ دیکھتے تھے کہ کسی اور شاعر یا خطیب کا کلام ایسا فصیح و بلیغ نہیں ہے تو وہ اسلام قبول کر لیتے تھے۔

بے شبہ قرآن مجید فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے معجزہ ہے لیکن اس کا اعجاز جس قدر عبارت و انشاء میں ہے اس سے کہیں زیادہ معانی و مطالب میں ہے۔

فرض کرو کہ قرآن مجید فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے ایسا ہی معجز ہوتا جیسا اب ہے لیکن اس میں صرف تاریخی واقعات یا اسی قسم کی اور کوئی بات ہوتی تو کیا یہی اثر پیدا ہو سکتا تھا' قرآن مجید ایک طرف تو فصاحت و بلاغت کی بنا پر اعجاز کا کام دیتا تھا' دوسری طرف جو مطالب اور مقاصد ادا کرتا تھا' وہ اسلام ہی کے مقاصد اور مطالب تھے' وہ خدا کی عظمت و جلالت' اصنام کی تحقیر و تذلیل' انسان کا عجز و تعبد' سزا و جزا' بعث و نشر' جور و ظلم کی تقبیح' اخلاقِ حسنہ کی تحسین' ان مطالب کو اس طرح ادا کرتا تھا کہ خود بخود وہ دلوں میں گھر کرتے تھے اور ان کو یہ نظر نہیں آتا تھا کہ وہ ان باتوں کو اس لیے مان رہے ہیں کہ مسلمان ہو چکے ہیں بلکہ یہ باتیں براہِ راست ان کے دل میں اتر

---

(۱) مسند ابن حنبل ج ۵ ص ۲۹۱۔

(۲) ابن ہشام ج ۱ ص ۱۳۶ مطبوعہ مصر ذکر ہجرت حبش۔

(۳) صحیح ترمذی تفسیر سورۂ روم۔

جاتی تھیں اور وہ مسلمان ہو جاتے تھے۔

موانع کا ازالہ

عرب کو جو چیزیں اسلام سے روکتی تھیں ان میں سب سے اہم (جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں) ان کے اوہام اور اعتقاداتِ باطلہ تھے، جو سینکڑوں ہزاروں برس سے چلے آتے تھے یا سیاسی و معاشی ضرورتیں تھیں، مقدم الذکر باتوں کا قرآن مجید اور اعجازِ نبوی نے استیصال کر دیا، عرب میں جو لوگ صاحبِ فہم اور ذی اثر تھے اور سیاسی اسباب سے مجبور نہ تھے، یہ ناممکن تھا کہ وہ قرآن سنتے اور ان کے تمام عقائد اور اوہام دفعتاً فنا نہ ہو جاتے، یہ اربابِ اثر جب خود متاثر ہو جاتے تھے تو ان میں سے ایک ایک شخص کے اثر سے ہزاروں اشخاص مسلمان ہو جاتے تھے کیونکہ قبائل پرستی کی بنا پر قبیلہ کا ہر معزز رئیس اپنے پورے قبیلے کے دل و دماغ کا مالک ہوتا تھا۔

البتہ جو لوگ سیاسی اسباب سے مطلقاً دعوتِ اسلام کی طرف متوجہ ہی ہونا نہیں چاہتے تھے، انہوں نے بار بار دارالنبوۃ (مدینہ منورہ) پر چڑھائیاں کیں، لیکن نصرتِ ایزدی نے ان کو اس قدر شکستیں دیں کہ بالآخر مجبور ہو کر بیٹھ گئے، ان میں سے کچھ فنا ہو گئے کچھ چار و ناچار اسلام کے حلقہ میں داخل ہوئے، جن میں سے اکثر رفتہ رفتہ بالآخر دل سے مسلمان بن گئے۔

قبائل کی ریاست سیاسی حیثیت سے گو اسلام کے مخالف تھی لیکن بعض وجوہ سے اسلام کو تائید بھی پہنچاتی تھی، اسلام کی جمہوریت جس قدر ریاست کی مخالف تھی، اس قدر عام جماعت کی حامی تھی، اسلام سے اگر ایک رئیس کی شانِ ریاست و خودسری کو نقصان پہنچتا تھا تو ہزاروں آدمیوں کو نظر آتا تھا کہ اسلام قبول کر لینے سے ہر شخص رئیس کا ہمسر ہو جاتا ہے، غرض اسلام اگر ایک رئیس کو مٹاتا تھا تو سینکڑوں کو رئیس بنا دیتا تھا۔

اس کے ساتھ رؤسا کی ریاست بالکل زائل نہیں ہو جاتی تھی بلکہ اسلام قبول کرنے پر وہ اپنے قبیلہ کے رئیس باقی رہتے تھے، صرف اتنا ہوتا تھا کہ ان کی بے قید مطلق العنانی قائم نہیں رہتی تھی اور اسلامی احکام کا پابند رہنا پڑتا تھا، اس لیے اگر کوئی خودغرضی بھی کرنا چاہتا تھا تو اس کو بھی یہ سودا گراں نہیں پڑتا تھا، مؤلفۃ القلوب کا گروہ اس کی ایک صریحی نظیر تھا۔

اب صرف معاشی ضرورت سدِ راہ ہو سکتی تھی، لیکن لوگوں کو نظر آتا تھا کہ جن حدود میں اسلام کی حکومت قائم ہو جاتی ہے وہاں امن و امان قائم ہونے کی وجہ سے تجارت اور دیگر ذریعۂ معاش کثرت سے ترقی کر جاتے ہیں۔

(۲) نبوت کے متعلق ان کو جو شکوک تھے، مشاہدہ اور تجربہ نے ان کا پردہ چاک کر دیا، بڑی سے بڑی انسانیت اور پاک سے پاک زندگی کا جو تخیل ایک انسان کے ذہن میں آ سکتا تھا، محمد رسول اللہ ﷺ کی زندگی اس سے بھی بدرجہا بالاتر اور ارفع تھی، ان کو نظر آتا تھا کہ گو مدعیِ نبوت بظاہر جامۂ بشریت میں ہے لیکن اپنی معنوی زندگی، اپنے معجزانہ اخلاق، اپنے مافوق الفطرت علم و معرفت، اپنے ربانی کرشموں کی بنا پر بشریت سے کوئی بالاتر مخلوق

ہے ﴿مَا هٰذَا بَشَرًا اِنْ هٰذَا اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ﴾ قرآن مجید نے آنحضرت ﷺ کے صدقِ نبوت پر اسی مقدس اور معصوم زندگی سے استدلال کیا ہے:

﴿فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ﴾ (یونس:۱۶)

''اے قریش! نبوت سے پہلے بھی میں نے تم میں ایک مدت دراز تک زندگی بسر کی ہے' کیا تم نہیں سمجھتے۔''

زندگی کا یہی اعجاز تھا۔ جس سے ظہورِ نبوت سے پہلے ہی امین کا خطاب آپ نے حاصل کر لیا تھا' بیوی کے برابر انسان کے اصلی حالات و اخلاق کا واقف کار کوئی اور نہیں ہو سکتا' نبوتِ محمدی کا معتقدِ اولین دنیا میں کون تھا' ام المومنین خدیجہؓ بنت خویلد لیکن ان کی اس زود اعتقادی کا راز کیا تھا' چالیس برس کے معجزانہ اخلاق اور مافوق الفطرت اوصاف و حالات کا تجربہ' وہ خود پیغمبر کو خطاب کر کے نبوت کی تسکین ان الفاظ میں دیتی ہیں۔ ''محمد! خدا کبھی تمہیں رسوا نہ کرے گا۔ تم رشتہ داروں کے ساتھ احسان کرتے ہو' ناداروں کی طرف سے قرض ادا کرتے ہو' محتاجوں کی خبر لیتے ہو' مہمانوں کے ساتھ بہ مدارات پیش آتے ہو جو لوگ حقیقت میں مبتلائے آلام ہیں ان کی اعانت کرتے ہو۔ (۱)

سن چکے ہو کہ عرب میں آپؐ کی نبوت کا جب چرچا ہوا تو ابوذر غفاریؓ نے انیسؓ اپنے بھائی کو حقیقت حال کے لیے بھیجا۔ انہوں نے واپس آ کر پیکرِ نبوت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا۔ ''میں ایک ایسے شخص کو دیکھ کر آیا ہوں جو بھلائیوں کا حکم دیتا ہے اور برائیوں سے روکتا ہے۔'' (۲)

نبوت کے بعد قریش نے ذاتِ نبوی کے ساتھ گو عداوت اور کینہ پروری کا کوئی پہلو اٹھا نہیں رکھا' تاہم کوئی ادنیٰ اخلاقی جرم بھی آپؐ کی طرف منسوب نہ کر سکے' اسلام کے سب سے اول اعلانِ دعوت کے موقع پر جب آپؐ نے ایک پہاڑ پر کھڑے ہو کر قریش کے مجمع کو خطاب کیا اور پوچھا کہ اگر میں کہوں کہ اس پہاڑ کی پشت پر ایک فوجِ گراں تم پر حملہ آور ہونے کو تیار ہے' تو کیا سچ مانو گے؟ سب نے بیک آواز کہا۔ ''محمد! تیری بات آج تک ہم نے جھوٹ نہ پائی۔'' (۳) ابوسفیانؓ جو ہجرت کے آٹھویں سال تک اسلام کے سخت ترین دشمن تھے' ۶ھ میں ہرقل قیصرِ روم کے دربار میں کفارِ قریش کی ایک جماعت کے ساتھ محمد رسول اللہ ﷺ کے اخلاق و اوصاف کے متعلق اپنی شہادتیں پیش کر رہے تھے' تاہم وہ ایک حرف بھی صداقت کے خلاف پیش نہ کر سکے' انہوں نے شہادت دی کہ محمد کبھی جھوٹ نہیں بولتے' انہوں نے کبھی بدعہدی نہ کی' شرک سے روکتے ہیں' توحید کی تعلیم دیتے ہیں' عبادت' صدق' عفت' صلہ رحمی کی تاکید کرتے ہیں' ہرقل ہر فقرہ پر کہتا جاتا تھا کہ نبوت کے یہی آثار و دلائل ہیں' یہ سب سے

(۱) صحیح بخاری بدء الوحی۔
(۲) صحیح بخاری جلد اول ص ۴۹۹ قصۂ اسلام ابی ذرؓ۔
(۳) صحیح بخاری تفسیر سورۂ تبت و صحیح مسلم کتاب الایمان باب۔

پہلا دن تھا کہ ابوسفیانؓ کے دل نے آنحضرت ﷺ کی کامیابی کا یقین کیا۔ (۱)

کتاب کی دوسری جلد میں آپؐ کے تمام محاسنِ اخلاق، یعنی رفق، ملاطفت، حسنِ معاملت، جود وسخا، عدم تشدد، عفو ودرگزر وغیرہ کی جو تفصیل بیان کی گئی ہے اس پر مجموعی طور پر نگاہ ڈالنے سے معلوم ہوسکتا ہے کہ وہ درحقیقت آنحضرت ﷺ کا ایک معجزہ تھا اور یہ معجزہ تسخیرِ قلوب ہی کے لیے عطا ہوا تھا، قرآن مجید اس نکتہ کو خود بتاتا ہے:

﴿وَ لَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ﴾ (آل عمران:۱۵۹)

''اور محمد! اگر تم درشت خو اور سخت دل ہوتے تو لوگ تمہارے پاس سے چل دیتے۔''

آپؐ کی یہی معجزانہ کشش تھی جو لوگوں کو کھینچ کھینچ کر دائرۂ اسلام میں داخل کرتی تھی، اور کفار کے جاہلانہ شکوک واوہام کو دم کے دم میں مٹا دیتی تھی، صحیح مسلم میں ہے کہ ایک شخص نے آپ سے بہت سی بکریاں مانگیں، آپؐ نے دے دیں، اس پر آپؐ کی فیاضی کا اس قدر اثر پڑا کہ اپنے قبیلے میں جا کر اس نے کہا۔ ''لوگو مسلمان ہو جاؤ کیونکہ محمد اس قدر دیتے ہیں کہ ان کو خود اپنے تنگ دست ہونے کا مطلق خوف نہیں ہوتا۔ (۲)

فتح مکہ میں جب صفوان بن امیہ مجبوراً اسلام لایا تو آنحضرت ﷺ نے اس کو تین سو اونٹ دے دیئے، خود صفوان کا بیان ہے کہ آنحضرت ﷺ نے مجھ کو اس قدر دیا کہ آپؐ پہلے میرے نزدیک مبغوض ترین خلق تھے لیکن اس فیاضی سے محبوب ترین شخص بن گئے، (۳) ہندہ خاندانِ نبوت کی قدیم ترین دشمن تھی، جنگِ احد میں قوتِ بازوئے اسلام حضرت حمزہؓ کے شکم کو اسی نے چاک کیا تھا۔ اسی نے ان کا جگر نکال کر چبایا تھا جس کو نگل نہ سکی اور پھر اگل دیا تھا، اور اسی نے بعض شہیدوں کے ناک کان کاٹ کر گلے کا ہار بنایا تھا۔ وہ فتح مکہ میں بھیس بدل کر آپؐ کی خدمت میں اسلام لانے کے لیے حاضر ہوئی اور اب بھی گستاخی سے باز نہیں آئی، لیکن دربارِ رسالت میں پہنچ کر آپؐ کے حسنِ خلق سے اس قدر متاثر ہوئی کہ بے اختیار بول اٹھی یا رسول اللہ ﷺ! روئے زمین پر آپؐ کے گھرانے سے زیادہ کوئی گھرانہ مجھے مبغوض نہ تھا لیکن آج آپؐ کے گھرانے سے زیادہ کوئی گھرانا محبوب نہیں ہے آپ نے یہ سن کر فرمایا خدا کی قسم ہمارا بھی یہی حال تھا۔ (۴)

آپؐ پر ایک یہودی عالم کا قرض آتا تھا۔ اس نے تقاضا کیا تو آپؐ نے فرمایا کہ اس وقت میرے پاس کچھ نہیں ہے اس نے کہا کہ میں تو لے ہی کے ٹلوں گا۔ آپؐ نے فرمایا تو اب میں تمہارے ساتھ بیٹھتا ہوں۔ چنانچہ آپؐ ظہر سے لے کر فجر کی نماز تک اس کے ساتھ بیٹھے رہے۔ صحابہؓ نے اس کی اس گستاخی پر ناراضی ظاہر کی اور خدمتِ اقدس میں عرض کی کہ یا رسول اللہ! آپؐ کو ایک یہودی نے روک رکھا ہے۔ آپؐ نے فرمایا ہاں، لیکن مجھے

---

(۱) صحیح بخاری بدء الوحی۔

(۲) صحیح مسلم ج۲ ص۲۹۰ باب ماسئل رسولا شیئاً قط فقال لا صحیح بخاری باب حسن الخلق والسخا۔

(۳) صحیح مسلم باب مذکور۔

(۴) مسلم جلد۲ ص۵۵ باب قضیہ ہند۔

خدا نے اس سے منع کیا ہے کہ میں کسی ذمی یا اور کسی شخص پر ظلم کروں۔ دن چڑھا تو یہودی نے کلمہ پڑھا اور کہا کہ ''میرا نصف مال خدا کی راہ میں صدقہ ہے میں نے یہ گستاخی اس لیے کی توراۃ میں پیغمبر کے جو اوصاف مذکور ہیں ان کا تجربہ کروں۔ (۱)

ثمامہ بن اثال یمامہ کا ایک رئیس تھا جو اسلام کا مجرم تھا' صحابہؓ کا ایک دستہ نجد کے اطراف میں بھیجا گیا تھا' حسنِ اتفاق سے وہ راہ میں مل گیا' گرفتار ہو کر مدینہ آیا اور مسجد نبوی کے ایک ستون میں باندھ دیا گیا' آنحضرت ﷺ نماز کے لیے تشریف لائے تو اس پر نظر پڑی آپؐ نے دریافت کیا کہ ثمامہ تمہارے ساتھ کیا برتاؤ کیا جائے؟ اس نے کہا کہ اگر قتل کرنا چاہیں تو ایک خونی مجرم کو آپ قتل کریں گے اور اگر عفو فرمائیں تو یہ احسان ایک احسان شناس کی گردن پر ہوگا' اگر مال کی خواہش ہے تو فرمایئے جو ارشاد ہوگا حاضر کیا جائے گا۔ یہ سن کر آپ اسی حالت میں اس کو چھوڑ کر چلے گئے' دوسرے دن پھر اسی قسم کا سوال و جواب ہوا' تیسرے دن پھر یہی گفتگو ہوئی' آنحضرت ﷺ نے اپنے دستِ مبارک سے اس کی بند گرہ کھول دی اور رہا کر دیا' اس پر اس واقعہ کا یہ اثر ہوا کہ مسجد سے نکل کر ایک کھجور کی آڑ میں گیا اور وہاں غسل کیا' غسل کر کے مسجد میں آیا اور کلمۂ توحید پڑھ کر آنحضرت ﷺ کی طرف مخاطب ہوا۔ محمد! زمین پر آپ کے چہرہ سے زیادہ کوئی چیز مجھ کو مبغوض نہ تھی' لیکن آج وہ مجھ کو سب سے زیادہ محبوب ہے' مجھ کو آپؐ کے دین سے زیادہ کسی دین سے عداوت نہ تھی' لیکن وہ آج میرے لیے تمام مذاہب سے عزیز تر ہو گیا ہے' مجھے آپؐ کے شہر سے زیادہ کسی شہر سے دشمنی نہ تھی لیکن وہ آج مجھ کو تمام شہروں سے زیادہ خوش نما نظر آتا ہے۔ (۲)

ایک بار آپؐ کسی سفر میں تھے اور پانی ساتھ نہ تھا' صحابہؓ نے پیاس کی شکایت کی' آپؐ نے ایک صحابی کے ساتھ حضرت علیؓ کو پانی کی جستجو میں روانہ فرمایا' راہ میں ایک عورت اونٹ پر پانی کی دو مشکیں بھری ہوئی لے جا رہی تھی' دونوں صاحب اس کو آنحضرت ﷺ کی خدمت میں لے آئے' آپؐ نے برتن منگوائے اور مشکوں کے منہ کھول دیے' صحابہ نے باری باری سے پانی پینا شروع کر دیا' وہ کھڑی یہ تماشا دیکھتی رہی' فراغت کے بعد اس کی محنت کے صلہ میں آنحضرت ﷺ نے کھجور کا آٹا اور ستو تھوڑا تھوڑا لوگوں سے جمع کر کے ایک کپڑے میں بندھوا کر اس کے اونٹ پر رکھوا دیا' وہ گھر پہنچی تو لوگوں نے تاخیر کا سبب پوچھا' اس نے کہا راہ میں مجھ کو دو آدمی ملے اور وہ مجھ کو اس شخص کے پاس لے گئے جس کو لوگ بد دین کہا کرتے ہیں' خدا کی قسم وہ یا تو اس آسمان و زمین کے درمیان سب سے بڑا جادوگر ہے یا وہ واقعی خدا کا رسول ہے۔

لیکن اسلام کا یہ اثر صرف اسی کی ذات تک محدود نہ رہا' بلکہ تربیت یافتگانِ نبوت کے فیض اثر سے اس کے

---

(۱) مشکوٰۃ ص ۵۲۱ کتاب الفتن فی اخلاقہ ﷺ۔

(۲) صحیح مسلم جلد ۲ ص ۷۶ کتاب الجہاد والسیر۔

تمام قبیلے تک وسیع ہوگیا۔ (۱)

نبی کے امتیاز و شناخت کا ذریعہ صرف اس کا اخلاق ہی نہیں اس کی زبان کا ایک ایک حرف' اس کی معصو شکل وصورت اور اس کی ایک ایک ادا اعجاز اور سرتاپا اعجاز ہوتی ہے۔

روئے وآوازِ پیغمبر معجزہ است (رومی)

آپؐ کی صداقت سے لبریز تقریر کا ایک حرف دل میں اتر جاتا تھا اور نبوت کا اصلی معیار سامع کے سامنے روشن ہو جاتا تھا۔

جب آپؐ ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو تمام مدینہ میں غل پڑ گیا' حضرت عبداللہؓ بن سلام جو مدینہ کے مشہور یہودی عالم تھے اپنے نخلستان میں کھجور توڑ رہے تھے' آمد آمد کی خبر ان کے کان میں پہنچی تو فوراً آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے' آپؐ فرما رہے تھے۔ اَفْشُوا السَّلَامَ وَ اَطْعِمُوا الطَّعَامَ وَ صِلُوا الْاَرْحَامَ وَ صَلُّوْا وَ النَّاسُ یَنَامَ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ بِسَلَامٍ۔ واپس گئے تو اس قدر متاثر تھے کہ آنحضرت ﷺ اٹھ کر حضرت ابوایوب انصاریؓ کے مکان میں جونہی پہنچے' حضرت عبداللہ بن سلام بھی آئے اور کہا کہ میں آپؐ کی رسالت کی گواہی دیتا ہوں اور نیز یہ شہادت دیتا ہوں کہ آپؐ ایک حق مذہب لے کر آئے ہیں۔ (۳)

ضماد ایک شخص تھے' جن کے ساتھ زمانۂ جاہلیت میں آپ کے دوستانہ تعلقات رہ چکے تھے' وہ جنون کا علاج کرتے تھے اتفاق سے وہ مکہ میں آئے تو کفار سے سنا کہ آپ (نعوذ باللہ) مجنون ہو چکے ہیں' وہ آپ کے پاس آئے اور کہا' محمد! میں جنون کا علاج کرتا ہوں' اس کے جواب میں آپ نے ایک تقریر کی اور اس کو ان الفاظ سے شروع کیا:

اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَ نَسْتَعِیْنُهٗ مَنْ یَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَ مَنْ یُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِیَ لَهٗ وَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِیْکَ لَهٗ وَ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَ رَسُوْلُهٗ.

''تمام تعریفیں خدا کے لیے ہیں میں اس کی حمد کرتا ہوں اور اس سے مدد چاہتا ہوں' خدا جس کو ہدایت دیتا ہے اس کو کوئی شخص گمراہ نہیں کر سکتا جس کو گمراہ کرتا ہے اس کو کوئی ہدایت نہیں کر سکتا' میں گواہی دیتا ہوں کہ خدا کے سوا کوئی خدا نہیں ہے وہ تنہا ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں ہے اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد اس کا بندہ اور رسول ہے۔''

ان پر ان فقروں کا یہ اثر پڑا کہ وہ مکرر سننے کے مشتاق ہوئے' آپؐ نے تین بار ان کلمات کا اعادہ فرمایا' انہوں نے کہا میں نے کاہنوں جادوگروں اور شاعروں کا کلام سنا ہے لیکن آپ کے اس کلام کی طرح مؤثر کلام کبھی

(۱) بخاری ج ۱ ص ۴۹ کتاب التیمم۔
(۲) ابن حنبل ج ۵ ص ۴۵۔
(۳) بخاری ج ۱ ص ۵۵۶ باب ہجرت النبی ﷺ واصحابہ الی المدینۃ۔

ہیں سنا' وہ سمندر تک پہنچ جائے گا ہاتھ لائیے' میں اسلام پر بیعت کرتا ہوں۔ (۱)

حضرت حلیمہؓ کے شوہر حارث یعنی آپؐ کے رضاعی باپ جب مکہ میں تشریف لائے تو قریش نے کہا کچھ سنا ہے' تمہارا بیٹا کہتا ہے کہ لوگ مر کر پھر زندہ ہوں گے' انہوں نے آپؐ سے کہا' بیٹا یہ کیا کہتے ہو؟ آپ نے نہایت وردار لہجہ میں فرمایا' ہاں جب وہ دن آیا تو آپؐ کا ہاتھ پکڑ کر بتادوں گا کہ جو کچھ میں کہتا تھا سچ تھا ان پر اس کا یہ اثر ڑا کہ فوراً مسلمان ہو گئے۔ اور یہ اثر اس قدر دیرپا ہوا کہ وہ کہا کرتے تھے کہ اگر میرا بیٹا ہاتھ پکڑے گا تو جنت میں پہنچا کر ہی چھوڑے گا۔ (۲)

انسان کا چہرہ حقیقت کا آئینہ ہے' آپؐ کی ایک ایک ادا صداقت اور معصومیت کا پیکر تھی' آپؐ کی شکل ہایت پر جلال تھی' چہرہ پرنور تھا' آواز موَقر اور پر رعب تھی اور ان تمام چیزوں کا مجموعی اثر پیغمبرانہ اعجاز کے ساتھ لوں کو اپنی طرف کھینچ لیتا تھا۔ حضرت عبداللہؓ بن سلام نومسلم یہودی عالم آپؐ کے چہرۂ مبارک کو دیکھ کر اسی اثر سے تاثر ہوئے اور بے اختیار بول اٹھے تھے۔

وَجْهٌ لَيْسَ بِوَجْهِ كَذَّابٍ (ترمذی ۲۰۹) ''جھوٹے آدمی کا یہ چہرہ نہیں ہوسکتا۔''

اور یہی کشش تھی جس کا اظہار حجۃ الوداع میں اعرابِ بادیہ کی زبان سے ان الفاظ میں ہوا تھا۔

هٰذَا وَجْهٌ مُبَارَكٌ.

''یہ مبارک چہرہ ہے۔''

بارگاہِ نبوت میں پہنچنے کے ساتھ ہی یہ اثر آنکھوں کی راہ سے دل میں پہنچ جاتا تھا' ابورافع نامی ایک شخص قریش کی طرف سے قاصد بن کر آپؐ کی خدمت میں آئے تھے جونہی چہرۂ اقدس پر نظر پڑی اور بہزار جان شیدا تھے' اسلام قبول کیا (۳) اور آپؐ کی غلامی کو فخر سمجھا۔ (۴)

❀ ❀ ❀ ❀

(۱) مسلم باب تخفیف الصلوٰۃ و الخطبۃ۔

(۲) اصابہ جلد ۱ ص ۲۹۲ تذکرہ حارث۔

(۳) ابوداؤد کتاب الجهاد باب السجن بالامام فی العهود۔

(۴) اصابہ واستیعاب۔

اسلام

یا

محمد رسول اللہ ﷺ کا پیغمبرانہ کام

آنحضرت ﷺ جس عظیم الشان پیغام کو لے کر آئے تھے اور جس مہتم بالشان کام کو انجام دینے کے لیے بھیجے گئے تھے نیک دل اور حقیقت شناس لوگ تو سننے اور دیکھنے کے ساتھ اس کے قبول کرنے پر آمادہ ہو گئے لیکن جن کے دل کے آئینے زنگ آلود تھے۔ پیغام کی سچائی، وحی کی تاثیر، پیغمبر کی پر اثر دعوتِ اعجاز، معصومیت اور اخلاق کے پرتو سے صاف و شفاف ہوتے گئے اور عوائق موانع، شبہات اور شکوک کی تو برتو ظلمتیں اور تاریکیاں رفتہ رفتہ چھٹتی چلی گئیں اور اسلام کا نور روز بروز زیادہ صفائی اور چمک کے ساتھ عرب کے افق پر درخشاں اور تاباں ہوتا گیا، یہاں تک کہ ۲۳ برس کی مدت میں ایک متحدہ قومیت، ایک متحدہ سلطنت، ایک متحدہ اخلاقی نظام، ایک کامل قانون، ایک مکمل شریعت، ایک ابدی مذہب اور عملی جماعت، خداپرستی، اخلاص، ایثار، تدین، تقویٰ، ایمانداری، اخلاق اور سچائی کا ایک مجسم عہد یعنی ایک نئی زمین اور ایک نیا آسمان پیدا ہو گیا اور گویا یہی حقیقت تھی، جس کی طرف آپؐ نے اپنی امت کے سب سے بڑے مجمع (حجۃ الوداع) میں اپنی وفات سے تقریباً دو ماہ پیشتر یہ ارشاد فرمایا:

اَلَآ اِنَّ الزَّمَانَ قَد اِستَدَارَ کَھَیئَۃِ یَومَ خَلَقَ اللّٰہُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ. (بخاری)

”ہاں اب زمانہ کا دور اپنی اسی حالت پر آ گیا جس حالت پر اس دن تھا جس دن خدا نے آسمان زمین کو پیدا کیا۔“

اور یہی حقیقت تھی جس کی نسبت آپ نے اپنی وفات سے کچھ دنوں پیشتر ایک نہایت پر درد وداعی تقریر کے آخر میں یہ الفاظ فرمائے :[1]

قَدْ تَرَکْتُمْ عَلَی الْبَیْضَاءِ لَیْلُھَا کَنَھَارِھَا.

”میں تم کو ایک روشن راستہ پر چھوڑ جاتا ہوں جس کی روشنی کا یہ حال ہے کہ اس کی رات بھی دن کے مانند ہے۔“

اور آخری حجۃ الوداع کے مجمع عام میں تکمیل کی بشارت آئی کہ

---

(۱) سنن ابن ماجہ ابواب سنت و بدعت و مستدرک حاکم جلد اول ص ۹۶ و مسند ابن حنبل جلد ۴ ص ۱۲۶۔

﴿اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ﴾ (المائدۃ:۳)

''آج میں نے تمہارا دین کامل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر ختم کر دی۔''

پروفیسر مارگولیتھ جن کی تائیدی شہادت بہت کم مل سکتی ہے' لکھتے ہیں:

''محمد کی وفات کے وقت ان کا سیاسی کام غیر مکمل نہیں رہا۔ آپ ایک سلطنت کی جس کا ایک سیاسی و مذہبی دارالسلطنت مقرر کیا گیا تھا' بنیاد ڈال چکے تھے' آپؐ نے عرب کے منتشر قبائل کو ایک قوم بنا دیا تھا' آپ نے عرب کو ایک مشترک مذہب عطا کیا اور ان میں ایک ایسا رشتہ قائم کیا جو خاندانی رشتوں سے زیادہ مستحکم اور مستقل تھا۔''(۱)

ایک دو (یورپ) کے بیگانہ مستشرق کی بہ نسبت جس کا علم عرب اور اسلام کے متعلق صرف چند کتابوں سے مستعار ہے' خود ایک عرب عیسائی اہل قلم کو فیصلہ کا زیادہ حق حاصل ہے' بیروت کے مسیحی اخبار ''الوطن'' نے ۱۹۱۱ء میں لاکھوں عرب عیسائیوں کے سامنے یہ سوال پیش کیا تھا کہ دنیا کا سب سے بڑا انسان کون ہے؟ اس کے جواب میں ایک عیسائی عالم (داور مجاعص) نے لکھا:

''دنیا کا سب سے بڑا انسان وہ ہے جس نے دس برس (۲) کے مختصر زمانہ میں ایک نئے مذہب' ایک نئے فلسفے ایک نئی شریعت اور ایک نئے تمدن کی بنیاد رکھی' جنگ کا قانون بدل دیا اور ایک نئی قوم پیدا اور ایک نئی طویل العمر سلطنت قائم کر دی لیکن ان تمام کارناموں کے باوجود امی اور ناخواندہ تھا وہ کون؟ محمد بن عبداللہ قریشی' عرب اور اسلام کا پیغمبر' اس پیغمبر نے اپنی عظیم الشان تحریک کی ہر ضرورت کو خود ہی پورا کر دیا' اور اپنی قوم اور اپنے پیروؤں کے لیے اور اس سلطنت کے لیے جس کو اس نے قائم کیا' ترقی اور دوام کے اسباب بھی خود مہیا کر دیئے' اس طرح کہ قرآن اور احادیث کے اندر وہ تمام ہدایات موجود ہیں جن کی ضرورت ایک مسلمان کو اس کی دینی یا دنیاوی معاملات میں پیش آ سکتی ہے' حج کا ایک سالانہ اجتماع فرض قرار دیا تا کہ اقوامِ اسلامی کے اہلِ استطاعت ایک مرکز پر جمع ہو کر اپنے دینی و قومی معاملات میں باہم مشورے کر سکیں' اپنی امت پر زکوٰۃ فرض کر کے قوم کے غریب طبقہ کی حاجت پوری کی' قرآن کی زبان کو دنیا کی دائمی اور عالم گیر زبان بنا دیا کہ وہ مسلمان اقوام کے باہمی تعارف کا ذریعہ بن جائے' قوم کے ہر فرد کو ترقی کا موقع اس طرح عنایت کیا کہ یہ کہہ دیا کہ ایک مسلمان کو کسی دوسرے مسلمان پر صرف تقویٰ کی بنا پر بزرگی حاصل ہے' اس بنا پر اسلام ایک حقیقی جمہوریت بن گیا' جس کا رئیس قوم کی پسند سے منتخب ہوتا ہے مسلمانوں نے ایک مدت تک اس اصول پر عمل کیا' یہ کہہ کر کہ عرب کو عجم پر اور عجم کو عرب پر کوئی فوقیت نہیں' اسلام میں داخل ہونا ہر شخص کے لئے آسان کر دیا' نامسلموں کے لیے اسلامی ملکوں میں عیش و آرام اور امن و اطمینان سے سکونت کی ذمہ داری یہ کہہ کر اپنے اوپر لے لی کہ تمام مخلوق خدا کی اولاد ہے' تو خدا کا سب سے

---

(۱) لائف آف محمد مارگولیوتھ ص ۴۷۱۔

(۲) مدینہ منورہ میں آپ دس برس زندہ رہے تھے۔

زیادہ محبوب وہ ہے جو اس کی اولاد کو سب سے زیادہ فائدہ پہنچائے' خاندانی اور ازدواجی اصلاحات بھی اس کی نظر سے پوشیدہ نہ رہیں' اس نے نکاح و وراثت کے احکام مقرر کیے' عورت کا مرتبہ بلند کیا' نزاعات اور مقدمات کے فیصلے کے قوانین بنائے' بیت المال کا نظام قائم کر کے قومی دولت کو بیکار نہ ہونے دیا' علم کی اشاعت اور تعلیم اس کی کوششوں کا بڑا حصہ رہی' اس نے حکمت کو ایک مومن کا گم شدہ مال قرار دیا' اسی سبب سے مسلمانوں نے اپنی ترقی کے زمانہ میں ہر دروازہ سے علم حاصل کیا' کیا ان کارناموں کا انسان دنیا کی سب سے بڑی ہستی قرار نہ پائے گا۔''

انگلستان کے مشہور انشا پرداز کارلائل نے اپنے ''ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ'' میں لاکھوں پیغمبروں اور مذہب کے بانیوں میں صرف محمد رسول اللہ ﷺ ہی کے وجودِ گرامی کو اس قابل سمجھا کہ وہ آپ کو نبوت کا ہیرو قرار دے' انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کا مضمون نگار آپؐ کی نسبت کہتا ہے:

''قرآن سے اس شخص کے روحانی ارتقا کا پتا چلتا ہے جو تمام نبیوں اور مذہبی لوگوں میں سب سے زیادہ کامیاب رہا۔''(۱)

الغرض دوست و دشمن سب کو اس کا اعتراف ہے کہ انبیا میں یہی برگزیدہ ہستی ہے جس نے کم سے کم مدت میں اپنی بعثت اور رسالت کے زیادہ سے زیادہ فرائض ادا کیے اور اصلاحاتِ انسانی کا کوئی گوشہ ایسا نہ چھوڑا جس کی تکمیل اس کی تعلیم اور عمل سے نہ ہو گئی ہو اور یہ اس لیے کہ تمام انبیاؑ میں خاتمِ نبوت' مکمل دین اور آخری معلم کی حیثیت آپ ہی کو عطا ہوئی تھی اگر انسان کی عملی و اخلاقی و دینی ضرورتوں کا کوئی گوشہ آپ کے فیض سے محروم رہ کر تکمیل کا محتاج ہوتا تو آپ کے بعد بھی کسی آنے والے کی حاجت باقی رہ جاتی' حالانکہ آپ نے فرما دیا کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں' میں نبوت کی عمارت کی آخری اینٹ ہوں۔ ﷺ (۲)

آپ کی تعلیمات کی یہی ہمہ گیری ہے جس پر کوتاہ بینوں کو آج نہیں بلکہ خود صحابہؓ کے عہد میں بھی تعجب ہوتا تھا' بعض مشرکوں نے حضرت سلیمان فارسیؓ سے مذاقاً کہا کہ تمہارے پیغمبر تم کو ہر چیز کی تعلیم دیتے ہیں' یہاں تک کہ اس کی بھی کہ تم کو قضائے حاجت کیونکر کرنی چاہیے' حضرت سلیمانؓ نے کہا ہاں یہ سچ ہے' آپؐ نے ہم کو یہ حکم دیا ہے کہ ہم ایسی حالت میں قبلہ رخ نہ بیٹھیں نہ اپنے داہنے ہاتھ سے طہارت کریں اور نہ تین ڈھیلوں سے کم استعمال کریں' جن میں کوئی ہڈی اور گوبر نہ ہو'(۳) نبوتِ محمدی کی تعلیمات کی یہ ہمہ گیری ہی اس کی تکمیل کی دلیل ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ پست سے پست اور غیر متمدن اقوام سے لے کر بلند سے بلند اور متمدن سے متمدن قوموں تک کے لیے یکساں تعلیمات اور ہدایات رکھتی ہے۔ عرب کے بدووں اور قریش کے رئیسوں دونوں کے لیے آپ کی بعثت تھی۔ اس لیے آپ کی تعلیمات میں پست کو بلند اور بلند کو بلند تر بنانے کی برابر کی ہدایات ہیں' آج

(۱) انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا طبع یازدہم مضمون ''قرآن'' ج ۱۵ ص ۵۹۸۔
(۲) صحیح بخاری جلد اول باب خاتم النبیین و جامع ترمذی کتاب الامثال۔
(۳) جامع ترمذی و سنن ابن ماجہ کتاب الطہارت۔

یہی چیز ہے کہ افریقہ کے وحشیوں میں اسلام اپنی تعلیمات کے ساتھ تنہا جاتا ہے اور ان کو متمدن اور مہذب بنانے کے لیے مذہب سے باہر کسی تعلیم کی اس کو ضرورت پیش نہیں آتی ہے' لیکن عیسوی مذہب کو چند اخلاقیات کو چھوڑ کر کہ جن کا ماخذ انجیل ہے عقائد' پادریوں کی کونسلوں سے دعائیں اور عبادات کلیساؤں کے حکمرانوں سے اور تہذیب وتمدن کی تعلیمات یورپ کے بے دینوں اور ملحدوں سے حاصل کرنی پڑتی ہیں۔ لیکن اسلام میں محمد رسول اللہ ﷺ کے علاوہ کچھ نہیں' عقائد ہوں کہ عبادات اور دعائیں' اخلاق ہوں کہ آدابِ تمدن' خانگی معاملات ہوں یا لین دین کے کاروبار' انسانوں کے ساتھ معاملہ ہو یا خدا کے ساتھ سب کا ماخذ محمد رسول اللہ ﷺ کی ہمہ گیر تعلیمات ہیں۔

اسلام کے چار حصے

آپؐ کی ان ہمہ گیر تعلیمات کی کتاب جو انسانی زندگی کے ہر شعبہ پر حاوی ہے چار ابواب پر منقسم ہے اور ان ہی کے مجموعہ کا نام اسلام ہے۔

آپؐ نے بتایا ہے کہ ہر انسان کا ایک تعلق تو اپنے خالق کے ساتھ ہے اور دوسرا اپنے خالق کی دوسری مخلوقات کے ساتھ اسی مفہوم کو دوسری عبارت میں یوں کہو کہ اس کا ایک تعلق اپنے آقا اور مالک کے ساتھ ہے اور دوسرا اپنے آقا اور مالک کے غلاموں کے ساتھ یا یوں کہو کہ اس کا ایک رخ تو آسمان کی طرف ہے اور دوسرا زمین کی سمت' اس کو ایک لگاؤ تو عالمِ غیب سے ہے اور دوسرا عالمِ شہود سے' پہلے کے ساتھ اس کا تعلق ایک مہربان آقا اور فرمان بردار غلام کا ہے اور دوسروں کے ساتھ اس کا تعلق برادری اور بھائی چارے کا ہے' خالق اور مخلوق یا خدا اور بندہ کے درمیان جو علاقہ اور رابطہ ہے' اس کا تعلق اگر صرف ہمارے ذہنی قویٰ اور قلبی حالات سے ہے' تو اس کا نام عقیدہ ہے' اور اگر ان قلبی حالات کے ساتھ' ہمارے جسم وجان اور مال وجائیداد سے بھی ہے تو اس کا نام عبادت ہے' باہم انسانوں اور انسانوں میں یا انسانوں اور دوسری مخلوقات میں جو علاقہ ورابطہ ہے' اس کی حیثیت سے جو احکام ہم پر عائد ہیں' اگر ان کی حیثیت محض قانون کی ہے تو اس کا نام معاملہ ہے اور ان کی حیثیت قانون کی نہیں بلکہ روحانی نصیحتوں اور برادرانہ ہدایتوں کی ہے تو اس کا نام اخلاق ہے۔

قرآنِ پاک کی اصطلاح میں پہلے تعلقات کی مضبوطی اور استحکام کا نام ایمان ہے' اور دوسرے' تیسرے اور چوتھے کی بجا آوری کا نام عملِ صالح ہے اور ان ہی دونوں کے مجموعہ پر کامل نجات کا انحصار ہے' عملِ صالح کی تین قسمیں ہیں' خدا کے سامنے اپنی عبودیت کا اظہار اور اس کے احکام کی تعمیل' بندوں کے ساتھ کاروبار اور معاملہ میں قانونِ الٰہی کی پابندی اور ان کے ساتھ محبت' الفت اور نیکی اور بھلائی کا برتاؤ' اور گو اس لحاظ سے کہ ان میں سے ہر ایک عمل کو جس میں خدا کی خوشنودی اور رضامندی مقصود ہو' اسلام عبادت کہتا ہے لیکن اصطلاح میں پہلے کا نام عبادات' دوسرے کا نام معاملات اور تیسرے کا نام اخلاق ہے' الغرض محمد رسول اللہ ﷺ جو عالم گیر شریعت اور دائمی ہدایت لے کر آئے وہ ان ہی چاروں عنوانوں کا مجموعہ ہے' یعنی عقائد' عبادات' معاملات اور اخلاق ان ہی کی اصلاح' تعلیم اور تکمیل کے لیے آپ کی بعثت ہوئی اور یہی آپ کے پیغمبرانہ فرائض کے اصلی کارنامے ہیں۔

عقائد

عقائد کی حقیقت اور اہمیت

انسان کے تمام افعال' اعمال اور حرکات کا محور اس کے خیالات ہیں' یہی اس کو بناتے اور بگاڑتے ہیں' یہ عام خیالات درحقیقت اس کے چند پختہ' غیر متزلزل اور غیر مشکوک اصولی خیالات پر مبنی ہوتے ہیں ان ہی اصولی خیالات کو عقائد کہتے ہیں۔ یہی وہ نقطہ ہے جس سے انسانی عمل کا ہر خط نکلتا ہے اور اس کے دائرۂ حیات کا ہر خط اسی پر جا کر ختم ہوتا ہے' ہمارے تمام افعال اور حرکات ہمارے ارادہ کے تابع ہیں' ہمارے ارادہ کا محرک' ہمارے خیالات اور جذبات ہیں' اور ہمارے خیالات اور جذبات پر ہمارے اندرونی عقائد حکومت کرتے ہیں' عام بول چال میں ان ہی چیزوں کی تعبیر ہم ''دل'' کے لفظ سے کرتے ہیں' اسلام کے معلم نے بتایا کہ انسان کے تمام اعضا میں اس کا دل ہی نیکی اور بدی کا گھر ہے۔ فرمایا:

اَلَا وَاِنَّ فِی الْجَسَدِ مُضْغَةٌ اِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ کُلُّهٗ وَ اِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ کُلُّهٗ اَلَا وَهِیَ الْقَلْبُ. (صحیح بخاری کتاب الایمان)

''انسان کے بدن میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے جو اگر درست ہے تو تمام بدن درست ہے اور اگر وہ بگڑ گیا تو تمام بدن بگڑ گیا ہاں وہ ٹکڑا دل ہے۔''

قرآن پاک نے دل (قلب) کی تین کیفیتیں بیان کی ہیں' سب سے پہلے قَلْبٌ سَلِیْمٌ۔ (سلامت دل) جو ہر گناہ سے پاک رہ کر بالطبع نجات اور سلامت روی کے راستہ پر چلتا ہے' دوسرا اس کے مقابل ﴿قَلْبٌ اَثِیْمٌ﴾ [1] (گنہگار دل) یہ وہ ہے جو گناہوں کی راہ اختیار کرتا ہے اور تیسرا ﴿قَلْبٌ مُّنِیْبٌ﴾ (رجوع ہونے والا دل) یہ وہ ہے جو اگر کبھی بھٹکتا اور بے راہ بھی ہوتا ہے تو فوراً نیکی اور حق کی طرف رجوع ہوتا ہے' غرض یہ سب نیرنگیاں ایسی ایک بے رنگ ہستی کی ہیں جس کا نام دل ہے' ہمارے تمام اعمال کا محرک' ہمارے اسی دل کا ارادہ اور نیت ہے' اسی بھاپ کی طاقت سے اس مشین کا ہر پرزہ چلتا اور حرکت کرتا ہے' اسی لیے آپؐ نے فرمایا:

((اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ)) (صحیح بخاری آغاز کتاب)

''تمام کاموں کا مدار نیت پر ہے۔''

اسی مطلب کو دوسرے الفاظ میں آپ نے یوں ادا فرمایا۔

---

(۱) قرآن پاک کی آیت میں یہ ہے۔ ﴿فَاِنَّهٗۤ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ﴾ (البقرۃ:۲۸۳)

((اِنَّمَا لِاِمْرِئٍ مَانَوٰی فَمَنْ کَانَتْ ھِجْرَتُہٗ اِلٰی دُنْیَا یُصِیْبُھَا اَوْ اِلَی امْرَأَۃٍ یَنْکِحُھَا فَھِجْرَتُہٗ اِلٰی مَاھَاجَرَ اِلَیْہِ)) (صحیح بخاری آغاز کتاب)

''ہر شخص کے کام کا ثمرہ وہی جس کی وہ نیت کرے تو جس کی ہجرت کی غرض دنیا کا حصول یا کسی عورت سے نکاح کرنا ہے تو اس کی ہجرت اسی کے لیے ہے جس کے لیے اس نے ہجرت کی (یعنی اس سے اس کو ثواب حاصل نہ ہوگا)۔''

آج کل علمِ نفسیات نے بھی اس مسئلہ کو بداہتاً ثابت کر دیا ہے کہ انسان کی عملی اصلاح کے لیے اس کی قلبی اور دماغی اصلاح مقدم ہے اور انسان کے دل اور ارادہ پر اگر کوئی چیز حکمران ہے تو وہ اس کا عقیدہ ہے اب صحیح اور صالح عمل کے لیے ضروری یہ ہے کہ چند صحیح اصول و مقدمات کا ہم اس طرح تصور کریں کہ وہ دل کا غیر مشکوک یقین اور غیر متزلزل عقیدہ بن جائیں اور اسی صحیح یقین اور مستحکم عقیدہ کے تحت میں ہم اپنے تمام کام انجام دیں۔

جس طرح اقلیدس کی کوئی شکل چند اصولِ موضوعہ اور اصولِ متعارفہ کے مانے بغیر نہ بن سکتی ہے نہ ثابت ہو سکتی ہے اسی طرح انسان کا کوئی عمل صحیح و درست نہیں ہو سکتا جب تک اس کے لیے بھی چند اصول موضوعہ ہم پہلے نہ تسلیم کر لیں۔

بظاہر عقل ہمارے ہر کام کے لیے ہم کو رہنما نظر آتی ہے لیکن غور سے دیکھو کہ ہماری عقل بھی آزاد نہیں، وہ ہمارے دلی یقین، ذہنی رجحانات اور اندرونی جذبات کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے اس لیے اس پابہ زنجیر عقل کے ذریعہ ہم اپنے دلی خیالات ذہنی رجحانات اور اندرونی جذبات پر قابو نہیں پا سکتے، اگر پا سکتے ہیں تو اپنے صحیح دلی یقینیات اور چند مضبوط دماغی و ذہنی تصورات کے ذریعہ۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک نے ایمان کا ذکر ہمیشہ ''عملِ صالح'' کے ذکر سے پہلے لازمی طور سے کیا ہے اور ایمان کے بغیر کسی عمل کو قبول کے قابل نہیں سمجھا ہے کہ ایمان کے عدم سے دل کے ارادہ اور خصوصاً اس مخلصانہ ارادہ کا بھی عدم ہو جاتا ہے، جس پر حسنِ عمل کا دارومدار ہے، عبداللہ بن جدعان ایک قریشی تھا، جس نے جاہلیت میں بہت سے نیکی کے کام کیے تھے، مگر بایں ہمہ مشرک تھا۔ اس کی نسبت آنحضرت ﷺ سے حضرت عائشہؓ نے ایک دفعہ دریافت کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ عبداللہ بن جدعان نے جاہلیت میں جو نیکی کے کام کیے کیا ان کا ثواب اس کو ملے گا؟ فرمایا نہیں اے عائشہؓ! کیونکہ کسی دن اس نے یہ نہیں کہا کہ بارِ الٰہا! میرے گناہوں کو قیامت میں بخش دے۔ (۱)

بدر کی لڑائی کے موقع پر ایک مشرک نے جس کی بہادری کی دھوم تھی حاضر ہو کر کہا کہ اے محمد! میں بھی تمہاری طرف سے لڑنے کے لیے چلنا چاہتا ہوں کہ مجھے بھی غنیمت کا کچھ مال ہاتھ آئے۔ فرمایا کیا تم اللہ عزوجل اور اس کے رسول پر ایمان رکھتے ہو؟ اس نے جواب دیا ''نہیں'' فرمایا واپس جاؤ کہ میں اہلِ شرک سے مدد کا خواست گار نہیں۔ دوسری دفعہ وہ پھر آیا اور وہی پہلی درخواست پیش کی، مسلمانوں کو اس کی شجاعت و بہادری کی وجہ سے اس کی

(۱) مصنف ابی شیبہ غزوات نسخہ قلمی دار المصنفین و ابن حنبل جلد ۶ صفحہ ۱۴۹ مصر۔

درخواست سے بڑی خوشی ہوئی اور وہ دل سے چاہتے تھے کہ وہ ان کی فوج میں شریک ہو جائے' لیکن آنحضرت ﷺ نے پھر وہی سوال کیا کہ کیا تم کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پر ایمان ہے۔ اس نے پھر نفی میں جواب دیا۔ آنحضرت ﷺ نے پھر وہی فرمایا کہ میں کسی مشرک سے مدد نہ لوں گا غالباً مسلمانوں کی تعداد کی کمی اور اس کی بہادری کے باوجود اس سے آپؐ کی بے نیازی کی کیفیت نے اس کے دل پر اثر کیا' تیسری دفعہ جب اس نے اپنی درخواست پیش کی اور آپؐ نے دریافت فرمایا کہ ''تم کو خدا اور اس کے رسول پر ایمان ہے۔'' تو اس نے اثبات میں جواب دیا اور نورِ اسلام سے منور ہو کر لڑائی کی صف میں داخل ہوا۔ (۱)

قرآن پاک نے ان لوگوں کے کارناموں کی مثال جو ایمان سے محروم ہیں۔ اس راکھ سے دی ہے جس کو ہوا کے جھونکے اڑا اڑا کر فنا کر دیتے ہیں اور ان کا کوئی وجود نہیں رہتا۔ اسی طرح اس شخص کے کام بھی جو ایمان سے محروم ہے بے بنیاد اور بے اصل ہیں۔

﴿مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ اَعْمَالُهُمْ كَرَمَادِ ِۨاشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ يَوْمٍ عَاصِفٍ لَا يَقْدِرُوْنَ مِمَّا كَسَبُوْا عَلٰى شَيْءٍ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ﴾ (ابراہیم:۱۸)

''جنہوں نے اپنے پروردگار کا انکار کیا ان کے کاموں کی مثال راکھ کی ہے جس پر آندھی والے دن زور سے ہوا چلی وہ اپنے کاموں سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے' یہی سب سے بڑی گمراہی ہے۔''

سورۂ نور میں ایمان کی دولت سے محروم لوگوں کے اعمال کی مثال سراب سے دی گئی ہے کہ اس کے وجود کی حقیقت فریبِ نظر سے زیادہ نہیں۔

﴿وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍۢ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً حَتّٰٓى اِذَا جَآءَهٗ لَمْ يَجِدْهُ شَيْـًٔا﴾ (النور:۳۹)

''اور جنہوں نے خدا کا انکار کیا ان کے کام اس سراب کی طرح ہیں جو میدان میں ہو جس کو پیاسا پانی سمجھتا ہے یہاں تک کہ جب وہ اس کے پاس پہنچے تو وہاں کسی چیز کا وجود اس کو نظر نہ آئے۔''

اس کی ایک اور مثال ایسی سخت تاریکی سے دی گئی ہے جس میں ہاتھ کو ہاتھ سوجھائی نہیں دیتا اور جس میں ہوش وحواس اور اعضاء کی سلامتی کے باوجود ان سے فائدہ اٹھانا ناممکن ہے۔

﴿اَوْ كَظُلُمٰتٍ فِيْ بَحْرٍ لُّجِّيٍّ يَّغْشٰهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ سَحَابٌ ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ اِذَآ اَخْرَجَ يَدَهٗ لَمْ يَكَدْ يَرٰىهَا وَ مَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ﴾ (النور:۴۰)

''یا ان کے کاموں کی مثال ایسی ہے جیسے کسی گہرے سمندر میں سخت اندھیرا ہو اس کے اوپر موج اور موج پر پھر موج اور اس کے اوپر بادل گھرا ہو۔ اندھیرے میں ایک کے اوپر ایک کہ اس میں ہاتھ

(۱) صحیح مسلم باب غزوات جلد دوم صفحہ ۱۰۶ مصر۔

نکالے تو وہ بھی سوجھائی نہ دے۔ جس کو خدا نے نور نہ دیا اس کے لیے نور نہیں۔''

الغرض ایمان کے بغیر عمل کی بنیاد کسی بلند اور صحیح تخیل پر قائم نہیں ہوسکتی۔ اسی لیے ریا' نمائش اور خودغرضی کے کاموں کو کوئی عزت نہیں دی جاسکتی' وہ کام جو گو بظاہر نیک ہوں' لیکن نیکی کرنے والے کا ان سے اصلی مقصد نام و نمود پیدا کرنا ہوتا ہے تو اخلاقی نقطۂ نظر سے تمام دنیا ان کو بے وقعت اور ہیچ سمجھتی ہے' اس بنا پر آنحضرت کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو متنبہ کیا اور فرمایا:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَ الْاَذٰى كَالَّذِیْ یُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَ لَا یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَیْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا لَا یَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَیْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا وَ اللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْكٰفِرِیْنَ﴾ (بقرہ: ۲۶۴)

''اے ایمان والو! اپنی خیراتوں کو احسان رکھ کر اور طعنے دے کر اس طرح نہ برباد کرو جس طرح وہ برباد کرتا ہے جو لوگوں کو دکھانے کے لئے خرچ کرتا ہے اپنا مال اور خدا پر (جو نیکیوں کی جزا دیتا ہے) اور قیامت پر (جس میں نیکیوں کی جزا ملے گی) یقین نہیں کرتا پس اس کی خیرات کی مثال اس چٹان جیسی ہے جس پر کچھ مٹی پڑی ہو' ذرا اس پر پانی برسا اور مٹی دھل کر پتھر رہ گیا' جس پر جو کچھ بویا جائے گا وہ اگے گا نہیں اور خدا کافر قوم کو ہدایت نہیں کرتا۔''

غرض ایمان ہمارے تمام اعمال کی اساس ہے جس کے بغیر ہر عمل بے بنیاد ہے وہ ہماری سیرابی کا اصلی سر چشمہ ہے جس کے فقدان سے ہمارے کاموں کی حقیقت سراب سے زیادہ نہیں رہتی' کیونکہ وہ دیکھنے میں تو کام معلوم ہوتے ہیں مگر روحانی اثر و فائدہ سے خالی اور بے نتیجہ ہوتے ہیں' خدا کے وجود کا اقرار اور اس کی رضامندی کا حصول ہمارے اعمال کی غرض و غایت ہے' یہ نہ ہو تو ہمارے تمام کام بے نظام اور بے مقصد ہو کر رہ جائیں' وہ ہمارے دل کا نور ہے وہ نہ ہو تو پوری زندگی تیرہ و تاریک نظر آئے اور ہمارے تمام کاموں کی بنیاد ریا' نمائش' جاہ پسندی' خودغرضی اور شہرت طلبی وغیرہ کے دنی جذبات و پست محرکات کے سوا کچھ اور نہ رہ جائے۔

توراۃ میں بعض عقیدوں کا ذکر ہے مگر ایمان کی حقیقت اور اس کی اہمیت کی تعلیم سے وہ خالی ہے' انجیل میں ایمان کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے' مگر اخلاق کی سچائی' اعمال کی راستی اور دل کے اخلاص کے لیے نہیں بلکہ معجزوں اور کرامتوں کے ظاہر کرنے کے لیے اور خوارقِ عادت پر قدرت اور اختیار پانے کے لیے۔ (۱) اس کے برخلاف فلسفۂ یونان کے بہت سے پیروؤں اور ہندوستان کے بہت سے مذہبوں نے محض ذہنی جولانی' مراقبہ' تصور' دھیان اور علم کو انسان کی نجات کا ذریعہ قرار دیا اور اخلاق و عمل سے کوئی تعرض نہیں کیا' عیسائیوں' زردشتیوں اور برہمنوں نے عقائد کو یہ وسعت دی اور ان کی ایسی تفصیل کی کہ وہ سرتاپا خیالی فلسفہ بن گئے' جس سے تصوریت عملیت پر

(۱) متی۔

غالب آ گئی اور انسانوں کے قوائے عمل سرد ہو گئے۔

محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم نے علم و عمل، تصور اور فعل، عقلیت اور عملیت میں لزوم ثابت کیا، مگر اصلی زور انسان کی عملیت پر صرف کیا اور عقائد کے اتنے ہی حصہ کا یقین و اقرار ضروری قرار دیا جو دل کی اصلاح کرے اور عمل کی بنیاد، اخلاق و عبادات کی اساس قرار پا سکے، عقائد کے فلسفیانہ الجھاؤ اور تصورات و نظریات کی تشریح و تفصیل کر کے عملیت کو برباد نہیں کیا چند سیدھے سادے اصول جو تمام ذہنی سچائیوں اور واقعی حقیقتوں کا جوہر اور خلاصہ ہیں ان کا نام عقیدہ اور ان پر یقین کرنے کا نام ایمان رکھا، آپ نے صریح الفاظ میں عقائد کے صرف پانچ اصول تلقین کئے، خدا پر ایمان، خدا کے فرشتوں پر ایمان، خدا کے رسولوں پر ایمان، خدا کی کتابوں پر ایمان اور اعمال کی جزا اور سزا کے دن پر ایمان۔

یہ تمام وہ حقائق ہیں جن پر دل سے یقین کرنا اور زبان سے ان کا اقرار کرنا ضروری ہے ان کے بغیر خالص عمل کا وجود نہیں ہو سکتا، اللہ تعالیٰ پر ایمان کہ وہ اس جہان کا تنہا خالق اور مالک ہے اور ہر ظاہر و باطن سے آگاہ ہے تا کہ وہی ہمارے کاموں کا قبلۂ مقصود قرار پا سکے اور اسی کی رضا جوئی اور اسی کی مرضی کی تکمیل ہمارے اعمال کی تنہا غرض و غایت ہو اور ہم جلوت کے سوا خلوت میں بھی گناہوں اور برائیوں سے بچ سکیں اور ہر نیکی کو اس لیے کریں اور ہر برائی سے اس لیے بچیں کہ یہی ہمارے خالق کا حکم اور یہی اس کی مرضی ہے، اس طرح ہمارے اعمال ناپاک اغراض اور ناجائز خواہشوں سے مبرا ہو کر آمیزش سے پاک ہوں اور اس کے احکام اور اس کے پیغام کی سچائی پر دل سے ایسا یقین ہو کہ ہمارے ناپاک جذبات، ہمارے غلط استدلالات، ہماری گمراہ خواہشیں بھی اس یقین میں شک اور تذبذب پیدا نہ کر سکیں۔

خدا کے رسولوں پر بھی ایمان لانا ضروری ہے کہ خدا کے ان احکام اور ہدایات اور اس کی مرضی کا علم ان ہی کے واسطہ سے انسانوں کو پہنچا ہے اگر ان کی صداقت، سچائی اور راست بازی کو کوئی تسلیم نہ کرے تو پیغامِ ربانی اور احکامِ الٰہی کی صداقت اور سچائی بھی مشکوک و مشتبہ ہو جائے اور انسانوں کے سامنے نیکی، نزاہت اور معصومیت کا کوئی نمونہ موجود نہ رہے جو انسانوں کے قوائے عملی کی تحریک کا باعث بن سکے پھر اچھے اور برے صحیح اور غلط کاموں کے درمیان ہماری عقل کے سوا جو ہمارے جذبات کی محکوم ہے کوئی اور چیز ہمارے سامنے ہماری رہنمائی کے لیے نہیں ہو گی۔

خدا کے فرشتوں پر بھی ایمان لانا واجب ہے کہ وہ خدا اور اس کے رسولوں کے درمیان قاصد اور سفیر ہیں، مادیت اور روحانیت کے مابین واسطہ ہیں، مخلوقات کو قانونِ الٰہی کے مطابق چلاتے ہیں اور ہمارے اعمال و افعال کے ایک ایک حرف کو ہر دم اور ہر لحظہ لکھتے جاتے ہیں تا کہ ہم کو ان کا اچھا یا برا معاوضہ مل سکے۔

خدا کے احکام و ہدایات جو رسولوں کے ذریعہ انسانوں کو پہنچائے گئے ان کو دور دراز ملکوں اور آئندہ نسلوں تک پہنچانے کے لیے ضروری ہوا کہ وہ تحریری شکلوں یعنی کتابوں اور صحیفوں میں یا لفظ و آواز سے مرکب ہو کر

ہمارے سینوں میں محفوظ رہیں' اس لیے خدا کی کتابوں اور صحیفوں کی صداقت پر اور جو کچھ ان میں ہے اس کی سچائی پر ایمان لانا ضروری ہے' ورنہ رسولوں کے بعد خدا کے احکام اور ہدایتوں کے جاننے کا ذریعہ مسدود ہو جائے اور ہمارے لیے نیکی و بدی کی تمیز کا کوئی ایسا معیار باقی نہ رہے جس پر تمام ادنیٰ و اعلیٰ' جاہل و عالم' بادشاہ اور رعایا سب متفق ہو سکیں۔

اعمال کی باز پرس اور جواب دہی کا خطرہ نہ ہو' اور اس کے مطابق جزا اور سزا کا خیال نہ ہو تو دنیاوی قوانین کے باوجود دنیائے انسانیت سراپا درندگی اور بہیمیت بن جائے' یہی وہ عقیدہ ہے جو انسانوں کو جلوت و خلوت میں ان کی ذمہ داری محسوس کراتا ہے اس لیے روزِ جزا اور یومِ آخرت پر ایمان رکھے بغیر انسانیت کی صلاح و فلاح ناممکن ہے' اسی لیے محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم نے اس پر بے حد زور دیا ہے بلکہ مکی وحی کی تلقین کا بیشتر حصہ اسی کی تلقین اور تبلیغ پر مشتمل ہے۔

یہی پانچ باتیں اسلام کے ایمانیات کے اصلی عناصر ہیں' یعنی اللہ تعالیٰ پر اس کے تمام رسولوں پر' اس کی کتابوں پر اس کے فرشتوں پر اور روز جزا پر ایمان لانا' یہ عقائدِ خمسہ یکجا طور پر سورۂ بقرہ میں متعدد دفعہ کہیں مجمل اور کہیں مفصل بیان ہوئے ہیں۔

﴿اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ ..... وَ الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ وَ مَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ﴾ (بقرہ:۳'۴)

''جو لوگ غیب (خدا) خدا کی صفات اور ملائکہ پر ایمان رکھتے ہیں۔۔۔۔۔ اور جو کچھ تم پر (اے محمد ﷺ) اترا اور تم سے پہلے (پیغمبروں) پر اترا اس پر یقین رکھتے ہیں (یعنی انبیا اور ان کی کتابوں پر)

﴿وَ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ یُوْقِنُوْنَ﴾ (بقرہ:۴)

''اور آخرت (روزِ جزا) پر یقین رکھتے ہیں۔''

یہ تو سورہ کے آغاز کی آیتیں ہیں' سورہ کے بیچ میں پھر ارشاد ہوا:

﴿وَ لٰکِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَ الْمَلٰٓئِکَةِ وَ الْکِتٰبِ وَ النَّبِیّٖنَ﴾ (بقرہ:۱۷۷)

''اور لیکن نیکی یہ ہے کہ جو شخص خدا پر' آخری دن پر' فرشتوں پر اور کتاب پر اور سب نبیوں پر ایمان لائے۔''

سورہ کے آخر میں ہے:

﴿اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ کُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ مَلٰٓئِکَتِهٖ وَ کُتُبِهٖ وَ رُسُلِهٖ﴾ (بقرہ:۲۸۵)

''پیغمبر پر جو کچھ اتارا گیا اس پر وہ خود اور تمام مومن ایمان لائے سب خدا پر اس کے فرشتوں پر' اس کی

کتابوں پر اور اس کے پیغمبروں پر ایمان لائے۔"

سورۂ نساء میں ان ہی عقائد کی تعلیم ہے:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ الْكِتٰبِ الَّذِیْ نَزَّلَ عَلٰی رَسُوْلِهٖ وَ الْكِتٰبِ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ وَ مَنْ یَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ وَ كُتُبِهٖ وَ رُسُلِهٖ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِیْدًا﴾ (النساء:۱۳۶)

"اے وہ لوگو جو ایمان لا چکے ہو ایمان لاؤ خدا پر اور اس کے رسول پر اور اس کتاب پر جو اس نے اپنے رسول پر اتاری اور اس کتاب پر جو اس سے پہلے اتاری اور جو شخص خدا کا' اس کے فرشتوں کا' اس کی کتابوں کا' اس کے پیغمبروں کا اور روزِ آخرت کا انکار کرے گا وہ سخت گمراہ ہوا۔"

اللہ تعالیٰ پر ایمان

﴿اٰمَنْ بِاللّٰہِ﴾

ایک قادر مطلق اور ہمہ صفت موصوف ہستی پر یقین اور اس کو ایک جاننا تعلیم محمدی کی پہلی ابجد ہے، اسلام سے پہلے جو مذاہب تھے باوجود اس کے کہ خدا کی توحید اور صفات پر ایمان رکھنا ان کے اصول میں بھی داخل تھا۔ مگر ان کی تعلیمات میں ترتیب مفقود تھی اور یہ نہیں معلوم ہوتا کہ ان کی نگاہ میں توحید کا مسئلہ اہمیت کے کس درجہ پر ہے آنحضرت ﷺ کی تعلیم نے اس مسئلہ کی اصلی اہمیت محسوس کی اور اس کو اپنے نصابِ درس کا پہلا سبق اور روحانی معارف وحقائقِ جسمانی اور اعمال واخلاق کا سرِ بنیاد قرار دیا، خدا اگر چاہے تو انسان کے تمام گناہوں سے درگزر کر سکتا ہے مگر اسی ایک حقیقت سے انکار وہ جرم ہے جس کو وہ کبھی معاف نہ فرمائے گا۔

﴿اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ وَ یَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ﴾ (نساء:۱۸)

''یقیناً خدا شرک کو معاف نہ کرے گا اور اس کے سوا جس کے جو گناہ چاہے معاف کر دے۔''

پھر اسی کے ساتھ خالص توحید کا بیان اسماء وصفات کی تشریح، شرک کے ہر پہلو کی نفی اور توحید کے ہر پہلو کی تکمیل، تعلیمِ محمدی کی امتیازی شان ہے، معلوم ہو چکا ہے کہ نبوتِ محمدیہ کی غرض وغایت صرف تخیل، نظریہ آرائی اور الٰہیاتی فلسفہ نہ تھا، بلکہ ایک زندہ قوم، جدوجہد اور عمل والی قوم، اخلاص وایثار اور نیکی وتقویٰ والی قوم کو پیدا کرنا تھا، اور اس کو تمام دنیا کی پیشوائی کے لیے نمونۂ عمل بنانا تھا، اس لیے سب سے پہلے اہلِ عرب کو جو اس کے مخاطبِ اول تھے، رموز واسرارِ توحید کا اس طرح حامل بنانا تھا کہ ان کے رگ وریشہ میں ولولہ اور جوش کا ایک نشہ پیدا ہو جائے، اور جن وجوہ اور اسباب سے شرک کے یہ عقائد پیدا ہوتے ہیں ان کی بیخ کنی کی جائے۔

اصلاحِ عقائد

معلوم ہو چکا ہے کہ عرب میں جہالت اور وحشت کی وجہ سے سینکڑوں غلط عقائد اور توہمات پھیل گئے تھے اور دنیا کے دوسرے مذاہب کے عقائد میں بھی بہت سی غلطیاں داخل ہو گئی تھیں، ان میں سب سے زیادہ بدتر اور تمام برائیوں کا اصلی محور شرک تھا، اس لیے سب سے پہلے آنحضرت ﷺ نے اس کی اصلاح سے آغاز کیا۔

شرک اور بت پرستی کا اصلی زینہ اسباب ومؤثرات کا وجود ہے، خدا نے عالم میں ایک سلسلۂ اسباب قائم کر دیا ہے اور عالم کے واقعات اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔ لیکن یہ تمام سلسلہ ایک قادرِ مطلق کے دستِ قدرت میں ہے

اور اس سلسلہ کی ایک کڑی بھی اس کے اشارہ کے بغیر جنبش نہیں کر سکتی' شرک اس طرح شروع ہوتا ہے کہ پہلے انسان ان اسباب و علل میں سے بعض نمایاں اور قوی الاثر اسباب سے متاثر ہوتا ہے' اجرامِ فلکی کی عظمت' آفتاب و ماہتاب کی نور افشانی' سمندر کا پرزور تلاطم' عناصر کی نیرنگ آرائیاں انسان کو مبہوت کر دیتی ہیں وہ ان کی عظمت و تاثیر سے متاثر پھر منفعل اور بالآخر ان کا غلام بن جاتا ہے۔ اعتقاد کے پہلے مرحلہ میں انسان غور رسی کے دعویٰ سے اس قدر امتیاز اور تفریق کرتا ہے کہ یہ چیزیں خود خدا یا معبود نہیں ہیں لیکن یہ تمیز آخر تک قائم نہیں رہتی بلکہ رفتہ رفتہ خوش اعتقادی کا اثر غالب آتا جاتا ہے اور یہ چیزیں خدا کی شریک بنتی جاتی ہیں یہاں تک کہ اصلی مسبب الاسباب نظر سے بالکل اوجھل ہو جاتا ہے۔

شرک کی جو گوناگوں صورتیں دنیا میں موجود ہیں اور جس طرح آنحضرت ﷺ نے ان کا استیصال کیا' ان کی تفصیل حسب ذیل ہے:

(۱) دنیا کی مشہور قوموں سے عیسائی اور مجوسی علانیہ مشرک تھے یعنی تین اور دو خدا مانتے تھے' ہندو بھی اسی کے قریب قریب تھے ان مذہبوں کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ خدا کے جو مختلف نمایاں اور اہم اوصاف ہیں' ان کا مستقل اور مجسم وجود قائم ہو گیا' مثلاً صفتِ خلق اور احیاء و اماتت برہما' بشن اور مہیش کے نام سے موسوم ہیں' مجوسیوں نے دیکھا کہ دنیا میں جس قدر اشیا اور افعال و حرکات ہیں سب باہم متضاد ہیں' نور و ظلمت' پستی و بلندی' یمین و شمال' نرم و سخت' رات دن' خیر و شر' حلم و غضب' غرور و خاکساری' فسق و صلاح کوئی چیز مقابلہ اور تضاد سے خالی نہیں' اس لیے ایسے دو متضاد عالم کا خالق ایک نہیں ہو سکتا' اس بنا پر انہوں نے دو خدا تسلیم کیے اور ان کا نام یزدان اور اہرمن یا نور و ظلمت رکھا۔

قرآن مجید میں تمام احکام نہایت تدریج کے ساتھ نازل ہوئے ہیں' یہاں تک کہ ۱۳ برس کی وسیع مدت تک روزہ' زکوٰۃ اور حج کچھ فرض نہیں ہوا تھا لیکن شرک کا استیصال کلی نبوت کا پہلا سبق تھا۔

سورۂ زمر مکہ میں نازل ہوئی اور اسی سورہ میں شرک کی تمام صورتیں مٹا دی گئیں' تمام دیگر سورتوں میں نہایت کثرت سے اس قسم کے شرک کا ابطال اور رد کیا ہے' اس لیے اس کی تفصیل کی ضرورت نہیں۔

مجوسیوں کے شرک کی بنیاد اس پر تھی کہ افعالِ خیر و شر کا ایک خالق نہیں ہو سکتا۔ ورنہ لازم آئے گا کہ خدا شر کو پیدا کرتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ جو شخص برائی کے پیدا ہونے کو جائز رکھتا ہے' وہ خود اچھا نہیں ہو سکتا' اس لیے قرآن مجید میں نہایت کثرت سے تصریحات آئیں کہ جن کو ہم خیر و شر کہتے ہیں سب کا فاعل خدا ہے' آنحضرت ﷺ نے نہایت تصریح و تاکید کے ساتھ تعلیم کی کہ جو کچھ ہوتا ہے سب خدا کے حکم سے ہوتا ہے' باقی یہ مسئلہ کہ بری چیز کا خالق اچھا نہیں ہو سکتا' اولاً تو یہ مغالطہ آمیز غلطی ہے' ایک صناع مصور اگر ایک نہایت بدصورت جانور کی تصویر نہایت اچھی کھینچے تو اس کے کمالِ مصوری پر اس سے کچھ داغ نہیں آئے گا کہ جانور خود برا ہے' دوسرے یہ کہ اسلام نے اس مسئلہ کی جس اصلی گرہ کو کھولا ہے وہ یہ ہے کہ اشیا بذاتہٖ خیر و شر نہیں ہیں بلکہ وہ اپنے صحیح یا غلط طریقۂ استعمال سے خیر و

شر ہو جاتی ہیں' آگ بجائے خود نہ خیر ہے نہ شر' اگر اس سے اچھا کام کیا جائے تو خیر ہے اور برا لیا جائے تو شر ہے' زہر نہ اچھا ہے نہ برا اگر اس کو بیماریوں کے استیصال میں استعمال کیا جائے تو خیر ہے اور اگر کسی بے گناہ کے قتل میں استعمال کرو تو شر ہے' اسی طرح دوسری اشیا کے بھی خیر و شر کے دونوں پہلو ہیں' نہ کوئی شے دنیا میں خیر مطلق ہے نہ کوئی شرِ محض۔ اسی لیے قرآن نے شر کی نسبت خدا کی طرف نہیں کی ہے بلکہ خود انسان کی طرف کی ہے:

﴿اَشَرٌّ اُرِیْدَ بِمَنْ فِی الْاَرْضِ اَمْ اَرَادَ بِهِمْ رَبُّهُمْ رَشَدًا﴾ (الجن:۱۰)

''آیا اہل زمین کے ساتھ شر کا ارادہ کیا گیا ہے یا ان کے پروردگار نے ان کو راہ پر لانا چاہا ہے۔''

﴿مَآ اَصَابَکَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ وَ مَآ اَصَابَکَ مِنْ سَیِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِکَ﴾ (نساء: ۷۹)

''تجھ کو جو نیکی پہنچی تو وہ خدا کی طرف سے ہے اور جو مصیبت پہنچی وہ خود تیری طرف سے ہے۔''

﴿اَوَ لَمَّآ اَصَابَتْکُمْ مُّصِیْبَةٌ قَدْ اَصَبْتُمْ مِّثْلَیْهَا قُلْتُمْ اَنّٰی هٰذَا قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِکُمْ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ﴾ (آل عمران:۱۶۵)

''کیا جب تم کو کوئی مصیبت پہنچی جس کی دوگنی تم ان کو پہنچا چکے ہو تو تم نے کہا یہ کہاں سے آئی' کہہ دے کہ خود تمہاری طرف سے ہے خدا ہر بات پر قدرت رکھتا ہے۔''

الغرض کسی شے کا ایسا پیدا کرنا جس میں خیر و شر کے دونوں پہلو ہیں' شر نہیں ہے' ان میں اس کے شر کے پہلو کو استعمال کرنا اور کام میں لانا شر ہے' ڈاکٹر بہت سی بیماریوں کے لیے زہریلی دوائیں بناتے ہیں مگر یہ شر نہیں' البتہ جب کوئی شریر ان دواؤں سے ان امراض کے ازالہ کے بجائے کسی کی جان لے لیتا ہے تو وہ شر ہے' حاصل یہ کہ اس دنیا میں جب خیر و شر اشیا میں بذاتہٖ نہیں ہے تو اچھی چیزوں کے لیے الگ خالق تسلیم کرنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ خالق ایک ہی ہے دو نہیں ہیں۔

﴿وَ قَالَ اللّٰهُ لَا تَتَّخِذُوْٓا اِلٰهَیْنِ اثْنَیْنِ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَاِیَّایَ فَارْهَبُوْنَ○ وَ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ﴾ (النحل۵۱:۵۲)

''اور خدا نے کہا کہ دو خدا نہ بناؤ وہ ایک ہی خدا ہے تو مجھی سے ڈرو اور اسی کے لیے ہے جو آسمانوں اور زمین میں ہے۔''

بزرگوں کی مشرکانہ تعظیم سے روکنا

(۲) شرک کا بہت بڑا ذریعہ کسی خاص شخص' کسی خاص شے کی تعظیم مفرط ہے جس کو شخص پرستی یا یادگار پرستی سے تعبیر کر سکتے ہیں' حضرت عیسیٰ علیہ السلام' رام چندر' کرشن کو اسی خوش اعتقادی نے آدمی سے خدا بنا دیا' اس بنا پر قرآن مجید میں نہایت پُرزور اور پر رعب الفاظ میں شخص پرستی کی تحقیر کی گئی:

﴿یٰاَھْلَ الْکِتٰبِ لَاتَغْلُوْا فِیْ دِیْنِکُمْ وَ لَا تَقُوْلُوْا عَلَی اللّٰہِ اِلَّا الْحَقَّ اِنَّمَا الْمَسِیْحُ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ رَسُوْلُ اللّٰہِ﴾ (نساء:۱۷۱)

''اے اہلِ کتاب اپنے دین میں حد سے زیادہ نہ بڑھ جاؤ اور خدا کی نسبت وہی کہو جو حق ہے' مسیح یعنی عیسیٰ بن مریم صرف خدا کے پیغمبر ہیں۔''

﴿لَنْ یَّسْتَنْکِفَ الْمَسِیْحُ اَنْ یَّکُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰہِ وَ لَا الْمَلٰٓئِکَۃُ الْمُقَرَّبُوْنَ وَ مَنْ یَسْتَنْکِفْ عَنْ عِبَادَتِہٖ وَ یَسْتَکْبِرْ فَسَیَحْشُرُھُمْ اِلَیْہِ جَمِیْعًا﴾ (نساء:۱۷۲)

''مسیح کو خدا کا بندہ ہونے سے ہرگز عار نہیں اور نہ مقرب فرشتوں کو (عار ہے) اور جس شخص کو خدا کی بندگی سے عار ہوگا اور بڑائی کرے گا تو خدا سب کو عنقریب اپنے حضور میں بلائے گا۔''

﴿لَقَدْ کَفَرَ الَّذِیْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰہَ ھُوَ الْمَسِیْحُ ابْنُ مَرْیَمَ قُلْ فَمَنْ یَّمْلِکُ مِنَ اللّٰہِ شَیْئًا اِنْ اَرَادَ اَنْ یُّھْلِکَ الْمَسِیْحَ بْنَ مَرْیَمَ وَ اُمَّہٗ وَ مَنْ فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا وَ لِلّٰہِ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَ مَا بَیْنَھُمَا یَخْلُقُ مَایَشَآءُ وَاللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ﴾ (المائدۃ:۱۷)

''وہ لوگ کافر ہیں جو کہتے ہیں کہ عیسیٰ بن مریم خدا ہیں کہہ دو کہ اگر خدا یہ چاہے کہ مسیح بن مریم کو' اس کی ماں کو اور دنیا میں جو کچھ ہے سب کو برباد کر دے تو کون ہے جو خدا کو روک لے اور خدا ہی کے لیے آسمان و زمین اور جو چیزیں ان دونوں میں ہیں سب کی حکومت ہے وہ جو چاہے کرے اور خدا ہر چیز پر قادر ہے۔''

﴿وَ اِذْ قَالَ اللّٰہُ یٰعِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ ءَ اَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِیْ وَ اُمِّیَ اِلٰھَیْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ قَالَ سُبْحٰنَکَ مَا یَکُوْنُ لِیْٓ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَیْسَ لِیْ بِحَقٍّ اِنْ کُنْتُ قُلْتُہٗ فَقَدْ عَلِمْتَہٗ تَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِیْ وَ لَآ اَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِکَ اِنَّکَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُیُوْبِ ○ مَا قُلْتُ لَھُمْ اِلَّا مَآ اَمَرْتَنِیْ بِہٖٓ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰہَ رَبِّیْ وَ رَبَّکُمْ﴾ (مائدہ۱۱۶:۱۱۷)

''اور جب خدا کہے گا کہ کیوں عیسیٰ تم نے لوگوں سے کہہ دیا تھا کہ خدا کو چھوڑ کر مجھ کو اور میری ماں کو خدا کہو' عیسیٰ عرض کریں گے کہ سبحان اللہ میری یہ مجال کہ میں ایسی بات کہوں جس کے کہنے کا مجھے حق نہیں' اگر میں نے کہا ہوگا تو تو جانتا ہوگا' تو میرے دل کی بات جانتا ہے اور میں تیرے دل کی بات نہیں جانتا' تو بڑا غیب دان ہے۔ میں نے لوگوں سے صرف وہی کہا تھا جس کا حکم تو نے مجھ کو دیا تھا یعنی یہ کہ خدا کی عبادت کرو' جو میرا بھی خدا ہے اور تمہارا بھی۔''

آنحضرت ﷺ باوجود اس کے کہ حاصلِ کون و مکان تھے' لیکن بار بار قرآن مجید میں تاکید آتی ہے:

﴿قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ یُوْحٰٓی اِلَیَّ اَنَّمَآ اِلٰھُکُمْ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ﴾ (الکہف:۱۲)

''کہہ دے اے پیغمبر! کہ میں تو تمہاری ہی طرح آدمی ہوں لیکن یہ کہ میری طرف وحی بھیجی جاتی ہے کہ تمہارا خدا ایک خدا ہے۔''

ایک خاص نکتہ غور کے قابل ہے، جس قدر جلیل القدر انبیاء علیہم السلام گزرے ہیں ان کے خاص خاص لقب ہیں مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام کلیم اللہ تھے، حضرت ابراہیم خلیل اللہ تھے اور حضرت عیسیٰ روح اللہ تھے لیکن آنحضرت ﷺ باوجود اس کے کہ اشرفِ انبیا تھے۔ آپؐ کا کیا لقب تھا؟ اور کلمۂ توحید میں، نماز میں، درود میں آنحضرت ﷺ کے اسم گرامی کے ساتھ کیا امتیازی وصف شامل کیا گیا؟ صرف رسالت اور عبدیت کا۔

﴿اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَ رَسُوْلُهٗ﴾

''میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد خدا کے بندے اور رسول ہیں۔''

اس میں بھی عبدیت کا وصف رسالت پر مقدم ہے، آنحضرت ﷺ نے ایک دفعہ بعض کفار کے حق میں دعائے بد کی، اس پر یہ آیت اتری۔ (۱)

﴿لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ اَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَاِنَّهُمْ ظٰلِمُوْنَ﴾ (آل عمران:۱۲۸)

''تم کو کچھ اختیار نہیں ہے، خدا چاہے گا تو ان پر توجہ کرے گا، یا ان کو عذاب دے گا کہ وہ ظالم ہیں۔''

آنحضرت ﷺ بعض کفار کی ہدایت پانے اور اسلام قبول کرنے کے نہایت خواہش مند تھے اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

﴿اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ﴾ (القصص:۵۶)

''تم جس کو چاہتے ہو اس کو ہدایت نہیں کر سکتے۔''

آنحضرت ﷺ نے عبداللہ بن ابی کے لیے دعائے مغفرت کی، اس پر قرآن مجید میں آیا:

﴿اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ﴾ (التوبۃ:۸۰)

''تم ان کے لیے مغفرت چاہو یا نہ چاہو، اگر تم ان کے لئے ستر دفعہ بھی مغفرت چاہو گے تو خدا ان کی مغفرت نہ کرے گا۔'' (۲)

آنحضرت ﷺ ہمیشہ ہر موقع پر اس امر کی تاکید اور اس کا لحاظ رکھتے تھے کہ لوگ آپؐ کی زائد از اعتدال مدح نہ کریں جو منجر ہو کر شرک تک پہنچ جائے۔ بار بار فرماتے تھے:

﴿لَا تُطْرُوْنِيْ كَمَا اَطْرَى الْيَهُوْدُ وَ النَّصَارٰى﴾

---

(۱) بخاری غزوۂ احد، یہ حدیث بخاری کے مختلف ابواب میں مذکور ہے۔

(۲) بخاری کتاب التفسیر، تفسیر سورۂ توبہ۔

'میری شان میں اس طرح مبالغہ نہ کرو جس طرح یہود و نصاریٰ نے اپنے پیغمبروں کی شان میں کیا۔''(۱)

ایک دفعہ آپؐ راستہ میں جا رہے تھے' ایک شخص نے دفعتاً آپؐ کو دیکھا اور اس پر اس قدر رعب طاری ہوا کہ کانپنے لگا آپؐ نے فرمایا ڈرو نہیں۔ میں ایک قریشی خاتون کا بیٹا ہوں' جو گوشت کو خشک کر کے کھایا کرتی تھی۔ (۲)

بنو عامر کا وفد جب آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو لوگوں نے عرض کی کہ آپؐ ہمارے سید (آقا) ہیں آپؐ نے فرمایا' سید خدا ہے۔ لوگوں نے عرض کی کہ آپؐ ہم سب سے افضل اور سب سے برتر ہیں' آپؐ نے فرمایا اچھا یہ کہو لیکن دیکھو کہیں تم کو شیطان اپنا وکیل نہ بنائے'(۳) اصلی الفاظ یہ ہیں۔ **قولوا بقولکم و لا یستجرینکم الشیطان۔**

ایک دفعہ ایک شخص نے ان الفاظ میں آپ کو مخاطب کیا' اے ہمارے آقا! اور ہمارے آقا کے فرزند! اور اے ہم میں سب سے بہتر اور سب سے بہتر کے فرزند' آپ نے فرمایا' لوگو! پرہیز گاری اختیار کرو' شیطان تمہیں گرا نہ دے' میں عبداللہ کا بیٹا محمد ہوں' خدا کا بندہ اور اس کا رسول ہوں' مجھ کو خدا نے جو مرتبہ بخشا ہے' مجھے پسند نہیں کہ تم مجھے اس سے زیادہ بڑھاؤ۔ (۴)

غور کرو کہ رسول کی شان میں یہ الفاظ ناجائز نہیں' مگر توحید کو شرک کے ہر شائبہ سے بچانے کا خیال ہر خیال پر غالب تھا۔

درمیانی واسطوں کا مشرکانہ اعتقاد

(۳) شرک کا اصلی ضرر یہ ہے کہ خدا سے انسان کو جس درجہ کا تعلق' جس قسم کا عجز و نیاز' جس مرتبہ کی محبت' جس درجہ کی التجا درکار ہے' اس کا رخ دوسری جانب بدل جاتا ہے' ہزاروں لاکھوں آدمی ہیں' جو اچھی طرح جانتے ہیں کہ دیوتا کائنات اور زمین و آسمان کے خالق نہیں ہیں تاہم وہ ہر قسم کی حاجتیں اور مرادیں ان ہی دیوتاؤں اور معبودوں سے مانگتے ہیں' ان ہی کو حاجت روا جانتے ہیں' اٹھتے بیٹھتے ان ہی کا نام لیتے ہیں' ان ہی پر نذر و نیاز چڑھاتے ہیں۔ غرض براہِ راست ان کو جو تعلق ہوتا ہے ان ہی معبودوں سے ہوتا ہے' خود مسلمانوں میں ہزاروں' لاکھوں آدمیوں کا طرزِ عمل انبیاء و صلحا بلکہ مزارات کی نسبت اس کے قریب قریب ہے' اس بنا پر مقدم ترین امر یہ ہے کہ معبودوں کی نسبت اس قسم کا خیال نہ پیدا ہونے پائے بلکہ صاف بتا دیا جائے کہ خدا کے آگے کسی کی کچھ نہیں چل سکتی اور اس کی مرضی میں کوئی دست اندازی نہیں کر سکتا' حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ سے طلبِ

---

(۱) بخاری جلد اول کتاب الانبیاء باب واذکر فی الکتاب مریم۔

(۲) شمائل ترمذی و مستدرک جلد ۳ ص ۴۸ علی شرط الشیخین واقعہ فتح مکہ۔

(۳) ادب المفرد امام بخاری باب **هل يقول سيدى** و ابوداؤد کتاب الادب باب **كراهة التمادح**۔

(۴) مسند ابن حنبل جلد ۳ ص ۱۵۳۔

مغفرت کا وعدہ کیا تو ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا۔

﴿لَاَسْتَغْفِرَنَّ لَکَ وَ مَآ اَمْلِکُ لَکَ مِنَ اللّٰہِ مِنْ شَیْءٍ﴾ (الممتحنۃ:۴)

''میں آپ کے لیے مغفرت کی درخواست ضرور ہی کروں گا لیکن مجھ کو خدا کے سامنے آپ کی نسبت کوئی اختیار نہیں۔''

آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میں نے اپنی والدہ کے لیے استغفار کی اجازت مانگی تھی، وہ نہیں ملی، البتہ یہ درخواست قبول ہوئی کہ میں ان کی قبر کی زیارت کرلوں۔ (۱)

قرآن مجید میں جب یہ آیت اتری ﴿وَ اَنْذِرْ عَشِیْرَتَکَ الْاَقْرَبِیْنَ﴾ تو آپؐ نے خاندان کے لوگوں کو جمع کر کے فرمایا، اے قریشیو! اے اولادِ عبدالمطلب! اے عباس! اے صفیہ! اے فاطمہ! میرے مال میں سے جو مانگو میں دے سکتا ہوں، لیکن خدا کے ہاں میں تمہارے لیے کچھ نہیں کرسکتا۔ (۲)

قرآن مجید میں نہایت کثرت اور نہایت تشدد کے ساتھ اس مضمون کو ادا کیا گیا کہ تم لوگ جن کو حاجت روا سمجھتے ہو اور جن سے حاجتیں مانگتے ہو، ان کو کارخانۂ ہستی میں کسی قسم کا اختیار نہیں:

﴿قُلِ ادْعُوا الَّذِیْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِہٖ فَلَا یَمْلِکُوْنَ کَشْفَ الضُّرِّ عَنْکُمْ وَ لَا تَحْوِیْلًا○ اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ یَبْتَغُوْنَ اِلٰی رَبِّھِمُ الْوَسِیْلَۃَ اَیُّھُمْ اَقْرَبُ وَ یَرْجُوْنَ رَحْمَتَہٗ وَ یَخَافُوْنَ عَذَابَہٗ اِنَّ عَذَابَ رَبِّکَ کَانَ مَحْذُوْرًا○﴾ (بنی اسرائیل:۵۶، ۵۷)

''کہہ دو کہ خدا کے علاوہ تم جن کو پکارتے ہو وہ تمہاری مصیبت کو ہٹانے یا بدلنے کا کچھ اختیار نہیں رکھتے، جن کو یہ لوگ پکارتے ہیں، وہ بھی زیادہ قرب حاصل کرنے کے لیے خود خدا ہی کی طرف وسیلہ ڈھونڈتے ہیں اور اس کی رحمت کے امیدوار رہتے ہیں اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں، بے شبہ تیرے خدا کا عذاب ڈرنے ہی کے قابل ہے۔''

خوارق خدا کے حکم سے ہوتے ہیں

(۴) شرک کا ایک بڑا ذریعہ خوارقِ عادات کی نسبت غلط فہمی ہے، جن اشخاص سے خوارقِ عادات سرزد ہوتے ہیں، ان کی نسبت لوگوں کو پہلے یہ خیال آتا ہے کہ یہ خود خدا نہیں ہیں لیکن ان میں خدائی کا شائبہ ضرور ہے ورنہ ایسے افعال کیونکر سرزد ہوتے جو قدرتِ انسانی سے بالاتر ہیں۔ یہی خیال رفتہ رفتہ دیوتا اور اوتار تک ترقی کرتا ہے اور بالآخر خدائی تک پہنچا دیتا ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس بنا پر آج چالیس کروڑ آدمیوں کے خدا یا خدا کے بیٹے ہیں۔

---

(۱) صحیح مسلم کتاب الجنائز۔

(۲) یہ روایت اس آیت کی تفسیر میں تمام تفسیروں اور حدیث کی کتابوں میں منقول ہے۔

لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں ہوتا کہ انبیاء علیہم السلام سے معجزات صادر ہوتے ہیں اور یہ امر خصائصِ نبوت میں سے ہے' تاہم یہ مسئلہ اسلام کے زمانہ تک مشتبہ اور مجمل رہا' قرآن مجید میں اس کے متعلق حسبِ ذیل امور بیان کیے گئے ہیں۔

(۱) معجزات صادر ہو سکتے ہیں اور خدا اپنے مقبول بندوں کو معجزات عطا کرتا ہے۔

﴿وَ قَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ قَادِرٌ عَلٰٓى اَنْ يُّنَزِّلَ اٰيَةً وَّ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ (انعام:۳۷)

''اور کفار کہتے ہیں کہ ان (آنحضرت ﷺ) پر کوئی معجزہ خدا کے یہاں سے کیوں نہیں اترا کہہ دو کہ خدا اس پر قادر ہے کہ معجزہ نازل کرے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔''

(۲) باوجود اس کے کفار کو معجزہ طلبی سے روکا جاتا تھا اور کہا جاتا تھا کہ نبوت اور رسالت معجزہ پر موقوف نہیں۔

﴿وَ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ لَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرٌ وَّ لِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ﴾ (الرعد:۷)

''اور کفار کہتے ہیں کہ ان (آنحضرتؐ) پر کوئی معجزہ خدا کے ہاں سے کیوں نہیں اترا۔ تم تو صرف ڈرانے والے ہو اور ہر قوم کے لیے ایک ہادی ہوتا ہے۔''

﴿وَ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا ○ اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّ عِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا ○ اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ ..... بَشَرًا رَّسُوْلًا ○﴾ (بنی اسرائیل:۹۱۔۹۳)

''اور کفار کہتے ہیں کہ ہم تم پر ایمان نہ لائیں گے جب تک تم زمین سے چشمے نہ نکال دو یا تمہارے پاس کھجوروں یا انگوروں کا باغ نہ ہو کہ جس کے بیچ میں تم نہریں جاری کر دو' یا آسمان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہم پر نہ گرا دو' جیسا کہ تمہارا گمان تھا یا خدا اور فرشتوں کو ہمارے سامنے نہ لے آؤ' یا تمہارا گھر سونے کا نہ بن جائے یا تم آسمان پر نہ چڑھ جاؤ اور ہم تو اس چڑھنے پر بھی یقین نہ لائیں گے جب تک ہم پر کوئی کتاب نہ اتارو جس کو ہم خود پڑھیں کہہ دو کہ سبحان اللہ میں تو صرف بشر ہوں اور رسول ہوں۔''

(۳) جو معجزے اس آیت میں کفار نے طلب کیے وہ ناممکن باتیں نہ تھیں' تاہم خدا نے آنحضرت ﷺ کو جو جواب تلقین کیا' وہ یہ تھا کہ میں تو بشر ہوں' دوسری جگہ اس کا جواب یہ دیا کہ معجزے تو خدا کے پاس ہیں یعنی معجزے صادر ہوں گے تو یہ میرا فعل نہ ہوگا بلکہ خدا کا ہوگا:

﴿وَ قَالُوْا لَوْ لَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ وَ اِنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ○ اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَرَحْمَةً وَّ ذِكْرٰى لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ○﴾ (عنکبوت:۵۰'۵۱)

''اور کفار کہتے ہیں کہ ان (آنحضرت ﷺ) پر ان کے خدا کے یہاں سے معجزے کیوں نہیں اترے کہہ دو کہ معجزے تو خدا کے ہاں ہیں اور میں تو صاف صاف ڈرانے والا ہوں کیا ان (کفار) کے لیے یہ کافی نہیں کہ ہم نے تمہارے اوپر کتاب (قرآن) اتاری جو ان پر تلاوت کی جاتی ہے' اس میں بے شبہ ایمان والوں کے لیے رحمت اور یاد رکھنے کی چیز ہے۔''

اسی لیے معجزات کے ذکر میں ہمیشہ ﴿بِاِذْنِ اللّٰہِ﴾ (خدا کی اجازت) کے الفاظ استعمال ہوئے۔

حرام وحلال کرنا خدا کا کام ہے

(۶) شرک کی ایک قسم یہ تھی کہ انبیا یا پیشوایان مذہبی کو تحریم وتحلیل کا مجاز سمجھتے تھے یعنی وہ جس چیز کو چاہیں حرام کر دیں اور جس چیز کو چاہیں حلال ٹھہرا دیں' قرآن مجید میں جب یہ آیت اتری:

﴿اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَھُمْ وَ رُھْبَانَھُمْ اَرْبَابًا﴾ (التوبہ:۳۱)

''ان لوگوں نے اپنے علما اور درویشوں کو رب بنا لیا ہے۔''

تو حضرت عدیؓ نے جو حاتم طائی کے فرزند اور اسلام لانے سے پہلے عیسائی تھے آنحضرت ﷺ سے عرض کی کہ ہم لوگ اپنے پیشوایانِ مذہبی کو اپنا رب تو نہیں سمجھتے تھے' آپؐ نے ارشاد فرمایا کیا تم لوگوں کا یہ اعتقاد نہ تھا کہ یہ لوگ جس چیز کو چاہیں حلال اور جس کو چاہیں حرام کر دیں عرض کی کہ ہاں۔ آپ نے فرمایا یہی رب بنانا ہے (۱) عموماً اہلِ مذاہب پیغمبروں کو شارع مستقل سمجھتے ہیں لیکن یہ بھی ایک قسم کا شرک ہے' شریعت کی تاسیس' حلال وحرام کی تعیین' جائز وناجائز کی تفریق' امر ونواہی کے احکام یہ سب خدا کے ساتھ مخصوص ہیں' پیغمبر صرف مبلغ اور پیغام رساں اور تعلیمِ الٰہی سے ان احکام کے شارح اور بیان کرنے والے ہیں' اسی بنا پر قرآن مجید میں ذاتِ نبوی کی صفتِ رسالت کو بار بار تاکید اور اصرار کے ساتھ نمایاں کیا گیا ہے:

﴿وَ مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ﴾ (آل عمران:۱۴۴)

''محمد تو صرف ایک رسول ہے' اس سے پہلے اور رسول گزر چکے ہیں۔''

﴿اِنَّمَا الْمَسِیْحُ عِیْسَی بْنُ مَرْیَمَ رَسُوْلُ اللّٰہِ﴾ (المائدۃ:۱۷۱)

''مریم کا بیٹا عیسیٰ علیہ السلام اللہ کا صرف رسول تھا۔''

اس حصر سے مقصود یہ ہے کہ انبیا میں خدائی کی کوئی صفت نہیں ہوتی' بلکہ جو کچھ ان میں ہے وہ رسالت اور نبوت کے اوصاف ہیں۔

غیر خدا کی مشرکانہ تعظیم

(۷) شرک کا ایک بڑا ذریعہ یہ تھا کہ جو اعمال اور آداب خدا کے ساتھ مخصوص ہیں وہ اوروں کے ساتھ بھی

(۱) جامع ترمذی وابن کثیر تفسیر آیت مذکور۔

برتے جاتے تھے' یہ اگرچہ شرک فی العبادۃ یا شرک فی الصفات ہے لیکن رفتہ رفتہ شرک فی الذات تک منجر ہوتا ہے سجدۂ عبادت خدا کے ساتھ مخصوص ہے لیکن کفار اور دیگر اہلِ مذاہب بتوں اور مقتدایانِ دینی کو بھی سجدہ کرتے تھے اور سلاطین وامرا کو تو سجدہ کرنا عام طور سے رائج تھا' چنانچہ حضرت یوسفؑ کو ان کے والدین نے سجدہ کیا تھا' لیکن چونکہ اسلام میں توحید کو انتہائے کمال تک پہنچانا تھا۔ سجدۂ تعظیمی بھی منع کر دیا گیا' ایک دفعہ ایک صحابیؓ خدمت اقدس میں آئے اور عرض کی کہ میں نے اہلِ عجم کو دیکھا ہے وہ اپنے رئیسوں کو سجدہ کرتے ہیں' آپؐ اجازت دیں تو ہم آپؐ کو سجدہ کریں۔ آپؐ نے فرمایا تو کیا میری قبر پر گزرو گے تو سجدہ کرو گے؟ عرض کی نہیں۔ فرمایا تو اب بھی نہ کرو' اگر میں کسی کو دوسرے کے آگے سجدہ کرنے کا حکم دے سکتا تو بیوی کو حکم دیتا کہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے (۱) اسی طرح ایک اور صحابیؓ ملک شام سے آئے تو آپؐ کے آگے سجدہ کیا۔ آپؐ نے پوچھا کہ یہ تم نے کیا کیا۔ عرض کی کہ میں نے شام میں رومیوں کو دیکھا کہ وہ اپنے مذہبی افسروں کو سجدہ کرتے ہیں تو میرا جی چاہا کہ میں بھی آپؐ کو سجدہ کروں' فرمایا ایسا نہ کرو' اگر میں کسی کو خدا کے سوا سجدہ کرنے کا حکم دیتا تو بیوی کو حکم دیتا کہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے۔ (۲)

صفاتِ الٰہی کی توحید

(۸) شرک کی ایک قسم یہ ہے کہ خدا کے ساتھ جو اوصاف مخصوص ہیں وہ اوروں میں تسلیم کیے جائیں۔ جس کا یہ قدرتی نتیجہ ہے کہ وہ شرکتِ وصف کی بنا پر خدا کے شریک اور ہمسر بن جائیں ان میں سے ایک وصف علمِ غیب ہے' اکثر اہلِ مذاہب اعتقاد رکھتے تھے اور اب بھی رکھتے ہیں کہ انبیا اور اولیا کو علمِ غیب ہوتا ہے' بنی اسرائیل کے زمانہ میں کاہنوں کا یہی کام تھا کہ وہ آئندہ واقعات کی پیشین گوئیاں کیا کرتے تھے' کبھی فال سے' کبھی پانسے پھینک کر اور کبھی یہ ظاہر کر کے کہ ان کو جنات غیب کا حال بتا جاتے ہیں۔

آنحضرت ﷺ نے نہایت تاکید اور استقصا کے ساتھ اس اعتقاد کو مٹایا اور علمِ غیب کی تمام صورتیں باطل کیں' خود قرآن مجید میں نہایت کثرت سے اس کے متعلق آیتیں نازل ہوئیں:

﴿وَ عِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ﴾ (الانعام:۵۹)

''اور خدا کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں جن کو خدا کے سوا کوئی جانتا۔''

آنحضرت ﷺ نے اس اجمال کی تفصیل بیان فرمائی اور فرمایا کہ مفاتحِ غیب پانچ ہیں جن کو خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ (۳)

---

(۱) ابوداؤد کتاب النکاح باب حق الزوج علی المراۃ۔

(۲) ابن ماجہ حق الزوج علی المراۃ۔

(۳) صحیح بخاری کتاب الرد علی الجہمیہ میں یہ تفصیل مذکور ہے۔

(۱) حمل یعنی لڑکا ہوگا یا لڑکی۔

(۲) کل کیا ہوگا۔

(۳) بارش کب ہوگی۔

(۴) کس جگہ موت آئے گی۔

(۵) قیامت کب آئے گی۔

اگر چہ علم غیب کی اور بھی صورتیں ہیں لیکن زیادہ تر ان ہی امور کی نسبت لوگ علم غیب کے مدعی تھے اور ان ہی باتوں کو لوگ پہلے سے جاننے کے خواہش مند ہوتے ہیں۔

یہاں تک کہ خود اپنی ذات سے بھی علمِ غیب کی نفی کی' ایک دفعہ ایک شادی کے موقع پر آنحضرت ﷺ تشریف فرما تھے' انصار کی چند لڑکیاں گا رہی تھیں' گاتے گاتے انہوں نے یہ گانا شروع کیا۔

وَ فِیْنَا رَسُوْلٌ یَّعْلَمُ مَا فِیْ غَدٍ. (۱)

''اور ہم میں ایک ایسا پیغمبر ہے جو کل کی بات جانتا ہے۔''

آنحضرت ﷺ نے منع فرمایا کہ یہ نہ کہو' وہی کہو جو پہلے گا رہی تھیں (۲) اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کو خاص حکم دیا کہ آپؐ اس حقیقت کو واضح کر دیں۔

﴿قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِیْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَ لَآ اَعْلَمُ الْغَیْبَ﴾ (الانعام:۵)

''کہہ دو کہ اے پیغمبر کہ میں یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہ میں غیب کی باتیں جانتا ہوں۔''

اور غیب کا علم صرف خدا کی صفت ہے۔

﴿قُلْ لَّا یَعْلَمُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ الْغَیْبَ اِلَّا اللّٰهَ﴾ (النمل:۶۵)

''کہہ دے اے پیغمبر کہ خدا کے سوا آسمانوں میں اور زمین میں کوئی غیب نہیں جانتا۔''

غیب دانی کے مدعی کاہن جو عرب کی گلی گلی میں خدع و فریب کا جال پھیلائے بیٹھے رہتے تھے اور بت خانوں میں خدائی کرتے تھے' ان کی سطوت خاک میں مل گئی' بت خانے ویران ہو گئے تو ان کے یہ پجاری بھی فنا ہو گئے۔ صحابہ نے آ کر پوچھا کہ یا رسول اللہ! ہم جاہلیت میں کاہنوں کے پاس جایا کرتے تھے' فرمایا ''اب نہ جایا کرو'' عرض کی ہم پرندوں سے فال لیا کرتے تھے' فرمایا یہ تمہارا وہم تھا' اس کے سبب سے اپنے ارادہ سے باز نہ آیا کرو' بعض لوگوں کے سوال کے جواب میں فرمایا کہ کاہن کچھ نہیں' انہوں نے کہا یا رسول اللہ (ﷺ)! ان کی بعض باتیں سچی بھی نکل آتی ہیں' فرمایا شیطان ایک آدھ بات سن لیتا ہے اور مرغی کی طرح قر قر کر کے اپنے دوست

(۱) صحیح بخاری کتاب الرد علی الجہمیہ میں بتفصیل مذکور ہے۔

(۲) صحیح بخاری کتاب النکاح۔

کے کانوں میں ڈالتا ہے اور وہ اس میں سو باتیں جھوٹ ملا دیتا ہے' کبھی فرمایا کہ فرشتوں کی زبان سے شیاطین فضائے آسمانی میں چوری چھپے کچھ سن لیتے ہیں اور کاہن اس میں سینکڑوں جھوٹ اپنی طرف سے ملا کر بیان کرتے ہیں' کاہنوں میں کچھ ایسے مکار ہوتے ہیں جو چوری کا غائبانہ پتا بتانے کا دعویٰ کرتے ہیں' عرب ان کو عراف کہتے تھے آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ جو کوئی کسی مال کا پتہ پوچھنے کے لیے کسی عراف کے پاس جائے گا اس کی چالیس دن کی نماز قبول نہ ہوگی۔ (۱) علمِ نجوم جس کے زور سے لوگ غیب کا حال دریافت کر لینے کے مدعی بنتے ہیں' آپ ؐ نے اس کا سیکھنا بھی جادو کی طرح گناہ بتایا ہے اور فرمایا کہ جو کسی کاہن کے پاس جا کر اس کی باتوں کو سچ سمجھے وہ محمد پر جو کچھ اترا ہے اس سے انکار کرتا ہے۔

ان تعلیمات نے خدا کے علاوہ دوسروں کی غیب دانی کے عقیدہ کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا' کہانت کی گرم بازاری سرد ہوگئی' فال' شگونِ بد' نجوم اور غیب دانی کے دوسرے خُدَّاعانہ طریقے مٹ گئے' پرندے اور پانسوں کے ذریعہ سے غیب کا حال دریافت کرنا وہم و وسوسہ قرار پایا' اور غیب کی مملکت پر خدا کے سوا کسی اور کی حکومت قائم نہ رہی۔

مخفی قوتوں کا ابطال

(۹) کائنات میں خدا کے سوا جن غیبی اسباب و علل یعنی سحر و طلسم' جنات و شیاطین اور ارواحِ خبیثہ اور دوسری قسم کی قوتوں کی غیبی قدرت و تصرف کا اعتقاد تھا اور ان سے بچنے کے لیے ان کی دہائی پکاری جاتی تھی' نذر چڑھائی جاتی تھی' قربانی کی جاتی تھی' آنحضرت ﷺ کی تعلیم اور وحی نے ان تمام خرافات کا قلع قمع کر دیا' اور خدا کے سوا تمام دوسری مخفی اور پوشیدہ قوتوں کا ڈر انسانوں کے سینوں سے ہمیشہ کے لیے نکال کر پھینک دیا' اور دعاء و کلماتِ الٰہی کے سوا ہر نوع کے جھاڑ پھونک منتر' تعویذ' گنڈے ٹوٹکے جن میں کسی غیر خدا سے غیبی استمداد یا شرک کا کلمہ ہو کفر قرار پائے اس قسم کے فاسد خیالات کے استیصال کے لیے ہر نماز میں اور نماز کی ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ کے ضمن میں اس آیت کے پڑھنے کا حکم دیا گیا:

﴿اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ﴾ (الفاتحہ:۴)

(''اے عالم کے پروردگار) ہم تیرے ہی آگے سر جھکاتے ہیں اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں۔''

سحر و طلسم و جادو اور ٹوٹکے کے متعلق ارشاد خداوندی ہوا:

﴿وَ مَاهُمْ بِضَآرِّیْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ وَ یَتَعَلَّمُوْنَ مَا یَضُرُّهُمْ وَ لَا یَنْفَعُهُمْ وَ لَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰاهُ مَالَهٗ فِی الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ﴾ (البقرۃ:۱۰۲)

''یہ جادو اور ٹوٹکے کرنے والے کسی کو کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتے' لیکن خدا کے حکم سے اور یہ یہود وہ (جادو

(۱) مشکوٰۃ باب الکہانۃ میں صحیحین سے حدیثیں نقل کی ہیں علمِ نجوم کی حرمت والی حدیث ابوداؤد' ابن ماجہ اور احمد سے کی ہے۔

اور ٹوٹکے) سیکھتے ہیں جو ان کو نقصان رساں ہیں نفع بخش نہیں اور یقیناً ان کو علم ہے کہ جو ان کو حاصل کرتا ہے اس کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے۔''

یہ بھی اعلان کر دیا گیا کہ سحر و جادو کی حقیقت وہم و تخیل سے زیادہ نہیں فرمایا:

﴿یُخَیَّلُ اِلَیْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰی﴾ (طٰہٰ: ٦٦)

''مصری جادوگروں کے جادو سے یہ اس کو خیال ہوتا تھا کہ وہ دوڑ رہے ہیں۔''

بلکہ بعض صحابہؓ نے ان مکار جادوگروں کے قلع قمع کے لیے ان کے قتل کا حکم دے دیا۔ (۱) تا کہ انسانوں کے دلوں میں ان کا جو خوف و ہراس بیٹھا ہوا ہے وہ دور ہو' ان کے اس عاجزانہ قتل ہونے سے یہ ثابت ہو کہ ان میں کوئی غیر معمولی طاقت نہیں وہ بالکل بے بس ہیں۔

ابوداؤد میں ہے کہ ایک صحابیؓ نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کہ یا رسول اللہ! ہم جاہلیت میں جھاڑ پھونک کیا کرتے تھے۔ اب آپ کیا فرماتے ہیں۔؟ ارشاد فرمایا کہ تم اپنے منتر ہمارے سامنے پیش کرو' اگر ان میں شرک کی کوئی بات نہ ہو تو کچھ مضائقہ نہیں' ایک صحابیؓ نے ایک بیمار پاگل پر سورۂ فاتحہ پڑھ کر دم کی وہ اچھا ہو گیا' اس نے ان کو انعام دیا انہوں نے آ کر رسول اللہ ﷺ سے واقعہ عرض کیا فرمایا کہ' میری عمر کی قسم! ہر جھاڑ پھونک باطل ہے لیکن تم نے سچی جھاڑ سے روزی کھائی' ایک اور صحابیؓ روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا:

((اِنَّ الرُّقٰی وَ التَّمَائِمَ وَ التِّوَلَةَ شِرْکٌ)) (ابوداؤد و ابن ماجہ)

''بے شک جھاڑ پھونک گنڈے اور میاں بیوی کے چھڑانے کے تعویذ شرک ہیں۔''

ان ہی صحابیؓ کے گھر میں ایک بڑھیا آیا کرتی تھی' گھر والوں نے اس سے کسی بیماری کا کوئی ٹوٹکا کرایا' ایک دھاگا پڑھ کر اس نے باندھ دیا تھا' وہ گھر آئے تو اس دھاگے پر ان کی نظر پڑی' انہوں نے ہاتھ بڑھایا اور اس کو توڑ کر پھینک دیا' پھر فرمایا کہ عبداللہ کا خاندان شرک کی باتوں سے مستغنی ہے' میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ کہتے سنا ہے کہ جھاڑ پھونک' گنڈے اور میاں بیوی کے چھڑانے کے تعویذ شرک ہیں' ان کی بیوی نے کہا کیا وجہ کہ ایک دفعہ میری آنکھوں میں کچھ پڑ گیا جب میں جھاڑتی تھی تو پانی رک جاتا تھا اور جب چھوڑ دیتی تھی تو پانی بھر آتا تھا۔ انہوں نے جواب دیا یہ شیطانی بات ہے تم نے کیوں نہ وہ کیا جو رسول اللہ ﷺ کرتے تھے۔ آنکھوں میں پانی ڈالتیں اور یہ دعا پڑھتیں۔ ''اے لوگوں کے پروردگار! اس بیماری کو دور کر' تو ہی شفا دینے والا ہے' تیری شفا بخشی کے سوا کوئی شفا نہیں' ایسی شفا دے کہ پھر کوئی بیماری نہ ہو۔''

اوہام و خرافات کا ابطال

(۱۰) وہ تمام اوہام و خرافات جن سے شرک پرست اہلِ عرب لرزہ براندام رہتے تھے اور جن کو وہ بالذات

(۱) جامع ترمذی باب ماجاء فی حد الساحر و ابوداؤد' باب اخذا الجزیۃ من المجوس۔

مؤثر اور متصرف سمجھتے تھے آنحضرت ﷺ نے ان کا طلسم توڑ دیا اور اعلان فرمایا کہ ان کی کوئی اصل نہیں۔ فرمایا۔(۱)

لَا عَدْوَی وَ لَا طِیَرَۃَ وَ لَا صِفْرَ وَّ لَا هَامَةَ. (ابوداؤد و ابن ماجه)

''نہ چھوت ہے، نہ بدفالی ہے، نہ پیٹ میں بھوک کا سانپ ہے نہ مردہ کی کھوپڑی سے پرندہ نکلتا ہے۔''

ایک اور صحابی کی روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا۔

اَلْعِیَافَةُ وَ الطَّیْرَةُ وَ الطَّرْقُ مِنَ الْجِبْتِ. (ابوداؤد ابن ماجہ)

''پرندوں کی بولی سے فال لینا، ان کے اڑنے سے فال لینا اور کنکری پھینک کر یا خط کھینچ کر حال بتانا شیطانی کام ہے۔''

ایک اور صحابی آپؐ کا یہ ارشاد نقل کرتے ہیں کہ فال نکالنا شرک ہے، پھر ان صحابی نے کہا کہ ہم صحابہؓ میں کوئی نہیں جو اس کو برا نہ سمجھتا ہو بلکہ خدا پر بھروسہ رکھنا چاہیے۔(۲) یہ بھی آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''پنھتر'' (نوٗ) کچھ نہیں۔(۳) یعنی پانی کی بارش میں اس کو بالذات کوئی دخل نہیں اسی طرح غولِ بیابانی کے متعلق عربوں کے جو معتقدات تھے ان کو آپؐ نے ایک لفظ سے باطل فرما دیا فرمایا۔

((لَا غَوْلَ)) (ابوداؤد باب فی الطیرۃ)

''غولِ بیابانی کچھ نہیں۔''

بحیرہ اور سائبہ وغیرہ جانوروں کے متعلق ان کے خیالاتِ فاسدہ کا قرآن نے ابطال کیا۔ سورۂ انعام میں ان کے ان مشرکانہ عقائد اور اعمال کی بتصریح تردید کی گئی اور سورہ مائدہ میں فرمایا گیا:

﴿مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْ بَحِیْرَةٍ وَّ لَا سَآئِبَةٍ وَّ لَا وَصِیْلَةٍ وَّ لَا حَامٍ﴾ (المائدۃ:۱۰۳)

''خدا نے بحیرہ اور سائبہ اور وصیلہ اور حام نہیں ٹھہرایا۔''

بحیرہ: اس بچہ کو کہتے تھے جس کا کان پھاڑ کر بتوں کی نذر کیا کرتے تھے۔

سائبہ: اس جانور کو کہتے تھے جو بتوں کے نام پر چھوڑ دیا جاتا تھا۔

وصیلہ: بعض لوگ نذر مانتے تھے کہ اگر بچہ نر ہوا تو اس کو بت پر چڑھائیں گے اور اگر مادہ ہوا تو اپنے پاس رکھیں گے۔ پھر اگر نر و مادہ پیدا ہوتے تو مادہ کے ساتھ نر بھی رکھ لیتے تھے، یہ وصیلہ تھا۔

حام: وہ اونٹ جس کے دس بچے بوجھ اٹھانے اور سواری کے لائق ہو چکتے تو دیوتا کے نام پر آزاد کر دیا جاتا تھا۔

---

(۱) یہ تمام روایتیں ابوداؤد جلد دوم باب التمائم و باب ماجاء فی الرقی اور ابن ماجہ باب تعلیق التمائم میں ہیں۔

(۲) ابوداؤد، ابن ماجہ ذکر فال۔

(۳) ابوداؤد و ابن ماجہ۔

یہ اور اس قسم کے دوسرے اوہام جو عرب میں پھیلے ہوئے تھے۔ آنحضرت ﷺ نے ان کا استیصال فرمایا' یہ اوہام پرستی حقیقت میں قوموں کی تباہی کا ایک بڑا سبب ہوتا ہے اور اوہام حقیقت کے خلاف ہونے کے علاوہ بہت سے کاموں میں خلل انداز ہوتے ہیں اور غور سے دیکھو تو ان کا سلسلہ بالآخر کسی نہ کسی شرک پر منجر ہوتا ہے اور انسان کو صحیح طریقِ عمل سے روک دیتے ہیں مثلاً بیماری میں طب کے قاعدہ کے موافق علاج کیا جائے تو مفید ہوگا لیکن بہت سے لوگ وہم پرستی کی بنا پر ٹونے ٹوٹکے کو دافعِ مرض سمجھتے ہیں' اس قسم کے اوہام عرب میں نہایت کثرت سے پھیلے ہوئے تھے آنحضرت ﷺ نے ان سب کی تصریح اور تعیین کے ساتھ باطل قرار دیا۔ مثلاً

(۱) عرب کا خیال تھا کہ جب کوئی بڑا شخص مر جاتا ہے تو چاند اور سورج میں گرہن لگتا ہے' آپ کے صاحبزادہ حضرت ابراہیمؓ نے جب انتقال کیا تو سورج گرہن لگا ہوا تھا' لوگوں نے خیال کیا کہ ان ہی کے مرنے کا اثر ہے' آنحضرت ﷺ نے سنا تو مسجد میں جا کر خطبہ دیا کہ چاند اور سورج خدا کی قدرت کے مظاہر ہیں' کسی کے مرنے سے ان میں گرہن نہیں لگتا۔ (۱)

(۲) یہ خیال تھا کہ سانپ اگر مارا جائے تو اس کا جوڑا آتا ہے اور انسان کو ہلاک کرتا ہے۔

(۳) ایک دفعہ آپؐ مسجد میں تشریف رکھتے تھے' ایک ستارہ ٹوٹا' آپؐ نے دریافت فرمایا کہ جاہلیت میں تم لوگ اس کی نسبت کیا اعتقاد رکھتے تھے' لوگوں نے عرض کی کہ ہمارا اعتقاد تھا کہ جب کوئی بڑا مر جاتا ہے یا کوئی بڑا شخص پیدا ہوتا ہے تو ستارے ٹوٹتے ہیں' آپ نے فرمایا کہ کسی کے مرنے یا پیدا ہونے سے ستارے نہیں ٹوٹتے۔ (۲)

(۴) شیر خوار بچوں کے سرہانے استرا رکھ دیا کرتے تھے کہ ان کو جنات نہ ستانے پائیں' ایک دفعہ حضرت عائشہؓ نے دیکھا تو اٹھا کر پھینک دیا اور کہا کہ آنحضرت ﷺ ان باتوں کو ناپسند کرتے تھے۔ (۳)

(۵) نظرِ بد سے بچنے کے لیے اونٹوں کے گلے میں قلادہ لٹکاتے تھے' آنحضرت نے حکم دیا کہ کسی اونٹ کے گلے میں قلادہ نہ رہنے پائے۔ (۴)

الغرض توحیدِ کامل کی تعلیم نے عربوں کے تمام مشرکانہ اوہام و خرافات کو ہمیشہ کے لیے مٹا دیا' اسلام کی اس اصلاح کی اہمیت کا اندازہ عیسائیت کی ان مقدس روایات و حکایات سے کرو جنہوں نے صدیوں تک دنیا کو دیووں' بھوتوں اور چڑیلوں کے تسلط اور عذاب کے شکنجہ میں مبتلا رکھا' اور ان کو نکالنا اور بھگانا عیسائیت کا کمال اور اعجاز سمجھا جاتا رہا۔

---

(۱) صحیح بخاری باب صلوٰۃ الکسوف۔

(۲) مسند ابن حنبل جلد اول ص ۲۱۔

(۳) ادب المفرد باب الطیرۃ من الجن ص ۱۸۰ مصر۔

(۴) مؤطا امام مالک باب ماجاء فی نزع المتعلق و الجرس من العین ص ۳۷۳۔

کفارہ اور شفاعت کے غلط معنی کی تردید

(۱۱) شرک کے اسباب میں ایک بڑا سبب کفارہ اور شفاعت کے وہ غلط معنی تھے جو عربوں اور عیسائیوں وغیرہ میں رائج تھے' عربوں نے شفاعت کے جو غلط معنی سمجھ رکھے تھے اس کا اصلی سبب ان کا وہ تخیل تھا جو خدا اور بندوں کے تعلق کی نسبت ان کے ذہن میں قائم تھا' وہ خدا اور بندوں کے درمیان وہی نسبت سمجھتے تھے اور جو ایک قاہر و جابر بادشاہ اور اس کی رعایا کے درمیان ہے' اور جس طرح بادشاہ کے دربار تک ایک عام اور معمولی رعایا کی رسائی دربار رس سفارشیوں اور مقربوں کے بغیر ممکن نہیں' اسی طرح اس شہنشاہ کے دربار میں بھی وہ اس کے دربار رس سفارشیوں اور مقربوں کے بغیر رسائی ممکن نہیں سمجھتے تھے' اسی لیے وہ ان درمیانی ہستیوں کے خوش رکھنے کی ضرورت کے بھی معتقد تھے' چنانچہ وہ اپنے بتوں' دیوتاؤں اور فرشتوں کو اسی نیت سے پوجتے تھے اور کہتے تھے:

﴿هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآءُنَا عِنْدَ اللّٰهِ﴾ (یونس:۱۸)

''یہ اللہ کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں۔''

آنحضرت ﷺ نے جب ان کی اس بت پرستی پر ان کو ملامت کی تو انہوں نے صاف کہا:

﴿مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى﴾ (الزمر:۳)

''ہم ان کو اسی لیے پوجتے ہیں کہ ہم کو اللہ کے تقرب میں نزدیک کر دیں۔''

یہودیوں میں بھی اسی قسم کی دوسری غلط فہمی تھی' وہ یہ سمجھتے تھے کہ بنی اسرائیل کا گھرانا خدا کا خاص کنبہ اور خاندان ہے اور ان کے خاندان کے پیغمبر اور نبی چونکہ خدا کے پیارے اور محبوب ہیں' اس لیے ان کی اولاد اور نسل بھی دنیا اور آخرت میں یہی درجہ رکھتی ہے' اگر ان پر کوئی مصیبت بھی پڑے گی تو بھی ان کے خاندان کے بزرگ جو خدا کے مقرب اور برگزیدہ ہیں' وہ ہر طرح ان کو اس سے بچالیں گے' ان کا دعویٰ تھا کہ

﴿نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَ اَحِبَّآؤُهٗ﴾ (المائدہ:۱۸)

''ہم خدا کی اولاد اور اس کے پیارے ہیں۔''

قرآن نے کہا۔

﴿بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ﴾ (المائدہ:۱۸)

''بلکہ تم بھی خدا کی مخلوقات میں سے ایک مخلوق ہو یہ اسی کو اختیار ہے جس کو چاہے بخشے اور جس کو چاہے سزا دے۔''

اور اسی بنا پر ان کا دعویٰ تھا:

﴿لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ﴾ (آل عمران:۲۴)

''ہم کو دوزخ صرف چند گنتی کے دن چھو کر چھوڑ دے گی۔''

قرآن نے کہا۔

﴿وَ غَرَّهُمْ فِیْ دِیْنِهِمْ مَا كَانُوْا یَفْتَرُوْنَ﴾ (آل عمران:۲۴)

''اور یہ اپنے دل سے بنا کر جو جھوٹ عقیدہ گھڑ چکے ہیں وہ ان کے مذہب کے بارہ میں ان کو دھوکا دے رہا ہے۔''

عیسائیوں کا عقیدہ یہ تھا اور ہے کہ باپ (خدا) نے تمام انسانوں کی طرف سے جو موروثی اور طبعی طور سے گنہگار ہیں اپنے اکلوتے بیٹے (حضرت عیسیٰؑ) کی قربانی دے کر ان کے گناہوں کا کفارہ دے دیا' اور وہ گناہوں سے پاک وصاف ہو گئے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے بعد ان کے جانشین پوپوں کو گناہوں کے معاف کرنے کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ جو زمین پر کھولیں گے وہ آسمان پر کھولا جائے گا' اسی لیے پوپوں کے سامنے اعترافِ گناہ کا عقیدہ عیسائیوں میں پیدا ہوا اور ان کو بندوں کے گناہوں کے معاف کرنے کا دنیا میں حق ملا۔

پیغامِ محمدی نے ان کو ملزم قرار دیا اور کہا:

﴿اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَ رُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ (التوبہ:۳۱)

''انہوں نے خدا کو چھوڑ کر اپنے عالموں اور راہبوں کو اپنا خدا بنا رکھا ہے۔''

اور اصولی طور پر اس نے یہ بتا دیا کہ

﴿وَ مَنْ یَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهَ﴾ (آل عمران:۱۳۵)

''اور خدا کے سوا کون گناہوں کو معاف کر سکتا ہے۔''

ان کا عقیدہ تھا کہ بیٹا قیامت کے دن باپ کے داہنے بازو پر برابر بیٹھ کر عدل وانصاف کرے گا' قرآن پاک نے ایک بڑے مؤثر طرز میں ان کی تردید کی ہے' قیامت کے دن خدا حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پوچھے گا:

﴿ءَ اَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِیْ وَ اُمِّیَ اِلٰهَیْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ (المائدہ:۱۱۶)

''اے عیسیٰ (علیہ السلام)! کیا تم نے لوگوں سے کہا تھا کہ خدا کو چھوڑ کر مجھ کو اور میری ماں کو خدا بناؤ۔''

وہ کہیں گے بارِ الٰہا! میں نے تو ان سے وہی کہا تھا جو تو نے کہا تھا۔ میں نے تو ان کو یہ تعلیم نہیں دی تھی۔ میں نے تو ان سے یہی کہا تھا کہ صرف ایک خدا کو پوجو۔ اب

﴿اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَ اِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ﴾ (المائدہ: ۱۱۸)

''اگر تو ان کو سزا دے تو یہ تیرے بندے ہیں اور اگر تو بخش دے تو سب کچھ کر سکتا ہے کہ تو غالب اور حکمت والا ہے۔''

اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ گناہوں کی مغفرت اور معافی یا گناہوں پر سزا اور عذاب دینا صرف خدا کے ہاتھ میں ہے کسی دوسرے کو اس میں کوئی دخل نہیں۔

بت پرست عربوں کا عقیدہ بھی یہی تھا کہ یہ دیوتا اور ان کے یہ بت خدا کی طرف سے دونوں عالم میں مختارِ کل ہیں' وہ یہاں دینے نہ دینے کا' اور اس عالم میں بخشنے کا اختیار رکھتے ہیں' اس عقیدہ کا نام ان کے یہاں شفاعت تھا' اور یہ دیوتا ان کے شفیع تھے' قرآن مجید نے کفارۂ غیر خدا کے اختیار' مغفرت اور بت پرستانہ طریقۂ شفاعت کے عقائدِ باطلہ کی ہر طرح تردید کی اور بتایا کہ یہ اختیار خدا کے سوا کسی اور کو نہیں' سب اس کی عظمت اور جلال کے سامنے عاجز اور درماندہ ہیں۔

﴿وَ لَا یَمْلِکُ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ وَ هُمْ یَعْلَمُوْنَ﴾ (الزخرف:۸۶)

''یہ کافر خدا کو چھوڑ کر جن کو پکارتے ہیں وہ شفاعت کا اختیار نہیں رکھتے' لیکن وہ جس نے حق کی شہادت دی اور وہ جانتے بھی ہوں۔''

﴿لَا یَمْلِکُوْنَ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا﴾ (مریم:۸۷)

''یہ شفاعت کا اختیار نہیں رکھتے لیکن وہ جس نے رحم والے خدا سے اقرار لے لیا۔''

﴿ءَ اَتَّخِذُ مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً اِنْ یُّرِدْنِ الرَّحْمٰنُ بِضُرٍّ لَّا تُغْنِ عَنِّیْ شَفَاعَتُهُمْ شَیْئًا وَّ لَا یُنْقِذُوْنَ﴾ (یٰسٓ : ۲۳)

''کیا خدائے برحق کو چھوڑ کر جھوٹے معبودوں کو خدا بناؤں' اگر رحمٰن مجھے نقصان پہنچانا چاہے تو ان کی شفاعت مجھے ذرا بھی فائدہ نہیں پہنچا سکتی اور نہ وہ مجھے چھڑا سکتے ہیں۔''

کفار فرشتوں کو بھی اسی غرض سے پوجتے تھے' حکم ہوا:

﴿وَ کَمْ مِّنْ مَّلَکٍ فِی السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِیْ شَفَاعَتُهُمْ شَیْئًا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اَنْ یَّاْذَنَ اللّٰهُ لِمَنْ یَّشَآءُ وَ یَرْضٰی﴾ (النجم:۲۶)

''اور کتنے فرشتے ہیں آسمانوں میں کہ ان کی شفاعت کچھ فائدہ نہیں پہنچاتی لیکن اس کے بعد کہ اللہ اجازت دے جس کے لیے چاہے اور پسند کرے۔''

﴿اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُفَعَآءَ قُلْ اَوَلَوْ کَانُوْا لَا یَمْلِکُوْنَ شَیْئًا وَّ لَا یَعْقِلُوْنَ﴾ (الزمر:۴۳)

''کیا ان کافروں نے خدا کے سوا کوئی شفیع بنایا ہے' کہہ دے کہ اگر یہ کچھ اختیار اور سمجھ بوجھ نہ رکھتے ہوں تو بھی شفیع بننے کے قابل ہیں؟''

خدا قیامت میں ان سے کہے گا:

﴿وَ مَا نَرٰی مَعَکُمْ شُفَعَآءَکُمُ الَّذِیْنَ زَعَمْتُمْ اَنَّهُمْ فِیْکُمْ شُرَکٰٓؤُا﴾ (انعام:۹۴)

''اور ہم دیکھتے نہیں' تمہارے ساتھ تمہارے ان شفیعوں کو جن کو تم سمجھتے تھے کہ وہ تمہاری ملکیت میں خدا

کے ساتھ شریک ہیں۔''

﴿وَ یَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ یُبْلِسُ الْمُجْرِمُوْنَ ○ وَ لَمْ یَكُنْ لَّهُمْ مِنْ شُرَكَآئِهِمْ شُفَعٰٓؤُا﴾ (روم:۱۲۔۱۳)

''اور جب قیامت قائم ہوگی تو مشرکین ناامید ہوں گے کہ جن کو وہ خدا کا شریکِ کار بتاتے تھے ان میں سے کوئی ان کا شفیع نہ ہوا۔''

خاص یہود کو مخاطب کر کے ان کے عقیدہ کی تردید میں کہا گیا:

﴿یٰبَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ ..... وَ اتَّقُوْا یَوْمًا لَّا تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَیْئًا وَّ لَا یُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّ لَا یُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّ لَاهُمْ یُنْصَرُوْنَ﴾ (البقرہ:۴۸)

''اے فرزندان اسرائیل۔۔۔۔اور ڈرو اس دن سے جس میں کوئی دوسرے کے ذرا کام نہ آئے گا اور نہ ی کی طرف سے کوئی شفاعت قبول کی جائے گی اور نہ کچھ اس کے بدلہ میں لیا جائے گا اور نہ کوئی ان کو مدد پہنچائی ئے گی۔''

پھر اسی معنی کی آیت اسی سورۂ میں دوسری جگہ ہے۔

﴿یٰبَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ ..... وَ اتَّقُوْا یَوْمًا لَّا تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَیْئًا وَّ لَا یُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّ لَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ﴾ (البقرہ:۱۱۲،۱۲۳)

''اے فرزندان اسرائیل! اور ڈرو اس دن سے جس میں کوئی کسی کے ذرا بھی کام نہ آئے گا اور نہ اس کی طرف سے کوئی بدلہ قبول ہوگا اور نہ شفاعت فائدہ دے گی۔''

اور اسی معنی میں مسلمانوں سے بھی کہا گیا کہ وہ عمل پیش کریں، شفاعت کے بھروسے پر نہ رہیں:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَ یَوْمٌ لَّا بَیْعٌ فِیْهِ وَ لَا خُلَّةٌ وَّ لَا شَفَاعَةٌ﴾ (البقرہ:۲۵۴)

''اے مسلمانو! جو کچھ ہم نے تم کو روزی دے رکھی ہے اس میں سے کچھ خرچ کر دیا کرو، اس دن کے آنے سے پہلے جس میں نہ لین دین ہے نہ دوستی ہے نہ شفاعت ہے۔''

غرض آپؐ کے پیغام نے ان معنوں میں شفاعت کے عقیدۂ باطل کی ہر جگہ تردید کی ہے اور اعلان کیا ہے ہ اس شفاعت کا اختیار صرف خدا کے ہاتھ میں ہے۔

﴿اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُفَعَآءَ قُلْ اَوَلَوْ كَانُوْا لَا یَمْلِكُوْنَ شَیْئًا وَّ لَا یَعْقِلُوْنَ○ قُلْ لِّلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِیْعًا لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ثُمَّ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ﴾ (الزمر:۴۳،۴۴)

''کیا انہوں نے خدا کے سوا اوروں کو شفیع بنا رکھا ہے کہہ دے کہ اگرچہ ان کو کسی چیز کا اختیار نہ ہو اور نہ ان کو ھ ہو تو یہ بھی کہہ دے کہ شفاعت کا کل اختیار خدا ہی کو ہے۔ اسی کا راج آسمانوں اور زمین میں ہے، پھر اسی کی

طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔"

اس آیت پاک نے کفار ومشرکین کے عقیدۂ شفاعت کی قطعی طور سے تردید کی' دوسری آیت میں یہود ونصاریٰ کے عقیدۂ شفاعت کا صرف اتنا حصہ تسلیم کیا کہ خدا کے نیک بندے اپنے بھائیوں کے حق میں شفاعت کریں گے:

﴿وَ لَا یَمْلِکُ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ وَ هُمْ یَعْلَمُوْنَ﴾ (الزخرف:۸۶)

"اور یہ لوگ خدا کو چھوڑ کر جن کو پکارتے ہیں وہ شفاعت کا اختیار نہیں رکھتے' لیکن وہ جنہوں نے حق کی گواہی دی اور وہ دانش رکھتے ہیں۔"

دوسری جگہ اسی شہادت کو اقرار لینا کہا گیا ہے:

﴿لَا یَمْلِکُوْنَ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا﴾ (مریم:۸۷)

"یہ لوگ شفاعت کا اختیار نہیں رکھتے لیکن وہ جو خدا کے نزدیک (دنیا میں اپنے عمل کے ذریعہ سے) اقرار لے چکا ہے۔"

لیکن اس شہادتِ حق اور عہدِ الٰہی کے باوجود اس اختیار کے استعمال کے لیے اللہ تعالیٰ کی اجازت اور رضامندی شرط ہے۔

﴿مَا مِنْ شَفِیْعٍ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اِذْنِهٖ﴾ (یونس:۳)

("خدا کی بارگاہ میں) کوئی شفیع نہیں' اس کی اجازت کے بعد۔"

﴿مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ﴾ (البقرۃ:۲۵۵)

"وہ کون ہے جو خدا کے سامنے کسی کی شفاعت کر سکے' لیکن اس کی اجازت سے۔"

﴿وَ کَمْ مِّنْ مَّلَکٍ فِی السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِیْ شَفَاعَتُهُمْ شَیْـًٔا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اَنْ یَّاْذَنَ اللّٰهُ لِمَنْ یَّشَآءُ وَ یَرْضٰی﴾ (النجم:۲۶)

"اور کتنے فرشتے ہیں آسمانوں میں کہ ان کی شفاعت ذرا بھی کام نہیں آ سکتی' البتہ اس کے بعد کہ خدا اجازت دے جس کو چاہے اور پسند کرے۔"

﴿لَا یَتَکَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَ قَالَ صَوَابًا﴾ (النباء:۳۸)

"یہ فرشتے اور روح کوئی خدا سے اس دن بات نہ کر سکے گا لیکن جس کو وہ رحم والا اجازت دے اور وہ ٹھیک کہے۔"

پھر یہ شفاعت بھی ان ہی لوگوں کے حق میں ہو سکے گی جن کے حق میں اللہ تعالیٰ انبیاء اور صالحین کو اس کی اجازت دے گا فرمایا۔

﴿وَ لَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا لِمَنْ اَذِنَ لَهٗ﴾ (سبا:۲۳)

''اور شفاعت خدا کے نزدیک نفع نہ دے گی لیکن اس کے لیے جس کے لیے وہ شفاعت کی اجازت دے۔''

﴿یَوْمَئِذٍ لَّا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَ رَضِیَ لَهٗ قَوْلًا﴾ (طٰہٰ: ۶)

''اس دن شفاعت نفع نہ دے گی لیکن اس کو جس کے لیے خدا اجازت دے اور اس کے لیے بات کرنا پسند کرے۔''

بلکہ خود انبیاء علیہم السلام بھی سفارش ان ہی کی کریں گے جن کی سفارش خود خدا چاہے گا۔ فرمایا:

﴿وَ لَا یَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰی وَهُمْ مِّنْ خَشْیَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ﴾ (الانبیاء:۲۸)

''اور وہ شفاعت نہیں کریں گے لیکن اس کی جس کے لیے خدا اپنی خوشنودی ظاہر کرے اور وہ اس کے خوف سے ترساں ہوں گے۔''

پھر ایک جماعت ایسی بھی ہے جس کے افراد کے لیے ازل ہی سے یہ اعلان عام ہو چکا ہے کہ ان کے لیے مغفرت اور شفاعت کا دروازہ بند ہے اور یہ وہ مجرم ہیں جن کے دل حق کی شہادت سے محروم ہو گئے۔

﴿فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشّٰفِعِیْنَ﴾ (المدثر:۴۸)

''تو ان کو شفاعت کرنے والوں کی شفاعت فائدہ نہ دے گی۔''

﴿وَ مَا لِلظّٰلِمِیْنَ مِنْ حَمِیْمٍ وَّ لَا شَفِیْعٍ یُّطَاعُ﴾ (المؤمن:۱۸)

''ظالموں (مشرکوں)[1] کا نہ کوئی دوست (اس دن) ہوگا' اور نہ کوئی شفیع جس کی بات مانی جائے۔''

اور وہ بدنصیب گروہ جس کے حق میں رحمت کا یہ دروازہ بند رہے گا' مشرکین ہیں' جیسا کہ ذیل کی آیت سے ظاہر ہے۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَكَ بِهٖ وَ یَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ یَّشَآءُ﴾ (النساء:۴۸)

''اللہ اس گناہ کو کہ اس کے ساتھ کوئی شریک ٹھہرایا جائے نہیں بخشتا اور اس سے نیچے کے گناہ جس کو چاہے بخش دے۔''

لیکن اب ایسی حالت میں جب کہ وہی شفاعت کر سکیں گے جن کو اللہ تعالیٰ اس کی اجازت دے گا اور وہ بھی ان ہی کی شفاعت کریں گے جن کی شفاعت کرانا خود خدا کو منظور ہوگا تو حقیقت میں خود اللہ تعالیٰ ہی اپنے دربار میں اپنا آپ شفیع ہوگا' یا صوفیانہ اصطلاح میں یوں کہو کہ جلالِ الٰہی کی بارگاہ میں اس کی صفتِ کریمی و رحیمی خود شفیع بن کر کھڑی ہوگی' اسی لیے ارشاد ہوا:

﴿وَ اَنْذِرْ بِهِ الَّذِیْنَ یَخَافُوْنَ اَنْ یُّحْشَرُوْٓا اِلٰی رَبِّهِمْ لَیْسَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ وَلِیٌّ وَّ لَا شَفِیْعٌ

---

(۱) ﴿اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ﴾ (لقمٰن: ۲۰) بے شک شرک بڑا ظلم ہے (صحیح بخاری ذکر لقمٰن جلد ا صفحہ ۴۸۷)

لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ﴾ (الانعام:۵۱)

''اوراس قرآن کے ذریعہ (اے پیغمبر) ان لوگوں کو ہشیار کردے کہ اس سے ڈرتے رہیں کہ وہ اپنے رب کے پاس جمع کیے جائیں گے ان کے لیے ان کے رب کے سوا کوئی حمایتی اور شفیع نہیں شاید وہ بچتے ہیں۔''

﴿مَالَكُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ وَ لَا شَفِيْعٍ اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ﴾ (السجدۃ:۴)

''خدا کے سوا تمہارا کوئی حمایتی اور شفیع نہیں پھر کیا تم سوچتے نہیں۔''

خدا کی اس صفتِ کریمی و رحیمی کے مظہر اس دنیا میں بھی وہی ہوں گے جو اس دنیا میں اس کے مظہر بن کر آئے تھے اور وہ انبیائے کرام ہیں کہ خدا کے رحم و کرم ہی کے سبب سے جو اس دنیا اور دنیا والوں کے ساتھ ہے ان انبیا کی بعثت ہوئی اور وہ اپنی اپنی امت پر شاہد قرار پائے' اسی طرح خدا کی اجازت کے بعد اس دنیا میں بھی وہی خدا کے اس رحم و کرم اور فضلِ عمیم کے مظہر قرار پائیں گے نیز رحمت کے فرشتے اور امت کے نیکوکار اور صالح افراد بھی جن کو رحمتِ الٰہی نے چنا ہو' اس منصب پر ممتاز ہو سکیں گے خصوصاً وہ سراپا رحمت نبی جو اس دنیا میں رحمۃ للعالمین اور خدا کی صفتِ رحیمی کا مظہر بن کر آیا۔

اجرامِ سماوی کی قدرت کا انکار

بظاہر دنیا میں بہت سی باتیں آفتاب و ماہتاب کی گردش اور ان کے سبب سے اختلاف موسم کے اثرات سے ہوتی ہیں' اس لیے ستارہ پرست قوموں میں یہ اعتقاد پیدا ہو گیا تھا کہ دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے وہ ستاروں کی گردش کے اثر سے ہوتا ہے' یہی اعتقاد عرب کے مشرکوں میں بھی پھیلا تھا' وہ سورج اور چاند کو سجدے کرتے تھے' اسلام نے ان کو اس شرک سے روکا اور کہا۔

﴿لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَ لَا لِلْقَمَرِ﴾ (حم السجدۃ:۵)

''سورج اور چاند کو سجدے نہ کیا کرو۔''

اسی طرح وہ زمانہ کو دنیا کے کاروبار میں حقیقی مؤثر جانتے تھے اور یہ کہتے تھے۔

﴿وَ مَا يُهْلِكُنَا اِلَّا الدَّهْرُ﴾ (الجاثیہ:۲۴)

''ہم کو تو زمانہ مارتا ہے۔''

اسی کا اثر ہے کہ ہماری شاعری کی زبان میں ''فلک کج رفتار'' اور ''دہر ناہنجار'' کی شکایت اب تک چلی آتی ہے عرب کے مشرکین بھی اسی طرح بولا کرتے تھے' ان کو جب کوئی خلافِ توقع تکلیف پہنچتی تھی تو زمانہ کی شکایت کیا کرتے تھے اور اس کو برا کہتے تھے [1] آنحضرت ﷺ نے اس سے منع کیا' اور فرمایا کہ زمانہ کو گالی نہ دیا کرو کہ

(۱) فتح الباری شرح بخاری جلد ۸ صفحہ ۴۴۱ و کتاب الاسماء والصفات بیہقی صفحہ ۱۱۵۔ الہ آباد۔

زمانہ خود خدا ہے۔ (۱) اور فرمایا کہ خدا ارشاد فرماتا ہے کہ آدم کا بیٹا مجھے تکلیف پہنچاتا ہے جب وہ زمانہ کو برا کہتا ہے' زمانہ میں ہوں' میرے ہاتھ میں تمام کام ہیں' میں شب و روز کا انقلاب کرتا ہوں۔ (۲) یعنی زمانہ کو جن تکلیفوں اور مصیبتوں کا خالق سمجھ کر لوگ برا کہتے ہیں' حقیقت میں ان کا پیدا کرنے والا خدا ہی ہے اسی لیے یہ گالی حقیقت میں خدا کو دی جاتی ہے۔

اسی خیال کا یہ بھی اثر تھا کہ اہلِ عرب بارش کو پنچھتر کی طرف منسوب کیا کرتے تھے' اور کہا کرتے تھے کہ فلاں پنچھتر کے سبب سے ہم پر پانی برسایا گیا' حدیبیہ کے موقع پر اتفاق سے رات کو بارش ہوئی' صبح کو نماز کے بعد آپ صحابہ کی طرف مخاطب ہوئے اور فرمایا جانتے ہو تمہارے رب نے کیا کہا' صحابہ نے عرض کی کہ خدا اور اس کا رسول زیادہ جانتا ہے' ارشاد ہوا' اس نے فرمایا۔ آج صبح کو میرے بندوں میں سے کچھ مومن ہو کر اٹھے اور کچھ کافر ہو کر' جنہوں نے یہ کہا کہ خدا کے فضل و رحمت سے ہم پر پانی برسا وہ تو خدا پر ایمان لانے والے اور ستارہ کے انکار کرنے والے ہیں اور جنہوں نے یہ کہا کہ فلاں پنچھتر سے پانی ہم پر برسا تو وہ خدا کے انکار کرنے والے اور ستارہ پر ایمان لانے والے ہیں۔ (۳)

سورج گرہن اور چاند گرہن کو بھی لوگ عظیم الشان واقعات اور انقلابات کی علامت سمجھتے تھے' کم و بیش دنیا کی تمام قوموں میں وہ آسمانی دیوتاؤں کے غیظ و غضب کے مظہر یقین کیے جاتے تھے' سن ۹ ہجری میں اتفاق سے ایک دن سورج میں گرہن لگا اور اسی دن آپؐ کے صاحبزادہ حضرت ابراہیم نے وفات پائی' صحابہ نے خیال کیا کہ یہ سورج میں گرہن لگنے کا سبب حضرت ابراہیم کی موت ہے' آنحضرت ﷺ نے جب یہ سنا تو تمام مسلمانوں کو مسجد میں جمع ہونے کا حکم دیا اور ایک بلیغ خطبہ ارشاد فرمایا' جس میں اس خیال کی تردید کی فرمایا کسوف و خسوف (گرہن) کو کسی کے جینے مرنے سے کوئی تعلق نہیں' یہ بھی خدا کے نشانوں میں سے ایک نشان ہے۔ (۴)

غیر خدا کی قسم سے روکنا

(۱۳) شرک کی ایک نہایت ہی باریک صورت یہ تھی کہ لوگ غیرِ خدا کی قسمیں کھاتے تھے۔

قسم کھانے کے معنی حقیقت میں شہادت کے ہیں' جس کی قسم کھائی جاتی ہے اس کو دراصل واقعہ پر گواہ بنایا جاتا ہے عربوں میں بت پرستی کے رواج کے باعث بتوں اور دیوتاؤں کی قسمیں کھائی جاتی تھیں جو صریح کفر تھا' قریش اپنے دیوتا لات و عزیٰ کی قسمیں کھایا کرتے تھے' آنحضرت ﷺ نے اس سے منع فرمایا۔ (۵) لیکن رواج

(۱) صحیح مسلم الفاظ الاب۔
(۲) صحیح بخاری تفسیر سورۂ جاثیہ و کتاب الرد علی الجہمیہ جلد ۲ صفحہ ۱۱۶۔
(۳) صحیح بخاری باب الاستسقاء و باب الذکر بعد الصلوٰۃ و صحیح مسلم کتاب الایمان۔
(۴) صحیح بخاری صلوٰۃ الکسوف۔
(۵) سنن نسائی الایمان والنذور۔

اور عادات کے باعث مسلمان ہونے کے بعد بھی بے اختیار ان کی زبان سے ان کی قسمیں نکل جاتی تھیں، آپ نے فرمایا کہ جس شخص کی زبان سے لات اور عزیٰ کی قسم نکل جائے تو وہ فوراً لا الہ الا اللہ کہہ (لے) یہ گویا اس کفر کے کلمہ سے توبہ ہے، قریش میں باپ کی قسم کھانے کا بھی رواج تھا۔ اس سے بھی آپ نے منع فرمایا۔ ایک دفعہ حضرت عمرؓ کو آپ نے باپ کی قسم کھاتے سنا تو آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو اس سے منع کیا ہے کہ اپنے باپ کی قسم کھایا کرو، جس کو قسم کھانی ہو وہ یا تو خدا کی قسم کھائے ورنہ چپ رہے، حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ حضور کے ارشاد کا یہ اثر ہوا کہ اس وقت سے آج تک میں نے نہ تو اپنی بات میں اور نہ کسی اور کی بات دہرانے میں کبھی باپ کی قسم کھائی۔ (۱) ماں کی قسم بھی لوگ کھایا کرتے تھے، اس سے بھی آپ نے منع فرمایا، اسی طرح کعبہ کی بھی قسم لوگ کھایا کرتے تھے اس پر ایک یہودی نے آ کر مسلمانوں کو طعنہ دیا کہ تم بھی شرک کرتے ہو، کعبہ کی قسم کھاتے ہو آپؐ نے مسلمانوں سے فرمایا کہ کعبہ نہیں بلکہ کعبہ والے (خدا) کی قسم کھایا کرو۔ (۲) ایک دفعہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے کسی کو کعبہ کی قسم کھاتے سنا تو اس کو منع کیا اور کہا کہ غیر خدا کی قسم نہ کھائی جائے، میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ کہتے سنا ہے کہ جس نے غیر خدا کی قسم کھائی اس نے کفر کیا یا شرک (۳) دوسری روایت میں ہے کہ ہر وہ قسم جو غیر خدا کی کھائی جائے شرک ہے۔ (۴)

خدا کی مشیت میں کوئی شریک نہیں

(۱۴) اکثر نیک لوگوں کی نسبت یہ سمجھا جاتا ہے کہ ان کی مشیت عین خدا کی مشیت ہے اس میں نہ صرف بد عقیدہ لوگ بلکہ اہلِ توحید بھی غلطی سے مبتلا ہو جاتے ہیں، آنحضرت ﷺ نے انسانوں کو اس دقیق غلطی سے آگاہ کیا اور بتایا کہ دنیا میں مشیت صرف خدا کی ہے، اسی کی خواہش کے مطابق دنیا چل رہی ہے، تمام مشیتیں اور خواہشیں اسی کی مشیت اور خواہش کے ماتحت ہیں، اس کے ساتھ کسی مخلوق کی مشیت عالم کے کاروبار میں شریک نہیں، لیکن لوگوں نے خدا کی مشیت کے ساتھ اوروں کی مشیت کو بھی شریک کر لیا تھا، توحیدِ کامل کے معلم ﷺ نے اس خیال کی سختی سے تردید کی، اور قرآن مجید نے جا بجا اس حقیقت کو واضح کیا کہ مشیتِ الٰہی کے علاوہ کوئی اور حقیقی مشیت نہیں تمام دیگر مشیتیں اس کے تابع اور ماتحت ہیں، عقیدہ کی یہ غلطی اس قدر عام تھی کہ جو لوگ عقیدہ نہیں رکھتے تھے وہ بھی سلاطین، حکام اور بزرگوں کے ساتھ گفتگو میں یہ کہنا حسنِ ادب سمجھتے تھے کہ جو خدا چاہے اور جو حضور چاہیں، آنحضرت ﷺ نے اس طرز کلام سے منع فرمایا، یہاں تک کہ خدا کی مشیت کے ساتھ برابری سے خود اپنی مشیت کے ذکر سے بھی صحابہؓ کو روکا اس قسم کا طرزِ کلام لوگوں کی زبان پر چڑھ گیا تھا، اس میں یہ تصحیح فرمائی کہ خدا اور غیر کی

(۱) یہ تمام واقعات صحیح بخاری صحیح مسلم۔ نسائی کتاب الایمان میں مذکور ہیں۔

(۲) نسائی کتاب الایمان والنذور۔

(۳) جامع ترمذی ابواب النذور والایمان و مستدرک حاکم ص ۱۸ ج ۱ کتاب الایمان۔

(۴) مستدرک بحوالہ مذکور۔

مشیت کے درمیان عطف کا واؤ نہ لایا جائے کہ اس سے برابری کا شائبہ نکلے بلکہ ''پھر'' کا لفظ بولا جائے تا کہ معلوم ہو کہ خدا کی مشیت کے بعد اوروں کی مشیت کا درجہ ہے۔

نسائی میں ہے کہ ایک یہودی نے خدمتِ نبوی میں آ کر مسلمانوں سے کہا کہ تم لوگ شرک کرتے ہو کہتے ہو کہ جو خدا چاہے اور جو محمد چاہیں' آپؐ نے صحابہ کو مخاطب کر کے فرمایا یوں کہو کہ وہ ایک ہے جو چاہے' پھر جو آپؐ چاہیں۔ (۱) یہی واقعہ ابن ماجہ میں اس طرح ہے کہ ایک صحابیؓ نے خواب میں دیکھا تھا کہ ایک یہودی یا عیسائی ان سے کہہ رہا ہے کہ تم مسلمان بڑے اچھے لوگ ہوتے اگر شرک نہ کیا کرتے تم کہا کرتے ہو کہ خدا جو چاہے اور محمد جو چاہیں' ان صحابی نے خدمت اقدس میں آ کر اپنا یہ خواب بیان کیا۔ آپؐ نے فرمایا میں اس فقرہ کی برائی جانتا تھا۔ یوں کہو کہ جو خدا چاہے پھر جو محمد چاہیں۔ (۲) ابوداؤد میں یہی تعلیم اس واقعہ کی تقریب کے بغیر اس طرح مذکور ہے کہ آپؐ نے صحابہ سے فرمایا کہ یہ نہ کہا کرو کہ جو خدا چاہے اور جو فلاں چاہے' بلکہ یوں کہو کہ جو خدا چاہے پھر جو فلاں چاہے' لیکن امام بخاری نے ادب المفرد میں اور بیہقی نے کتاب الاسماء میں جو روایت کی ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ خدا کے ساتھ کسی اور مشیت کا نام بھی نہ لینا چاہیے ایک شخص نے خدمت والا میں حاضر ہو کر سلسلۂ کلام میں کہا کہ جو خدا چاہے اور جو آپؐ چاہیں' ارشاد ہوا کہ تم نے خدا کا ہمسر اور مقابل ٹھہرایا جو خدا تنہا چاہے۔ ماشاء اللہ وحدہ۔

اس سلسلہ میں یہاں تک اہتمام مدِ نظر تھا کہ اس سے بھی منع فرمایا کہ خدا اور رسول کی طرف ایک ضمیر پھیر کر ایک فعل لایا جائے تا کہ یہ سمجھا جائے کہ خدا اور رسول کا درجہ برابر برابر ہے' ایک دفعہ آپ کے سامنے کسی شخص نے خطبہ کے اثنا میں یہ فقرہ کہا' جس نے خدا اور رسول کی اطاعت کی اس نے ہدایت پائی اور جس نے ان دونوں کی نافرمانی کی۔ یہاں تک اس نے کہا تھا کہ آپ نے اس کو روک دیا اور فرمایا۔ ''اٹھ جاؤ تم برے خطیب ہو۔'' (۴) آپ نے آزردگی کا اظہار اس لیے فرمایا کہ ان دونوں کے ساتھ کہنے سے سامعین پر یہ اثر پڑتا ہے کہ خدا کی اور رسول کی نافرمانی کا حکم برابر ہے اور اس میں شرک کا شائبہ ہے' اس لئے خطیب کو یوں کہنا چاہیے تھا کہ اور جو خدا کی اور رسول کی نافرمانی کرے گا وہ۔۔۔۔۔۔۔۔ جیسا کہ قرآن پاک میں بار بار آیا ہے اور ماثورہ خطبوں میں بھی منقول ہے۔

مشتبہاتِ شرک کی ممانعت

(۱۵) جن باتوں میں شرک کا ذرا بھی شائبہ پایا جاتا تھا' ان سے بالکل منع کر دیا۔ لوگ اولاد کا نام آفتاب'

(۱) نسائی کتاب الایمان والنذور۔

(۲) ابن ماجہ کتاب النذور۔

(۳) ابوداؤد کتاب الادب باب لاتقول خبثت نفسی۔

(۴) ادب المفرد امام بخاری صفحہ ۱۵۷ مصر و کتاب الاسماء والصفات امام بیہقی صفحہ ۱۸ مطبوعہ الہ آباد۔

ماہتاب وغیرہ کی عبدیت کے ساتھ رکھتے تھے مثلاً عبدالشمس، عبدمناف، ان ناموں سے سخت منع فرمایا ارشاد ہوا کہ بہترین نام عبداللہ اور عبدالرحمٰن ہیں (۱) اہلِ عجم اپنے سلاطین کو شاہنشاہ یعنی تمام بادشاہوں کا بادشاہ کہتے تھے چونکہ اس میں شرک کا احتمال تھا۔ آنحضرت نے فرمایا کہ یہ نام خدا کو سب سے زیادہ ناپسند ہے، (۲) دوسری روایت میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا اس شخص پر اللہ کا بے حد غضب ہوا جس نے اپنے کو شہنشاہ کہا، خدا کے سوا کوئی بادشاہ نہیں (حاکم فی المستدرک ص ۲۷۵ ج ۴)

غلاموں کو لوگ عبد یعنی بندہ کہتے تھے، حالانکہ انسان خدا کا بندہ ہے آدمیوں کا نہیں۔ اسی طرح غلام اپنے مالک کو رب کہتے تھے، حالانکہ رب خدا ہے اس بنا پر آنحضرت ﷺ نے قطعاً منع فرمایا کہ کوئی شخص غلاموں کو عبد یعنی بندہ نہ کہنے پائے، بلکہ یوں کہے کہ میرا بچہ یا بچی اور اسی طرح غلام اور باندیاں اپنے آقا کو رب نہ کہیں، مالک کہیں کہ تم سب غلام ہو اور رب اللہ ہے، (۳) ہانیؓ ایک صحابی تھے جن کی کنیت ابوالحکم تھی وہ جب خدمتِ اقدس میں اپنی قوم کے ساتھ آئے تو آپ نے فرمایا کہ حکم خدا کا ہے اور خدا ہی حکم دینے والا ہے تم کو لوگ ابوالحکم کیوں کہتے ہیں، عرض کی کہ میرے قبیلہ میں جب کوئی نزاع ہوتی ہے تو لوگ مجھ کو حکم یعنی ثالث بناتے ہیں اور میں جو فیصلہ کرتا ہوں اس کو سب تسلیم کر لیتے ہیں، آپ نے فرمایا، تمہارے بچوں کے کیا نام ہیں۔ بولے شریح، مسلم، عبداللہ آپ نے پوچھا، سب میں بڑا کون ہے، عرض کی، شریح، فرمایا تو تمہاری کنیت ابوشریح ہے۔ (۴)

اکثر لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ کوئی برا کام کرتے ہیں، تو شیطان پر لعنت بھیجتے ہیں، گویا اس نے برائی کرائی ایک دفعہ ایک صاحب آنحضرت ﷺ کے ساتھ گھوڑے پر سوار تھے، گھوڑے نے ٹھوکر کھائی انہوں کہا شیطان کا برا ہو۔ آپ نے فرمایا یوں نہ کہو ورنہ شیطان غرور سے پھول جائے گا اور کہے گا، میری قوت سے یہ ہوا، خدا کا نام لو تو شیطان دب کر مکھی کے برابر ہو جائے گا۔ (۵)

تصویر بنانے سے سخت منع کیا، اس کی یہی وجہ تھی کہ اول اول لوگ کسی بزرگ اور مقتدا کی تصویر گھر میں رکھتے تھے تو محبت یا یادگار کے طور پر رکھتے تھے لیکن رفتہ رفتہ ان ہی تصویروں کی پرستش ہونے لگتی تھی، چنانچہ ہندوؤں اور رومن کیتھلک عیسائیوں میں اسی طرح تصویر پرستی اور اس سے بڑھ کر بت پرستی کا رواج ہوا، اس بنا پر آنحضرت ﷺ نے سرے سے تصویر کھینچنے سے منع فرمایا۔

---

(۱) ابوداؤد کتاب الادب باب تغیر الاسماء۔

(۲) ابوداؤد کتاب الادب۔

(۳) ابوداؤد کتاب الادب باب الکریم وحفظ المنطق۔

(۴) ابوداؤد کتاب الادب باب تفسیر الاسم القبیح۔

(۵) ابوداؤد کتاب الادب باب لایقول خبثت نفسی۔

قبر پرستی اور یادگار پرستی سے روکنا

(۱۶) شرک کا بڑا ذریعہ قبر پرستی اور یادگار پرستی ہے' قبروں اور یادگاروں کو لوگ عبادت گاہ بنا لیتے ہیں' سالانہ مجمع کرتے ہیں' دور دور سے سفر کر کے آتے ہیں' قبروں پر مسجدیں بناتے ہیں' منتیں مانتے ہیں' نذریں چڑھاتے ہیں' آنحضرت ﷺ نے ان تمام افعال سے منع کیا ہے۔ وفات سے پانچ دن پہلے فرمایا کہ تم سے پہلے لوگ قبروں کو مسجد بنا لیتے تھے' دیکھو میں تم کو منع کرتا ہوں کہ قبروں کو مسجد نہ بنانا۔ عین وفات کے وقت چہرہ سے چادر الٹ دی اور فرمایا کہ خدا یہود و نصاریٰ پر لعنت کرے' ان لوگوں نے اپنے پیغمبروں کی قبروں کو مسجد بنا لیا۔ (۱)

ریا اور عدم اخلاص بھی معنوی شرک ہے

(۱۷) یہ توحید کے متعلق وہ اصلاحات تھیں جن کا تعلق زیادہ تر اعمال اور روزمرہ کی بول چال سے تھا' لیکن حقیقی اصلاح جس سے توحید کی تکمیل ہوتی ہے وہ قلب و روح کی توحید ہے' انسان کے تمام کاموں کا کوئی نہ کوئی نفسیاتی محرک ہوتا ہے' کوئی طلبِ شہرت کے لیے کام کرتا ہے کوئی دنیاوی معاوضہ کے لیے کرتا ہے کوئی نمائش اور دکھاوے کے لیے کرتا ہے' کوئی غیر کی محبت یا عداوت میں کرتا ہے ان تمام کاموں کا محرک درحقیقت غیرِ خدا ہے۔ جس نے خدا کی جگہ لے لی ہے' اسی لیے قرآن مجید نے کہا۔

﴿اَرَاَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ﴾ (فرقان:۴۳)

''تم نے ان کو دیکھا جس نے اپنا خدا خود اپنی نفسانی خواہش کو بنا لیا ہے۔''

اسی لیے بڑا بت وہی ہے جس کو انسان نے خود اپنے دل کے بت خانے میں چھپا رکھا ہے' اس بت کو توڑنا توحید کی اصل تکمیل ہے آپؐ نے بتایا کہ انسان کے تمام کاموں کا دار و مدار خود اس کے دل کے عمل پر ہے ﴿اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ﴾ اس لیے ایک مسلمان کے ہر قسم کے کاموں کا اصلی محرک صرف خدا کا حکم' خدا کا خوف' خدا کی اطاعت' خدا کی خوشنودی' خدا کی محبت' غرض صرف خدا ہونا چاہیے جس درجہ تک ایک مومن کی اس قلبی کیفیت میں ترقی ہوگی۔ اس کے ایمان و توحید کی تکمیل بھی پایۂ کمال کو پہنچتی جائے گی' اسی بنا پر وحی محمدی نے ہر جگہ اور ہر موقع پر انسان کو اس کے عمل کی غرض و غایت ﴿مَرْضَاتِ اللّٰهِ﴾ اللہ کی خوشنودی ﴿مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ﴾ خالص خدا کے لئے اور ﴿وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰی﴾ ذاتِ خدا کو قرار دینے کی تعلیم دی ہے اس بنا پر انسان جو کام خدا کے علاوہ کسی اور غرض و نیت سے کرے تو درحقیقت اس کام کے لیے اس نے ایک مؤقت خدا الگ بنایا۔ وہ گو اس وقت لفظی اور قانونی شرک کا مجرم نہیں لیکن معنوی و نفسی شرک کے ارتکاب کا یقیناً مجرم ہے۔ آپؐ نے فرمایا۔ جس نے خدا کے لیے دیا اور خدا ہی کے لیے روکیا' خدا کے لیے چاہا اور خدا ہی کے لیے عداوت کی اور خدا ہی کے لیے بیاہ

(۱) صحیح مسلم کتاب المساجد۔

کیا۔اس نے اپنے ایمان کو کامل کرلیا۔ (۱)

متعدد صحابیوںؓ سے روایت ہے (۲) کہ آپؐ نے فرمایا کہ ریا چھپا ہوا شرک ہے' حضرت ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ چھپا ہوا شرک یہ ہے کہ انسان کوئی کام دوسرے کی موجودگی کے سبب سے کرے۔ (۳) حضرت شدادؓ بن اوس روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا جس نے دکھاوے کی نماز پڑھی اس نے شرک کیا۔ جس نے دکھاوے کا روزہ رکھا اس نے شرک کیا' جس نے دکھاوے کی خیرات کی اس نے شرک کیا۔ (۴) یہی صحابیؓ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ صحابہؓ کے مجمع میں آپؐ فرما رہے تھے کہ مجھے اپنی امت کے لوگوں پر سب سے زیادہ جس کا خوف ہے وہ شرک کا ہے' ہاں میرا یہ مطلب نہیں کہ وہ چاند یا سورج کو سجدہ کریں گے یا بتوں کو پوجیں گے بلکہ یہ ہے کہ غیرِ خدا کے لیے عمل نہ کرنے لگیں اور چھپی نفسانی خواہش میں نہ مبتلا ہوں۔ (۵) حضرت محمود بن لبید انصاریؓ آپؐ کا قول نقل کرتے ہیں کہ آپ نے صحابہ سے فرمایا کہ مجھ کو سب سے زیادہ جس کا تم پر خوف ہے وہ شرکِ اصغر ہے' صحابہؓ نے عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ شرکِ اصغر کیا ہے' فرمایا قیامت کے دن جب لوگوں کو اپنے اپنے عمل کا بدلہ مل رہا ہوگا' خدا ریا کار لوگوں سے کہے گا کہ تمہارے لیے ہمارے یہاں کچھ نہیں تم ان ہی کے پاس جاؤ جن کے دکھانے کو دنیا میں یہ کام کیا کرتے تھے۔ (۶) حضرت ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں کہ ایک موقع پر ہم لوگ دجال کے متعلق آپس میں باتیں کر رہے تھے کہ اسی اثنا میں آنحضرت ﷺ تشریف لائے اور فرمایا کہ دجال سے بڑھ کر جو خوف ناک چیز میرے نزدیک ہے' کیا میں تم کو اس سے آگاہ نہ کروں' ہم سب نے عرض کی ہاں یا رسول اللہ (ﷺ)! فرمایا وہ شرکِ خفی ہے یعنی یہ کہ مثلاً کوئی شخص نماز پڑھ رہا ہے تو وہ نماز کو محض اس لیے درست کر کے پڑھے کہ کوئی دوسرا شخص اس کو دیکھ رہا ہے۔ (۷) ابوسعیدؓ بن ابی فضالہ انصاری بیان کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ قیامت میں جب خدا اگلوں اور پچھلوں کو یکجا کرے گا تو ایک منادی پکارے گا کہ جس نے اپنے کسی عمل میں خدا کے ساتھ کسی غیر کو بھی شریک بنالیا ہو تو وہ اپنا ثواب اسی غیر سے مانگے کہ خدا سا جھے

---

(۱) مستدرک حاکم ترمذی آخر کتاب الزہد' ترمذی کے دو نسخوں میں اس حدیث کے متعلق دو تنقیدیں درج ہیں۔ ایک میں منکر لکھا ہے اور دوسرے میں حسن اس کے ایک راوی احلج کی نسبت لوگوں نے کلام کیا ہے مگر حدیث کا نفسِ مضمون تمام اسلامی روایات اور احکام کے عین مطابق ہے۔

(۲) حضرت ابوسعید خدریؓ' معاذ بن جبل' ابوہریرہؓ' شداد بن اوس' محمودؓ بن لبید' ابوسعیدؓ بن ابی فضالہ' ان صحابیوں کی روایتیں ابن حنبل' ابن ماجہ' مستدرک وغیرہ میں ہیں۔

(۳) مستدرک حاکم کتاب الرقاق ص ۳۲۹ ج ۴ (صحیح)

(۴) بحوالہ سابق مستدرک ؛ ابن حنبل مسند شداد بن اوس ص ۱۲۶ ج ۴۔

(۵) سنن ابن ماجہ باب الریأ والسمعہ۔

(۶) ابن حنبل مسند محمود بن لبید انصاری ص ۴۲۸ ج ۵ و ابوداؤد مسند ابن حنبل۔

(۷) سنن ابن ماجہ باب الریأ والسمعہ۔

سے بے نیاز ہے' ابو ہریرہؓ کہتے ہیں (۱) کہ آپؐ نے ارشاد کیا کہ خدا فرماتا ہے کہ میں تمام شریکوں میں سب سے زیادہ شرکت سے بے نیاز ہوں تو جس نے اپنے کسی کام میں میرے ساتھ کسی اور کو شریک کر لیا تو میں اس سے الگ ہوں اور وہ اسی کا ہے جس کو اس نے میرا شریک بنایا۔

ان تعلیمات کا یہ اثر ہوا کہ صحابہؓ اپنے ہر عمل میں اس شرک خفی سے ڈرتے تھے' شدادؓ بن اوس کہتے ہیں (۲) کہ ہم لوگ آنحضرت ﷺ کے زمانۂ حیات میں ریا کو شرکِ اصغر گنا کرتے تھے۔ (۳) ایک دفعہ حضرت عمر فاروقؓ جا رہے تھے دیکھا کہ حضرت معاذؓ بن جبل صحابی آنحضرت ﷺ کی قبر مبارک کے پاس بیٹھے رو رہے ہیں' حضرت عمرؓ نے رونے کا سبب دریافت کیا تو انہوں نے قبر مبارک کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ اس قبر میں مدفون ہستی نے کہا تھا کہ ریا کا ادنیٰ شائبہ بھی شرک ہے۔ (۴) اسی طرح ایک دفعہ عبادہ تابعی نے دیکھا کہ حضرت شدادؓ بن اوس صحابی اپنی جانماز پر بیٹھے زار و قطار رو رہے ہیں' رونے کا سبب دریافت کیا تو انہوں نے بیان کیا کہ ایک دن میں نے رسول اللہ ﷺ کے چہرۂ اقدس پر غم و ملال کے آثار دیکھے' عرض کی کہ میرے ماں باپ حضور پر فدا ہوں۔ اس حزن و ملال کا سبب کیا ہے ارشاد ہوا کہ میں اپنے بعد بھی امت پر ایک چیز سے ڈرتا ہوں عرض کی یا رسول اللہ! وہ کیا ہے؟ فرمایا شرک اور چھپی نفسانی خواہش میں نے دوبارہ گزارش کی یا رسول اللہ! کیا آپؐ کی امت آپؐ کے بعد شرک میں مبتلا ہو گی' فرمایا اے شداد! میری امت یقیناً سورج یا چاند یا بت اور پتھر کی پرستش نہیں کرے گی لیکن وہ اپنے عمل کی نمائش اور ریا کرے گی۔ عرض کی یا رسول اللہ! کیا ریا شرک ہے۔ فرمایا ہاں (۵) ان واقعات اور تعلیمات کو پڑھ کر ہر شخص اندازہ لگا سکتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے کس طرح ہر پہلو سے شرک کی تردید اور توحید کی تکمیل فرمائی ہے' وہی عرب جو پہلے خدا کے سوا ہر چیز کی پرستش کرتے تھے۔ انہوں نے آپؐ کی تعلیم کے اثر سے خدا پرستی اور توحید کی انتہائی معراج حاصل کر لی۔

❀❀❀❀❀

---

(۱) سنن ابن ماجہ باب الریا و ترمذی و مسند ابن حنبل۔

(۲) ابن ماجہ باب الریا۔

(۳) مستدرک حاکم کتاب الرقاق ۴ ص ۳۲۹ (صحیح)

(۴) مستدرک حاکم کتاب الرقاق ج ۴ ص ۱۳۲۸ صحیح۔

(۵) مستدرک حوالۂ مذکور' حاکم نے اس حدیث کو صحیح الاسناد لکھا ہے مگر ذہبی نے تصریح کی ہے کہ اس کا ایک راوی عبدالواحد بن زید متروک ہے تاہم چونکہ حدیث کا نفسِ مضمون مسند ابن حنبل (ج ۴ ص ۱۲۶) اور سنن ابن ماجہ (باب الریا) میں ایسے سلسلوں سے مذکور ہے جس میں یہ عبدالواحد نہیں پڑتا اس لیے ہم نے اس حدیث کو یہاں درج کیا ہے۔

توحید اور اس کے ایجابی اصول وارکان

یہ تو توحید کے سلبی اجزا تھے، یعنی توحید کے مخالف عقائد وخیالات کی نفی اور تردید، لیکن نبوتِ محمدی کا کارنامہ اس سے اہم اور بالاتر ہے، اور وہ توحید کی اصل بنیاد کی استواری، اس کے اصول کی تعیین، امورِ ایمان کی تفصیل اور اس کے اجزا کی تکمیل ہے۔ عرب میں شرک وبت پرستی بھی تھی اور کہیں کہیں آسمانی مذاہب کی محرف صورتیں بھی موجود تھیں، مگر ایک صحیح مذہب کا تخیل ان کے سامنے مطلق نہ تھا۔ اس بنا پر عقائد اور ایمان کی کوئی صحیح اور مرتب صورت بھی ان کے ذہن میں نہیں ہوسکتی تھی۔ آنحضرت ﷺ نے ان تمام پچھلے خرافات اور اوہام کو جن کو دین کا درجہ دے دیا گیا تھا یک قلم محو کر دیا، بت پرستی، جن پرستی، فرشتہ پرستی، فطرت پرستی، انسان پرستی، غرض شرک کی تمام صورتیں قطعاً مٹا دیں اور ان کی جگہ مرتب، متعین، سنجیدہ حقائق اور سچائیوں سے معمور چند عقائد کی تعلیم دی جو انسان کے تمام اعمال اور اخلاق کا بنیادی پتھر ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی ہستی پر دلیل

اس سلسلہ میں سب سے پہلی چیز خدا کی ہستی کا یقین اور پھر اس کی توحید پر ایمان ہے، دنیا میں جتنے پیغمبر آئے ان میں سے ہر ایک نے اس قادرِ مطلق کی طرف لوگوں کو دعوت دی، مگر یہ دعوت ان کے ایک مسلم دعویٰ کی حیثیت سے تھی، انہوں نے اس دعویٰ کو دلائل کا محتاج نہ سمجھا اور حقیقت میں جن محدود زمانوں میں قوموں کے لیے ان کی بعثت ہوئی، ان میں دلیل اور برہان کی ضرورت بھی نہ تھی، کیونکہ ان زمانوں میں بت پرستی، ستارہ پرستی اور فطرت پرستی کا رواج نہ تھا، الحاد کا وجود نہ تھا، لیکن محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت عمومی تھی۔ جو آخری زمانہ تک کے لیے اور تمام قوموں کے لیے تھی اور علمِ الٰہی میں یہ تھا کہ بعثتِ محمدی کے بعد عقلِ انسانی تحقیق وتلاش کے آخری مراحل طے کرنا چاہے گی اور قدرت کے سربمہر خزانے وقفِ عام ہوں گے اور عقلیت کا دور دورہ ہوگا اور ہر شے دلیل وثبوت کی محتاج قرار پائے گی، اس لیے محمد رسول اللہ ﷺ کو دلائل وبراہین ثبوت اور شواہد کی بھی تلقین کی گئی۔

ایک اور سبب یہ ہے کہ انبیائے سابقین صرف اپنی قوموں کی دعوت پر مامور ہوئے تھے، جن میں مشرکین کا وجود تھا، ملحدین کا نہ تھا، لیکن خاتم الانبیاء ﷺ کی بعثت تمام طبقوں اور قوموں کے لیے ہوئی، اس لیے آپؐ کی دعوت میں یہ صاف نظر آتا ہے کہ آپؐ انسانی عقل کی ہر صنف کو مخاطب کر رہے ہیں اور اس کے معیار اور سطح کے مطابق اس قادرِ مطلق کی ہستی اور وجود پر دلیلیں بھی پیش کر رہے ہیں۔ اس لئے آپؐ نے دوسرے پیغمبروں کی

طرح صرف مشرکوں کو مخاطب نہیں فرمایا' بلکہ مشرکوں' کافروں' ملحدوں مشککوں' دہریوں' ہر ایک کو مخاطب فرمایا اور ان میں سے ہر ایک کی تسکین و تشفی کا سامان بہم پہنچایا۔

ایک قادرِ مطلق' خالقِ عالم اور صانع کی ہستی کے ثبوت اور انکار پر جب سے فلسفہ کا وجود ہے ہمیشہ بحثیں پیدا ہوئیں اور دلیلیں پیش کی جاتی رہی ہیں' مصر' یونان' ہندوستان' اسلامی ممالک اور آج یورپ میں بھی اس مسئلہ پر عقلائے زمانہ نے اپنی جودتِ ذہن' نکتہ رسی اور دقیقہ فہمی کا بہترین ثبوت پیش کیا ہے' مگر غور سے دیکھو تو معلوم ہوگا کہ دلائل کی زبان اور طرزِ تعبیر میں گو تبدیلی ہوتی رہی ہے' مگر اصل مغزِ سخن صرف ایک ہے۔ اس بنا پر وحیِ محمدی نے اللہ تعالیٰ کی ہستی اور وجود پر جو دلیل قائم کی اس میں اسی مغز کو لے لیا ہے اور نہایت مؤثر طرز ادا میں اس کو بار بار دہرایا اور انسانوں کو متنبہ کیا ہے۔

وحیِ محمدی کا سب سے پہلا دعویٰ یہ ہے کہ اس ایک قادرِ مطلق' خالقِ عالم اور صانعِ کائنات ہستی کا اعتراف انسانی فطرت میں داخل ہے' متمدن سے متمدن اور وحشی سے وحشی قوم میں بھی اس اعتراف کا سراغ ملتا ہے' آثارِ قدیمہ کی تحقیقات نے سینکڑوں مردہ اور گمنام قوموں کی تاریخ کا سراغ لگایا جس میں سامانِ تمدن' اعلیٰ خیالات اور علوم کی لاکھ کمی محسوس ہوتی ہو' مگر مذہبی عقیدت اور کسی خدا کے اعتراف کی کمی بالکل نظر نہیں آتی' ان کی عمارتوں کے منہدم کھنڈروں میں جو چیز سب سے پہلے ملتی ہے' وہ کسی معبد کی چہار دیواری ہوتی ہے' آج بھی دنیا کے مختلف گوشوں میں جو بالکل وحشی قومیں ملتی ہیں وہ بھی کسی نہ کسی شکل میں عالم کے خالق اور کائنات کے صانع کے تخیل سے بہرہ ور ہیں' غرض جماعتِ انسانی کا کوئی حصہ' زمین کا کوئی گوشہ' زمانہ کا کوئی عہد اس تخیل سے خالی نہیں ملتا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اعتراف بھی انسان کی فطری تصورات اور وجدانی جذبات میں داخل ہے اسی لیے وحیِ محمدی نے اس کو فطرت سے تعبیر کیا ہے۔

﴿فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ (الروم:۳۰)

''اپنا منہ سب طرف سے پھیر کر دین کی طرف کر' یہ خدا کی وہ فطرت ہے جس پر خدا نے لوگوں کو پیدا کیا خدا کی خلقت میں تبدیلی نہیں' یہی سیدھا اور ٹھیک دین ہے' لیکن اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔''

آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

﴿كُلُّ مَوْلُوْدٍ يُوْلَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ﴾

''ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔''

اسی لیے خدا کا اعتراف روزِ ازل کا وہ عہد و پیمان ہے جو خالق و مخلوق کے درمیان ہوا تھا' اور یہ اسی عہد و پیمان کا احساس ہے جو انسان کی رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے ہے کہ ہزار انکار کے بعد بھی کسی نہ کسی رنگ میں

وہ اعتراف نمایاں ہوجاتا ہے قرآن نے اس واقعہ کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے:(۱)

﴿وَاِذْ اَخَذَ رَبُّکَ مِنْ بَنِیْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُھُوْرِھِمْ ذُرِّیَّتَھُمْ وَ اَشْھَدَھُمْ عَلٰٓی اَنْفُسِھِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ قَالُوْا بَلٰی شَھِدْنَا﴾ (الاعراف:۱۷۲)

''اور جب تیرے خدا نے بنی آدم کی پیٹھ سے ان کی نسل کو لیا اور خود ان کو ان ہی پر گواہ کیا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں' انہوں نے کہا ہاں ہم گواہ ہیں۔''

انسان کا یہ جذبۂ فطرت کبھی کبھی خارجی اثرات سے دب جاتا ہے۔ وحی محمدی نے بار بار انسان کے اسی دبے ہوئے جذبہ کو ابھارا ہے اور اسی زیرِ خاکستر آگ کو ہوا دی ہے اور انسان کو اس کا بھولا ہوا وعدہ یاد دلایا ہے وہ انسانوں سے پوچھتی ہے:

﴿اَفِی اللّٰہِ شَکٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ﴾ (ابراہیم:۱۰)

''کیا آسمان وزمین کے پیدا کرنے والے خدا میں شک ہے۔''

ایک اور مقام پر اس نے کہا:

﴿اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَیْرِ شَیْءٍ اَمْ ھُمُ الْخَالِقُوْنَ○ اَمْ خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بَلْ لَّا یُوْقِنُوْنَ○﴾ (طور:۳۵'۳۶)

''کیا وہ آپ ہی آپ بن گئے یا وہی اپنے آپ خالق ہیں یا ان ہی نے آسمان اور زمین کو پیدا کیا ہے (یہ کوئی بات نہیں) بلکہ ان کو یقین نہیں ہے۔''

دنیا اور کائنات جس میں انسان بھی شامل ہے اور جو اپنی عقل اور فہم کی بنا پر سب سے بالاتر ہے بہر حال موجود ہے اور اس کے اس وجود میں کوئی شک بھی نہیں ہے' اب سوال یہ ہے کہ کسی کے بن بنائے وہ آپ سے آپ بن گئی ہے یا خود اس نے اپنے آپ کو بنالیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں صورتیں باطل ہیں۔ نہ آپ سے آپ کوئی چیز بن سکتی اور نہ کوئی مفعول اپنا فاعل آپ ہوسکتا ہے اگر کوئی بے وقوف یہ کہے کہ نر و مادہ مل کر اپنا بچہ پیدا کرتے ہیں تو اس سے پوچھا جائے گا کہ سلسلۂ توالد و تناسل کا آغاز کیونکر ہوا' اور اولیں نر و مادہ کا اور مادۂ تخلیق و روح کا خالق کون ہے۔

یہ گوناگوں عالم' یہ رنگارنگ کائنات' یہ تاروں بھرا آسمان' یہ بوقلموں زمین' یہ سورج' یہ چاند' یہ درخت' یہ سمندر' یہ پہاڑ' یہ لاکھوں جاندار اور بے جان اشیا' یہ علل و اسباب کا تسلسل' یہ تغیر و انقلاب کا نظام' یہ کائنات کا نظم اور اس کے ذرہ ذرہ کا قاعدہ و قانون' انسان کے اندرونی قویٰ اور ان کی باہمی ترتیب' موت و حیات کے اسرار' خواص و قویٰ کے رموز انسان کی خیالی بلند پروازی اور عملی عجز و درماندگی' یہ تمام باتیں ایک خالق و صانع کے اعتراف پر مجبور کرتی ہیں' یہ نیلگوں آسمان کی چھت' یہ زمین کا سبزہ زار فرش اور ایک ہی حرکت سے شب و روز کا انقلاب ایک خالق کل کا

(۱) صحیح بخاری کتاب الایمان۔

پتا دیتا ہے۔

﴿اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اخْتِلَافِ اللَّیْلِ وَ النَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ﴾ (آل عمران:۱۹۰)

''آسمانوں کی اور زمین کی پیدائش اور رات اور دن کے بدلنے میں عقل مندوں کے لیے نشانیاں ہیں۔''

یہ شب و روز کا نور و ظلمت یہ سورج اور یہ چاند کی روشنی' ان کی مقررہ رفتار' اور با قاعدہ طلوع و غروب اس کی دلیل ہے کہ اس ابلقِ ایام پر کوئی سوار ہے جس کے ہاتھ میں اس کا سیاہ و سپید ہے۔

﴿وَ مِنْ اٰیٰتِهِ الَّیْلُ وَ النَّهَارُ وَ الشَّمْسُ وَ الْقَمَرُ﴾ (حم السجدۃ:۳۷)

''اور اس کی نشانیوں میں سے رات' دن اور سورج اور چاند ہیں۔''

آسمان اور زمین کی پیدائش' دن اور رات کا الٹ پھیر تو ہے' دیکھو کہ خطرناک سمندروں میں کس طرح لوگ ایک ملک سے دوسرے ملک کو تجارت کا سامان لے کر دوڑتے پھرتے ہیں' اگر پانی میں مٹی کا اور لوہے کا ذرہ بھی ڈالو تو فوراً ڈوب جائے گا۔ مگر یہ لاکھوں من کے لدے ہوئے جہاز کیسے پھول کی طرح پانی پر تیر رہے ہیں جس فطری قاعدہ کے بموجب یہ عمل ظہور میں آ رہا ہے وہ جس کے حکم سے بنا ہے اس کا کتنا بڑا احسان ہے' پھر ان سمندروں سے بخارات اٹھتے ہیں وہ اوپر جا کر بادل بنتے ہیں اور وہ وہیں پہنچ کر برستے ہیں جہاں پیداوار اور زمین کی نشو و نما کی حاجت ہے اور پھر وہ بادل ہواؤں کے تخت پر بیٹھ کر کیسے ادھر ادھر ضرورت کے مطابق اڑتے پھرتے ہیں۔

﴿اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَ النَّهَارِ وَ الْفُلْكِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِیْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ وَّ تَصْرِیْفِ الرِّیَاحِ وَ السَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَیْنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ﴾ (البقرۃ:۱۶۴)

''بے شبہ آسمانوں کی اور زمین کی پیدائش اور دن رات کے الٹ پھیر میں اور ان جہازوں میں جو انسانوں کے لیے فائدہ رساں سامان لے کر سمندر میں چلتے ہیں اور آسمان سے اس کے پانی برسانے اور پھر اس پانی کے ذریعہ مرے پیچھے زمین کو زندگی بخشنے میں اور زمین میں ہر طرح کے چلنے والوں کے پھیلانے میں اور ہواؤں کے کبھی ادھر اور کبھی ادھر بدلنے میں اور آسمان و زمین کے بیچ میں جو بادل کام میں لگے ہیں ان سب میں سمجھ بوجھ والوں کے لیے بڑی نشانیاں ہیں۔''

آسمان اور زمین کی عجیب و غریب خلقت کے ساتھ خود انسان کی اپنی پیدائش کی حکایت کتنی عجیب ہے۔

﴿اِنَّ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ ۝ وَ فِیْ خَلْقِكُمْ وَ مَا یَبُثُّ مِنْ دَآبَّةٍ اٰیٰتٌ

لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ﴾ (الجاثیہ:۴)

''بے شک آسمانوں میں اور زمین میں ایمان والوں کے لیے نشانیاں ہیں اور خود تمہاری پیدائش میں اور جو چلنے والے پھیلائے ان میں یقین کرنے والوں کے لیے دلیلیں ہیں۔''

سورۂ انعام میں نباتات اور ان کی نیرنگیوں کو اپنی ہستی کی دلیل میں پیش کیا' یہ کتنے تعجب کی بات ہے کہ ایک ہی زمین ہے جس میں سے وہ اگتے ہیں ایک ہی پانی ہے جس سے وہ سینچے جاتے ہیں' ایک ہی ہوا ہے جس سے وہ سانس لیتے ہیں مگر کتنے رنگ برنگ کے پھل' پھول' میوے اور درخت لگتے ہیں جن میں سے ہر ایک کا رنگ' ہر ایک کا مزہ' ہر ایک کی پتی' ہر ایک کا قد وقامت' ہر ایک کے خواص اور فائدے' دوسرے سے بالکل الگ ہوتے ہیں۔

﴿وَهُوَالَّذِیْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجْنَا بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ شَیْءٍ فَاَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا نُّخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًا وَ مِنَ النَّخْلِ مِنْ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ دَانِیَةٌ وَ جَنّٰتٍ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّ الزَّیْتُوْنَ وَ الرُّمَّانَ مُشْتَبِهًا وَّ غَیْرَ مُتَشَابِهٍ اُنْظُرُوْٓا اِلٰی ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَ یَنْعِهٖ اِنَّ فِیْ ذٰلِكُمْ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ۝﴾ (الانعام:۹۹)

''اور وہی ہے جس نے آسمان سے پانی اتارا' پھر ہم نے اس سے اگنے والی ہر چیز نکالی' پھر اس سے سبز خوشے نکالے' جن سے ہم جڑے ہوئے دانے نکالتے ہیں اور کھجور کے گابھے میں سے لٹکتے گچھے اور انگور کے باغ اور زیتون اور انار ہم شکل اور جدا جدا شکل کے جب وہ پھلیں تو ان کے پھل اور پکنے کو دیکھو بے شک ان میں ایمان والے لوگوں کے لیے دلیلیں ہیں۔''

سورۂ روم میں پہلے مٹی سے انسان کی پیدائش کو پھر اس میں عورت مرد کے جوڑے ہونے کو اور ان کے درمیان مہر ومحبت کے جذبات کے ظہور کو اپنی ہستی کی دلیل بتایا' پھر اپنی قدرت کے دوسرے عجائبات کو جو آسمان سے زمین تک پھیلے ہیں' ایک ایک کر کے پیش کیا ہے' اول تو خود انسانوں کی پیدائش' پھر ان میں عورت مرد ہونا اور ان کے درمیان جذبات کی لہر' پھر مختلف قوموں کی بولیوں' شکلوں اور رنگوں کو دیکھو کہ ایک ایک سے الگ ہے' پھر انسانوں کے اندر کے اعمال کو دیکھو' ایک نیند ہی کی حقیقت پر غور کرو یہی تمہاری آنکھیں کھول دینے کے لیے کافی ہے۔

﴿وَ مِنْ اٰیٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ اِذَآ اَنْتُمْ بَشَرٌ تَنْتَشِرُوْنَ ۝ وَ مِنْ اٰیٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَیْهَا وَ جَعَلَ بَیْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّ رَحْمَةً اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ ۝ وَ مِنْ اٰیٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَ اَلْوَانِكُمْ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّلْعٰلِمِیْنَ ۝ وَ مِنْ اٰیٰتِهٖ مَنَامُكُمْ بِالَّیْلِ وَ النَّهَارِ وَابْتِغَآؤُكُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّسْمَعُوْنَ ۝ وَ مِنْ اٰیٰتِهٖ یُرِیْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّ طَمَعًا وَّ یُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَیُحْیٖ بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ

○ وَ مِنْ اٰیٰتِهٖۤ اَنْ تَقُوْمَ السَّمَآءُ وَ الْاَرْضُ بِاَمْرِهٖ﴾ (روم:۲۰'۲۵)

''اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تم کو مٹی سے بنایا پھر تم آدمی بن کر چلتے پھرتے ہو' اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہاری جنس سے تمہارے جوڑے بنائے کہ تم ان سے سکون حاصل کرو اور تم سب کے درمیان پیار اور مہر رکھا اور اس میں ان لوگوں کے لیے جو سوچتے ہیں دلیلیں ہیں اور اس کی نشانیوں میں سے آسمان وزمین کی بناوٹ ہے اور تمہاری بولیوں اور رنگوں کی بوقلمونی ہے' اس میں جاننے والوں کے لیے یقیناً دلیلیں ہیں اور اس کی عجیب قدرتوں میں سے تمہارا رات اور دن میں سونا اور تمہارا اس کی مہربانیوں کو تلاش کرنا ہے اس میں ان کے لیے جو سنتے ہیں دلیلیں ہیں اور اس کے عجائبِ قدرت میں سے یہ ہے کہ تمہیں وہ بجلی کی چمک دکھاتا ہے' جس سے تم ڈرتے ہو اور کبھی (رحمت کی بارش کی) امید رکھتے ہو اور وہ آسمان سے پانی برساتا ہے' پھر اس میں ان کے لیے جو سمجھ رکھتے ہیں دلیلیں ہیں اور اس کی دلیلوں میں سے ہے کہ آسمان اور زمین اس کے حکم سے قائم ہیں۔''

اس آخیر آیت میں آسمان اور زمین کے اس کے حکم سے قائم رہنے کا ذکر ہے' تم کہتے ہو کہ یہ باہمی جذب وکشش سے قائم ہیں' لیکن خود یہ جذب وکشش کس کی کشش کا نتیجہ ہے؟ یہ خود حیرت انگیز ہے' سورۂ لقمان میں آسمانوں کے بلا کسی نظر نہ آنے والے سہارے کے کھڑے ہونے اور زمین کے اپنی جگہ پر ٹھہرے ہونے کا ذکر ہے' یہ نظر نہ آنے والا سہارا قوتِ کشش ہی سہی لیکن وہ بھی تو اسی کے اسرار میں سے ہے' اس کے بعد ایک جاندار و بے حیات مردہ زمین کے اندر سے پانی برسنے کے ساتھ انواع واقسام کی زندگی کے نمونوں کا ابھر آنا کتنا حیرت انگیز ہے' یہ بھی اسی کا کرشمہ ہے:

﴿خَلَقَ السَّمٰوٰتِ بِغَیْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا وَ اَلْقٰی فِی الْاَرْضِ رَوَاسِیَ اَنْ تَمِیْدَ بِكُمْ وَ بَثَّ فِیْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ وَّ اَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَنْۢبَتْنَا فِیْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِیْمٍ﴾ (لقمان: ۱۰)

''اس نے آسمانوں کی چھت کو کسی ایسے ستونوں کے بغیر کھڑا کیا ہے جو تم کو نظر آتے ہوں اور زمین میں ایسے کھونٹے ڈال دیے کہ وہ تم کو لے کر ہل نہ جائے اور اس نے اس زمین پر ہر قسم کے چلنے پھرنے والے پھیلائے اور آسمان سے پانی برسایا پھر ہم نے اسی زمین میں ہر اچھے جوڑے پیدا کیے۔''

سورۂ سجدہ میں انسان کی پیدائش کا مٹی سے آغاز' پھر قطرۂ آب (نطفہ) سے ذریعہ توالد وتناسل' پھر اس کے سڈول جسم کا بن جانا' پھر اس مٹی کے مردہ قالب میں دفعۃً کہیں سے زندگی آجانا اور اس میں روح پھک جانا' اور اس میں علم وحواس کے حیرت انگیز آلات کا پیدا ہو جانا ان سب کو اپنی صفت میں پیش کیا ہے:

﴿اَلَّذِیْۤ اَحْسَنَ كُلَّ شَیْءٍ خَلَقَهٗ وَ بَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِیْنٍ ○ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِیْنٍ ○ ثُمَّ سَوّٰىهُ وَ نَفَخَ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ وَ جَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ وَ

الْاَفْئِدَةَ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ○﴾ (سجدہ:۷۔۹)

''وہ جس نے جو چیز بنائی خوب بنائی اور انسان کی پیدائش مٹی سے شروع کی پھر اس کی نسل ذلیل سے نچڑے پانی سے بنائی پھر اس کو سڈول کیا اور اس میں اپنی جان سے کچھ پھونک دیا اور تمہارے لیے کان اور آنکھیں اور دل بنا دیے' تم ان احسانوں کا بہت کم شکر ادا کرتے ہو۔''

مردہ زمین کے اندر کیا کیا قوتیں ودیعت ہیں اور خود انسانوں کے جسم و جان میں عجائبات کا کتنا خزانہ رکھا ہے' لیکن کوئی صاحبِ نظر ادھر نہیں دیکھتا' انسان کی زندگی' اس کے اندرونی جذبات' حواس' ذہنی قویٰ اور دماغی حرکات ان میں سے ہر شے معمہ ہے۔

﴿وَ فِی الْاَرْضِ اٰیٰتٌ لِّلْمُوْقِنِیْنَ ○ وَ فِیْٓ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ﴾ (ذاریات:۲۰'۲۱)

''اور زمین میں یقین کرنے والوں کے لیے نشانیاں ہیں اور خود تمہاری جانوں کے اندر' کیا تم نظر نہیں کرتے۔''

جانوروں کے جسموں کے اندر جو عجیب و غریب نظام ہے' وہ بھی غور کے قابل ہے' ایک ہی گھاس پھوس کی غذا ان کے پیٹ میں جاتی ہے' پھر اس کا کچھ حصہ لید اور گوبر' کچھ خون اور کچھ دودھ بن جاتا ہے' اور اسی لید اور گوبر کے باہر آنے کے راستوں اور سرخ خون کی رگوں کے درمیان سے خالص سپید' شیریں دودھ کی دھاروں کا نکلنا کتنا عجیب ہے۔

﴿وَ اِنَّ لَكُمْ فِی الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً نُسْقِیْكُمْ مِّمَّا فِیْ بُطُوْنِهٖ مِنْۢ بَیْنِ فَرْثٍ وَّدَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَآئِغًا لِّلشّٰرِبِیْنَ﴾ (نحل:۶۶)

''اور تمہارے لیے جانوروں میں عبرت ہے ہم تمہیں ان کے پیٹوں کے اندر سے لید اور خون کے بیچ سے خالص اور پینے والوں کے لیے خوشگوار دودھ پلاتے ہیں۔''

ایک ہی قسم کے پھل ہیں' اگر ان کو ایک طرح سے کھاؤ تو تمہاری عقل اور قوت کو بڑھاتے ہیں اور دوسری طرح کھاؤ تو اس کو ضائع کر دیتے ہو۔

﴿وَ مِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِیْلِ وَ الْاَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا وَّ رِزْقًا حَسَنًا اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ﴾ (نحل:۶۷)

''اور چھوہاروں اور انگوروں کے پھلوں کو دیکھو کہ ان میں سے تم نشہ اور اچھی روزی بھی حاصل کرتے ہو' اس میں سمجھ والوں کے لیے دلیل ہے۔''

زمین اور زمین پر کی مخلوقات کو چھوڑ کر اوپر آسمان کی طرف نظر اٹھاؤ' سورج کا روشن چراغ اور چاند کی خوش نما قندیل کتنی عجیب ہے' پھر سورج کو دیکھو کہ سال کے بارہ مہینوں میں آسمان کے بارہ برج طے کر کے کس طرح زمین میں مختلف موسموں اور زمانوں کو نمایاں کرتا ہے۔

﴿تَبٰرَکَ الَّذِیْ جَعَلَ فِی السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّ جَعَلَ فِیْهَا سِرَاجًا وَّ قَمَرًا مُّنِیْرًا﴾ (فرقان: ۶۱)

''بابرکت ہے وہ ہستی جس نے آسمانوں میں برج بنائے اور ان میں ایک چراغ اور چمکنے والا چاند بنایا۔''

ان ہی چند چیزوں تک اس کی قدرت کے عجائبات محدود نہیں بلکہ ہر شے اپنی خلقت اور اپنی محکم روش اور اپنے قانونِ فطرت سے اس کی گواہی دیتی ہے۔

﴿صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِیْٓ اَتْقَنَ کُلَّ شَیْءٍ﴾ (نمل:۷)

''اس اللہ کی صنعت ہے جس نے ہر شے کو مضبوط (نظام پر) بنایا۔''

اس کی صنعت ہر قسم کے عیب سے پاک ہے' اس میں مستحکم نظم ونسق کی بندش نظر آتی ہے۔

﴿مَا تَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرٰی مِنْ فُطُوْرٍ ○ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ کَرَّتَیْنِ یَنْقَلِبْ اِلَیْکَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِیْرٌ○﴾ (ملک:۳'۴)

''تجھے مہر والے خدا کی بناوٹ میں کوئی بے برابری نظر آتی ہے؟ پھر نگاہ کر' کیا کوئی فطور دکھائی پڑتا ہے' پھر دہرا کر دوبارہ نظر کر تیری نگاہ رد ہو کر تھک کر تجھ تک پلٹ آئے گی (مگر کوئی نقص نہ پا سکے گی)۔''

اس قسم کی اور سینکڑوں آیتیں ہیں' جن کا استقصا بھی مشکل ہے' ان آیتوں میں تین قسم کے دلائل ہیں:

(۱) قدرت کے عجائبات اور نیرنگیاں' اور پھر ان کا ایک قانون کے ماتحت ہونا۔

(۲) عالم کا نظم ونسق اور اس کا مرتب سلسلہ۔

(۳) کائنات اور سلسلۂ عالم کی ہر کڑی میں بے انتہا مصلحتوں' حکمتوں اور فائدوں کا ہونا۔

ان مقدمات سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ کائنات اور اس کے یہ عجائبات اور اس کے یہ منظم علل واسباب خود بخود بخت واتفاق سے نہیں بن گئے بلکہ کسی حکیم ودانا اور قادرِ مطلق صانع نے اپنی قدرت اور ارادہ سے ان کو بنایا ہے۔

اہلِ فلسفہ اور متکلمین عالم کے وجود پر عموماً یہ دلیل پیش کیا کرتے ہیں کہ ہم بداہتاً دیکھتے ہیں کہ عالم میں ہر چیز کے لیے اسباب کا سلسلہ ہے' یہ سلسلہ یا تو کہیں جا کر ختم ہوگا یا یوں ہی مسلسل چلا جائے گا۔ اگر یہ یونہی مسلسل چلا جائے گا تو لازم آتا ہے کہ ہر چیز کے پیدا ہونے پر غیر متناہی علل گزر جائیں اور غیر متناہی علل کا خاتمہ نہیں ہو سکتا اور نہ کہیں ان کا آغاز ہو سکتا ہے اس لیے کوئی چیز پیدا بھی نہیں ہو سکتی تسلسل عقلاً بھی محال ہے' بلکہ انسان اس کے تخیل سے بھی عاجز ہے' اس بنا پر لامحالہ سلسلۂ علل کا کہیں خاتمہ ہونا ضروری ہے جس علت کل پر تمام علتیں ختم ہو جاتی ہیں وہی خلق وپیدائش اور وجود وکون کی اصل علت العلل ہے۔

یہ دلیل گو بہت کچھ پیچیدہ اصلاحات سے لبریز اور بہت سے محذوف مقدمات پر مبنی ہے' تاہم وہ انسانی

عقل میں آئی ہے' اور بہتوں کے لیے تسکین کا باعث ہے' قرآن پاک کی ایک دو آیتوں میں بھی اس دلیل کا ماخذ مذکور ہے' سورۂ ہود کے آخر میں ہے:

﴿وَ لِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اِلَيْهِ يُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ فَاعْبُدْهُ وَ تَوَكَّلْ عَلَيْهِ﴾ (ہود:۱۲۳)

''اور خدا ہی کے پاس ہے آسمان اور زمین کی چھپی بات اور اسی کی طرف ہر بات لوٹائی جاتی ہے تو اس کو پوج اور اس پر بھروسہ کر''۔

﴿وَ اَنَّ اِلٰى رَبِّكَ الْمُنْتَهٰى﴾ (النجم:۴۲)

''اور یہ کہ تیرے رب کی طرف ہے سب کی انتہا۔''

آنحضرت ﷺ انسانی کمزوریوں سے واقف تھے' چند صحابیوں نے آ کر عرض کی یا رسول اللہ ﷺ کبھی کبھی ہمارے دلوں میں ایسے خیالات اور وسوسے آتے ہیں جن کو ہم زبان سے ادا نہیں کر سکتے' فرمایا' کیا تم کو یہ کیفیت حاصل ہوگئی؟ گزارش کی ہاں یا رسول اللہ! فرمایا یہ تو خالص ایمان ہے' مقصود ہے دل میں وسوسوں کا آنا اور پھر ان وسوسوں کو اتنا بدتر جاننا کہ ان کا زبان پر لانا بھی وہ گناہ سمجھے' یہ کیفیت ایمان کے بغیر ممکن نہیں' اسی طرح آپ نے فرمایا لوگ علم و دانش کا سوال کرتے ہیں' کہتے ہیں کہ خیر اس کو تو خدا نے پیدا کیا اور پھر اس خدا کو کس نے پیدا کیا' آسمان کو خدا نے بنایا زمین کو خدا نے بنایا' یہاں تک کہ بڑھتے بڑھتے پھر پوچھتے ہیں' اچھا تو پھر خدا کو کس نے پیدا کیا؟ فرمایا یہ شیطانی وسوسہ ہے' جب یہ حالت کسی کو پیش آئے تو کہہ دے ﴿اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ﴾ میں اللہ پر ایمان لایا۔ (۱)

یہ تعلیم درحقیقت اسی مسئلہ کی ہے کہ خدا پر تمام علتوں کی انتہا ہے اور اس کے بعد کوئی علت نہیں اس لیے یہ وسوسہ لائقِ جواب نہیں' یہ جہالت اور نادانی کا سوال ہے۔

توحید پر عقلی دلیلیں

اگر کوئی عالم کا خالق و صانع ہے تو وہ یقیناً ایک ہے دو نہیں تاہم دنیا میں ایسے عقل مند بھی ہیں' جو دو تین بلکہ متعدد خداؤں کے قائل ہیں' اور عالم کی ایک مملکت کو سینکڑوں حصوں میں تقسیم کر کے ان کو مختلف خداؤں کی حکومتیں قرار دیتے ہیں' وحیِ محمدی نے اس شرک کے ابطال پر سب سے زیادہ جس دلیل کو پیش کیا ہے وہ نظامِ عالم کی یکسانی اور وحدت اور کائنات کے علل و اسباب کا باہم توافق' تعاون' اشتراک اور اتحاد ہے' دنیا میں ایک ذرہ بھی اس وقت تک پیدا ہو نہیں سکتا جب تک آسمان سے لے کر زمین تک کی تمام کارکن قوتیں اور اسباب ایک دوسرے کے موافق و مناسب نہ ہوں اور باہم ان میں اشتراکِ عمل نہ ہو' ایک دانہ زمین سے اس وقت تک اگ نہیں سکتا' جب

(۱) یہ دونوں حدیثیں صحیح مسلم کتاب الایمان میں متعدد روایتوں میں سے مذکور ہیں۔

تک دانہ اگنے کے لائق نہ ہو' زمین میں اگانے کی صلاحیت نہ ہو' موسم اس کے مناسب نہ ہو' بارش موافق نہ ہو' آفتاب سے اس کو گرمی اور روشنی اس کے مزاج کے مطابق بہم نہ پہنچے' پھر اس کے اگنے کے موانع اور عوائق ایک ایک کر کے دفع نہ ہوں' ان سب مراحل کے بعد وہ دانہ اگے گا اور پھل لائے گا' قرآن پاک نے اسی حقیقت کو ان الفاظ میں ادا کیا ہے:

﴿لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ﴾ (انبیاء: ۲۲)

''اگر زمین و آسمان میں اس ایک خدائے برحق کے سوا اور خدا بھی ہوتے تو زمین و آسمان برباد ہو جاتے' تو پاک ہے عرش والا خدا ان باتوں سے جو یہ مشرک کرتے ہیں۔''

آسمان و زمین کا یہ تمام کاروبار' یہ تمام قوانینِ قدرت' اگر ایک کے بجائے دو طاقتوں کے ہاتھوں میں ہوتے تو یہ باہمی تصادم میں ایک لمحہ کے لیے بھی قائم نہ رہتے' فلسفیانہ اصطلاحات میں اس مطلب کو ادا کرو' تو یوں ہوگا کہ عالمِ کائنات معلول ہے' اس کی کوئی علتِ تامہ ہوگی' یہ ظاہر ہے ایک معلول کی دو علت تامہ نہیں ہو سکتیں' کیونکہ علت تامہ اس کو کہتے ہیں جس کے وجود کے بعد معلول کے وجود میں کسی اور چیز کا انتظار نہ ہو۔ اب عالم کی علت تامہ ایک نہ ہو بلکہ دو ہوں تو سوال یہ ہے کہ ایک علتِ تامہ کے وجود کے بعد عالم کے وجود میں دوسری علت تامہ کا انتظار رہے گا یا نہیں اگر رہے گا تو پہلی شے علتِ تامہ نہیں رہے گی اور اگر انتظار نہ رہے گا تو دوسری شے علت تامہ نہ ہوگی' اس سے ثابت ہوا کہ عالم کی علتِ تامہ ایک ہی ہو سکتی ہے۔

توحید کے ثبوت اور شرک کے ابطال کی دوسری دلیل نظامِ عالم کی وحدت ہے' سورج' چاند اور تاروں سے لے کر انسان' حیوان' ہوا' پانی' درخت' گھاس پات کو دیکھو تو معلوم ہوگا سب ایک مقرر نظام اور بندھے اصول کے ماتحت ہیں جن میں کبھی سرِ مو فرق نہیں ہوتا' ہر شے ایک اصول کی پابند' اور ایک عادتِ جاریہ کے مطابق چل رہی ہے' گویا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان سب میں یکسانی اور مساوات کی ایک خاص وحدت قائم ہے اور سب کسی ایک ہستی کے اشارے پر چل رہے ہیں۔:

﴿وَ مَا كَانَ مَعَهٗ مِنْ اِلٰهٍ اِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ اِلٰهٍۢ بِمَا خَلَقَ وَ لَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ﴾ (المؤمنون:۹۱)

''اور نہ اس خدائے برحق کے ساتھ کوئی اور خدا ہے اگر ایسا ہوتا تو ہر خدا اپنی مخلوق کو الگ لے جاتا اور ایک دوسرے پر چڑھ جاتا۔''

﴿قُلْ لَّوْ كَانَ مَعَهٗٓ اٰلِهَةٌ كَمَا يَقُوْلُوْنَ اِذًا لَّابْتَغَوْا اِلٰى ذِى الْعَرْشِ سَبِيْلًا ○ سُبْحٰنَهٗ وَ تَعٰلٰى عَمَّا يَقُوْلُوْنَ عُلُوًّا كَبِيْرًا ○ تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَ الْاَرْضُ وَ مَنْ فِيْهِنَّ وَ اِنْ مِّنْ شَىْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ﴾ (بنی اسرائیل:۴۲'۴۴)

''کہہ اگر خدائے برحق کے ساتھ کچھ اور خدا ہوتے جیسا کہ یہ (مشرکین) کہتے ہیں تو ایسی حالت میں وہ تخت والے (حکمران) خدا سے حکومت چھیننے کا راستہ ڈھونڈھتے' پاک اور بلند ہے وہ (خدا) اس بات سے جس کو یہ (مشرک) کہتے ہیں' اس (خدائے) برحق کی پاکی ساتوں آسمان اور زمین اور جو ان کے اندر ہے' بیان کرتے ہیں اور کوئی چیز ایسی نہیں جو اس کی پاکی کی گواہی نہ دیتی ہو۔''

اسی وحدتِ نظام کے استدلال کو ایک اور آیت میں خدا نے بیان فرمایا ہے:

﴿مَا تَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرٰی مِنْ فُطُوْرٍ ○ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ اِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِيْرٌ﴾ (ملک ۳'۴)

''تو خدا کے بنائے میں کوئی فرق نہیں دیکھتا' پھر نگاہ کر' کیا کوئی فطور تجھ کو دکھائی دیتا ہے؟ پھر دوبارہ نظر دوڑا' تیری نظر رد ہو کر تھک کر واپس جائے گی۔''

اس واقعاتی استدلال سے بڑھ کر جو بالکل نظمِ فطرت پر مبنی ہے کوئی دوسری صحیح دلیل نہیں ہو سکتی' اسی لیے قرآن پاک نے اس کو اختیار کیا ہے' یہ دنیا وحدتِ نظام ہی کے ماتحت چل رہی ہے' ورنہ وہ ایک لمحہ کے لیے بھی چل نہ سکے' اسی سے اس دنیا کے حاکم و فرمان روائے مطلق کی وحدت بخوبی ثابت ہے۔

توحید کی تکمیل

توحید خواہ کسی قدر محرف' شرک آمیز اور ناقص شکل میں ہو' دنیا کے تمام مذاہب و ادیان کی مشترک اور اولین تعلیم ہے لیکن ان مذاہب میں وہ کسی خاص اصول پر مبنی نہ تھی' محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم نے اس عمارت کو چند خاص اصول کے بنیادی پتھروں پر قائم کیا۔ یہ پتھر کیا ہیں؟ خدا کی حقیقی عظمت کی شناخت اور اس عالمِ کائنات میں انسان کی اصلی حیثیت اور مرتبہ کی تعیین۔

خدا کی حقیقی عظمت

اہلِ عرب ایک حقیقی قوت کے نام سے واقف تھے اور اس کو خالق بھی مانتے تھے' مگر قدرت کے کارخانہ کا اس کو تنہا مالک نہیں سمجھے تھے' یہود یوں کا خدا' ایک خاندانی خدا تھا' جس نے ساری دنیا صرف بنی اسرائیل کے لیے پیدا کی تھی' اور اس کو بنا کر ساتویں دن وہ تھک کر بیٹھ گیا تھا' وہ انسانوں سے کشتی لڑتا تھا' اس کی اولادیں تھیں' عیسائیوں کا خدا سب کچھ مسیح بن مریم کو دے کر خود معطل ہو گیا تھا' ایرانیوں کے خدا کی خدائی نیکی و بدی کی دو مملکتوں میں بٹی ہوئی تھی' ہندوؤں کا خدا اوتاروں کا بھیس بدل کر لاکھوں خدا بن گیا تھا اور برہما مہیش اور بشن تینوں نے مل کر خدائی کے کاروبار باہم تقسیم کر لیے تھے۔ لیکن محمد رسول اللہ ﷺ نے اس خدا کا جلوہ نمایاں کیا جو آسمان کے اوپر سے لے کر زمین کے نیچے تک کا تنہا مالک ہے' اس کے کاروبار میں کوئی دوسرا شریک نہیں' اس کی شاہنشاہی میں کسی دوسرے کا حصہ نہیں' اس کے کارخانۂ قدرت میں کوئی دوسرا ساجھی نہیں' کائنات کا کوئی ذرہ اس کے حکم سے باہر

نہیں، دنیا کی کوئی چیز اس کی نگاہوں سے چھپی نہیں، شجر، حجر، جنگل، پہاڑ، صحرا، دریا، سورج چاند، زمین آسمان، انسان حیوان، زبان والے اور بے زبان سب اس کے آگے سربسجود اور اس کی تسبیح وتہلیل میں مصروف ہیں، سب کمزور ہیں وہی ایک قوت والا ہے، سب جاہل ہیں، اسی ایک کو علم ہے، سب فانی ہیں، اسی ایک کو بقا ہے، سب محتاج ہیں وہی ایک بے نیاز ہے، سب اس کے بندے ہیں وہی ایک شہنشاہ ہے، غرض عرش سے فرش تک جو کچھ ہے وہ اس کا ہے اور اس پر صرف اسی کی حکمرانی ہے وہ ہر عیب سے پاک، ہر برائی سے منزہ اور ہر الزام سے بری ہے، وہ ہر قسم کے صفاتِ عالیہ، اوصافِ کمالیہ اور محامدِ جمیلہ سے متصف ہے اس کے مانند کوئی نہیں، اس کی شبیہ ومثال کوئی نہیں، وہ تشبیہ وتمثیل سے بالاتر اور انسانی رشتے ناتے سے پاک ہے۔

﴿ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ﴾ (زمر:٦)

''وہ ہے اللہ تمہارا رب اس کی بادشاہی ہے اس کے سوا اور کوئی خدا نہیں ہے۔''

﴿لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ﴾ (زمر:۴۴)

''آسمانوں کی اور زمین کی بادشاہی اس کی ہے۔''

﴿فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ﴾ (فاطر:۱۴)

''آسمانوں کا اور زمین کا پیدا کرنے والا۔''

﴿عَالِمُ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ﴾ (انعام:۷۳)

''چھپی اور کھلی کا جاننے والا۔''

﴿كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ لَهُ الْحُكْمُ﴾ (قصص:۸۸)

''اس کی ذات کے سوا ہر چیز فانی ہے، اسی کے ہاتھ میں فیصلہ کی طاقت ہے۔''

﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ وَّ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ﴾ (شوریٰ:۱۱)

''اس کے مانند کوئی چیز نہیں اور وہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔''

﴿هُوَ الْحَيُّ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ﴾ (مؤمن:٦۵)

''وہی زندہ ہے اس کے سوا کوئی خدا نہیں۔''

﴿وَ عِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ وَ يَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ وَ مَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا وَ لَا حَبَّةٍ فِيْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ﴾ (انعام:۵۹)

''غیب کی کنجیاں اسی کے پاس ہیں اس کے سوا ان کو کوئی نہیں جانتا، خشکی اور تری میں جو کچھ ہے وہ اس کو جانتا ہے درخت کا کوئی پتہ نہیں گرتا اور نہ زمین کی تاریکیوں میں دانہ ہے لیکن وہ اس کے علم میں ہے۔''

﴿اَللّٰهُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَ تَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ وَ تُعِزُّ

مَنْ تَشَآءُ وَ تُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِيْرٌ﴾ (آل عمران: ۲۶)

''اے اللہ! اے بادشاہی کے مالک' تو جس کو چاہے سلطنت دے اور جس سے چاہے چھین لے اور جس کو چاہے عزت دے اور جسے چاہے ذلت نصیب کرے' تیرے ہاتھ میں بھلائی ہے بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے۔''

﴿وَ اِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗۤ اِلَّا هُوَ وَ اِنْ يُّرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ يُصِيْبُ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ﴾ (یونس:۱۰۷)

''اور اگر اللہ تجھے مصیبت پہنچائے تو اس کے سوا کوئی اس کا دور کرنے والا نہیں اور اگر وہ تیرے ساتھ بھلائی کرے تو اس کے فضل و کرم کا کوئی روکنے والا نہیں اپنے بندوں میں سے جس کو چاہے اپنے فضل و کرم سے ممتاز کرے' اور وہی گناہ کو معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔''

﴿اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَیُّ الْقَيُّوْمُ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّ لَا نَوْمٌ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ مَنْ ذَا الَّذِیْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَ مَا خَلْفَهُمْ وَ لَا يُحِيْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖۤ اِلَّا بِمَا شَآءَ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ لَا يَئُوْدُهٗ حِفْظُهُمَا وَ هُوَ الْعَلِیُّ الْعَظِيْمُ﴾ (بقرہ:۲۵۵)

''اللہ اس کے سوا کسی اور کی بندگی نہیں' وہی جیتا ہے اور سب اس کے سہارے جیتے ہیں' اس کو نہ اونگھ آتی ہے نہ نیند' آسمان اور زمین میں جو کچھ ہے اسی کا ہے' کون ایسا ہے جو اس کے سامنے اس کی اجازت کے بغیر سفارش کر سکے' جو لوگوں کے روبرو ہے اور جو ان کے پیچھے ہے' سب کو جانتا ہے اور وہ اس کے علم کے حصہ کا احاطہ نہیں کر سکتے مگر جتنا وہ چاہے اس کا تخت آسمانوں کو اور زمین کو سمائے ہے ان آسمانوں کی اور زمین کی نگرانی اس کو تھکاتی نہیں اور وہی اوپر اور بڑا ہے۔''

﴿يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِی الْاَرْضِ وَ مَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَ مَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَ مَا يَعْرُجُ فِيْهَا وَ هُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ۝﴾ (الحدید۴:۔۵)

''جو زمین میں گھستا اور جو اس سے نکلتا ہے جو آسمان سے اترتا اور اس میں چڑھتا ہے' وہ سب کو جانتا ہے اور تم جہاں بھی ہو وہ تمہارے ساتھ ہے اور تم جو کچھ کرو اللہ اس کو دیکھتا ہے اور آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اسی کی ہے اور تمام کاموں کا مرجع وہی ہے۔''

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ (فاتحہ:۱)

''سب تعریف اللہ کے لیے ہے جو تمام عالم کا پالنے والا ہے''۔

﴿وَ هُوَ الْغَفُوْرُ الْوَدُوْدُ ○ ذُوالْعَرْشِ الْمَجِيْدُ ○ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ○ ﴾ (البروج ۱۴:۱۶)

''وہی گناہوں کا بخشنے والا ہے' بندوں سے محبت کرنے والا ہے۔ تخت کا مالک ہے بڑی شان والا ہے' جو چاہتا ہے کر دیتا ہے۔''

﴿وَ لَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ﴾ (آل عمران:۸۳)

اور آسمانوں میں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اس کے زیر فرمان ہے۔''

﴿يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ﴾ (جمعہ:۴۴)

''آسمان میں اور زمین میں جو ہے سب اللہ کی پاکی بیان کرتے ہیں۔''

﴿وَ اِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ﴾ (بنی اسرائیل:۴۴)

''اور کوئی چیز نہیں جو اس کی حمد کی تسبیح نہ پڑھتی ہو۔''

ان معنوں کی ہزاروں آیتیں قرآن پاک میں ہیں' ان تعلیمات نے خدا کی عظمت وجلالت اور کبریائی کا وہ جلوہ پیش کیا۔ جس کے سامنے معبودانِ باطل کی عزت خاک میں مل گئی' بتوں کی بڑائی کا طلسم ٹوٹ گیا' سورج' چاند' تاروں کی خدائی کا چراغ ہمیشہ کے لیے بجھ گیا جن وانس' شجر وحجر' بحر وبر سب اس کے جلال وجبروت کے سامنے سر بسجود نظر آئے۔ پھر اس کے سوا کون تھا جو نیرنگِ وجود کے ساز سے ﴿اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ﴾ ''میں ہوں خدا جس کے سوا کوئی دوسرا خدا نہیں'' کی صدا بلند کر سکتا۔

انسان کا مرتبہ

توحیدِ محمدی کا دوسرا بنیادی اصول اس عالمِ خلق میں انسان کی حیثیت اور درجہ ہے جو لوگ بتوں کو سجدہ کرتے ہیں' پتھروں کو پوجتے ہیں' درختوں کے آگے جھکتے ہیں' جانوروں کو دیوتا مانتے ہیں' جنات اور ارواحِ خبیثہ کے نام کی دہائی پکارتے ہیں' انسانی مخلوقات کو ارباب جانتے ہیں انسانوں کو خدا سمجھتے ہیں' وہ حقیقت میں انسان کے درجہ اور مرتبہ سے ناواقف ہیں' وہ دراصل اس طرح انسان کو پتھروں سے' درختوں سے' جانوروں سے' دریاؤں سے' پہاڑوں سے اور چاند تاروں سے کمتر جانتے ہیں' انہوں نے درحقیقت انسان کے اصلی رتبہ اور حیثیت کو نہیں پہچانا' آنحضرت ﷺ نے اپنی وحی کی زبان سے جاہل عربوں کو یہ نکتہ سوجھایا کہ انسان اس عالمِ خلق میں تمام مخلوقات سے اشرف ہے اور وہ اس دنیا میں خدا کی نیابت کا فرض انجام دینے آیا ہے' قرآن کے ابتدائی سورۂ میں آدمؑ کی خلافت کا قصہ محض داستان نہیں بلکہ انسان کی اصلی حیثیت کو عیاں اور نمایاں کرنے والی تعلیم کا اولین دیباچہ ہے اس کو فرشتوں کا مسجود بنانا گویا تمام کائنات کا مسجود بنانا تھا' اس کو تمام اسما کا علم عطا کرنا گویا تمام اشیاء کو اس کے تصرف میں دینا تھا وہ ﴿اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً﴾ کے فرمان کے رو سے اس عالم میں خدا کا نائب ہے اور اس کا سر خلافتِ الٰہی کے تاج سے ممتاز ہے' کروڑوں مخلوقاتِ الٰہی میں خدا کی امانت کا حامل وہ منتخب ہوا' یہ منصبِ اعلیٰ نہ

فرشتوں کو ملا' نہ آسمان کو عطا ہوا' نہ زمین کے حصہ میں آیا' نہ پہاڑ اس کے مستحق قرار پائے' صرف انسان ہی کا سہ تھا جو اس امانت کا خزینہ دار ہوا اور اسی کی گردن تھی جو اس بوجھ کے قابل نظر آئی فرمایا:

﴿اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ الْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَ اَشْفَقْنَ مِنْهَا وَ حَمَلَهَا الْاِنْسَانُ﴾ (احزاب:۷۲)

''ہم نے اپنی امانت آسمانوں پر اور زمین پر اور پہاڑوں پر پیش کی تو سب نے اس بار (امانت) کو اٹھانے سے انکار کیا اور اس سے ڈرے اور انسان نے اس کو اٹھالیا۔''

وحیِ محمدی نے انسان کا رتبہ یہ بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو بزرگیوں سے سرفراز فرمایا۔ عالمِ مخلوقات میں بر بنایا اور انعام واکرام سے معزز کیا ہے۔

﴿وَ لَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَ حَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ وَ رَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَ فَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا﴾ (بنی اسرائیل:۷۰)

''ہم نے آدم کی اولاد کو عزت دی اور ہم نے خشکی اور تری میں ان کو سواری دی اور ستھری چیزوں کی ان کو روزی بخشی اور اپنی بہت سی پیدا کی ہوئی چیزوں پر ان کو فضیلت عطا کی۔''

انسان ہی وہ مخلوق ہے' جو سب سے معتدل' قوی اور بہترین اندازہ کے ساتھ دنیا میں پیدا ہوئی۔

﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ﴾ (التین:۴)

''البتہ ہم نے انسان کو بہتر اندازہ پر پیدا کیا۔''

یہاں تک کہ انسان خدائی صورت کا عکس قرار پایا' متعدد حدیثوں میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ خدا نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا۔ (۱) اسی بنا پر آپؐ نے تعلیم دی کہ غلام کو سزا دو تو اس کے چہرہ پر نہ مارو کہ وہ صورتِ الٰہی کا عکس ہے عین میدانِ جنگ میں اگر تلواریں برس رہی ہوں تو حریف کے چہرہ پر وار نہ کرنا چاہیے۔ (۲) کہ خدا نے آدم کو اپنی صورت پر بنایا ہے (۳) غصہ میں بھی نہ کہنا چاہیے کہ خدا تیرے چہرہ کو اور تیرے جیسے چہرہ کو بگاڑ دے کہ خدا نے آدم کو اپنی صورت پر خلق کیا (۴) ان حدیثوں کا مطلب یہ نہیں کہ انسان کی طرح خدا کی کوئی جسمانی شکل ہے اور آدم کی شکل اس کی نقل ہے ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ﴾ بلکہ یہ مطلب ہے کہ انسان

(۱) صحیح بخاری کتاب الاستیذان' ابن ابی عاصم فی السنہ والطبرانی من حدیث وابن عمر باسناد رجالہ ثقات وادب المفرد بخاری واحمد عن ابی ہریرہ وصحیح مسلم کتاب البر' نیز توراۃ میں بھی یہ فقرہ ان الفاظ میں ہے' جس دن خدا نے آدم کو پیدا کیا خدا کی صورت پر اسے بنایا۔ پیدائش ۵۔۲)

(۲) صحیح بخاری کتاب العتق وصحیح مسلم کتاب البر والصلہ۔

(۳) صحیح مسلم کتاب البر آخری ٹکڑا صرف مسلم میں ہے۔

(۴) ادب المفرد امام بخاری باب لاتقل قبح اللہ وجہہ۔

ں خدا کی صفاتِ کاملہ کی ایک دھندلی سی جھلک موجود ہے علمِ قدرت' حیات' سمع' بصر' ارادہ' غضب' رحم' سخا وغیرہ صفات کی ناقص مثالیں اس کے اندر اللہ نے ودیعت رکھی ہیں' اور چونکہ انسان کے تمام اعضا میں اس کا چہرہ ہی اس کی شخصیت کا آئینہ دار اور اس کے اکثر حواس کا مصدر ہے' جن سے اس کے تمام اوصاف کا ظہور ہوتا' ہے اس لیے آنحضرت ﷺ نے انسان کے اعضا میں اسی کو فیضِ رحمانی کا مورد ظاہر کیا۔ (۱) اب غور کرو کہ وہ چہرہ جس کو خدا سے ایسی نسبت ہے کیا اس لائق ہے کہ غیر خدا کے آگے زمین پر رکھا جائے۔

انسان تو کائنات میں خلیفہ اللہ بن کر آیا ہے۔

﴿وَ هُوَ الَّذِیْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ﴾ (انعام:۱۶۵)

''اور اسی نے تم کو زمین کا نائب بنایا۔''

تو اب وہ عالمِ کائنات میں خدا کے سوا کس کو سجدہ کرے۔

روئے زمین کی تمام چیزیں اس کی خاطر بنیں' وہ روئے زمین کی چیزوں کی خاطر نہیں بنا ہے۔

﴿خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا﴾ (بقرہ:۲۹)

''جو کچھ زمین میں ہے خدا نے (اے انسانو) تمہارے لیے بنایا۔''

﴿اِنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ﴾ (حج:۹)

''زمین میں جو کچھ ہے خدا نے اس کو تمہارے بس میں دے دیا ہے۔''

تو اب وہ روئے زمین کی کس ہستی کے سامنے سر جھکائے۔

مشرک' بت پرست' ستارہ پرست' فطرت پرست' حقیقت میں غیروں کے آگے جھک کر یہ ثبوت دیتے ہیں کہ یہ ان کے لیے نہیں بلکہ وہ ان کے لیے بنے ہیں' جو چاند اور سورج کو پوجتے ہیں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ چاند اور سورج ان کے لیے نہیں' بلکہ وہ چاند اور سورج کے لیے بنے ہیں' محمد رسول اللہ ﷺ نے اپنی وحی اور تعلیم کے ذریعہ سے یہ بتایا کہ کائنات کی ہر چیز انسان کے لیے بنی ہے اور انسان خدا کے لیے بنا ہے' اس لیے جب کائنات کا ہر ذرہ انسان کی خدمت گزاری میں مصروف ہے تو انسان کو بھی خدا ہی کی خدمت گزاری میں مصروف رہنا چاہیے۔

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک درکارند
تا تونا نے بکف آری و بغفلت نہ خوری

انسانوں نے آسمانی مخلوقات کو اپنا معبود بنایا' تو وحیِ محمدی نے ان سے کہا:

﴿وَ سَخَّرَ لَكُمُ الَّیْلَ وَ النَّهَارَ وَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ وَ النُّجُوْمُ مُسَخَّرٰتٌۢ بِاَمْرِهٖ﴾ (نحل:۱۲)

''اور خدا نے رات دن اور چاند اور سورج کو تمہارے لیے کام میں لگایا اور ستارے اس کے حکم سے کام

(۱) اس حدیث کی شرح میں فتح الباری شرح بخاری میں یہ قول نقل کیا گیا ہے۔

میں لگے ہیں۔''

انسانوں نے جانوروں کو پوجا تو پیغامِ محمدی نے ان انجانوں کو بتایا کہ یہ تمہارے ہیں تم ان کے نہیں ہو۔

﴿وَ الْاَنْعَامَ خَلَقَهَا لَكُمْ فِيْهَا دِفْءٌ وَّ مَنَافِعُ﴾ (نحل:۵)

''اور جانوروں کو اس نے پیدا کیا تمہارے لیے جن میں اون کی گرمی اور دوسرے فائدے ہیں۔''

انسانوں نے دریا' سمندر کو دیوی اور دیوتا بنایا' حالانکہ وہ بھی ان ہی کی خاطر عدم سے وجود میں آئے ہیں۔

﴿وَ هُوَ الَّذِیْ سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَاْكُلُوْا مِنْهُ لَحْمًا طَرِیًّا وَّ تَسْتَخْرِجُوْا مِنْهُ حِلْیَةً تَلْبَسُوْنَهَا تَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِیْهِ وَ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ﴾ (نحل:۱۴)

''اور وہی خدا ہے جس نے دریا کو کام میں لگایا کہ تم اس سے تازہ گوشت کھاؤ اور تا کہ تم اس میں سے آرائش کے موتی پہننے کو نکالو اور دیکھتے ہو کہ جہاز سمندر کو پھاڑتے پھرتے ہیں اور تا کہ تم خدا کے فضل و کرم (روزی) کی تلاش کرو۔''

آگ بھی انسانوں کی مسجود بنی' حالانکہ وہ خود ان کی محبت میں جل رہی ہے۔

﴿اَلَّذِیْ جَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الشَّجَرِ الْاَخْضَرِ نَارًا فَاِذَاۤ اَنْتُمْ مِّنْهُ تُوْقِدُوْنَ﴾ (یٰسٓ : ۸۰)

''جس نے تمہارے واسطے ہرے درخت سے آگ پیدا کی' پس اس وقت تم اس سے اور آگ روشن کرتے ہو۔''

الغرض زمین سے لے کر آسمان تک جو مخلوق بھی ہے' انسان اس سے اشرف اور بلند تر ہے اور ساری مخلوق اسی کے لیے ہے پھر اس انسان سے بڑھ کر اور کون نادان ہے جو مخلوقات میں سے کسی کو اپنا معبود اور مسجود بنائے' اس حقیقت کے آشکارا ہونے کے بعد شرک کا کوئی پہلو بھی ایسا ہے جس میں کوئی سچا مسلمان گرفتار ہو سکے اور ایک آستانہ کو چھوڑ کر وہ کسی اور چوکھٹ پر اپنا سر جھکا سکے۔

الغرض محمد رسول اللہ ﷺ نے جس کی تلقین کی وہ ان ہی دو اصولوں پر قائم ہے ایک یہ کہ انسان تمام مخلوقات میں اشرف ہے' اس لیے کسی مخلوق کے سامنے اس کا سر نہ جھکنا چاہیے اور دوسرا یہ کہ ہر قسم کی قوت' ہر قسم کی قدرت اور تمام اوصافِ کمالیہ صرف ایک بزرگ و برتر ہستی کے لیے ہیں جو ماورائے عرش سے زیرِ فرش تک ہر ذرہ پر حکمران ہے' اس کی اطاعت کے دائرہ سے کوئی نقطہ باہر نہیں' انسان کی پیشانی کو ہر چوکھٹ سے اٹھ کر صرف اسی کے آستانہ پر جھکنا چاہیے' ہماری تمام عقیدت' ہماری تمام محبت' ہمارا تمام خوف' ہماری تمام امیدیں' ہماری تمام دعائیں' ہماری تمام التجائیں' ہماری تمام عاجزیاں صرف ایک درگاہ پر نثار ہوں اور اسی کے رحم و کرم کے سہارے ہماری زندگی کا ہر لمحہ بسر ہو۔

وہ بزرگ و برتر ہستی کیا ہے؟ اور اس کی نسبت ہمارا کیا تخیل ہو؟ تعلیمِ محمدی نے اس کا بھی جواب دیا ہے۔

خدا کا جامع اور مانع تخیل

قرآنِ پاک کی آیات' جاہلیت کے اشعار' اسلام سے پہلے عربوں کے واقعات بلکہ عرب کے آثارِ قدیمہ کے کتبات سے یہ واضح طور پر ثابت ہے کہ عربوں کے ذہن میں ایک بالاتر ہستی کا تخیل ضرور موجود تھا جس کا نام ان کے ہاں اللہ تھا' مگر اللہ کیا ہے؟ کیسا ہے؟ اس کے صفات کیا ہیں' اس کی طرف کیا کیا باتیں منسوب کی جاسکتی ہیں' کن کن باتوں سے وہ پاک ہے' اس کا تعلق اپنے بندوں کے ساتھ کیسا ہے؟ ہم کو اس کے آگے کیسے جھکنا چاہیے؟ اس سے کیا مانگنا چاہیے؟ اور کیونکر مانگنا چاہیے؟ اس کے حضور میں دعا کیونکر کرنی چاہیے؟ ہم اس سے کیوں ڈریں اور کیونکر ڈریں؟ اور اس سے ڈرنے کی کیا حقیقت ہے؟ اس سے محبت بھی کی جاسکتی ہے یا نہیں؟ اگر کی جاسکتی ہے تو کیونکر؟ اس سے محبت کی حقیقت کیا ہے' اس کی قدرت کہاں تک ہے' اس کے علم کی کیا حیثیت ہے؟ کیا وہ ہم سے دور ہے یا بالکل قریب؟ اس کے تقدس' بڑائی اور عظمت کی کوئی حد ہے؟ اس پر ہم توکل اور بھروسہ کیونکر کریں؟ کیا وہ انسانوں کی کسی صنف سے کلام بھی کرتا ہے؟ کیا اس کے کچھ احکام بھی ہیں؟ اور وہ احکام واجبُ الاطاعۃ بھی ہیں؟ وہ کن باتوں سے ناخوش ہوتا ہے کیا وہ ہمارے دلوں کے چھپے ہوئے رازوں سے بھی آگاہ ہے؟ کیا اس کی اجازت کے بغیر زمین کا ایک ذرہ بھی اپنی جگہ سے حرکت کرسکتا ہے' اس کی مشیت اور اس کا ارادہ کیونکر آسمان سے زمین تک ہر چیز کو محیط ہے؟ کیا اس کے بنائے ہوئے قاعدے اور قانون بھی ہیں؟ کیا وہ انسانوں کی تعلیم اور اصلاح کے لیے پیغمبروں کو بھی مبعوث کرتا ہے؟ کیا ہم اس کی بارگاہ میں اپنے اعمال کے جواب دہ بھی ہیں؟ ہم سے وہ کیوں اور کیونکر ہمارے اعمال کا مؤاخذہ کرے گا؟ یہ وہ باتیں ہیں جن سے عرب جاہلیت کا دل و دماغ بالکل عاری اور خالی تھا اور ان چیزوں کے متعلق ان کے ذہن میں کوئی تخیل نہ تھا' عرب جاہلیت کا ایک ایک شعر پڑھ جاؤ' ان کے مذاہب و اعتقادات کا ایک ایک حرف تلاش کرلو' اس سے زیادہ کچھ نہ پاؤ گے کہ اللہ ایک طاقتور' اعلیٰ ہستی ہے جس نے سب کو پیدا کیا ہے اور مصیبتوں اور بلاؤں میں اس کو پکارنا چاہیے۔

محمد رسول اللہ ﷺ نے اپنی ربانی تعلیمات سے ان کو اللہ تعالیٰ کی حقیقی عظمت سے آشنا کیا' اس کی وحدت اور بے مثالی سے باخبر کیا' اس کی مشیت و ارادہ اور قدرت و وسعت سے آگاہ کیا' ایک ایسی ہستی کے اعتقاد کی ان کو تعلیم دی جس کی قدرت بے انتہا' جس کی وسعت غیر محدود ہے' جس کی مشیت کائنات کے ہر ذرہ میں نافذ ہے' جس کے علم کے احاطہ میں اندھیرے اور اجالے کی ہر چیز داخل ہے۔ دلوں کے اسرار' زبانوں کے الفاظ اور ہاتھ پاؤں کے اعمال سب ہر لحاظ اور ہر لمحہ اس کے روبرو ہیں۔ اس کے سامنے انسان اپنے ہر عمل کا جوابدہ اور ذمہ دار ہے' اس کے مؤاخذہ کا خوف اور اس کی رحمت کی امید ہے' وہ محبوبِ ازل ہے' اس کی محبت کا نشہ ہمارے دلوں کی ہشیاری ہے' اس کے فضل و کرم اور لطف و محبت کی نیرنگیاں اوپر سے نیچے تک پھیلی ہیں' اس کی قوت ہر قوت پر غالب' اس کا ارادہ ہر ارادہ میں نافذ اور اس کا حکم ہر حکم سے بالاتر ہے' اس کی عبادت ہر مخلوق پر فرض اور اس کی اطاعت ہر

مکلّف پر واجب ہے' وہ ہر عیب سے منزہ' پاک اور ہر وصف کا مستحق اور اس سے متصف ہے' انسانوں کو اپنی یاد دلانے اور ان کے تزکیہ و اصلاح کے لیے رسولوں اور پیغمبروں کو بھیجتا رہا اور ان سے ہم کلام ہوتا رہا' اس کے کچھ احکام اور بندھے ہوئے قوانین ہیں' جن کی اطاعت نیکی اور نافرمانی گناہ ہے وہ اندھیرے کی روشنی' بھوکوں کی سیری' مایوسیوں کی امید' زخمیوں کا مرہم' بے قراروں کی تسلی اور بے کسوں کا سہارا ہے' وہ ہم سے ہماری گردن کی رگ سے بھی قریب تر ہے' ہم اس کو جب پکاریں وہ سنتا ہے' وہ نیکیوں کو پسند اور گناہوں سے نفرت کرتا ہے' وہ جب چاہے آسمان و زمین کو فنا کر دے اور جب چاہے ان کو پھر رچا دے' اس کی محبت دنیا کا اصل' اس کی عبادت ہماری زندگی کا مقصود اور اس کی یاد ہمارے دلوں کی راحت ہے۔

﴿اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ﴾ (الرعد:۲۸)

''ہاں خدا کی یاد سے دلوں کو اطمینان حاصل ہوتا ہے۔''

ان تعلیمات کا یہ اثر ہوا کہ وہ لوگ جن کو بھولے سے بھی خدا کا نام یاد نہ آتا تھا' وہ اس کے سوا سب کچھ بھول گئے اور اس کی راہ میں ہر چیز قربان کرنے کو تیار ہو گئے' وہ چلتے پھرتے' اٹھتے بیٹھتے' سوتے جاگتے' ہر حال میں اس کی یاد میں سرمست و سرشار رہتے تھے۔

﴿يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِهِمْ﴾ (ال عمران:۱۹۱)

''وہ خدا کو کھڑے' بیٹھے اور لیٹے یاد کرتے ہیں۔''

اس سرمستی و سرشاری میں بھی انہوں نے جنگلوں میں راہبانہ زندگی بسر نہیں کی' دولت مندوں کی بھیک کو اپنا سہارا نہیں بنایا' دنیا کی کشمکش سے نجات حاصل کرنے کے لیے بزدلانہ گوشہ نشینی کو تقدس کا نام دے کر اختیار نہیں کیا' بلکہ فرائض کی ادائیگی اور اس راہ میں جدوجہد اور سعی و کوشش کو اپنا مذہب سمجھا' اور خدا کا حکم جان کر اس کو پوری مستعدی کے ساتھ بجا لائے اور ان تمام ہنگاموں کے ساتھ دل کا معاملہ دلدارِ ازل کے ساتھ ہمیشہ قائم رکھا' خدا نے ان کی مدح کی کہ

﴿رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّ لَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ﴾ (نور:۳۷)

''وہ لوگ جن کو تجارت اور خرید و فروخت خدا کی یاد سے غافل نہیں کرتی۔''

ان کی محبتِ الٰہی کا درجہ دنیا کی ہر محبت پر غالب آ گیا' خدا نے ان کی توصیف کی کہ

﴿وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ﴾ (البقرۃ:۱۶۵)

''ایمان والے سب سے زیادہ خدا سے محبت کرتے ہیں۔''

ان کا توکل' ان کا صبر' ان کا استقلال' ان کی استقامت' ان کی بہادری' ان کی بے خوفی ان کی صداقت' ان کی راست بازی' ان کی اطاعت غرض ان کی ہر چیز ان کے اسی جذبۂ ایمان کا پرتو تھی اور ہر وقت ان کے پیشِ نظر یہ تعلیم رہتی تھی کہ

﴿وَ مَنْ یَّتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ فَھُوَ حَسْبُہٗ﴾ (طلاق:۳)

''جوخدا پر بھروسہ کرتا ہے تو خدا اس کو بس ہوتا ہے۔''

﴿اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ﴾ (زمر:۳۶)

''کیا خدا اپنے بندہ کو کافی نہیں۔''

﴿وَ تَخْشَی النَّاسَ وَ اللّٰہُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰہُ﴾ (احزاب:۳۷)

''اور تو لوگوں سے ڈرتا ہے حالانکہ سب سے زیادہ خدا سے ڈرنا چاہیے۔''

ان میں یہ تمام روحانی واخلاقی جوہر اسی ایمان باللہ کے بدولت پیدا ہوئے۔

ماءوصفت

دنیا کے آغاز میں خدا نے کہا تھا کہ ہم نے آدم کو سب نام سکھائے' دنیا کہاں سے کہاں نکل گئی اور علم کی عت کہاں سے کہاں پہنچی' مگر غور کیجیے تو ناموں کے ہیر پھیر سے ہم اب تک آگے نہیں بڑھے' یہی ہماری حقیقت ا ہے اور یہی ہمارا فلسفہ ہے' ہم اپنے مفروضہ اصولِ منطقی کی بنا پر ذاتیات اور حقائق کے ذریعہ سے اشیا کی تعریف ے مدعی بن گئے ہیں' لیکن ہزاروں صدیاں گزرنے پر بھی ذاتی اور حقیقی تعریف (حدِ منطقی) کی ایک مثال بھی پیش لر سکے جو کچھ کر سکے وہ یہ کہ صفاتِ عوارض اور خواص سے مختلف رنگوں سے نئی نئی طفلانہ شکلیں بناتے اور بگاڑتے ' جب مادیت کا یہ عالم ہے تو وراء الورا ہستی میں ہماری بشری طاقت اس سے زیادہ تحمل کیونکر کر سکتی' تجلی گاہِ طور ا رمز کی آتشیں تصویر ہے۔

ہم خدا کو بھی اس کے ناموں' اس کے کاموں' اس کی صفتوں ہی سے جان سکتے ہیں' محمد رسول اللہ ﷺ نے رب کے جاہلوں کو اسی نصابِ انسانی کے مطابق تعلیم دی عرب کا جاہل اللہ نام کی ایک اعلیٰ ہستی سے واقف تھا' لبتہ اس کے ناموں اور کاموں کے تخیل سے بڑی حد تک ناآشنا تھا' اس لیے اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات سے بھی وہ لعاً بیگانہ تھا۔ دیوانِ عرب یعنی ان کی شاعری کے دفتر میں کہیں کہیں اللہ کا نام آتا ہے' مگر کہیں اس کی صفت کا ذکر یں آتا' قرآن پاک میں ان کے خیالات کا پورا عکس اتارا گیا ہے' لیکن کہیں سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ اللہ الیٰ کے اسماء وصفات سے بھی آگاہ تھے' بعض عیسائی عربوں میں' اللہ کے ساتھ ساتھ الرحمان کا لفظ بھی مستعمل تھا' س کے معنی رحم کرنے والے کے ہیں' اصحاب الفیل کے عیسائی رئیس ابرہہ کے نام سے سدِ عرم (یمن) پر جو کتبہ لگا ہے اور جس کو جرمن فاضل گلازر نے شائع کیا ہے اس میں بھی دو جگہ رحمان کا لفظ آیا ہے' عرب عیسائی شعرا کے کلام ں بھی یہ لفظ ملتا ہے۔ عیسائیوں میں اس کے استعمال کا نتیجہ یہ تھا کہ عرب مشرکین کو اس لفظ سے چڑ ہوگئی تھی' اس لیے جب اسلام نے اس لفظ کو اختیار کیا تو مشرکین نے اس کے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر ب آنحضرت ﷺ نے معاہدہ کے کاغذ پر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھوایا تو قریش کے نمائندہ نے کہا کہ' قسم ہے اللہ

کی مجھے نہیں معلوم کہ رحمٰن کیا ہے۔ (۱)

محمد رسول اللہ ﷺ کی زبانِ مبارک سے سننے اور قرآن مجید میں بار بار خدا کے لیے رحمٰن کا لفظ مستعمل ہونے کی وجہ سے مشرکوں کو برہمی ہوتی تھی اور وہ کہتے تھے کہ ہم کبھی رحمٰن کے آگے سرنگوں نہیں ہو سکتے' قرآن نے ان کی اسی حالت کا ذکر اس آیت میں کیا ہے:

﴿وَ اِذَا قِیْلَ لَهُمُ اسْجُدُوْا لِلرَّحْمٰنِ قَالُوْا وَ مَا الرَّحْمٰنُ اَنَسْجُدُ لِمَا تَاْمُرُنَا وَ زَادَ هُمْ نُفُوْرًا﴾ (الفرقان:۶۰)

''اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ رحمٰن کو سجدہ کرو تو کہتے ہیں کہ رحمٰن کیا ہے' کیا تم جس کو کہو اس کو ہم سجدہ کریں' رحمٰن کا نام ان کی نفرت کو اور بڑھا دیتا ہے۔''

مشرکین کو یہ برا لگتا ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ ایک طرف تو ان کے بتوں اور دیوتاؤں کی مذمت کرتے ہیں اور دوسری طرف عیسائیوں کے رحمان کی مدح وستائش کرتے ہیں۔

﴿اَهٰذَا الَّذِیْ یَذْكُرُ اٰلِهَتَكُمْ وَ هُمْ بِذِكْرِ الرَّحْمٰنِ هُمْ كٰفِرُوْنَ﴾ (الانبیاء:۳۶)

''(مشرک آپ کو دیکھتے ہیں تو مذاق سے کہتے ہیں کہ) یہی وہ ہے جو تمہارے دیوتاؤں کو برا کہتا ہے اور وہی مشرک رحمان کے ذکر سے انکار کرتے ہیں۔''

تعلیمِ محمدی نے عرب کے ناآشنایانِ حقیقت کو بالآخر آگاہ کیا کہ خدا کے اسماء وصفات کی کوئی حد نہیں' اس کو سب ہی اچھے ناموں سے پکارا جا سکتا ہے۔

﴿قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ اَیًّامَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى﴾ (بنی اسرائیل: ۱۱۰)

''کہہ دو (اے پیغمبر کہ) خدا کو اللہ کہہ کر پکارو یا رحمٰن کہہ کر جس نام سے بھی پکارو سب اچھے نام اسی کے ہیں۔''

اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کا مسئلہ اسلام کے ان اہم مذہبی اصلاحات میں سے ہے جن سے نہ صرف عرب کے جاہل ناآشنا تھے بلکہ دنیا کے بڑے بڑے مذہبوں کے پیرو بھی ان کے متعلق غلطیوں میں مبتلا تھے' یہودیوں کے اسفار اور صحیفوں میں خدائے برحق کا اصلی نام ''یہودا'' تھا' مگر کبھی عام یہودیوں کو اس مقدس نام کے زبان پر لانے کی اجازت نہ تھی' دوسرا عام نام ''اہیم'' ہے' جو ہر موقع پر استعمال ہوتا ہے' ان دو کے علاوہ خدا کے بیسیوں نام اور اسماء جو درحقیقت اس کے اوصافِ ذاتی اور اعمالِ ربانی کے ترجمان ہیں' تورات کا دفتر ان کے ذکر سے بالکل خالی ہے' صفاتِ الٰہی میں سے جو صفت یہودی صحیفوں میں سب سے زیادہ نمایاں ہے وہ فوجوں والا خدا یعنی ''رب الافواج'' ہے جو صرف خدا کی صفاتِ جلالی کا مظہر ہے۔

---

(۱) صحیح بخاری جلد اول ص ۳۷۹۔

عیسائیوں کی انجیل اور مذہبی کتابوں میں ''باپ'' کا لفظ خدا کے لیے استعمال ہوا ہے' اس لفظ کی حقیقت اور خدا پر اس کے اطلاق سے مقصود کیا ہے' گوشت پوست اور مادیت سے بھرے ہوئے لفظ کا خدا پر مجازاً اطلاق بھی کہاں تک جائز ہے اور اس سے اس مذہب میں کہاں تک غلطیاں پھیلیں' ان باتوں کو چھوڑ کر بھی دیکھیے تو یہ خدا کے صرف جمالی صفات کی ناقص اور مادی تعبیر ہے' عیسائیت میں فلسفہ کی آمیزش نے تثلیث کے اختراعی عقیدہ کو اسی مسئلۂ صفات کے پردہ میں چھپا لیا اور یہ تاویل کی گئی کہ تثلیث کے اقانیم ثلٰثہ' باپ (خدا) بیٹا (حضرت عیسیٰ علیہ السلام) اور روح القدس حیات' خلق اور علم تین صفتوں سے عبارت ہیں' باپ حیات' بیٹا خلق اور روح القدس علم ہے' اور یہ تینوں ایک ہیں اور تینوں اپنے وجود میں الگ الگ ہیں اس تشریح سے صفاتِ الٰہی کے تجسیم کے مسئلہ نے جنم لیا' اور ایک خدا کئی خداؤں کا مجموعہ بن گیا۔

ہندوؤں میں اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کی نیرنگی نظر آتی ہے' لیکن ہر صفت نے ان کے ہاں ایک مستقل وجود اختیار کر لیا ہے اور خود خدا ہر قسم کی صفات سے خالی' مجرد گیا ہے' اسی لیے ہندوستان کے تمام مذاہب اسی تجسیمِ صفات کے جلوہ گاہ ہو کر رہ گئے ہیں برہما' مہیش دشنو تین صفات خالق' ممیت (مارنے والا) اور قیوم کے مجسمے ہیں' غلط تعبیر نے وحدت کی جگہ یہاں بھی تثلیث پیدا کر دی ہے' شنکر آچاریہ نے خدا کے صرف تین اصلی صفات تسلیم کیے۔ حیات' علم اور سروریا آنند جین مذہب اور بعض ہندو فرقوں میں ایک خالقیت کی صفت کے تجسیم نے اعضائے تناسل کی پرستش کی گمراہی پیدا کی' عام ہندوؤں میں ۳۳ کروڑ عجیب الخلقت دیوتاؤں کی عظیم الشان بھیڑ بھی صفات واسمائے الٰہی کی تجسیم اور مستقل وجود کے غلط فلسفہ نے پیدا کی اور اسی نے بت پرستیوں کی نت نئی صورتیں نمایاں کیں' مجوسیوں میں یزدان اور اہرمن کی ثنویت اور دوئی بھی خدا کی دو صفتوں ہادی اور مضل کو دو مستقل ہستیوں میں منقسم کر دینے کا نتیجہ ہے اس تفصیل سے اندازہ ہوا ہوگا کہ اس مسئلہ کی غلط تعبیر نے دنیا میں کتنی گمراہیاں پیدا کی ہیں۔

محمد رسول اللہ ﷺ نے انسانوں کے ان تمام فاسد تخیلات کو باطل ٹھہرایا ہے' ان کے غلط عقیدوں کی تصحیح کی اور ربانی ہدایت کے نور سے سراجِ منیر بن کر جس طرح حقیقت کو روشن کیا' وہ نبوتِ محمدی کے عظیم الشان کارناموں میں سے ہے۔

آپؐ نے بتایا کہ اللہ تعالیٰ ﷻ کی صفاتِ کاملہ گنتی اور شمار کی حد سے باہر ہیں اور اس کی باتوں کی کوئی انتہا نہیں' آپ نے یہ دعا سکھائی' اے خداوند! تیرے ہر اس نام کے وسیلہ سے جو تو نے اپنا رکھا یا اپنی کتاب میں اتارا' یا کسی مخلوق کو سکھایا یا اپنے لیے اپنے علمِ غیب میں اس کو چھپا رکھا' میں تجھ سے مانگتا ہوں' حضرت عائشہؓ کو یہ الہامی دعا تعلیم ہوئی' خداوندا! میں تیرے سب اچھے ناموں کے وسیلہ سے جن میں سے کچھ کو ہم نے جانا اور جن کو نہیں جانا' تجھ سے درخواست کرتا ہوں'[1] قرآن پاک کے ذریعہ بتایا گیا:

---

(۱) یہ تینوں دعائیں امام بیہقی نے کتاب الاسماء والصفات میں بسند نقل کی ہیں اور پہلی روایت مسند ابن حنبل میں بھی (بسند عبداللہ بن مسعود) ہے۔

﴿قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّیْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّی وَ لَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا﴾ (الکہف:۲۱)

''کہہ دے (اے پیغمبر!) کہ اگر سمندر میرے پروردگار کی باتوں کے لکھنے کے لیے سیاہی بن جائے' تو سمندر ختم ہو جائے لیکن میرے پروردگار کی باتیں ختم نہ ہوں گی' اگرچہ ہم ایسا ایک اور سمندر کیوں نہ لے آئیں۔''

دوسری جگہ کہا گیا:

﴿وَ لَوْ اَنَّ مَا فِی الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّ الْبَحْرُ یَمُدُّهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ﴾ (لقمان:۲۷)

''اور اگر زمین میں جتنے درخت ہیں وہ قلم بن جائیں اور سمندر اور اس کے بعد سات سمندروں کا پانی سیاہی ہو جائے تب بھی اللہ کی باتیں ختم نہ ہوں گی۔''

الغرض تمام اچھے اور کمالی نام اسی کے لیے ہیں اور اسی کو زیبا ہیں:

﴿اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی﴾ (طٰہٰ: ۸)

''نہیں ہے کوئی معبود لیکن وہی اللہ اسی کے لیے ہیں سب اچھے نام۔''

بڑائی کا نام اور خوبی کا ہر وصف اسی ذاتِ بے ہمتا کے لیے ہے' خواہ اس کو خدا کہو یا اللہ کہو' لغت اور زبان کا کوئی فرق اس میں خلل انداز نہیں:

﴿قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ اَیًّامَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی﴾ (بنی اسرائیل:۱۱۰)

''کہہ دے (اے پیغمبر!) اس کو اللہ کہہ کر پکارو یا رحمان کہہ کر' جو چاہو کہہ کر پکارو سب اچھے نام اسی کے ہیں۔''

لیکن مشرکوں کی طرح اس کو ایسے ناموں سے نہ پکارو جو اس کے کمال اور بڑائی کے منافی ہیں اور بتوں اور دیوتاؤں کے ناموں سے بھی اس کو یاد نہ کرو:

﴿وَ لِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی فَادْعُوْهُ بِهَا وَ ذَرُوا الَّذِیْنَ یُلْحِدُوْنَ فِیْۤ اَسْمَآىِٕهٖ﴾ (اعراف: ۱۸۰)

''اور اللہ ہی کے لیے ہیں سب اچھے نام' اس کو ان ناموں سے پکارو اور ان لوگوں سے علیحدہ رہو جو اس کے ناموں میں کجی کرتے ہیں۔''

تعلیمِ محمدی کا صحیفۂ وحی اللہ تعالیٰ کے تمام اوصافِ حمیدہ اور اسمائے حسنہ سے بھرا ہوا ہے بلکہ اس کا صفحہ صفحہ خدا کے اسماء و صفات کی جلوہ گریوں سے معمور ہے' قرآن پاک کا کوئی ایسا رکوع ہوگا جس کا خاتمہ خدا کی توصیف اور حمد پر نہ ہو' اور یہ تمام اوصاف اور نام اس عشق و محبت کو نمایاں کرتے ہیں جو اس محبوبِ ازل اور نورِ عالم کے ساتھ

قرآن کے ہر پیرو کے دل میں ہونا چاہیے۔

﴿اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ يُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ لَّاشَرْقِيَّةٍ وَّ لَا غَرْبِيَّةٍ يَّكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ وَ لَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ يَهْدِى اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ وَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ وَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ﴾ (نور:۳۵)

''اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے اس کے نور کی مثال یہ ہے کہ ایک طاق ہو جس میں چراغ ہو چراغ ایک شیشہ کے اندر ہو۔ شیشہ اتنا صاف ہو کہ گویا ایک چمکتا ستارہ ہے۔ وہ چراغ زیتون کے مبارک درخت کے تیل سے جلایا گیا ہو وہ نہ پورب ہے نہ پچھم ہے اس کا تیل اتنا صاف ہے کہ آگ کے چھوئے بغیر وہ آپ سے آپ جلنے کو ہو' روشنی پر روشنی خدا اپنی روشنی تک جس کو چاہے پہنچا دے اور خدا لوگوں (کے سمجھانے) کے لیے یہ مثالیں بیان کرتا ہے اور اللہ کو ہر چیز کا علم ہے۔''

﴿اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّ لَا نَوْمٌ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَ مَا خَلْفَهُمْ وَ لَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ لَا يَئُوْدُهٗ حِفْظُهُمَا وَ هُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ﴾ (بقرہ:۲۵۵)

''اللہ نہیں ہے اس کے سوا اور کوئی معبود' وہ ہمیشہ زندہ تمام دنیا کو سنبھالے ہے' اس کو اونگھ اور نیند نہیں آتی آسمانوں میں اور زمین میں جو کچھ ہے اسی کا ہے۔ کون ہے جو اس کی مرضی کے بغیر اس کے سامنے سفارش کرنے کو کھڑا ہو' انسانوں کے سامنے اور پیچھے جو کچھ ہے اس کو وہ جانتا ہے اور لوگ اس کے علم کا احاطہ نہیں کر سکتے' لیکن جتنے کا وہ چاہے اس کا تخت آسمانوں اور زمینوں کو سمائے ہوئے ہے اور ان دونوں (آسمان و زمین) کی نگہبانی اس کو تھکاتی نہیں اور وہی اونچا اور بڑا ہے۔''

﴿هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ○ هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ سُبْحَانَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ○ هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى يُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ○﴾ (حشر:۲۲'۲۴)

''وہی اللہ ہے جس کے سوا کوئی اللہ نہیں' چھپے اور کھلے کا علم رکھنے والا' وہی رحم کرنے والا اور مہربانی والا ہے۔ وہی اللہ ہے جس کے سوا کوئی اللہ نہیں' سب کا بادشاہ' پاک' پوری سلامتی' امن والا' ہر شے پر گواہ' غالب سب پر قابو والا' بڑائی والا' ہر اس چیز سے پاک ہے جس کو یہ مشرک خدا کا شریک بناتے ہیں۔ وہی اللہ پیدا کرنے والا' وجود بخشنے والا' ہر چیز کی صورت کھینچنے والا اسی کے لیے سب اچھے نام ہیں جو کچھ

آسمانوں میں اور زمین میں ہے سب اس کی پاکی بیان کرتے ہیں وہی سب پر غالب اور حکمت والا ہے۔"

﴿سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ○ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ یُحْیٖ وَ یُمِیْتُ وَ هُوَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ○ هُوَ الْاَوَّلُ وَ الْاٰخِرُ وَ الظَّاهِرُ وَ الْبَاطِنُ وَ هُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ○ هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ یَعْلَمُ مَا یَلِجُ فِی الْاَرْضِ وَ مَا یَخْرُجُ مِنْهَا وَ مَا یَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَ مَا یَعْرُجُ فِیْهَا وَ هُوَ مَعَكُمْ اَیْنَمَا كُنْتُمْ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ○ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اِلَی اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ○ یُوْلِجُ الَّیْلَ فِی النَّهَارِ وَ یُوْلِجُ النَّهَارَ فِی الَّیْلِ وَ هُوَ عَلِیْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ○﴾ (حدید:۱تا۶)

"آسمانوں میں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ سب خدا کی پاکی بیان کرتے ہیں اور وہی غالب اور دانا ہے' آسمانوں کی اور زمین کی حکومت اسی کی ہے۔ وہی جلاتا ہے اور مارتا ہے اور وہ ہر بات پر قادر ہے۔ وہی پہلا اور وہی پچھلا ہے اور وہی کھلا ہے اور وہی چھپا ہے اور ہر بات کو جانتا ہے۔ وہی ہے جس نے آسمانوں کو اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا۔ پھر تخت پر برابر ہوا وہ جانتا ہے جو زمین میں گھستا ہے اور جو اس سے نکلتا ہے اور جو آسمان سے اترتا ہے اور جو اس میں چڑھتا ہے اور جہاں بھی تم ہو وہ تمہارے ساتھ ہے' اور اللہ تعالیٰ تمہارے کاموں کو دیکھتا ہے آسمانوں کی اور زمین کی بادشاہی اسی کی ہے اور اللہ ہی تمام چیزوں کا مرجع ہے وہ رات کو دن میں داخل کر دیتا ہے اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور وہ سینوں کے سب بھیدوں سے واقف ہے۔"

خدا کے متعلق اہلِ عرب کا جو پست تخیل تھا' اور محمد رسول اللہ ﷺ نے اس کو مٹا کر ان کے سامنے جو بلند تخیل پیش کیا' اس کا اندازہ حسبِ ذیل واقعہ سے ہو سکتا ہے' آپ نے جب توحید کا آوازہ بلند کیا تو مشرکین جو اپنے دیوتاؤں کی آل و اولاد اور بیویوں اور گوپیوں کی حمد کے ترانے گاتے تھے' آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور فرمائش کی کہ ذرا اپنے خدا کا نسب تو ہمارے سامنے بیان کرو' گویا وہ اپنے دیوتاؤں سے اسلام کے خدا کا مقابلہ کر کے بتانا چاہتے تھے کہ اس حیثیت سے اسلام کا خدا ہمارے دیوتاؤں کی ہمسری نہیں کر سکتا' اس کے جواب میں وحیِ محمدی نے اپنے خدا کی حقیقت قرآن پاک کی اس سب سے مختصر سورہ میں پیش کی۔ (۱)

﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ○ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ○ لَمْ یَلِدْ وَ لَمْ یُوْلَدْ ○ وَ لَمْ یَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ○﴾ (اخلاص ۱:۴)

"کہہ دے (اے پیغمبر!) اللہ ایک ہے وہ تنہا اور بزرگ اور بے نیاز اور عالم کا مرجع اور جائے پناہ ہے نہ

(۱) مستدرک حاکم تفسیر اخلاص (صحیح) و جامع ترمذی تفسیر سورۂ مذکور و کتاب الاسماء بیہقی ص ۲۳ الہ آباد۔

اس کے کوئی اولاد ہے اور نہ اس کے ماں باپ ہیں (جنہوں نے اس کو جنا ہو) اور نہ اس کا کوئی ہمسر ہے' (جو اس کی بیوی ہو)۔"

یہ روایت حضرت ابی بن کعبؓ سے مروی ہے جو صحابہؓ میں سب سے زیادہ قرآن کے ماہر سمجھے جاتے تھے' وہ اسی کے بعد اس سورہ کی تفسیر میں کہتے ہیں کہ "صمد" وہ ہے جو نہ جنتا ہے اور نہ کسی نے اس کو جنا ہو' کیونکہ جو جنا جاتا ہے وہ مرتا بھی ہے اور جو مرتا ہے وہ اپنا وارث اور جانشین بھی چھوڑ جاتا ہے' اور خدا نہ مرتا ہے نہ اس کا کوئی جانشین ہے اور کوئی اس کا ہمسر نہیں یعنی کوئی اس کے برابر نہیں اور نہ کوئی اس کے مثل ہے' غور کرو کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم سے پہلے اہلِ عرب میں خدا کا کتنا پست و ذلیل تخیل تھا' جس کا اندازہ تم ان کے سوال سے کر سکتے ہو' اور آپ کی تعلیم کے بعد وہ تخیل کتنا پاک' اعلیٰ اور بلند ہو گیا جس کا اندازہ حضرت ابیؓ کی تفسیر سے ہو سکتا ہے جو اسی عرب نژاد قبیلہ کے ایک ممتاز فرد تھے لیکن ان کا دل اب محمد رسول اللہ ﷺ کے فیضِ تعلیم سے منور ہو چکا تھا' حضرت ابو ہریرہؓ آپ سے سن کر کہتے تھے کہ خدا فرماتا ہے کہ آدم کے بیٹے نے مجھے جھٹلایا اور آدم کے بیٹے نے مجھ کو گالی دی اس کا جھٹلانا یہ ہے کہ اس نے کہا کہ خدا دوبارہ پیدا نہیں کرے گا حالانکہ پہلی بار کے پیدا کرنے سے دوسری بار کا پیدا کرنا بہت آسان ہے اور اس کا گالی دینا یہ ہے کہ اس نے کہا کہ خدا کی اولاد ہے حالانکہ میں ایک اور "صمد" ہوں جس نے نہ کسی دوسرے کو جنا ہے اور نہ اس کو کسی نے جنا ہے اور نہ اس کا کوئی ہم سر ہے'(۱) حضرت ابو ہریرہؓ یمنی عرب ہیں' یعنی اس عرب کے ایک فرد ہیں جو تعلیمِ محمدی سے پہلے ان حقائق سے بے بہرہ تھا اور اب وہ تنزیہ و تقدیس کے یہ موتی اپنے منہ سے اگل رہے ہیں۔

اس مختصر سورہ میں سب سے چھوٹا لفظ "صمد" ہے' لیکن درحقیقت قرآن کی بلاغت نے اس ایک لفظ میں صفاتِ الٰہی کا بے پایاں دفتر چھپا رکھا ہے "صمد" کے معنی لغت میں اونچی پتھریلی زمین یا چٹان کے ہیں جو کسی ایسے علاقہ میں ہو جہاں جب سیلاب آتا ہو' تو اس پر نہ چڑھتا ہو' اور لوگ اس وقت دوڑ دوڑ کر اسی پر چڑھ کر اپنی جان بچائیں' پھر صمد کے اس لغوی معنی سے اس سردار کے معنی پیدا ہوئے جو بزرگی اور شرافت میں انتہائی معراجِ کمال پر ہو' اور اس سردار کو بھی کہنے لگے جس کی موجودگی کے بغیر مجلس میں کوئی فیصلہ نہ ہو سکتا ہو اور اس سردار کو بھی جس کے اوپر کوئی سردار نہ ہو' اور اس جائے پناہ کے معنی میں بھی مستعمل ہوا جو سب کو مصیبت کے وقت اپنے دامن میں پناہ دے سکے اور اس مرجع و مرکز کے معنی میں بھی آیا جس کی طرف ہر شخص دوڑ دوڑ کر جاتا ہے' صمد ٹھوس کو بھی کہتے ہیں جس کے اندر خول نہ ہو' اسی لیے اس کو بھی کہتے ہیں جو کھاتا پیتا نہ ہو اور جس کے آل و اولاد نہ ہو' اس کو بھی کہتے ہیں جس سے کوئی بے نیاز نہ ہو' اس بہادر کو بھی کہتے ہیں جس کو لڑائی میں بھوک اور پیاس نہ لگتی ہو صمدۃ اس اونٹنی کو کہتے ہیں جس کے حمل نہ رہا ہو' حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ "صمد" وہ سردار ہے جو اپنی بزرگی اور سرداری میں درجۂ کمال پر ہو' وہ شریف جس کی شرافت کامل ہو' وہ بڑا جس کی بڑائی میں کوئی نقص نہ ہو' وہ بردبار جس کی بردباری بدرجۂ

(۱) صحیح بخاری سورۂ اخلاص۔

اتم ہو وہ بے پرواو بے نیاز جس کے بے پروائی و بے نیازی کی کوئی حد نہ ہو وہ زبردست جس کے جبروت کی انتہ
ہو وہ علم والا جس کا علم بدرجۂ اتم ہو وہ حکیم جس کی دانائی بمرتبۂ کمال ہو یعنی وہ جو بڑائی اور بزرگی کی ہر صنف
کامل ہو۔ (۱)

ان معنوں کے علاوہ صحابہؓ و تابعین نے اس کی تفسیر میں حسب ذیل معانی بھی لکھے ہیں:

ابن عباسؓ۔ وہ جس کی طرف مصیبت کے وقت لوگ رجوع کریں۔

حسن بصریؒ۔ وہ حی و قیوم جس کو زوال نہ ہو اور جو باقی ہو۔

ربیع بن انسؒ۔ جس کے نہ اولاد ہو نہ ماں باپ۔

عبداللہ بن مسعودؓ۔ جس کے اندر معدہ وغیرہ جسمانی اعضا نہ ہوں۔

بریدہؒ۔ جس میں خون نہ ہو۔

عکرمہؒ و شعبیؒ۔ جو کھاتا نہ ہو۔

عکرمہؒ۔ جس سے کوئی دوسری چیز نہ نکلے۔

قتادہؒ۔ باقی و غیر فانی۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ تمام معانی (۲) اس ایک لفظ کے اندر پوشیدہ ہیں' اور یہ سب صرف ایک حقیقت مختلف تعبیریں ہیں' کیونکہ اوپر یہ معلوم ہو چکا ہے کہ اس لفظ کے اصلی معنی ''چٹان'' کے ہیں جو لڑائی اور مصیبتو کے وقت جائے پناہ کا کام دے اسرائیلی الٰہیات میں بھی یہ لفظ یہی اہمیت رکھتا ہے اور بنی اسرائیل کے صحیفو میں جائے پناہ کے لیے چٹان کا لفظ آیا ہے۔ استثناء (۳۰'۳۱'۳۲) میں ہے۔

''اگر ان کی چٹان ان کی بیچ نہ ڈالتی اور خداوند ان کو اسیر نہ کرواتا' کیونکہ ان کی چٹان ایسی نہیں جیسی ہمار چٹان'' یہ چٹان اس موقع پر حقیقت میں خدا کی مدد و نصرت سے کنایہ ہے'' سموال کے پہلے صحیفہ میں یہ کنایہ تصر سے بدل جاتا ہے ''خداوند کے مانند کوئی قدوس نہیں' تیرے سوا کوئی نہیں' کوئی چٹان ہمارے خدا کے مانند نہیں (۲۔۲)

اس سورہ میں خدا کی صفت میں دو لفظ ہیں احد (ایک) اور صمد (جائے پناہ) اور یہ دونوں خدا کے دو متضد کمالی اوصاف کو حاوی ہیں' اس کی یکتائی کا نتیجہ تو یہ ہے کہ اس جیسا کوئی نہیں' نہ اس کو کسی کی حاجت نہ اس کو کسی ے غرض وہ یکہ تنہا' اکیلا بے ہمتا' بے نیاز' بے پروا' سب سے مستغنی اور سب سے الگ ہے' لیکن اسی کمالِ یکتائی ے ساتھ وہ سب کے ساتھ' سب کا دستگیر' سب کی جائے پناہ' سب کا محتاج الیہ' سب کا مرکز' سب کا مرجع' سب کا ماوٰ

(۱) کتاب الاسماء والصفات امام بیہقی بسند ص ۴۳۔

(۲) ان معانی کے لیے دیکھو کتاب الاسماء بیہقی ص ۴۳ مفردات القرآن راغب اصفہانی ابن جریر طبری' ابن کثیر اور تفسیر سورۃ الاخلاص لابن تیمیہ۔

سب کا ملجا یعنی سب کی چٹان ہے جو مصیبتوں میں سہارا' بلاؤں میں تسلی اور اضطرابوں میں تشفی ہے۔

﴿فَفِرُّوٓا اِلَی اللّٰہِ﴾

''ہر جگہ سے بھاگ کر اللہ کے ہاں پناہ لو۔''

یہ سورۂ پاک توحیدِ اسلامی کے ہر شعبہ کو حاوی ہے اور اسی لیے اس کو ثلث القرآن (تہائی قرآن) کا درجہ دیا گیا ہے' ایک صحابی تھے جو نماز کی ہر دو رکعت میں قرأت کے آخر میں اس سورہ کو پڑھا کرتے تھے لوگوں نے یہ واقعہ آنحضرت ﷺ سے بیان کیا' آپؐ نے ان سے اس کی وجہ دریافت کرائی' انہوں نے کہا۔ اس میں میرے رب کی صفتیں بیان ہوئی ہیں جو مجھ کو بہت محبوب ہیں' آپ نے فرمایا' بشارت ہو کہ خدا بھی تم سے محبت کرتا ہے۔ (۱) ایک اور انصاری صحابی تھے جو قبا کی مسجد میں امامت کرتے تھے ان کا یہ حال تھا کہ ہر رکعت میں فاتحہ کے بعد پہلے اس سورہ کو پڑھ لیتے تھے تب کوئی دوسری سورہ پڑھتے تھے ان کے مقتدی صحابہؓ نے اس پر اعتراض کیا تو انہوں نے کہا کہ مجھے امامت چھوڑنی منظور ہے مگر اپنی روش بدلنی منظور نہیں' لوگوں نے اس واقعہ کا تذکرہ آنحضرت ﷺ سے کیا۔ آپؐ نے ان سے اس کی وجہ دریافت کی تو گزارش کی کہ یا رسول اللہ ﷺ مجھے یہ سورۂ بہت محبوب ہے' ارشاد ہوا کہ یہ محبت تم کو جنت میں لے جائے گی' (۲) قتادہ بن نعمان ایک صحابی تھے جو رات بھر اسی ایک سورہ کو دہراتے اور لطف حاصل کرتے رہتے تھے' لوگوں نے آنحضرت ﷺ سے اس کا تذکرہ کیا تو فرمایا کہ یہ سورہ قرآن کا تہائی حصہ ہے۔ (۳)

اس گمراہی اور تاریکی کا اندازہ جو آنحضرت ﷺ سے پہلے عرب پر چھائی ہوئی تھی' اس روحانی لطف اور نورانی فیض سے کرو جو محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ اس کے حصہ میں آیا۔

قرآن مجید اور احادیث میں اللہ تعالیٰ کے سو سے زیادہ نام اور اوصاف آئے ہیں' صحیح حدیثوں میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام ہیں' جو ان کو محفوظ رکھے یا نگاہ میں رکھے' وہ جنت میں داخل ہوگا۔ (۴) خدا طاق ہے' وہ طاق عدد پسند کرتا ہے آخری فقرہ اس علت کو ظاہر کرتا ہے کہ ۹۹ نام کیوں رکھے گئے' پورے سو کیوں نہ مقرر کیے گئے یہ اس لیے کہ اگر پورے سو ہوتے تو عدد طاق نہ رہتا' اور اس سے توحید کا رمز آشکارانہ ہوتا' صحیح احادیث میں اسی قدر ہے یعنی ان ۹۹ ناموں کی تصریح نہیں ہے ترمذی میں اور بعض کم درجہ حدیثوں میں ان ناموں کو گنایا بھی ہے' لیکن محدثین نے عموماً یہاں تک کہ حافظ ابن حجر نے بھی لکھا ہے کہ یہ روایتیں ضعیف اور کمزور

(۱) صحیح بخاری کتاب التوحید۔
(۲) ایضاً کتاب الصلوٰۃ۔
(۳) مسند احمد بسند ابی سعید الخدری۔
(۴) صحیح بخاری کتاب التوحید و صحیح مسلم کتاب الذکر و مسند احمد بسند ابی ہریرہؓ و جامع ترمذی و نسائی و ابن ماجہ و ابن خزیمہ و ابوعوانہ و ابن جریر و طبرانی و بیہقی وغیرہ۔

ہیں، پھر ان روایتوں میں بعض ناموں کا ادل بدل اور الٹ پھیر بھی ہے اور بعض ایسے نام بھی ان میں ہیں جو قرآن مجید میں مذکور نہیں اور بعض نام ایسے جو قرآن مجید میں ہیں ان میں نہیں ہیں۔ اسی لیے علما کا فیصلہ یہ ہے کہ ان روایتوں میں ناموں کا انتخاب راویوں نے خود اپنی تلاش و تفحص سے کیا ہے اس لیے ان روایتوں سے یہ شبہ نہ ہو کہ اسمائے الٰہی صرف ان ننانوے میں محصور ہیں بلکہ بڑے بڑے ائمہ اور محدثین مثلاً عبدالعزیز بن یحییٰ، ابوبکر بن عربی، امام نووی، حافظ ابن حجر، امام خطابی، ابن تیمیہ اور قرطبی وغیرہ نے تصریح کی ہے کہ اسمائے الٰہی ان ننانوے میں محصور نہیں، اور یہ بھی تصریحات ملتی ہیں کہ اسماء اور صفاتِ الٰہی کی کوئی حد و پایاں نہیں ہے [1] اور اس پر محدثین نے حضرت ابن مسعودؓ اور حضرت عائشہؓ کی روایتوں سے جو آغازِ مضمون میں اوپر گزر چکی ہیں استدلال کیا ہے۔

بہر حال قرآن پاک اور احادیثِ صحیحہ کے تتبع سے علما نے ننانوے ناموں کا پتا چلایا ہے اور ان کو الگ الگ ایک ایک کر کے گنایا ہے، یہ تمام نام وہ ہیں جو یا بطورِ علم اور بطورِ صفت قرآن پاک میں آئے ہیں یا افعال کی حیثیت سے خدا کی طرف منسوب ہوئے ہیں اور یا آنحضرت ﷺ نے دعاؤں میں ان کی تعلیم کی ہے۔ ہم ذیل میں بہ ترتیب ایک ایک نام لکھتے ہیں اور اس کی مختصر لغوی تشریح کرتے ہیں تا کہ معلوم ہو سکے کہ آنحضرت ﷺ نے خدا کا جو تخیل اور عقیدہ اپنے پیروؤں کو سکھایا وہ کتنا وسیع، کتنا بلند، کتنا منزہ اور پاکیزہ ہے، علما نے ان ناموں کو یا ان صفات کو مختلف معنوی مناسبتوں سے ترتیب دیا ہے، لیکن ہم نے ان کے صرف تین مرتبے قرار دیے ہیں، ایک وہ جن سے اس کے رحم و کرم، عفو و درگزر یعنی صفاتِ جمالی ظاہر ہوتے ہیں، دوسرے وہ جن سے اس کی شہنشاہی، جلال و جبروت اور حکومت و استیلا کا اظہار ہوتا ہے اور ہم ان کو صفاتِ جلالی کہتے ہیں، تیسرے، وہ اسماء اور صفات جن سے اس کی تنزیہہ، بلندیِ کمالات کی جامعیت اور ہر قسم کے اوصافِ حسنہ اور محامدِ عالیہ کا ثبوت ملتا ہے اور ان کو ہم صفاتِ کمالی سے تعبیر کرتے ہیں۔

الغرض خدا کے تمام اسماء و صفات ان ہی تین عنوانوں کی تشریح ہیں یعنی یا تو ان سے خدا کی رحیمی و کریمی ظاہر ہوتی ہے یا اس کے جاہ و جلال کا اظہار ہوتا ہے اور یا اس کی تنزیہہ و کمال کا اثبات ہوتا ہے۔

صفاتِ جمالی

یعنی وہ اسماء و صفات جن سے خدا کے رحم و کرم اور شفقت و محبت کا اظہار ہوتا ہے۔

﴿اَللّٰہُ﴾ ”یہ خدا کا وہ نام ہے جو قرآنِ پاک میں بطورِ علم ہر جگہ استعمال کیا گیا ہے، اسلام سے پہلے بھی یہ عرب میں خدائے برحق کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ اس لفظ کی لغوی تحقیق میں بہت کچھ اختلاف کیا گیا ہے، کسی نے کہا ہے کہ اس کے معنی اس ہستی کے ہیں جس کی پرستش کی جائے، بعضوں نے کہا ہے کہ وہ جس کی حقیقت و معرفت میں عقلِ انسانی حیران و سرگرداں ہو۔ دوسروں کی تحقیق ہے کہ اس کے معنی ہیں وہ جو اپنی مخلوقات کے ساتھ ایسی

(۱) تمہید ابوشکور سالمی القول الثالث فی عدد الاسماء یہ ماتریدیہ کی مشہور مستند کتاب ہے۔

شفقت اور محبت رکھے جو ماں کو اپنے بچوں کے ساتھ ہوتی ہے۔ اس اخیر تعبیر کی بنا پر اللہ کے معنی پیار کرنے والے یا پیارے کے ہیں۔"

﴿اَلرَّحْمٰنُ﴾ "اللہ کے بعد یہ دوسرا لفظ ہے جس کو علم کی حیثیت حاصل ہے' اس کے معنی رحم والے کے ہیں' یہ گزر چکا ہے کہ رحمان کا لفظ اسلام سے پہلے صرف عیسائی عربوں میں مستعمل تھا' عام اہلِ عرب میں اللہ کا لفظ مستعمل تھا' قرآنِ مجید نے ہر سورہ کے شروع میں نیز اور مقامات میں اللہ کو الرحمٰن کہہ کر سینکڑوں جگہ استعمال کیا ہے' بظاہر تو یہ وصف موصوف کی معمولی ترکیب ہے مگر درحقیقت یہ بدل و مبدل منہ ہیں اور اس رمز کی طرف اشارہ ہے کہ عام عربوں کا اللہ اور عرب عیسائیوں کا رحمان دو اجنبی ذاتیں اور دو بیگانہ ہستیاں نہیں بلکہ ایک ہی حقیقت کی دو تعبیریں اور ایک ہی ہستی کے دو نام ہیں۔ اس طرح ان دو مختلف قوموں کو وحدتِ الٰہی کی دعوت دی گئی جو ناموں کے تعدد کو حقیقت کے تعدد کا مرادف سمجھتی تھیں اور کہا گیا۔"

﴿قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ اَيًّامَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى﴾ (بنی اسرائیل:۱۱۰)

"اللہ کہو یا رحمٰن جو چاہو کہو اسی کے لیے سب اچھے نام ہیں۔"

﴿اَلرَّحِيْمُ﴾ "رحم کرنے والا' رحم کا لفظ اس رحم سے نکلا ہے جس سے بچہ کی پیدائش ہوتی ہے' اس لیے اصل لغت کے لحاظ سے اس لفظ میں بھی مربیانہ محبت کا جذبہ نمایاں ہے ﴿اَلرَّحْمٰنُ﴾ اور ﴿اَلرَّحِيْمُ﴾ خدا کی وہ دو صفتیں ہیں جن سے قرآن کا صفحہ صفحہ منور ہے' کائنات میں جو کچھ ہوا' جو کچھ ہے جو کچھ ہوگا' وہ اس کی رحمانی اور رحیمی ان ہی دو صفتوں کا پرتو ہے' اس عالم اور اس عالم دونوں میں اس کی ان ہی دونوں شانوں کا ظہور ہے اور ہو گا۔"

﴿اَلرَّبُّ﴾ "پرورش کرنے والا' یعنی ہستی کے اول نقطہ سے لے کر آخر منزل تک ہر لمحہ اور ہر لحظہ مخلوقات کی نشوونما اور ظہور و ترقی کا ذمہ دار۔"

﴿اَللَّطِيْفُ﴾ "لطف والا' مہربان۔"

﴿اَلْعَفُوُّ﴾ "معاف کرنے والا' درگزر کرنے والا۔"

﴿اَلْوَدُوْدُ﴾ "محبوب' محبت کرنے والا' پیار کرنے والا۔"

﴿اَلسَّلَامُ﴾ "امن و سلامتی' صلح و آشتی' ہر عیب سے پاک و صاف۔"

﴿اَلْمُحِبُّ﴾ "محبت والا' پیار والا' چاہنے والا۔"

﴿اَلْمُؤْمِنُ﴾ "امان دینے والا' امن بخشنے والا' ہر خوف سے بچانے والا اور ہر مصیبت سے نجات دینے والا۔"

﴿اَلشَّكُوْرُ﴾ "اپنے بندوں کے نیک عمل کو قبول اور پسند کرنے والا۔"

﴿اَلْغَفُوْرُ وَ الْغَفَّارُ﴾ "معاف کرنے والا' گناہ بخشنے والا' درگزر کرنے والا۔"

﴿اَلْحَفِیْظُ وَ الْحَافِظُ﴾ ''حفاظت کرنے والا' نگہبان' بچانے والا۔''

﴿اَلْوَهَّابُ﴾ ''دینے والا' عطا کرنے والا' بخشنے والا۔''

﴿اَلرَّازِقُ وَ الرَّزَّاقُ﴾ ''روزی دینے والا' نشوونما کا سامان بہم پہنچانے والا۔''

﴿اَلْوَلِیُّ﴾ ''دوست' حمایتی' طرف دار۔''

﴿اَلرَّءُوْفُ﴾ ''مہربان' نرمی اور شفقت کرنے والا۔''

﴿اَلْمُقْسِطُ﴾ ''انصاف والا' عادل۔''

﴿اَلْهَادِیُّ﴾ ''راہ دکھانے والا' رہنما۔''

﴿اَلْکَافِیُّ﴾ ''اپنے بندوں کی ہر ضرورت کے لیے کافی۔''

﴿اَلْمُجِیْبُ﴾ ''قبول کرنے والا' دعاؤں کا سننے والا۔''

﴿اَلْحَلِیْمُ﴾ ''بردبار' بندوں کی برائیوں سے چشم پوشی کرنے والا۔''

﴿اَلتَّوَّابُ وَ قَابِلُ التَّوْبِ﴾ ''توبہ قبول کرنے والا' گہنگار کے گناہوں سے درگزر کر کے دوبارہ اس کی طرف رجوع ہونے والا۔''

﴿اَلْحَنَّانُ﴾ ''ماں کی طرح بچوں پر شفقت کرنے والا۔''

﴿اَلْمَنَّانُ﴾ ''احسان کرنے والا۔''

﴿اَلنَّصِیْرُ﴾ ''مدد کرنے والا۔''

﴿ذُو الطَّوْلِ﴾ ''کرم والا۔''

﴿ذُو الْفَضْلِ﴾ ''فضل والا۔''

﴿اَلْکَفِیْلُ﴾ ''بندوں کی کفالت کرنے والا۔''

﴿اَلْوَکِیْلُ﴾ ''بندوں کی ضرورتوں کا ذمہ لینے والا' سامان کرنے والا۔''

﴿اَلْمُقِیْتُ﴾ ''روزی پہنچانے والا۔''

﴿اَلْمُغِیْثُ﴾ ''فریاد کو پہنچنے والا' فریاد سننے والا۔''

﴿اَلْمُجِیْرُ﴾ ''پناہ دینے والا۔''

﴿اَلْمُغْنِیُ﴾ ''بندوں کو اپنے سوا ہر چیز سے بے نیاز کرنے والا۔''

صفاتِ جلالی

یعنی وہ اسماء وصفات جن سے خدا کی بڑائی' کبریائی' شہنشاہی کا اظہار ہوتا ہے۔

﴿اَلْمَلِکُ وَ الْمَلِیْکُ﴾ ''بادشاہ' فرمان روا۔''

﴿اَلْعَزِیْزُ﴾ ''غالب جس پر کوئی دسترس نہ پائے۔''
﴿اَلْقَاهِرُ وَ الْقَهَّارُ﴾ ''جس کے حکم سے کوئی باہر نہیں جا سکتا' سب کو دبا کر اپنے قابو میں رکھنے والا۔''
﴿اَلْمُنْتَقِمُ﴾ ''سزا دینے والا' برائیوں کی جزا دینے والا۔''
﴿اَلْجَبَّارُ﴾ ''جبروت والا جس کے سامنے کوئی دوسرا دم نہ مار سکے' جس سے کوئی سرتابی نہ کر سکے۔''
﴿اَلْمُهَیْمِنُ﴾ ''سب پر شاہد اور گواہ اور دلیل۔''
﴿اَلْمُتَكَبِّرُ﴾ ''اپنی بڑائی دکھانے والا' کبریائی والا' سخت سزا دینے والا۔''
﴿شَدِیْدُ الْعِقَابِ﴾ ''سخت سزا والا۔''
﴿شَدِیْدُ الْبَطْشِ﴾ ''بڑی گرفت والا' جس سے کوئی چھوٹ نہیں سکتا۔''

نکتہ: خدا کے صفاتِ جلالی کا ذکر زیادہ تر تورات میں ہے لیکن صحیفۂ محمدی میں جہاں کہیں خدا کی ان جلالی صفتوں کا ذکر آتا ہے ہمیشہ ان کے ساتھ ساتھ خدا کے عادل' حکیم و علیم ہونے کا بھی ذکر ہوتا ہے' جس سے انسان کی اس غلط فہمی کا مٹانا مقصود ہے کہ خدا کی ان صفتوں کا یہ منشا نہیں ہے کہ وہ نعوذ باللہ ایک لاابالی کی طرح دم کے دم میں جو چاہے کر گزرتا ہے بلکہ اس کا قہر' اس کا غلبہ' اس کا انتقام اور اس کی گرفت' عدل و انصاف اور حکمت و مصلحت پر مبنی ہوتی ہے اور اس طرح ان جلالی ناموں سے بے رحمی اور ظالمانہ سخت گیری کا جو شبہ پیدا ہو سکتا ہے وہ دور ہو جاتا ہے فرمایا:

﴿اَنَّ اللّٰهَ لَیْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِ﴾ (آل عمران:۱۸۲)
''بے شک خدا بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں۔''

اسی لیے اللہ تعالیٰ کے وصف میں ﴿عَزِیْزٌ﴾ (غالب) کے ساتھ ﴿حَكِیْمٌ﴾ (حکمت والا) ہمیشہ قرآن میں آیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ خدا کے عذاب کے ذکر کے ساتھ اس کی رحمت کا تذکرہ بھی ہمیشہ قرآن میں کیا جاتا ہے اور دوزخ کے بیان کے ساتھ جنت کا سماں بھی لازمی طور پر دکھایا جاتا ہے۔

جہاں یہ کہا گیا کہ ﴿وَ مَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ﴾ وہیں یہ بھی کہا گیا ﴿رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا بَیْنَهُمَا الْعَزِیْزُ الْغَفَّارُ﴾ (صٓ:۶۵) ''قوموں کی تباہی و بربادی کا ذکر کیا گیا تو فرمایا۔''
﴿وَ مَا اللّٰهُ یُرِیْدُ ظُلْمًا لِّلْعِبَادِ﴾ (مؤمن:۳۱)
''اور اللہ بندوں پر ظلم نہیں کرنا چاہتا۔''

اس کی صفت ﴿ذُوْ عِقَابٍ اَلِیْمٍ﴾ دردناک عذاب دینے والا جہاں بیان کی گئی تو اس سے پہلے ﴿لَذُوْ مَغْفِرَةٍ﴾ یقینی بخشش والا (حم السجدۃ:۴۳) بھی فرما دیا گیا' غرض صفاتِ جلالی کے بیان میں یہ رعایت پیش نظر رکھی گئی ہے ان کے ساتھ یا آگے پیچھے خدا کی صفاتِ جمالی کا بھی ذکر ہو' تاکہ خوف و خشیت کے ساتھ اس کی محبت اور لطف و کرم کے جذبات بھی نمایاں ہوں۔

صفاتِ کمالی

یعنی وہ اسماء وصفات جن سے خدا کی خوبی، بڑائی، بزرگی اور ہر وصف میں اس کا کامل ہونا ظاہر ہوتا ہے، اس طرح کے اسماء وصفات پانچ قسم کے ہیں، ایک وہ جو اس کی وحدانیت سے متعلق ہیں، دوسرے وہ جو وجود سے تعلق رکھتے ہیں تیسرے، اس کے علم سے، چوتھے اس کی قدرت سے اور پانچویں اس کی تنزیہہ اور پاکی سے۔

صفاتِ وحدانیت

یعنی وہ صفتیں جو خدا کی یکتائی اور بے مثالی کو ظاہر کرتے ہیں، اور وہ یہ ہیں:

﴿اَلْوَاحِدُ﴾ ''ایک۔''

﴿اَلْاَحَدُ﴾ ''ایک۔''

﴿اَلْوِتْرُ﴾ ''طاق جس کا کوئی جوڑ انہیں۔''

صفاتِ وجودی

یعنی وہ صفتیں جن سے اس کا وجود، بقا و دوام، ازلیت اور بے زوالی ظاہر ہوتی ہے:

﴿اَلْمَوْجُوْدُ﴾ ''وجود والا، ہست۔''

﴿اَلْحَیُّ﴾ ''ہمیشہ زندہ، غیر فانی۔''

﴿اَلْقَدِیْمُ﴾ ''وہ جس سے پہلے کوئی دوسرا موجود نہیں، جو ہمیشہ سے ہے۔''

﴿اَلْقَیُّوْمُ﴾ ''جو اپنے سہارے تمام کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے۔''

﴿اَلْبَاقِیُّ﴾ ''جس کو ہمیشہ بقا ہے۔''

﴿اَلدَّآئِمُ﴾ ''ہمیشہ رہنے والا۔''

﴿اَلْاَوَّلُ﴾ ''وہ پہلا جس کے پہلے کوئی نہیں۔''

﴿اَلْاٰخِرُ﴾ ''وہ پچھلا جو سب کے فانی ہونے کے بعد بھی ہمیشہ باقی رہے گا۔''

﴿اَلْمُقَدَّمُ﴾ ''جو سب کے آگے سے ہے۔''

﴿اَلْمُؤَخَّرُ﴾ ''جو سب سے پیچھے رہ جائے گا۔''

﴿اَلظَّاهِرُ﴾ ''جس کا وجود کھلا اور نمایاں ہے (یعنی جو اپنے کاموں اور قدرتوں کے لحاظ سے ظاہر ہے)۔''

﴿اَلْبَاطِنُ﴾ ''جو چھپا اور مخفی ہے (یعنی جو اپنی ذات کے لحاظ سے پوشیدہ ہے)۔''

صفاتِ علم

یعنی وہ صفتیں جو اس کے ہر چیز سے باخبر اور آگاہ ہونے کو ظاہر کرتی ہیں:

﴿اَلْخَبِیْرُ﴾ ''خبر رکھنے والا۔''

﴿اَلْعَلِیْمُ﴾ ''جاننے والا۔''

﴿عَلَّامُ الْغُیُوْبِ﴾ ''جو باتیں سب سے پوشیدہ ہیں ان کو جاننے والا۔''

﴿عَلِیْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ﴾ ''دلوں کے چھپے ہوئے بھید کو جاننے والا۔''

﴿اَلسَّمِیْعُ﴾ ''سننے والا۔''

﴿اَلْبَصِیْرُ﴾ ''دیکھنے والا۔''

﴿اَلْمُتَکَلِّمُ﴾ ''بولنے والا' اپنے علم اور ارادہ کو ظاہر کرنے والا۔''

﴿اَلْوَاجِدُ﴾ ''پانے والا' جس کے علم سے کوئی چیز گم نہیں۔''

﴿اَلشَّہِیْدُ﴾ ''حاضر' جس کے سامنے کوئی چیز غائب نہیں۔''

﴿اَلْحَسِیْبُ﴾ ''حساب کرنے والا' یعنی جن چیزوں کا علم حساب کے ذریعہ سے حاصل کیا جاتا ہے یعنی وزن اور مقدار' ان کا بھی جاننے والا۔''

﴿اَلْمُحْصِیْ﴾ ''گننے والا' یعنی جن چیزوں کا علم گن کر حاصل کیا جاتا ہے یعنی اعداد ان کا بھی جاننے والا۔''

﴿اَلْمُدَبِّرُ﴾ ''تدبیر کرنے والا' انتظام کرنے والا۔''

﴿اَلْحَکِیْمُ﴾ ''حکمت والا' عقل والا' سب کاموں کو مصلحت سے کرنے والا۔''

﴿اَلْمُرِیْدُ﴾ ''ارادہ کرنے والا' مشیت والا۔''

﴿اَلْقَرِیْبُ﴾ ''نزدیک' جو اپنے علم کے لحاظ سے گویا سب کے پاس ہے۔''

قدرت

یعنی وہ صفتیں جن سے اس کی قدرت کی وسعت کا اظہار ہوتا ہے۔

﴿اَلْفَاتِحُ وَ الْفَتَّاحُ﴾ ''ہر مشکل کو کھولنے والا۔''

﴿اَلْقَدِیْرُ وَ الْقَادِرُ﴾ ''قدرت والا۔''

﴿اَلْمُقْتَدِرُ﴾ ''اقتدار والا' جس کے سامنے کوئی چون و چرا نہیں کر سکتا۔''

﴿اَلْقَوِیُّ﴾ ''زبردست' جس کے سامنے کسی کا بس نہیں چل سکتا۔''

﴿اَلْمَتِیْنُ﴾ ''مضبوط' جس میں کوئی کمزوری نہیں۔''

﴿اَلْجَامِعُ﴾ ''جمع کرنے والا' متفرق اور پراگندہ چیزوں کو اکٹھا کرنے والا۔''

﴿اَلْبَاعِثُ﴾ ''اٹھانے والا' مردوں کو قبروں سے اٹھانے والا' یا دنیا میں ہر واقعہ اور ہر حادثہ کا محرک

اول۔''

﴿مَالِکُ الْمُلْکِ﴾ ''سلطنت کا مالک' جس کے سامنے کسی کی کوئی ملکیت نہیں۔''

﴿اَلْبَدِیْعُ﴾ ''نئی نئی چیزیں ایجاد کرنے والا۔''

﴿اَلْوَاسِعُ﴾ ''سمانے والا' جو ہر چیز کو سمائے ہوئے ہے۔''

﴿اَلْمُحِیْطُ﴾ ''احاطہ کرنے والا' جو ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے' کوئی اس کے احاطہ سے باہر نہیں۔''

﴿اَلْمُحْیِیْ وَ الْمُمِیْتُ﴾ ''جلانے والا اور مارنے والا۔''

﴿اَلْقَابِضُ وَ الْبَاسِطُ﴾ ''سمیٹنے اور پھیلانے والا۔''

﴿اَلْمُعِزُّ وَ الْمُذِلُّ﴾ ''عزت دینے والا اور ذلت دینے والا۔''

﴿اَلْخَافِضُ وَ الرَّافِعُ﴾ ''نیچا کرنے والا اور اونچا کرنے والا۔''

﴿اَلْمُعْطِیْ وَ الْمَانِعُ﴾ ''دینے والا اور روک لینے والا۔''

﴿اَلنَّافِعُ وَ الضَّآرُّ﴾ ''نفع پہنچانے والا اور نقصان پہنچانے والا' یعنی نفع اور ضرر دونوں اسی کے ہاتھ میں ہیں۔''

﴿اَلْمُبْدِئُ وَ الْمُعِیْدُ﴾ ''جو چیز پہلے سے موجود نہ ہو اس کو وجود میں لانے والا' اور جو ہو کر فنا کر دی گئی اس کو پھر دوبارہ وجود میں لانے والا۔''

نکتہ: اس قسم کی صفتیں جن میں بظاہر قبح نظر آتا ہے جیسے ﴿اَلضَّآرُّ﴾ ''نقصان پہنچانے والا۔'' ﴿اَلْمُذِلُّ﴾ ''ذلت دینے والا۔'' ﴿اَلْخَافِضُ﴾ ''پست کرنے والا۔'' ﴿اَلْمَانِعُ﴾ ''روکنے والا۔'' وغیرہ ان کا تنہا استعمال چونکہ غلط فہمی پیدا کرنے والا ہے۔ اس لیے جب تک ان کے ساتھ ان کے مقابل کی صفت نہ بولی جائے۔ ان کا استعمال جائز نہیں رکھا گیا ہے یعنی خدا کو صرف ﴿اَلضَّارُّ اَلْخَافِضُ اَلْمَانِعُ اَلْمُذِلُّ﴾ کہنا درست نہیں جب تک اس کے ساتھ اس کے دوسرے پہلو کو بھی نہ ملایا جائے۔ یعنی ﴿اَلضَّآرُّ﴾ کے ساتھ ﴿اَلنَّافِعُ﴾ ﴿اَلْخَافِضُ﴾ کے ساتھ ﴿اَلرَّافِعُ﴾ ﴿اَلْمَانِعُ﴾ کے ساتھ ﴿اَلْمُعْطِیْ﴾ اور ﴿اَلْمُذِلُّ﴾ کے ساتھ ﴿اَلْمُعِزُّ﴾ جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے قرآنِ پاک اور احادیث دونوں میں ان صفات کے استعمال میں رعایت ملحوظ رکھی گئی ہے' کیونکہ تنہا نقصان پہنچانے والا' ذلت دینے والا اور روکنے والا کوئی خوبی نہیں' بلکہ ایک طرح کی برائی ہے' ہاں نقصان پہنچانے والا' عزت و ذلت دینے والا اور روکنے والا دونوں کو ملا کر کہا جائے تو جائز ہوگا' اس سے مقصود خدا کی قدرت کی وسعت ہے اگر کوئی ایسا نفع پہنچانے والا ہے' جس میں نقصان پہنچانے کی قدرت ہی نہیں یا ایسا عزت دینے والا جس میں ذلیل کرنے کی استطاعت ہی نہیں تو وہ اس عزت دینے اور نفع پہنچانے پر مجبور و مضطر ہوگا' اور اس کی قدرت کا یہ کمال نہ ہوگا۔ البتہ جو نقصان پہنچانے کی طاقت رکھنے کے باوجود نفع پہنچاتا اور ذلت دے سکنے کے باوصف عزت دیتا ہے اس کا کمال ہر شخص کو تسلیم کرنا پڑتا ہے۔

صفاتِ تنزیہہ

یعنی وہ صفات جو اس کی بڑائی' کبریائی' پاکی اور نیکی اور عیب ونقصان سے اس کی برأت کو ظاہر کرتی ہیں۔

﴿اَلْعَلِیُّ﴾ مرتبہ والا۔

﴿اَلْعَظِیْمُ﴾ عظمت والا۔

﴿اَلْکَبِیْرُ﴾ بڑا۔

﴿اَلرَّفِیْعُ﴾ بلند۔

﴿اَلْجَلِیْلُ﴾ بزرگ۔

﴿اَلْکَرِیْمُ﴾ شریف۔

﴿اَلْغَنِیُّ﴾ بے نیاز۔

﴿اَلصَّادِقُ﴾ سچا' راست باز۔

﴿اَلْمَاجِدُ﴾ عزت والا۔

﴿اَلْحَمِیْدُ﴾ تعریف والا۔

﴿اَلْقُدُّوْسُ﴾ پاک۔

﴿اَلْحَقُّ﴾ سچا اور اصل یعنی یہ کہ اس کے سوا سب باطل ہیں۔

﴿اَلْجَمِیْلُ﴾ اچھا۔

﴿اَلْبَرُّ﴾ نیک۔

﴿اَلْعَدْلُ﴾ عادل۔

﴿سُبُّوْحٌ﴾ ہر عیب سے پاک۔

﴿اَلصَّمَدُ﴾ بزرگی کی ہر صفت میں کامل۔

﴿اَلرَّشِیْدُ﴾ سیدھی راہ چلنے والا' نہ بہکنے والا۔

ان تعلیمات کا اثر اخلاقِ انسانی پر

اللہ تعالیٰ کے ان اسماء وصفات کا عقیدہ دینِ محمدی میں محض نظری نہیں بلکہ عملی حیثیت بھی رکھتا ہے یعنی اس کے یہ محامد واوصاف اخلاقِ انسانی کا معیار ہیں' ان اوصاف کو چھوڑ کر جو اس ذوالجلال کے لیے خاص ہیں' اور جو بندہ کی حیثیت اور طاقت سے زیادہ ہیں بقیہ اوصاف ومحامد انسان کے لیے قابلِ نقل ہیں کہ وہ خدا کے محامد و اوصاف سے دور کی نسبت رکھتے ہیں' اس لیے انسان پر فرض ہے کہ اگر وہ خدا سے نسبت پیدا کرنا چاہتا ہے تو اپنے اندر اس کے محامد واوصاف سے نسبت پیدا کرے' اور ان کو خوبیوں کا انتہائی معیار جان کر ان کی نقل وپیروی کی

خواہش کرے' محامدِ الٰہی گویا استادِ اعلیٰ کی وصلی ہے جس کو دیکھ کر شاگرد کو اپنے خط کی خوبی میں ترقی کرنی چاہیے' اس لیے انسان کو بھی اپنے حرف کے لکھنے (محامدِ الٰہی کی نقل اتارنے) میں ایک نظر اس استادِ ازل کی وصلی پر ڈال لینی چاہیے تاکہ معلوم ہو کہ اس کی ذاتی مشق کہاں تک اصلی وصلی کے مطابق ہے۔

گزر چکا ہے کہ قرآن کا پہلا سبق یہ ہے کہ بحکم ﴿اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً﴾ (البقرۃ:۳۱) آدم کا بیٹا زمین میں خدا کا خلیفہ اور نائب بنایا گیا ہے' خلیفہ اور نائب میں اصل کے اوصاف و محامد کا پرتو جتنا زیادہ نمایاں ہوگا' اتنا ہی وہ اپنے اندر اس منصب کا استحقاق زیادہ ثابت کرے گا اور نیابت کے فرائض زیادہ بہتر ادا کر سکے گا' یہاں تک کہ اس میں وہ جلوہ بھی نمایاں ہوگا جب وہ سرتاپا خدائی رنگ میں رنگ کر نکھر جائے گا۔

﴿صِبْغَةَ اللّٰهِ وَ مَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً﴾ (البقرۃ :۱۳۸)

''خدا کا رنگ اور خدا کے رنگ سے کس کا رنگ اچھا ہے۔''

تمام اہلِ تفسیر متفق ہیں کہ اس ''خدائی رنگ'' سے مقصود خدا کا ''دینِ فطرت'' ہے۔

یہ حدیث اوپر گزر چکی ہے کہ ﴿اِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ اٰدَمَ عَلٰی صُوْرَتِهٖ﴾ خدا نے آدمؑ کو اپنی صورت پر پیدا کیا اور ساتھ ہی اس کی تشریح بھی گزری ہے کہ اس ''صورت'' سے مقصود جسمانی نہیں بلکہ معنوی شکل و صورت ہے' یعنی یہ کہ خدا نے انسان میں اپنے صفاتِ کاملہ کا عکس جلوہ گر کیا ہے اور ان کے قبول کرنے کی صلاحیت عطا کی ہیں اور ان میں حدِ بشری تک ترقی کی استعداد بخشی ہے' اور انسان کو اخلاق و صفت میں ملاءِ اعلیٰ سے تشبیہ اور ہم شکلی کا جوہر مرحمت فرمایا ہے اور یہی صوفیہ اور خاصان خدا کے اس مقولہ تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰهِ۔ خدا کے اخلاق اپنے اندر پیدا کرو' کا مطلب ہے۔ حدیث میں یہی مفہوم بروایتِ طبرانی ان الفاظ میں ادا کیا گیا ہے کہ حُسْنُ الْخُلُقِ خُلُقِ اللّٰهِ الْاَعْظَمِ۔ حسن خلق خدا تعالیٰ کا خلق عظیم ہے۔ (۱)

اللہ تعالیٰ کی صفاتِ کاملہ کی تین قسمیں اوپر بیان ہوئی ہیں' جلالی' کمالی اور تنزیہی' صفاتِ جلالی جو کبریائی' عظمت' شہنشاہی اور بڑائی کے اوصاف ہیں' اللہ تعالیٰ کے سوا مخلوقات ان کی مستحق نہیں' اور نہ یہ اوصافِ بندگی و عبودیت کے رتبہ کے مناسب ہیں' ان کا انعکاس یہ ہے کہ بندوں میں ان کے مقابل کے صفات پیدا ہوں' یعنی عاجزی' تواضع' فروتنی اور خاکساری' اسی لیے ترفع' تکبر اور بڑائی کا اظہار منع ہے اور اسی لیے آدم جس نے فروتنی اختیار کی اور عجز و قصور کا اعتراف کیا' وہ مغفرت کے خلعت سے سرفراز ہوا' اور شیطان جس نے ترفع اور غرور ظاہر کیا دائمی لعنت کا مستحق ٹھہرا۔

﴿اَبٰی وَ اسْتَكْبَرَ وَ كَانَ مِنَ الْكَافِرِیْنَ﴾ (البقرۃ :۳۴)

''اس نے (آدم کو سجدہ سے) انکار کیا اور غرور کیا اور کافروں میں سے ہو گیا۔''

قرآن پاک میں ہے کہ بڑائی اور کبریائی صرف خدا کے لیے ہے اس کے سوا کوئی اور اس کا مستحق نہیں۔

---

(۱) کنز العمال ج ۱۲ ص ۲ بروایت حضرت عمار بن یاسر۔

﴿وَ لَهُ الْكِبْرِيَآءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ﴾ (الجاثیۃ:۳۷)

''اور آسمانوں اور زمین میں اسی کے لیے بڑائی ہے۔''

صحیح مسلم میں (۱) ابوسعید خدریؓ اور ابوہریرہؓ دو صحابیوں سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا کہ عزت اس کا لباس اور کبریائی اس کی چادر ہے (خدا فرماتا ہے) تو جو کوئی عزت و کبریائی میں میرا حریف بنے گا میں اسے سزا دوں گا۔ دوسری جگہ ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ خدا کے نزدیک سب سے براوہ ہے جو اپنا نام بادشاہوں کا بادشاہ اور شہنشاہ رکھتا ہے' خدا کے سوا کوئی بادشاہ اور مالک نہیں۔ (۲) ﴿اَلْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ﴾ (حشر:۲۳) اسی کی شان ہے' البتہ اللہ تعالیٰ اپنی عزت وجلال اور قوت و جبروت کا فیضان بعض بندوں اور امتوں پر نازل کرتا ہے اور وہ ان کو طاقت اور قوت اور بادشاہی عطا کرتا ہے' مگر اس نوازش کے بعد بھی نیک بندوں اور صالح امتوں کا فرض یہی ہے کہ عین اس وقت جب ان کے دست و بازو سے قوتِ حق اور ربانی جاہ وجلال کا اظہار ہو رہا ہو' ان کی پیشانیاں فرطِ عبودیت سے اس کے آگے جھکی ہوں' اور سرِ نیاز اظہارِ بندگی کے لیے اس کے سامنے خم ہوں کہ عزت وجلال خاص خدا کی شان تھی جس کا فیضان رسول پر ہوا اور رسول کی وساطت سے مومنوں پر ہوا' یہ ترتیب خود قرآن میں ملحوظ رکھی گئی ہے۔

﴿وَ لِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَ لِرَسُوْلِهٖ وَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ﴾ (المنافقون:۸)

''اور عزت خدا کے لیے ہے اور اس کے رسول کے لیے اور مومنوں کے لیے ہے۔''

حاکم میں ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ کے تین کپڑے ہیں' وہ اپنی عزت وجلال کا ازار باندھتا ہے اور اپنی رحمت کا جامہ پہنتا ہے' اور اپنی کبریائی کی چادر اوڑھتا ہے' تو جو شخص اس عزت کے سوا جو خدا کی طرف سے اس کو عنایت ہوئی ہے معزز بننا چاہتا ہے تو وہی وہ شخص ہے جس کو قیامت میں کہا جائے گا (اس کا) مزہ چکھ تو معزز اور شریف بنتا تھا۔'' (قرآن)۔ اور جو انسانوں پر رحم کرتا ہے خدا اس پر رحم کرتا ہے' کیونکہ اس نے وہ جامہ پہنا جس کا پہننا اس کو روا تھا اور جو کبریائی کرتا ہے وہ خدا کی اس چادر کو اتارنا چاہتا ہے' جو خدا ہی کے لیے تھی۔ (۳) خدا کے صفاتِ کمال میں سے وحدانیت اور بقائے ازلی وابدی کے سوا کہ ان سے تمام مخلوقات اور ممکنات طبعاً محروم ہیں بقیہ اوصاف کے فیضان سے انسان مشرف ہوتا ہے' صفاتِ تنزیہی مثلاً قدرت' علم' سمع' بصر' کلام وغیرہ سے بھی مخلوقات تمام تر محروم ہیں' ان کی تنزیہہ یہی ہے کہ وہ خدا کے عصیان' نافرمانی اور گنہگاری کے عیب سے بری اور پاک ہوں۔

خدا کے صفاتِ جمالی وہ اصلی اوصاف ہیں جن کے فیضان کا دروازہ ہر صاحبِ توفیق کے لیے حسبِ

(۱) کتاب الادب باب الکبر ج ۲ ص ۴۰۰ مصر۔
(۲) صحیح بخاری و مسلم کتاب الادب
(۳) کنز العمال ج ۲ ص ۱۷۹ و مستدرک حاکم۔

استعداد کھلا ہوا ہے' ان صفات کا سب سے بڑا مظہر عفو و درگزر ہے' عیسائیوں کی عام دعا میں ایک فقرہ ہے کہ خداوند! تو ہمارے گناہوں کو معاف کر' جس طرح ہم اپنے قرض داروں کو معاف کرتے ہیں' اسلام نے اس الٹی تشبیہ کو جائز نہیں رکھا ہے' اس کے ہاں یہ ہے کہ اے انسان تو اپنے مجرموں کو معاف کر کہ خدا تیرے گناہوں کو معاف کرے' آنحضرت ﷺ نے فرمایا جو کوئی اپنے بھائی کے گناہ پر پردہ ڈالے گا' خدا اس کے گناہوں پر پردہ ڈالے گا۔ (۱)

قرآن کہتا ہے کہ تم دوسروں کو معاف کرو کہ خدا تم کو معاف کرتا ہے۔

﴿اِنْ تُبْدُوْا خَيْرًا اَوْ تُخْفُوْهُ اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيْرًا﴾ (النساء:۱۴۹)

''اگر تم کوئی نیکی دکھا کر یا چھپا کر کرو یا کسی کی برائی معاف کرو تو اللہ (بھی) معاف کرنے والا' قدرت والا ہے۔''

ایک دفعہ عہدِ نبوت میں بارگاہِ عدالت قائم تھی' ایک مجرم کو سزا دی جا رہی تھی' سزا کا منظر دیکھ کر حضور کے چہرہ کا رنگ متغیر ہو رہا تھا' اداشناسوں نے سبب دریافت کیا تو فرمایا کہ امام تک معاملہ پہنچنے سے پہلے ہی اپنے بھائیوں کو معاف کر دیا کرو' خدا معاف کرتا ہے' اور عفو و درگزر پسند کرتا ہے تو تم بھی معاف اور درگزر کیا کرو' کیا تمہیں یہ پسند نہیں کہ خدا تمہیں بھی معاف کرے' وہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔ (۲)

آنحضرت ﷺ ایک دفعہ صحابہؓ کے مجمع میں فرما رہے تھے کہ جس کے دل میں غرور کا ایک ذرہ بھی ہوگا' وہ بہشت میں داخل نہ ہوگا' ایک صحابیؓ نے عرض کی یا رسول اللہ! انسان چاہتا ہے کہ اس کے کپڑے اچھے ہوں' اس کا جوتا اچھا ہو' کیا یہ بھی غرور ہے' فرمایا:

((اِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ جَمِيْلٌ يُحِبُّ الْجَمَالَ)) (۳)

''اللہ تعالیٰ اچھا ہے. جمال والا ہے اچھائی اور جمال ہی کو پسند کرتا ہے۔''

یہ غرور نہیں' غرور حق کو پامال کرنا اور انسانوں کو دبانا ہے' یہی روایت حدیث کی دوسری کتابوں میں ان الفاظ کے ساتھ ہے' خدا جمال والا ہے' وہ جمال کو پسند کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ اس کے بندہ پر اس کی نعمت کا اثر ظاہر ہو (۴) یہ روایت بھی ہے ''خدا جمیل ہے' جمال کو پسند کرتا ہے' وہ سخی ہے' سخاوت کو پسند کرتا ہے' وہ صاف ستھرا ہے' صفائی اور ستھرے پن کو پسند کرتا ہے۔'' (۵) روایت کے یہ الفاظ بھی آئے ہیں۔'' وہ جمیل ہے. جمال کو پسند کرتا ہے' اخلاقِ عالیہ سے محبت اور بداخلاقیوں سے نفرت رکھتا ہے' (۶) ایک موقع پر آنحضرت ﷺ حضرت عائشہؓ کو نصیحت

---

(۱) صحیح مسلم کتاب البر والصلۃ۔
(۲) مستدرک للحاکم جلد ۴ ص ۳۸۲ کتاب الحدود۔
(۳) صحیح مسلم کتاب الایمان و ترمذی باب الکبر۔
(۴) کنز العمال کتاب الزینۃ بحوالہ شعب الایمان بیہقی۔
(۵) کنز العمال کتاب الزینۃ بحوالہ کامل لابن عدی۔
(۶) ایضاً بحوالہ معجم اوسط طبرانی۔

فرماتے ہیں۔ ''اے عائشہؓ! خدا نرمی والا ہے' وہ ہر بات میں نرمی کو پسند کرتا ہے۔ (۱) ایک مرتبہ آپؐ نے خطبہ میں ارشاد فرمایا لوگو! خدا پاک ہے اور پاک ہی کو قبول کرتا ہے۔ (۲) عام مسلمانوں کو مخاطب کر کے فرمایا۔ اے قرآن کے ماننے والو! وتر نماز پڑھا کرو کہ خدا یکتا ہے' وہ یکتا (وتر) کو پسند کرتا ہے۔ (۳)

رحمت وشفقت اللہ تعالیٰ کی خاص صفت ہے' مگر خدا کی رحمت وشفقت کے وہی مستحق ہیں جو دوسروں پر رحمت وشفقت کرتے ہیں' آپؐ نے فرمایا رحم کرنے والوں پر وہ رِحم کرنے والا بھی رحم کرتا ہے' لوگو! تم زمین والوں پر رحم کرو تو آسمان والا تم پر رحم کرے گا۔ (۴) رشتہ داروں اور قرابت کے حقوق ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے' تمام رشتہ داریاں اور قرابتیں رحم کے تعلق پر قائم ہیں' آپ نے فرمایا کہ رحم کی جڑ رحمان سے ہے' خدا فرماتا ہے کہ اے رحم! جو تجھ کو قطع رحم کرے گا' میں اس کو قطع کروں گا' جو تجھ کو ملائے گا۔ اس کو میں بھی ملاؤں گا۔ (۵) ترمذی میں تعلیم ان الفاظ میں ہے۔ ''میں خدا ہوں' میں رحمان ہوں' میں نے رحم پیدا کیا ہے اور اپنے نام (رحمان) سے اس کا نام (رحم) مشتق کیا ہے تو جو اس کو ملائے میں اس کو ملاؤں گا جو اس کو قطع کرے گا میں اس کو قطع کروں گا۔ (۶) پھر فرمایا جو انسانوں پر رحم نہیں کرتا۔ خدا اس پر رحم نہیں کرتا' بخاری میں اس روایت کے یہ الفاظ ہیں' جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا۔ (۷) آپؐ نے فرمایا' خدا نے رحم کے سو حصے کیے ۹۹ حصے اپنے پاس رکھے اور ایک حصہ زمین والوں کو عنایت کیا' اسی کا یہ اثر ہے کہ باہم لوگ ایک دوسرے کے ساتھ رحم وشفقت سے پیش آتے ہیں' یہاں تک کہ گھوڑی بھی اپنے بچہ کے لئے اس خوف سے پاؤں اٹھا لیتی ہے کہ اس کو صدمہ نہ پہنچے۔ (۸)

بخل خدا کی صفت نہیں' مگر آپؐ نے فرمایا تم اپنی تھیلی کے منہ نہ بند کرو' ورنہ تم پر تھیلی کا منہ بند کیا جائے گا۔ (۹) یہ نصیحت بھی فرمائی کہ جو بندہ دوسرے بندہ کی پردہ پوشی کرے گا' قیامت میں اس کی پردہ پوشی خدا کرے گا' (۱۰) یہ بھی تعلیم دی گئی ہے کہ جب تک تم اپنے بھائی کی مدد میں ہو' (۱۱) خدا تمہاری مدد میں ہے۔

---

(۱) صحیح مسلم' ابوداؤد' حاکم' نسائی ابن ماجہ' بیہقی فی الآداب۔

(۲) صحیح مسلم کتاب الصدقات وترمذی تفسیر سورہ بقرہ۔

(۳) ابوداؤد باب استحباب الوتر۔

(۴) ابوداؤد باب فی الرحمۃ

(۵) صحیح بخاری باب صفۃ الرحم۔

(۶) ابواب البر والصلۃ۔

(۷) ترمذی باب مذکور۔

(۸) جامع بخاری باب رحمۃ الولد۔

(۹) جامع بخاری باب رحمۃ الولد۔

(۱۰) صحیح ترمذی ابواب البر والصلہ۔

(۱۱) مسلم کتاب البر والصلہ باب بشارۃ من ستر اللہ تعالیٰ علیہ فی الدنیا بان یستر علیہ فی الآخرۃ۔

ایک اور موقع پر آپؐ نے فرمایا کہ خدا سے بڑھ کر کوئی غیرت مند نہیں' اسی لیے اس نے فحش باتوں کو حرام کیا ہے اسی کی تفسیر دوسری حدیث میں ہے' آپؐ نے فرمایا کہ خدا بھی غیرت والا اور مومن بھی غیرت والا ہے اور خدا کی غیرت یہ ہے کہ اس نے اپنے مومن پر جس بات کو حرام کیا ہے اگر کوئی اس کا ارتکاب کرے تو وہ اس پر خفا ہو۔ (۱)

اللہ تعالیٰ ظلم سے پاک ہے۔ فرمایا:

﴿وَ اَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ﴾ (آل عمران:۱۸۲)

''اور بے شک خدا بندوں پر ظلم نہیں کرتا۔''

اس لیے اس کے بندوں کا فرض ہے کہ وہ بھی آپس میں ایک دوسرے پر ظلم نہ کریں' محمد رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی زبان سے اس کی اس عملی تعلیم کو ان الفاظ میں ادا فرمایا:

((يَا عِبَادِىْ اِنِّىْ حَرَمْتُ الظُّلْمَ عَلٰى نَفْسِىْ وَ جَعَلْتُهٗ بَيْنَكُمْ مُحَرَّمًا فَلَا تَظَالَمُوْا)) (۲)

''اے میرے بندو! میں نے ظلم کو اپنے اوپر حرام کیا ہے اور اس کو تمہارے درمیان بھی حرام کیا ہے تو تم آپس میں ایک دوسرے پر ظلم نہ کرنا۔''

پاکیزگی اور لطافت خدا کی صفتیں ہیں' اس لیے خدا کے ہر بندہ کو بھی پاک وصاف رہنا چاہیے' آپؐ نے فرمایا:

((اِنَّ اللّٰهَ طَيِّبٌ يُحِبُّ الطَّيِّبَ وَ نَظِيْفٌ يُحِبُّ النَّظَافَةَ فَتَنَظَّفُوْا وَ لَا تَشَبَّهُوا الْيَهُوْدَ)) (۳)

''خدا پاکیزہ ہے' پاکیزگی کو پسند کرتا ہے اور پاک وصاف ہے پاکی اور صفائی کو پسند کرتا ہے تو تم پاک و صاف رہا کرو یہودیوں کی طرح گندے نہ بنو۔''

یہ توحید کا ایک رخ تھا' اب اس کا دوسرا رخ بھی ملاحظہ کے قابل ہے۔

وہ قومیں جو توحید سے آشنا نہ تھیں' انہوں نے انسانیت کا مرتبہ بھی نہیں پہچانا تھا' وہ انسان کو فطرت کے ہر مظہر کا غلام سمجھتی تھیں' یہ محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیمِ توحید ہی تھی جس نے خدا کے سوا ہر شے کا خوف انسانوں کے دل سے نکال دیا' سورج سے لے کر زمین کے دریا اور تالاب تک ہر چیز آقا ہونے کے بجائے انسانوں کی غلام بن

(۱) ابوداؤد کتاب الادب فی المعونۃ للمسلم۔
(۲) صحیح بخاری کتاب التوحید جلد دوم ص ۱۱۰۳۔
(۳) جامع ترمذی باب ماجاء فی الغیرۃ من ابواب نکاح۔
(۴) صحیح مسلم کتاب البر والصلہ ومسند ابن حنبل ج ۸ ص ۱۶ مصر وادب المفرد امام بخاری باب الظلم ص ۹۵۔
(۵) ترمذی باب وص ۴۵۶۔

کران کے سامنے آئی' بادشاہوں کے جلال و جبروت کا طلسم ٹوٹ گیا اور وہ بابل و مصر' ہند و ایران کے خدا اور رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی ہونے کے بجائے انسانوں کے خادم' راعی اور چوکیدار کی صورت میں نظر آئے جن کا عزل و نصب' دیوتاؤں اور فرشتوں کے ہاتھ میں نہ تھا بلکہ خود انسانوں کے ہاتھ میں تھا۔

تمام انسانی برادری جس کو دیوتاؤں کی حکومتوں نے اونچے نیچے' بلند و پست' شریف و ذلیل' مختلف طبقوں اور ذاتوں میں منقسم کر دیا تھا اور جن میں سے کچھ کی پیدائش پرمیشور کے منہ' کچھ کی اس کے ہاتھ اور کچھ کی اس کے پاؤں سے تسلیم کی جاتی تھی' اس عقیدے کی وجہ سے ایسی مختلف جنسوں میں بٹ گئی تھی جن کو کسی طرح متفق نہیں کر سکتے تھے اور اسی طرح مساواتِ انسانی کی دولت دنیا سے گم ہو چکی تھی اور زمین قوموں اور ذاتوں کے ظلم و جبر اور غرور و فخر کا دنگل بن گئی تھی۔ توحید نے آ کر اس کی اونچائی نیچائی' بلندی و پستی اور نشیب و فراز کو برابر کیا' سب انسان خدا کے بندے' سب اس کے سامنے برابر' سب باہم بھائی بھائی اور سب حقوق کے لحاظ سے یکساں قرار پائے' ان تعلیمات نے دنیا کی معاشرتی' اخلاقی اور سیاسی اصلاحات میں جو کام کیا' اس کے نتائج تاریخ کے صفحوں میں ثبت ہیں۔

بہر حال اس اصول کی صداقت کو انہوں نے بھی تسلیم کر لیا' جو حقیقی توحید سے نا آشنا ہیں اور اسی لیے وہ مساواتِ انسانی کے حقیقی کوچہ سے بھی اب تک نابلد ہیں' انتہا یہ ہے کہ خدا کے گھر میں جا کر بھی تفاوت' درجہ کا خیال ان کے دل سے دور نہیں ہوتا اور وہ دولت و فقر اور رنگ و قومیت کے امتیازات کو خدا کے سامنے سرنگوں ہو کر بھی نہیں بھولتے۔ مسلمانوں کو تیرہ سو برس سے مساوات کی نعمت اسی توحیدِ کامل کی بدولت حاصل ہے اور وہ ہر قسم کے مصنوعی امتیازات سے پاک ہیں۔ اسلام کی نظر میں سب ایک خدا کے بندے ہیں' اور سب یکساں اس کے سامنے سر افگندہ ہیں' دولت و فقر' رنگ و روپ اور نسل و قومیت کا کوئی امتیاز ان کو منقسم نہیں کرتا' اگر کوئی امتیاز ہے تو صرف تقویٰ اور خدا کی فرمان برداری کا ہے۔

﴿اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰکُمْ﴾ (حجرات:۱۳)

''تم میں خدا کے نزدیک سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ خدا سے تقویٰ کرتا ہے۔''

خدا کا ڈر اور پیار

اس سلسلہ میں ایک اور اہم مسئلہ خدا سے ڈرنے اور اس سے محبت کرنے کا ہے' عام طور سے مخالفوں نے یہ سمجھا ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ نے جس خدا کی تعلیم دی ہے وہ فقط قہار' جبار اور مہیب شہنشاہ مطلق ہے' جس کی ہیبت و جلال سے تمام بندوں کو صرف ڈرتے' کانپتے رہنا چاہیے' اس کے گوشۂ چشم میں لطف و عنایت کا گزر نہیں' محبت و پیار کا نذرانہ اس کے دربار میں قبول نہیں ہوتا' وہ اپنے کمزور بندوں پر نہ خود محبت کی نظر رکھتا ہے اور نہ بندوں سے اپنی محبت کا تقاضا کرتا ہے' لیکن درحقیقت یہ تعلیمِ محمدی کی بالکل غلط تصویر ہے۔ اللہ تعالیٰ کے جو اسماء و صفات

اوپر گزر چکے ہیں' ان میں سے ایک ایک پر نظر ڈالو تو معلوم ہوگا کہ اس کے چند پُر جلال ناموں کو چھوڑ کر جو اس کی قدرتِ تامہ اور مالکیتِ عامہ کی حقیقت کو ظاہر کرتے ہیں' بقیہ تمام نام صرف محبت اور پیار اور لطف اور کرم' رحمت اور مہر کی تجلی گاہ ہیں۔ مخالفوں کو اس حقیقت کے سمجھنے میں دو وجہوں سے مغالطہ ہوا۔

(۱) آنحضرت ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے خوف اور خشیت کی بھی انسانوں کو دعوت دی۔

(۲) دوسرے مذہبوں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت کے اظہار کی جو اصطلاحیں مقرر کی تھیں' آپ نے شدت کے ساتھ ان کی مخالفت کی اور ان کو شرک قرار دیا۔

محبت کے ساتھ خوف وخشیت کی تعلیم

یہ واقعہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اپنی تعلیم میں خدا کی محبت اور پیار کے ساتھ اس کے خوف وخشیت کو بھی جگہ دی ہے۔ غور کرو انسانوں میں تمام کاموں کے محرک دو ہی جذبے ہوتے ہیں' خوف اور محبت۔ یہ دونوں جذبے الگ الگ بھی پائے جاتے ہیں اور ایک ساتھ یا آگے پیچھے بھی ان دونوں جذبات کے لوازم بھی الگ الگ ہوتے ہیں' ادعائے محبت کا نتیجہ' ناز تبختر اور کبھی گستاخی اور کبھی اپنے مہربان ومحبوب پر غایت اعتماد کی بنا پر نافرمانی بھی ہے اور ظاہر ہے کہ جذبۂ محبت کے ان لوازم اور اثرات کا فساد صرف خوف کے جذبہ سے ہوسکتا ہے' اس لئے خالق و مخلوق کے درمیانی رابطہ کی تکمیل نہ تنہا خوف سے ہوسکتی ہے اور نہ تنہا محبت سے بلکہ ان دونوں کے اشتراک' امتزاج اور اعتدال سے یہ مقصد حاصل ہوسکتا ہے اور یہی نبوتِ محمدی کی تعلیم ہے۔

اسلام سے پہلے جو آسمانی مذاہب موجود تھے' ان کے اندر اس مسئلہ میں بھی افراط وتفریط پیدا ہوگئی تھی اور صراطِ مستقیم سے وہ تمام تر ہٹ گئے تھے۔ یہودی مذہب کی بنا سراسر خوف وخشیت اور سخت گیری پر تھی' اس کا خدا فوجوں کا سپہ سالار اور [1] باپ کا بدلہ پشت ہا پشت تک بیٹوں سے لینے والا تھا' [2] حالانکہ یہودیت کے صحیفوں میں خدا کے رحم وکرم اور محبت وشفقت کا ذکر کہیں کہیں موجود ہے۔ [3] اس کے برعکس عیسائیت زیادہ تر خدا کے رحم و کرم اور محبت وشفقت کے تذکروں سے معمور تھی' گویا ایسا نہیں ہے کہ اس میں خدا کے خوف وخشیت کی مطلق تعلیم نہ ہو بلکہ اس میں بھی اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہنے کی تاکید ہے' [4] مگر دونوں مذہبوں کے پیروؤں نے ان دو متقابل تعلیموں کے درمیان اعتدال ملحوظ نہیں رکھا تھا۔ اسلام نے اسی نقطۂ اعتدال کو پیش نظر رکھا ہے' وہ نہ تو خدا کو محض جبار' قہار' رب الافواج اور صرف بنی اسرائیل یا بنی اسمٰعیل کا خدا مانتا ہے' نہ اس کو مجسم انسان' انسانوں کا باپ سمجھتا ہے' اور نہ تنہا رحم وکرم اور محبت وشفقت کے صفات سے اس کو متصف کرتا ہے بلکہ وہ خدا کی نسبت یہ یقین رکھتا

---

(۱) یرمیاہ' ۳۲' ۱۴' ۱۵۔ وغیرہ۔

(۲) خروج ۲۰' ۵' ۳۴' واستثناء ۴' ۳۴' ۶' ۵ وغیرہ۔

(۳) خروج' ۲۰' ۷ و ۳۴ وزبور ۸۶' ۱۵ و ۱۰۳' ۸ وغیرہ میں خدا کے پیار اور رحم وکرم کا ذکر ہے۔

(۴) لوقا کی انجیل' ۱۲' ۵ اول پطرس ۴۰۔ ۷ دوم قرنیتون ۷۔ ۱ افسیون ۵۔ ۲۱ الغرض خدا سے ڈرنے کی تعلیم عیسائیت میں بھی دی گئی ہے۔

ہے کہ وہ اپنے بندوں پر قاہر بھی ہے اور رحمان و کریم بھی، وہ منتقم اور شدید العقاب بھی ہے اور غفور و رحیم بھی وہ اپنے بندوں کو سزا بھی دیتا ہے اور پیار بھی کرتا ہے اور خفا بھی ہوتا ہے اور نوازتا بھی ہے، اس سے ڈرنا بھی چاہیے اور اس سے محبت بھی کرنی چاہیے۔

﴿اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّ خُفْيَةً اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ○ وَ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا وَ ادْعُوْهُ خَوْفًا وَّ طَمَعًا اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ ○﴾ (الاعراف ۵۵،۵۶:)

(''لوگو)! اپنے پروردگار کو گڑگڑا کر اور چپکے چپکے پکارا کرو، وہ حد سے بڑھ جانے والوں کو پیار نہیں کرتا، اور زمین کی درستی کے بعد اس میں فساد نہ پھیلاؤ، اور اس کو (اس کے عذاب سے) ڈرتے ہوئے اور (اس کے فضل و کرم کی) لو لگاتے ہوئے اسے پکارا کرو۔ بے شک خدا کی رحمت اچھے کام کرنے والوں کے قریب رہتی ہے۔''

چند نیک بندوں کی مدح میں فرمایا:

﴿اِنَّهُمْ كَانُوْا يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَ يَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّ رَهَبًا﴾ (انبیاء:۹۰)

''وہ نیکی کے کاموں میں جلدی کرتے تھے اور ہم کو امید اور ڈر کے ساتھ پکارتے تھے۔''

اس سے زیادہ پر لطف بات یہ ہے کہ اسلام خدا سے لوگوں کو ڈراتا تو ہے، مگر اس کو جبار و قہار کہہ کر نہیں بلکہ مہربان اور رحیم کہہ کر، چنانچہ خدا کے سعید بندوں کی صفت یہ ہے کہ

﴿وَ خَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ﴾ (یٰسٓ: ۱۱)

''اور رحم کرنے والے سے بن دیکھے ڈرا۔''

﴿مَنْ خَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ﴾ (قٓ: ۳۳)

''جو رحم کرنے والے سے بن دیکھے ڈرا۔''

نہ صرف انسان بلکہ تمام کائنات کی زبان اس مہربان کے سامنے گنگ ہے۔

﴿وَ خَشَعَتِ الْاَصْوَاتُ لِلرَّحْمٰنِ﴾ (طٰہٰ: ۱۰۸)

''اور رحم والے کے ادب سے تمام آوازیں پست ہو گئیں۔''

دنیا میں جتنے بھی پیغمبر آئے وہ دو قسم کے تھے، ایک وہ جن کی آنکھوں کے سامنے صرف خدا کے جلال و کبریائی کا جلوہ تھا، اس لیے وہ صرف خدا کے خوف و خشیت کی تعلیم دیتے تھے، مثلاً حضرت نوحؑ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام، دوسرے وہ جو محبتِ الٰہی میں سرشار تھے اور وہ لوگوں کو اسی خمخانۂ عشق کی طرف بلاتے تھے، مثلاً حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام۔

لیکن پیغمبروں میں ایک ایسی ہستی بھی آئی جو ان دونوں صفتوں کی برزخِ کبریٰ، جلال و جمال دونوں کا مظہر

اور پیار اور ادب دونوں کی جامع تھی، یعنی محمد رسول اللہ ﷺ ایک طرف آپؐ کی آنکھیں خوفِ الٰہی سے اشک بار رہتی تھیں اور دوسری طرف آپؐ کا دل خدا کی محبت اور رحم وکرم کے سرور سے سرشار رہتا تھا، کبھی ایسا ہوتا کہ ایک ہی وقت میں دونوں منظر آپؐ کے چہرۂ انور پر لوگوں کو نظر آ جاتے تھے، چنانچہ جب راتوں کو آپ شوق وولولہ کے عالم میں نماز کے لیے کھڑے ہوتے، قرآن مجید کی لمبی لمبی سورتیں زبان مبارک پر ہوتیں اور ہر معنی کی آیتیں گزرتی جاتیں تو جب کوئی خوف وخشیت کی آیت آتی، آپؐ پناہ مانگتے اور جب کوئی مہر ومحبت اور رحم وبشارت کی آیت ہوتی تو اس کے حصول کی دعا کرتے تھے۔ (۱)

الغرض اسلام کا نصب العین یہ ہے کہ وہ خوف اور محبت کے کناروں سے ہٹا کر جہاں سے ہر وقت نیچے گرنے کا خطرہ ہے، خوف وخشیت اور رحم ومحبت کے بیچ کی شاہراہ میں انسانوں کو کھڑا کرے، اس لیے کہا گیا ہے کہ۔ اَلْاِیْمَانُ بَیْنَ الْخَوْفِ وَالرَّجَآءِ۔

''ایمان کامل خوف اور امید کے درمیان ہے'' کہ تنہا خوف لوگوں کو خدا کے رحم وکرم سے ناامید اور محض رحم و کرم پر بھروسہ ان کو خودسر اور گستاخ بنا دیتا ہے، جیسا کہ اس عملی دنیا کے روزانہ کے کاروبار میں نظر آتا ہے، اور مذہبی حیثیت سے اس کے نتائج کا مشاہدہ عملاً یہودیوں اور عیسائیوں میں کیا جا سکتا ہے، اسی لئے محمد رسول اللہ ﷺ نے اپنی تعلیم میں ان دونوں متضاد کیفیتوں کو ایمان اور عقیدہ کی رو سے برابر کا درجہ دیا لیکن ساتھ ہی عاجز و درماندہ انسانوں کو یہ بھی بشارت سنائی کہ خدا کی رحمت کا دائرہ اس کے غضب کے دائرہ سے زیادہ وسیع ہے فرمایا:

﴿وَ رَحْمَتِیْ وَ سِعَتْ کُلَّ شَیْءٍ﴾ (الاعراف:۱۵۶)

''اور میری رحمت ہر چیز کو سمائے ہوئے ہے۔''

اور اس کی تفسیر خود صاحبِ قرآن علیہ السلام نے ان الفاظ میں کی:

((رَحْمَتِیْ سَبَقَتْ غَضَبِیْ)) (بخاری)

''میرے غضب سے میری رحمت آگے بڑھ گئی۔''

عیسائیوں نے خدا سے اپنا رشتہ جوڑا، اور اپنے کو فرزندِ الٰہی کا لقب دیا، بعض یہودی فرقوں نے بنی اسرائیل کو خدا کا خانوادہ اور محبوب ٹھہرایا، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے جوڑ پر حضرت عزیرؑ کو فرزندِ الٰہی کا رتبہ دیا، لیکن اسلام یہ شرف کسی مخصوص خاندان یا خاص قوم کو عطا نہیں کرتا بلکہ وہ تمام انسانوں کو بندگی اور اطاعت کی ایک سطح پر لا کر کھڑا کرتا ہے، مسلمانوں کے مقابلہ میں یہودیوں اور عیسائیوں دونوں کو دعویٰ تھا:

﴿نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَ اَحِبَّآؤُهٗ﴾ (المائدۃ:۱۸)

''ہم خدا کے بیٹے اور چہیتے ہیں۔''

قرآن مجید نے اس کے جواب میں کہا:

---

(۱) مسند ابن حنبل ج۹ ص۹۳۔

﴿قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوبِكُمْ بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ﴾ (مائدۃ:۱۸)

''کہہ دو کہ اگر ایسا ہے تو خدا تمہارے گناہوں کے بدلہ تم کو عذاب کیوں دیتا ہے (اس لئے تمہارا دعویٰ صحیح نہیں) بلکہ تم بھی انہی انسانوں میں سے ہو جن کو اس نے پیدا کیا۔''

دوسری جگہ قرآن نے تنہا یہودیوں کے جواب میں کہا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ هَادُوْٓا اِنْ زَعَمْتُمْ اَنَّكُمْ اَوْلِيَآءُ لِلّٰهِ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ﴾ (جمعہ:٦)

''اے وہ جو یہودی ہو اگر تم اپنے اس خیال میں سچے ہو کہ تمام انسانوں کو چھوڑ کر تم ہی خدا کے خاص چہیتے ہو تو موت (یعنی خدا کی ملاقات) کی تمنا کیوں نہیں کرتے۔''

اسلام رحمتِ الٰہی کے دائرہ کو کسی خاندان اور قوم تک محدود نہیں رکھتا' بلکہ وہ اس کی وسعت میں انسانوں کی ہر برادری کو داخل کرتا ہے ایک شخص نے مسجد نبوی میں آ کر دعا کی کہ ''خدایا مجھ کو اور محمد کو مغفرت عطا کر۔'' آپؐ نے فرمایا ''خدا کی وسیع رحمت کو تم نے تنگ کر دیا۔'' (۱) ایک اور اعرابی نے مسجد میں دعا مانگی کہ خدایا! مجھ پر اور محمد پر رحمت بھیج اور ہماری رحمت میں کسی کو شریک نہ کر۔ آپؐ نے صحابہؓ کی طرف خطاب کر کے فرمایا۔ یہ زیادہ گمراہ ہے یا اس کا اونٹ۔

محبت کی جسمانی اصطلاحات کی ممانعت

اس سلسلہ میں تعلیمِ محمدی کے متعلق غلط فہمی کا دوسرا سبب جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے' یہ ہے کہ بعض مذاہب نے خدا کی محبت و کرم کی تعبیر کے لیے جو مادی اور جسمانی اصطلاحیں قائم کی تھیں' اسلام نے ان کی مخالفت کی اور ان کو شرک قرار دیا' اس سے نتیجہ یہ نکالا گیا کہ اسلام کا خدا رحم و کرم اور محبت اور پیار کے اوصاف سے معرا ہے۔ (۲)

اصل یہ ہے کہ انسان دوسرے غیر مادی خیالات کی طرح خدا اور بندہ کے باہمی مہر و محبت کے جذبات کو بھی اپنی ہی انسانی بول چال میں ادا کر سکتا ہے' محبت اور پیار کے یہ جذبات انسانوں کے اندر باہمی مادی اور جسمانی رشتوں کے ذریعہ سے نمایاں ہوتے ہیں۔ اس بنا پر بعض مذاہب نے اس طریقۂ ادا کو خالق و مخلوق کے ربط و تعلق کے اظہار کے لئے بھی بہترین اسلوب سمجھا چنانچہ کسی نے خالق اور مخلوق کے درمیان باپ اور بیٹے کا تعلق پیدا کیا' جیسا کہ عیسائیوں میں ہے' دوسرے نے ماں کی محبت کا بڑا درجہ سمجھا' اس لیے اس تعلق کو ماں اور بیٹے کی اصطلاح سے واضح کیا اور دیبیاں انسانوں کی ماتائیں بنیں' جیسا کہ ہندوؤں کا عام مذہبی تخیل ہے' خاص ہندوستان کی خاک میں زن و شو کی باہمی محبت کا امتیازی خاصہ ہے' جس کی نظیر دوسرے ملکوں میں نہیں مل سکتی ہے' اس کی نگاہ میں محبت کا

(۱) صحیح بخاری کتاب الادب۔

(۲) ابوداؤد کتاب الادب۔

اس سے زیادہ پراثر منظر اور نا قابلِ شکست پیمان کوئی دوسرا نہیں۔ اس لیے یہاں کے بعض فرقوں میں خالق و مخلوق کی باہمی محبت کے تعلق کو زن و شوہر کی اصطلاح سے ادا کیا گیا' سدا سہاگ فقرا اس تخیل کی مضحکہ انگیز تصویر ہیں۔

یہ تمام فرقے جنہوں نے خدا اور بندہ کے تعلق کو جسمانی اور مادی رشتوں کے ذریعہ ادا کرنا چاہا' راہ سے بے راہ ہو گئے اور لفظ کے ظاہری استعمال نے نہ صرف ان کے عوام بلکہ ان کے خواص تک کو گمراہ کر دیا' جو لفظ کی اصلی روح کو چھوڑ کر جسمانیت کے ظاہری مغالطوں میں گرفتار ہو گئے' عیسائیوں نے واقعی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا سمجھ لیا' ہندوستان کے بیٹوں نے ماتاؤں کی پوجا شروع کر دی۔ سدا سہاگ فقیروں نے چوڑیاں اور ساڑھیاں پہن لیں' اور خدائے قادر سے شوخیاں کرنے لگے' اسی لیے اسلام نے جو توحید خالص کا مبلغ تھا' ان جسمانی اصطلاحات کی سخت مخالفت کی اور خدا کے لیے ان الفاظ کا استعمال ضلالت اور گمراہی قرار دیا' لیکن وہ ان الفاظ کے اصلی معنی اور منشا کا اور اس مجاز کے پردہ میں جو حقیقت مستور ہے اس کا انکار نہیں کرتا' بلکہ وہ ان جسمانی معنوں کو خالق و مخلوق اور عبد و معبود کے ربط و تعلق کے اظہار کے لیے ناکافی اور غیر مکمل سمجھتا ہے اور وہ ان سے زیادہ وسیع و کامل معنی کا طالب ہے۔

﴿فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا﴾ (البقرۃ:۲۰۰)

''تم خدا کو اس طرح یاد کرو جس طرح اپنے باپوں کو یاد کرتے ہو بلکہ اس سے بھی زیادہ یاد کرو۔''

دیکھو کہ باپ کی طرح کی محبت کو وہ اپنے پروردگار کی محبت کے لیے ناکافی قرار دیتا ہے اور عبد و معبود کے درمیان محبت کے رشتہ کو اس سے کہیں زیادہ مضبوط و استوار ظاہر کرنا چاہتا ہے۔

الغرض رحم و محبت کے اس جسمانی طریقۂ تعبیر کی مخالفت سے یہ لازم نہیں آتا کہ اسلام سرے سے خالق و مخلوق اور عبد و معبود کے درمیان محبت و پیار کے جذبات سے خالی ہے اتنا کون نہیں سمجھتا کہ مذہب کی تعلیمات انسانوں کی بولی میں اترتی ہیں' انسانوں کے تمام خیالات اور تصورات اسی مادی اور جسمانی ماحول کا عکس ہیں' اس لیے ان کے ذہن میں کوئی غیر مادی اور غیر جسمانی تصور کسی مادی اور جسمانی تصور کی وساطت کے بغیر براہِ راست پیدا نہیں ہو سکتا اور نہ اس کے لیے ان کی لغت میں کوئی ایسا لفظ مل سکتا ہے جو کسی غیر مادی اور غیر جسمانی مفہوم کو اس قدر منزہ اور بلند طریقہ سے بیان کرے جس میں مادیت اور جسمانیت کا مطلق شائبہ نہ ہو' انسان ان دیکھی چیزوں کا تصور صرف دیکھی ہوئی چیزوں کی تشبیہ سے پیدا کرتا ہے اور اس طرح ان دیکھی چیزوں کا ایک دھندلا عکس ذہن کے آئینہ میں اتر جاتا ہے۔

اس ان دیکھی ہستی کی ذات و صفات کے متعلق جس کو خدا کہتے ہو' ہر مذہب میں ایک تخیل ہے۔ غور سے دیکھو تو معلوم ہو گا کہ یہ تخیل بھی اس مذہب کے پیروؤں کے گرد و پیش کی اشیا سے ماخوذ ہے لیکن ایک بلند تر اور کامل تر مذہب کا کام یہ ہے کہ وہ اس تخیل کو مادیت' جسمانیت اور انسانیت کی آلائشوں سے اس حد تک پاک و منزہ کر دے جہاں تک بنی نوعِ انسان کے لیے ممکن ہے خدا کے متعلق باپ' ماں اور شوہر کا تخیل اس درجہ مادی' جسمانی اور

انسانی ہے کہ اس تخیل کے معتقد کے لیے ناممکن ہے کہ وہ خالص توحید کے صراطِ مستقیم پر قائم رہ سکے' اسی لیے نبوتِ محمدی نے ان مادی تعلقات اور جسمانی رشتوں کے ظاہر کرنے والے الفاظ کو خالق ومخلوق کے اظہارِ ربط وتعلق کے باب میں یک قلم ترک کر دیا' بلکہ ان کا استعمال بھی شرک قرار دیا' تاہم چونکہ روحانی حقائق کا اظہار بھی انسانوں ہی مادی بولی میں کرنا تھا اس لیے جسمانی و مادی رشتہ کے بجائے جس کو دوسرے مذاہب نے منتخب کیا تھا' اس رشتہ کے محض جذبات' احساسات اور عواطف کو خالق ومخلوق کے تعلقات باہمی کے اظہار کے لیے اسلام نے مستعار لے لیا' اس طرح خالق ومخلوق کے درمیان جسمانی رشتہ قائم کیے بغیر اس نے ربط وتعلق کا اظہار کیا اور استعمالات کی لفظی غلطی سے جو گمراہیاں پہلے پیش آ چکی تھیں' ان سے انسانوں کو محفوظ رکھا۔

ہر زبان میں اس خالق ہستی کی ذات کی تعبیر کے لیے کچھ نہ کچھ الفاظ ہیں جن کو کسی خاص تخیل اور نصب العین کی بنا پر مختلف قوموں نے اختیار کیا ہے اور گو ان کی حیثیت اب علم اور نام کی ہے تاہم وہ درحقیقت پہلے پہل کسی نہ کسی وصف کو پیش نظر رکھ کر استعمال کئے گئے تھے ہر قوم نے اس علم اور نام کے لیے اسی وصف کو پسند کیا ہے جو اس کے نزدیک اس خالق ہستی کی سب سے بڑی اور سب سے ممتاز صفت ہو سکتی تھی۔

اسلام نے خالق کے لیے جو نام اور علم اختیار کیا ہے' وہ لفظ اللہ ہے' اللہ کا لفظ اصل میں کس لفظ سے نکلا ہے اس میں اہل لغت کا یقیناً اختلاف ہے' مگر ایک گروہِ کثیر کا یہ خیال ہے کہ یہ ﴿وَلَاہُ﴾ سے نکلا ہے اور ﴿ولہ﴾ کے اصل معنی عربی میں اس ''غم'' اور ''محبت'' اور ''تعلقِ خاطر'' کے ہیں جو ماں کو اپنی اولاد کے ساتھ ہوتا ہے' اسی سے بعد میں مطلق عشق ومحبت کے معنی پیدا ہو گئے اور اسی سے ہماری زبان میں لفظ والہ (شیدا) مستعمل ہے اس لیے اللہ کے معنی ''محبوب اور پیارے'' کے ہیں جس کے عشق ومحبت میں نہ صرف انسان بلکہ ساری کائنات کے دل سرگرداں' متحیر اور پریشان ہیں۔ حضرت مولانا شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادی قرآن مجید کی آیتوں کے ترجمہ اکثر ہندی میں فرمایا کرتے تھے' اللہ کا ترجمہ وہ ہندی میں ''من موہن'' یعنی ''دلوں کا محبوب'' کیا کرتے تھے۔

قرآن مجید کھولنے کے ساتھ ہی خدا کی جن صفتوں پر سب سے پہلے نگاہ پڑتی ہے وہ ''رحمان'' اور ''رحیم'' ہیں ان دونوں لفظوں کے تقریباً ایک ہی معنی ہیں رحم والا' مہربان' لطف وکرم والا' بسم اللہ الرحمٰن الرحیم (محبوب مہربان رحم والا) کے ضمن میں قرآن مجید کے ہر سورہ کے آغاز میں انہی صفات ربانی کے بار بار دہرانے کی تاکید کی گئی ہے' ہر نماز میں کئی کئی دفعہ ان کی تکرار ہوتی ہے' کیا اس سے بھی بڑھ کر اللہ تعالیٰ کے متعلق اسلام کے تخیل کو واضح کرنے کے لیے کوئی دلیل ہو سکتی ہے۔

لفظ اللہ کے بعد اسلام کی زبان میں دوسرا علم یہی لفظ ''رحمان'' ہے جو رحم وکرم اور لطف ومہر کے معنی میں صفت مبالغہ کا صیغہ ہے۔

﴿قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِادْعُوا الرَّحْمٰنَ اَيًّامَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى﴾ (بنی اسرائیل:۱۱۰)

''اس کو محبوب (اللہ) کہو یا مہربان (رحمان) کہو جو کہہ کر اس کو پکارو سب اچھے نام اسی کے ہیں۔''

قرآن مجید نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی صدہا بار کی تکرار کے علاوہ خاص طور سے ۵۳ موقعوں پر خدا کو اس رحمان کے نام سے یاد کیا ہے۔

ابھی اس سے پہلے باب میں اسمائے الٰہی کا ایک ایک نام تمہاری نظر سے گزر چکا ہے' ان ناموں میں اللہ تعالیٰ کے جلالی و جمالی اوصاف آ گئے ہیں' استقصا کرو تو معلوم ہوگا کہ ان میں بڑی تعداد انہی ناموں کی ہے جن سے اللہ تعالیٰ کے لطف و کرم اور مہر و محبت کا اظہار ہوتا ہے قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ایک نام یا ایک وصف ﴿اَلْوَدُوْدُ﴾ سورۂ ذات البروج میں آیا ہے' جس کے معنی ''محبوب'' اور ''پیارے'' کے ہیں کہ سرتاپا مہر و محبت اور عشق اور پیار ہے' اس کے سوا خدا کا ایک اور نام ''الولی'' ہے جس کے لفظی معنی ''یار'' اور ''دوست'' کے ہیں' خدا کا ایک اور نام جو قرآن مجید میں بار بار استعمال ہوا ہے ''اَلرَّءُوْفُ'' ہے' روف کا لفظ رافت سے نکلا ہے رافت کے معنی اس محبت اور تعلقِ خاطر کے ہیں جو باپ کو اپنی اولاد سے ہوتا ہے' اسی طرح خدا کا ایک نام ''حنان'' ہے جو حن سے مشتق ہے ''حن اور حنین'' اس سوزِ دل اور محبت کو کہتے ہیں جو ماں کو اپنی اولاد سے ہوتی ہے یہ الفاظ ان مجازی اور مستعار معانی کو ظاہر کرتے ہیں جو اسلام نے خالق و مخلوق اور عبد و معبود کے ربط و تعلق کے اظہار کے لیے بے تکلف استعمال کرتا ہے اور اس طرح مادیت اور جسمانیت کا تخیل آئے بغیر وہ ان روحانی معنوں کی تلقین کر رہا ہے۔

محمد رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ وہ غَفَّارٌ (بخشش کرنے والا) اور غَفُوْرٌ (بخشنے والا) ہے یعنی بندوں کے گناہوں کو معاف کرنے والا ہے وہ سَلَامٌ (امن و سلامتی) ہے' یعنی اپنے بے پناہ بندوں کے لیے وہ سرتاپا امن و سلامتی ہے وہ اَلْمُؤْمِنُ (امن دینے والا) ہے وہ اَلْعَدْلُ ہے یعنی سرتاپا انصاف ہے وہ اَلْعَفُوْ (معاف کرنے والا) اَلْوَهَّابُ (عطا کرنے والا) ہے اَلْحَلِيْمُ (بردبار) ہے' اَلصَّبُوْرُ (بندوں کی گستاخیوں پر صبر کرنے والا) ہے اَلتَّوَّابُ (بندوں کے حال پر رجوع ہونے والا) اَلْبَرُّ (نیک اور مجسم) اور اَلْمُقْسِطُ (منصف اور عادل) ہے ان میں سے ہر لفظ پر ٹھہر کر ذرا غور کرو کہ اسلام کا تخیل کس قدر بلند اور برتر ہے۔

توراۃ کے اسفار' انجیل کے صحائف اور وید کے حصص کا ایک ایک ورق پڑھ جاؤ' کیا اللہ تعالیٰ کے لیے ایسے پر محبت اور سراپا مہر و کرم سے لبریز اسماء و صفات کی یہ کثرت تم کو وہاں ملے گی؟ یہ سچ ہے کہ اسلام اللہ تعالیٰ کے لیے ماں اور باپ کا لفظ یہود و نصاریٰ اور ہنود کی طرح استعمال کرنا جائز نہیں سمجھتا' مگر اس سے یہ قیاس کرنا غلطی ہے کہ وہ اس لطفِ احساس اور مہر و کرم کے جذبات و عواطف سے یکسر خالی ہے جن کو یہ فرقے اپنا مخصوص سرمایہ سمجھتے ہیں' بات یہ ہے کہ اسلام ان روحانی جذبات اور معنوی احساسات کے ساتھ شرک و کفر کی اس ضلالت و گمراہی سے بھی انسانوں کو بچانا چاہتا ہے جو ذرا سی لفظی غلط فہمی سے مجاز کو حقیقت اور استعارہ کو اصلیت سمجھ کر پاک اور سرتاپا روحانی معنوں کو مادی اور مجسم یقین کر لیتے ہیں' اور اس طرح وہ توحید کی بلند ترین سطح سے بہت نیچے گر کر سر رشتۂ حقیقت کو ہاتھ سے چھوڑ بیٹھتے ہیں۔

محمد رسول اللہ ﷺ متکلمِ ازل کا آخری پیغام لے کر آئے تھے' اس لیے ضرورت تھی کہ آپ کی تعلیم اس قسم کی لغزشوں سے پاک و مبرا ہو' روحانی حقائق کی تعبیر کے لیے جیسا کہ پہلے کہا جا چکا' یقیناً مادی اور جسمانی استعارات و مجازات سے چارہ نہیں' تاہم ایک دائمی تعلیم کا یہ فرض تھا کہ وہ اپنے کو استعمالات کی غلطیوں اور مجازات کی غلط فہمیوں سے محفوظ رکھتی' چنانچہ اسلام نے اسی بنا پر ان استعارات و مجازات کے استعمال میں بڑی احتیاط برتی ہے اور خدا کے مہر و کرم اور عشق و محبت کے تذکروں کے ساتھ ادب و لحاظ کے قواعد کو فراموش نہیں کیا ہے' قرآن مجید اور احادیث روحانی عشق و محبت کے ان دلآویز اور ولولہ انگیز حکایات سے معمور ہیں' بایں ہمہ اسلام انسان کو بیٹا اور خدا کو (باپ) نہیں کہتا کہ عبد و معبود کے تعلقات کے اظہار کے لیے اس کے نزدیک یہ کوئی بلند تر تعبیر نہیں' وہ خدا کو اب (باپ) کے بجائے ''رب'' کہہ کر پکارتا ہے' وہ اس کو تمام دنیا کا باپ نہیں بلکہ تمام دنیا کا رب کہتا ہے۔

اب اور رب ان دونوں لفظوں کا باہمی معنوی مقابلہ کرو تو معلوم ہوگا کہ عیسائیوں اور یہودیوں کا تخیل اسلام کے مطمحِ نظر سے کس درجہ پست ہے۔ اب یعنی باپ کا تعلق اپنے بیٹے سے ایک خاص حالت کی بنا پر ایک خاص لحظہ میں قائم ہوتا ہے اور پھر اس کی حیثیت بدل کر پرورش اور حفاظت کی صورت میں بچپن کے ایک محدود عرصہ تک قائم رہتی ہے' اس طرح گو باپ کو بیٹے کے وجود میں یک گونہ تعلق ضرور ہوتا ہے' مگر یہ تعلق حد درجہ ناقص' محدود اور آنی ہوتا ہے۔ بیٹے کے وجود' قیام و بقا' ضروریات زندگی' سامانِ حیات' نشو و نما اور ارتقا کسی چیز میں باپ کی ضرورت نہیں ہوتی' وہ اپنے باپ سے الگ' مستقل اور بے نیاز زندگی بسر کرتا ہے' مگر ذرا غور کرو کیا عبد و معبود اور خالق و مخلوق کے درمیان جو ربط و تعلق ہے اس کا انقطاع کسی وقت ممکن ہے' کیا بندہ اپنے خدا سے ایک دم اور ایک لمحہ کے لیے بے نیاز اور مستغنی ہو سکتا ہے۔

کیا یہ تعلق باپ اور بیٹے کے تعلق کی طرح محدود اور مخصوص الاوقات ہے۔

ربوبیت (پرورش) عبد اور معبود اور خالق و مخلوق کے درمیان اس تعلق کا نام ہے جو آغاز سے انجام تک' پیدائش سے وفات تک بلکہ وفات کے بعد سے ابد تک قائم رہتا ہے' جو ایک لمحہ کے لیے منقطع نہیں ہو سکتا' جس کے بل اور سہارے پر دنیا اور دنیا کی مخلوقات کا وجود ہے' وہ گہوارۂ عدم سے لے کر فنائے محض کی منزل تک ہر قدم پر ہر موجود کا ہاتھ تھامے رہتا ہے' انسان ذرہ ہو یا بصورتِ غذا قطرۂ آب ہو یا قطرۂ خون' مضغۂ گوشت یا مشتِ استخواں' شکمِ مادر میں ہو یا اس سے باہر' بچہ ہو یا جوان' ادھیڑ یا بوڑھا' کوئی آن' کوئی لمحہ' رب کے مہر و کرم اور لطف و محبت سے مستغنی اور بے نیاز نہیں ہو سکتا۔

علاوہ ازیں باپ اور بیٹے کے الفاظ سے مادیت' جسمانیت' ہم جنسی اور برابری کا جو تخیل پیدا ہوتا ہے' اس سے لفظ رب یک قلم پاک ہے اور اس میں ان ضلالتوں اور گمراہیوں کا خطرہ نہیں' جن میں نصرانیت اور ہندویت نے ایک عالم کو مبتلا کر رکھا ہے۔

تعلیماتِ اسلامی میں محبتِ الٰہی کے مظاہر

اب ان آیتوں اور حدیثوں کو دیکھو جن سے یہ روشن ہوتا ہے کہ اسلام کا سینہ اس ازلی وابدی عشق ومحبت کے نور سے کس درجہ معمور ہے اور وہ خمخانۂ الست کی سرشاری کی یاد بھکے ہوئے انسانوں کو کس کس طرح دلا رہا ہے' اسلام کا سب سے پہلا حکم ایمان ہے' ایمان کی سب سے بڑی خاصیت اور علامت حبِ الٰہی ہے' اور یہ وہ دولت ہے جو اہلِ ایمان کی پہلی جماعت کو عملاً نصیب ہو چکی تھی' زبانِ الٰہی نے شہادت دی:

﴿وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ﴾ (بقرہ:۱۶۵)

''اور جو ایمان لائے وہ سب سے زیادہ خدا سے محبت رکھتے ہیں۔''

اس نشۂ محبت پر باپ' ماں' اولاد' بھائی' بیوی' جان' مال' خاندان سب کو قربان اور نثار ہو جانا چاہیے' ارشاد ہوتا ہے:

﴿اِنْ کَانَ اٰبَآؤُکُمْ وَ اَبْنَآؤُکُمْ وَ اِخْوَانُکُمْ وَ اَزْوَاجُکُمْ وَ عَشِیْرَتُکُمْ وَ اَمْوَالُ نِ اقْتَرَفْتُمُوْھَا وَ تِجَارَۃٌ تَخْشَوْنَ کَسَادَھَا وَ مَسٰکِنُ تَرْضَوْنَھَآ اَحَبَّ اِلَیْکُمْ مِّنَ اللّٰہِ وَ رَسُوْلِہٖ وَ جِھَادٍ فِیْ سَبِیْلِہٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰی یَاْتِیَ اللّٰہُ بِاَمْرِہٖ﴾ (توبہ:۲۴)

''اگر تمہارے باپ تمہارے بیٹے' تمہارے بھائی تمہاری بیویاں اور تمہارا کنبہ اور وہ دولت جو تم نے کمائی ہے اور وہ سوداگری جس کے مندا پڑ جانے کا تم کو اندیشہ ہے اور وہ مکانات جن کو تم پسند کرتے ہو' خدا اور اس کے رسول اور خدا کی راہ میں جہاد کرنے سے تم کو زیادہ محبوب اور پیارے ہیں تو اس وقت تک انتظار کرو کہ خدا اپنا فیصلہ لے آئے۔''

ایمان کے بعد بھی اگر نشۂ محبت کی سرشاری نہیں ملی تو وہ بھی جادۂ حق سے دوری ہے' چنانچہ جو لوگ راہ حق سے بھٹکنا چاہتے تھے' ان کو پکار کر سنا دیا گیا۔

﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَنْ یَّرْتَدَّ مِنْکُمْ عَنْ دِیْنِہٖ فَسَوْفَ یَاْتِی اللّٰہُ بِقَوْمٍ یُّحِبُّھُمْ وَ یُحِبُّوْنَہٗ﴾ (مائدہ:۵۴)

''مسلمانو! اگر تم میں سے کوئی اپنے دین (اسلام) سے پھر جائے گا (تو خدا کو اس کی کچھ پروا نہیں وہ) ایسے لوگوں کو لا کر کھڑا کرے گا جن کو وہ پیار کرے گا اور وہ اس کو پیار کریں گے۔''

حضرت مسیحؑ نے کہا درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے' ہر معنوی اور روحانی حقیقت ظاہری آثار اور جسمانی علامات سے پہچانی جاتی ہے تم کو زید کی محبت کا دعویٰ ہے مگر نہ تمہارے دل میں اس کے دیدار کی تڑپ ہے نہ تمہارے سینہ میں صدمۂ فراق کی جلن ہے اور نہ آنکھوں میں ہجر و جدائی کے آنسو ہیں' تو کون تمہارے دعویٰ کی تصدیق کرے گا' اسی طرح خدا کی محبت اور پیار کے دعویدار تو بہتیرے ہو سکتے ہیں' مگر اس غیر محسوس کیفیت کی مادی

نشانیاں اور ظاہری علامتیں اس کے احکام کی پیروی اور اس کے رسول کی اطاعت ہے' خدا کے رسول کو اس اعلان کا حکم ہے:

﴿اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰهُ﴾ (آل عمران:۳۱)

''اگر تم کو خدا سے محبت ہے تو میری پیروی کرو کہ خدا بھی تم کو پیار کرے گا۔''

محبت کیونکر حاصل ہو' وحیِ محمدی نے اس رتبۂ بلند کے حصول کی تدبیر بھی بتادی' فرمایا:

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَیَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا﴾ (مریم:۹۶)

''جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کئے' رحمت والا خدا ان کے لیے محبت پیدا کرے گا۔''

اس آیت میں محبت کے حصول کے دو ذریعے بتائے گئے ہیں' ایمان اور عمل صالح یعنی نیک کام۔ چنانچہ طبقات انسانی میں متعدد ایسے گروہ ہیں جن کو ان ذریعوں سے خدا کی محبت اور پیار کی دولت ملی ہے۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ﴾ (بقرہ:۱۹۵ والمائدۃ:۱۳)

''خدا نیکی کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔''

﴿اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ﴾ (بقرہ:۲۲۲)

''خدا توبہ کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔''

﴿اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُتَوَکِّلِیْنَ﴾ (آل عمران:۱۵۹)

''خدا توکل کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔''

﴿اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ﴾ (المائدۃ:۴۲ والحجرات:۹)

''خدا منصف مزاجوں کو پیار کرتا ہے۔''

﴿اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُتَّقِیْنَ﴾ (التوبۃ:۴'۷)

''خدا پرہیزگاروں کو پیار کرتا ہے۔''

﴿اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِهٖ﴾ (الصّف:۴)

''خدا ان کو پیار کرتا ہے جو اس کے راستے میں لڑتے ہیں۔''

﴿وَ اللّٰهُ یُحِبُّ الصّٰبِرِیْنَ﴾ (آل عمران:۱۴۶)

''اور خدا صبر کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔''

﴿وَ اللّٰهُ یُحِبُّ الْمُطَّهِّرِیْنَ﴾ (التوبۃ:۱۰۸)

''اور خدا پاک وصاف لوگوں کو پیار کرتا ہے۔''

مسند احمد میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تین قسم کے آدمیوں سے پیار کرتا ہے اور تین قسم کے آدمیوں کو پیار نہیں کرتا' محبت ان سے کرتا ہے جو اس کی راہ میں خلوصِ نیت کے ساتھ اپنی جان فدا کرتے ہیں' اور

ان سے جو اپنے پڑوسی کے ظلم پر صبر کرتے ہیں' اور ان سے جو وضو کر کے خدا کی یاد کے لیے اس وقت اٹھتے ہیں جب قافلہ رات کے سفر سے تھک کر آرام کے لیے بستر لگاتا ہے اور خدا کی محبت سے محروم یہ تین ہیں۔ اترانے والا مغرور' اِن دھرنے والا بخیل' جھوٹی قسمیں کھا کھا کر مال بیچنے والا سوداگر۔ (۱)

دنیا کے عیش و مسرت میں اگر کوئی خیال کا کانٹا چبھتا ہے اور ہمیشہ انسان کے عیش و سرور کو مکدر اور منغض بنا کر بے فکری کی بہشت کو فکر و غم کی جہنم بنا دیتا ہے تو وہ ماضی اور حال کی ناکامیوں کی یاد اور مستقبل کی بے اطمینانی ہے۔ پہلے کا نام حزن و غم اور دوسرے کا خوف و دہشت ہے۔ غرض غم اور خوف ہی دو کانٹے ہیں' جو عاجز و درماندہ انسان کے پہلو میں چبھتے رہتے ہیں' لیکن جو محبوب حقیقی کے طلب گار اور اس کے والہ و شیدا ہیں' ان کو بشارت ہے کہ ان کے عیش کا چمن زار ان کانٹوں سے پاک و صاف ہوگا۔

﴿اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ﴾ (یونس:۶۲)

''ہاں خدا کے دوستوں کو نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔''

محبت کا وہ درجہ جو بڑے کو چھوٹے کے ساتھ احسان' نیکی' درگزر اور عفو و بخشش پر آمادہ کرتا ہے' اس کا نام ''رحم'' اور ''رحمت'' ہے' اسلام کا خدا تمام تر رحم ہے' اس کی رحمت کے فیض سے عرصۂ کائنات کا ذرہ ذرہ سیراب ہے' اس کا نام رحمان و رحیم ہے جو کچھ یہاں ہے سب اس کی رحمت کا ظہور ہے' وہ نہیں تو کچھ نہیں' اس لیے اس کی رحمت سے ناامیدی جرم اور مایوسی گناہ ہے۔ مجرم سے مجرم اور گنہگار سے گنہگار کو وہ نوازنے کے لیے ہمہ وقت آمادہ و تیار رہتا ہے' گنہگاروں اور مجرموں کو وہ محمد رسول اللہ ﷺ کی زبان سے میرے بندو! کہہ کر ان کے پاس تسلی کا یہ پیام بھیجتا ہے:

﴿قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ﴾ (الزمر:۵۳)

''اے پیغمبر! میرے ان بندوں کو پیام پہنچا دے جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے کہ تم اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو' اللہ یقیناً تمام گناہوں کو بخش سکتا ہے۔ بے شک وہی بخشش کرنے والا اور رحم کھانے والا ہے۔''

فرشتے حضرت ابراہیمؑ کو بشارت سناتے ہیں تو کہتے ہیں:

﴿فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْقٰنِطِيْنَ﴾ (الحجر:۵۵)

''تم ناامید ہونے والوں میں سے نہ ہو۔''

خلیل اللہ اس رمز سے ناآشنا نہ تھے کہ مرتبۂ خلعت محبت سے مافوق ہے' اس لیے جواب دیا:

﴿وَ مَنْ يَّقْنَطُ مِنْ رَّحْمَةِ رَبِّهٖٓ اِلَّا الضَّآلُّوْنَ﴾ (الحجر:۵۶)

---

(۱) احمد بن حنبل مسند ابوذر ج ۵ ص ۱۷۶۔

''اپنے پروردگار کی رحمت سے گمراہ لوگوں کے سوا اور کون ناامید ہوتا ہے۔''

بندوں کی جانب سے خدا پر کوئی پابندی عائد نہیں، مگر اس نے اپنی رحمت کے اقتضا سے اپنے اوپر خود کچھ چیزیں فرض کر لی ہیں، منجملہ ان کے ایک رحمت بھی ہے، خدا مجرموں کو سزا دے سکتا ہے، گنہگاروں پر عذاب بھیج سکتا ہے، سیہ کاروں کو ان کی گستاخیوں کا مزہ چکھا سکتا ہے، وہ غالب ہے، قاہر ہے، جبار ہے، منتقم ہے، لیکن ان سب کے ساتھ وہ غفار و غفور بھی ہے، رحمان و رحیم بھی اور عفو و رؤف بھی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس نے اپنے اوپر رحمت کی پابندی خود عائد کر لی ہے اور اس کو اپنے اوپر فرض گردان لیا ہے۔

﴿كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ﴾ (انعام:۱۲)

''اللہ نے از خود اپنے اوپر رحمت کو لازم کر لیا ہے۔''

قاصدِ خاص کو حکم ہوتا ہے کہ ہمارے گنہگار بندوں کو ہماری طرف سے سلام پہنچاؤ، اور تسلی کا یہ پیام دو کہ ہمارا باب رحمت ہر وقت کھلا رہتا ہے۔

﴿وَ اِذَا جَآءَ كَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِنَا فَقُلْ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْٓءًا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَ اَصْلَحَ فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ (انعام:۵۴)

''اے پیغمبر جب تیرے پاس وہ آئیں، جو میری آیتوں پر یقین رکھتے ہیں، تو ان سے کہہ کہ تم پر سلامتی ہو، تمہارے پروردگار نے اپنے اوپر از خود اپنے بندوں پر مہربان ہونا لازم کر لیا ہے کہ جو کوئی تم میں سے براہِ نادانی برائی کر بیٹھے، پھر اس کے بعد بارگاہِ الٰہی کی طرف رجوع کرے اور نیک بنے تو بے شک خدا بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔''

قرآن کی تعلیم کے مطابق اس وسیع عرصۂ کائنات کا کوئی ذرہ اس سایۂ رحمت سے محروم نہیں۔

﴿وَ رَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ﴾ (الاعراف:۱۵۶)

''اور میری رحمت نے ہر چیز کو گھیر لیا ہے۔''

بخاری و ترمذی وغیرہ کی صحیح حدیثوں میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب اس عالم کو پیدا کیا تو از خود اپنے اوپر رحمت کی پابندی عائد کر لی، جامع ترمذی میں ہے کہ ایک دفعہ آپؐ نے فرمایا، اگر مومن کو یہ معلوم ہوتا کہ خدا کے پاس کتنا عتاب ہے تو وہ جنت کی طمع نہ کرتا اور اگر کافر کو یہ معلوم ہوتا کہ خدا کی رحمت کس قدر بے حساب ہے تو وہ جنت سے مایوس نہ ہوتا۔ یہ اسلام کے تخیل کی صحیح تعبیر ہے، بارگاہِ احدیت کا آخری قاصد اپنے پروردگار کی جانب سے گنہگاروں کو بشارت سناتا ہے کہ اے آدم کے بیٹو! جب تک تم مجھے پکارتے رہو گے اور مجھ سے آس لگائے رہو گے میں تمہیں بخشتا رہوں گا۔ خواہ تم میں کتنے ہی عیب کیوں نہ ہوں، مجھے پروا نہیں، اے آدم کے بیٹے اگر تمہارے گناہ آسمان کے بادلوں تک بھی پہنچ جائیں اور پھر تم مجھ سے معافی مانگو تو میں معاف کر دوں گا خواہ تم میں کتنے ہی

عیب کیوں نہ ہوں، مجھے پروانہیں، اے آدم کے بیٹو! اگر پوری سطح زمین بھی تمہارے گناہوں سے بھری ہو، پھر تم میرے پاس آؤ اس حال میں کہ کسی کو میرا شریک نہ بناتے ہو تو میں بھی تمہارے پاس پوری سطحِ زمین بھر مغفرت لے کر آؤں گا۔ (۱) کیا انسانوں کے کانوں نے اس رحمت، اس محبت، اس عفوِ عام کی بشارت کسی اور قاصد کی زبان سے بھی سنی ہے۔

حضرت ابوایوب انصاریؓ کی وفات کا وقت جب آیا تو انہوں نے لوگوں سے کہا کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اگر تم لوگ گناہ نہ کرتے تو خدا اور کوئی مخلوق پیدا کرتا جو گناہ کرتی اور وہ اس کو بخشتا، یعنی اللہ تعالیٰ کو اپنے رحم و کرم کے اظہار کے لیے گنہگاروں ہی کی تلاش ہے کہ نیکوکاروں کو تو سب ڈھونڈھتے ہیں مگر گنہگاروں کو صرف وہی ڈھونڈتا ہے۔ (۲)

دنیا میں انسانوں کے درمیان جو رحم و کرم اور مہر و محبت کے عناصر پائے جاتے ہیں اور جن کی بنا پر دوستوں، عزیزوں اور قرابت داروں اور اولادوں میں میل ملاپ اور رسم و محبت ہے، نیز جس کی بنا پر دنیا میں عشق و محبت کے شاندار مناظر نظر آتے ہیں، تم کو معلوم ہے کہ یہ اس شاہدِ حقیقی کے سرمایۂ محبت کا کون سا حصہ ہے؟ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کے سو حصے کیے، ان میں سے ایک حصہ اپنی مخلوقات کو عطا کیا، جس کے اثر سے لوگ ایک دوسرے پر باہم رحم کیا کرتے ہیں، باقی ننانوے حصے خدا کے پاس ہیں۔ (۳) اس لطف و کرم اور مہر و محبت کی بشارتیں کس مذہب نے انسانوں کو سنائی ہیں، اور کس نے گنہگار انسانوں کے مضطرب قلوب کو اس طرح تسلی دی ہے، صحیح بخاری میں ایک واقعہ مذکور ہے کہ ایک شخص شراب خوری کے جرم میں بار بار گرفتار ہو کر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پیش ہوا، صحابہؓ نے تنگ آ کر کہا۔ خداوندا تو اپنی لعنت اس پر نازل کر کہ یہ کس قدر بار بار لایا جاتا ہے، رحمۃ للعالمین کو لوگوں کی یہ بات ناپسند آئی، فرمایا اس پر لعنت نہ کرو کہ اس کو خدا اور رسول سے محبت ہے۔ (۴) تم نے دیکھا کہ اسلام نے گنہگاروں کے لیے خدا کی محبت کا دروازہ کس طرح کھول رکھا ہے۔

محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم نے ان عربوں کو جو خدا کی محبت کیا، خدا کی معرفت سے بھی ناآشنا تھے، کس طرح آشنائے حقیقت کر دیا اور ان کو ذاتِ الٰہی کے ساتھ وابستگی، محبت اور سرشاری کے لطف سے کس درجہ بہرہ اندوز کر دیا، بلالؓ کو دیکھو ٹھیک دوپہر کے وقت عرب کی جلتی ہوئی ریت پر ان کو لٹایا جاتا ہے، ایک گرم پتھر سینہ پر رکھا جاتا ہے اور خدائے واحد سے انحراف کے لیے ان کو مجبور کیا جاتا ہے، وہ یہ سب تکلیفیں اٹھاتے ہیں، مگر زبان سے

(۱) جامع ترمذی ابواب الدعوات دو مگر کتب احادیث (صحیح)

(۲) مسند ابن حنبل ج ۵ ص ۴۱۴۔

(۳) بخاری کتاب الادب باب ص ۸۸۷۔

(۴) بخاری کتاب الحدود باب ما یکرہ من لعن شارب الخمر ص ۱۰۰۲۔

وہی احد احد (ایک ایک) کا ترانہ نکلتا ہے (۱) مکہ کا ذرہ ذرہ صدائے حق کا دشمن ہے' ابوذر غفاریؓ یہ جان کر بھی صحن مکہ میں جوش وحدت پرستی سے سرشار ہو کر کلمۂ توحید کا بآوازِ بلند اعلان کرتے ہیں' ہر طرف پتھروں اور ہڈیوں کی بارش ہوتی ہے بعض لوگ آ کر چھڑا دیتے ہیں' لیکن جب دوسری صبح نمودار ہوتی ہے تو پھر محبتِ الٰہی کے کیف و مستی کا وہی عالم نظر آتا ہے اور مشرکین کی طرف سے وہی سزا ملتی ہے۔ (۲)

ایک صحابیؓ جو رات کو میدانِ جنگ میں ایک پہاڑ پر پہرہ دینے کے لیے متعین تھے' وہ اپنی نیند ٹالنے کے لیے خدا کی یاد میں مصروف ہوتے ہیں' دشمن پے در پے تین دفعہ تیر مارتا ہے جو بدن میں پیوست ہو جاتا ہے اور وہ بدستور نماز میں محو رہتے ہیں ان کے ساتھی پوچھتے ہیں کہ تم نے نماز کیوں نہیں توڑی کہتے ہیں کہ جو سورہ شروع کی تھی' جی نہ چاہا کہ اس کو تمام کیے بغیر چھوڑ دوں۔

محمد رسول اللہ ﷺ کے دو جانشین عین حالتِ نماز میں زخم کھا کر گرتے ہیں' مگر مقتدیوں کی صف اس حی و باقی کے سامنے کھڑی ہو کر ہر فانی ومیت ہستی کی محبت سے بے نیاز رہتی ہے' اسی لیے خدا نے بشارت دی کہ وہ خدا کے محبوب اور خدا ان کا محبوب ہے یعنی رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ۔

مدینہ میں ایک اللہ والے مسلمان نے وفات پائی' اس کا جنازہ اٹھا' آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔ اس کے ساتھ نرمی کرو کہ اللہ نے بھی اس کے ساتھ نرمی کی ہے کیونکہ اس کو اللہ اور اس کے رسول سے محبت تھی' قبر کھودی جانے لگی تو فرمایا' اس کی قبر کشادہ رکھو کہ خدا نے بھی اس کے ساتھ کشادگی فرمائی ہے' اس بار بار کے اہتمام کو دیکھ کر صحابہؓ نے پوچھا' یا رسول اللہ ﷺ آپ کو اس مرنے والے کی موت کا غم ہے؟ فرمایا' ہاں کیونکہ اس کو خدا اور رسول پیارے تھے' ایک دفعہ آپ نے ایک صاحب کو کسی جماعت کا افسر بنا کر بھیجا' وہ جب نماز پڑھاتے تو ہر سورۃ کے آخر میں قل ہو اللہ ضرور پڑھتے جب یہ جماعت سفر سے لوٹ کر آئی تو خدمتِ اقدس میں یہ واقعہ عرض کیا' فرمایا' ان سے پوچھو کہ وہ ایسا کیوں کرتے ہیں لوگوں نے پوچھا تو جواب دیا کہ یہ اس لیے کرتا ہوں کہ اس سورہ میں رحم والے خدا کی صفت کا بیان ہے تو مجھ کو اس کے پڑھنے سے محبت ہے' فرمایا کہ ان کو بشارت دو کہ وہ رحم کرنے والا خدا بھی ان سے محبت کرتا ہے یہ بشارت محمد رسول اللہ ﷺ کی زبانِ مبارک کے سوا کسی اور نے بھی سنائی ہے۔

صحیح بخاری اور مسلم میں متعدد طریقوں سے حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ ایک صحابی نے

---

(۱) ابن ہشام ذکر عدوان المشرکین واسد الغابہ ج ۱ ص ۲۰۶ مصر۔

(۲) طبقات ابن سعد تذکرہ حضرت ابوذر غفاریؓ

(۳) صحیح بخاری وسنن ابی داؤد کتاب الطہارت باب الوضوء من الدم۔

(۴) ابن ماجہ کتاب الجنائز باب ماجاء فی حضر البقر۔

(۵) مسلم کتاب صلوٰۃ المسافرین قصرہا فضل قرأۃ قل ہو اللہ احد' یہ واقعہ بخاری کتاب الصلوٰۃ باب الجمع بین السورتین میں دوسری طرح مروی ہے اور اس میں رسول اللہ ﷺ کے الفاظ بھی دوسرے ہیں۔

خدمت والا میں حاضر ہو کر دریافت کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ قیامت کب آئے گی' فرمایا تم نے اس کے لیے کیا سامان کر رکھا ہے انہوں نے نادم ہو کر شکستہ دلی سے عرض کی یا رسول اللہ میرے پاس نہ تو نمازوں کا بڑا ذخیرہ ہے نہ روزوں کا اور نہ صدقات و خیرات کا' جو کچھ سرمایہ ہے' وہ صرف خدا اور رسول کی محبت ہے اور بس! فرمایا تو انسان جس سے محبت کرے گا' اسی کے ساتھ رہے گا۔ صحابہؓ نے اس بشارت کو سن کر اس دن بڑی خوشی منائی۔ (۱)

صحیح مسلم کی روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا جب خدا کسی بندہ کو چاہتا ہے تو فرشتۂ خاص جبریلؑ سے کہتا ہے کہ میں فلاں بندہ کو پیار کرتا ہوں' تم بھی اس کو پیار کرو' تو جبریلؑ اس کو پیار کرتے ہیں اور آسمان والے بھی اس کو پیار کرتے ہیں اور پھر زمین میں اس کو ہر دل عزیزی اور حسنِ قبول بخشا جاتا ہے۔ (۲)

صحیح بخاری میں حضرت ابو ہریرہؓ کی رسول اللہ ﷺ سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو بندہ اپنی طاعتوں سے میری قربت کو تلاش کرتا رہتا ہے تو میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں یہاں تک کہ میں اس کا کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے' اور اس کی آنکھ ہو جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے' میں ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے' اور پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے۔ (۳) یہ دولت' یہ نعمت' یہ سعادت' آستانۂ محمدی کے سوا کہیں اور نہیں بٹتی۔

امام بزاز نے مسند میں حضرت ابو سعیدؓ سے روایت نقل کی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا' میں ان لوگوں کو پہچانتا ہوں جو نہ نبی ہیں اور نہ شہید ہیں' لیکن روزِ قیامت میں ان کے مرتبہ کی بلندی پر انبیا اور شہدا بھی رشک کریں گے' یہ وہ لوگ ہیں جن کو خدا سے محبت ہے اور جن کو خدا پیار کرتا ہے وہ اچھی باتیں بتاتے اور بری باتوں سے روکتے ہیں الخ۔ (۴) یہ قابل رشک رتبہ محمد رسول اللہ ﷺ کے سوا اور کس کے ذریعہ عطا ہوا ہے۔

امام مالک نے روایت کی ہے کہ آپؐ نے فرمایا خداوند تعالیٰ یہ ارشاد فرماتا ہے کہ ان کو پیار کرنا مجھ پر لازم ہے جو آپس میں ایک دوسرے کو میری محبت کے سبب سے پیار کرتے ہیں اور میری محبت میں ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھتے ہیں اور میری محبت میں ایک دوسرے سے ملتے ہیں اور میری محبت میں ایک دوسرے کے لیے اپنی جان و مال وقف کرتے ہیں (۵) یہ محبتِ الٰہی کی نیرنگیاں اسلام ہی کے پردہ پر نظر آتی ہیں۔

ترمذی میں حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا۔ لوگو! خدا سے محبت کرو کہ وہ تمہیں اپنی نعمتیں عطا کرتا ہے اور اسی کی محبت کے سبب سے مجھ سے محبت کرو اور میری محبت کے سبب سے میرے اہلِ بیت

---

(۱) مسلم کتاب الادب المرء مع من احب بخاری کتاب الادب باب ماجاء فی قول الرجل ویلک۔

(۲) مسلم کتاب الادب باب اذا احب اللہ عبداً حبہ بعبادہ۔

(۳) بخاری کتاب الرقاق باب التواضع۔

(۴) اس کی ہم معنی حدیثیں ترمذی' مالک اور شعب الایمان بیہقی میں بھی ہیں دیکھو مشکوٰۃ کتاب الآداب فی حب اللہ فصل ثانی (صفحہ ۱۰۰)

(۵) مشکوٰۃ باب مذکور۔

سے محبت کرو' (۱) یہ عشق ومحبت کی دعوت محبوبِ ازل کے سوا اور کون دے سکتا ہے؟

عام مسلمانوں میں پیغمبرِ اسلام کا لقب ''حبیبِ خدا'' ہے۔ دیکھو کہ حبیب اور محبوب میں خلعت ومحبت کے کیا کیا ناز ونیاز ہیں' آپ خشوع وخضوع کی دعاؤں اور خلوت وتنہائی کی روحانی ملاقاتوں میں کیا ڈھونڈتے اور کیا مانگتے تھے' کیا چاہتے اور کیا سوال کرتے تھے' امام احمد اور بزار نے اپنی اپنی مسندوں میں' ترمذی نے جامع میں' حاکم نے مستدرک میں اور طبرانی نے معجم میں متعدد صحابیوں سے نقل کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ اپنی دعاؤں میں محبتِ الٰہی کی دولت مانگا کرتے تھے' انسان کو اس دنیا میں سب سے زیادہ محبوب اپنی اور اپنے اہل وعیال کی جان ہے لیکن محبوبِ خدا کی نگاہ میں یہ چیزیں ہیچ تھیں' دعا فرماتے تھے' خداوندا۔

((اَسْئَلُ حُبَّکَ وَ حُبَّ مَنْ یُّحِبُّکَ وَ حُبَّ عَمَلٍ یُّقَرِّبُ اِلٰی حُبِّکَ)) (احمد' ترمذی' حاکم)

''میں تیری محبت مانگتا ہوں اور جو تجھ سے محبت کرتا ہو اس کی محبت اور اس کام کی محبت جو تیری محبت سے قریب کر دے۔''

﴿اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ حُبَّکَ اَحَبَّ اِلَیَّ مِنْ نَفْسِیْ وَ اَھْلِیْ وَمِنَ الْمَآءِ الْبَارِدِ﴾ (ترمذی وحاکم)

''الٰہی تو اپنی محبت کو میری جان سے میرے اہل وعیال سے اور ٹھنڈے پانی سے بھی زیادہ میری نظر میں محبوب بنا۔''

عرب میں ٹھنڈا پانی دنیا کی تمام دولتوں اور نعمتوں سے زیادہ گراں اور قیمتی ہے لیکن حضور کی پیاس اس مادی پانی کی خنکی سے نہیں بجھتی تھی وہ صرف محبتِ الٰہی کا زلالِ خالص تھا جو اس تشنگی کو تسکین دے سکتا تھا' عام انسان روٹی سے جیتے ہیں مگر ایک عاشقِ الٰہی (مسیحؑ) کا قول ہے کہ انسان صرف روٹی سے نہیں جیتا' پھر وہ کون سی روٹی ہے جس کو کھا کر انسان پھر کبھی بھوکا نہیں ہوتا' حضور دعا فرماتے ہیں:

((اَللّٰھُمَّ ارْزُقْنِیْ حُبَّکَ وَ حُبَّ مَنْ یَّنْفَعَنِیْ فِیْ حُبِّکَ)) (ترمذی)

''خداوند! تو اپنی محبت اور اس کی محبت جو تیری محبت کی راہ میں نافع ہو مجھے روزی کر۔''

عام ایمان خدا اور رسول پر یقین کرنا ہے مگر جانتے ہیں کہ اس راہ میں آخری منزل کیا ہے' صحیحین میں ہے:

((مَا کَانَ اللّٰہُ وَ رَسُوْلُہٗٓ اَحَبَّ اِلَیْہِ مِمَّا سِوَاھُمَا)) (۲)

'یہ کہ خدا اور رسول کی محبت کے آگے ماسوا کی محبتیں ہیچ ہو جائیں۔''

بعض مذاہب کو اپنی اس تعلیم پر ناز ہے کہ وہ انسانوں کو یہ سکھاتے ہیں کہ وہ اپنے خدا کو ماں باپ سمجھیں اور اس سے اس طرح محبت کریں جس طرح اپنے والدین سے کرتے ہیں اور چونکہ اسلام نے اس طریقۂ تعبیر کو اس

(۱) ینابیع المودۃ مناقب اہل بیت بروایت ترمذی۔

(۲) مسلم کتاب الایمان۔ وبخاری کتاب الایمان باب حلاوۃ الایمان۔

بناء پر کہ وہ شرک کا راستہ ہے ممنوع قرار دیا ہے' اس لیے ان مذاہب کے بہت سے پیرو یہ سمجھتے ہیں کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم محبتِ الٰہی کے مقدس جذبات سے خالی ہے' لیکن جیسا کہ پہلے گزر چکا کہ یہ دعویٰ سرتاپا بے بنیاد ہے' بلکہ واقعہ یہ ہے کہ تعلیمِ محمدی کی بلندیِ نظر اور محبت کا علوئے معیار دونوں ان مذاہب کے پیش کردہ نظر و معیار سے بہت بالاتر ہیں' ثبوت میں قرآن پاک کی یہ آیت پاک بھی پہلے پیش کی جا چکی ہے:

﴿فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا﴾ (البقرۃ :۲۰۰)

''تم خدا کو اس طرح یاد کرو جس طرح اپنے باپوں کو یاد کرتے ہو بلکہ اس سے بہت زیادہ یاد کرو۔''

لیکن احادیث سے ہمارا دعویٰ اور بھی زیادہ واضح ہو جاتا ہے' لڑائی کا میدان ہے دشمنوں میں بھاگ دوڑ پڑی ہے جس کو جہاں امن کا گوشہ نظر آ رہا ہے' اپنی جان بچا رہا ہے' بھائی بھائی سے' ماں بچہ سے' بچہ ماں سے الگ ہے۔ اسی حال میں ایک عورت آتی ہے' جس کا بچہ میدانِ حشر میں گم ہو گیا ہے' محبت کی دیوانگی کا یہ عالم ہے کہ جو بچہ بھی اس کے سامنے آ جاتا ہے' اس کو اپنے بچہ کے جوشِ محبت میں چھاتی سے لگا لیتی ہے اور دودھ پلاتی ہے دفعۃً رحمتہ للعالمین کی نظر پڑتی ہے اور آپؐ صحابہ سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں' کیا یہ ممکن ہے کہ یہ عورت خود اپنے بچہ کو اپنے ہاتھ سے دہکتی آگ میں ڈال دے؟' لوگ عرض کرتے ہیں ہرگز نہیں۔ آپؐ فرماتے ہیں' تو جتنی محبت ماں کو اپنے بچہ سے ہے خدا کو اپنے بندوں سے اس سے کہیں زیادہ محبت ہے۔ (۱)

ایک دفعہ ایک غزوہ سے آپ واپس تشریف لا رہے ہیں' ایک عورت اپنے بچہ کو گود میں لے کر سامنے آتی ہے' اور عرض کرتی ہے' یا رسول اللہ! ایک ماں کو اپنی اولاد سے جتنی محبت ہوتی ہے کیا خدا کو اپنے بندوں سے اس سے زیادہ نہیں۔ فرمایا' ہاں بے شک اس سے زیادہ ہے۔ تو بولی کوئی ماں تو اپنی اولاد کو خود آگ میں ڈالنا گوارا نہ کرے گی یہ سن کر فرطِ اثر سے آپؐ پر گریہ طاری ہو گیا' پھر سر اٹھا کر فرمایا' خدا صرف اس بندہ کو عذاب دیتا ہے جو سرکشی سے ایک کو دو کہتا ہے۔ (۲)

آپ ایک مجلس میں تشریف فرما ہیں' ایک صحابیؓ پرند کو مع اس کے بچوں کے چادر میں باندھ کر لاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یا رسول اللہ! میں نے ایک جھاڑی سے ان بچوں کو اٹھا کر کپڑے میں لپیٹ لیا' ماں نے دیکھا تو میرے سر پر منڈلانے لگی میں نے ذرا کپڑے کو کھول دیا تو فوراً آ کر بچوں پر گر پڑی۔ ارشاد ہوا کیا بچوں کے ساتھ ماں کی اس محبت پر تم کو تعجب ہے قسم ہے اس ذات کی جس نے مجھ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا' جو محبت اس ماں کو اپنے بچوں کے ساتھ ہے' خدا کو اپنے بندوں کے ساتھ اس سے بدرجہا زیادہ ہے۔ (۳)

ایک صاحب ایک چھوٹے بچہ کو لے کر خدمتِ اقدس میں حاضر ہوتے ہیں' محبت کا یہ حال تھا کہ وہ بار بار اس کو گلے سے لگائے جاتے تھے۔ آنحضرت ﷺ نے ان سے پوچھا کہ کیا تم کو اس بچہ سے محبت ہے؟ انہوں

(۱) صحیح بخاری کتاب الادب' باب رحمۃ الولد۔

(۲) سنن نسائی باب ما یرجی من الرحمۃ۔

(۳) مشکوٰۃ بحوالہ ابوداؤد کتاب الاسماء باب رحمۃ اللہ وغضبہ۔

نے کہا' ہاں' فرمایا تو اللہ تعالیٰ کو تم سے اس سے زیادہ محبت ہے' جتنی تم کو اس بچہ سے ہے' وہ تمام رحم کرنے والوں میں سب سے بڑا رحم کرنے والا ہے۔ (۱)

جمالِ حق کا پہلا مشتاق اور مستورِ ازل کے زیرِ نقاب چہرہ کا پہلا بند کشا' زندگی کے آخری مرحلوں میں ہے' مرض کی شدت ہے' بدن بخار سے تپ رہا ہے' اٹھ کر چل نہیں سکتا لیکن یک بیک وہ اپنے میں ایک اعلانِ خاص کی طاقت پاتا ہے۔ مسجد نبوی میں جانثار حاضر ہوتے ہیں سب کی نظریں حضور کی طرف لگی ہیں' نبوت کا آخری پیغام سننے کی آرزو ہے' دفعتاً لب مبارک ہلتے ہیں اور یہ آواز آتی ہے لوگو! میں خدا کے سامنے اس بات کی برأت کرتا ہوں کہ انسانوں میں میرا کوئی دوست ہے' مجھ کو خدا نے اپنا پیارا بنایا ہے جیسے ابراہیمؑ کو اس نے اپنا پیارا بنایا تھا۔ (۲) یہ تو وفات سے پہلے کا اعلان تھا' عین حالتِ نزع میں زبان پر یہ کلمہ تھا خداوند بہترین رفیق۔

اللہ تعالیٰ کی کریمی و رحیمی اس کی بیچارہ نوازی' عاجزوں اور درماندوں کی دست گیری' اور اپنے گنہگار بندوں پر اس کی شانِ بخشش کا ترانہ محمد رسول اللہ ﷺ نے خود اپنے کانوں سے سنا اور نادم و متاسف سیہ کاروں تک اس مژدہ کو پہنچا کر ان کے شکستہ اور زخمی دلوں پر مرہم رکھا' حضرت ابوذرؓ کہتے ہیں کہ حضرت رحمۃ للعالمین نے یہ پیغامِ ربانی ہم کو سنایا۔

میرے بندو! میں نے اپنے اوپر بھی اور تمہارے درمیان بھی ظلم کو حرام کیا ہے' تو ایک دوسرے پر تم ظلم نہ کیا کرو' اے میرے بندو! تم میں ہر ایک گمراہ تھا' لیکن جس کو میں نے راہ دکھائی تو مجھ سے راستہ پوچھو' میں بتاؤں گا' اے میرے بندو! تم میں ہر ایک بھوکا تھا لیکن جس کو میں نے کھلایا تو مجھ سے کھانا مانگو' میں تم کو کھلاؤں گا' اے میرے بندو! تم میں ہر ایک پیاسا تھا' لیکن جس کو میں نے پلایا تو مجھ سے پانی مانگو' میں تم کو پلاؤں گا' اے میرے بندو! تم میں ہر ایک ننگا تھا لیکن جس کو میں نے پہنایا تو مجھ سے کپڑا مانگو میں تم کو پہناؤں گا' اے میرے بندو' تم دن رات گناہ کرتے ہو اور میں سب گناہوں کو معاف کرتا ہوں' تم مجھ سے معافی مانگو' میں تم کو معاف کروں گا۔ (۳)

اے میرے بندو! مجھے نقصان پہنچانا تمہاری طاقت میں نہیں ہے اور نہ مجھے نفع پہنچانا تمہاری قدرت میں ہے' اے میرے بندو! اگر تمہارے اگلے پچھلے جن و انس چھوٹے بڑے مرد اور عورت دنیا کے سب سے بڑے پرہیزگاروں کے برابر ہو جائیں تو میری شہنشاہی میں ایک ذرہ اضافہ نہ ہوگا' اور اے میرے بندو! اگر تمہارے اگلے اور پچھلے جن و انس' چھوٹے اور بڑے' مرد اور عورت دنیا کے سب سے بڑے گنہگاروں کے برابر ہو جائیں تو بھی میری شہنشاہی میں ذرہ برابر کمی نہ ہوگی' اے میرے بندو! اگر تمہارے اگلے اور پچھلے اور جن و انس سب کسی ایک زمین میں کھڑے ہو کر مجھ سے مانگیں اور میں سب کے سوال کو پورا کروں تو میرے خزانہ میں کچھ کمی نہ ہوگی۔ لیکن اتنی جتنی ایک سوئی

---

(۱) الادب المفرد امام بخاری باب رحمۃ العیال ص ۵۷ مصر۔
(۲) صحیح مسلم کتاب المساجد۔
(۳) صحیح بخاری ذکر نبوی۔

سمندر کے پانی میں ڈبو کر نکال لی جائے' اے میرے بندو! تمہارے ہی عمل ہوں گے جن کو میں گن گن کر تم کو واپس کروں گا۔ اور پورا کروں گا۔ تو جس کو بھلائی ملے وہ خدا کا شکر ادا کرے اور جس کو برائی ملے وہ خود اپنے ہی کو ملامت کرے۔ (۱)

محبت کا یہ پر کیف نغمہ دنیا نے محمد رسول اللہ ﷺ ہی کی زبانِ مبارک سے سنا' تسلی و تشفی کا یہ روح افزا پیام آپؐ ہی کے مبارک لبوں سے ادا ہوا' عفو و کرم کے بحرِ بیکراں کا یہ ساحلِ امید آپؐ ہی کے دکھانے سے ہم کو نظر آیا اور گنہگاروں کو "میرے بندو" کہہ کر پکارے جانے کی عزت آپؐ ہی کے وسیلہ سے میسر آئی۔ ﷺ

❀ ❀ ❀

(۱) صحیح مسلم و ترمذی کتاب الزہد و مسند احمد بن حنبل ج ۵ ص ۱۶۰ و ص ۱۷۷ و ادب المفرد امام بخاری باب الظلم ص ۶۵ مصر۔ میں نے صحیح مسلم کی روایت سامنے رکھی ہے' لیکن بعض الفاظ مسند سے لے کر بڑھا دیے ہیں' اس کے بعض بعض ٹکڑے انجیل میں بھی ملتے ہیں دیکھو متی ۳۵۔ ۲۵ تا ۴۵ مگر دونوں کے ملانے سے وہی فرق نمایاں ہوتا ہے جو ناقص اور کامل میں ہونا چاہیے۔

فرشتوں پر ایمان

﴿وَمَلٰئِکَتِہٖ﴾

ملائکہ کا لفظ جمع ہے اس کا واحد ملک ملاک اور مالک تین طرح سے مستعمل ہے اس کے لغوی معنی قاصد اور رسول کے ہیں' اسی لیے قرآن پاک میں ملائکہ کے لیے رسل کا لفظ بھی آیا ہے جس کے معنی قاصد اور پیام رساں کے ہیں۔ ان سے مراد وہ غیر مادی مگر مخلوق نیک ہستیاں یا ارواح ہیں جو اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق عالم اور اس کے اسباب وعلل کے کاروبار کو چلا رہی ہیں اگر یہ عالم ایک مشین ہے تو ملائکہ اس کا انجن اور اس کے کل پرزوں کو حرکت دینے والی قوتیں ہیں' جو خدا کے مقررہ احکام اور قوانین کے مطابق ان کو حرکت دے رہے اور چلا رہے ہیں' یعنی وہ خالق اور اس کی مخلوقات کے درمیان پیام رسانی اور سفارت کی خدمت اس طرح انجام دے رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے حکم اور مرضی کو ان پر القا کرتا ہے اور وہ ایک بے اختیار محکوم کی طرح اس کو مخلوقات میں جاری اور نافذ کرتے ہیں' ان کو خود نہ کوئی ذاتی اختیار ہے اور نہ ان کا کوئی ذاتی ارادہ ہے وہ سرتاپا اطاعت ہیں اور خدا کے حکم سے سرِ مو تجاوز نہیں کرتے' گویا ان کی خلقت اطاعت اور فرمان برداری کے لیے کی گئی ہے دنیا پر رحمت یا عتاب جو کچھ نازل ہوتا ہے وہ انہی کے ذریعہ سے ہوتا ہے اور خدا انبیا پر اپنے جو احکام اتارتا یا ان سے کلام کرتا ہے وہ انہی کی وساطت سے کرتا ہے۔

ملائکہ کا تخیل مذاہبِ قدیمہ میں

دنیا کے تمام مذاہب بلکہ قدیم یونانی مصری فلسفہ میں بھی اس قسم کی ہستیوں کا وجود تسلیم کیا گیا ہے صابی مذہب میں یہ ستاروں اور سیاروں کی صورت میں مانے گئے ہیں' یونانی' مصری (سکندری) فلسفہ میں ان کا نام عقولِ عشرہ (دس عقلیں) رکھا گیا ہے اور ساتھ ہی نو آسمانوں کے اندر بھی الگ الگ ذی ارادہ نفوس تسلیم کیے گئے ہیں بلکہ خالص یونانی فلسفہ میں بھی بعض غیر مادی ارواحِ مجردہ کا پتہ لگتا ہے جن میں سب سے اہم لوگس کا تخیل ہے جس سے مقصود وہ اولیں ہستی ہے جس کو خدا نے تمام کائنات کی پیدائش کا ذریعہ اور واسطہ قرار دیا ہے اور جس کو اہلِ فلاسفہ عقلِ اول سے تعبیر کرتے ہیں۔ پارسیوں میں ان ہستیوں کا نام ''امشاسپند'' ہے اور ان کی بے شمار تعداد قرار دے گئی ہے' یہودی ان کو وبیم کہتے ہیں اور ان میں سے خاص خاص کے نام جبریل اور میکائیل وغیرہ رکھتے ہیں' عیسائی بھی ان کو انہی ناموں سے یاد کرتے ہیں اور جبریل اور روح القدس وغیرہ الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں'

ہندوؤں میں وہ دیوتاؤں اور دیویوں کے نام سے روشناس ہیں' جاہل عرب ان کو خدا کی بیٹیاں کہہ کر پکارتے ہیں' بہر حال یہ تمام مختلف صحیح اور غلط نام ایک ہی حقیقت کی مختلف تعبیریں ہیں' جس سے مراد وہ روحانی وسائط ہیں' جو صانع ومصنوعات اور خالق ومخلوقات کے درمیان اس کے حکم کے مطابق عمل پیرا اور کارفرما ہیں۔

مذاہبِ سابقہ میں ان غیر مادی' ذی روح مخلوق' ہستیوں کی حیثیت نہایت مشتبہ تھی' وہ کبھی مخلوق کہی جاتی تھیں اور کبھی خدائی کے مرتبہ تک بھی بلند کر دی جاتی تھیں' ہندوؤں کے دیوتاؤں اور دیویوں کی یہی کیفیت تھی' پارسیوں میں امشاسپند کا بھی یہی حال تھا' کہ کبھی ان کی حیثیت فرشتوں کی رہتی تھی' کبھی وہ خدا کے مقابل بن جاتی تھیں' اور کبھی خود خدا ان میں سے ایک ہو جاتا تھا' ہندوؤں کی طرح پارسیوں میں بھی وہ قابلِ پرستش سمجھی جاتی تھیں ان کے نزدیک سب سے عالی رتبہ امشاسپند تھے اور ان کے تحت میں' ۳۳ پھر ان میں سے ہر ایک کے ماتحت ہزاروں تھے اور چونکہ پارسی نیکی اور بدی کے دو متقابل خداؤں کے قائل تھے اس لیے دونوں کے ماتحت اچھے اور برے فرشتوں کی بے شمار تعداد تھی' نیکی کے فرشتے براہِ راست نیکی کی چیزوں کو اور برائی کے فرشتے مصیبتوں' ہلاکتوں اور برائیوں کو دنیا میں پیدا کرتے تھے اور اپنے اپنے خدا کی طرف سے ان اشیا پر حاکم سمجھے جاتے تھے دونوں خدا اپنی اپنی فوجوں اور لشکروں کے پرے لے کر باہم نبرد آزما رہتے تھے یہ بھی ان کا اعتقاد تھا کہ ہر امشاسپند یا فرشتہ کے ساتھ ایک یزد یعنی مادہ (فرشتہ) بھی ہوتی تھی جو اس کی بیوی تھی۔ ہندوؤں میں نر دیوتاؤں اور مادہ دیبیوں کا تصور تھا مگر ان نر و مادہ ہستیوں میں کسی نر کو کسی مادہ سے خصوصیتِ خاص نہ تھی بلکہ ہر ایک جنس کا ہر فرد دوسری جنس کے ہر فرد سے لطف اندوز ہو سکتا تھا۔ یہودیوں میں فرشتوں کی حیثیت ایسی تھی کہ ان کی تقدیس اور ثناء وصفت خدا سے مشتبہ ہو جاتی تھی' نظر آنے والے فرشتہ کی تعظیم کی جاتی تھی' اس کے آگے جھکا جاتا تھا' اور اس کو خداوند کہہ کر اس طرح خطاب کیا جاتا تھا کہ کہیں کہیں یہ شبہ ہو جاتا ہے کہ خدا مخاطب ہے یا فرشتہ (تکوین ۱۶' ۱۳ و ۱۸' ۲' ۳' ۲۲) وہ کبھی کبھی خدا کے بیٹے بھی کہے جاتے تھے (تکوین ۶۔۲) عیسائیوں میں ان میں سے بعض مثلاً روح القدس خدا کا ایک جزو تسلیم ہو کر تثلیث کا رکن ہے۔

صابیوں میں فرشتوں کی قربانی کی جاتی تھی ان کے ہیکل بنائے جاتے تھے اور ان کو خدا تسلیم کیا جاتا تھا' عربوں میں فرشتے مادہ سمجھے جاتے تھے وہ خدا کی بیٹیاں کہہ کر پکارے جاتے تھے' ان کی پرستش ہوتی تھی' اور سمجھا جاتا تھا کہ وہ خدا کے دربار میں سفارشی ہوں گے۔ یونانیوں میں عقلِ اول اور عقولِ عشرہ تمام عالم کے خالق کارفرما اور مرجعِ کل مانے گئے اور خدا کو معطل ٹھہرایا گیا۔

اسلام میں فرشتوں کی حقیقت

اسلام نے آ کر ان تمام عقائد کو مٹا دیا' خدائی اور ربوبیت کی ہر صفت سے وہ محروم بنائے گئے ان کی پرستش ناجائز کی گئی' نر و مادہ کی مادی جنسیت سے وہ پاک کیے گئے' اور انسانوں کو ان پاک مخلوقات کی غلامی و بندگی سے

آزاد کیا گیا۔ ان کی تعداد و شمار اور درجہ بندی کا کوئی تخیل باقی نہیں رکھا گیا۔ ان کی ہستی خدائے تعالیٰ کے سامنے ایک سراپا مطیع و فرمان بردار غلام کی قرار دی گئی جس کا کام شب و روز صرف آقا کا حکم بجالانا ہے' عالم میں ان کا کسی قسم کا تصرف نہیں مانا گیا اور نہ نیکی و بدی کی دو تقسیمیں کی گئیں' نہ وہ الگ الگ جنس مخلوقات کے حاکم و منتظم قرار دیے گئے' قرآن میں ان کی ہستی صرف اس قدر تسلیم کی گئی ہے کہ وہ صرف غیر مادی' ذی روح مخلوقات ہیں جن کا کام خدا کی حمد و ثنا اور اطاعت و فرمان برداری ہے۔ خالق اور اس کے مخلوقات کے درمیان وہ پیغام رسانی کا ذریعہ ہیں' خدا کے حکم کے مطابق وہ مخلوقات کے کارخانہ کو چلا رہے ہیں لیکن اس چلانے میں خود ان کی ذاتی مرضی اور ارادہ کو کوئی دخل نہیں ہے' اسی لیے قرآن پاک نے یہودیوں کی طرح ان کو ''خداوند'' کا خطاب نہیں دیا' نہ پارسیوں کی طرح ان کو قابلِ پرستش کے لقب سے یاد کیا' نہ ہندوؤں کی طرح دیو اور دیوتا' اور دیوی کہا' بلکہ صرف ملک اور رسول کے الفاظ استعمال کیے جن کے لفظی معنی فرستادہ' قاصد' پیغام رساں اور ایلچی کے ہیں' بلکہ قرآن نے آغازِ خلقتِ انسانی کے قصہ میں یہ حقیقت واضح کر دی کہ ملائکہ اس لائق نہیں ہیں کہ آدم ان کو سجدہ کرے' بلکہ آدم میں یہ صلاحیت ہے کہ ملائکہ کا مسجود بنے' چنانچہ اس کو مرتبۂ علم میں ان سے بالاتر ٹھہرایا گیا اور خدا کی جس تسبیح اور تقدیس کا ان کو دعویٰ تھا' اس کے باوجود جب انسان کا جوہرِ حقیقت انہوں نے پہچانا تو یہ تسلیم کرنا پڑا کہ

﴿سُبْحٰنَکَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا اِنَّکَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَکِیْمُ﴾ (البقرہ:۳۲)

''تو پاک ہے ہم کو کوئی علم نہیں لیکن وہ جو تو نے ہم کو سکھایا بے شک تو جاننے والا اور حکمت والا ہے۔''

اس قصہ نے شروع ہی میں یہ واضح کر دیا کہ وہ ہستیاں جن کو دوسرے مذاہب نے انسانوں کا دیوتا انسانوں کا خداوند اور کبھی خدا کا ہمسر اور متصرفِ مطلق قرار دیا تھا' اسلام میں ان کی حیثیت انسان کے مقابلہ میں کیا ہے؟ انسان اور فرشتے خدا کے سامنے برابر کے مخلوق اور بندے یکساں عاجز و درماندہ ہیں' انسانوں کو مادی اشیا پر حکومت بخشی گئی ہے کہ اپنے نفع و نقصان کے لیے ان سے کام لے سکیں اور ملائکہ کو اپنے حضور میں متعین فرمایا گیا ہے کہ آسمان و زمین اور پوری مملکت الٰہی میں خدا کے احکام کی تعمیل و تنفیذ کریں۔

دنیا میں اللہ تعالیٰ نے اسباب و علل کا ایک سلسلہ رکھا ہے جو ہر جگہ کارفرما نظر آتا ہے۔ لوگ انہی ظاہری اسباب و علل کو دیکھ کر دھوکا کھاتے ہیں اور ان کی پرستش کرنے لگتے ہیں۔ مثلاً آگ جلاتی اور روشن کرتی ہے' اس کو دیکھ کر آتش پرست اور مادہ پرست یقین کرتے ہیں کہ خود آگ میں جلانے کی طاقت ہے لیکن فرق یہ ہے کہ آتش پرست اس کے آگے سجدہ میں گر پڑتے ہیں' اور مادہ پرست گو اپنا سر اس کے آگے نہیں جھکاتے مگر ان کا دل جھک جاتا ہے کیونکہ وہ بھی یہ ایمان رکھتے ہیں کہ یہ طاقت خود آگ کے اندر موجود ہے' کچھ لوگ ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ جلانے کی طاقت آگ میں نہیں ہے بلکہ اس کا ایک مستقل دیوتا یا فرشتہ ہے' جو اس پر حکمراں ہے' یہ لوگ اس آگ کے فرمان روا کے سامنے جھکتے ہیں' اسلام کے نظریۂ توحید نے اس شرک کو بھی مٹایا' اور بتایا کہ آگ اور آگ کا کوئی فرشتہ ہے تو وہ کل کے کل اسی ایک رب العلمین اور فرمان روائے ارض و سما کے حکم کے تابع ہیں اسی کے آگے جھکنا

چاہیے اور اسی کی بندگی کرنی چاہیے۔

اسلام میں فرشتوں کی حقیقت کیا ہے؟ اس کا جواب ان نصوص سے مل سکتا ہے جو ان کے کاموں کے متعلق قرآن میں مذکور ہیں' ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان سے مراد وہ غیر مادی ذی روح ہستیاں ہیں' جو احکام اور پیغامِ الٰہی کو دنیائے خلق تک پہنچاتی اور نافذ کرتی ہیں اور وہ اسباب وعلل جن کو مادہ پرست ذاتی طور پر موثر جانتے اور جن کو بت پرست دیوتاؤں کا کرشمہ سمجھتے ہیں ان کو فرشتے احکام الٰہی کے مطابق کام میں لگاتے اور مرضیِ الٰہی کو پورا کرتے ہیں۔

اس عقیدہ کی عقلی حیثیت

عقلی حیثیت سے یہ عقیدہ بھی اسی طرح قبول اور انکار کے قابل ہے جس طرح عقلیات کے دوسرے عقائد اور نظریے ہیں جن کی تصدیق یا تکذیب عقل کی دسترس سے باہر ہے اس لیے اس عقیدہ کو یہ کہہ کر کوئی رد کرنے کی جرأت نہیں کرسکتا کہ یہ خلافِ عقل ہے بلکہ جس طرح قیاسات اور عقلی نکتہ پردازی سے دوسرے عقلی مباحث کا فیصلہ کیا جاتا ہے' ویسا ہی یہاں بھی کیا جاسکتا ہے' اشیا میں خصائص اور لوازم کے وجود اور ان کے اسباب وعلل کا مسئلہ عقلا میں ہمیشہ اختلافات کا دنگل رہا ہے اور یہ معما آج بھی اسی طرح لاینحل ہے جس طرح پہلے تھا۔ اس کا حل سائنس کی مادی تحقیقات اور تجربوں کی طاقت سے باہر ہے اور فلسفہ بھی اس کی گتھی کے سلجھانے سے عاجز ہے' اس لیے اگر حکمائے ملحدین کی شاہراہ سے الگ ہٹ کر اس کے حل کی کوئی صورت اربابِ مذہب نے نکالی ہے تو وہ محلِ اعتراض نہیں ہوسکتی اور نہ خلافِ عقل کہی جاسکتی ہے۔ کائنات کے حوادث میں جس طرح مادی علل و اسباب کارفرما ہیں اسی طرح ان سے بالاتر روحانی علل واسباب بھی ساتھ ساتھ کارفرما ہیں اور ان دونوں قسم کے اسباب کے توافق سے حوادث کا وجود ہوتا ہے یہی سبب ہے کہ انسان اکثر مادی علل واسباب موجود ہونے یا نہ ہونے کے باوجود کامیاب یا ناکام ہوتا ہے اور اس کا نام بخت واتفاق رکھتا ہے حالانکہ مسئلۂ علل واسباب کو مان لینے کے بعد بخت واتفاق کوئی چیز نہیں رہ جاتا۔ یہی روحانی علل واسباب ہیں جن کا سررشتہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مرضی سے ان فرشتوں کو سپرد کیا ہے' جو فرمان بردار چاکروں کی حیثیت سے نظامِ عالم کو چلا رہے ہیں ہمارے اور دوسرے متکلمین اور حکما کے اصطلاحات میں فرق یہ ہے کہ وہ ملائکہ کی تعبیر اسباب وعلل کے ''قوائے طبعی'' سے کرتے ہیں اور ہم ''قوائے روحانی'' سے۔

اس تقریر کا یہ منشا نہیں ہے کہ اشیا میں خواص وطبائع' اور اس مادہ کی ملکیت میں مقررہ طبعی اصول وقوانین موجود نہیں ہیں بلکہ یہ مقصد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ازلی اندازہ (تقدیر) کے مطابق ہر چیز کے خصائص (طبائع اور اصول وقوانین) مقرر کر کے ملائکہ کو حکم دیا ہے کہ وہ اس کو ان ہی اصول وطبائع مقررہ کے مطابق چلاتے رہیں۔

سمجھنے کے لیے اس کی صحیح مثال خود انسان بلکہ ہر جاندار ہستی ہے۔ مخلوقات کی دو قسمیں ہیں' ذی روح اور غیر ذی روح ذی روح مخلوقات کے اکثر افعال وحرکات اس کی روح کی ارادی قوت کی وساطت سے انجام پاتے ہیں وہی روح اس کے ہاتھ پاؤں اور تمام اعضا بلکہ ہر عضو کے ایک ایک رگ وریشہ پر حکمراں اور مسلط ہے۔ باایں ہمہ وہ روح اصولِ مقررہ کے تحت ہی اعضا سے کام لیتی ہے اور ان اصول سے باہر نہیں جاتی اس طرح غیر ذی روح اشیا میں ابر و باد سے لے کر دریا' پہاڑ' چاند اور سورج تک پر ارواح مقرر ہیں جو ان اشیا سے خدا کے اصولِ مقررہ کے مطابق یکساں افعال وحرکات کا صدور کراتی ہیں' جس طرح ہماری روح اپنے اعضا اور اعضا کے ذریعہ سے مادہ میں جو تغیرات پیدا کرتی ہے وہ اشیا کے مقررہ خواص وطبائع کے سہارے پر کرتی ہے اسی طرح ملائکہ بھی انہی مقررہ خواص وطبائع کے ذریعہ اپنے مفروضہ فرائض انجام دیتے ہیں۔

الغرض جس طرح ہمارے ارادی افعال اور حکمِ الٰہی کے درمیان ہماری انسانی ارواح ونفوس واسطہ ہیں' اسی طرح تمام عالمِ مخلوقات اور کائنات کے افعال اور حکمِ الٰہی کے درمیان یہ ملکوتی ارواح اور نفوس مجردہ واسطہ ہیں اور جس طرح ہماری انسانی ارواح کی اس وساطت سے خدا کی حکومت علی الاطلاق پر کوئی اعتراض نہیں واقع ہوتا اسی طرح ان ملکوتی ارواح کی وساطت سے بھی خدا کی علی الاطلاق حکومت میں کوئی نقص نہیں واقع ہوتا۔ یہیں سے یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے کہ ہمارے ارادی افعال میں اختلافات کی اتنی نیرنگیاں نظر آتی ہیں' مگر ہمارے اور عالمِ کائنات کے جو نوعی افعال ہیں ان میں اختلافات اور نیرنگیوں کے بجائے یکسانی' ہمرنگی اور عدمِ اختلاف پایا جاتا ہے؟ کیونکہ انسان نے ارادہ پا کر کسی قدر ذاتی اختیار پا لیا ہے اور یہی ذاتی اختیار اس کے افعالِ اختیاری کی ذمہ داری' بازپرس اور مؤاخذہ کی بنیاد ہے اور جس کی بنا پر وہ اپنی اطاعت کے ذریعہ سے ثواب اور عصیاں کر کے عتاب کا مستحق ہو جاتا ہے' مگر دنیا کی یہ ملکوتی ارواحِ مجردہ یعنی یہ ملائکہ ذاتی ارادہ اور اختیار سے تمامتر محروم ہو کر صرف اطاعت' فرمان برداری' اور انقیاد کے لیے پیدا کیے گئے ہیں' اس لیے ان میں عصیاں' تمرد' سرکشی اور حکمِ الٰہی سے انحراف کی کوئی صلاحیت نہیں ہے' اسی بنا پر اشیا کے تمام نوعی افعال وحرکات اور خصائص میں یکسانی' ہمرنگی اور عدمِ اختلاف پایا جاتا ہے یہی حقیقت ہے جو فطرت' طبیعت اور نوعی خاصیت کی اصطلاحات کی صورتوں میں ہمارے لیے دھوکے اور اشتباہ کا باعث بن گئی ہے۔

آیات واحادیث میں ملائکہ کا ذکر

۱۔ اب ہم کو تعلیماتِ نبوی یعنی آیات واحادیث سے ملائکہ کی حیثیت کو روشن کرنا چاہیے ملائکہ کی سفارت و پیام رسانی' یعنی خالق کے احکام اور مرضی کو مخلوقات تک پہنچانا اور اس کام میں ان کا بے اختیار ہونا' ان دو آیتوں سے ثابت ہوتا ہے:

﴿اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّ مِنَ النَّاسِ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ○ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ

اَیْدِیْهِمْ وَ مَا خَلْفَهُمْ وَ اِلَی اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ○﴾ (الحج:۷۵،۷۶)

''خدا ہی ہے جو فرشتوں اور آدمیوں میں سے پیام رساں اور قاصد منتخب کرتا ہے بے شک خدا سننے والا اور دیکھنے والا ہے اور وہ ان کے آگے اور پیچھے کا حال جانتا ہے اور تمام کاموں کا مرجع خدا ہی ہے۔''

یعنی پیام رسانی اور سفارت کے سوا ان کو اصل حکم میں کوئی دخل نہیں ہے' اختیارات سب خدا کے ہاتھ میں ہیں اور وہی تمام امور اور انتظامات کا مرجع کل ہے' دوسری جگہ ہے:

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا اُولِیْٓ اَجْنِحَةٍ مَّثْنٰی وَ ثُلٰثَ وَرُبٰعَ یَزِیْدُ فِی الْخَلْقِ مَا یَشَآءُ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ○ مَا یَفْتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَةٍ فَلَا مُمْسِكَ لَهَا وَ مَا یُمْسِكْ فَلَا مُرْسِلَ لَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَ هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ﴾ (فاطر:۱،۲)

''حمد ہو اس خدا کی جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے اور فرشتوں کو دو دو تین تین اور چار چار شہپر بازوؤں والے پیام رساں بنانے والا ہے' وہ پیدائش میں جو چاہے بڑھا دے وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ وہ لوگوں کے لیے رحمت کھولے تو کوئی اس کا روکنے والا نہیں اور جو روک دے تو اس کے سوا کوئی چھوڑنے والا نہیں اور وہی غالب و دانا ہے۔''

اس آیت پاک میں بھی یہی حقیقت ظاہر کی گئی ہے کہ ملائکہ سفارت اور درمیانگی کے علاوہ اور کوئی اختیار نہیں رکھتے رحمت کے دروازوں کا کھولنے والا اور بند کرنے والا صرف خدا ہے' یہ تعلیم اس غلط عقیدہ کی تردید کرتی ہے کہ فرشتوں کو دنیا کی حکمرانی اور انتظامات میں کوئی ذاتی دخل ہے' یا ان میں الوہیت اور ربوبیت کا شائبہ ہے یا وہ پرستش کے قابل ہیں یا ان کی دہائی بھی پکارنی چاہیے۔

(۲) ملائکہ خدا کے احکام کو دنیا میں جاری کرتے ہیں:

﴿اِذْ یُوْحِیْ رَبُّكَ اِلَی الْمَلٰٓئِكَةِ اَنِّیْ مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾ (انفال:۱۲)

(''یاد کر) جب تیرا پروردگار فرشتوں کو وحی کر رہا تھا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں' تم مومنوں کو ثابت قدم رکھو۔''

﴿تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَ الرُّوْحُ فِیْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ مِنْ كُلِّ اَمْرٍ﴾ (قدر:۴)

''اس میں فرشتے اور روح اپنے پروردگار کے حکم سے ہر کام کو لے کر نیچے اترتے ہیں۔''

وہ جس طرح احکام لے کر اترتے ہیں' اسی طرح دربارِ الٰہی تک عروج بھی کرتے ہیں۔

﴿تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَ الرُّوْحُ اِلَیْهِ﴾ (معارج:۴)

''فرشتے اور روح اس تک چڑھتے ہیں۔''

(۳) موت کے وقت روح کا قبض کرنا' انہی سے متعلق ہے:

﴿قُلْ يَتَوَفّٰكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِىْ وُكِّلَ بِكُمْ﴾ (سجدہ:۱۱)

''کہہ دو کہ موت کا فرشتہ جو تم پر مقرر ہے وہ تم پر موت طاری کرے گا۔''

﴿وَ لَوْ تَرٰٓى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِىْ غَمَرَاتِ الْمَوْتِ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ بَاسِطُوْٓا اَيْدِيْهِمْ اَخْرِجُوْٓا اَنْفُسَكُمْ﴾ (انعام:۹۳)

''اور اگر دیکھو تم جب گنہگار موت کے سکرات میں ہوں اور فرشتے اپنے ہاتھوں کو پھیلائے ہوں کہ نکالو اپنی جانوں کو۔''

﴿وَ لَوْ تَرٰٓى اِذْ يَتَوَفَّى الَّذِيْنَ كَفَرُوا الْمَلٰٓئِكَةُ﴾ (انفال:۵۰)

''اور اگر دیکھو جب فرشتے کافروں کو موت دے رہے ہوں۔''

اسی کے ہم معنی اور بھی کئی آیتیں ہیں، جن سے ظاہر ہے کہ حکمِ الٰہی کے مطابق موت وفنا کی تدبیر علل و اسباب کی انہی روحانی قوتوں سے متعلق ہے۔

دنیا میں کسی شے کے انقلاب اور فنا کے لیے کسی ایک علت وسبب کا وجود کافی نہیں ہے بلکہ ضروری ہے کہ اس کے متعلقہ علل واسباب کی تمام کڑیاں باہم پیوستہ اور ایک دوسرے کی معاون ہوں اور موانع اور عوائق معدوم ہوں یہ متعلقہ علل واسباب کا توافق اور موانع کا انسداد ہی تدبیر ہے جو بحکمِ الٰہی ملائکہ کے سپرد ہے، [1] اس تدبیر کو کبھی اللہ تعالیٰ اپنی طرف منسوب کرتا ہے۔

(۳) (وہ کام کی تدبیر کرتا ہے) اور کبھی ملائکہ کی طرف:

﴿وَ النّٰزِعٰتِ غَرْقًا ۝ وَّ النّٰشِطٰتِ نَشْطًا ۝ وَّ السّٰبِحٰتِ سَبْحًا ۝ فَالسّٰبِقٰتِ سَبْقًا ۝ فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا ۝﴾ (النازعات:۱تا۵)

''ڈوب کر (روحوں کے) کھینچنے والوں کی قسم ہے (رگوں کی) گرہوں کے کھولنے والوں کی قسم ہے (اس فضائے آسمانی میں) تیرنے والوں کی پھر دوڑ کر (مادی اسباب وعلل پر سے) آگے بڑھ جانے والوں کی پھر کام کی تدبیر کرنے والوں کی قسم ہے۔''

یہی ملائکہ خدا اور رسول کے درمیان بھی سفیر ہیں۔

﴿اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِىَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ﴾ (شوریٰ:۵۱)

''یا خدا (آدمی سے اس طرح باتیں کرتا ہے کہ اپنا) ایک سفیر بھیجتا ہے تو وہ اس (خدا) کی اجازت سے جو وہ (خدا) چاہتا ہے وحی کرتا ہے۔''

دوسری جگہ ہے:

---

(۱) صحیح بخاری کتاب بدء الخلق باب ذکر الملائکہ میں ہے کہ رحمِ نسوانی پر ایک فرشتہ مقرر ہے جو بچہ کی نسبت قضائے الٰہی کو تحریر کرتا ہے۔

﴿یُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِکَۃَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِہٖ عَلٰی مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِہٖ﴾ (نحل:۲)

''خدا روح کے ساتھ فرشتوں کو اپنے حکم سے اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے اتارتا ہے۔''

خاص آنحضرت ﷺ کے متعلق ہے:

﴿فَاِنَّہٗ نَزَّلَہٗ عَلٰی قَلْبِکَ بِاِذْنِ اللّٰہِ﴾ (بقرۃ:۹۷)

''بس اس (جبریل فرشتہ) نے (قرآن) کو خدا کے حکم سے تمہارے دل پر اتارا۔''

(۴) یہ لوگوں پر بشارت اور عذاب لے کر بھی اترتے ہیں:

﴿وَ لَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰھِیْمَ بِالْبُشْرٰی﴾ (ھود:۷)

''ہمارے سفیر ابراہیم کے پاس بشارت لے کر اترے۔''

اسی طرح حضرت زکریا اور حضرت مریم علیہما السلام کو انہوں نے بشارت دی:

﴿اِنَّمَآ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّکِ لِاَھَبَ لَکِ غُلٰمًا زَکِیًّا﴾ (مریم:۱۹)

''میں تیرے پروردگار کا فرستادہ ہوں کہ تجھے ایک پاک لڑکا بخشوں۔''

حضرت لوطؑ کے پاس ان کی قوم کی بربادی کے لیے آئے اور

﴿قَالُوْا یَا لُوْطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّکَ﴾ (ھود:۸۱)

''کہا اے لوط! ہم تیرے پروردگار کے بھیجے ہوئے ہیں۔''

اس کے بعد یہ فرشتے حضرت لوطؑ کی قوم پر کوہِ آتش فشاں کا منہ کھول دیتے ہیں' اور تمام قوم برباد ہو جاتی ہے یہ کام اگرچہ فرشتوں نے انجام دیا تھا' مگر اللہ تعالیٰ نے اس کو خود اپنی طرف منسوب کیا ہے' کیونکہ وہ فرشتوں کے ذاتی اختیار کے بجائے خدا ہی کے حکم سے ہوا تھا۔

﴿فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِیَھَا سَافِلَھَا وَ اَمْطَرْنَا عَلَیْھَا حِجَارَۃً مِّنْ سِجِّیْلٍ مَّنْضُوْدٍ﴾ (ھود:۸۲)

''تو جب ہمارا حکم آیا تو ہم نے اس کے اوپر کو نیچے کر دیا (یعنی زمین الٹ دی) اور اس پر تہ بہ تہ پتھروں کی بارش کی۔''

(۵) فرشتے انسانوں کے اعمال کی نگہبانی اور نگرانی کرتے ہیں' اور ان کے ثواب اور گناہ کے کاموں کو محفوظ رکھتے ہیں:

﴿وَ اِنَّ عَلَیْکُمْ لَحٰفِظِیْنَ ○ کِرَامًا کَاتِبِیْنَ ○ یَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ ○﴾ (انفطار:۱۰'۱۲)

''بے شک تم پر نگہبان ہیں جو بزرگ ہیں لکھنے والے ہیں جو تم کچھ کرتے ہو اس کو وہ جانتے ہیں۔''

﴿مَا یَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَیْہِ رَقِیْبٌ عَتِیْدٌ﴾ (قٓ : ۱۸)

''کوئی بات منہ سے نہیں نکالتا' لیکن اس کے پاس ایک نگہبان حاضر ہے۔''

﴿سَوَآءٌ مِّنْكُمْ مَّنْ اَسَرَّ الْقَوْلَ وَ مَنْ جَهَرَ بِهٖ وَ مَنْ هُوَ مُسْتَخْفٍۭ بِالَّيْلِ وَ سَارِبٌۢ بِالنَّهَارِ ○ لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَ مِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ﴾ (الرعد:۱۰،۱۱)

''تم میں سے کوئی بات چھپا کر کہے یا زور سے کہے یا وہ رات میں چھپے یا دن کو کرے خدا کے تعاقب کرنے والے اس کے سامنے سے اور اس کے پیچھے سے خدا کے حکم سے اس نگرانی کرتے ہیں۔''

﴿وَ يُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَفَظَةً حَتّٰۤى اِذَا جَآءَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا وَ هُمْ لَا يُفَرِّطُوْنَ﴾ (انعام:۶۱)

''اور وہ (خدا) تم پر نگراں بھیجتا ہے' یہاں تک کہ تم میں سے جس کسی کو موت آتی ہے تو ہمارے قاصد اس کی عمر پوری کرتے ہیں اور وہ اپنے اس کام میں کمی نہیں کرتے۔''

(۶) وہ انسانوں کے اعمال کے مطابق ان پر خدا کی رحمت یا لعنت کے نزول کا ذریعہ اور واسطہ ہیں:

﴿لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ وَ تَتَلَقّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ هٰذَا يَوْمُكُمُ الَّذِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ﴾ (انبیاء:۱۰۳)

''نیکوکاروں کو وہ بڑی گھبراہٹ (قیامت) غمگین نہ کرے گی' اور فرشتے ان کا آگے بڑھ کر استقبال کریں گے (کہ) یہی وہ دن ہے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا۔''

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَ لَا تَحْزَنُوْا وَ اَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ○ نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ فِي الْاٰخِرَةِ﴾ (حم السجدۃ:۳۰،۳۱)

''جن لوگوں نے یہ کہا کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے پھر اس پر قائم رہے' ان پر فرشتے یہ کہتے ہوئے اتریں گے کہ نہ ڈرو اور نہ غم کرو اور اس جنت کی خوش خبری سنو جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا' ہم ہیں جو تمہاری پہلی اور اس دوسری زندگی میں تمہارے رفیق ہیں۔''

﴿هُوَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَ مَلٰٓئِكَتُهٗ﴾ (احزاب:۴۳)

''وہی خدا تم پر رحمت بھیجتا ہے اور اس کے فرشتے۔''

﴿اِنَّ اللّٰهَ وَ مَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ﴾ (احزاب:۵۶)

''اللہ اور اس کے فرشتے نبی پر رحمت بھیجتے ہیں۔''

﴿وَ يَسْتَغْفِرُوْنَ لِمَنْ فِي الْاَرْضِ﴾ (شوریٰ:۵)

''اور جو زمین میں ہیں ان کے لیے وہ خدا سے مغفرت کی دعا مانگتے ہیں۔''

اسی طرح وہ بدکاروں پر لعنت بھی کرتے ہیں:

﴿اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ اَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللّٰهِ وَ الْمَلٰٓئِكَةِ وَ النَّاسِ اَجْمَعِيْنَ﴾ (آل عمران

:۸۷)

''ان کی سزا یہ ہے کہ ان پر اللہ کی اور فرشتوں کی اور لوگوں کی سب کی لعنت ہے۔''

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَ مَا تُوْا وَ ھُمْ کُفَّارٌ اُولٰٓئِکَ عَلَیْھِمْ لَعْنَۃُ اللّٰہِ وَ الْمَلٰٓئِکَۃِ وَ النَّاسِ اَجْمَعِیْنَ﴾ (بقرہ:۱۶۱)

''جو کفر کی حالت میں مر گئے ان پر اللہ کی اور فرشتوں کی اور لوگوں کی سب کی لعنت ہے۔''

(۷) جنت اور دوزخ کا کاروبار بھی ملائکہ کے زیر اہتمام ہوگا:

﴿وَ سِیْقَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اِلٰی جَھَنَّمَ زُمَرًا حَتّٰٓی اِذَا جَآءُوْھَا فُتِحَتْ اَبْوَابُھَا وَ قَالَ لَھُمْ خَزَنَتُھَا اَلَمْ یَاْتِکُمْ رُسُلٌ مِّنْکُمْ﴾ (الزمر:۷۱)

''اور کفر کرنے والے گروہ در گروہ کر کے دوزخ کی طرف لے جائے جائیں گے یہاں تک کہ جب اس کے پاس پہنچیں گے تو اس کے دروازے کھولے جائیں گے اور اس کے چوکی دار (فرشتے) کہیں گے کہ کیا تمہارے پاس تم ہی میں سے پیغمبر نہیں آئے۔''

﴿وَ سِیْقَ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا رَبَّھُمْ اِلَی الْجَنَّۃِ زُمَرًا حَتّٰٓی اِذَا جَآءُوْھَا وَ فُتِحَتْ اَبْوَابُھَا وَ قَالَ لَھُمْ خَزَنَتُھَا سَلٰمٌ عَلَیْکُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوْھَا خٰلِدِیْنَ﴾ (زمر:۷۳)

''اور جو اپنے پروردگار سے ڈرتے تھے وہ گروہ در گروہ جنت میں لے جائے جائیں گے یہاں تک کہ جب وہ اس کے پاس پہنچیں گے اور اس کے دروازے کھولے جائیں گے اور اس کے پاسبان کہیں گے، تم پر سلامتی ہو خوش خوش جنت میں ہمیشہ کے لیے داخل ہو جاؤ۔''

﴿وَ الْمَلٰٓئِکَۃُ یَدْخُلُوْنَ عَلَیْھِمْ مِّنْ کُلِّ بَابٍ ○ سَلٰمٌ عَلَیْکُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَی الدَّارِ ○﴾ (رعد۲۳:۲۴)

''اور ان جنتیوں پر فرشتے ہر دروازہ سے داخل ہو کر کہیں گے تم پر سلامتی ہو یہ تمہارے صبر کا بدلہ کیسا اچھا عاقبت کا گھر ہے۔''

﴿عَلَیْھَا مَلٰٓئِکَۃٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ﴾ (تحریم:۶)

''اس (دوزخ) پر سخت دل طاقتور فرشتے مقرر ہیں۔''

﴿وَ مَا جَعَلْنَا اَصْحٰبَ النَّارِ اِلَّا مَلٰٓئِکَۃً﴾ (مدثر:۳۱)

''اور ہم نے دوزخ کا اہل کار فرشتوں ہی کو بنایا ہے۔''

(۸) فرشتے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ قدس کے حاضر باش ہیں۔

﴿وَ تَرَی الْمَلٰٓئِکَۃَ حَآفِّیْنَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ یُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّھِمْ﴾ (زمر:۸)

''اور تم فرشتوں کو دیکھو گے کہ عرش کے اردگرد احاطہ کئے ہوئے اپنے پروردگار کی حمد و ثناء میں مصروف

ہوں گے۔"

﴿لَا یَسَّمَّعُوْنَ اِلَی الْمَلَاءِ الْاَعْلٰی﴾ (الصّٰفّٰت:۸)

"اعلیٰ اہل دربار کی باتیں وہ (شیاطین) نہیں سن سکتے۔"

﴿مَا کَانَ لِیَ مِنْ عِلْمٍ بِالْمَلَاُ الْاَعْلٰی اِذْ یَخْتَصِمُوْنَ﴾ (صٓ : ۶۹)

"مجھے خدا کے بلند درباریوں کا علم نہیں جب وہ باتیں کرتے ہیں۔"

قیامت کے دن بھی یہ تختِ الٰہی کے حامل اور اس بارگاہ کے حاضر باش ہوں گے جو ہر وقت اس کے ہر حکم کو بجالانے کے لیے تیار رہیں گے۔

﴿وَ الْمَلَکُ عَلٰٓی اَرْجَآئِهَا وَ یَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّکَ فَوْقَهُمْ یَوْمَئِذٍ ثَمٰنِیَةٌ﴾ (الحاقۃ:۱۷)

"اور فرشتے اس کے کناروں پر ہوں گے اور تیرے پروردگار کے تخت کو آٹھ (فرشتے) اس دن اپنے اوپر اٹھائے ہوں گے۔"

﴿کَلَّآ اِذَا دُکَّتِ الْاَرْضُ دَکًّا دَکًّاo وَ جَآءَ رَبُّکَ وَ الْمَلَکُ صَفًّا صَفًّاo﴾ (الفجر: ۲۱_۲۲)

"ہرگز نہیں جب زمین ریزہ ریزہ کردی جائے گی اور تیرا رب تشریف فرما ہوگا' اور فرشتے قطار در قطار آئیں گے"۔

﴿یَوْمَ یَقُوْمَ الرُّوْحُ وَ الْمَلٰٓئِکَةُ صَفًّا﴾ (النباء:۳۸)

"جس دن روح اور فرشتے صف باندھے کھڑے ہوں گے۔"

(۹) فرشتے خدا سے سرکشی اور اس کی نافرمانی نہیں کرتے ہمیشہ اس کی تہلیل و تقدیس اور حمد و ثنا میں مصروف رہتے ہیں' اس کے جلال و جبروت سے ڈرتے اور کانپتے رہتے ہیں اور اس کے حضور میں اہلِ زمین کے لیے عموماً اور نیکوکاروں کے لیے خصوصاً مغفرت کی دعا مانگا کرتے ہیں۔

﴿وَ الْمَلٰٓئِکَةُ یُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَ یَسْتَغْفِرُوْنَ لِمَنْ فِی الْاَرْضِ اَلَآ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ﴾ (شوریٰ:۵)

"اور فرشتے حمد کے ساتھ اپنے رب کی تسبیح کرتے رہتے ہیں اور زمین والوں کی بخشائش کی دعا مانگا کرتے ہیں ہشیار کہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا خدا ہی ہے۔"

یعنی یہ دھوکا نہ ہو کہ فرشتوں کی دعا ہی رحمت و برکت کا ذاتی سبب ہے' بلکہ بخشش اور رحمت کرنے والا صرف وہی خدائے واحد ہے اور یہ بخشش و رحمت اسی کے دستِ اختیار میں ہے۔

﴿اَلَّذِیْنَ یَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَ مَنْ حَوْلَهٗ یُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَ یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَ یَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾ (مؤمن:۷)

''جو (فرشتے) عرش کو اٹھائے ہیں' اور جو اس کے پاس ہیں' وہ سب اپنے پروردگار کی حمد اور تسبیح کرتے ہیں اور اس پر ایمان رکھتے ہیں اور ایمان لانے والوں کی بخشائش کی دعا کرتے ہیں۔''

﴿وَ لَهٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَنْ عِنْدَهٗ لَا یَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَ لَا یَسْتَحْسِرُوْنَ ○ یُسَبِّحُوْنَ الَّیْلَ وَ النَّهَارَ لَا یَفْتُرُوْنَ ○﴾ (انبیاء:۱۹'۲۰)

''آسمانوں میں اور زمین میں جو کوئی ہے اسی کا ہے اور جو اس کے پاس ہیں' یعنی فرشتے وہ اس کے سامنے اپنی عبودیت کے اظہار سے غرور نہیں کرتے' اور نہ اس کی عبادت سے تھکتے ہیں وہ رات دن خدا کی پاکی بیان کرتے ہیں' سست نہیں پڑتے۔''

﴿بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ○ لَا یَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَ هُمْ بِاَمْرِهٖ یَعْمَلُوْنَ ○ وَ هُمْ مِّنْ خَشْیَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ ○﴾ (انبیاء:۲۶'۲۸)

''بلکہ وہ بزرگ بندے ہیں' جو بات میں اس (خدا) پر پیش دستی نہیں کرتے' اور وہ اس کے حکم پر عمل کرتے ہیں اور وہ اس کے خوف سے ترساں رہتے ہیں۔''

﴿لَا یَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَاۤ اَمَرَهُمْ وَ یَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ﴾ (تحریم:۶)

''خدا ان کو جس بات کا حکم دیتا ہے وہ اس میں اس کی نافرمانی نہیں کرتے اور وہی کرتے ہیں جس کا حکم دیا جاتا ہے۔''

﴿وَ یُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ مِنْ خِیْفَتِهٖ﴾ (رعد:۱۳)

''اور بجلی کی کڑک اور فرشتے خدا کے ڈر سے اس کی حمد و تسبیح کرتے ہیں۔''

﴿وَ لِلّٰهِ یَسْجُدُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ وَّ الْمَلٰٓئِكَةُ وَ هُمْ لَا یَسْتَكْبِرُوْنَ ○ یَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ وَ یَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ○﴾ (النحل۴۹:۵۰)

''اور آسمان میں اور زمین میں جو چار پائے اور فرشتے ہیں وہ سب خدا کو سجدہ کرتے ہیں۔ اور اس کے سامنے اپنی بڑائی نہیں کرتے وہ اپنے مالک سے جو ان کے اوپر ہے ڈرتے رہتے ہیں اور وہی کرتے ہیں جس کا ان کو حکم دیا جاتا ہے۔''

فلاسفہ و مذاہب کی بے اعتدالی

گذر چکا ہے کہ ملائکہ کا اعتقاد دنیا کے تمام مذہبوں اور قوموں میں کسی نہ کسی طرح رہا ہے لیکن ان کے اس اعتقاد میں بہت سی باتیں ایسی داخل تھیں جو توحیدِ کامل کے منافی تھیں اسکندریہ کے تو افلاطونی فلسفہ کے رو سے عقلِ اول کی اضطراری پیدائش کے بعد خدا کو معطل ہو جانا پڑا' اور فرشتوں کو عقول کی صورت میں اصلی کارفرما قرار دیا گیا تھا عراق کے صابئی اجرامِ سماوی کی شکل میں ان کی پرستش کرتے تھے' اور انہیں کو عالم کا فرمان روا مانتے

تھے۔ یہودی بھی ان کو کسی قدر صاحبِ اختیار تصور کرتے تھے اور کبھی کبھی ان کو خداؤں کا درجہ دیتے تھے' جیسا کہ توراۃ (صحیفہ تکوین ۱۶'۱۳'۱۸'۲و۳'۲۲) کے قصوں میں کہیں کہیں نظر آتا ہے' ان کو وہ ''خدا کے بیٹوں'' کے خطاب سے بھی کبھی کبھی یاد کرتے تھے (تکوین ۶'۲) ہندوؤں میں وہ دیوتا اور دیوی بن کر ایک طرف انسانی خصائص سے ملوث تھے اور دوسری طرف اپنے ذاتی اختیارات کے لحاظ سے چھوٹے خداؤں کے مرتبہ پر بھی فائز تھے' عیسائی ان میں سے بعض مثلاً روح القدس کو خدا کا ایک جز تسلیم کرتے تھے' اور یہ تثلیث کا ایک رکن تھا' عربوں میں فرشتے خدا کی بیٹیوں کا درجہ رکھتے تھے وہ ان کی پوجا کرتے اور ان کو اپنے گناہوں کا شفیع سمجھتے تھے۔

تعلیمِ محمدی نے ان تمام عقائدِ باطلہ کو مٹا دیا' اور ایک ایک کر کے ان میں سے ہر عقیدہ کی تردید کر دی' اور بتایا کہ فرشتے بھی خدا کی دوسری مخلوقات کی طرح ایک مخلوق ہیں' ان کو خدائی کا کوئی اختیار حاصل نہیں' وہ صرف خدا کی اطاعت' عبادت اور اسی کے احکام کی بجا آوری میں مصروف رہتے ہیں' ان میں سے جس کے جو کام سپرد ہے' وہ اسی کو انجام دیتا ہے وہ ہماری ہی طرح بندۂ محض ہیں' وہ نہ عبادت کے مستحق ہیں' نہ خدا کے بے اذن وہ شفاعت کا ایک حرف زبان سے نکال سکتے ہیں اور نہ خدا کے سامنے کچھ عرض کرنے کی جرأت کر سکتے ہیں۔ یہودی ان کو خدا کے بیٹے اور عرب خدا کی بیٹیاں کہتے تھے' قرآن نے دونوں کی تردید کی' اور بتایا کہ وہ انسانی خصائص اور میلانات سے پاک ہیں' وہ نہ مرد ہیں' نہ عورت ہیں' نہ کھاتے ہیں نہ پیتے ہیں' اور نہ خدائی کا دعویٰ کر سکتے ہیں' وہ خدا کے خوف سے ہمیشہ کانپتے اور لرزتے رہتے ہیں۔

﴿وَ قَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ○ لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَ هُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ ○ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَ مَا خَلْفَهُمْ وَ لَا يَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى وَ هُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ ○ وَ مَنْ يَّقُلْ مِنْهُمْ اِنِّيْٓ اِلٰهٌ مِّنْ دُوْنِهٖ فَذٰلِكَ نَجْزِيْهِ جَهَنَّمَ كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ ○﴾ (انبیاء:۲۶'۲۹)

''مشرکوں نے کہا کہ مہربان خدا نے اپنا لڑکا بنایا ہے وہ اس سے پاک ہے بلکہ یہ (فرشتے) اس کے معزز بندے ہیں جو بات میں اس پر پیش دستی نہیں کرتے اور وہ اس کے حکم پر عمل کرتے ہیں خدا اس سے جو ان کے آگے اور پیچھے ہوتا ہے واقف ہے وہ شفاعت نہیں کرتے لیکن اسی کی جس کے لیے خدا پسند کرتا ہے اور وہ خدا کے خوف سے ڈرتے رہتے ہیں اور ان سے جو یہ کہے کہ میں خدا ہوں تو اس کو بھی اسی طرح ہم جہنم کی سزا دیں گے ایسی ہی ہم ظالموں کو سزا دیتے ہیں۔''

﴿اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ سُبْحٰنَهٗ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ وَلَدٌ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ○ لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَلَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ وَ مَنْ يَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَ يَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ اِلَيْهِ جَمِيْعًا﴾ (نساء:۱۷۱'۱۷۲)

''خدا تو ایک ہی ہے وہ اس سے پاک ہے کہ اس کے کوئی اولاد ہو' آسمانوں میں اور زمین میں جو کچھ

ہے وہ اس کی ملکیت ہے' اور خدا کا وکیل ہونا کافی ہے' مسیحؑ کو اس سے عار نہ ہوگا کہ وہ خدا کا بندہ ہے' اور نہ مقرب فرشتوں کو (اس سے عار ہے) اور جو لوگ اس کی عبادت سے عار اور غرور کریں گے تو وہ ان سب کو اپنے پاس اکٹھا کر لے گا۔"

﴿وَ لَا يَاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ وَ النَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا اَيَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ﴾ (آل عمران:۸۰)

"خدا اس کا حکم تم کو نہیں دیتا کہ تم فرشتوں کو اور پیغمبروں کو خدا بناؤ کیا تم کو مسلمان ہونے کے بعد کفر کرنے کا حکم دے گا۔"

﴿وَ يَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ثُمَّ يَقُوْلُ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اَهٰٓؤُلَآءِ اِيَّاكُمْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ ○ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ اَنْتَ وَلِيُّنَا مِنْ دُوْنِهِمْ بَلْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ الْجِنَّ اَكْثَرُهُمْ بِهِمْ مُّؤْمِنُوْنَ○﴾ (سبا:۱۰۔۴۱)

"اور جس دن وہ سب کو جمع کرے گا پھر فرشتوں سے کہے گا کہ کیا یہ مشرکین تمہیں کو پوجتے تھے وہ کہیں گے پاک ہے تو' تو ہمارا والی ہے وہ نہیں ہیں' بلکہ وہ جنوں کو پوجتے تھے وہ اکثر انہی جنوں پر ایمان لائے ہیں۔"

﴿يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا لَّا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَ قَالَ صَوَابًا﴾ (النباء:۳۸)

"جس دن روح اور فرشتے صف بستہ خدا کے سامنے کھڑے ہوں گے تو کچھ بول نہ سکیں گے لیکن وہ جس کو وہ مہربان اجازت دے اور وہ ٹھیک بات کہے۔"

﴿وَ كَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِي السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اَنْ يَّاْذَنَ اللّٰهُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ يَرْضٰى﴾ (النجم:۲۶)

"اور آسمانوں میں کتنے فرشتے ہیں جن کی سفارش کچھ بھی فائدہ نہیں پہنچا سکتی' لیکن اس کے بعد کہ خدا جس کو چاہے اجازت دے اور پسند کرے۔"

﴿اَفَاَصْفٰىكُمْ رَبُّكُمْ بِالْبَنِيْنَ وَ اتَّخَذَ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ اِنَاثًا اِنَّكُمْ لَتَقُوْلُوْنَ قَوْلًا عَظِيْمًا ○ وَ لَقَدْ صَرَّفْنَا فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِيَذَّكَّرُوْا وَ مَا يَزِيْدُهُمْ اِلَّا نُفُوْرًا ○ قُلْ لَّوْ كَانَ مَعَهٗٓ اٰلِهَةٌ كَمَا يَقُوْلُوْنَ اِذًا لَّابْتَغَوْا اِلٰى ذِي الْعَرْشِ سَبِيْلًا ○ سُبْحٰنَهٗ وَ تَعٰلٰى عَمَّا يَقُوْلُوْنَ عُلُوًّا كَبِيْرًا○ تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَ الْاَرْضُ وَ مَنْ فِيْهِنَّ﴾ (بنی اسرائیل:۴۲۔۴۴)

"کیا تمہارے لیے خدا نے بیٹوں کو پسند کیا اور خود فرشتوں میں سے لڑکیاں اپنے لیے پسند کیں' تم یقیناً بہت بڑی بات منہ سے نکالتے ہو اور ہم نے اس قرآن میں پھیر پھیر کر سمجھنے کو باتیں بیان کی ہیں لیکن یہ

ان کی نفرت کو اور بڑھاتا ہے۔ کہہ دو اے پیغمبر کہ اگر اس ایک خدائے برحق کے ساتھ اور بھی چند خدا ہوتے تو اس تخت والے خدا کی طرف وہ راستہ ڈھونڈتے (کہ اس کے ہاتھ سے حکومت چھین کر خود قبضہ کرلیں) یہ مشرک جو کہتے ہیں خدا اس سے بلند و برتر ہے' ساتوں آسمان اور زمین اور جو کچھ ان میں ہے وہ اس کی تسبیح پڑھتے ہیں۔"

﴿وَ جَعَلُوا الْمَلٰٓئِكَةَ الَّذِيْنَ هُمْ عِبٰدُ الرَّحْمٰنِ اِنَاثًا اَشَهِدُوْا خَلْقَهُمْ سَتُكْتَبُ شَهَادَتُهُمْ وَ يُسْئَلُوْنَ وَ قَالُوْا لَوْ شَآءَ الرَّحْمٰنُ مَا عَبَدْنٰهُمْ مَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ اِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ۝﴾ (زخرف:۱۹'۲۰)

"اور ان مشرکوں نے فرشتوں کو جو رحمت والے خدا کے بندے ہیں' عورتیں بنا دیا۔ کیا وہ ان کی پیدائش کے وقت حاضر تھے ہم ان کی گواہی لکھیں گے اور ان سے اس کی باز پرس کی جائے گی اور انہوں نے کہا کہ اگر خدا چاہتا تو ہم ان (فرشتوں) کو نہ پوجتے انہیں اس کا (تحقیقی) علم نہیں وہ صرف اٹکل لگاتے ہیں۔"

قرآن پاک میں اس مفہوم کی اور بہت سی آیتیں ہیں' مگر یہاں استقصا مقصود نہیں۔

یہودیوں کا خیال تھا کہ فرشتے کھاتے پیتے بھی ہیں' چنانچہ توراۃ میں جہاں حضرت ابراہیمؑ کے پاس فرشتوں کے آنے کا ذکر ہے' یہ بھی مذکور ہے کہ ابراہیمؑ نے ان کے لئے دعوت کا سامان کیا اور انہوں نے کھایا' "تکوین (۱۸' ۸) لیکن قرآن پاک نے اس قصہ کو دہرا کر یہ تصریح کر دی ہے کہ فرشتے' انسانی ضرورتوں سے پاک ہیں' چنانچہ حضرت ابراہیمؑ نے ان کے لئے دعوت کا سامان کیا مگر

﴿فَلَمَّا رَآ اَيْدِيَهُمْ لَا تَصِلُ اِلَيْهِ نَكِرَهُمْ وَ اَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً قَالُوْا لَا تَخَفْ اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰى قَوْمِ لُوْطٍ﴾ (ھود:۷۰)

"جب ابراہیم نے دیکھا کہ وہ کھانے کو ہاتھ نہیں لگاتے تو اس کو وہ انجان معلوم ہوئے اور دل میں ڈرا انہوں نے کہا ڈرو نہیں' ہم لوطؑ کی قوم کی طرف ان کے تباہ کرنے کے لئے بھیجے گئے ہیں۔"

کفارِ قریش کا مطالبہ تھا کہ انسان کے بجائے کوئی فرشتہ پیغمبر بنا کر کیوں نہیں بھیجا گیا اس کے جواب میں کہا گیا:

﴿وَ لَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا وَّ لَلَبَسْنَا عَلَيْهِمْ مَّا يَلْبِسُوْنَ﴾ (انعام:۹)

"اور اگر ہم پیغمبر کو فرشتہ بنا کر بھیجتے تو (آدمیوں کے لیے) اس کو آدمی ہی بناتے اور جس شبہ میں اب ہم نے ان کو ڈالا ہے' اسی میں وہ پھر بھی پڑے رہتے یعنی یہی کہتے کہ تم فرشتہ نہیں ہو بلکہ آدمی ہو۔"

اس آیت اور دوسری آیتوں سے ملکوتیت اور بشریت کی قوتوں کا اختلاف ظاہر ہے تاہم فرشتے کبھی کبھی عارضی طور سے انسان کے مثالی لباس میں بھی جلوہ گر ہوتے ہیں' جیسا کہ حضرت مریمؑ وغیرہ کے قصوں میں ہے۔

﴿فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا﴾ (مریم:۱۷)

''وہ فرشتہ ایک اچھے خاصے بشر کی مثالی صورت میں ظاہر ہوا۔''

یہی وہ صورت تھی جس میں حضرت ابراہیمؑ کو فرشتوں کے انسان ہونے کا دھوکا ہوا اور ان کے لیے دعوت کا سامان کیا مگر یہ دھوکا جلد رفع ہو گیا کہ وہ انسان کی مثالی صورت میں فرشتے ہیں۔

فرشتوں پر ایمان لانے کا مقصد

ان تمام تفصیلات کے بعد یہ غور کرنا ہے کہ فرشتوں پر ایمان لانے سے اسلام کا کیا مقصود ہے؟ حقیقت میں اس سے دو باتیں مقصود ہیں۔

(۱) ایک یہ کہ اسلام سے پہلے بت پرست اقوام اور دوسرے اہلِ مذاہب میں ان فرشتوں کو خدائی کا جو مرتبہ دیا گیا تھا' اس غلط عقیدہ کو مٹا کر یہ حقیقت ظاہر کی جائے کہ ان کی حیثیت بے اختیار محکوم بندہ کی ہے جب تک اس کی تصریح نہ ہوتی' کلمۂ توحید کی تکمیل ممکن نہ تھی۔

(۲) دوسرا مقصد یہ ہے کہ مادہ کے خواص وطبائع کو دیکھ کر مادہ پرست جوان مادی خواص وطبائع کی بالذات کارفرمائی کا یقین کرتے ہیں' اس کا ازالہ کیا جائے' کیونکہ یہی پتھر ان کی ٹھوکر کا باعث ہوتا ہے اور بالآخر خدا کے انکار تک ان کو لے جاتا ہے' درحقیقت ان مادی خواص وطبائع پر روحانی اسباب مسلط ہیں۔ جو خدا کے حکم سے اس کے مقررہ اصول کے مطابق نظامِ عالم کو چلا رہے ہیں' مادہ اور اس کے خواص بالذات مؤثر نہیں' بلکہ کوئی دوسرا ہے جو اپنے ارواحِ مجردہ کے ذریعہ سے ان کو مؤثر بناتا ہے' اس عقیدہ سے مادیت کا بت ہمیشہ کے لیے ٹوٹ جاتا ہے۔ غرض منزہ خالق اور مادی مخلوق کے درمیان احکام وشرائع کا نزول اور قدرتِ الٰہی کے افعال کا صدور ان محکوم ارواحِ مجردہ کے ذریعہ ہوتا ہے۔

رسولوں پر ایمان

﴿وَرُسُلِہٖ﴾

یہ عقیدہ اسلام کی ان خصوصیات میں سے ہے جن کی تکمیل صرف اسی کے ذریعہ سے انجام کو پہنچتی ہے۔ آنحضرت ﷺ کے وجودِ مبارک سے پہلے دنیا کی ہر قوم کو بجائے خود یہ خیال تھا کہ وہی اللہ تعالیٰ کی خاص محبوب اور پیاری ہے' تمام دنیا کی قوموں میں ہدایتِ ربانی کے لیے وہی منتخب کی گئی ہے' اس کے علاوہ دنیا کی تمام قومیں اس فیض سے قطعاً محروم ہیں اور رہیں گی۔ اسی کی سرزمین دیوتاؤں اور دیویوں کا مسکن اور اسی کی زبان خدا کی خاص مقدس زبان ہے۔ بابل و نینوا ہو یا مصر و یونان' ایران ہو یا آریہ ورت ہندوستان ہر ملک کے لوگوں کو بجائے خود تنہا خدا کی مقدس اور برگزیدہ مخلوق ہونے کا دعویٰ تھا' اور وہ صرف اپنے آپ کو خدا کے پیغام اور خطاب سے مشرف ہونے کا مستحق جانتے تھے' لیکن تعلیمِ محمدی نے تنگ خیالی کے اس محدود دائرہ کو دنیا کی عظیم الشان وسعت سے بدل دیا' آپؐ نے یہ سکھایا کہ دنیا کی تمام قومیں خدا کی نظر میں یکساں ہیں۔ نہ عرب کو عجم پر اور نہ عجم کو عرب پر فضیلت ہے اور نہ کالے کو گورے اور نہ گورے کو کالے پر کوئی تقدم حاصل ہے' (۱) ساری زمین خدا کی ہے اور تمام قومیں خدا کی مخلوق ہیں' آپؐ نے فرمایا لوگو! تم سب ایک ہی باپ (آدمؑ) کی اولاد ہو اور وہ مٹی سے پیدا ہوا تھا' (۲) اسی طرح یہ بھی تعلیم دی کہ انسانوں اور قوموں کا امتیاز رنگ و روپ ملک و مرز بوم اور زبان سے نہیں' بلکہ صرف تقویٰ اور نیکوکاری سے۔ (۳)

اس تعلیم کا سب سے پہلا نتیجہ یہ نکلا کہ قوموں اور ملکوں کی فطری فضیلت کی پرانی داستان فراموش ہوگئی' دنیا کی تمام قومیں ایک سطح پر آ گئیں اور مساواتِ انسانی کا راستہ صاف ہوگیا۔ بنی اسرائیل جن کو خدا کا کنبہ ہونے کا ناز تھا' وحیِ محمدی نے ان کی اس حیثیت کے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور کہا:

﴿بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ﴾ (مائدۃ:۱۸)

''بلکہ تم بھی خدا کی مخلوقات میں سے بشر ہو۔''

---

(۱) مسند احمد بن حنبل از ابونضرہ تابعی۔

(۲) جامع ترمذی آخر کتاب المناقب۔

(۳) قرآن۔

نبوت کسی ملک یا قوم سے مخصوص نہیں

بنی اسرائیل کو دعویٰ تھا کہ نبوت اور پیغمبری صرف انہی کے خاندان کا ورثہ ہے۔ جس طرح اس آریہ ورت کا دعویٰ ہے کہ خدا کی بولی صرف یہیں کے رشیوں اور منیوں نے سنی جو وید کے اوراق میں محفوظ ہے۔ اسی طرح دوسری قوموں کو بھی اپنی اپنی جگہ پر یہی خیال تھا۔ اسلام نے اس تخصیص کو خدا کے انصاف و عدل و کرم اور رحمتِ عام کے منافی قرار دیا' اور کہہ دیا:

﴿ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰهِ یُؤْتِیْهِ مَنْ یَّشَآءُ وَ اللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ﴾ (جمعۃ:۴)

''یہ (نبوت) اللہ کی مہربانی ہے جس کو چاہے دے اور اللہ بڑی مہربانی والا ہے۔''

﴿قُلْ اِنَّ الْهُدٰی هُدَی اللّٰهِ اَنْ یُّؤْتٰٓی اَحَدٌ مِّثْلَ مَآ اُوْتِیْتُمْ اَوْ یُحَآجُّوْکُمْ عِنْدَ رَبِّکُمْ قُلْ اِنَّ الْفَضْلَ بِیَدِ اللّٰهِ یُؤْتِیْهِ مَنْ یَّشَآءُ وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ ○ یَّخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ یَّشَآءُ وَ اللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ ○﴾ (آل عمران:۷۳'۷۴)

''کہہ دو کہ ہدایت اللہ کی ہدایت ہے (اسرائیلی علما اپنے ہم مذہبوں سے کہتے ہیں کہ) کیا یہ ممکن ہے کہ جیسا دین تم کو دیا گیا کسی اور کو دیا جائے یا یہ نئے دین والے تم سے خدا کے آگے جھگڑ سکیں کہہ دو کہ (یہ نبوت کا) فضل اللہ کے ہاتھ میں ہے' وہ جس کو چاہتا ہے اس کو دیتا ہے اور اللہ کی رحمت سب پر عام ہے اور وہ جس کو چاہتا ہے اپنی رحمت کے ساتھ مخصوص کرتا ہے' وہ بڑا فضل والا ہے۔''

﴿مَا یَوَدُّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْکِتٰبِ وَ لَا الْمُشْرِکِیْنَ اَنْ یُّنَزَّلَ عَلَیْکُمْ مِّنْ خَیْرٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَ اللّٰهُ یَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ یَّشَآءُ وَ اللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ﴾ (بقرہ:۱۰۵)

''اہل کتاب میں جو منکر ہیں وہ یہ نہیں پسند کرتے اور نہ مشرکین پسند کرتے ہیں کہ تم پر تمہارے پروردگار کی طرف سے کوئی بھلائی نازل ہو اور اللہ اپنی رحمت کے ساتھ جس کو چاہتا ہے مخصوص کرتا ہے' اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔''

اس نے یہ تعلیم دی کہ روئے زمین کی ہر آبادی میں ہر قوم میں اور ہر زبان میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی راہ دکھانے والے' اس کی آواز پہنچانے والے' اور انسانوں کو ان کی غفلت سے چونکانے والے پیغمبر یا نائب پیغمبر آئے اور یہ سلسلہ محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت تک برابر جاری رہا۔

تمام دنیا میں پیغمبر آئے

بعثتِ محمدی سے پہلے دنیا کی کل آبادی مختلف گھرانوں میں بٹی ہوئی اور ایک دوسرے سے ناآشنا تھی' ہندوستان کے رشیوں اور منیوں نے آریہ ورت سے باہر کی دنیا کو خدا کی آواز سننے کا کبھی مستحق نہیں سمجھا تھا۔ ان کے نزدیک پرمیشور صرف آریہ ورت کی ہدایت اور رہنمائی کا خواہاں تھا زردشت نے پاک نژادانِ ایران کے سوا

سب کو یزدان کے جلوۂ نورانی سے محرومِ یقین کیا تھا' بنی اسرائیل اپنے خانوادہ کے سوا کہیں اور کسی نبی یا رسول کی بعثت کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے' عیسائی صرف اپنے آپ کو خدا کی فرزندی کا مستحق سمجھتے تھے' لیکن محمد رسول اللہ ﷺ نے آ کر بتایا کہ خدا کی ہدایت اور رہنمائی کے ظہور کے لیے کسی ملک' قوم اور زبان کی تخصیص نہیں۔ اس کی نگاہ میں عرب و عجم' شام و ہند سب برابر ہیں' محمد رسول اللہ ﷺ کی ہمہ بین آنکھوں نے پورب پچھّم' اتر' دکھن ہر ملک اور ہر قوم میں خدا کا نور دیکھا اور ہر زبان میں اس کی آواز سنی۔

﴿وَ لِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ﴾ (یونس:۴۷)

''اور ہر قوم کے لیے ایک رسول ہے۔''

﴿وَ لَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا﴾ (نحل:۳۶)

''اور یقیناً ہم نے ہر قوم میں ایک رسول بھیجا۔''

﴿وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ رُسُلًا اِلٰى قَوْمِهِمْ﴾ (الروم:۴۷)

''اور ہم نے تجھ سے پہلے کتنے رسول ان کی اپنی اپنی قوم میں بھیجے۔''

﴿وَ لِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ﴾ (رعد:۷)

اور ہر قوم کے لیے ایک رہنما آیا۔''

﴿وَ اِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ﴾ (فاطر:۲۴)

''اور کوئی قوم نہیں جس میں ایک ہشیار کرنے والا نہ آیا ہو۔''

﴿وَ كَمْ اَرْسَلْنَا مِنْ نَّبِيٍّ فِی الْاَوَّلِيْنَ﴾ (الزخرف:۶)

''اور ہم نے پہلی قوموں میں کتنے پیغمبر بھیجے''۔

﴿وَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ﴾ (ابراہیم:۴)

''اور ہم نے ہر پیغمبر کو اس کی قوم کی بولی میں بھیجا' تا کہ وہ ان کو بتا سکے۔''

اس آخری آیت سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ رسول تعلیمِ الٰہی کی تشریح و بیان کے لیے مامور ہے۔

تمام پیغمبروں کی صداقت کا اعتراف

ایک یہودی کے لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سوا کسی اور کو پیغمبر ماننا ضروری نہیں' ایک عیسائی تمام دوسرے پیغمبروں کا انکار کر کے بھی عیسائی رہ سکتا ہے' ایک ہندو تمام دنیا کو ملیچھ' شودر اور چنڈال کہہ کر بھی پکا ہندو رہ سکتا ہے ایک زردشتی تمام عالم کو بحرِ ظلمات کہہ کر بھی نورانی ہو سکتا ہے اور وہ ابراہیمؑ اور موسیٰ علیہم السلام کو نعوذ باللہ جھوٹا کہہ کر بھی دین داری کا دعویٰ کر سکتا ہے' لیکن محمد رسول اللہ ﷺ نے یہ ناممکن کر دیا ہے کہ کوئی ان کی پیروی کا دعویٰ کر کے ان سے پہلے کے کسی پیغمبر کا انکار کر سکے' آنحضرت ﷺ تہجد میں جو دعا پڑھتے تھے اس میں ایک فقرہ یہ بھی ہوتا

تھا۔﴿وَ النَّبِیُّوْنَ حَقٌّ وَّ مُحَمَّدٌ حَقٌّ﴾ سب نبی برحق تھے اور محمد بھی برحق ہے'(۱) غرض کوئی شخص اس وقت تک محمدی نہیں ہوسکتا جب تک وہ پہلے موسوی' عیسوی' اور سلیمانی وداؤدی نہ بن لے اور کوئی شخص اس وقت تک مسلمان نہیں ہوسکتا' جب تک وہ دنیا کے تمام پیغمبروں کی یکساں صداقت' حقانیت' راست بازی اور معصومیت کا اقرار نہ کرے اور یہ یقین نہ کرے کہ ان کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے عرب کی طرح ہر قوم کو اپنی ہدایت اور راہنمائی سے سرفراز کیا ہے اور ان کا ماننا ایسا ہی ضروری ہے جیسا خدا کا ماننا۔

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ وَ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّفَرِّقُوْا بَیْنَ اللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ وَ یَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّ نَکْفُرُ بِبَعْضٍ وَّ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّتَّخِذُوْا بَیْنَ ذٰلِکَ سَبِیْلًا ○ اُولٰٓئِکَ هُمُ الْکٰفِرُوْنَ حَقًّا وَّ اَعْتَدْنَا لِلْکٰفِرِیْنَ عَذَابًا مُّهِیْنًا ○ وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ وَ لَمْ یُفَرِّقُوْا بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ اُولٰٓئِکَ سَوْفَ یُؤْتِیْهِمْ اُجُوْرَهُمْ وَ کَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا﴾ (نساء:۱۵۰'۱۵۲)

''بے شک جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں کا انکار کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان فرق کریں اور کہتے ہیں کہ ہم بعض کو مانیں گے اور بعض کو نہیں مانیں گے اور چاہتے ہیں کہ اس کے بیچ بیچ میں کوئی راستہ نکالیں' وہی تو حقیقت میں کافر ہیں اور کافروں کے لیے ہم نے اہانت والا عذاب تیار کر رکھا ہے' اور جو اللہ پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے اور ان رسولوں میں سے کسی کے درمیان فرق نہیں کیا تو وہی لوگ ہیں جن کی مزدوری خدا ان کو دے گا اور اللہ بخشنے والا رحمت والا ہے۔''

﴿وَ الْمَلٰٓئِکَةِ وَ الْکِتَابِ وَ النَّبِیّٖنَ﴾ (بقرہ:۱۷۷)

''اور فرشتوں پر کتاب پر اور سب نبیوں پر ایمان لانا نیکی ہے۔''

﴿وَ مَنْ یَّکْفُرْ بِاللّٰهِ وَ مَلٰٓئِکَتِهٖ وَ کُتُبِهٖ وَ رُسُلِهٖ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِیْدًا﴾ (نساء:۲۰)

''اور جس نے خدا کا اور اس کے فرشتوں کا اور اس کی کتابوں کا اور اس کے رسولوں کا اور قیامت کا انکار کیا وہ نہایت سخت گمراہ ہوا۔''

بقرہ کے خاتمہ میں ہے:

﴿کُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ مَلٰٓئِکَتِهٖ وَ کُتُبِهٖ وَ رُسُلِهٖ لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ﴾ (بقرہ:۲۸۵)

''ہر ایک خدا پر اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لایا ہم خدا کے رسولوں کے درمیان تفریق نہیں کرتے۔''

﴿لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ﴾ (بقرہ:۱۳۶۔ال عمران:۸۴)

---

(۱) صحیح بخاری باب التہجد۔

''ان پیغمبروں میں سے کسی کے درمیان تفرق نہیں کرتے۔''

پیغمبروں میں تفریق کی ممانعت

پیغمبروں میں تفریق کرنے کے یہ معنی ہیں کہ ان میں سے بعض کو مانیں اور بعض کو نہ مانیں' اسلام نے اس کی ممانعت کی اور عام حکم دیا کہ دنیا کے تمام پیغمبروں اور رسولوں کو یکساں خدا کا رسولِ صادق اور راست باز تسلیم کیا جائے۔

یہودی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نعوذ باللہ جھوٹا اور کاذب سمجھتے تھے' اور ان پر طرح طرح کی تہمتیں لگاتے تھے' اور اب بھی ان کا یہی عقیدہ ہے۔ یہودیت اور اسلام میں جو اشتراک ہے' وہ مسیحیت سے زیادہ ہے' اس لیے اگر اسلام کی راہ میں حضرت مسیحؑ کا نام نہ آئے تو بہت سے یہود مسلمان ہونے کو تیار ہو جائیں' مگر اسلام نے کبھی یہ ننگ گوارا نہیں کیا' اور جب تک کسی یہودی سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت' معصومیت اور تقدس کا اقرار نہیں لے لیا' اس کو اپنے دائرہ میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دی' چنانچہ خود آنحضرت ﷺ کے زمانے میں بہت سے یہود آپؐ کی رسالت' اور شریعت پر ایمان لانے کو تیار تھے' مگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ماننے کے لیے تیار نہیں تھے۔ آنحضرت ﷺ نے ان کی دوستی کے عظیم الشان فائدوں سے محروم رہنا گوارا کیا مگر مسیح علیہ السلام کی سچائی سے ان کا محروم رہنا قبول نہ فرمایا'[1] اور ان سے صاف کہا:

﴿یٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ هَلْ تَنْقِمُوْنَ مِنَّآ اِلَّآ اَنْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَ مَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلُ وَ اَنَّ اَكْثَرَكُمْ فٰسِقُوْنَ﴾ (المائدہ:۵۹)

''اے یہود! کیا بیر ہے تم کو ہم سے' مگر یہی کہ ہم خدا پر' اور جو ہماری طرف اتارا گیا اور جو پہلے اتارا گیا اس پر ایمان رکھتے ہیں اور تم میں اکثر بے حکم ہیں۔''

خود قریش کا یہ حال تھا کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نام سے چٹکتے تھے' تاہم ان کی خاطر سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت' تقدس اور معصومیت کا انکار نہیں کیا گیا' قرآن نے کہا:

﴿وَ لَمَّا ضُرِبَ ابْنُ مَرْيَمَ مَثَلًا اِذَا قَوْمُكَ مِنْهُ يَصِدُّوْنَ ○ وَ قَالُوْٓا ءَاٰلِهَتُنَا خَيْرٌ اَمْ هُوَ مَا ضَرَبُوْهُ لَكَ اِلَّا جَدَلًا بَلْ هُمْ قَوْمٌ خَصِمُوْنَ ○ اِنْ هُوَ اِلَّا عَبْدٌ اَنْعَمْنَا عَلَيْهِ﴾ (زخرف ۵۷'۵۹:)

''اور جب مریمؑ کے بیٹے کی کہاوت بیان کی گئی تو تیری قوم اس سے چلانے لگتی ہے اور بولی کہ ہمارے معبود اچھے ہیں یا وہ' یہ نام جو وہ تجھ پر دھرتے ہیں' صرف جھگڑنے کو' بلکہ وہ جھگڑالو ہیں' وہ ایک بندہ ہے جس پر ہم نے فضل کیا ہے۔''

---

(۱) تفسیر ابن جریر طبری جلد ہشتم ص ۱۶۷ مصر۔

قریش کو معلوم تھا کہ اسلام عیسیٰ علیہ السلام بن مریم کو بندہ اور رسول مانتا ہے' خدا نہیں۔ باوجود اس کے عیسائیوں کی طرح مسلمانوں پر بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ماننے کی وجہ سے عیسیٰ پرستی کا الزام دھرتے تھے قرآن نے ان کے اس بے معنی اعتراض کی تردید کی۔

پیغمبروں کی غیر محدود تعداد

اسلام میں پیغمبروں کی کوئی تعداد محدود نہیں ہے۔ طبرانی کی ایک ضعیف روایت میں ہے کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیا مبعوث ہوئے۔ دوسری روایت میں اس سے کم تعداد بھی مروی ہے۔ قرآن پاک میں نام کے ساتھ صرف انہی انبیاء علیہم السلام کا ذکر ہے جن سے عرب مانوس تھے' یا ان کے ہمسایہ یہود و نصاریٰ کے صحیفوں میں جن کے تذکرے تھے۔ قرآن میں بعض ایسے انبیا بھی مذکور ہیں جن سے صرف عرب واقف تھے اور یہود و نصاریٰ بے خبر تھے' مثلاً حضرت ہودؑ اور حضرت شعیبؑ' بعض ایسے بھی ہیں جن کو یہود و نصاریٰ جانتے تو تھے' لیکن پیغمبر نہیں تسلیم کرتے تھے' مثلاً حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ وحیِ محمدی نے ان سب کو پیغمبر تسلیم کیا' اور ان کی صداقت و عظمت کا اقرار کیا۔

پیغمبری کی واضح حقیقت کا اظہار

اسی سلسلہ میں ایک اور واقعیت کی طرف بھی اشارہ کر دینا مناسب ہے' اسلام سے پہلے نبوت' رسالت اور پیغمبری کی کوئی خاص واضح اور غیر مشتبہ حقیقت دنیا کے سامنے نہ تھی' یہود کے ہاں نبوت کے معنی صرف پیشین گوئی کے تھے اور نبی پیشین گو کو کہتے تھے' اور جس کے متعلق وہ یقین رکھتے تھے کہ اس کی دعا یا بددعا فوراً قبول ہو جاتی ہے'(۱) اسی لیے حضرت ابراہیمؑ' حضرت لوطؑ' حضرت اسحٰقؑ حضرت یعقوبؑ اور حضرت یوسفؑ کی نبوت اور رسالت کا محض دھندلا سا خاکہ ان کے ہاں موجود ہے' بلکہ حضرت ابراہیمؑ کے مقابلہ میں شام کے کاہن مالک کی پیغمبرانہ شان ان کے نزدیک زیادہ نمایاں معلوم ہوتی ہے'(۲) حضرت داؤدؑ اور سلیمانؑ کی حیثیت ان کے ہاں صرف بادشاہ کی ہے' اور ان کے زمانہ کے پیشین گوئی کرنے والے پیغمبر اور ہیں' یہی سبب ہے کہ یہود کے قصوں اور کتابوں میں اسرائیلی پیغمبروں کی طرف نہایت سخیف باتیں بے تامل منسوب کی گئی ہیں' عیسائیوں کے ہاں بھی رسالت اور نبوت کی کوئی واضح حقیقت نہیں بیان کی گئی ہے' ورنہ یہ نہ کہا جاتا کہ مجھ سے پہلے جو آئے' وہ چور اور ڈاکو تھے۔(۳) موجودہ انجیلوں میں نہ خدا کے رسولوں کی تعریف ہے' نہ ان کے تذکرے ہیں' نہ ان کی سچائی اور صداقت کی گواہی ہے' حضرت زکریاؑ اور حضرت یحییٰؑ جن کے تذکرے انجیل میں ہیں' وہ بھی پیغمبرانہ شان کے ساتھ ان کے ہاں مسلم

(۱) دیکھو توراۃ صحیفہ تکوین باب ۲۰' ۷۔
(۲) تکوین ۱۴' ۱۸۔
(۳) انجیل۔

نہیں، لیکن محمد رسول اللہ ﷺ نے آ کر اس جلیل القدر منصب کی حقیقت ظاہر کی، اس کے فرائض بتائے، اس کی خصوصیات کا اظہار کیا اور ان سب پر ایمان لانے کو نجات کا ضروری ذریعہ قرار دیا۔ آپؐ نے بتایا کہ نبوت و رسالت خاص خاص انسانوں کو خدا کا بخشا ہوا ایک منصب ہے، جس کو دے کر وہ دنیا میں اس غرض سے بھیجے گئے کہ وہ خدا کے احکام لوگوں کو بتائیں اور سچائی اور نیکی کا راستہ ان کو دکھائیں، وہ ہادی (رہنما)، نذیر (ہشیار کرنے والے)، داعی (خدا کی طرف بلانے والے)، مبشر (خوش خبری سنانے والے)، معلم (سکھانے والے)، مبلغ (خدا کے احکام پہنچانے والے) اور نور (روشنی) تھے۔ خدا ان سے ہم کلام ہوتا تھا، اپنی باتوں سے ان کو مطلع کرتا تھا، اور وہ ان سے دوسرے انسانوں کو آگاہ کرتے تھے، وہ گناہوں سے پاک اور برائیوں سے محفوظ تھے، وہ خدا کے نیک اور مقبول بندے تھے، اور اپنے عہد کے سب سے بہتر انسان تھے۔ ان کے سب کام خدا کے لیے تھے اور خدا ان کے لیے تھا، یہ ہستیاں اپنے فرائض کو انجام دینے کے لیے ہر قوم میں پیدا ہوئیں جنہوں نے ان کو مانا، نجات پائی، اور جنہوں نے جھٹلایا، ہلاک و برباد ہوئے۔ قرآن پاک نے ان کی زندگی کے سوانح، ان کی تبلیغ کی روداد، ان کے اخلاق کی بلند مثالیں، اور ان کی خدا پرستی کا اخلاص اس طرح بیان کیا ہے کہ ان کے پڑھنے اور سننے سے ان کی پیروی کا جذبہ، ان کے اتباع کا شوق اور ان کی صداقت کا یقین دلوں میں پیدا ہو جاتا ہے اور ساتھ ہی اس نے شانِ نبوت کے خلاف جو غلط باتیں دوسرے صحیفوں میں ان کی طرف منسوب کیں، ان کو چھوڑ دیا ہے، یا ان کی تردید کر دی ہے۔

پیغمبروں کی عصمت

الغرض نبوت اور رسالت کی سب سے اہم خصوصیت اسلام نے جو یہ قرار دی کہ نبی و رسول گناہوں سے پاک اور برائیوں سے محفوظ اور معصوم ہوتے ہیں، بنی اسرائیل کو نبوت اور رسالت کے اس بلند تخیل کی ہوا بھی نہیں لگی تھی، اس لیے انہوں نے نہایت بیباکی سے اپنے پیغمبروں کی طرف ہر قسم کے گناہ منسوب کر دیے۔ عیسائی ایک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو تو معصوم کہتے ہیں باقی سب کی گنہگاری کے قائل ہیں لیکن اسلام نے دنیا کے تمام پیغمبروں اور رسولوں کی عظمت کی ایک ہی سطح قائم کی ہے، اس کے نزدیک گناہوں سے پاکی اور عصمتِ انبیا اور مرسلین کا مشترک وصف ہے کیونکہ گنہگار، گنہگاروں کی رہنمائی کا مستحق نہیں، اور اندھا اندھے کو راہ نہیں دکھا سکتا۔ اس بنا پر محمد رسول اللہ ﷺ کی وحی و تعلیم نے خدا کے تمام معصوم رسولوں کی عظمت و جلالت دنیا میں قائم کی اور جن کو رباطنوں نے ان کی عصمت و بیگناہی کے دامن پر اپنے وہم و نادانی سے داغ لگائے تھے ان کو دھو کر پاک و صاف کیا، اور یہ رسالتِ محمدی کا عظیم الشان کارنامہ ہے۔

خود انجیل کے طرز سے ظاہر تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام احکامِ عشرہ کے برخلاف اپنی ماں کی عزت نہیں کرتے تھے، قرآن نے اس کی تردید کی، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبان سے کہلوایا:

﴿وَ بَرًّا بِوَالِدَتِیْ وَ لَمْ یَجْعَلْنِیْ جَبَّارًا شَقِیًّا﴾ (مریم:۳۲)

''اور اپنی ماں کے ساتھ نیکی کرنے والا' اور مجھ کو خدا نے جبار اور بد بخت نہیں بنایا۔''

کیونکہ احکامِ عشرہ کے مطابق ماں باپ کا ادب نہ کرنا بد بختی تھی' اسی طرح موجودہ انجیل نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر یہ الزام لگایا ہے کہ وہ نماز روزہ کی پروا نہیں کرتے تھے' قرآن نے ان کی زبان سے کہلوایا:

﴿وَ اَوْصَانِیْ بِالصَّلٰوۃِ وَالزَّکٰوۃِ مَا دُمْتُ حَیًّا﴾ (مریم:۳۱)

''اور اس نے مجھے نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیا ہے جب تک میں زندہ ہوں۔''

یہود حضرت مریم علیہا السلام پر تہمت رکھتے تھے قرآن نے اس الزام کو دور کیا اور کہا:

﴿وَ مَرْیَمَ بِنْتَ عِمْرَانَ الَّتِیْ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِیْهِ مِنْ رُّوْحِنَا وَ صَدَّقَتْ بِکَلِمٰتِ رَبِّهَا وَ کُتُبِهٖ وَ کَانَتْ مِنَ الْقَانِتِیْنَ﴾ (تحریم:۱۲)

''اور مریم بنت عمران جس نے اپنی عصمت کی حفاظت کی تو ہم نے اس میں اپنی روح پھونکی اور اس نے اپنے پروردگار کی باتوں اور اس کی کتابوں کو سچ جانا اور وہ بندگی کرنے والوں میں تھی۔''

یہود حضرت سلیمانؑ کو گنڈہ' تعویذ اور عملیات وغیرہ کا موجد سمجھتے تھے حالانکہ سحر و جادو وغیرہ توراۃ میں شرک قرار دیا جا چکا تھا' قرآن نے علانیہ یہودیوں کے اس الزام کی تردید کی:

﴿وَ مَا کَفَرَ سُلَیْمٰنُ وَ لٰکِنَّ الشَّیٰطِیْنَ کَفَرُوْا یُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ﴾ (بقرہ:۱۰۲)

''اور سلیمان نے کفر کا کام نہیں کیا' بلکہ شیطانوں نے کیا وہ لوگوں کو جادو سکھاتے تھے۔''

اسی طرح حضرت لوطؑ پر بدکاری کا جو الزام یہود لگاتے ہیں اس کی تردید کی۔

قرآن میں پیغمبروں کا جامع تذکرہ

اوپر گزر چکا ہے کہ قرآن نے یا آنحضرت ﷺ نے دنیا کے تمام پیغمبروں کے نام نہیں لیے ہیں کہ صرف ناموں کی فہرست یا نامعلوم اشخاص کے نام لے لینے سے دلوں میں جوشِ عقیدت نہیں پیدا ہو سکتا' تاہم معلوم تھا کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی صدائے دعوت ایک دن دنیا کے کناروں تک پہنچے گی۔ اور بہت سی غیر قومیں اور دوسرے انبیا کی امتیں اس حلقہ میں داخل ہوں گی اور اپنے اپنے انبیا کا نام و نشان صحیفۂ محمدی میں تلاش کریں گی اس لیے ایک جامع آیت میں تمام انبیا کا تذکرہ کر دیا گیا اور ان کی صداقت کی پہچان بتا دی گئی' فرمایا:

﴿اِنَّآ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ کَمَآ اَوْحَیْنَآ اِلٰی نُوْحٍ وَّ النَّبِیّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَ اَوْحَیْنَآ اِلٰٓی اِبْرٰهِیْمَ وَ اِسْمٰعِیْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ یَعْقُوْبَ وَ الْاَسْبَاطِ وَ عِیْسٰی وَ اَیُّوْبَ وَ یُوْنُسَ وَ هٰرُوْنَ وَ سُلَیْمٰنَ وَ اٰتَیْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ○ وَّ رُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَیْکَ مِنْ قَبْلُ وَ رُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَیْکَ وَ کَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰی تَکْلِیْمًا ○ رُسُلًا مُّبَشِّرِیْنَ وَ مُنْذِرِیْنَ لِئَلَّا یَکُوْنَ

لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ وَ كَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۝﴾ (النساء:۱۶۳،۱۶۵)

''ہم نے (اے محمد) تمہارے پاس وحی بھیجی جس طرح نوحؑ اور ان کے بعد کے پیغمبروں کے پاس بھیجی، اور ہم نے ابراہیم کو اور اسمٰعیل کو اور اسحاق کو اور یعقوب کو اور ان کے خاندان کو اور عیسیٰ کو اور ایوب اور یونس کو اور ہارون کو اور سلیمان کو وحی بھیجی اور داؤد کو زبور عطا کی اور دوسرے رسولوں کو بھیجا جن کا حال تم سے ہم نے پہلے بیان کیا ہے اور ان رسولوں کو جن کا حال ہم نے تم سے بیان نہیں کیا، اور خدا نے موسیٰؑ سے بات کی اور ان رسولوں کو خوش خبری سنانے والا اور ہشیار کرنے والا بنا کر بھیجا تا کہ لوگوں کو رسولوں کے آجانے کے بعد خدا کے آگے کوئی عذر باقی نہ رہ جائے اور خدا غالب و دانا ہے۔''

انبیا کے متعلق یہی حقیقت سورۂ مومن میں دوبارہ بیان کی گئی ہے:

﴿وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَ مِنْهُمْ مَنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ﴾ (مؤمن:۷۸)

''اور ہم نے یقیناً تم سے پہلے بہت سے پیغمبر بھیجے ان میں کچھ وہ ہیں جن کا حال تم سے بیان کیا ہے اور کچھ وہ ہیں جن کا حال تم سے بیان نہیں کیا۔''

وہ انبیاؑ جن کا تذکرہ قرآن میں نہیں

تعلیمِ محمدی کے اصول کے مطابق یہ یقین کرنا ضروری ہے کہ دنیا کی بڑی بڑی قوموں اور ملکوں جیسے چین، ایران اور ہندوستان میں بھی آنحضرت ﷺ سے پہلے خدا کے انبیا مبعوث ہو چکے ہیں، اور اس لیے یہ تمام قومیں اپنے جن بزرگوں کی عزت و عظمت کرتی ہیں اور اپنے دین و مذہب کو جن کی طرف منسوب کرتی ہیں ان کی صداقت اور استبازی کا قطعی انکار کوئی مسلمان نہیں کرسکتا۔ اسی بنا پر بعض علماء نے ہندوستان کے کرشن اور رام (۱) کو بلکہ ایران کے زردشت (۲) کو بھی اور بعض صاحبوں نے تو بودھ تک کو پیغمبر کہا ہے، بہر حال امکان میں تو شک ہی نہیں، لیکن یقین کے ساتھ ان ناموں کی تعیین بھی حد سے تجاوز کرنا ہے۔ اصل یہ ہے کہ قرآن نے انبیا کی دو قسمیں کی ہیں، ایک وہ جن کے ناموں کی اس نے تصریح کی ہے اور دوسرے وہ جن کے نام اس نے بیان نہیں کیے ہیں، اس لیے صحیح یہ ہے کہ جن انبیا کے نام مذکور ہیں، تمام مسلمانوں کو ان پر نام بنام ایمان لانا چاہیے اور جن کے نام مذکور نہیں، ان کی نسبت صرف اجمالی ایمان کافی ہے کہ ان قوموں میں خدا کے فرستادہ اور پیغمبر آئے تھے، گو بہ تخصیص ان کے نام نہیں معلوم ہیں، وہ قومیں جن کا نام لیتی ہیں، اگر ان کی زندگی اور ان کی تعلیم نبوت اور رسالت کی شان کے مطابق ہیں، تو ان کی نبوت اور رسالت کی طرف رُجحان اور میلان بلکہ قرینہ غالب ہو سکتا ہے، لیکن یقین

(۱) کلماتِ طیبات حضرت شاہ مرزا مظہر جانِ جانان۔

(۲) ملل و نحل ابن حزم۔

اس لیے نہیں کیا جا سکتا کہ ہمارے پاس ان باتوں پر یقین کرنے کا ذریعہ صرف وحی ہے اور وہ اس تخصیص و تعیین سے خاموش ہے۔

ایسے انبیاؑ کی شناخت کا اصول

اس قسم کے انبیاؑ جن کے نام گو قرآن میں مذکور نہیں، مگر وہ آنحضرت ﷺ کے پہلے گذر چکے ہیں اور ان کے پیرو ان کو اپنے ہاں نبوت و رسالت کا درجہ دیتے ہیں، ان کی شناخت اور پہچان کا ایک اصول قرآن نے مقرر کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنی قوم کو توحید کی تعلیم دی ہے:

﴿وَ لَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ کُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَ اجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ﴾ (نحل:۳۶)

''اور ہم نے ہر قوم میں ایک رسول بھیجا کہ اللہ کی پرستش کرو اور جھوٹے معبود سے بچے رہو۔''

﴿وَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِکَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِیْٓ اِلَیْهِ اَنَّه لَآ اِلٰهَ اِلَّا اَنَا فَاعْبُدُوْنِ﴾ (انبیاء:۲۵)

''اور ہم نے تجھ سے پہلے کسی نبی کو نہیں بھیجا لیکن اس کو یہی وحی بھیجی کہ میرے سوا کوئی خدا نہیں مجھی کو پوجو۔''

اس لیے وہ تمام قدیم رہبرانِ انسانی اور رہنمایانِ عالم جو دنیا میں کسی مذہب کو لائے اور جن کی تبلیغ و تعلیم توحید کی دعوت اور بت پرستی سے اجتناب تھی اور جن کی زندگی اس تعلیم کے شایانِ شان تھی، ان کی نسبت یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اپنی قوم کے اور اپنے وقت کے رسول اور پیغمبر نہ تھے کہ اتنی بڑی بڑی قومیں خود قرآن کے اصول کے مطابق انبیا اور رسولوں کے وجود سے خالی نہیں رہ سکتی تھیں۔ اسی بنا پر اسلام کی ان تلقینات میں سے جن کے تسلیم کیے بغیر کوئی شخص مسلمان نہیں ہو سکتا، ایک یہ بھی ہے کہ وہ تمام ملکوں کے پیغمبروں اور تمام قوموں کے رسولوں کو جو حضرت خاتمِ نبوت ﷺ کے زمانہ سے پہلے پیدا ہوئے، یکساں صداقت کے ساتھ تسلیم کرے۔ ان سب نے تمام دنیا کو ایک ہی تعلیم دی ہے اور وہ توحید ہے، البتہ ان انبیا میں سے ایک کو دوسرے پر بعض بعض حیثیتوں سے ترجیح ہے۔

﴿تِلْکَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰی بَعْضٍ مِّنْهُمْ مَّنْ کَلَّمَ اللّٰهُ وَ رَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ وَّ اٰتَیْنَا عِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ الْبَیِّنٰتِ وَ اَیَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ﴾ (بقرہ:۲۵۳)

''ان رسولوں میں سے ہم نے کسی کو کسی پر فضیلت دی، ان میں سے کسی سے اللہ نے کلام کیا اور کسی کے بہت درجے بڑھائے اور ہم نے عیسیٰ ابن مریم کو نشانیاں دیں۔ اور پاکی کی روح سے اس کی تائید کی۔''

آپؐ نے دوسرے انبیا کی جائز تعظیم و تکریم یہاں تک کی ہے کہ ان کے مقابلہ میں کبھی کبھی اپنی ہستی بھی

فراموش کر دی ہے۔ ایک دفعہ ایک صحابی نے آپؐ کو خَیْرُ الْبَرِیَّۃ۔ اے بہترین خلق کہہ کر خطاب کیا۔ فرمایا وہ تو ابراہیمؑ تھے (۱) ایک دفعہ ایک صاحب نے دریافت کیا کہ سب سے عالی خاندان کون تھا' فرمایا یوسف علیہ السلام پیغمبر بن پیغمبر' بن خلیل اللہ' (۲) ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ ایک یہودی مدینہ میں کہہ رہا تھا کہ قسم ہے اس ذات کی جس نے موسیٰ علیہ السلام کو بشر پر فضیلت دی۔ ایک مسلمان یہ کھڑے سن رہے تھے' ان کو غصہ آ گیا کہ ہمارے پیغمبر کی موجودگی میں تم یہ کہہ رہے ہو' اور اس کو ایک تھپڑ کھینچ مارا' اس نے دربارِ نبوی میں جا کر شکایت کی آپؐ نے ان صحابی کو بلا بھیجا' اور مقدمہ کی روداد سنی پھر نہایت برہم ہو کر فرمایا کہ پیغمبروں میں باہم ایک دوسرے پر فضیلت نہ دو' (۳) یعنی ایسی فضیلت جس سے کسی دوسرے نبی کی تنقیص ہوتی ہو۔

یہی وہ تعلیماتِ محمدی ہیں' جن کے ذریعہ سے دنیا میں وحدتِ مذاہب' روحانی مساوات' انسانی اخوت اور تمام انبیا اور پیغمبروں کے ادب و احترام کے جذبات پیدا ہوئے۔ بنی اسرائیل کے وہ پیغمبر جن کو ماننے والے تمام دنیا میں چند لاکھ سے زیادہ نہ تھے' محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ سے ان کی عظمت و جلالت اور ادب و احترام کرنے والے چالیس کروڑ سے زیادہ ہو گئے' وہ حضرت مریمؑ اور حضرت عیسیٰؑ جو چھ سو برس تک یہودیوں کی جھوٹی تہمت سہتے رہے محمد رسول اللہ ﷺ نے آ کر دفعتاً اس کو مٹا دیا' اور ان کی پاکی کی گواہی دی' جس کی بدولت آج چالیس کروڑ زبانیں ان کی عصمت کی شہادت دے رہی ہیں۔ ہندوستان' ایران' چین جن کے سچے رہنماؤں کا ان کے ملک سے باہر کوئی ادب و احترام نہ تھا' جہاں جہاں مسلمان گئے ان کے جائز ادب و احترام کو اپنے ساتھ لیتے گئے۔ (۴)

وہ عرب جو پیغمبروں کے ناموں تک سے ناواقف تھے' جو نبوت و رسالت کے خصائص کے علم سے محروم تھے' جو انبیاء اور رسولوں کی سیرتوں سے ناآشنا تھے' جو ان کے ادب و احترام اور تصدیق و اعتراف سے بیگانہ تھے' جن کو اپنے دیوتاؤں کے سامنے عیسیٰ علیہ السلام بن مریم پر تحقیرانہ ہنسی آتی تھی اور جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی فضیلت کا ذکر سن کر اپنے غصہ کو ضبط نہیں کر سکتے تھے (۵) محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم سے ان کا یہ حال ہوا کہ وہ ایک ایک پیغمبر کے نام و نشان اور تاریخ و سیرت سے واقف ہو گئے اور تبرکاً ان کے ناموں پر اپنی اولادوں کے نام رکھنے لگے اور جو آج بھی تمام مسلمانوں میں شائع اور ذائع ہیں' انہوں نے پیغمبروں کی صداقت اور سچائی کی گواہی دی' ان کے ادب و احترام کو اپنے سینوں میں جگہ دی' ان کی تعظیم و تکریم کو اپنے دین و ایمان کا جزو بنا لیا' دنیا کی کسی قوم میں یہ رواج نہیں ہے کہ انبیا علیہم السلام کے نام ادب سے لیے جائیں' مگر ایک مسلمان کے لیے لازم ہے کہ جب کسی پیغمبر کا نام لے تو ادب سے لے اور ان پر درود و سلام پڑھے۔

---

(۱) مسند ابن حنبل ج ۱ ص ۱۵۳۔

(۲) صحیح بخاری کتاب انبیاء مناقب حضرت یوسف علیہ السلام ص ۴۷۹۔

(۳) صحیح بخاری مناقب حضرت موسیٰ علیہ السلام ص ۴۸۵۔

(۴) قرآن پاک سورۂ زخرف رکوع ۶۔

(۵) صحیح بخاری مناقب حضرت موسیٰ علیہ السلام۔

کتبِ الٰہی پر ایمان

﴿وَ کُتُبِہٖ﴾

کتابِ الٰہی پر ایمان لانے کا مقصد

ایک مسلمان کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے پیغمبر کے صحیفۂ وحی پر ایمان لائے! ہر چند یہ عقیدۂ رسالت کا لازمی نتیجہ ہے یعنی رسول کو رسول مان لینا' اس کی تعلیمات اور وحی کو مان لینے کے مترادف ہے' تاہم یہ تصریح اس لیے کی گئی' تاکہ پوری طرح صاف اور واضح ہو جائے کہ رسول کو رسول مان لینے کے بعد اس کے صحیفۂ وحی کو مان کر اس کی تعلیمات پر عمل کرنا ضروری ہے' سورۂ بقرہ کے شروع ہی میں سچے مومنوں کی تعریف میں کہا گیا ہے:

﴿وَ الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ﴾ (بقرہ:۴)

''اور جو اس (کتاب یا وحی) پر ایمان رکھتے ہیں جو تجھ پر (اے محمد) اتاری گئی۔''

کتابِ الٰہی پر ایمان لانے سے مقصود' ان تمام صداقتوں اور حکموں کو بجان و دل قبول کرنا ہے جو اس میں مذکور ہیں' یہ گویا پوری شریعتِ مطہرہ کو قبول کر لینے کا مختصر ترین طریقۂ تعبیر ہے اور اس لیے ایمانیات کی بہت سی دوسری باتیں جن کی تفصیل ہر موقع پر ضروری نہیں' اس ایک فقرہ کے تحت میں آ جاتی ہیں۔ قرآن پر ایمان کے معنی یہ ہیں کہ جو کچھ قرآن میں علمی و عملی عقائد و عبادات و احکام مذکور ہیں ان سب کو بے کم و کاست ہم تسلیم کرتے ہیں کہ اگر کوئی سرے سے ان کو تسلیم ہی نہیں کرتا تو ان کی تعمیل و پیروی کا اس سے کیونکر مطالبہ کیا جا سکتا ہے' اسی بنا پر اس کی تشریح آنحضرت ﷺ نے کبھی ان الفاظ میں فرمائی ہے کہ ﴿بِمَا جِئْتُ بِہٖ﴾ جو کچھ میں لے کر آیا اس پر ایمان لاؤ۔ قرآن نے کہا:

﴿وَ اٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰی مُحَمَّدٍ﴾ (محمد:۲)

''اور ایمان لائے اس پر جو محمد پر اتارا گیا۔''

اس عقیدہ کا تکمیلی پہلو

لیکن قرآن اگر اتنا ہی کہتا کہ میرے پیرو صرف مجھ پر ایمان لائیں تو یہ کوئی اہم بات نہ ہوتی کہ ہر صاحبِ مذہب کی یہی تعلیم ہوتی ہے' قرآن نے عقائد کی اس دفعہ میں بھی اپنے تکمیلی پہلو کو پیش نظر رکھا ہے' اور یہ ضروری

قرار دیا ہے کہ اہلِ قرآن قرآن کے ساتھ ہی دوسری آسمانی کتابوں کی صداقت کو بھی تسلیم کریں یعنی کوئی شخص اس وقت تک مسلمان نہیں ہوسکتا' جب تک صحیفۂ محمدی کے ساتھ دوسرے پیغمبروں کے صحیفوں کو بھی منجانب اللہ تسلیم نہ کرے' چنانچہ سورۂ بقرہ کے شروع والی مذکورہ بالا آیت کے ساتھ یہ بھی فرمایا:

﴿وَ مَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ﴾ (بقرہ:۴)

''اور جو ایمان لائے اس پر جو تجھ سے پہلے اترا۔''

پھر اسی سورہ کے آخر میں فرمایا:

﴿اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ کُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ مَلٰٓئِکَتِهٖ وَ کُتُبِهٖ﴾ (بقرہ:۲۸۵)

''رسول ایمان لایا' اس پر جو خدا کی طرف سے اس پر اترا اور اہلِ ایمان بھی ہر ایک خدا پر' اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر ایمان لایا۔''

تمام کتبِ الٰہی پر ایمان لانا ضروری ہے

بقرہ کی آیتوں میں بعض انبیاء علیہم السلام کا تفصیلی تذکرہ اور بقیہ تمام انبیا کا اجمالی ذکر کر کے ان کی کتابوں اور وحیوں کی تصدیق کا حکم دیا گیا ہے:

﴿قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْنَا وَ مَآ اُنْزِلَ اِلٰٓی اِبْرٰهِیْمَ وَ اِسْمٰعِیْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ یَعْقُوْبَ وَ الْاَسْبَاطِ وَ مَا اُوْتِیَ مُوْسٰی وَ عِیْسٰی وَ مَآ اُوْتِیَ النَّبِیُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ﴾ (بقرہ:۱۳۶)

''اے مسلمانو! تم کہو کہ ہم خدا اور جو کچھ ہماری طرف اتارا گیا اور جو کچھ ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب اور خاندانِ یعقوب کی طرف اتارا گیا' اس پر اور جو کچھ موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ کو دیا گیا اس پر اور جو کچھ اور سب پیغمبروں کو ان کے پروردگار کی طرف سے دیا گیا' ہم ان سب پر ایمان لائے۔''

آلِ عمران میں کسی قدر تفصیل ہے:

﴿قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ مَآ اُنْزِلَ عَلَیْنَا وَ مَآ اُنْزِلَ عَلٰٓی اِبْرٰهِیْمَ وَ اِسْمٰعِیْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ یَعْقُوْبَ وَ الْاَسْبَاطِ وَ مَآ اُوْتِیَ مُوْسٰی وَ عِیْسٰی وَ النَّبِیُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ﴾ (آلِ عمران:۹)

''کہہ کہ ہم خدا پر اور جو کچھ ہم پر اتارا گیا' اس پر اور جو کچھ ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب اور خاندانِ یعقوب پر اتارا گیا' اس پر اور جو کچھ موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ کو دیا گیا' اس پر اور دوسرے سب پیغمبروں کو ان کے پروردگار کی طرف سے جو کچھ دیا گیا' اس پر ہم ان سب پر ایمان لائے۔''

سورۂ نساء میں اس پر ایمان لانے کے حکم کے ساتھ ساتھ اس کے انکار کو کفر بھی قرار دیا گیا ہے:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ الْکِتٰبِ الَّذِیْ نَزَّلَ عَلٰی رَسُوْلِهٖ وَ الْکِتٰبِ

الَّذِیۡۤ اَنۡزَلَ مِنۡ قَبۡلُ وَ مَنۡ یَّکۡفُرۡ بِاللّٰہِ وَ مَلٰٓئِکَتِہٖ وَ کُتُبِہٖ وَ رُسُلِہٖ وَالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ فَقَدۡ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِیۡدًا﴾ (نساء:۱۳۶)

''اے وہ لوگو جو ایمان لا چکے ہو! ایمان لاؤ خدا پر، اس کے رسول پر اور اس کی کتاب پر جو اس نے اپنے رسول پر اتاری اور اس کتاب پر جو پہلے اتاری اور جس نے خدا کا اس کے فرشتوں کا اور اس کی کتابوں کا انکار کیا وہ نہایت سخت گمراہ ہوا۔''

سورۂ مومن میں ان منکروں کو عذاب کی بھی دھمکی دی گئی ہے جو کسی پیغمبر کے پیغام کی تکذیب کریں:

﴿اَلَّذِیۡنَ کَذَّبُوۡا بِالۡکِتٰبِ وَ بِمَاۤ اَرۡسَلۡنَا بِہٖ رُسُلَنَا فَسَوۡفَ یَعۡلَمُوۡنَ ۙ﴿۷۰﴾ اِذِ الۡاَغۡلٰلُ فِیۡۤ اَعۡنَاقِہِمۡ وَ السَّلٰسِلُ یُسۡحَبُوۡنَ ۙ﴿۷۱﴾﴾ (مؤمن:۷۰،۷۱)

''جن لوگوں نے کتاب کو اور جو پیغام دے کر ہم نے اپنے پیغمبروں کو بھیجا، اس کو جھٹلایا وہ عنقریب جانیں گے، جب ان کی گردنوں میں طوق اور زنجیریں ہوں گی، وہ گھسیٹے جائیں گے۔''

چار معلوم الاسم آسمانی صحائف

نام کی تخصیص کے ساتھ قرآن پاک میں چار آسمانی کتابوں کا ذکر ہے۔ توراۃ جس کو ایک جگہ صحفِ موسیٰ علیہ السلام بھی کہا گیا ہے (اعلیٰ:۱۹) اور حضرت داؤدؑ کی زبور اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی انجیل اور خود قرآن ان کے علاوہ ایک موقع پر صحفِ ابراہیمؑ کا بھی تذکرہ ہے۔

﴿اِنَّ ہٰذَا لَفِی الصُّحُفِ الۡاُوۡلٰی ۙ﴿۱۸﴾ صُحُفِ اِبۡرٰہِیۡمَ وَ مُوۡسٰی﴾ (اعلیٰ ۱۸:۱۹)

''یہ باتیں گزشتہ صحیفوں میں بھی ہیں، ابراہیم اور موسیٰ کے صحیفوں میں۔''

ان کے ماسوا اجمال کے ساتھ دو موقعوں پر گزشتہ آسمانی کتابوں اور صحیفوں کے الفاظ ہیں:

﴿اَوَ لَمۡ تَاۡتِہِمۡ بَیِّنَۃُ مَا فِی الصُّحُفِ الۡاُوۡلٰی﴾ (طٰہٰ: ۱۳۳)

''کیا اگلے صحیفوں میں جو کچھ ہے اس کی گواہی ان کو نہیں پہنچی۔''

﴿وَ اِنَّہٗ لَفِیۡ زُبُرِ الۡاَوَّلِیۡنَ﴾ (الشعراء:۱۹۶)

''اور بے شبہ یہ پہلوں کی کتابوں میں مذکور ہے۔''

اس بنا پر انبیاؑ کی طرح ان کتابوں پر بھی ہر مسلمان کا تفصیلی اور اجمالی ایمان ہے جن کتابوں کے نام مذکور ہیں۔ ان پر ناموں کے ساتھ اور جن کے نام مذکور نہیں، ان پر بالاجمال ایمان ضروری ہے کسی قوم میں اگر کوئی آسمانی کتاب ہے جس کا وجود قرآن سے پہلے ہے، لیکن اس کا تصریحی نام قرآن میں مذکور نہیں ہے، اور اس میں توحیدِ الٰہی کی دعوت اور طاغوت سے بچنے کی نصیحت بھی ہے تو اگرچہ ہم اس کو بتصریح خدا کی کتاب تسلیم نہیں کر سکتے۔ تاہم بالتصریح اس کا انکار بھی نہیں کر سکتے، اسی بنا پر آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اہلِ کتاب کی نہ تصدیق کرو اور نہ

تکذیب۔یہی حال دوسری مشکوک کتابوں کا ہے۔ (۱)

یہود توراۃ کے سوا کچھ نہیں مانتے' عیسائی توراۃ کے احکام نہیں مانتے' لیکن اس کی اخلاقی نصیحتوں کو قبول کرتے ہیں' تاہم انجیل سے پہلے کی دوسری زبانوں اور ملکوں کی آسمانی کتابوں کی نسبت مسلمانوں کی طرح ادب اور احتیاط کا پہلو بھی اختیار نہیں کرتے' پارسی اوستا کے باہر خدا کے کلام ہونے کا شبہ بھی نہیں کر سکتے اور برہمن ویدوں کے باہر خدا کے فیضان کا تصور بھی نہیں کر سکتے' لیکن قرآن پر ایمان لانے والا مجبور ہے کہ صحیفۂ ابراہیم توراۃ زبور اور انجیل کو خدا کی کتابیں یقین کرے اور دوسری اگلی آسمانی کتابوں کی جن میں آسمانی تعلیمات کی خصوصیتیں پائی جاتی ہوں تکذیب نہ کرے کہ ان کا کتبِ الٰہی ہونا ممکن ہے۔

اس عقیدہ کا اثر سیاساتِ عالم پر

حقیقت میں اسلام کی یہ تعلیم دنیا کی مہتم بالشان تعلیمات۔میں سے ہے جس کا وجود کسی دوسرے مذہب میں نہ تھا۔ یہ رواداری' بے تعصبی اور عام انسانی اخوت کی سب سے بڑی تعلیم ہے یہودی اپنی کتاب کو چھوڑ کر تمام دوسری آسمانی کتابوں سے انکار کر کے بھی نجات کا منتظر رہ سکتا ہے' عیسائی تورات اور تمام دوسرے صحیفوں کا انکار کر کے بھی آسمانی بادشاہی کا متوقع ہو سکتا ہے' پارسی اوستا کے سوا دوسری ربانی کتابوں کو باطل مان کر بھی مینو (جنت) کا استحقاق پیدا کر سکتا ہے۔ ہندو اپنے ویدوں کے سوا دنیا کی تمام آسمانی کتابوں کو دجل وفریب مان کر بھی آواگون سے نجات حاصل کر سکتا ہے' بودھ مت والے اپنے سوا تمام دنیا کی وحیوں کا انکار کر کے بھی نروان کا درجہ حاصل کر سکتے ہیں مگر مسلمان جب تک قرآن کے ساتھ تمام دنیا کی آسمانی کتابوں کو منجانب اللہ نہ تسلیم کرے' جنت کا مستحق نہیں ہو سکتا۔

یہ تعلیم صرف نظریہ کی حیثیت نہیں رکھتی بلکہ عملاً اس پر اسلامی حکومت کے قوانین اور احکام مبنی ہیں' یہودیوں کی نظر میں صرف دو ہی قومیں ہیں' بنی اسرائیل اور غیر بنی اسرائیل یا اسرائیل کا گھرانہ' اور غیر قومیں یا مختون اور غیر مختون اور ان ہی دونوں تقسیموں پر ان کے قانون کی بنیاد ہے' عیسائیوں میں مذہبی حیثیت سے مسیحی یہود اور بت پرست' گو تین قومیں مانی جاتی ہیں مگر چونکہ ان کے مذہب میں قانون نہیں ہے' اس لیے وہ اکثر امور میں رومن لاء کے پیرو رہے ہیں' لیکن رومن عیسائیوں میں بھی ملکی حیثیت سے دو ہی تقسیمیں ہیں' رومی اور غیر رومی' ایک رومی ملک میں غیر رومی کا کوئی حق نہیں کہ وہ رومی حکومت کے لیے اور غیر رومی غلامی کے لیے پیدا ہوا ہے' پارسیوں میں پاک نژادانِ ایران اور بیرونی لوگ' دنیا کی دو ہی حیثیتیں ہیں' ہندوؤں میں اونچی ذاتیں اور اچھوت قوموں کی دو ہی صورتیں ہیں۔

---

(۱) صحیح بخاری الوحید وحدیث الافک وتفسیر سورۂ بقرہ

اقوامِ عالم کی قانونی تقسیم اوران کے حقوق

مگر اسلام کے گزشتہ عقیدہ کی بناپر آنحضرت ﷺ نے قانونی حیثیت سے دنیا کی قوموں کو چار طبقوں میں تقسیم فرمایا اوران کے علیحدہ علیحدہ حقوق قرار دیے جن پر اسلام کی تیرہ صدیوں میں برابر عمل ہوتا رہا' یہ تقسیمیں حسب ذیل ہیں:

(۱) مسلمان

جوقرآن اوردوسری آسمانی کتابوں کو کتابِ الٰہی یقین کرتے ہیں' ان میں سے ہرایک دوسرے کا بھائی اور ہراچھائی اور برائی میں ایک دوسرے کا شریک ہے' وہ آپس میں ایک دوسرے سے شادی بیاہ کرسکتے ہیں اورایک دوسرے کے ہاتھ کا ذبح کیا ہوا جانور کھاسکتے ہیں اسلام کی سلطنت میں ان کے حقوق یکساں ہیں۔

(۲) اہل کتاب

یعنی ان کتابوں کے پیروجن کے نام قرآن میں مذکور ہیں' یایوں کہوکہ جوقرآن کوگوآسمانی کتاب نہیں مانتے مگران کتابوں میں سے جن کا نام قرآن میں مذکور ہیں کسی کووہ آسمانی کتاب مانتے ہیں وہ اپنی حفاظت کا مالی ٹیکس (جزیہ) ادا کرکے اسلامی حکومتوں کے حدود میں رہ سکتے ہیں' ان کے معابداور مذہبی عمارتیں محفوظ رہتی ہیں ان کو اپنے مذہب کے بدلنے پر مجبورنہیں کیا جاتا' ان کی جان ومال اورعزت وآبرو کے مسلمان محافظ ہوتے ہیں' ان کی عورتوں سے مسلمان نکاح کرسکتے ہیں' اوران کے ہاتھ کا ذبح کیا ہوا جانور کھاسکتے ہیں ان کا جائز کھانا وہ کھاسکتے ہیں اوروہ اپنا کھانا ان کوکھلاسکتے ہیں۔

(۳) شبہ اہل الکتاب

یعنی وہ لوگ جوقرآن اورتوراۃ وانجیل وزبورکونہیں مانتے مگروہ خودان کے علاوہ کسی آسمانی کتاب پرایمان لانے کے مدعی ہیں جیسے صابئی جوایک آسمانی کتاب رکھنے کے دعویٰ کے باوجود ستاروں کو پوجتے تھے اورمجوس یعنی پارسی جوایک آسمانی کتاب رکھنے کا دعویٰ کرتے ہیں اورساتھ ہی سورج' آگ اوردیگر مظاہرِ قدرت کی پرستش کرتے ہیں' ترکستان اورسندھ کی فتح کے موقع پرعلمائے اسلام نے انہی پر قیاس کرکے ہندوؤں' اور بودھوں وغیرہ کوبھی اسی صف میں داخل کیا' مسلمان ان کی عورتوں سے نکاح نہیں کرسکتے اوران کا ذبیحہ نہیں کھاسکتے' ان دوباتوں کے علاوہ اہلِ کتاب کے بقیہ تمام حقوق آنحضرت ﷺ نے ان کوعطا کیے ہیں' وہ اسلامی حکومتوں میں ادائے جزیہ کے بعد ہرقسم کے ملکی حقوق میں شریک ہیں' ان کی جان ومال وآبرواوران کے معبدوں کی حفاظت اسلامی حکومتوں کا فرض ہے۔

(۴) کفار و مشرکین

یعنی وہ لوگ جن کے پاس نہ کوئی آسمانی کتاب ہے اور نہ وہ کسی دینِ الٰہی کی طرف منسوب ہیں۔ ان کو چند شرائط کے ساتھ امن دیا جا سکتا ہے، لیکن حقوق حاصل کرنے کے لیے ان سے کہا جائے گا کہ وہ کسی آسمانی دین کے اندر اپنے کو داخل کر لیں، جیسا کہ عباسیوں کے ابتدائی زمانہ میں خرانی عراقیوں نے اپنے کو صائبیوں میں داخل کر کے اپنے لئے حقوق حاصل کئے تھے۔

اس تفصیل سے معلوم ہو سکتا ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی اس تعلیم نے دنیا میں امن و امان اور مسلمانوں میں مذہبی رواداری کے پیدا کرنے میں کتنا عظیم الشان حصہ لیا ہے، یہی وہ نظریہ تھا جس نے مسلمانوں کو اپنے مذہبی عقائد و شریعت کی سخت پیروی کے باوجود دنیا کی دوسری قوموں کے ساتھ مشارکت اور میل جول کے لیے آمادہ کیا اور مجوسیوں، صائبیوں، یہودیوں، عیسائیوں اور ہندوؤں کے ساتھ مل کر مختلف ملکوں میں ان ملکوں کے مناسب مختلف تمدنوں کی بنیاد رکھنے کی ان میں قوت پیدا کی۔

وحدۃ الادیان

تمام رسولوں اور ان کے صحیفوں کی تصدیق کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم یہ ہو کہ آدم سے لے کر محمد علیہما السلام تک جتنے سچے مذاہب خدا کی طرف سے آئے وہ سب ایک تھے، چنانچہ درحقیقت آپؐ کی یہی تعلیم تھی۔ اسلام اسی ایک مذہب کا نام ہے جو آدمؑ سے محمد ﷺ تک باری باری پیغمبروں کے ذریعہ سے آتا رہا اور انسانوں کو اس کی تعلیم دی جاتی رہی۔

صحیفۂ محمدی نے ہمارے سامنے دو لفظ پیش کیے ہیں، ایک دین اور دوسرا شرعۃ، منسک اور منہاج شرعہ اور منہاج کے معنی راستہ کے ہیں، اور منسک کے معنی طریقِ عبادت کے ہیں، دنیا میں یہ راز سب سے پہلے محمد رسول اللہ ﷺ کے قلبِ پاک پر منکشف ہوا کہ دینِ الٰہی ہمیشہ سے ایک تھا، ایک رہا اور ایک رہے گا۔ نورِ معرفت ایک ہے خواہ وہ کتنی ہی مختلف شکل و رنگ کی قندیلوں میں روشن ہوا، اصل دین میں تمام پیغمبروں کی تعلیم یکساں تھی، ایک ہی دین تھا جس کو لے کر اول سے آخر تک تمام انبیاءؑ آتے رہے اس میں زمان و مکان کے تغیر کو کوئی دخل نہ تھا اور نہ قوم و ملک کے اختلاف سے اس میں کوئی اختلاف پیدا ہوا وہ ہر زمانہ اور ہر مقام میں یکساں آیا، اور وہاں کے ہر پیغمبر نے اس کی یکساں تعلیم دی۔

یہ دائمی حقیقت اور یکساں تعلیم کیا ہے، یہ مذہب کے اصل اصول ہیں، یعنی خدا کی ہستی، اس کی توحید، اس کے صفاتِ کاملہ، انبیا اور مرسلینؑ کی بعثت، خدا کی خالص عبادت، حقوقِ انسانی، اخلاقِ فاضلہ، اچھے اور برے اعمال کی باز پرس اور جزا و سزا، یہ تمام مذاہب کے وہ بنیادی امور ہیں، جن پر جملہ مذاہبِ حقہ کا اتفاق ہے، اگر ان میں کسی جہت سے کوئی اختلاف ہے، تو طریقۂ تعبیر کی غلطی ہے اور یا باہر سے آ کر اس تعلیم میں کوئی نقص شامل ہو گیا ہے۔

دین وشرعہ منسک ومنہاج کا فرق

دوسری چیز جس کو آنحضرت ﷺ کی زبانِ وحی ترجمان نے شرعہ منہاج اور منسک کہا ہے، وہ جزئیات احکام اور متفقہ مقصد کے حصول کے جدا جدا راستے ہیں جو ہر قوم ومذہب کی زمانی ومکانی خصوصیات کے سبب سے بدلتے رہتے ہیں، مثلاً عبادتِ الٰہی ہر مذہب کا جزءِ لازم ہے، لیکن طریقِ عبادت میں تھوڑا تھوڑا اختلاف ہر مذہب میں موجود ہے، عبادت کے لیے کوئی خاص سمت ہر مذہب نے مقرر کی ہے، مگر وہ سمت خاص خاص مصلحتوں کے لحاظ سے مختلف مقرر کی ہے، اسی طرح اعمالِ قبیحہ کا انسداد تمام مذاہب کا متفقہ نصب العین ہے مگر اس انسداد کے راستہ اور طریقے جدا جدا ہیں، غرض یہ راستے اور طریقے مختلف پیغمبروں کے زمانے میں اگر اصلاح اور تبدیل کے قابل پائے گئے، تو بدلتے رہے، مگر اصلِ دین جو ازلی سچائی اور ابدی صداقت ہے، نا قابلِ تبدیل اور نا قابلِ تغیر رہا ہے۔

انبیاء علیہم السلام کا دنیا میں وقتاً فوقتاً ظہور اسی ضرورت سے ہوتا رہا کہ وہ اس ازلی وابدی صداقت کو ہمیشہ اہلِ دنیا کے سامنے پیش کرتے رہیں، اور دین کو اس کے اصل مرکز پر ہمیشہ قائم رکھیں اور ساتھ ہی اپنی اپنی قوم وملک اور زمانہ کے حالات کے مطابق خاص احکام اور جزئیات جو قوم کے مناسبِ حال ہوں وہ اس کو بتائیں اور سکھائیں۔

صحیفے وقتاً فوقتاً کیوں نازل ہوئے

انبیاؑ کے سوانح پر نظر کرنے سے اس کی پوری تصدیق ہوتی ہے کہ ایک صاحبِ شریعت نبی کے بعد دوسرا صاحبِ شریعت نبی اسی وقت مبعوث ہوا ہے جب کہ اگلا صحیفۂ وحی جو دین وشریعت کا محافظ تھا، کھو گیا، یا انسانی دست برد سے ایسا بدل گیا کہ اس کی اصلیت مشتبہ ہو گئی، صحیفۂ ابراہیم کے گم ہو جانے کے بعد جس کا نہایت ناقص خلاصہ توراۃ کے سفرِ تکوین میں ہے، صحیفۂ موسیٰ علیہ السلام نازل ہوا، صحیفۂ موسیٰ علیہ السلام کے نو پیدا اختلاف کو دور کرنے کے لیے زبور وغیرہ مختلف صحیفے آتے رہے، پھر انجیل آئی، اور انجیل میں انسانی تصرفات کے راہ پانے کے بعد قرآن آیا، چونکہ قرآن دنیا کے آخر تک کے لیے آیا ہے، اس لیے ہر تحریف اور انسانی تصرف سے اس کی حفاظت کی گئی ہے، اور قیامت تک کی جائے گی اس لیے اس کے بعد کسی اور صحیفہ کی ضرورت نہیں اور نہ کسی پیغمبر کی بعثت کی حاجت ہے، البتہ اس کے معانی کی صحیح تشریح اور بدعات واحداثات کے انسداد کے لیے آئمہ، خلفا، مجددین، محدثین اور علمائے راسخین پیدا ہوتے رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے اور ان کی اصلاح کی صداقت کی پہچان سنتِ نبوی کا احیا اور بدعات کا قلع قمع ہے۔

اب ہم کو پھر اوپر سے چلنا ہے، اور اپنے ایک ایک دعویٰ کو وحیِ محمدی کی روشنی میں دیکھنا ہے۔

وحدتِ دین پر قرآن کی شہادت

وحدتِ دین کی حقیقت کو وحیِ اسلامی کے آخری ترجمان نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے:

﴿شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَ مَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرَاهِيْمَ وَ مُوْسٰى وَ عِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَ لَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَ يَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ ○ وَ مَا تَفَرَّقُوْٓا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ وَ لَوْ لَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى لَّقُضِيَ بَيْنَهُمْ وَ اِنَّ الَّذِيْنَ اُوْرِثُوا الْكِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ ○ فَلِذٰلِكَ فَادْعُ وَ اسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ وَ لَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ وَ قُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ وَّ اُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمُ اَللّٰهُ رَبُّنَا وَ رَبُّكُمْ لَنَآ اَعْمَالُنَا وَ لَكُمْ اَعْمَالُكُمْ لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمُ اَللّٰهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا وَ اِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ○﴾ (شوریٰ:۱۳'۱۵)

''اس نے دین میں تمہارے لیے وہی راہ مقرر کی جو نوح سے کہی تھی اور ہم نے تیرے پاس جو حکم بھیجا اور جو کہہ دیا ہم نے ابراہیم سے اور موسیٰ سے اور عیسیٰ سے یہ کہ دین کو قائم رکھو اور اس میں تفرقہ نہ ڈالو مشرکوں کو جدھر تو بلاتا ہے وہ ان پر گراں گزرتا ہے اور خدا اپنی طرف جس کو چاہتا ہے چن لیتا ہے اور اپنی طرف اس کو راہ دیتا ہے جو (اس کی طرف) رجوع کرتا ہے اور یہ تفرقے لوگوں نے وحی کا علم (حقیقی) ملنے کے بعد آپس کی ضد اور تعصب سے پیدا کیے ہیں اور اگر تیرے رب کی طرف سے ایک بات وقتِ مقررہ تک کے لیے نہ ہو چکی ہوتی تو (کشفِ حقیقت کر کے) ان کے اختلافات کا فیصلہ کر دیا جاتا اور جن کو ان اگلوں کے بعد کتاب وراثت میں ملی وہ اس امرِ حق کی طرف سے ایسے شک میں ہیں جو ان کو چین نہیں لینے دیتا' سو تو سب کو اسی حقیقت کی طرف بلا اور اسی پر استواری سے قائم رہ جیسا کہ تجھ کو حکم دیا گیا ہے اور ان تفرقہ اندازوں کی غلط خواہشوں کی پیروی نہ کر' اور کہہ کہ میں ایمان لایا ہر اس کتاب پر جو خدا نے اتاری اور مجھے حکم ملا ہے کہ میں تمہارے بیچ میں انصاف کروں۔ ہمارا رب اور تمہارا رب وہی ایک اللہ ہے ہم کو ہمارے کاموں کا بدلہ ملے گا اور تم کو تمہارے کاموں کا۔ ہم میں تم میں کچھ جھگڑا نہیں اللہ سب کو اکٹھا کرے گا اور اسی کی طرف پھر جانا ہے۔''

ان آیاتِ مبارکہ میں کس خوبی کے ساتھ اس حقیقت کے چہرہ سے پردہ اٹھایا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ وہی ایک دین ہے جو نوح کو ابراہیم کو موسیٰ کو اور تم کو اے محمد (صلوٰت اللہ علیہم) عطا کیا گیا ہے' اگلوں کے بعد پچھلوں نے جن کو یہ کتاب ملی اپنے ذہنی تحریفات اور ذہنی تصرفات سے اس میں تفرقے پیدا کیے اور آپس کی ضد اور تعصّبات سے فرقہ واری کی الگ الگ راہیں نکالیں' پھر ارشاد ہوتا ہے کہ اس وحدتِ دین کی حقیقت کا یقین اہلِ

کتاب کو نہیں ہے' حالانکہ وہ شکوک وشبہات کے دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں پھر حکم ہوتا ہے کہ اے محمد رسول اللہ ﷺ تم اس حقیقت کی طرف لوگوں کو بلاؤ اور استواری کے ساتھ اپنی اس دعوت اور دعویٰ پر قائم رہو اور یہ اعلان کر دو کہ میرا مسلک یہ ہے کہ خدا کی طرف سے جو کتاب بھی دنیا میں آئی ہے میں اس کی صداقت کو تسلیم کرتا ہوں اور تم اے اہل کتاب جو مختلف فرقوں اور مذہبوں میں بٹ گئے ہیں تمہارے ساتھ انصاف کروں یعنی جس میں جو سچائی ہے اس کو قبول کروں' یا معاملات میں تمہارے ساتھ عدل وانصاف کروں' پھر فرمایا ہمارا اور تمہارا خدا ایک ہی ہے دو نہیں اگر اتحاد چاہو تو اس لفظ پر ہم تم متحد ہو سکتے ہیں' البتہ ہمارے اور تمہارے راستوں میں جو اختلاف ہے' اس کے ذمہ دار ہم تم خود ہیں' نہ تم ہمارے کاموں کے جواب دہ ہو اور نہ ہم تمہارے کاموں کے۔ اب ہمارے تمہارے درمیان یہاں کوئی جھگڑا نہیں۔

حدتِ دین کی دعوتِ عامہ

اسی وحدت کی دعوت محمد رسول اللہ ﷺ کی زبانِ وحی نے ایک اور آیت میں دی ہے:

﴿یٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۭ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَ لَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّ لَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ﴾ (آل عمران:۶۴)

''اے کتاب والو! آؤ ہم تم ایک بات پر جو ہمارے تمہارے درمیان یکساں ہے' متفق ہو جائیں' وہ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی پرستش نہ کریں' اور نہ کسی کو اس کا شریک بنائیں اور نہ آپس میں ایک خدا کو چھوڑ کر رب بنائیں اگر وہ اس کو قبول نہ کریں تو کہہ دے کہ تم گواہ رہو کہ ہم حکمِ الٰہی کے تابع (مسلم) ہیں۔''

یہود ونصاریٰ جنہوں نے اپنی فرقہ واریوں سے اصل دین میں تفریقیں پیدا کر دی تھیں' ان کی طرف اشارہ کر کے محمد رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَ كَانُوْا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِيْ شَيْءٍ اِنَّمَآ اَمْرُهُمْ اِلَى اللّٰهِ ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ﴾ (انعام:۱۶۰)

''بے شک وہ جنہوں نے اپنے دین میں الگ الگ راہیں نکالیں اور کئی فرقے ہو گئے تجھ کو ان سے کوئی واسطہ نہیں ان کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے وہ ان کو جتا دے گا جو وہ کرتے تھے۔''

دینِ قیم

پھر دونوں کو اس کے بعد ہی اصل ''دینِ قیم'' کی جو ابراہیمؑ کا تھا' دعوت دی گئی:

﴿قُلْ اِنَّنِيْ هَدٰىنِيْ رَبِّيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ دِيْنًا قِيَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا وَّ مَا كَانَ مِنَ

الْمُشْرِكِيْنَ﴾ (انعام:۱۶۲)

''کہہ دے کہ میرے خدا نے اس سیدھی راہ کی طرف میری رہنمائی کی جو دینِ صحیح ہے ابراہیم حنیف کا مذہب اور وہ (ابراہیم) مشرکوں میں سے نہ تھے۔''

غرض اسلام وہ ''دینِ قیم ہے جو ہمیشہ انبیا کا دین رہا' اور موجودہ دین اسلام یہود و نصاریٰ کی تحریفات و تصرفات اور فرقہ پروریوں کو مٹا کر اسی ایک متحدہ دین کی پکار ہے جس کی طرف تمام انبیا اپنے اپنے زمانوں میں ہمیشہ لوگوں کو بلاتے رہے' اسی لیے اکثر انبیاء علیہم السلام کے ناموں کو گنانے کے بعد محمد رسول اللہ ﷺ کو ہدایت فرمائی گئی:

﴿اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ هَدَی اللّٰهُ فَبِهُدٰهُمُ اقْتَدِهْ﴾ (انعام:۹۱)

''یہ وہ لوگ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت دی' سو تو انہی کی راہ پر چل۔''

بعض اسلامی حدود و شرائع کی تشریح کے بعد فرمایا گیا:

﴿یُرِیْدُ اللّٰهُ لِیُبَیِّنَ لَکُمْ وَ یَهْدِیَکُمْ سُنَنَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ﴾ (نساء:۲۶)

''خدا چاہتا ہے کہ تمہارے واسطے بیان کرے اور تم کو ان کے راستے دکھائے جو تم سے پہلے تھے۔''

اسلام اور مذاہب قدیمہ کا اتحاد

اس کے بعد معلوم ہوا کہ اسلام اپنے حدود و شرائع میں بھی اگلے پیغمبروں کی تعلیمات کے ساتھ اتحاد رکھتا ہے اور یہ امر واقعہ ہے جو لوگ قرآن کا اس لیے انکار کرتے ہیں کہ یہ کوئی الگ صحیفہ ہے' ان سے کہا گیا:

﴿اِنَّ هٰذَا لَفِی الصُّحُفِ الْاُوْلٰی ○ صُحُفِ اِبْرَاهِیْمَ وَ مُوْسٰی﴾ (اعلیٰ:۱)

''بے شبہ یہ بات اگلے صحیفوں میں بھی تھی یعنی ابراہیم اور موسیٰ علیہما السلام کے صحیفوں میں۔''

ایک اور آیت میں کہا گیا:

﴿وَ اِنَّهٗ لَفِیْ زُبُرِ الْاَوَّلِیْنَ﴾ (شعراء:۱۹۶)

''اور یہی پہلے پیغمبروں کی کتابوں میں تھا۔''

ایک مقام پر یہ فرمایا گیا:

﴿مَا یُقَالُ لَکَ اِلَّا مَا قَدْ قِیْلَ لِلرُّسُلِ مِنْ قَبْلِکَ﴾ (حم السجدۃ:۴۳)

''(اے محمد) تجھ سے (اس کتاب) میں وہی کہا گیا ہے جو تجھ سے پہلے پیغمبروں سے کہا گیا۔''

دین ہمیشہ ایک رہا

اس اعلان میں یہ ظاہر کر دیا گیا کہ محمد رسول اللہ ﷺ سے وہی کہا گیا جو اگلے پیغمبروں سے کہا جا چکا تھا۔ ان معنوں میں قرآن کوئی نئی دعوت لے کر نہیں آیا ہے' بلکہ یہ اسی پرانی دعوت کی تکرار ہے جس کی آواز دنیا سے گم ہو

چکی تھی یا دب گئی تھی۔ اگر فرق ہے تو اجمال و تفصیل یا نقص و تکمیل کا کہ اسلام گزشتہ اجمال کی تفصیل اور دینِ سابق کی تکمیل ہے۔

اس لئے اسلام یہ ہے کہ اس پر یقین کیا جائے کہ وحی کے آغاز سے آخر تک ایک ہی پیغام تھا جو آتا رہا' ایک ہی دین تھا جو سکھایا جاتا رہا' اور ایک ہی حقیقت تھی جو دہرائی جاتی رہی لیکن وہ بار بار انسانوں کے نسیان و تغافل اور تصرف و تحریف سے بدلتی اور گم ہوتی رہی اور آخری دفعہ دنیا کے کمالِ بلوغ کے زمانہ میں وہ پوری حفاظت کے وعدہ کے ساتھ محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ سے مفصل اور کامل ہو کر نازل ہوئی اور قیامت تک محفوظ و باقی رہے گی۔

شرعہ و منہاج میں تبدیلی ہوئی

دوسری چیز جس کی مذہب میں ثانوی حیثیت ہے' اور جو اصل مقصد نہیں ذریعہ ہے' وہ بدلتی رہتی ہے۔ اور عہد محمدی تک برابر بدلتی رہی ہے اس کا نام شرعہ' منہاج اور منسک ہے۔ یہودیوں کو آنحضرت ﷺ پر اعتراض تھا کہ آپ یہودی شریعت کے جزئیات میں کیوں تبدیلی کرتے ہیں۔ قرآن نے اس کے جواب میں ہمیشہ یہی کہا کہ یہ مقصود نہیں ذرائع ہیں' اصول نہیں فروع ہیں' ہر قوم کی مناسبت سے ان میں تغیر ہوتا رہا ہے اور ہوتا رہے گا اس کی ایک مثال قبلہ ہے کہ مقصود اصلی نماز ہے اور سمت کا تعین ایک فرعی اور ثانوی چیز ہے۔ بنی اسرائیل کو اپنی آبائی مسجد (بیت المقدس) سے گرویدگی تھی' وہ ان کا قبلہ ہوئی' ابراہیمی عربوں کو اپنی مرکزی مسجد (کعبہ) سے وہی وابستگی اور لگاؤ تھا' اس لیے یہ ان کا قبلہ بنی۔ چنانچہ قرآن نے تعیینِ قبلہ کے موقع پر کہا:

﴿وَ لِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ﴾ (بقرہ:۱۴۸)

''اور ہر ایک کے لیے ایک سمت ہے' جدھر وہ منہ کرتا ہے' سو تم نیکیوں کی طرف سبقت کرو۔''

یعنی سمتوں اور جہتوں کی تعیین کو اہمیت کی چیز نہ سمجھو' بلکہ نیکیوں کو اصلی اہمیت دو' اس لیے فرمایا:

﴿لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ وَ لٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ﴾ (بقرہ:۱۷۷)

''نیکی یہی نہیں ہے کہ تم پورب یا پچھّم کی طرف رخ کرو بلکہ نیکی یہ ہے کہ جو ایمان لائے اللہ پر (اور دوسرے نیک کام کرے)۔''

خانۂ خدا کے حج کی تعیین

اسی طرح خانۂ کعبہ کا حج یہودیوں میں نہ تھا' اسلام نے جب اس کو رائج کیا تو کہا ہر گروہ نے اپنے عام مذہبی اجتماع اور قومی عبادت کے لیے کوئی نہ کوئی طریقہ مقرر کیا ہے اور اسلام نے خانۂ کعبہ کے حج کو اس لئے تجویز کیا ہے۔

﴿لِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا هُمْ نَاسِكُوْهُ فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي الْاَمْرِ وَادْعُ اِلٰى رَبِّكَ اِنَّكَ لَعَلٰى هُدًى مُّسْتَقِيْمٍ ○ وَ اِنْ جَادِلُوْكَ فَقُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ○﴾ (حج ۶۷:۶۸)

''ہر قوم کے لیے ہم نے عبادت کا طریقہ بنایا جس کی اس قوم کے لوگ مذہبًا پابندی کرتے ہیں سو اس بات میں وہ تجھ سے جھگڑا نہ کریں' تو اپنے رب کی طرف بلائے جا تو بے شک سوجھ کی سیدھی راہ پر ہے' اور اگر وہ تجھ سے جھگڑنے لگیں تو کہہ دے کہ اللہ بہتر جانتا ہے جو تم کرتے ہو۔''

یہودیوں اور عیسائیوں کو اپنی کتابوں پر۔۔۔۔۔

سورۂ مائدہ میں عدل و انصاف اور قانونی جزاء و سزا کے طریقوں کے ضمن میں ان یہودیوں اور عیسائیوں سے جنہوں نے اسلام قبول نہیں کیا' یہی کہا گیا کہ وہ اپنی اپنی کتابوں ہی کے احکام پر عمل کریں جن کو وہ چھوڑ بیٹھے ہیں۔

پہلے یہودیوں سے کہا:

﴿اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰةَ فِيْهَا هُدًى وَّ نُوْرٌ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا لِلَّذِيْنَ هَادُوْا وَ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَ الْاَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ وَ كَانُوْا عَلَيْهِ شُهَدَآءَ﴾ (مائدہ:۴۴)

''ہم نے توراۃ اتاری' اس میں ہدایت اور روشنی تھی پیغمبر جو حکم بردار تھے اور یہود کا فیصلہ کرتے اور ان کے عالم اور فقیہ کہ اللہ کی کتاب پر وہ نگہبان تھے اور وہ تھے اس پر خبردار۔''

پھر عیسائی شریعت کی نسبت کہا:

﴿وَ قَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰةِ وَ اٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ فِيْهِ هُدًى وَّ نُوْرٌ وَّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰةِ وَ هُدًى وَّ مَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ○ وَ لْيَحْكُمْ اَهْلُ الْاِنْجِيْلِ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فِيْهِ﴾ (المائدۃ:۴۶۔۴۷)

''اور ہم نے ان پیغمبروں کے پیچھے مریم کے بیٹے عیسیٰ کو بھیجا سچ بتاتا ہوا اس کو جو اس کے پہلے تھے' یعنی تورات اور ہم نے اس کو انجیل دی' اس میں ہدایت اور روشنی (ہے) اور تصدیق کرتی ہوئی اپنے سے پہلے کی یعنی توراۃ کی اور ہدایت اور نصیحت پرہیزگاروں کے لیے' اور چاہیے کہ انجیل والے اس کا حکم دیں جو اس میں خدا نے اتارا۔''

مسلمانوں کو شریعتِ اسلام پر۔۔۔۔۔

اس کے بعد آنحضرت ﷺ کو خطاب کر کے کہا:

﴿وَ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَ مُهَيْمِنًا عَلَيْهِ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَ لَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ﴾ (مائدہ:۴۸)

''اور ہم نے تیری طرف یہ کتاب سچائی کے ساتھ اتاری جو اپنے پہلے کی کتاب کی تصدیق کرتی ہے اور ان کے مضامین کی نگہبان ہے سو تو ان کے درمیان اس کے مطابق فیصلہ کر جو خدا نے اتارا اور تیرے پاس جو سچائی آئی ہے اس کو چھوڑ کر ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کر۔''

اہلِ کتاب نے اپنی کتابوں کو چھوڑ کر۔۔۔۔۔

دیکھو کس خوبی کے ساتھ صحیفۂ محمدی نے اگلی کتابوں کی تصدیق اور مدح وتعریف کی اور ان اہل مذاہب کو جو اسلام پر ایمان نہیں لائے' اپنی اپنی کتبِ منزلہ پر عمل کرنے کی دعوت دی اور پھر یہ دعویٰ کیا کہ قرآن تمام گزشتہ کتابوں پر امین ومحافظ بن کر آیا ہے اور اس میں ان سب کتابوں کی سچائیاں یکجا ہیں لیکن ان لوگوں نے اپنی اپنی کتابوں کو چھوڑ کر اہواء (غلط خواہشوں) کی پیروی شروع کر دی' یہ اہوا کیا ہیں؟ کتابِ الٰہی میں تحریف وتصرف کر کے آسانیاں پیدا کرنا اور احکام الٰہی کے مقابلہ میں انسانی اجتہادات کی آمیزش ﴿فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ﴾ (البقرۃ:۷۹) ''افسوس ہے ان پر جو اپنے ہاتھوں سے کتاب بناتے ہیں پھر کہتے ہیں کہ یہ خدا کی طرف سے ہے۔'' آنحضرت ﷺ کو حکم ہوتا ہے کہ شریعتِ الٰہی کو چھوڑ کر ان اہلِ کتاب کی اہواء کی پیروی نہ کریں اس کے بعد حدود وجزاء وسزا میں ان خفیف اختلافات اور تبدیلیوں کو جو تورات' انجیل اور قرآن میں ہیں غیر اہم بتایا گیا' فرمایا:

﴿لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّ مِنْهَاجًا﴾ (مائدہ:۴۸)

''ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لیے ایک دستور اور ایک راستہ بنا دیا۔''

یہود ونصاریٰ کی ایک دوسرے کو۔۔۔۔۔۔

انہی اختلافات کی بنا پر یہود اور نصاریٰ دونوں ایک دوسرے کو برسر باطل کہتے تھے۔

﴿وَ قَالَتِ الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصَارٰى عَلٰى شَيْءٍ وَّ قَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُوْدُ عَلٰى شَيْءٍ وَّهُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ﴾ (بقرہ:۱۱۳)

''اور یہود نے کہا نصاریٰ کسی راہ پر نہیں اور نصاریٰ نے کہا یہود کسی راہ پر نہیں حالانکہ وہ دونوں خدا کی کتاب پڑھتے ہیں۔''

دونوں مل کر مسلمانوں سے کہتے تھے۔

﴿وَ قَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا﴾ (بقرہ:۱۳۵)

''اور انہوں نے کہا کہ یہودی یا نصرانی بن جاؤ تو ہدایت پاؤ گے۔''

اسلام کی دعوت اصل دین ابراہیمی کی طرف

ارشاد ہوا کہ تم دونوں اپنے اپنے الگ الگ راستوں کو چھوڑ کر آؤ اور اصل دینِ ابراہیمی پر متفق ہو جاؤ۔

﴿قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرَاهِيْمَ حَنِيْفًا وَّ مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ○ قُوْلُوْا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَ مَآ اَنْزَلَ اِلٰٓى اِبْرَاهِيْمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ وَ الْاَسْبَاطِ وَ مَآ اُوْتِىَ مُوْسٰى وَ عِيْسٰى وَ مَآ اُوْتِىَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَ نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ○ فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا وَ اِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِىْ شِقَاقٍ﴾ (بقرہ :۱۳۵،۱۳۷)

''کہہ بلکہ ابراہیم کے دین کی پیروی کرو جو موحد تھا' مشرک نہ تھا' تم لوگ کہو کہ ہم خدا پر اور جو کچھ ہماری طرف اترا اور جو ابراہیم اور اسماعیل اور اسحق اور یعقوب اور اس کی اولاد پر اتارا گیا اور جو موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا گیا' اور جو سب نبیوں کو ان کے خدا کی طرف سے دیا گیا اس سب پر ایمان لائے' اور ہم اس ایک خدا کے تابع ہیں تو اگر یہ بھی اسی طرح ایمان لائیں جس طرح تم ایمان لائے ہو تو انہوں نے ہدایت پائی اور اگر روگردانی کریں تو وہی ہیں ضد اور مخالفت پر۔''

یہود اور نصاریٰ کو یہ دعویٰ تھا:

﴿لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى﴾ (بقرہ:۱۱۱)

''یہود و نصاریٰ کے سوا کوئی جنت میں داخل نہ ہوگا۔''

جواب دیا گیا:

﴿تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ﴾ (بقرہ:۱۱۱)

''یہ ان کی باطل آرزوئیں ہیں۔'' بلکہ

﴿بَلٰى مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَ هُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗٓ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ وَ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ﴾ (بقرہ:۱۱۲)

''ہاں جس نے بھی اپنے کو خدا کا مطیع بنایا اور وہ نیکوکار ہے تو اس کی مزدوری اس کے خدا کے پاس ہے نہ ان کو خوف ہوگا اور نہ غم۔''

اسلام کا تمام اہلِ مذاہب کو خطاب

تمام اہلِ مذاہب کو یکساں خطاب کر کے فرمایا:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ الَّذِيْنَ هَادُوْا وَ النَّصٰرٰى وَ الصَّابِـِٕيْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ عَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ﴾ (بقرہ:۶۲)

''بے شک جو ایمان لائے (یعنی مسلمان) جو یہودی ہوئے اور نصاریٰ اور صابی' جو بھی خدا پر اور آخری دن پر ایمان لایا اور نیک عمل کیا تو ان کی مزدوری ان کے پروردگار کے پاس ہے نہ ان پر خوف

ہوگا' نہ وہ غمگین ہوں گے۔''

اب جو ایمان لائے یعنی مسلمان اور جو یہودی ہے' اور نصاریٰ اور صابئین ان میں سے جو بھی اپنے اپنے دورِ نبوت میں خدا کی توحید پر' روزِ آخر کی صداقت پر ایمان لایا' اور اچھے عمل کیے' ان کو اپنے کام کا پورا ثواب ملے گا' یعنی جس نے بھی اپنے اپنے پیغمبر کی اصلی تعلیم اور سچی شریعت کے مطابق جو شرک و کفر اور بت پرستی سے یقیناً پاک تھی' عمل کیا' اس کو اس کا ثواب ملے گا۔ خدا کی توحید اور روزِ آخر کی صداقت پر ایمان لانا اور اچھے کام کرنا صرف عقل کی ہدایت سے نہیں ہوسکتا' بلکہ کسی رسول کی تعلیم ہی سے ہوسکتا ہے اور اس پر تمام اہلِ مذاہب کا اتفاق ہے' اس لیے رسالت کی تصدیق بھی اس کے ضمن میں داخل ہے کہ

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ وَ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّفَرِّقُوْا بَیْنَ اللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ وَ یَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّ نَکْفُرُ بِبَعْضٍ وَّ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّتَّخِذُوْا بَیْنَ ذٰلِکَ سَبِیْلًا ○ اُولٰٓئِکَ هُمُ الْکٰفِرُوْنَ حَقًّا وَّ اَعْتَدْنَا لِلْکٰفِرِیْنَ عَذَابًا مُّهِیْنًا ○ وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ وَ لَمْ یُفَرِّقُوْا بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ اُولٰٓئِکَ سَوْفَ یُؤْتِیْهِمْ اُجُوْرَهُمْ وَ کَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا ○﴾

(نساء:۱۵۰'۱۵۲)

''بے شک جو اللہ اور اس کے رسولوں کا انکار کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولوں میں جدائی کریں اور کہتے ہیں کہ ہم کسی کو مانتے ہیں اور کسی کو نہیں مانتے اور چاہتے ہیں کہ وہ اس میں درمیان کا راستہ اختیار کریں' وہی حقیقی کافر ہیں اور ہم نے کافروں کے لیے اہانت کرنے والا عذاب تیار کیا ہے اور جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے اور ان میں سے کسی کا کبھی انکار نہیں کیا' یہ وہ ہیں جن کو ان کی مزدوریاں خدا دے گا اور خدا بخشنے والا' رحم کرنے والا ہے۔''

دوسری آیت میں ہے۔

﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ﴾ (نور:۶۲)

''مومن وہی ہیں جو خدا اور اس کے رسول پر ایمان لائے۔''

اسلام تمام رسولوں کی تصدیق کا نام ہے

اس بنا پر ان آیتوں سے دو باتیں معلوم ہوئیں' ایک یہ کہ قبولِ عمل کے لیے ایمان شرط ہے' دوسری یہ کہ ایمان و عمل کے علم کے لیے نبی کی تصدیق ضروری ہے' اسی لیے اوپر جن چار فرقوں کا ذکر ہوا وہ چاروں وہ ہیں جو کسی نہ کسی پیغمبر کے ماننے والے ہیں اس بنا پر کامل اسلام یہ ہے کہ تمام رسولوں کو صادق مانا جائے' چنانچہ اس کی تفصیل سورۂ مائدہ میں ہے:

﴿قُلْ یٰٓاَهْلَ الْکِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰی شَیْءٍ حَتّٰی تُقِیْمُوا التَّوْرٰةَ وَ الْاِنْجِیْلَ وَ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکُمْ

مِنْ رَّبِّكُمْ وَ لَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّ كُفْرًا فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ○ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ الَّذِيْنَ هَادُوْا وَ الصّٰبِئُوْنَ وَ النَّصٰرٰى مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ عَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ○﴾ (مائدہ ۶۸:۶۹)

''کہہ دے اے کتاب والو! تم کچھ نہیں جب تک تم توراۃ اور انجیل کو اور جو کچھ تمہاری طرف اتارا گیا' اس کو قائم نہ کرو' اور (اے پیغمبر!) جو تیری طرف اترا ہے' وہ ان کی سرکشی اور انکار کو اور بڑھائے گا تو ان منکروں کا غم نہ کرو' اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جو مسلمان ہوئے اور جو یہودی ہوئے' اور صابی' اور عیسائی جو خدا پر اور روزِ قیامت پر ایمان لایا' اور اچھے کام کئے تو ان پر کوئی خوف نہیں اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔''

یہود و نصاریٰ انبیاءؑ کی تکذیب کرتے رہے

اس کے بعد ہی اس کا ذکر ہے کہ یہودیوں نے ہمیشہ رسولوں کا انکار کیا اور نصاریٰ توحید کو چھوڑ کر تثلیث اور الوہیتِ مسیح میں مبتلا ہو گئے' اس لیے اصل اسلام سے یہ دونوں ہٹ گئے ہیں' فرمایا:

﴿لَقَدْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآئِيْلَ وَ اَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمْ رُسُلًا كُلَّمَا جَآءَ هُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُهُمْ فَرِيْقًا كَذَّبُوْا وَ فَرِيْقًا يَّقْتُلُوْنَ ○ وَ حَسِبُوْٓا اَلَّا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ فَعَمُوْا وَ صَمُّوْا ثُمَّ تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ثُمَّ عَمُوْا وَ صَمُّوْا كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ○ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ قَالَ الْمَسِيْحُ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآئِيْلَ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَ رَبَّكُمْ اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَ مَاْوٰهُ النَّارُ وَ مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ○ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ وَ مَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّآ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَ اِنْ لَّمْ يَنْتَهُوْا عَمَّا يَقُوْلُوْنَ لَيَمَسَّنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ○﴾ (مائدہ:۷۰'۷۳)

''بے شک ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا اور ان کی طرف کئی رسول بھیجے' جب کبھی ان کے پاس کوئی رسول ان کی نفسانی خواہشوں کے خلاف احکام لے کر آیا' تو انہوں نے کتنوں کو جھٹلایا اور کتنوں کا خون کرنے لگے اور خیال کیا کہ اس سے کچھ خرابی نہ ہو گی' سو اندھے ہو گئے اور بہرے' پھر خدا ان پر رجوع ہوا' پھر ان میں بہتیرے اندھے اور بہرے ہو گئے' اور اللہ دیکھتا ہے وہ جو کرتے ہیں بے شبہ وہ کافر ہوئے' جنہوں نے یہ کہا کہ مریم کا بیٹا مسیح ہی اللہ ہے' مسیح نے تو یہ کہا تھا کہ اے بنی اسرائیل اللہ کو پوجو میرا اور تمہارا رب ہے' بے شک جو اللہ کا شریک بنائے گا تو اللہ نے اس پر جنت حرام کر دی اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے اور گنہگاروں کی کوئی مدد کرنے والا نہیں' بے شبہ وہ کافر ہوئے جنہوں نے کہا کہ اللہ تین میں تیسرا ہے حالانکہ کوئی اللہ نہیں مگر وہی ایک۔ اگر وہ اپنے اس قول سے باز نہ آئے تو ان میں سے

کافروں کو یقیناً دردناک عذاب چھوئے گا۔''

یہ تو ان یہود و نصاریٰ کے ''ایمان'' کا حال تھا' اس کے بعد اسی رکوع میں ان کے حسن عمل کا جائزہ لیا گیا ہے اور اسی کے بعد ہی ان سے کہا گیا ہے:

﴿وَ لَوْ كَانُوْا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ النَّبِيِّ وَ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَااتَّخَذُوْهُمْ اَوْلِيَآءَ وَ لٰكِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ﴾ (مائدہ:۸۱)

''اور اگر اللہ اور اسی نبی پر اور جو اس نبی پر اترا اس پر یہ لوگ ایمان لے آتے تو ان (مشرکوں) کو وہ اپنا دوست نہ بناتے لیکن ان میں اکثر نافرمان ہیں۔''

اسلام کا اصل الاصول توحیدِ کامل اور رسالت

اسلام یعنی تمام نبیوں اور رسولوں کے واحد اور مشترک دین کا اصل الاصول دو باتیں ہیں' توحیدِ کامل اور رسالتِ عمومی یعنی اللہ تعالیٰ کو توحید کی تمام صفتوں میں کامل بلاشریک ماننا اور اس کے تمام پیغمبروں اور رسولوں کو یکساں صادق اور راست باز تسلیم کرنا چنانچہ فرمایا:

﴿اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَ لَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا وَّ اِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ○ قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ مَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَ مَآ اُنْزِلَ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ وَ الْاَسْبَاطِ وَ مَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَ عِيْسٰى وَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَ نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ○ وَ مَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَ هُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ○﴾ (آل عمران:۸۳'۸۵)

''کیا وہ دینِ الٰہی کے سوا کوئی اور دین چاہتے ہیں حالانکہ جو بھی آسمانوں میں اور زمین میں ہے وہ خوشی سے یا مجبوراً خدا کا مسلم یعنی فرمان بردار ہے اور اسی کی طرف سب لوٹائے جائیں گے۔ (اے پیغمبر!) کہہ کہ ہم اللہ پر اور اس نے جو ہم پر اتارا اور جو ابراہیم پر اسماعیل پر اور اسحاق پر اور یعقوب پر اور ان کی اولادوں پر اترا' اور جو کچھ موسیٰ اور عیسیٰ اور سب پیغمبروں کو ان کے رب کی طرف سے ملا ہم سب کی صداقت کو تسلیم کرتے ہیں۔ ہم ان میں سے کسی میں کوئی فرق نہیں کرتے ہم اسی خدا کے مسلم یعنی فرمان بردار ہیں' اور جو اسلام کے سوا اور کوئی دین چاہے گا تو وہ اس سے قبول نہ کیا جائے گا اور وہ آخرت میں نقصان اٹھانے والوں سے ہوگا۔''

اس آیت سے ظاہر ہے کہ خدا پر اور تمام رسولوں پر ایمان لانا دین اللہ ہے' اور اسی کا نام اسلام ہے۔ جس نے اس اصول کو قبول نہیں کیا وہ آخرت میں نقصان اٹھائے گا' آل عمران میں ہے کہ یہود و نصاریٰ تاویلاتِ باطلہ اور اتباعِ متشابہات کی وجہ سے گمراہ ہو گئے' یعنی دینِ اسلام سے روگرداں ہو کر اختلافات میں پڑ گئے' فرمایا:

﴿اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ وَ مَا اخْتَلَفَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَ ھُمُ الْعِلْمُ بَغْیًاۢ بَیْنَھُمْ وَ مَنْ یَّکْفُرْ بِاٰیٰتِ اللّٰہِ فَاِنَّ اللّٰہَ سَرِیْعُ الْحِسَابِ ○ فَاِنْ حَآجُّوْکَ فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْھِیَ لِلّٰہِ وَ مَنِ اتَّبَعَنِ﴾ (آل عمران:۱۹،۲۰)

''بے شک دین خدا کے نزدیک اسلام ہے اور جن کو کتاب دی گئی' انہوں نے علم آنے کے بعد اس میں آپس کی ضد کے سبب سے اختلاف کیا اور جو اللہ کی آیتوں کا انکار کرے گا تو اللہ جلد حساب لینے والا ہے تو اگر (اے پیغمبر!) یہ تجھ سے پھر کج بحثی کریں تو کہہ دے کہ میں نے اور میرے پیروؤں نے تو اپنے کو خدا کا تابع فرمان (مسلم) کر دیا ہے۔''

اسی کے بعد آنحضرت ﷺ کو حکم ہوتا ہے کہ یہود و نصاریٰ سے سوال کریں کہ وہ اسلام قبول کرتے ہیں یا نہیں۔

﴿وَ قُلْ لِّلَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ وَ الْاُمِّیّٖنَ ءَ اَسْلَمْتُمْ فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اھْتَدَوْا وَ اِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَیْکَ الْبَلٰغُ وَ اللّٰہُ بَصِیْرٌۢ بِالْعِبَادِ﴾ (آل عمران:۲۰)

''اور اے پیغمبر! ان سے جن کو کتاب دی گئی اور عرب کے جاہلوں سے کہہ دے کہ کیا تم نے بھی اسلام قبول کیا' اگر کیا تو انہوں نے سیدھی راہ پائی اور اگر انکار کیا تو تجھ پر صرف پہنچا دینا ہے' اور اللہ بندوں کو دیکھتا ہے۔''

اسلام کا ہدایتِ تامہ ہونا

یہود و نصاریٰ کو اس اسلام کے قبول کرنے پر ہدایت تامہ ملنے کی بشارت ہوتی ہے' اس سے معلوم ہوا کہ اسلام ''ہدایتِ تامہ'' ہے۔ یہی دین ہے جس کو یہود و نصاریٰ اور تمام اہلِ مذاہب نے جو کسی گزشتہ پیغمبر کی امت ہوں کھو دیا تھا اور اب جس کو محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ سے دوبارہ دنیا میں پیش کیا گیا ہے' اس لیے جو ہدایت ان قوموں کے پاس تھی وہ ناقص تھی اور اسلام جس کو لے کر آیا وہ کامل ہے' نیز یہ معلوم ہوا کہ جن آیتوں میں یہ کہا گیا ہے کہ اب جو ایمان لائے اور جو یہودی ہوئے اور نصرانی اور صابیٔ جو بھی خدا اور یومِ آخر پر ایمان لایا' اور اس نے نیک کام کیا اس کو خوف و غم نہ ہوگا۔ ان میں خدا پر ایمان لانے سے مقصود توحیدِ کامل ہے' اور اس کا یہ منشا نہیں کہ یہود و نصاریٰ اور صابیٔ وغیرہ اپنے موجودہ گمراہ عقیدوں کے باوجود نجات کے مستحق ہیں یہود و نصاریٰ کیا مسلمان بھی اس توحیدِ کامل کے بغیر نجات کے مستحق نہیں' جب تک مسلمانوں کا ایمان اور عملِ صالح ٹھیک اس تعلیم کے مطابق نہ ہو جو ان کے رسول کے ذریعہ سے دنیا میں آئی ہے' یہ اصول ہر ایک کے لیے ہے خواہ وہ مسلمان ہو یا یہودی عیسائی ہو یا صابیٔ غرض کسی نبی کی پیروی کا مدعی ہو۔

نبوتِ محمدی کا دعویٰ

نبوتِ محمدی کا یہ دعویٰ نہیں کہ وہی ایک ہدایت ہے اور اس کے سوا سب ضلالت ہے' بلکہ یہ دعویٰ ہے کہ وہی ایک کامل ہدایت ہے' اور بقیہ مذاہب سابقہ موجودہ حالت میں ناقص ہیں یعنی وہ ابدی کامل ہدایت جو اپنے اپنے وقتوں میں نبی لے کر آتے رہے' چونکہ ان کے پیرو اپنے تاویلات' تحریفات' تصرفات اور اختلافات سے اس کو برباد کر چکے تھے' اس لیے محمد رسول اللہ ﷺ اسی کو لے کر آخری دفعہ تشریف لائے اور اب وہ ہدایت ہمیشہ کامل رہے گی' کبھی' ناقص نہ ہوگی' کیونکہ اس کا صحیفۂ ہدایت (قرآن) تحریف واختلافات اور تصرف سے محفوظ و پاک رہے گا۔

دعوتِ محمدی میں ہدایت کی بشارت

یہی وجہ ہے کہ یہود و نصاریٰ کو نبوتِ محمدی کی دعوت جہاں دی گئی ہے' ہدایت کی بشارت بھی سنائی گئی ہے چنانچہ اسی آیت میں جو اوپر گزری یہ ہے:

﴿وَ قُلْ لِّلَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ وَ الْاُمِّیّٖنَ ءَ اَسْلَمْتُمْ فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا﴾ (آل عمران: ۲۰)

''اے پیغمبر! ان سے جن کو کتاب دی گئی اور عرب کے جاہلوں سے کہہ کیا وہ اسلام لائے اگر اسلام لائے تو انہوں نے سیدھی راہ پائی۔''

سورۂ بقرہ میں ہے:

﴿قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْنَا وَ مَآ اُنْزِلَ اِلٰٓی اِبْرٰهِیْمَ وَ اِسْمٰعِیْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ یَعْقُوْبَ وَ الْاَسْبَاطِ وَ مَآ اُوْتِیَ مُوْسٰی وَ عِیْسٰی وَ مَآ اُوْتِیَ النَّبِیُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَ نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ○ فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا وَ اِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِیْ شِقَاقٍ﴾ (بقرہ: ۱۳۶'۱۳۷)

''(اے مسلمانو)! کہو کہ ہم اللہ پر اور جو ہماری طرف اترا' اور جو ابراہیم پر اور اسمٰعیل پر اور اسحٰق پر اور یعقوب پر اور ان کی اولاد پر اترا اور جو موسیٰ کو اور عیسیٰ کو اور سب پیغمبروں کو ان کے پروردگار کی طرف سے دیا گیا (سب پر) ایمان لائے ہم ان میں سے کسی میں کچھ فرق نہیں کرتے' اور ہم اسی خدا کے مسلم یعنی فرمان بردار ہیں' تو اگر یہ بھی اسی طرح مانیں جس طرح تم نے مانا تو انہوں نے سیدھی راہ پائی اور اگر وہ اس سے باز رہیں تو وہ محض ضد پر ہیں۔''

یہود و نصاریٰ اور اہلِ کتاب کو تعلیمِ محمدی کی طرف دعوت اسی ''ہدایت'' کے پانے کے لیے ہے جو اسلام یعنی انبیاؑ کے دینِ ازلی سے عبارت ہے اور جس کو لے کر محمد رسول اللہ ﷺ اس دنیا میں تشریف لائے اور اب فلاح و

نجات اسی کے ماننے پر منحصر ہے۔

﴿وَ الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ وَ مَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ وَ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ یُوْقِنُوْنَ○ اُولٰٓئِکَ عَلٰی هُدًی مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ اُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ○﴾ (بقرہ:۴'۵)

''جو اس کو جو تیری (پیغمبر کی) طرف اترا اور جو تجھ سے پہلے اترا' دونوں کو مانتے ہیں اور پچھلی زندگی پر یقین رکھتے ہیں اور وہی اپنے پروردگار کی ہدایت پر ہیں اور وہی کامیاب ہیں۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصہ کے بعد فرمایا کہ رحمتِ الٰہی گو عام ہے مگر یہ نعمت خاص طور سے ان کا حصہ ہے' جو تعلیمِ محمدی کو قبول کریں اور وہی نجاتِ کامل کے مستحق ہیں:

﴿وَ رَحْمَتِیْ وَسِعَتْ کُلَّ شَیْءٍ فَسَاَکْتُبُهَا لِلَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ وَ یُؤْتُوْنَ الزَّکٰوةَ وَ الَّذِیْنَ هُمْ بِاٰیٰتِنَا یُؤْمِنُوْنَ○ الَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ الَّذِیْ یَجِدُوْنَهٗ مَکْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِی التَّوْرٰةِ وَ الْاِنْجِیْلِ یَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَ یَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْکَرِ وَ یُحِلُّ لَهُمُ الطَّیِّبٰتِ وَ یُحَرِّمُ عَلَیْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَ یَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِیْ کَانَتْ عَلَیْهِمْ فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَ عَزَّرُوْهُ وَ نَصَرُوْهُ وَ اتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ اُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ○ یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعًا نِ الَّذِیْ لَهٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ یُحْیٖ وَ یُمِیْتُ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهِ النَّبِیِّ الْاُمِّیِّ الَّذِیْ یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ کَلِمٰتِهٖ وَ اتَّبِعُوْهُ لَعَلَّکُمْ تَهْتَدُوْنَ○﴾ (اعراف:۱۵۶'۱۵۸)

''اور میری رحمت ہر چیز کو سمائے ہے تو اس رحمت کو میں ان کے لیے لکھ دوں گا جو پرہیزگار ہیں' اور زکوٰۃ دیتے ہیں' اور جو ہمارے حکموں کو مانتے ہیں جو اس ان پڑھ فرستادہ پیغمبر کی پیروی کرتے ہیں جس کو وہ اپنے ہاں توراۃ اور انجیل میں لکھا پاتے ہیں جو ان کو نیکی کا حکم دیتا ہے اور برائی سے باز رکھتا ہے اور اچھی چیزوں کو ان کے لیے حلال کرتا اور بری چیزوں کو حرام کرتا ہے' اور ان کے بندھن کو اور ان زنجیروں کو جو ان پر پڑی تھیں' اتارتا ہے۔ تو جنہوں نے اس پیغمبر کو مانا اور اس کی تائید کی اور اس کی مدد کی اور اس روشنی کے پیچھے چلے جو اس کے ساتھ اتری وہی کامیاب ہیں۔ کہہ دے' (اے پیغمبر!) کہ اے انسانو! میں تم سب کی طرف۔ اس خدا کا رسول ہوں جس کی آسمانوں اور زمین کی شہنشاہی ہے اس کے سوا کوئی خدا نہیں' وہی جلاتا اور وہی مارتا ہے سو اللہ اور اس کے ان پڑھ پیغام رساں رسول پر ایمان لاؤ جو اللہ پر اور اس کی باتوں پر ایمان رکھتا ہے اور اس رسول کی پیروی کرو تا کہ تم سیدھی راہ پاؤ۔''

ان آیات میں صاف ظاہر کر دیا گیا کہ گزشتہ مذاہب کے پیروؤں کو محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانا اس لیے ضروری ہے کہ وہ دینِ خالص جو انسانی تصرفات اور آمیزشوں سے مکدر ہو گیا تھا' وہ صحفِ الٰہی کی پیشین گوئیوں کے مطابق آپؐ کے ذریعہ سے پھر نکھارا گیا ہے' اور جن اضافوں اور جزئیاتِ احکام کی سختیوں کو انسانوں نے اس

میں شامل کر دیا تھا' وہ آپؐ کے ذریعہ سے دور کی گئیں نیز آپ عالم گیر پیغمبر بنا کر معبوث کیے گئے ہیں اس لیے ہدایتِ تامہ' نبوتِ عمومی اور نجاتِ کامل اور فلاحِ عام اب صرف وحیِ محمدی کے اندر محدود ہے۔

الغرض دینِ محمدی کو قبول کرنا اس لیے تمام انسانوں پر ضروری ہے کہ وہ دینِ ازلی جو ہر مذہب کا جوہر تھا اور جو اس کے پیروؤں کی تحریف وتصریف اور تصرف سے برباد ہو گیا تھا' اسی کو صحیفۂ محمدی لے کر آیا ہے' اب وہ ہمیشہ محفوظ رہے گا' کیونکہ اس کا نبی خاتم النبیین' اس کا دین کامل دین اور اس کا صحیفہ تمام صحفِ الٰہی پر مہیمن اور حاوی ہے' اور قیامت تک خدا کی طرف سے اس کی پوری حفاظت اور بقا کا وعدہ کیا گیا ہے' یہ چاروں دعوے یعنی تکمیلِ دین' قرآن کا مہیمن ہونا' قیامت تک اس کا محفوظ وباقی رکھنا اور ختمِ نبوت' حسبِ ذیل دلائل سے ثابت ہیں۔

تکمیلِ دین

قرآن کے سوا کسی اور صحیفہ نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ مکمل ہے' اور اس کے ذریعہ سے دینِ الٰہی اپنے تمام اصول وفروع (مناسک وشرائع) کے لحاظ سے تکمیل کو پہنچ گیا' بلکہ گزشتہ مذاہب میں سے ہر ایک نے اپنے وقت میں یہی کہا کہ اس کے بعد ایک اور نبوت آئے گی جو اس کے کام کی تکمیل کرے گی' خدا نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا:

''میں ان کے لیے ان کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا' اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اسے فرماؤں گا وہ سب ان سے کہے گا۔'' (استثناء ۱۸:۱۹)

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد ان کے مانند ایک اور نبی آنے والا تھا' جس کے منہ میں اللہ تعالیٰ خود اپنا کلام ڈالے گا' اس سے ثابت ہوا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرح ایک اور صاحبِ شریعت نبی خدا کے نئے کلام کے ساتھ آئے گا' اسی طرح حضرت عیسیٰ نے بھی کہا:

''لیکن وہ فارقلیط (احمد) پاکیزگی کی روح ہے جسے باپ (خدا) میرے نام سے بھیجے گا' وہی تمہیں سب چیزیں سکھائے گا' اور سب باتیں جو میں نے تم سے کہی ہیں' تمہیں یاد دلائے گا۔ (یوحنا ۱۴'۲۶)

اور وہ فارقلیط (احمد) آ کر دنیا کو گناہ سے راستی اور عدالت سے قصوروار ٹھہرائے گا' گناہ اس لیے کہ وہ مجھ پر ایمان نہیں لائے۔ میری اور بہت سی باتیں ہیں کہ میں تم سے کہوں' پر اب تم ان کی برداشت نہیں کر سکتے' لیکن جب وہ یعنی سچائی کی روح آئے گی' تو وہ تمہیں ساری سچائی کی راہ بتائے گی اس لیے کہ وہ اپنی نہ کہے گی' لیکن جو وہ سنے گی سو کہے گی' میری بزرگی کرے گی۔ (یوحنا ۱۶'۸)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بھی اپنے کلام کو ہنوز ناتمام ہی فرمایا' اور ایک آئندہ آنے والے کا پتا دیا' جو اس کی تکمیل کرے گا۔

موعود الامم کی آمد اور اس کا دعویٰ

آخر وہ موعود الامم (ﷺ) آیا اور دعویٰ کیا کہ میں موسیٰ علیہ السلام کے مانند بنی اسرائیل کے بھائیوں یعنی بنی اسماعیل میں سے آیا ہوں' اور میرے منہ میں خدا نے اپنی بولی ڈالی ہے اور یہ دعویٰ کیا کہ میں ہی وہ سچائی کی روح ہوں' جو مسیح کی اصلی بڑائی ظاہر کرنے' سچائی کی راہ بتانے اور مسیح کی ادھوری بات کو کامل کرنے کے لیے آئی ہے' میں اپنی نہیں کہتا بلکہ وہی کہتا ہوں' جو اوپر سے سنتا ہوں اور آخر زمانہ نبوت کے ختم پر وحیِ الٰہی نے اس کی زبان سے یہ اعلان عام کیا:

﴿اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَ رَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا﴾

(مائدہ:۳)

''آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین کامل کر دیا' اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی اور تمہارے لیے اسلام کا دین پسند کیا۔''

اسی تکمیل کا یہ اثر تھا کہ اس نے یہود کے بعض سخت فقہی احکام کو جو ان کی سخت گیری کے لیے ان پر عائد تھے اور اصل دینِ ابراہیمی میں داخل نہ تھے'[1] یا انسانوں کے اضافے اور تصرفات تھے' بدل کر ایسے مناسب اور آسان احکام عطا کیے جو ہر زمانہ کے لیے موزوں ہو سکتے ہیں' اسی لیے اس نے اپنے بعد کسی آنے والے پیغمبر کی پیشین گوئی نہیں کی' نہ کسی نئے کلام کے نزول کی خبر دی' نہ کسی نئی شریعت کا منتظر کیا' کہ تکمیل کے بعد اب کسی نئے آنے والے کسی نئے کلام اور کسی نئی شریعت کا موقع کہاں؟ اور اسی بنا پر قرآن نے ہر جگہ ﴿وَ مَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ﴾ (جو محمد ﷺ سے پہلے نازل کیا گیا) پر ایمان لانے کی تاکید کی لیکن ﴿وَ مَآ اُنْزِلَ مِنْۢ بَعْدِکَ﴾ کے قبول کرنے کا کہیں اشارۃ تک نہیں کیا۔

قرآن مہیمن کتب ہے

اس دینِ کامل کا صحیفہ تمام اگلی کتابوں کا مصدق ہے:

﴿مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ﴾ (مائدہ:۴۶)

''اپنے آگے کی کتابوں کی تصدیق کرنے والا۔''

وہ تمام اگلی کتابوں کی صداقتوں اور تعلیموں پر مشتمل ہے اس لیے جو کوئی اس صحیفہ کو قبول کرتا ہے' وہ تمام اگلی کتابوں کی صداقتوں اور تعلیموں کو قبول کر لیتا ہے' یہ حیثیت قرآن کے سوا کسی دوسرے صحیفہ کو حاصل نہیں' فرمایا:

﴿وَ اَنْزَلْنَآ اِلَیْکَ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ مِنَ الْکِتٰبِ وَ مُهَیْمِنًا عَلَیْهِ﴾

(مائدہ:۴۸)

---

(۱) دیکھو آیت ﴿کُلُّ الطَّعَامِ کَانَ حِلًّا لِّبَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسْرَآئِیْلُ عَلٰی نَفْسِهٖ﴾ (آل عمران: ۹۳)

''اور ہم نے (اے محمد!) تیری طرف سچائی کے ساتھ یہ کتاب اتاری جو اپنے سے پہلے کی کتاب کی تصدیق کرتی ہے اس پر شاہد و حاوی ہے۔''

لفظ مہیمن کی تفسیر اہل زبان مفسروں نے یہ کی ہے۔

ابن عباسؓ : شاہد اور امین' قرآن اپنے پہلے کی ہر کتاب کا امین ہے۔

قتادہؒ: قرآن سے پہلے جو کتابیں تھیں ان کا وہ امین اور شاہد ہے۔

غرض قرآن اگلی کتابوں کی کچھ صداقتوں پر سچی تعلیموں کی صداقت اپنے اندر رکھتا ہے۔

قرآن محفوظ ہے اور رہے گا

پیغمبر کی تعلیم کی حفاظت اس کے صحیفۂ الٰہی کی حفاظت پر موقوف ہے۔ قرآن سے پہلے کوئی کتابِ الٰہی دانستہ اور نادانستہ لفظی تحریفات اور تصرفات سے پورے طور پر بری نہیں رہی' لاکھوں پیغمبروں میں سے چند کے سوا کسی کا صحیفہ دنیا میں باقی نہیں اور جو باقی ہے وہ فنا ہو ہو کر نئے نئے قالب میں بدلتا رہا' توراۃ جل جل کر خاک ہوئی پھر ان سوختہ اوراق سے تحریر کی گئی' اور ترجموں کی تحریفات سے اپنی اصل کھو بیٹھی' انجیل میں تحریف و جعل تو اسی زمانہ میں شروع ہو چکا تھا پھر مترجموں کی کتر بیونت نے حقیقت بالکل مشتبہ کر دی' زردشت کا صحیفہ سکندر کے نذر ہوا اب صرف گاتھا کا ایک حصہ بچا کھچا رہ گیا ہے ان کتابوں کا یہ حال اس لیے ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو دائمی اور آخری کتابیں بنا کر نہیں بھیجا تھا' اسی بنا پر ان کی دائمی حفاظت کا وعدہ نہیں کیا گیا' قرآن کی نسبت یہ وعدہ ہوا کہ وہ ہمیشہ کے لیے باقی اور محفوظ رہے گا' اس کی بقاء اور حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر لی اور فرمایا اور کس وثوق سے فرمایا':

﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوْنَ﴾ (حجر:۹)

''ہم نے اس نصیحت (کی کتاب) کو اتارا اور بے شبہ ہم ہیں اس کی حفاظت کرنے والے۔''

یہ وعدۂ الٰہی ایک اور آیت میں ان لفاظ میں دہرایا گیا ہے:

﴿اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَ قُرْاٰنَهٗ ○ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ○ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ○﴾ (قیامہ: ۱۷'۱۹)

''بے شک ہمارے ذمہ ہے اس (قرآن) کو سمیٹ رکھنا' اور اس کا پڑھنا' پھر جب ہم پڑھیں تو تو اس کے پڑھنے کے ساتھ رہ پھر بے شبہ ہم پر ہے' اس کو کھول کر بتانا۔''

اس آیت میں قرآن کی قرأت یعنی لفظ و عبارت اور بیان یعنی معنی دونوں کی ذمہ داری خدائے تعالیٰ نے خود اپنے اوپر لی ہے' تیسری آیت میں اس کی تصریح ہے کہ اس حق میں باطل کی آمیزش کبھی راہ نہ پا سکے گی' فرمایا:

﴿وَ اِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيْزٌ ○ لَّا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَ لَا مِنْ خَلْفِهٖ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ

حَمِیْدٍ﴾ (حم السجدۃ:۴۱،۴۲)

''اور بے شک، یہ قرآن ایک ایسی کتاب سے جو غالب ہے، باطل نہ اس کے سامنے سے اور نہ اس کے پیچھے سے اس کے پاس آئے گا، ایک حکمت والے اور خوبیوں والے کی طرف سے اترا۔''

اس کتاب کو غالب فرمایا گیا، یعنی جو اپنے ہر حریف کو اپنے دلائل کے زور سے پست کرے گی، باطل نہ اس کے سامنے سے اس میں مل سکتا ہے اور نہ پیچھے سے یعنی نہ لفظ و عبارت کی طرف سے اور نہ حقیقت و معنی کی جہت سے، کیونکہ وہ ایک حکمت والے کی جانب سے عطا ہوئی ہے اس لیے ہر باطل کے عیب سے پاک رہے گی۔

یہ قرآن کا اپنا دعویٰ ہے اور ساڑھے تیرہ سو برس کی تاریخ اس کی صداقت پر گواہ ہے۔

ختمِ نبوت

مقدماتِ بالا کا نتیجہ گو خود یہ ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ کے بعد کسی نبی کی، قرآن کے بعد کسی صحیفہ کی اور اسلام کے بعد کسی دین کی ضرورت نہ ہو، لیکن وحیِ محمدی نے ہر شک کے ازالہ کے لئے آگے بڑھ کر یہ تصریح بھی کر دی کہ اب نبوت و رسالت کا سلسلہ ختم ہو گیا، اور اب آپؐ کے بعد کسی نبی کی حاجت نہیں، کہ دینِ کامل اور صحیفۂ الٰہی محفوظ ہو چکا، اور ہدایتِ ربانی کے دروازہ کے بند ہونے کا خطرہ دور ہو گیا، چنانچہ خود تاریخِ انسانی گواہ ہے کہ بعثتِ محمدی کے بعد دنیا کی حالت بدل گئی، متفرق قومیں پیوستہ ہو گئیں، زمین کے کونے ایک دوسرے سے مل گئے اور توحیدِ کامل کا غلغلہ عرش سے فرش تک بلند ہو گیا اور خدا کے تمام رسولوں کو سچا اور صادق ماننے کا ولولہ آہستہ آہستہ ترقی پانے لگا۔ یہاں تک کہ ان قوموں نے بھی جو مسلمان نہیں ہوئیں ان دونوں صداقتوں کو اصولاً تسلیم کر لیا۔

وحدتِ ادیان اور دینِ اسلام

تفصیلِ بالا کے بعد یہ واضح ہو گیا کہ وحدتِ ادیان کا منشا کیا ہے، یعنی یہ کہ اصل میں ایک ہی دین ہے جو تمام انبیا کا مذہب رہا، لیکن وہ بعد کو ان کے پیروؤں کے صحائف میں تحریف و تصرف کے سبب سے بگڑتا رہا، اسی دینِ ازلی کو لے کر محمد رسول اللہ ﷺ آئے اور اسی کا نام اسلام ہے، جو اپنے صحیفہ کی بقا و حفاظت اور دین کی تکمیل اور نبوت کے اتمام کے سبب سے ہمیشہ قائم و باقی رہے گا، اگر تمام مذاہبِ سابقہ اپنے اپنے اس اصل دین پر آ جائیں، جس کی تعلیم ان کے پیغمبروں نے دی تھی تو وہ وہی دینِ ازلی ہو گا، جس کا نام اسلام ہے اور نوحؑ، ابراہیمؑ، موسویؑ، عیسویؑ اور محمدی دینوں میں سوائے اجمال و تفصیل کے کوئی فرق نہ رہے گا، اسی لئے فرمایا گیا:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْهًا فَنَرُدَّهَا عَلٰٓى اَدْبَارِهَآ اَوْ نَلْعَنَهُمْ كَمَا لَعَنَّآ اَصْحٰبَ السَّبْتِ﴾ (نساء:۴۷)

''اے وہ لوگو جن کو پہلے کتاب دی گئی، اس سے پہلے کہ ہم چہروں کو بگاڑ دیں، اور ان کو پیٹھ کی طرف پھیر دیں یا سبت کے گنہگاروں پر جس طرح لعنت کی تھی، ہم ان پر لعنت کریں، اس وحی پر ایمان لاؤ، جو ہم

نے اب اتاری (قرآن) جوان تعلیمات کی جوتمہارے پاس ہے تصدیق کرتی ہے۔"

مشرکینِ عرب سے زیادہ اہلِ کتاب کواس حقیقت کے سمجھنے کا زیادہ استحقاق تھا' اس لیے انہی کوسب سے پہلے اس کا منکر نہ ہونا چاہیے۔

﴿وَ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَ لَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ﴾ (البقرۃ:۴۱)

"اور جو کتاب ہم نے اب اتاری جوتمہارے پاس والی کتاب کوسچا بتاتی ہے اس پر ایمان لاؤ اور تم ہی پہلے کافر نہ ہو۔"

لیکن ان کی حالت یہ ہوئی کہ

﴿وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَ يَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ وَ هُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ﴾ (بقرہ:۱۱)

"اور جب ان سے کہا گیا کہ خدا نے جو بھی اتارا' اس پر ایمان لاؤ تو جواب دیا کہ جو ہم پر اترا ہم اس کو مانتے ہیں اور وہ اس کے سوا کا انکار کرتے ہیں' حالانکہ یہی (قرآن) حق ہے اور جوان کے پاس ہے اس کی تصدیق کرتا ہے۔"

صحیفۂ محمدی نے اہلِ کتاب کو وحدتِ دین کی دعوت دی

اس کے برخلاف محمد رسول اللہ ﷺ نے جس دین کو پیش کیا' اس کی بنیاد تمام اگلی نبوتوں اور کتابوں کی صداقت کے تسلیم کرنے پر رکھی گئی یہی سبب ہے کہ اسلام نے مسلمان ہونے کے لیے صرف یہی ضروری نہیں قرار دیا کہ وہ تنہا محمد رسول اللہ ﷺ کی نبوت پر ایمان لائے بلکہ یہ بھی قرار دیا کہ وہ تمام اگلی نبوتوں اور صحیفوں پر بھی ایمان لائے' چنانچہ خود قرآن کی شہادت ہے' کہ آنحضرت ﷺ کو صرف اسی کی تکلیف نہ تھی کہ آپؐ کے ہم وطن آپؐ کے صحیفہ کو نہیں مانتے تھے۔ بلکہ اس کی بھی تھی کہ وہ اگلے صحیفوں کو بھی نہیں مانتے تھے سورۂ سباء میں ہے:

﴿وَ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ بِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَ لَا بِالَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ﴾ (سبا:۳۱)

"اور منکروں نے کہا کہ ہم اس قرآن پر ہرگز ایمان نہ لائیں گے اور نہ اس سے اگلی کتاب پر (یعنی تورات پر)۔"

اور اسی لیے آنحضرت ﷺ نے تصریح کے ساتھ فرمایا کہ جو میری عبدیت اور رسالت کے ساتھ عیسیٰ علیہ السلام بن مریم کو بھی خدا کا بندہ اور اس کا رسول اور کلمہ اور خدا کی طرف سے آئی ہوئی روح تسلیم کرے گا' وہ جنت میں جائے گا (بخاری کتاب الانبیاء ذکر عیسیٰ علیہ السلام) الغرض وہ ازلی وابدی دین صرف ایک ہی تھا' اور تمام انبیاء علیہم السلام اسی ایک پیغام کو لے کر دنیا میں آئے تھے' یہی وحدتِ دین کی وہ حقیقت ہے جس کو قرآن نے اپنے الفاظ میں ادا کیا ہے:

﴿یٰٓاَیُّهَا الرُّسُلُ کُلُوْا مِنَ الطَّیِّبٰتِ وَ اعْمَلُوْا صَالِحًا اِنِّیْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِیْمٌ ○ وَ اِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُکُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّ اَنَا رَبُّکُمْ فَاتَّقُوْنِ ○ فَتَقَطَّعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَیْنَهُمْ زُبُرًا کُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَیْهِمْ فَرِحُوْنَ○﴾ (مؤمنون:۵۱،۵۳)

''اے پیغمبر! ستھری چیزیں کھاؤ اور بھلا کام کرو میں تمہارے کاموں سے آگاہ ہوں اور بے شک تم سب کی امت ایک امت ہے، اور میں تم سب کا (ایک) پروردگار ہوں تو مجھ سے ڈرتے رہو، تو ان کے پیروؤں نے اپنے مذہب کو آپس میں ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا، ہر فرقہ اپنے پاس کے خیال پر نازاں ہے۔''

اس حقیقت کی مزید تشریح آنحضرت ﷺ نے اپنے الفاظ میں فرمائی ہے:

((اَلْاَنْبِیَآءُ اِخْوَةٌ لِّعَلَّاتٍ اُمَّهَاتُهُمْ شَتّٰی وَ دِیْنُهُمْ وَاحِدٌ)) (بخاری کتاب الانبیاء: ذکر عیسیٰ)

''تمام انبیا ایسے بھائی ہیں جن کا باپ ایک ہے اور مائیں مختلف ہیں اور ان کا دین ایک ہے۔''

پچھلے دن اور پچھلی زندگی پر ایمان

﴿وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ﴾ (بقرہ:۱۷۷)﴿وَ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ یُوْقِنُوْنَ﴾ (بقرہ:۴)

اسلام کے سلسلۂ ایمانیات کی آخری کڑی ایک پچھلے دن اور پچھلی زندگی یا پچھلی دنیا پر یقین کرنا ہے،(۱) سورۂ بقرہ کے پہلے ہی رکوع میں ہدایت یاب اور کامیاب انسانوں کے ایمانیات کی آخری دفعہ یہ بیان کی گئی ہے۔

﴿وَ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ یُوْقِنُوْنَ﴾ (بقرہ:۴)

''اور وہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔''

﴿مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ﴾ (توبہ:۱۸)

''جو اللہ اور پچھلے دن پر ایمان لایا۔''

﴿اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ﴾ (التوبہ:۴۴)

''جو اللہ اور پچھلے دن پر ایمان لائے ہیں۔''

﴿اٰخرة﴾ کے معنی پچھلی کے ہیں اور یہ لفظاً صفت ہے عربی میں اوصاف کو موصوف کا قائم مقام کر کے اکثر موصوف کو حذف کر دیتے ہیں مثلاً ''دنیا'' کے لفظی معنی (قریب ترین) کے ہیں اور یہ صفت ہے اس کا موصوف ﴿الحیاة﴾ (زندگی) یا ﴿الدار﴾ (گھر) ہے اس لیے ﴿الدنیا﴾ کا مفہوم ﴿الحیاة الدنیا﴾ (قریب ترین زندگی) یعنی اس عالم کی موجودہ (زندگی) یا ﴿اَلدَّارُا الدُّنْیَا﴾ (قریب ترین گھر یعنی موجودہ عالم) ہے اسی طرح ﴿الاٰخر﴾ اور ﴿الاٰخرة﴾ کا مفہوم ﴿اَلْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَ الْحَیٰوةِ الْاٰخِرَةِ وَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ﴾ (پچھلا دن اور پچھلی زندگی اور پچھلا آنے والا گھر ہے) یعنی موجودہ زندگی کے بعد آنے والی دوسری دنیا کی زندگی اور گھر اور قرآن پاک میں یہ لفظ اسی معنوں میں ایک سو تیرہ مقام پر آیا ہے، اور ہر جگہ اس کا مخذوف موصوف ﴿حیاة﴾ (زندگی) یا دار (گھر) ہے۔

چنانچہ حسب ذیل آیتوں کے پڑھنے سے یہ حقیقت منکشف ہوگی۔

﴿وَ اِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِیَ الْحَیَوَانُ﴾ (عنکبوت:۶۴)

''اور بے شک آخری گھر اصلی زندگی ہے۔''

﴿وَ لَلدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَیْرٌ﴾ (انعام:۳۲)

---

(۱) قرآن پاک میں جہاں جہاں ایمان کے تفصیلات ذکر کیے گئے ہیں وہاں یوم آخر پر ایمان سب سے آخر میں بیان کیا گیا ہے۔

''اور بے شک آخری گھر بہتر ہے۔''

ان دونوں آیتوں میں (دار) یعنی گھر کا لفظ موجود ہے۔

﴿اَرَضِیتُم بِالحَیٰوۃِ الدُّنیَا مِنَ الاٰخِرَۃِ﴾ (التوبۃ:۳۸)

''کیا پچھلی زندگی کو چھوڑ کر اس موجودہ زندگی پر تم راضی ہو گئے۔''

﴿اَلَّذِینَ کَفَرُوا وَ کَذَّبُوا بِلِقَآءِ الاٰخِرَۃِ وَ اَترَفنٰھُم فِی الحَیٰوۃِ الدُّنیَا﴾ (المؤمنون:۳۳)

''جنہوں نے انکار کیا اور پچھلی زندگی کی ملاقات کو جھٹلایا اور ہم نے موجودہ زندگی میں ان کو نعمت دی۔''

ان آیتوں میں ﴿الحیاۃ الدنیا﴾ یعنی موجودہ دنیا کے تقابل سے ظاہر ہے کہ الاخرۃ سے مراد الحیاۃ الاٰخرۃ یعنی پچھلی زندگی ہے۔ (۱) اور اس لفظ کے عموم میں وہ تمام منازل و مقامات داخل ہیں جو ابتدائے موت سے لے کر حشر و نشر اور اس کے بعد پیش آتے ہیں' یا آئیں گے' چنانچہ احادیثِ صحیحہ سے ثابت ہے کہ اس آیت میں

﴿یُثَبِّتُ اللّٰہُ الَّذِینَ اٰمَنُوا بِالقَولِ الثَّابِتِ فِی الحَیٰوۃِ الدُّنیَا وَ فِی الاٰخِرَۃِ﴾ (ابراہیم:۲۷)

''جو ایمان لائے ان کو اللہ حیات دنیا میں اور آخرت میں اس کی پکی بات (کلمہ توحید) پر مضبوط رکھے گا۔''

---

(۱) دنیا اور آخرت کا یہ تقابل قرآن پاک کی بے شمار آیتوں میں مذکور ہے حضرت عیسیٰ کے متعلق ہے ﴿وَجِیھًا فِی الدُّنیَا وَ الاٰخِرَۃِ﴾ (آل عمران : ۴۵) ''دنیا اور آخرت میں معزز'' سلسلۂ دعا میں ہے۔

﴿رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنیَا حَسَنَۃً وَّ فِی الاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً﴾ (البقرۃ:۲۰۱)

''پروردگار ہم کو دنیا میں نیکی اور آخرت میں نیکی دے۔''

کفار کے بطلان عمل کے ذکر میں ہے:

﴿حَبِطَت اَعمَالُھُم فِی الدُّنیَا وَ الاٰخِرَۃِ﴾ (البقرۃ:۲۱۷)

''ان کے عمل دنیا اور آخرت میں گر گئے۔''

﴿اِنِ استَحَبُّوا الحَیٰوۃِ الدُّنیَا عَلَی الاٰخِرَۃِ﴾ (النحل:۱۰۷)

''انہوں نے دنیا کی زندگی کو آخرت پر ترجیح دی۔''

﴿نَحنُ اَولِیٰٓؤُکُم فِی الحَیٰوۃِ الدُّنیَا وَ فِی الاٰخِرَۃِ﴾ (حم السجدۃ:۳۱)

''ہم ہیں تمہاری قریب کی زندگی اور پچھلی زندگی کے دوست۔''

اور کبھی دنیا کے بجائے ''اولیٰ'' (پہلی زندگی) کا لفظ اختیار کیا گیا ہے فرمایا:

﴿فَاَخَذَ اللّٰہُ نَکَالَ الاٰخِرَۃِ وَ الاُولٰی﴾ (النازعات:۲۵)

''تو خدا نے اس کو پچھلی زندگی اور پہلی زندگی کی سزا بنایا۔

﴿وَ اِنَّ لَنَا الاٰخِرَۃَ وَ الاُولٰی﴾ (الیل:۱۳)

''اور ہمارے ہی لیے ہے پچھلی اور پہلی زندگی۔''

اس آیت میں ''آخرت'' سے مراد ''عالم برزخ'' ہے اور قرائن بھی اسی پر دلالت کرتے ہیں کہ قیامت میں قولِ ثابت پر قائم رہنا کون سی بڑی بات ہوگی' جب کہ ہر چیز اس وقت واضح اور نمایاں ہوگی' اس لیے اس آیت میں ''آخرۃ'' سے مراد عالمِ برزخ کے سوا کچھ اور نہیں ہوسکتا' ایک اور حدیث میں تصریحاً بیان ہے کہ ''قبر'' (یعنی برزخ) آخرت کی منزلوں میں سے سب سے پہلی منزل ہے۔'' (۱)

یومِ آخر اور حیاتِ آخرت پر ایمان اسلام کی نہایت اہم تعلیم ہے' اور قرآن پاک میں ایمان باللہ کے بعد اسی کی اہمیت پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے' کیونکہ موجودہ دنیا کے تمام اعمال اور ان کے نتائج کی اصلی اور دائمی بنیاد اسی آئندہ دنیا کے گھر کی بنیاد پر قائم ہے' اگر یہ بنیاد متزلزل ہو جائے تو اعمالِ انسانی کے نتائج کا ریشہ ریشہ بیخ و بن سے اکھڑ جائے' اسی لیے تمام مذاہب نے کسی نہ کسی رنگ اور کسی نہ کسی اصطلاح میں دوسری زندگی کو متفقاً تسلیم کیا ہے۔

آنحضرت ﷺ کی تعلیم نے اس آئندہ زندگی کو دو دوروں میں تقسیم کیا ہے' ایک موت سے لے کر قیامت تک اور دوسرا قیامت سے لے کر ابد (ہمیشہ) تک' جس میں پھر موت و فنا نہیں' پہلے دور کا نام ''برزخ'' اور دوسرے کا نام ''بعث'' یا حشر و نشر اور قیامت ہے' اور ان سب کے معنی جی اٹھنے' اکٹھے کیے جانے اور کھڑے ہونے کے ہیں' لیکن ان سب سے مقصود ایک ہی حقیقت کی طرف اشارہ ہے اور وہ موجودہ دنیا کے خاتمہ کے بعد دوسری دنیا کی زندگی ہے اور اسی لیے اس دوسری زندگی یا اس عالم کا نام قرآن میں ﴿اَلدَّارُ الْاٰخِرَةِ﴾ اور ﴿عُقْبَى الدَّارِ﴾ وغیرہ ہے جس کے معنی دوسرے یا پچھلے گھر کے ہیں۔

توراۃ و انجیل میں برزخ و قیامت کی تفصیل نیز یہ کہ مرنے کے بعد اور قیامت سے پہلے انسان کی روح کس حالت اور کیفیت میں رہے گی مذکور نہیں ہے' لیکن اسلام میں یہاں بھی گنجلک اور ابہام نہیں' بلکہ اس نے اس کی پوری تفصیل کی ہے اور بتایا ہے کہ موجودہ عالم کے علاوہ عالمِ برزخ اور میدانِ قیامت ہمارے سزاء و جزا کے دو مقام ہیں' شخصی موت کے بعد ہر شخص عالمِ برزخ میں داخل ہو جاتا ہے اور وہاں اس کے معاملات شروع ہو جاتے ہیں' پھر اپنے مقررہ وقت پر جس کو خدا نے اپنی مصلحتوں اور حکمتوں کے لحاظ سے طے کر لیا ہے' سلسلۂ خلق کے خاتمہ پر جب موجودہ دنیا پر عام موت اور فنا طاری ہوگی' دوسری زندگی کی دنیا شروع ہو جائے گی جو تمام تر ہماری پہلی دنیا میں ہمارے اچھے یا برے اعمال کا سراپا عکس' اور ظل ہوگی' چنانچہ سورۂ توبہ کی حسبِ ذیل آیت میں ہمارے ان تینوں دور ہائے حیات کا ذکر ہے۔

﴿سَنُعَذِّبُهُمْ مَّرَّتَيْنِ ثُمَّ يُرَدُّوْنَ اِلٰى عَذَابٍ عَظِيْمٍ﴾ (التوبۃ:۱۰۱)

---

(۱) ابن ماجہ و حاکم بحوالہ کنز العمال جلد ۸ ص ۹۵ حیدر آباد دکن (ترمذی)

''ہم ان کو دو مرتبہ عذاب دیں گے پھر وہ ایک بڑے عذاب کی طرف لوٹائے جائیں گے۔''

عذاب کی یہ تین منزلیں دنیا' برزخ اور قیامت ہیں۔

ان تینوں عالموں میں جو فرق ہے وہ یہ ہے کہ اس موجودہ دنیا میں جسم و مادہ نمایاں اور روح پوشیدہ ہے' اور روح کو جو کچھ مسرت و تکلیف یہاں پہنچتی ہے' وہ صرف اس مادی جسم کے واسطے سے پہنچتی ہے ورنہ درحقیقت اس کی براہِ راست راحت ولذت کا اس مادی دنیا میں کوئی امکان نہیں' دوسرے عالم میں جس کو برزخ کہا گیا ہے' روح نمایاں ہوگی اور جسم چھپ جائے گا وہاں جو راحت و تکلیف پہنچے گی وہ دراصل روح کو پہنچے گی اور جسم اس کی تبعیت میں ضمناً اس سے متاثر ہوگا' لیکن اس تیسرے عالم میں جہاں سے حقیقی اور غیر فانی زندگی شروع ہوتی ہے' روح اور جسم دونوں نمایاں ہوں گے اور دونوں کی لذت و تکلیف کے مظاہر بالکل الگ الگ ہوں گے۔

برزخ

قرآن میں لفظ برزخ اوراس کے معنی

''برزخ'' کالفظ قرآن پاک میں تین دفعہ استعمال ہوا ہے اور ہر جگہ اس سے دو چیزوں کے درمیان کا پردہ' حاجب اور حائل مراد ہے' چنانچہ سورہ رحمان میں دو دریاؤں کا ذکر ہے' جن میں ایک میٹھا اور دوسرا کھاری ہے اور ان کے بیچ میں ایک پردہ حائل ہے جو ان کو آپس میں ملنے نہیں دیتا۔

﴿بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيَانِ﴾ (الرحمٰن:۲۰)

''ان دونوں کے بیچ میں ایک پردہ ہے جس سے ایک دوسرے پر بڑھ کر نہیں جاتا۔''

اسی عجیب وغریب بحری منظر کا ذکر سورۂ فرقان میں ہے اور وہاں بھی یہی لفظ واقع ہے۔

﴿وَ هُوَ الَّذِیْ مَرَجَ الْبَحْرَیْنِ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَ هٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ وَ جَعَلَ بَیْنَهُمَا بَرْزَخًا وَّ حِجْرًا مَّحْجُوْرًا﴾ (فرقان:۵۳)

''اور اسی نے دو دریاؤں کو ملا کے چلایا اور یہ میٹھا اور پیاس بجھاتا ہے اور وہ کھاری کڑوا ہے اور ان کے بیچ میں ایک پردہ اور روکی ہوئی اوٹ بنائی ہے۔''

اسی بنا پر موجودہ زندگی اور آئندہ زندگی کے درمیان جو مقام حائل اور حاجب ہے اس کا نام ''برزخ'' ہے سورۂ مومنون میں نزع کے وقت کے بیان میں ہے کہ

﴿وَ مِنْ وَّ رَآئِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ﴾ (مؤمنون:۱۰۰)

''اور ان مرنے والوں کے پیچھے ایک پردہ ہے اس دن تک جب کہ وہ (قیامت میں) اٹھائے جائیں گے۔''

عربوں بلکہ کل سامی قوموں کے رسم ورواج اور مشاہدات کی بنا پر اسی درمیانی منزل (برزخ) کا نام ''قبر'' ہے خواہ وہ خاک کے اندر ہو' یا قعرِ دریا میں یا کسی درندہ یا پرندہ کے پیٹ میں' اسی لیے فرمایا:

﴿وَ اَنَّ اللّٰهَ یَبْعَثُ مَنْ فِی الْقُبُوْرِ﴾ (حج:۷)

''بے شبہ اللہ ان کو جو قبروں میں ہیں اٹھائے گا۔''

اب ظاہر ہے کہ یہ ''بعث'' صرف انہی مردوں کے لیے مخصوص نہیں جو تودۂ خاک کے اندر دفن ہوں بلکہ ہر میت کے لیے ہے خواہ وہ کسی حالت اور کسی عالم میں ہو' اسی لیے قبر سے مقصود ہر وہ مقام ہے جہاں مرنے کے بعد

جسمِ خاکی نے جگہ حاصل کی۔

موت وحیات کی منزلیں

قرآن پاک میں دوموتوں اور دوحیاتوں کا ذکر ہے' ایک جگہ دوزخیوں کی زبان سے کہا گیا ہے:

﴿رَبَّنَآ اَمَتَّنَا اثْنَتَيْنِ وَ اَحْيَيْتَنَا اثْنَتَيْنِ فَاعْتَرَفْنَا بِذُنُوْبِنَا فَهَلْ اِلٰى خُرُوْجٍ مِّنْ سَبِيْلٍ﴾ (مؤمن:۱۱)

''ہمارے پروردگار تو نے ہم کو دو دفعہ مارا اور دو دفعہ جلایا ہم نے اپنے گناہوں کا اقرار کیا۔ پھر کیا نکلنے کی کوئی راہ ہے۔''

ان دوموتوں اور دوحیاتوں کی تفصیل خود اللہ تعالیٰ نے سورۂ بقرہ میں فرمائی ہے:

﴿كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَ كُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ﴾ (بقرۃ:۲۸)

''کیسے تم اللہ کا انکار کرتے ہو حالانکہ تم پہلے مردہ تھے پھر تم کو اس نے زندہ کیا (انسان بنا کر پیدا کیا) پھر تم کو مار دے گا پھر تم کو جلائے گا' پھر اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔''

پہلی موت تو ہر انسان کی خلقت سے پہلے کی ہے' جب وہ مادہ یا عنصر کی صورت میں تھا' پھر زندہ ہو کر اس دنیا میں پیدا ہوا۔ یہ اس کی پہلی زندگی ہے' پھر موت آئی روح نے مفارقت کی اور جسم اپنی اگلی مادی صورت میں منتقل ہو گیا' یہ دوسری موت ہوئی۔

پھر خدا اس کی روح کو جسم سے ملا کر زندہ کرے گا' یہ اس کی دوسری زندگی ہوئی جس کے بعد پھر موت نہیں۔

قرآن پاک میں خود رسول اللہ ﷺ کو خطاب کر کے فرمایا گیا:

﴿اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّ اِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ ۝ ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عِنْدَ رَبِّكُمْ تَخْتَصِمُوْنَ ۝﴾ (زمر: ۳۰'۳۱)

''بے شک تو بھی مرنے والا ہے اور وہ بھی مرنے والے ہیں پھر تم قیامت کے دن اپنے پروردگار کے سامنے دعویٰ پیش کرو گے۔''

﴿ثُمَّ اِنَّكُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ لَمَيِّتُوْنَ ۝ ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ تُبْعَثُوْنَ ۝﴾ (مؤمنون:۱۵'۱۶)

''پھر تم اس کے بعد مرنے والے ہو' پھر تم قیامت کے دن اٹھائے جاؤ گے۔''

اب سوال یہ ہے کہ برزخ کے عالم میں کیا کیفیت ہوگی' اس کے سمجھنے کے لیے ایک مختصر سی تمہید کی ضرورت ہے۔

نیند اور موت کی مشابہت

اللہ تعالیٰ نے اس مادی دنیا میں روحانی عالم کی باتوں کے سمجھنے کے لیے اپنی عجیب وغریب قدرت سے ہم کو ایک چیز عنایت کی ہے، جس کو ہم نیند کہتے ہیں، روح کو اپنے جسم سے دو قسم کا تعلق ہے، ایک ادراک واحساس کا اور دوسرے تدبیر وتغذیہ کا۔ نیند کا وہ عالم جس میں ہمارے تمام آلاتِ ادراک واحساس اس دنیا سے بے خبر ہو کر اپنے گردوپیش کی مادی دنیا سے یکسر بیگانہ بن جاتے ہیں تاہم ہمارے نفس یا روح کا تعلق ہمارے جسم سے باقی رہتا ہے، اور وہ اس حالت میں بھی جسم کی مادی زندگی، نشوونما اور بقا کی تدبیروں اور دل ودماغ اور دیگر اعضائے رئیسہ کے غذا رسانی اور خون کے دوران میں مصروف رہتی ہے، اسی کا نام روح کا جسم سے تدبیری تعلق ہے۔ اب نیند اور موت میں فرق ہے تو یہ ہے کہ نیند کی حالت میں جسم سے نفس کا تدبیری تعلق قائم رہتا ہے، اس لیے جسم باقی اور زندہ رہتا ہے، لیکن موت کی حالت میں جسم سے روح کا تدبیری تعلق بھی اکثر منقطع ہو جاتا ہے اس لئے جسم کے اجزا کچھ دنوں میں منتشر ہو جاتے ہیں، موت اور نیند کی یہی مشابہت ہے جس کی بنا پر اکثر انسانوں کی زبانوں میں موت کو نیند سے تشبیہ دیتے ہیں اور دنیا بھر کی زبانوں کا یہ توافق الہامِ طبعی کی خبر دیتا ہے، قرآن پاک میں اس حقیقت کو ان الفاظ میں ادا کیا ہے:

﴿وَ هُوَ الَّذِیْ یَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّیْلِ وَ یَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ثُمَّ یَبْعَثُكُمْ فِیْهِ لِیُقْضٰۤى اَجَلٌ مُّسَمًّى﴾ (انعام:۶۰)

''اور وہی ہے جو تم کو رات میں مارتا ہے اور جلاتا ہے اور جانتا ہے جو تم نے دن میں کمایا پھر تم کو دن میں جلاتا ہے، تاکہ مقررہ وقت پورا کیا جائے۔''

اس سے زیادہ تفصیل سورۂ زمر میں ہے:

﴿اَللّٰهُ یَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِهَا وَ الَّتِیْ لَمْ تَمُتْ فِیْ مَنَامِهَا فَیُمْسِكُ الَّتِیْ قَضٰى عَلَیْهَا الْمَوْتَ وَ یُرْسِلُ الْاُخْرٰۤى اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ﴾ (زمر:۴۲)

''وہ اللہ ہی ہے جو روحوں کو ان کی موت کے وقت وفات دیتا ہے، اور جو نہیں مری ہیں ان کو ان کی نیند میں وفات دیتا ہے تو جس پر موت کا حکم اس نے جاری کیا اس کو روک لیتا ہے اور دوسری کو جس پر موت کا حکم نہیں یعنی نیند والی کو ایک مدتِ معینہ کے لیے چھوڑ دیتا ہے بے شک اس میں سوچنے والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔''

یہی وجہ ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی وحی نے ''برزخ'' کی زندگی کو نیند کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ قرآن پاک میں ہے کہ قیامت میں جب لوگ دوسری زندگی پا کر قبروں سے اٹھیں گے تو گنہگاروں کی زبانوں پر یہ فقرہ ہو گا۔

﴿یٰوَیْلَنَا مَنْۢ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا﴾ (یٰسٓ : ۵۲)

''اے ہماری خرابی کس نے ہم کو ہماری نیند کی جگہ سے اٹھا دیا۔''

غزوۂ احد کے موقع پر ہے کہ جن کو مرنا تھا' ان کی موت ٹل نہیں سکتی تھی' اگر وہ میدانِ جنگ کے بجائے گھروں میں بھی ہوتے تو نکل نکل کر اپنے مقتل میں خود آ جاتے۔ اس مفہوم کو قرآن نے یوں ادا کیا ہے:

﴿قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِيْ بُيُوْتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِيْنَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ﴾ (آل عمران: ۱۵۴)

''کہہ دے کہ اگر وہ گھروں میں بھی ہوتے تو جن کے لیے مارا جانا لکھا گیا تھا' وہ خود نکل کر اپنی سونے کی جگہوں میں چلے آتے۔''

اسی لیے قرآن پاک میں دوسری زندگی کے لیے اکثر ''بعث'' لفظ استعمال ہوا ہے' جس کے معنی جگانے اور بیدار کرنے کے بھی ہیں' [1] جیسا کہ اوپر کی اس آیت میں ہے:

﴿وَ هُوَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰكُمْ بِالَّيْلِ وَ يَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ فِيْهِ﴾ (انعام: ۶۰)

''اور وہی ہے جو تم کو رات میں موت دیتا ہے' اور دن کو جو تم کرتے ہو اس کو جانتا ہے' پھر تم کو دن میں جگاتا ہے۔''

﴿وَ اَنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ مَنْ فِي الْقُبُوْرِ﴾ (حج: ۷)

''اور بے شک اللہ ان کو جو قبروں میں ہیں' جگائے گا۔''

احادیث میں ہے کہ قبر میں سوال و جواب کے بعد نکوکاروں سے کہا جاتا ہے کہ ﴿نم كنوم العروس﴾ دلہن کی نیند سو جاؤ جس کو وہی جگاتا ہے' جو اس کو سب سے زیادہ محبوب ہے' یہاں تک کہ خدا اس کو اس خواب سے اٹھائے گا۔ [2]

ان شواہد سے ظاہر ہے کہ برزخ کی زندگی جس میں روح جسم سے الگ ہوتی ہے روح کی ایک طویل و عمیق نیند کے مشابہ ہے۔ [3]

خواب میں لذت و الم

انسان جب سوتا ہے تو اس کے ادراک و احساس کے آلات اپنی مادی دنیا سے عارضی طور پر بے خبر ہو جاتے

---

(۱) صحیح بخاری (باب تہجد) میں ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت ﷺ نے حضرت علیؓ سے نماز تہجد کے لیے اس وقت تک بیدار نہ ہونے پر سوال فرمایا' تو حضرت ممدوح نے ان لفظوں میں معذرت پیش کی یا رسول الله انفسنا بيد الله فاذا شاء ان يبعثنا۔ ہماری روحیں خدا کے ہاتھ میں ہیں' وہ جب جگانا چاہتا ہے جگاتا ہے اس حدیث میں بھی بعث جگانے کے معنوں میں آیا ہے۔

(۲) جامع ترمذی کتاب الجنائز باب عذاب القبر ص۔۱۸ حدیث حسن غریب۔

(۳) شاہ ولی اللہ صاحب حجۃ اللہ البالغہ میں لکھتے ہیں فهذا المبتلى فى الرؤيا غير انه رؤيا لا يقظه منها الى يوم القيمة (باب اختلاف احوال الناس فی البرزخ) یعنی یہ عذاب قبر کا گرفتار خواب میں ہے لیکن یہ کہ یہ ایسا خواب ہے جس سے قیامت تک جاگنا نہیں ہے۔

ہیں، مگر اس کے ادراک واحساس کی تخیلی، تمثالی، یا ذہنی دنیا اس کے سامنے بالکل اسی مادی دنیا کی طرح متشکل ہو جاتی ہے۔ اس میں وہ خود اپنے جسم سے الگ مگر ہو بہو وہی جسم دیکھتا ہے جو آتا جاتا، چلتا پھرتا اور دیکھتا سنتا ہے، سب کچھ ہے۔ اس کے سامنے کھانے پینے اور لطف انگیزی کے سب سامان ہوتے ہیں، نیز اس میں درد ورنج اور تکلیف کی تمام وہی صورتیں ہوتی ہیں، جو مادی دنیا میں ہیں۔ اس کے خیالی جسم کو اگر اس عالم میں تکلیف ہوتی ہے تو وہ خود چیخ اٹھتا ہے، اور اگر اس میں لذت ملتی ہے، تو لطف اندوز ہوتا ہے اور ان دونوں کے اثرات اس کو اپنے مادی جسم میں جاگنے کے بعد بھی نظر آتے ہیں۔ غرض عالم خواب کی خیالی دنیا اور اس کی شادی ورنج اور لذت والم، اور اس مادی دنیا کے جسمانی و مادی شادی ورنج اور لذت والم میں کوئی فرق نہیں ہوتا اگر کچھ فرق ہے تو یہ ہے کہ عالم خواب کی لذت وتکلیف بیداری کے بعد ختم ہو جاتی ہے اور مادی دنیا کی لذت وتکلیف، احساس وادارک کے وجود تک قائم رہتی ہے اور جس طرح مادی بیداری والی لذت وتکلیف خواب میں معدوم ہو جاتی ہے اسی طرح خواب والی لذت، وتکلیف بیداری میں رخصت ہو جاتی ہے۔

خواب والے لذائذ وآلام کے مختلف مناظر اور ان کے حقایق اور اسباب وعلل پر اگر فلسفیانہ حیثیت سے غور کیا جائے تو عجیب وغریب معاملات سامنے آتے ہیں، کبھی تو یہ ہوتا ہے کہ وہ تمام احساسات ومعلومات جو کبھی بھی ذہنِ انسانی میں آئے ہوں اور ان کو بحالتِ بیداری مادی دنیا کے مشاغل اور زمانہ کے امتداد کے سبب سے انسان کتنا ہی فراموش کر چکا ہو، وہ خواب میں مادی گراں باری سے آزادی کے بعد سامنے مجسم شکلوں میں نمودار ہو جاتے ہیں، اور بیچ کی کڑیوں کے بھول جانے کی وجہ سے وہ اس کو بے جوڑ معلوم ہوتے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ جن چیزوں کو انسان بھول جاتا ہے وہ اس کے حافظہ سے حقیقت میں معدوم نہیں ہو جاتیں، بلکہ دماغی حجرہ (ذہن) کے منتشر اسباب کے ذخیرہ (معلومات) میں چھپ کر گم ہو جاتی ہیں، اور پھر بعد کو مل جاتی ہیں اس لیے وہ تمام اچھے اور برے اعمال جو انسان نے عمر بھر کیے ہیں خواہ وہ ان کو آج بھول گیا ہو مگر ان کی یاد ذہن کے گوشوں میں پڑی ہے، معدوم ومفقود نہیں ہو گئی۔

خواب کی عجیب وغریب صورت وہ ہے، جس کو تمثیلی کہتے ہیں، جیسے حضرت ابراہیمؑ نے اپنے اکلوتے فرزند کے خدمتِ کعبہ پر وقف کرنے کو قربانی کی شکل میں، اور حضرت یوسفؑ نے والدین کو سورج اور چاند اور گیارہ بھائیوں کو گیارہ ستاروں کی صورت میں دیکھا، شاہِ مصر کے سولی پانے والے مصاحب نے اپنے سولی پانے کو اس رنگ میں دیکھا کہ اس کے سر پر خوان ہے اور بڑے بڑے پرندے اس میں چونچ مار مار کر کھاتے ہیں، شاہِ مصر نے مصر کی ہفت سالہ قحط سالی کو سات دبلی گایوں کی صورت میں دیکھا۔ (۱) آنحضرت ﷺ نے فتح مکہ کو اس شکل میں دیکھا کہ مسلمان سر منڈوائے اور بال ترشوائے حج کر رہے ہیں، مسیلمہ اور اسود عنسی دو کذابوں کو سونے کے دو کنگنوں کی صورت میں دیکھا، شہدائے احد کو موٹی گائے کی صورت میں ملاحظہ کیا، مدینہ کی وباء ایک پریشان مو،

(۱) یہ کل تمثیلی خواب قرآن پاک میں مذکور ہیں۔

کالی عورت کی صورت میں نظر آئی' خلافت کو ڈول کھینچنے کی اور حضرت عمرؓ کے علم کو دودھ کی اور ان کی دینداری کو لمبی قمیص کی شکل میں دیکھا'[1] ان کے علاوہ ہر شخص کے ذاتی تجربوں سے بھی اس کی بے شمار مثالیں فراہم کی جاسکتی ہیں۔

اس سے بڑھ کر یہ کہ انسان کے جسم میں اگر کسی قسم کا مادہ بڑھ جاتا ہے تو خواب میں اس کے مناسب مجسم شکلیں نظر آتی ہیں' مثلاً اگر بلغم کی زیادتی ہو تو پانی' دریا اور سمندر نظر آئیں گے' اگر سودا بڑھ جائے تو ہاتھی اور کالی کالی صورتیں نظر آئیں گی' اسی طرح دوسرے تغیرات خلطی بھی اپنے مناسب جسمانی ہیئت میں خواب میں مجسم اور متشکل ہو کر دکھائی دیتے ہیں۔[2]

اسی طرح اعمال جو جسم و مادہ سے بالکل الگ ہیں خواب میں اپنے مناسب قالب میں مجسم ہو جاتے ہیں' اگر کسی بھائی کا حقِ واجب کسی نے ادا نہیں کیا تو خواب میں اس کو نظر آئے گا کہ وہ اس کا گلا کاٹ رہا ہے' اگر کسی کی غیبت کی ہے تو معلوم ہوگا کہ وہ مردار کھا رہا ہے' سونے چاندی کے خزانوں کو جمع کر کے اگر بخل کا اژدہا ان کی حفاظت میں بٹھایا ہے تو سانپ بن کر وہ اس کی گردن میں لپٹتا اور کاٹتا ہے' ذلت اور خواری کتے کی' حماقت گدھے کی اور شجاعت شیر کی شکل میں نمودار ہوتی ہے' شبِ معراج میں آنحضرت ﷺ کے سامنے فطرت دودھ کی اور غیر فطرت شراب کی شکل میں پیش ہوئی' اسی طرح کہن سال دنیا ایک بڑھیا کی شکل میں نظر آئی۔

اسی قسم کی تمثیلات قرآن مجید میں بھی آئی ہیں' مثلاً غیبت کی نسبت فرمایا:

﴿وَ لَا یَغْتَبْ بَعْضُكُمْ بَعْضًا اَیُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ یَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِیْهِ مَیْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ﴾

(حجرات:۱۲)

''اور پیٹھ پیچھے ایک دوسرے کو برا نہ کہے کیا تم میں سے کوئی پسند کرسکتا ہے کہ وہ اپنے مردہ بھائی کی بوٹی نوچ نوچ کر کھائے سو گھن آئی تم کو۔''

سود کھانے کو جنون اور پاگل پن کی شکل میں ظاہر کیا:

﴿اَلَّذِیْنَ یَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا یَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا یَقُوْمُ الَّذِیْ یَتَخَبَّطُهُ الشَّیْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ﴾

(بقرہ:۲۷۵)

''جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ نہیں اٹھیں گے (یا نہیں اٹھتے) لیکن جیسے وہ اٹھتا ہے جس کے حواس شیطان نے چھو کر کھو دیے ہوں۔''

یتیموں کا مال ناجائز طریق سے کھانے کو پیٹ میں آگ بھرنا فرمایا:

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْیَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا یَاْكُلُوْنَ فِیْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا وَّ سَیَصْلَوْنَ

---

(۱) ان خوابوں کو صحیح بخاری کتاب التعبیر میں دیکھو۔

(۲) حجۃ اللہ البالغہ شاہ ولی اللہ ذکر برزخ۔

سَعِیْرًا﴾ (نساء:۱۰)

''وہ لوگ جو یتیموں کا مال ظلم کر کے کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹوں میں آگ بھرتے ہیں اور جہنم کی آگ میں داخل ہوں گے۔''

وہ خود غرض لوگ جو بیکسوں کے کام نہیں آتے' قیامت میں ان کے بھی کوئی کام نہ آئے گا اور جو خود سیر ہو کر کھاتے ہیں اور غریبوں کے دردِ گرسنگی سے بے خبر رہ کر اپنے مال کا میل کچیل (زکوٰۃ) بھی ان کو کھانے کو نہیں دیتے' دوزخ میں ان کو زخموں کا دھوون کھانے کو ملے گا' فرمایا:

﴿اِنَّهٗ كَانَ لَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ الْعَظِيْمِ ○ وَّ لَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ○ فَلَيْسَ لَهُ الْيَوْمَ هٰهُنَا حَمِيْمٌ ○ وَّ لَا طَعَامٌ اِلَّا مِنْ غِسْلِيْنٍ ○ لَّا يَاْكُلُهٗۤ اِلَّا الْخَاطِئُوْنَ○﴾ (حاقہ ۳۳'۳۷:)

''بے شک وہ اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں رکھتا تھا' اور مسکین کے کھانے پر آمادہ نہیں کرتا تھا تو آج اس کا بھی یہاں کوئی دوست نہیں اور نہ زخموں کے دھوون کے سوا کوئی کھانا ہے' اس کو وہی گنہگار کھائیں گے۔''

بے لوث مخلصانہ فیاضی کی تمثیل سرسبز و شاداب باغ سے دی:

﴿وَ مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَ تَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍۭ بِرَبْوَةٍ﴾ (بقرہ:۲۶۵)

''اور ان کی مثال جو اپنی دولت خدا کی خوشنودی چاہنے اور اپنے دلوں کی مضبوطی کے لیے خرچ کرتے ہیں ایک باغ کی ہے جو ایک ٹیلہ پر ہے۔''

خدا کی راہ میں جان دینے والوں اور مرنے والوں کو جانِ نو' اور حیاتِ جاوداں کی خوش خبری دی گئی' فرمایا:

﴿وَ لَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْيَآءٌ﴾ (البقرۃ:۱۵۴)

''جو خدا کی راہ میں مارا جائے' اس کو مردہ نہ کہو' وہ لوگ زندہ ہیں۔''

اسی طرح یہ ہے کہ جو خدا کو قرض دے گا' خدا اس کو بڑھا کر دے گا جو دوسروں کو معاف کرے گا خدا اس کو معاف کرے گا جو دوسروں کی عیب پوشی کرے گا خدا اس کی ستاری کرے گا' قرآن و احادیث اس قسم کی بالمعاوضہ جزا و سزا کے ذکر سے لبریز ہیں۔

جو لوگ راہ خدا میں اپنا مال نہیں دیتے' ان کی نسبت فرمایا۔

﴿سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ﴾ (آل عمران:۱۸۰)

''جس مال کا بخل کیا تھا' قیامت میں اس کا ان کے گلے میں طوق پڑے گا۔''

﴿يَوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَ جُنُوْبُهُمْ وَ ظُهُوْرُهُمْ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ﴾ (توبہ:۳۵)

''جس دن اس سونے اور چاندی کو دوزخ کی آگ میں گرم کیا جائے گا' پھر ان سے ان کی پیشانیاں اور پہلو اور پیٹھیں داغی جائیں گی کہ یہ ہے جو تم نے اپنے لیے گاڑ رکھا تھا تو اب تم اس کا مزہ چکھو جس کو تم گاڑ کر رکھتے تھے۔''

دنیا میں اللہ کے نورِ بصیرت سے روگردانی آخرت میں ظاہری نابینائی کی صورت میں رونما ہوگی اور اسی طرح جو خدا کو یہاں بھولے گا خدا اس کو وہاں بھلائے گا' چنانچہ حضرت آدمؑ سے جنت سے نکلتے وقت یہ فرمایا گیا تھا:

﴿وَ مَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِیْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِیْشَةً ضَنْكًا وَّ نَحْشُرُهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اَعْمٰى ○ قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِیْۤ اَعْمٰى وَ قَدْ كُنْتُ بَصِیْرًا ○ قَالَ كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰیٰتُنَا فَنَسِیْتَهَا وَ كَذٰلِكَ الْیَوْمَ تُنْسٰى ○﴾ (طٰہٰ:۱۲۴'۱۲۶)

''اور جس نے میری یاد سے روگردانی کی تو اس کے لیے تنگ گذران ہے اور ہم قیامت کے دن اس کو اندھا اٹھائیں گے وہ کہے گا میرے پروردگار تو نے مجھے اندھا بنا کر کیوں اٹھایا میں تو دنیا میں آنکھوں والا تھا' خدا کہے گا اسی طرح تیرے پاس ہماری نشانیاں آتی رہیں تو ان کو تو نے بھلا دیا اور اسی طرح آج تو بھلایا جائے گا۔''

یہی مفہوم اور زیادہ اختصار کے ساتھ اس آیت میں ہے:

﴿وَ مَنْ كَانَ فِیْ هٰذِهٖۤ اَعْمٰى فَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَ اَضَلُّ سَبِیْلًا﴾ (بنی اسرائیل:۷۲)

''جو کوئی دنیا میں (دل کا) اندھا تھا وہ آخرت میں اندھا ہے اور راستہ سے بہت بھٹکا ہوا۔''

اس باب میں سب سے زیادہ صریح وہ حدیث صحیح ہے جس میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ بخیل کا مال سانپ کی صورت میں گلے کا ہار ہو کر نظر آئے گا' یعنی وہ مال سونے اور چاندی کے سانپ کی صورت میں ہوگا۔

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ اٰتَاهُ اللّٰهُ مَالًا فَلَمْ یُؤَدِّ زَكَاتَهٗ مُثِّلَ لَهٗ مَالُهٗ شُجَاعًا اَقْرَعَ لَهٗ زَبِیْبَتَانِ یُطَوَّقُهٗ یَوْمَ الْقِیَامَةِ یَاْخُذُ بِلِهْزِمَتَیْهِ اَیْ لِشِدْقَیْهِ یَقُوْلُ اَنَا مَالُكَ اَنَا كَنْزُكَ. (بخاری تفسیر آل عمران ج۲ ص۵۵)

''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس کو اللہ نے مال دیا اور اس نے اس کی زکوٰۃ ادا نہیں کی تو اس کا مال اس کو اچھل کر ڈسنے والے سانپ کی صورت میں دکھایا جائے گا' جس کا سر زہر کی شدت سے گنجا ہوگا اور اس کے منہ میں دو دانت ہوں گے' وہ اس کے گلے میں قیامت کے دن پڑا ہوگا' اور وہ اس کے دونوں جبڑوں کو کاٹے اور کہے گا میں ہوں تیرا مال میں ہوں تیرا خزانہ۔''

اسی طرح دو حدیثیں ہیں جن میں مختلف اعمال کا مختلف شکلوں میں آنا بیان کیا گیا ہے' مثلاً یہ کہ مرنے کے

بعد قبر میں نماز روزہ وغیرہ اعمال' عذاب سے بچنے کے لیے ڈھال بن کر داہنے بائیں سے نمودار ہوں گے'(۱) یہ بھی حدیث میں ہے کہ مرنے کے بعد جب ایک دفعہ فرشتۂ الٰہی مردہ کو بیدار کرتا ہے تو اس کو آفتاب ڈوبتا ہوا دکھایا جاتا ہے مُثِّلَتَ الشَّمْسُ عِنْدَ غُرُوْبِهَا۔ نیک مرد مسلمان اس تنگ وقت کو دیکھ کر نماز کی تیاری کرنا چاہتا ہے۔(۲) یہ ظاہر ہے کہ یہ دنیا والا آفتاب وہاں نہیں بلکہ اس کی تمثیل ہوئی ہے جیسا کہ حدیث کے الفاظ میں ہے یعنی یہ کہ اس مردہ کو ایسا نظر آتا ہے' اور وہ درحقیقت آفتاب نہیں بلکہ آفتاب کی مثالی صورت ہوئی ہے۔

گناہوں کی تمثیلی سزائیں

اوپر کے بیانات سے ہویدا ہے کہ غیر مجسم اعمال اور معانی اپنے جن تمثیلی پیکروں میں نظر آتے ہیں۔ وہ درحقیقت ان اعمال و معانی سے تمثیلی مشابہت رکھتے ہیں' مثلاً ایک صحیح حدیث میں ہے کہ مشہور صحابی حضرت عثمان بن مظعونؓ کی وفات کے بعد ایک صحابی نے خواب میں دیکھا کہ ان کے لیے ایک نہر بہہ رہی ہے اور جب اس کا ذکر آنحضرت ﷺ سے کیا تو آپؐ نے اس کی تعبیر میں فرمایا:

((ذٰلِکَ عَمَلُهٗ)) (بخاری کتاب التعبیر)

''یہ نہر ان کا (نیک) عمل ہے۔''

اس تمہید کے بعد آنحضرت ﷺ کے اس رؤیائے صادقہ پر غور کرو' جو ظاہر ہے کہ قیامت کا نہیں کہ ابھی وہ آئی نہیں' بلکہ برزخ ہی کا مرقع پیش کرتا ہے' جواب بھی قائم ہے' آپؐ نے ایک صبح کو فرمایا کہ رات میں نے دیکھا کہ دو آنے والے آئے اور انہوں نے مجھے جگا دیا میں ان کے ساتھ چل کھڑا ہوا تو میں نے دیکھا کہ ایک آدمی لیٹا ہے اور دوسرا اس کے سر پر ایک بڑا پتھر لیے کھڑا ہے اور وہ اس پتھر کو اس کے سر پر اس طرح دے مارتا ہے کہ اس کا سر چکنا چور ہو جاتا ہے' اور پتھر لڑھکنے لگتا ہے وہ اس کے پیچھے جا کر اس کو اٹھا لاتا ہے اور اتنی دیر میں اس کا سر درست ہو جاتا ہے' اور پھر وہ مارتا ہے اور پھر وہی صورت پیش آتی ہے' ہم آگے بڑھے تو دیکھا کہ (۲) ایک شخص اوندھا پڑا ہے اور دوسرا لوہے کا ایک آنکس لیے کھڑا ہے اور وہ اس سے اس کے جبڑے کو پھر نتھنے کو پھر آنکھوں کو گدی تک چیر ڈالتا ہے' پہلے ایک طرف بعد ازیں دوسری طرف پھر آگے بڑھے تو دیکھا کہ (۳) تنور کی قسم کی ایک چیز دہک رہی ہے اور کچھ مرد اور عورت اس میں ننگے پڑے ہیں' اور اس کے شعلے بھڑک بھڑک کر ان تک پہنچتے ہیں' اور چیختے ہیں' آگے بڑھے تو نظر آیا کہ (۴) ایک خون کی جیسی سرخ نہر بہہ رہی ہے اور ایک آدمی اس میں تیر رہا ہے نہر کے کنارے ایک آدمی کھڑا ہے جس کے پاس بہت سے پتھر رکھے ہیں' وہ تیرنے والا آدمی تیر کر جب اس شخص کے قریب آتا ہے تو یہ ایک پتھر اٹھا کر اس زور سے مارتا ہے کہ وہ پتھر اس کے منہ میں جا کر پیٹ میں اتر جاتا ہے۔

---

(۱) ابن حنبل۔

(۲) سنن ماجہ ذکر القبر ص ۳۶۶۔

اس کے بعد ہم آگے بڑھے تو ایک سرسبز وشاداب چمن نظر آیا' جس میں بہار کی ہر کلی کھل رہی تھی' باغ کے سامنے ایک دراز قد آدمی کو دیکھا جس کا سر آسمان میں تھا اور اس کے چاروں طرف بہت سے چھوٹے چھوٹے بچے تھے آگے بڑھے تو ایک بہت بڑا باغ دیکھا' جس سے زیادہ خوب صورت باغ میں نے نہیں دیکھا تھا' یہاں پہنچ کر اپنے دونوں ہمراہیوں کے کہنے سے اوپر چڑھا تو ایک شہر ملا جس کی دیوار میں سونے کی ایک ایک اور چاندی کی ایک ایک اینٹ لگی تھی' ہم لوگ دروازہ کے پھاٹک پر پہنچے' دروازہ کھلوایا' دروازہ کھلا تو اس کے اندر گھسے' تو اس میں کچھ لوگ ملے جن کا آدھا دھڑ نہایت ہی خوب صورت اور آدھا بہت ہی بدصورت تھا' میرے ہمراہیوں نے ان سے ایک نہر کی طرف جو بیچ میں نہایت صاف وشفاف بہہ رہی تھی اشارہ کر کے کہا کہ اس میں جا کر غوطہ لگا کر آؤ۔ وہ جب اس میں غوطہ لگا کر آئے تو ان کی بدصورتی کا حصہ جاتا رہا اور وہ پورے دھڑ سے خوب صورت ہو گئے' میرے ہمراہیوں نے مجھ سے کہا کہ یہ جنت عدن ہے اور وہ آپؐ کا دولت خانہ ہے میں نے نظر اٹھا کر دیکھا' سپید ملۂ ابر کی طرح ایک محل دکھائی دیا۔

پھر میں نے ان ہمراہیوں سے کہا کہ آج تو میں نے عجیب عجیب چیزیں دیکھیں' تو بتاؤ میں نے کیا کیا دیکھا' انہوں نے جواب دیا کہ پہلا شخص جس کا سر پتھر سے کچلا جا رہا تھا' وہ ہے جو قرآن پڑھ کر اس کی تعمیل سے انکار کرتا ہے اور صبح کی مفروضہ نماز سے غافل ہو کر سو رہتا ہے اور دوسرا شخص جس کے گلپھڑے اور نتھنے اور آنکھیں پھاڑی جاتی تھیں' وہ ہے جو جھوٹ بول کر تمام دنیا میں اس کو پھیلاتا ہے اور تنور میں جو مرد اور عورتیں ننگی جل رہی تھیں وہ بدکار مرد اور عورتیں ہیں اور جو شخص خون کی نہر میں تیر رہا تھا' اور منہ سے پتھر نگلتا تھا وہ سود خوار ہے' اور اس سدا بہار چمن میں جو دراز قد آدمی آپ نے دیکھا وہ ابراہیمؑ تھے اور ان کے گرد جو بچے تھے' وہ ننھے اور کم سن بچے تھے جو فطرت پر مرتے تھے' کسی صحابی نے پوچھا یا رسول اللہ! مشرکوں کے بچے؟ فرمایا اور مشرکوں کے بچے بھی' وہ لوگ جن کا آدھا دھڑ خوب صورت اور آدھا بدصورت تھا وہ ہیں جنہوں نے کچھ کام اچھے بھی کیے تھے' تو خدا نے ان کے گناہ دھو دیے۔ (۱)

برزخ کی ان تمام سزاؤں پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ ان کی نوعیت اور کیفیت ان کے اعمال کے بالکل مناسب اور مشابہ قرار دی گئی ہے' نمازِ صبح سے غافل ہو کر' بالینِ راحت سے سر نہ اٹھانے والے کا سر کچلا جانا' جھوٹے کا گلپھڑا پھاڑا جانا' زانی اور زانیہ کا برہنہ تنور کی آگ میں جلنا' خون چوسنے والے سود خوار کا انسانوں کے خون کے دریا میں تیرنا' اپنا دو بالشت کا پیٹ بھرنے کے لیے سارے غریبوں کی روزی چھین چھین کر جمع کرنے والے کا پتھر کے لقمے کھانا' سراسر ان کے دنیاوی اعمال کی تمثیل وتصویر ہے اور آخر میں نصف حسنِ عمل سے آدھے دھڑ کی خوب صورتی اور نصف سوءِ عمل سے آدھے دھڑ کی بدصورتی پوری مشابہ ہے' اور صاف وشفاف نہر کی صورت

(۱) صحیح بخاری کتاب التعبیر ملخصاً۔

میں رحمت ومغفرتِ الٰہی کا ظہور بھی اسی قیاس پر ہے۔ (۱)

علم النفس سے انسان کی لاعلمی

ابھی تک دنیا نے جو کچھ ترقی کی ہے وہ نفس سے باہر ''آفاقی'' (یعنی اپنے سے باہر کی بیرونی مادی) دنیا کی اشیا کے خواص وصفات کے جاننے میں کی ہے جن سے سائنس کی ایجادات واختراعات کا تعلق ہے لیکن ابھی اس سے بھی زیادہ ایک وسیع دنیا اپنے اندر کی پڑی ہے' جس کو قرآن نے انفس کہا ہے ان انفس یا ارواح کے اوصاف و خصائص کا ابھی تک بہت کم علم ہوا ہے ہماری سائیکالوجی (علم النفس) ابھی اپنی ابتدائی منزل میں ہے' اور سپر یچولزم (علمِ ارواح) ابھی طلسم وفریب کے عجائبات میں اسی طرح گرفتار ہے جس طرح موجودہ عہد سے پہلے آج کے معمولی سائنٹیفک تجربے سحر وجادو کے نقش ونگار بنے ہوئے تھے' بہرحال ابھی تک علمِ نفس وروح کے عجائبات پر پردے پڑے ہوئے ہیں' ایک یہی مسئلہ کہ شے کے یقین اور اس کے خارجی وجود میں کیا تعلق ہے؟ ایک معما ہے' بہت سے ہندو اہلِ فلسفہ اور بعض مسلمان صوفیوں اور موجودہ زمانہ کے مشہور فلاسفر برکلے کے نزدیک تو کسی شے کے یقین اور وجود یا یوں کہو کہ ذہنی اور خارجی وجود میں بہت کم فرق ہے' بلکہ گویا نہیں ہے۔

بہرحال نفسِ انسانی کے اندرونی قویٰ کا علم گو ابھی بہت کچھ محتاجِ تکمیل ہے' تاہم اتنا ثابت ہے کہ کسی شے کے تصوری یقین' اور خارجی وجود میں بہت ہی شدید تعلق ہے' مسمریزم نے جو سراسر اسی اصول پر مبنی ہے' اس حقیقت کو کسی قدر واضح کر دیا ہے اسی سے معلوم ہوگا کہ مذاہب نے سب سے زیادہ ایمان پر جو یقین ہی کا دوسرا نام ہے۔ اس قدر زور بے سبب نہیں دیا ہے۔

قرآن میں یقین کی دو قسمیں

قرآن پاک نے یقین کی دو قسمیں کی ہیں' علم الیقین اور عین الیقین کسی شے کی دلیلوں کو سن کر یا بعض علامتوں کو دیکھ کر اس کے وجود کا اقرار کر لو' تو یہ علم الیقین (یقین جاننا) ہے اور اگر وہ شے خود تمہارے احساس اور مشاہدہ کے سامنے آ جائے۔ جس میں پھر شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہو سکتی تو وہ عین الیقین (خود یقین) ہے قرآن پاک نے یقین کی ان دونوں صورتوں کو سورۂ تکاثر میں بیان کیا ہے:

﴿اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ ○ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ○ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ○ ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ○ كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ ○ لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ ○ ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِيْنِ ○﴾ (تکاثر: ۱'۷)

''تم کو دولت ونعمت کی بہتات نے غفلت میں مبتلا کر دیا' یہاں تک کہ تم نے قبروں کو جا دیکھا' ابھی نہیں تم آگے جان لوگے' پھر ابھی نہیں تم آگے جان لوگے' ہرگز نہیں' اگر تم یقین کا جاننا جانتے تو البتہ دوزخ کو

(۱) حجۃ اللہ البالغہ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ ذکر واقعات حشر۔

دیکھ لیتے پھر البتہ عین الیقین سے اس کو دیکھ لو گے۔''

بنا بریں اگر انسان اپنے اندر علم الیقین حاصل کر لے تو جو کمال ایمان کا اعلیٰ درجہ ہے تو وہ اپنے باطن کی آنکھوں سے اپنی دوزخ یہیں دیکھ لے۔

﴿كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ ○ لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ ○﴾ (تکاثر:۵۔۶)

''نہیں یہ بات نہیں اگر تم کو علم یقین ہو تو دوزخ کو بے شبہ دیکھ لو گے۔''

کفار آنحضرت ﷺ سے عذاب کے عینی مشاہدہ کا فوری مطالبہ کرتے تھے' وحی الٰہی نے اس کے جواب میں کہا:

﴿يَسْتَعْجِلُوْنَکَ بِالْعَذَابِ وَ اِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌ بِالْكٰفِرِيْنَ﴾ (عنکبوت:۵۴)

''وہ تجھ سے جلد عذاب مانگتے ہیں حالانکہ دوزخ گھیر رہی ہے منکروں کو۔''

ایک دوسری آیت میں ہے کہ منافقین بزعمِ خود آزمائش کے ڈر سے جہاد کی شرکت سے عذر کرتے ہیں' اس کے جواب میں ان سے فرمایا گیا کہ وہ تو ابھی آزمائش میں مبتلا ہیں' اور دوزخ ان کو گھیرے ہوئے ہے۔

﴿وَ مِنْهُمْ مَنْ يَّقُوْلُ ائْذَنْ لِّیْ وَ لَا تَفْتِنِّیْ اَلَا فِی الْفِتْنَةِ سَقَطُوْا وَ اِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌ بِالْكٰفِرِيْنَ﴾ (توبہ:۴۹)

''اور ان کا کوئی ایسا ہے جو کہتا ہے کہ مجھے (جہاد میں عدم شرکت کی) اجازت دیجئے اور آزمائش میں نہ ڈالیے' ہاں وہ تو آزمائش میں پڑ چکے اور دوزخ منکروں کو گھیر رہی ہے۔''

لیکن یہ علم الیقین جس کے حصول کا ذریعہ صرف ایمان ہے ہر شخص اس سے اس دنیا میں بہرہ ور نہیں ہوتا' بلکہ بہتیرے اس کے منکر ہیں اس لیے ان کو یہ اپنے پاس کی دوزخ اس وقت نظر نہیں آتی' لیکن موت جس کا آنا ایک دن یقینی ہے جب وہ آئے گی تو مادہ کا یہ حجاب جو آنکھوں پر پڑا ہے اٹھ جائے گا اس وقت اس عالم غیب کے کچھ اسرار ان پر منکشف ہو جائیں گے اور اعمال کے تمثیلی نتائج اور ثواب و عذاب اور جنت و دوزخ کے بعض مناظر ان کے سامنے آ جائیں گے' اور اسی وقت وہ اپنے یقین کی آنکھوں سے کسی قدر واقعات کا مشاہدہ کر لیں گے۔

﴿ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِيْنِ﴾ (تکاثر:۷)

''پھر تم دوزخ کو عینِ یقین سے دیکھ لو گے۔''

یہ موت کے بعد کا سماں ہوگا' جس کو برزخ کا عالم کہتے ہیں اس کے بعد جب قیامت آئے گی تو ہر راز فاش ہو جائے گا۔

﴿يَوْمَ تُبْلَى السَّرَآئِرُ﴾ (الطارق:۹)

''جس دن تمام بھید کھل جائیں گے۔''

اور بہشت و دوزخ اپنی ظاہری صورتوں میں اس طرح سامنے آ جائیں گی کہ پھر شک و شبہ کا شائبہ بھی باقی نہ

رہے گا۔ وہ علمِ حقیقی اور یقینِ تحقیقی کا دن ہوگا' قرآن میں قیامت کے موقع پر ہے:

﴿وَ نُفِخَ فِی الصُّوْرِ ذٰلِکَ یَوْمُ الْوَعِیْدِ ○ ..... فَکَشَفْنَا عَنْکَ غِطَآءَ کَ فَبَصَرُکَ الْیَوْمَ حَدِیْدٌ ○﴾ (ق:۲۰و۲۲)

''اور نرسنگار پھونکا گیا یہ ہے ڈر کا دن .....تو ہم نے تیرا پردہ تجھ سے کھول دیا تو آج تیری نگاہ تیز ہے۔''

اس پردہ کے ہٹتے ہی اس دن انسان کے تمام اعمال ایک ایک کر کے اس کے سامنے آ جائیں گے اور دوزخ منظرِ عام پر آ جائے گی' فرمایا:

﴿فَاِذَا جَآءَ تِ الطَّآمَّةُ الْکُبْرٰی ○ یَوْمَ یَتَذَکَّرُ الْاِنْسَانُ مَا سَعٰی ○ وَ بُرِّزَتِ الْجَحِیْمُ لِمَنْ یَّرٰی ○﴾ (النازعات:۳۴'۳۶)

''جب وہ بڑا ہنگامہ آئے گا جس دن انسان کو جو کچھ اس نے کیا ہے یاد آ جائے گا اور دوزخ دیکھنے والے کے سامنے باہر لائی جائے گی۔''

احوالِ برزخ کا عین الیقین

ایک طرف شاعر (ابوالعتاہیہ) نے حیرت کے عالم میں کیا خوب کہا ہے:

اَلْمَوْتُ بَابٌ وَ کُلُّ النَّاسُ یَدْخَلَهٗ

یَلَیْتَ شَعَرِیْ بَعْدَ الْبَابِ مَاالدَّارُ.

''موت کا ایک دروازہ ہے اور تمام انسان اس دروازہ میں داخل ہوں گے کاش مجھے معلوم ہوتا کہ اس دروازہ کے بعد کون سا گھر ہے۔''

یہ علم جس کی حسرت شاعر نے کی ہے اس زندگی میں صرف علم الیقین سے حاصل ہو سکتا ہے البتہ موت کے وقت جب وہ دوسرے عالم کے دروازہ پر کھڑا ہوگا تو اس کو پسِ پردہ کا نظارا تھوڑا بہت ہو جائے گا اور وہی برزخ کا عالم ہے' فرمایا:

﴿حَتّٰٓی اِذَا جَآءَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ ○ لَعَلِّیْ اَعْمَلُ صَالِحًا فِیْمَا تَرَکْتُ کَلَّا اِنَّهَا کَلِمَةٌ هُوَ قَآئِلُهَا وَ مِنْ وَّ رَآئِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ﴾ (المؤمنون:۹۹'۱۰۰)

''جب ان گنہگاروں میں سے کسی ایک کو موت آتی ہے تو وہ (زندگی کے پسِ پردہ کے بعض مناظر کو دیکھ کر) کہتا ہے کہ اے میرے پروردگار مجھے ایک بار اور دنیا میں لوٹا دے تا کہ دنیا میں جو ماحول چھوڑ کر آیا ہوں اس سے شاید کوئی نیک کام کروں' ہرگز نہیں' یہ بات ہی بات ہے جو وہ کہتا ہے اور (اب) ان گنہگاروں کے پیچھے اس دن تک ایک پردہ (برزخ) ہے جب وہ موت کے بستر سے جگا کر اٹھائے

جائیں گے۔''

ظاہر ہے کہ اگر موت کے وقت اور بعد کوئی نئی غیبی کیفیت اس کے مشاہدہ میں نہیں آ جاتی' تو اس کا شک و شبہ دفعتاً یقین سے کیسے بدل جاتا ہے' فرمایا:

﴿فَجَآءَ تْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ ذٰلِكَ مَا كُنْتَ مِنْهُ تَحِيْدُ﴾ (قٓ : ۱۹)

''اور موت کی بے ہوشی حقیقت کو لے کر آ گئی' یہی ہے وہ جس سے تو ہٹا کرتا تھا۔''

اس سے معلوم ہوا کہ سکرات کے وقت ''حقیقت'' کا کوئی منظر سامنے ضرور آ جاتا ہے۔ اہلِ تفسیر نے بھی اس آیت سے یہی سمجھا ہے' ابن جریر طبری لکھتے ہیں:

بِالْحَقِّ مِنْ اَمْرِ الْاٰخِرَةِ فَتَبَيَّنَهُ لِلْاِنْسَانِ حَتّٰى تَثْبُتَهُ وَ عَرَفَهُ. (۱)

''حق یعنی آخرت کا کچھ حال تو موت کی سکرات انسان پر کھول دیتی ہے یہاں تک کہ انسان اس کو یقین کر لیتا ہے اور جان لیتا ہے۔''

حافظ ابن کثیر محدث اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:

يَقُوْلُ عَزَّوَجَلَّ وَ جَآءَ تْ اَيُّهَا الْاِنْسَانُ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ كَشَفْتُهُ لَكَ عَيْنَ الْيَقِيْنِ الَّذِىْ كُنْتَ تَمْتَرِىْ فِيْهِ. (۲)

''اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے انسان موت کی بے ہوشی حق کو لے کر آ گئی یعنی تیرے اس یقین کے پردہ کو کھول دیا' جس میں تو شک کرتا تھا۔''

قاضی شوکانی محدث کی تفسیر میں ہے:

﴿وَ مَعْنٰى بِالْحَقِّ اَنَّهٗ عِنْدَ الْمَوْتِ يَتَضَحَّ لَهُ الْحَقَّ وَ يَظْهَرَلَهٗ صِدْقَ مَاجَآءَ تْ بِهِ الرُّسُلُ مِنَ الْاَخْبَارِ بِالْبَعْثِ وَ الْوَعْدِ وَ الْوَعِيْدِ﴾ (ج۵ص۷۳)

''اور حق لے کر آنے کے معنی یہ ہیں کہ موت کے وقت حق بات کھل جاتی ہے' اور پیغمبر جس قیامت اور جزاء و سزا کی خبریں لے کر آئے تھے' ان کی سچائی ہویدا ہو جاتی ہے۔''

مفتی آلوسی حنفی کی تفسیر کی عبارت یہ ہے:

﴿وَ الْمَعْنٰى اَحْضَرَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ حَقِيْقَةُ الْاَمْرِ الَّذِىْ نُطِقَتْ بِهٖ كُتُبُ اللّٰهِ تَعَالٰى وَ رُسُلِهٖ عَلَيْهِمُ السَّلَامُ﴾

''اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ موت کی مدہوشی اس حقیقتِ امر کو سامنے کر دیتی ہے جس کو اللہ کی کتابوں اور اس کے رسولوں نے بیان کیا ہے۔''

---

(۱) تفسیر ابن جریر طبری جلد ۲۶ ص ۹۱۔

(۲) تفسیر ابن کثیر بر فتح البیان ج ۹ ص ۱۹۸۔

زمخشری معتزلی کی تفسیر (کشاف ج ۲ ص ۱۴۰۲ کلکتہ) اور ابوحیان اندلسی مالکی کی تفسیر (بحر محیط ج ۸، ص ۱۲۴ مصر) میں بھی یہی ہے۔

یہ مفسرین مختلف فرقوں سے تعلق رکھتے ہیں، لیکن ان سب کی متفقہ تفسیر یہی ہے اس تفسیر کی صحت کی مزید دلیل یہ ہے کہ اس کے بعد ہی قیامت کے ذکر میں ہے:

﴿فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ﴾ (قٓ : ۲۲)

''ہم نے آج تجھ سے تیرا پردہ کھول دیا تو آج تیری نظر تیز ہے۔''

اس سے معلوم ہوا کہ موت کے وقت کسی قدر انکشاف ہوتا ہے اور قیامت کے دن انکشافِ تام ہو جاتا ہے لیکن بہر حال موت کے وقت یقین کا پردہ بالکل کھل جاتا ہے۔

موت کے بعد خدا کی طرف روح کی بازگشت

موت کے لیے قرآن میں اکثر ''خدا کی طرف بازگشت'' یعنی خدا کی طرف لوٹ جانے کی اصطلاح اختیار کی گئی ہے

قُلْ اِنَّ الْمَوْتَ الَّذِیْ تَفِرُّوْنَ مِنْهُ فَاِنَّهٗ مُلٰقِیْكُمْ ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰی عَالِمِ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ فَیُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴾ (جمعہ:۸)

''کہہ دو بے شک وہ موت جس سے تم بھاگتے ہو اس سے ٹاہی ہے پھر تم اس (خدا) کے پاس لوٹائے جاؤ گے جو حاضر و غائب کا جاننے والا ہے تو وہ تم کو تمہارے کرتوت بتائے گا۔''

﴿اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ﴾ (بقرہ:۱۵۶)

''ہم سب خدا کے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جائیں گے۔''

﴿اِلَی اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِیْعًا﴾ (مائدہ:۱۰۵)

''تم سب کو خدا ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔''

یہ طرزِ ادا بیسیوں آیتوں میں اختیار کیا گیا ہے، یہ بالکل بدیہی ہے کہ ہر رجوع و بازگشت کے مفہوم میں ورود اور آمد داخل ہے، اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ تمام ارواح انسانی خدا کے یہاں سے اس جسم و قالب کی قید میں آئی ہیں، اور موت کے وقت اس عناصر کی چہار دیواری سے نکل کر پھر ان کو وہیں واپس جانا ہے، جہاں سے آئی تھیں۔ اس بازگشت کے سفر میں ان کا زادِ راہ صرف وہی ہوگا جو اس دنیا کے دارالعمل میں انہوں نے کمایا ہے یعنی ان کے اندرونی و بیرونی اعمال، اور اس کے بعد جو زندگی ہوگی وہ ان کے ان ہی اعمال کی نوعیت پر منحصر ہوگی۔

﴿وَ هُوَ الَّذِیْ یَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّیْلِ وَ یَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ثُمَّ یَبْعَثُكُمْ فِیْهِ لِیُقْضٰۤی اَجَلٌ مُّسَمًّی ثُمَّ اِلَیْهِ مَرْجِعُكُمْ ثُمَّ یُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ﴾ (انعام:۶۰)

''اور وہی (خدا) ہے جو تمہیں رات کو موت (نیند) دیتا ہے اور دن کو جو کما چکے اس کو جانتا ہے پھر تم کو دن میں جگا اٹھاتا ہے تاکہ مقررہ وقت (اصلی موت) پورا ہو پھر اسی کی طرف تم کو لوٹ کر جانا ہے پھر وہ تم کو تمہارے اعمال جتائے گا۔''

ایک اور آیت میں ہے:

﴿یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّمَا بَغْیُكُمْ عَلٰٓی اَنْفُسِكُمْ مَّتَاعَ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ثُمَّ اِلَیْنَا مَرْجِعُكُمْ فَنُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ﴾ (یونس:۲۳)

''اے انسانو! تمہاری بغاوت کا نتیجہ تمہیں پر ہے دنیا کی زندگی سے کچھ فائدہ اٹھانا پھر ہماری طرف لوٹ کر آنا ہے۔ تو ہم تم کو تمہارے اعمال جتائیں گے۔''

اس میں دنیا کی زندگی کے بعد ہی خدا نے اپنی طرف واپس آ جانے کی اطلاع دی ہے اور اہل تفسیر نے بھی اس رجوع الی اللہ سے موت ہی کے معنی سمجھے ہیں (طبری ۱۱ص ۶۴ مصر)

اب ہم ایک ایسی آیت پیش کرتے ہیں جس میں موت کا پورا نقشہ ہے اور اس کے بعد بیان ہے کہ اس دن مرنے کے بعد ہی خدا کے ہاں ہنکا کر لائے جاؤ گے گویا جس طرح جانور ہنکا کر لائے جاتے ہیں ویسے ہی گنہگاروں کی روحیں موت کے بعد نکال کر لائی جاتی ہیں فرمایا:

﴿كَلَّآ اِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِیَ ○ وَ قِیْلَ مَنْ رَاقٍ ○ وَّ ظَنَّ اَنَّهُ الْفِرَاقُ ○ وَ الْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ اِلٰی رَبِّكَ یَوْمَئِذِ ِالْمَسَاقِ﴾ (قیامہ:۲۶،۳۰)

''ہرگز نہیں جب روح ہانس (ہنسلی) تک آ پہنچے اور لوگ کہیں اب کون ہے جھاڑ پھونک کر کے بچانے والا اور سمجھا کہ اب جدائی کا وقت آ گیا اور پنڈلی سے پنڈلی لپٹ گئی اس دن تیرے پروردگار کی طرف ہے ہانکا جانا۔''

لیکن سعید اور نیکوکار روحوں کو موت کے وقت یہ محبت بھری صدائے غیب سنائی دیتی ہے:

﴿یٰٓاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ○ ارْجِعِیْ اِلٰی رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً﴾ (الفجر:۲۷۔۲۸)

''اے مطمئن روح! تو اپنے مالک سے خوش اور تیرا مالک تجھ سے خوش تو اپنے مالک کے پاس چلی جا۔''

یہ کیسی دلآویز صدا اور کیسی دل کش واپسی ہوگی۔

اس وقت کا سماں

وہ لمحہ جب اس روح کی مہلت کا زمانہ اور عمل کی فہرست ختم ہوتی ہے کتنا دردناک ہے اس وقت سے اس کی زندگی صرف اس کے گذشتہ اعمال کے قالب میں جلوہ گر ہوتی ہے ہر عمل کی صورت اس کو اپنے سامنے کھڑی ہوئی معلوم ہوتی ہے اور غیب کی کارکن صورتیں چلتی پھرتی دکھائی اور بولتی چالتی سنائی دیتی ہیں۔

﴿وَ لَوْ تَرٰٓی اِذَا الظّٰلِمُوْنَ فِیْ غَمَرَاتِ الْمَوْتِ وَ الْمَلٰٓئِکَةُ بَاسِطُوْٓا اَیْدِیْهِمْ اَخْرِجُوْٓا اَنْفُسَکُمْ اَلْیَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا کُنْتُمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَی اللّٰهِ غَیْرَ الْحَقِّ وَ کُنْتُمْ عَنْ اٰیٰتِهٖ تَسْتَکْبِرُوْنَ ○ وَ لَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰی کَمَا خَلَقْنٰکُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّ تَرَکْتُمْ مَا خَوَّلْنٰکُمْ وَ رَآءَ ظُهُوْرِکُمْ﴾ (انعام:۹۳،۹۴)

''اور کبھی تو دیکھے جس وقت گنہگار موت کی بیہوشی میں ہوں اور فرشتے ہاتھ کھولے ہوں کہ نکالو (اپنے جسموں کے اندر سے) اپنی روحوں کو آج تم کو اس پر ذلت کی سزا ملے گی کہ تم خدا کی شان میں جھوٹ باتیں کہتے تھے اور اس کے حکموں کے ماننے سے غرور کرتے تھے' اور تم ایک ایک کر کے (تنہا) جیسے ہم نے پہلی بار تم کو پیدا کیا تھا' ہمارے پاس آئے اور جو سامان واسباب تم کو دیا تھا جس نے تم کو مفرور بنایا تھا' اس کو اپنے پیچھے چھوڑ آئے۔''

ان آیات سے ظاہر ہے کہ موت کے وقت کس طرح فرشتے سامنے آتے ہیں اور روح جسم سے جس وقت الگ ہوتی ہے اس کے گناہوں کی سزا کا دور شروع ہو جاتا ہے' یہی بات ایک اور موقع پر مذکور ہے:

﴿وَ لَوْ تَرٰٓی اِذْ یَتَوَفَّی الَّذِیْنَ کَفَرُوا الْمَلٰٓئِکَةُ یَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَ اَدْبَارَهُمْ وَ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِیْقِ ○ ذٰلِکَ بِمَا قَدَّمَتْ اَیْدِیْکُمْ وَ اَنَّ اللّٰهَ لَیْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِ﴾ (انفال: ۵۰،۵۱)

''اور کبھی تو دیکھے جس وقت فرشتے کافروں کی جان لیتے ہیں' ان کے منہ پر اور پیچھے مارتے ہیں اور کہتے ہیں جلنے کے عذاب کا مزہ چکھو یہ تمہارے ہاتھوں کے پہلے کیے ہوئے کاموں کا بدلہ ہے اللہ بندوں پر ظلم نہیں کرتا۔''

اس سے واضح ہے کہ یہ سزا موت ہی کے عالم سے شروع ہو جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ یہ سزا نعوذ باللہ کسی انتقام کے سبب سے نہیں دیتا بلکہ وہ درحقیقت قانونِ عمل کے مطابق خود انسان کے کاموں کا لازمی نتیجہ ہوتی ہے۔

نیکوکاروں کا نقشہ اس سے بالکل الگ ہے' ان کو ہر طرف سے بشارتیں سنائی دیتی ہیں' اور ہر سمت خوشی شادمانی کا سماں سامنے ہوتا ہے۔

﴿فَلَوْ لَآ اِذَا بَلَغَتِ الْحُلْقُوْمَ ○ وَ اَنْتُمْ حِیْنَئِذٍ تَنْظُرُوْنَ ○ وَ نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْکُمْ وَ لٰکِنْ لَّا تُبْصِرُوْنَ ○ فَلَوْلَآ اِنْ کُنْتُمْ غَیْرَ مَدِیْنِیْنَ ○ تَرْجِعُوْنَهَآ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ○ فَاَمَّآ اِنْ کَانَ مِنَ الْمُقَرَّبِیْنَ ○ فَرَوْحٌ وَّ رَیْحَانٌ وَّ جَنَّتُ نَعِیْمٍ ○ وَ اَمَّآ اِنْ کَانَ مِنْ اَصْحٰبِ الْیَمِیْنِ ○ فَسَلٰمٌ لَّکَ مِنْ اَصْحٰبِ الْیَمِیْنِ ○ وَ اَمَّآ اِنْ کَانَ مِنَ الْمُکَذِّبِیْنَ الضَّآلِّیْنَ ○ فَنُزُلٌ مِّنْ حَمِیْمٍ ○ وَّ تَصْلِیَةُ جَحِیْمٍ ○ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْحَقُّ الْیَقِیْنِ ○﴾ (واقعۃ:۸۳،۹۵)

''پھر کیوں نہیں جس وقت روح حلق تک پہنچ جاتی ہے اور تم اس وقت دیکھ رہے ہوتے ہو' اور ہم اس سے تمہاری نسبت زیادہ نزدیک تر ہوتے ہیں' لیکن تم کو دکھائی نہیں دیتا تو اگر تم کسی اور کے حکم کے نیچے نہیں ہو' تو کیوں نہیں اس روح کو پھر پلٹا دیتے ہو' اگر تم (اپنے انکار و تکذیب میں) سچے ہو تو اگر وہ (مرنے والا) مقرب بندوں میں سے ہوا تو خوشی و آرام اور نعمت کی بہشت ہے اور اگر وہ (اس سے کچھ کم درجہ) داہنے والوں میں ہوا تو تجھ پر سلامتی داہنے والوں میں سے اور اگر وہ حق کو جھٹلانے والے گمراہوں میں سے ہوا تو گرم پانی کی مہمانی اور دوزخ میں بیٹھنا ہے بے شبہ یہ بات یقین کے لائق ہے۔''

یہ تمام سماں موت کے بعد اور عالمِ برزخ ہی کے مناظر ہیں۔

برزخ کا عذاب و راحت

اوپر کی آیتوں میں سے پوری طرح ہویدا ہے کہ روح و جسم کی مفارقت کے بعد اچھی روحوں کے سامنے رحمت کے اور بری روحوں کے روبرو عذاب کے منظر گزرتے ہیں' قرآن پاک میں کچھ اور آیتیں ہیں جن سے ثابت ہے کہ یہ منظر نہ صرف روح کے سامنے ہی سے گذرتے ہیں' بلکہ کبھی کبھی وہ اپنے اعمال کے مدارج کے مطابق رحمت یا زحمت کے اندر بھی داخل کر دی جاتی ہے' منافقین کی نسبت قرآن میں ہے:

﴿سَنُعَذِّبُهُمْ مَّرَّتَيْنِ ثُمَّ يُرَدُّوْنَ اِلٰى عَذَابٍ عَظِيْمٍ﴾ (توبہ:۱۰۱)

''ہم ان کو دو دفعہ عذاب دیں گے' پھر وہ ایک بڑے عذاب کی طرف لوٹائے جائیں گے۔''

﴿عَذَابٍ عَظِيْمٍ﴾ سے ظاہر ہے کہ دوزخ کا عذاب مراد ہے' اب اس عذابِ دوزخ سے پہلے عذاب کے دو دوران پر اور گذر چکے ہوں گے' ایک تو یہ دنیاوی عذاب ہے' اور دوسرا موت کے بعد ہی کا ہو سکتا ہے۔ قرآن میں آلِ فرعون کے ذکر میں ہے۔

﴿وَ حَاقَ بِاٰلِ فِرْعَوْنَ سُوْٓءُ الْعَذَابِ ○ اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّ عَشِيًّا وَّ يَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ اَدْخِلُوْٓا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ﴾ (مؤمن:۴۵-۴۶)

''اور فرعون والوں پر بری طرح عذاب الٹ پڑا' آگ کہ اس پر وہ صبح اور شام پیش کیے جاتے ہیں اور جس دن سے قیامت کی گھڑی ہوگی (ندا ہوگی کہ) فرعون والوں کو (پہلے سے بھی) بڑھ کر عذاب میں ڈالو۔''

اس سے ظاہر ہوا کہ گنہگاروں کو قیامت سے پہلے برزخ کے عالم میں بھی عذاب کا کچھ نہ کچھ مزا چکھایا جاتا ہے' ایسا ہی نیکوکاروں کو بہشت کے عیش و آرام کا منظر دکھایا جاتا ہے' اسی آیت پاک کی تشریح میں گویا آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے تم میں سے جب کوئی مرتا ہے تو اس پر صبح و شام اس کا اصلی مقام پیش کیا جاتا ہے اگر وہ اہلِ

جنت میں سے ہوتا ہے تو جنت اور اہلِ دوزخ سے ہوتا ہے' تو دوزخ پھر اس سے کہا جاتا ہے کہ یہ ہے تیرا مقام اس وقت تک کے لیے کہ جب تو قیامت کے دن اٹھایا جائے' (۱) ایک اور صحیح حدیث میں ہے کہ جنتی مردہ کے سامنے جنت و دوزخِ دونوں کے منظر سامنے کر کے کہتے ہیں کہ اگر تو اچھے عمل نہ کرتا تو تیرا یہ مقام نہ ہوتا' مگر تیرے نیک عمل کے سبب سے اب یہ جنت تیرا مقام ہے (۲) اور اس دن تک کے لیے کہ لوگ اٹھائے جائیں' اس پر سرسبزی بھر دی جاتی ہے۔ (۳)

مشرکوں اور قیامت کے منکروں کا سوال تھا کہ اگر یہ پیغامِ الٰہی سچ ہے تو ہم کو فرشتے یا خدا نظر کیوں نہیں آتے' جواب میں کہا گیا کہ فرشتے جس دن نظر آئیں گے' اس دن ایمان بالغیب کہاں؟ اور اوپر کی آیتوں سے معلوم ہو چکا ہے کہ فرشتے موت کے وقت نظر آتے ہیں یا پھر قیامت میں نظر آئیں گے' اس لیے ارشاد ہے:

﴿یَوْمَ یَرَوْنَ الْمَلٰٓئِکَةَ لَا بُشْرٰی یَوْمَئِذٍ لِّلْمُجْرِمِیْنَ وَ یَقُوْلُوْنَ حِجْرًا مَّحْجُوْرًا ○ وَ قَدِمْنَآ اِلٰی مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا ○ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ یَوْمَئِذٍ خَیْرٌ مُّسْتَقَرًّا وَّ اَحْسَنُ مَقِیْلًا ○ وَ یَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ بِالْغَمَامِ وَ نُزِّلَ الْمَلٰٓئِکَةُ تَنْزِیْلًا ○ اَلْمُلْکُ یَوْمَئِذِ نِ الْحَقُّ لِلرَّحْمٰنِ وَ کَانَ یَوْمًا عَلَی الْکٰفِرِیْنَ عَسِیْرًا ○﴾ (الفرقان: ۲۲'۲۶)

''جس دن وہ فرشتوں کو دیکھیں گے اس دن ان گنہگاروں کو کوئی خوش خبری نہیں اور کہیں گے (کہ یہ ڈراؤنا منظر جو ہم کو نظر آ رہا ہے) اب اوٹ میں روکا جائے اور ہمارا خدا فرماتا ہے ان کے کیے ہوئے کاموں کے پاس پہنچے اور ان کو اڑتا غبار بنا دیا (یعنی بیکار و بے سود و معدوم) جنت والے لوگ (یعنی جنت جن کو ملنے والی ہے) اس دن ان کے لیے خوب ٹھکانا اور دوپہر کے سونے کا مقام ہوگا اور جس دن آسمان بادل سے پھٹ جائے گا اور فرشتے آہستہ آہستہ اتارے جائیں گے' اس دن راج سچا خدا کا ہوگا اور وہ دن کافروں پر سخت ہوگا۔''

کھلی بات ہے کہ آسمان کا بادل سے پھٹنا' اور فرشتوں کا اترنا قیامت کا نقشہ ہے' اب اس سے پہلے فرشتوں کے دکھائی دینے کا وہ دن جس میں گنہگاروں کے لیے کوئی خوش خبری نہیں اور وہ کہیں گے کہ کاش یہ ڈراؤنا منظر ہماری نگاہوں کے سامنے نہ ہوتا اور جنت کے مستحقین کو ایک اچھا مستقر (قرارگاہ) اور دوپہر کی دھوپ سے بچانے والی خواب گاہ ملی ہوگی' قیامت سے پہلے اور موت کے بعد ہی کی کیفیت ہے۔ (۴)

---

(۱) صحیح مسلم کتاب الجنۃ والنار باب عرض مقعد المیت جلد ۲ ص ۴۸۸ مصر و جامع ترمذی کتاب الجنائز باب عذاب القبر۔

(۲) حدیث حسن صحیح و صحیح بخاری کتاب الجنائز عذاب القبر ص ۱۸۴ و سکرات الموت ص ۹۶۴۔

(۳) صحیح بخاری کتاب الجنائز ص ۳۸۴۔

(۴) صحیح مسلم باب عرض مقعد المیت ص ۴۹۰ مصر۔

سورۂ محمد میں موت کے وقت کا حال بیان ہوتا ہے کہ جب فرشتے ان گنہگاروں کی روحوں کو قبض کرتے ہیں تو ان کے چہروں پر اور پیٹھوں پر ضرب لگاتے ہیں فرمایا:

﴿فَكَيْفَ اِذَا تَوَفَّتْهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَ اَدْبَارَهُمْ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمُ اتَّبَعُوْا مَآ اَسْخَطَ اللّٰهَ وَ كَرِهُوْا رِضْوَانَهٗ فَاَحْبَطَ اَعْمَالَهُمْ﴾ (محمد:۲۷،۲۸)

''پھر کیا حال ہوگا جب فرشتے ان کو وفات دیں گے ان کے چہروں اور پیٹھوں پر مارتے ہوئے یہ اس لیے کہ انہوں نے اس کی پیروی کی جس نے خدا کو ان سے ناخوش کر دیا اور جنہوں نے خدا کی خوشنودی کو پسند نہ کیا تو خدا نے ان کے کاموں کو بے نتیجہ کر دیا۔''

یہ غیبی ضرب خواہ اسی مادی جسم پر پڑتی ہو یا اس کے مثالی جسم پر یا روح پر جو بھی کہیے بہر حال اس سے یہ ثابت ہے کہ گنہگار مردہ پر موت کے وقت ہی سے عذاب کا ایک رنگ شروع ہوتا ہے۔

سورۂ انعام میں اس سے زیادہ ہے۔

﴿وَ لَوْ تَرٰٓى اِذَا الظّٰلِمُوْنَ فِيْ غَمَرَاتِ الْمَوْتِ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ بَاسِطُوْٓا اَيْدِيْهِمْ اَخْرِجُوْٓا اَنْفُسَكُمْ اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ﴾ (انعام:۹۳)

''اور اگر تو دیکھے جب گنہگار موت کی سکرات میں ہوں اور فرشتے ہاتھ بڑھائے ہوں کہ نکالو (اپنے جسم کے اندر سے) اپنی روحوں کو آج تم کو ذلت کی سزا ملے گی۔''

اَلْيَوْم جس کے معنی آج کے ہیں' ظاہر ہے کہ اس سے وہی زمانہ مراد ہے جس وقت سے فرشتے بدن سے روح نکالتے ہیں اس ''آج'' سے مقصود ہمارا دنیاوی آج نہیں ہے جو ۲۴ گھنٹوں میں ختم ہو جاتا ہے بلکہ برزخ کا پورا زمانہ ہے (دیکھو فتح القدیر شوکانی و تفسیر ابوالسعود و تفسیر روح المعانی آلوسی)

قوم نوحؑ کے غرق ہونے کے بعد ہی دوزخ میں جانے کا حکم ہے۔

﴿اُغْرِقُوْا فَاُدْخِلُوْا نَارًا فَلَمْ يَجِدُوْا لَهُمْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْصَارًا﴾ (نوح:۲۵)

''وہ ڈبو دیے گئے' پھر وہ آگ میں داخل کیے گئے تو انہوں نے خدا کے سوا مددگار نہیں پائے۔''

حضرت لوطؑ اور حضرت نوحؑ کی کافر بیویوں کی موت کے بعد ہی عذاب کا ذکر ہے۔

﴿وَ قِيْلَ ادْخُلَا النَّارَ مَعَ الدّٰخِلِيْنَ﴾ (التحریم:۱۰)

''اور کہا گیا کہ داخل ہونے والوں کے ساتھ تم دونوں بھی آگ میں داخل ہو جاؤ۔''

یہ قیامت سے پہلے اور دنیا کے عذاب ہلاکت کے بعد کے واقعات ہیں' اور اسی وقفہ کا نام برزخ ہے۔

سورۂ یٰسٓ میں ایک خیر خواہ قوم کا ذکر ہے' جو عمر بھر اپنی قوم کو حق کی تبلیغ کرتا رہا تھا' اور پھر وہ غالباً اسی حق کی راہ میں شہید ہوا۔ مرنے کے بعد جب اس کو بہشت ملی تو اس نے بڑی حسرت سے کہا کہ کاش میری قوم کو معلوم ہوتا کہ مرنے کے بعد خدا نے کس طرح مجھے معاف فرمایا' اور عزت بخشی تا کہ وہ بھی ایمان سے میری طرح بہرہ ور ہو کر۔

اس مغفرت اور عزت سے سرفراز ہوتی۔

﴿قِيْلَ ادْخُلِ الْجَنَّةَ قَالَ يٰلَيْتَ قَوْمِيْ يَعْلَمُوْنَ بِمَا غَفَرَلِيْ رَبِّيْ وَ جَعَلَنِيْ مِنَ الْمُكْرَمِيْنَ ○ وَ مَآ اَنْزَلْنَا عَلٰى قَوْمِهٖ مِنْۢ بَعْدِهٖ مِنْ جُنْدٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَ مَا كُنَّا مُنْزِلِيْنَ○﴾ (یٰسٓ :۲۶،۲۸)

''کہا گیا جنت میں داخل ہو' اس نے کہا اے کاش میری قوم کو یہ معلوم ہوتا کہ میرے پروردگار نے میری مغفرت کی اور مجھے عزت والوں میں سے بنایا' اور ہم نے اس کے مرنے کے بعد اس کی قوم پر آسمان سے کوئی فوج نہیں اتاری اور نہ ہم اتارا کرتے ہیں۔''

شہیدوں کی نسبت تو خاص طور پر ہے۔

﴿بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ﴾ (آل عمران:۱۶۹)

''بلکہ وہ زندہ ہیں اپنے رب کے پاس روزی پاتے ہیں۔''

اس سے معلوم ہوا کہ شہدا کو برزخ ہی میں کامل زندگی کے ساتھ جنت کی روزی ملتی ہے اور عام نیکوکاروں کا یہ حال ہے کہ ان کو فرشتے اس وقت سلامتی اور جنت کی خوش خبری سناتے ہیں' فرمایا:

﴿اَلَّذِيْنَ تَتَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ طَيِّبِيْنَ يَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَيْكُمُ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ﴾ (نحل:۳۲)

''جن کو فرشتے (گناہوں سے) پاک وصاف حالت میں وفات دیتے ہیں' کہتے ہیں کہ تم پر سلامتی ہو اپنے کاموں کے بدلہ جنت میں چلے جاؤ۔''

قبر کی اصطلاح

سطورِ بالا میں عالمِ برزخ کے وہ مناظر دکھائے گئے ہیں' جو قرآن کی آیتوں میں نظر آتے ہیں اور احادیثِ صحیحہ میں اس عالم کے حالات کی جو تفصیلیں مذکور ہیں'[1] وہ عموماً قبر کی اصطلاح کے ساتھ بیان ہوئی ہیں' لیکن اس لفظ ''قبر'' سے درحقیقت مقصود وہ خاک کا تودہ نہیں جس کے نیچے کسی مردہ کی ہڈیاں پڑی رہتی ہیں' بلکہ وہ عالم ہے جس میں یہ مناظر پیش آتے ہیں' اور وہ ارواح ونفوس کی دنیا ہے' مادی عناصر کی نہیں' اسی لیے قرآن پاک نے اس عالم کے تعلق سے ہمیشہ نفس اور نفوس کو خطاب کیا ہے اور ان ہی کے عذاب وثواب اور رحمت ولعنت کا ذکر ہے۔ اس عالم میں جو جسم نظر آتا ہے' وہ مرنے والوں کے اعمال کا مثالی پیکر ہوتا ہے جو ہو بہو اس کے خاکی جسم کا مثنیٰ ہوتا

(۱) بعض معتزلہ عذاب قبر کے قائل نہ تھے' اور ان کی دلیل یہ تھی کہ قرآن میں اس کا ذکر نہیں یہ غلط فہمی ان کو اس لیے پیش آئی کہ قرآن میں لفظ قبر وقبور کے ساتھ عذاب کا ذکر نہیں لیکن اگر وہ دیکھتے کہ قرآن میں بعد موت اور قبل قیامت ارواح انسانی کے عذاب وثواب اور رحمت ولعنت کا ذکر موجود ہے تو ان کو اس انکار کی جرأت نہ ہوتی اور قرآن میں اسی قسم کی متعدد آیتیں موجود ہیں۔

ہے تم نیند میں ہو اور تمہارا نیم مردہ بے حس جسم بستر پر دراز ہے' مگر تم خواب میں دیکھ رہے ہو کہ بعینہٖ تمہارا جسم آگ میں جل رہا ہے یا باغ و بہار کی لذتوں میں مصروف ہے' اور تم کو اس سے وہی تکلیف اور راحت مل رہی ہے' جو بیداری میں اپنے بستر پر پڑے ہوئے جسم کی تکلیف و راحت سے مل سکتی ہے' اس خواب میں جس طرح تمہارے مادی جسم کے علاوہ تم کو اپنا ایک خیالی جسم نظر آتا ہے جو ہو بہو تمہارا مادی جسم ہے' اس طرح موت کے خواب میں بھی تم کو اپنا ایک مثالی جسم نظر آئے گا' جو اکثر حالتوں میں ہو بہو تمہارے اس خاکی جسم کے مطابق ہوگا (۱) اور تمہاری روح اسی جسم مثالی کے عذاب و راحت سے متاثر ہوگی اور اعمال کی اصل ذمہ دار روح انسانی ہے' جسم خاکی نہیں فرمایا ﴿كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ﴾ (مدثر: ۳۸) یعنی ہر روح اور جان اپنے اعمال کے ہاتھوں گرو ہو گی۔'' اس لیے اصل مکلّف روح ہے جسم نہیں' جسم بمنزلہ آلہ کے ہے' دنیا میں اس کا ایک خاکی جسم تھا' برزخ میں اس کا ایک اور جسم ہوگا جو مادہ و مادیات سے پاک و بری ہوگا۔ تاہم اس کو اپنے جسمِ خاکی سے ایک قسم کی نسبت حاصل ہوگی' اور اتنی ہی نسبت کی بنا پر قبر کی اصطلاح عام بول چال میں جاری ہے' کیونکہ ہم اپنی آنکھوں سے مسلمان مردوں کو اسی قبر میں جاتے دیکھتے ہیں قرآن پاک کی یہ آیت اوپر گذر چکی ہے۔

﴿وَ لَوْ تَرٰٓى اِذْ يَتَوَفَّى الَّذِيْنَ كَفَرُوا الْمَلٰٓئِكَةُ يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَ اَدْبَارَهُمْ وَ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ﴾ (انفال: ۵۰)

''اور کبھی تو دیکھے جس وقت فرشتے کافروں کی جان لیتے ہیں' ان کے منہ پر اور پیچھے مارتے ہیں اور کہتے ہیں جلنے کے عذاب کا مزہ چکھو۔''

اس آیت سے جہاں یہ ثابت ہوتا ہے کہ گنہگاروں پر موت کے بعد ہی سے عذاب شروع ہو جاتا ہے وہاں یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ یہ مار ان کے منہ اور پیٹھ پر پڑتی ہے مگر یہ منہ اور یہ پیٹھ وہ نہیں ہے جو بے جان لاشہ کی صورت میں ہمارے سامنے ہے بلکہ اس آیت میں کافر کی روح کو جانور سے تشبیہ دی گئی ہے کہ جس طرح جانور کو تیز ہنکاتے وقت کبھی آگے (منہ پر) اور کبھی پیچھے (پیٹھ پر) مارتے ہیں' اسی طرح گویا کافر روح کو زبردستی فرشتے مارتے ہوئے اور ہنکاتے ہوئے لے چلیں گے اور کہیں گے کہ چلو عذاب کا مزہ چکھو' یہی مفہوم صاف لفظوں میں اس آیت میں ہے۔

﴿اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَئِذِ ِۨالْمَسَاقُ﴾ (قیامہ: ۳۰)

''اس دن تیرے پروردگار کی طرف ہے ہنکایا جانا۔''

بعض ایسی سعید روحیں بھی ہوتی ہیں' جن کو اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اس برزخ میں جسمِ خاکی کی شکل و صورت کی قید سے آزاد کر کے کوئی دوسرا مناسب مثالی جسم عطا کرتا ہے جیسا کہ احادیث میں آیا ہے کہ مومن کامل

(۱) اس سے اس شبہ کا ازالہ ہوتا ہے کہ ہم کو مردہ جسم سامنے پڑا نظر آتا ہے لیکن اس پر عذاب کا کوئی نشان نظر نہیں آتا اور نیز اس شبہ کا بھی ازالہ ہوتا ہے کہ قبر میں جب جسم سڑ گل جاتا ہے تو پھر عذاب و ثواب کا احساس اس کو کیسے ہوتا ہے۔

کی روح پرندوں کی شکل میں جنت میں اڑتی پھرتی ہے۔ (۱) اور خصوصاً شہدا کے متعلق آیا ہے کہ وہ سبز پرندوں کی شکل میں ہوں گے' اور عرشِ الٰہی کی قندیلیں ان کا آشیانہ ہوں گی' اسی طرح دوزخ و بہشت کے متعلق آنحضرت ﷺ کا جو رؤیائے صادقہ پہلے گذرا ہے' اس میں جسمانی قالبوں میں گنہگاروں کی سزا و تکلیف کی صورتیں دکھائی گئی ہیں' وہ تمام تر مثالی ہی ہیں' ظاہر ہے کہ مومن سعید اور شہدا کے وہ مثالی قالب اور گنہگاروں کے یہ مثالی اجسام ان کے وہ قالب اور جسم نہیں ہیں جو ان کی قبروں میں سڑ گل کر فنا ہو گئے' یا وہ آگ میں جل کر خاکستر ہوئے' اور ذرے ہوا میں اڑ کر منتشر ہو گئے یا کسی جانور کے پیٹ میں جا کر اس کا جزوِ بدن بن گئے۔

بعض حدیثوں میں آنحضرت ﷺ سے ان مٹی کی قبروں میں عذاب کے مشاہدات و مسموعات کا تذکرہ ہے تو ظاہر ہے کہ مادی زبان و منظر میں ان قوموں کے نزدیک جو مردوں کو گاڑتی ہیں اس میت کی یادگار اس دنیا میں اس کے اس مٹی کے ڈھیر کے سوا اور کیا ہے جس کی طرف اشارہ کیا جا سکے' ایک صحیح حدیث میں اس نیک مرد کا ذکر ہے جس نے خدا کے خوف سے یہ وصیت کی تھی کہ مرنے کے بعد اس کا جسم جلا کر اس کی راکھ ہوا میں اڑا دی جائے تا کہ وہ خدا کے سامنے حاضر نہ کیا جا سکے' مگر قدرتِ الٰہی نے اس کو مجسم کر کے کھڑا کر دیا' اور اس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے نوازا۔ (۲)

سوال و جواب

احادیث میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ مرنے کے بعد قبر میں دو فرشتے آتے ہیں اور وہ مردوں سے توحید و رسالت کی نسبت سوال و جواب کرتے ہیں۔

اس کی تصدیق قرآن کی ان آیتوں سے بھی ہوتی ہے:

﴿اَلَّذِیْنَ تَتَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ طَیِّبِیْنَ یَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَیْكُمُ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ﴾ (نحل:۳۲)

''جن کو فرشتے (گناہوں سے) پاک و صاف حالت میں وفات دیتے ہیں' کہتے ہیں کہ تم پر سلامتی ہو اپنے کاموں کے بدلہ جنت میں چلے جاؤ۔''

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ تَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِیْٓ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِیْمَ كُنْتُمْ قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِیْنَ فِی الْاَرْضِ قَالُوْٓا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِیْهَا فَاُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ﴾ (نساء:۹۷)

''بے شک فرشتوں نے جن کی روحوں کو اس حالت میں قبض کیا کہ وہ اپنی جانوں پر ظلم کر رہے تھے' وہ

---

(۱) سنن ابن ماجہ کتاب الجنائز۔

(۲) صحیح بخاری جلد دوم صفحہ ۹۵۹ کتاب الرقاق باب الخوف من اللہ۔

ان سے کہتے ہیں' تم کس بات میں تھے' وہ جواب دیتے ہیں کہ ہم ملک میں بے یار و مددگار تھے وہ فرشتے کہتے ہیں کہ کیا اللہ کی زمین کشادہ نہ تھی کہ تم اپنا وطن چھوڑ کر باہر چلے جاتے۔''

ایک اور آیت ہے:

﴿حَتّٰٓی اِذَا جَآءَ تْهُمْ رُسُلُنَا یَتَوَفَّوْنَهُمْ قَالُوْٓا اَیْنَ مَا كُنْتُمْ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ قَالُوْا ضَلُّوْا عَنَّا وَ شَهِدُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِیْنَ ○ قَالَ ادْخُلُوْا فِیْٓ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ مِنَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ فِی النَّارِ﴾ (اعراف:۳۷'۳۸)

''یہاں تک کہ جب ان جھٹلانے والوں کے پاس ہمارے فرشتے ان کی روحوں کو قبض کرنے آئیں گے اور کہیں گے کہاں ہے وہ جن کو تم خدا کے علاوہ پکارتے تھے (اس وقت وہ مشرک) کہیں گے کہ ہمارے وہ دیوتا ہم سے کنارہ کش ہو گئے اور انہوں نے اپنے اوپر آپ گواہی دی کہ وہ کافر تھے تب خدا فرمائے گا کہ تم بھی ان لوگوں میں جا ملو جو جن وانس میں سے تم سے پہلے آگ میں جا چکے ہیں۔''

پہلی آیت میں عدمِ ہجرت کے گناہ کے مرتکب مسلمانوں کا' اور دوسری میں کافروں کا حال بیان کیا ہے کہ ان سے ان کی موت کے بعد ہی یہ سوال کیا جائے گا۔ بہر حال یہ تو خاص خاص گناہوں کے مجرموں کا حال تھا اب عام لوگوں سے جو سوال ہو سکتا ہے جس کا ذکر احادیث میں ہے' یعنی توحید و رسالت کی معرفت کا ان سے سوال ہو گا۔

قرآن پاک میں ایک جگہ کلمۂ طیبہ (اچھی بات یعنی کلمۂ توحید) اور کلمۂ خبیثہ (بری بات یعنی کلمۂ کفر) کی ایک ایک مثال ہے' کلمۂ طیبہ کی مثال اس درخت کی ہے جس کی جڑیں زمین میں مضبوطی سے گڑی ہیں' اسی کی شاخیں آسمانوں تک پھیلی ہیں اور اس میں سدا بہار میوے لگے ہیں' اور کلمۂ خبیثہ کی مثال اس درخت کی ہے جس کی جڑ زمین سے اکھڑی پڑی ہے وہ اب گرا اور تب گرا۔ اس کے بعد قرآن میں ہے:

﴿یُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَ فِی الْاٰخِرَةِ وَ یُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِیْنَ﴾ (ابراہیم:۲۷)

''اللہ ایمان والوں کو پکی بات پر اس دنیا میں مضبوط رکھے گا اور آخرت میں بھی اور اللہ ظالموں کو بچلاتا ہے۔''

اس کی تفسیر صحیح حدیثوں میں یہ ہے کہ برزخ کے اسی سوال و جواب سے متعلق ہے کہ صاحبِ ایمان جس طرح اپنی اس زندگی میں ایمان کی بات پر قائم تھا' اسی طرح برزخ میں بھی اس پر قائم رہے گا' اور جو کافر و مشرک یہاں اس پر قائم نہ تھا' وہاں بھی وہ قائم نہ رہے گا اور بہک جائے گا۔

ہر چند کہ رسول اللہ ﷺ کی صحیح تفسیر کے ہوتے ہوئے کسی اور استدلال کی حاجت نہیں تاہم' تائیداً یہ عرض ہے کہ اس آیت میں اہلِ ایمان کے آخرت میں بھی قولِ ثابت پر ثابت قدم رکھے جانے کی بشارت ہے' ظاہر ہے

کہ اس آخرت سے قیامت اور بہشت و دوزخ کا دن تو مراد نہیں ہوسکتا کہ وہ تو کشفِ راز کا دن ہے اس دن تو کافر بھی (اس قولِ ثابت سے) پلٹنے کی جرأت نہیں کرسکتا۔ پھر یہ اہلِ ایمان کے لیے کوئی خاص بشارت نہ ہوگی' اور نہ یہ اس اظہارِ احسان کا مناسب وقت ہوسکتا ہے' البتہ اس بشارت اور احسان کا اعلان و اظہار آخرت کے اس حصہ میں موزوں ہوسکتا تھا' جہاں ہنوز اسرارِ پسِ پردہ کی پوری نقاب کشائی نہیں ہوتی' اور وہ برزخ کا عالم ہے۔

اس آیت پاک کی اس تفسیر سے جو احادیثِ صحیحہ پر مبنی ہے' یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ آخرت کی وسعتِ مفہوم میں برزخ کا میدان بھی داخل ہے۔

حقیقت میں اس عالمِ برزخ کا سوال و جواب کوئی نیا واقعہ نہ ہوگا۔ بلکہ ہر روح کی پہلی زندگی کی ایمانی کیفیت اقرار و انکار کی مثال ہوگی' یا یوں کہو کہ آج کے آئینہ میں کل کا عکس نمایاں ہوگا یعنی اقرار و انکار کی جس کیفیت پر زندگی کا خاتمہ ہوا ہوگا' وہی بعد کو سوال و جواب میں نمایاں ہوگی۔

برزخ میں ارواح کا مسکن

آخری سوال یہ ہے کہ موت اور قیامت کی اس بیچ کی منزل (برزخ) میں ارواحِ انسانی کا مسکن کہاں ہو گا؟ قرآن پاک میں اس کا جواب متعدد آیتوں میں ملتا ہے' سب سے پہلی آیت تو ان مذکورۂ بالا آیات کے بعد ہے جس میں ذکر ہے کہ فرشتے جب منکرین سے سوال و جواب کر چکیں گے تو خدا ان کی روحوں کو حکم دے گا کہ وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ عذاب کی آگ میں داخل ہو جائیں' اس کے بعد ہے۔

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا وَ اسْتَکْبَرُوْا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ وَ لَا یَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰی یَلِجَ الْجَمَلُ فِیْ سَمِّ الْخِیَاطِ﴾ (اعراف:۴۰)

"بے شک جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا اور ان کے ماننے سے غرور کیا ان کے لئے آسمان کے دروازے نہ کھولے جائیں گے اور نہ وہ جنت میں داخل ہوں گے تا آنکہ اونٹ سوئی کے ناکے میں گھس جائے (یعنی کبھی نہیں)۔"

اس سے معلوم ہوا کہ آیاتِ الٰہی کے منکروں اور جھٹلانے والوں کی روحیں مرنے کے بعد آسمانی بادشاہی کے حدود میں قدم نہ رکھ سکیں گی' اور وہ فضائے زمین میں آوارہ پھریں گی' یا اپنے خاکی جسموں کے لگاؤ سے جہاں وہ سپردِ خاک ہوئے ہوں منڈلاتی رہیں گی' اور وہیں سے دوزخ کا منظر دیکھیں گی' اور تکلیف اٹھائیں گی۔

اس کے برخلاف ہمہ تن پاک باز مومن روح کا یہ حال ہوتا ہے کہ موت ہی کے وقت رحمتِ الٰہی کا فرشتہ بلکہ خود زبانِ رحمت اس کے کانوں میں یہ صدا دیتی ہے۔

﴿یٰۤاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ○ اِرْجِعِیْۤ اِلٰی رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً○ فَادْخُلِیْ فِیْ عِبَادِیْ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ○﴾ (فجر:۲۷'۳۰)

''اے مطمئن روح! اپنے پروردگار کے پاس واپس چلی جا' تیرا پروردگار تجھ سے خوش اور تو اپنے پروردگار سے خوش' تو میرے بندوں میں شامل اور میری بہشت میں داخل ہو جا۔''

ان سے بڑھ کر وہ پاک باز روحیں ہیں' جنہوں نے اپنے خاکی جسموں' فانی زندگیوں' مادی خوشیوں اور زوال پذیر عشرتوں کو خدا کی راہ میں قربان کیا' تو ان کو خدا کی طرف سے ایک تمثالی جسم' غیر فانی زندگی اور روحانی عیش و مسرت کی لازوال دولت اسی وقت عنایت کر دی جاتی ہے' فرمایا:

﴿وَ لَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّ لٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ﴾ (بقرہ: ۱۵۴)

''جو خدا کی راہ میں مارے جائیں ان کو مردہ نہ کہو' وہ زندہ ہیں لیکن تم شعور نہیں کر سکتے۔''

یہ پر مسرت زندگی کیسی ہوگی' اس کی تفصیل دوسری سورہ میں ہے:

﴿وَ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ○ فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَ يَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ اَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ○ يَسْتَبْشِرُوْنَ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ فَضْلٍ وَّ اَنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ○﴾ (آل عمران: ۱۶۹'۱۷۱)

''اور تو ان کو جو خدا کی راہ میں مارے گئے مردہ نہ گمان کر' بلکہ وہ اپنے رب کے پاس زندہ ہیں' ان کو روزی دی جاتی ہے خدا نے اپنی مہربانی سے ان کو جو دیا ہے' اس پر خوش ہیں' اور جو ابھی ان کے پیچھے سے ان تک نہیں پہنچے ہیں' ان کی طرف سے بھی خوش ہیں کہ ان کو نہ کوئی خوف ہوگا' اور نہ وہ غمگین ہوں گے' وہ اللہ کے مہر و کرم سے مسرور ہیں' اللہ ایمان والوں کی مزدوری ضائع نہیں کرتا۔''

یہ پر مسرت زندگی شہدا کو ملے گی' اسی زندگی کا مقام ''خدا کے پاس'' بتایا گیا ہے' احادیثِ صحیحہ میں ہے کہ ان زندہ شہیدوں کی روحیں قفسِ عنصری سے پرواز کر کے جب اڑتی ہیں تو وہ سبز پرندوں کی صورت میں جنت کی سیر کرتی ہیں اور عرشِ الٰہی کی قندیلیں ان کا نشیمن بنتی ہیں' اس کے بعد غالباً ہر ذی عقل تسلیم کرے گا کہ انبیاء علیہم السلام کے روحانی مدارج و مراتب شہدا سے بہر حال اعلیٰ و برتر ہیں' اس لیے ان کا مقام بھی اسی احاطۂ قدس کے اندر ہوگا۔ اسی لیے آنحضرت ﷺ نے سیرِ معراج اور اپنے رؤیائے صادقہ میں بعض پیغمبروں کو آسمان اور بہشت کے مختلف مدارج میں دیکھا۔

بعض وہ سعید روحیں ہیں جو یہاں سے نکل کر فرشتوں کی صف میں داخل ہو جاتی ہیں' جیسا کہ حضرت جعفر طیارؓ کے متعلق احادیثِ صحیحہ میں آیا ہے کہ وہ شہادت کے بعد دونوں بازوؤں سے فرشتوں کے ساتھ عالمِ ملکوت میں اڑ رہے تھے' عالم برزخ کے یہ اڑانے والے باز و در حقیقت ان کے ان دونوں جسمانی بازوؤں کی مثال ہیں' جو اس جنگ میں ان کے جسم سے کٹ کر گر گئے تھے' اور وہ اس پر بھی اسلام کے علم کو اپنے بقیہ کٹے ہوئے بازو اور گردن

کے سہارے سے پکڑے تھے' عجب نہیں کہ قرآن پاک کی یہ آیت ایسے ہی لوگوں کی شان میں ہو:

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَ لَا تَحْزَنُوْا وَ اَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِیْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ○ نَحْنُ اَوْلِیٰٓؤُكُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَ فِی الْاٰخِرَةِ﴾ (حم السجدۃ:۳۰'۳۱)

''بے شک جن لوگوں نے اقرار کیا کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے پھر ثابت قدم رہے ان پر فرشتے یہ خوش خبری لے کر اترتے ہیں کہ خوف نہ کھاؤ اور غمگین نہ ہو اور اس جنت کی بشارت سنو جس کا تم سے وعدہ کیا تھا' ہم دنیا کی زندگی میں تمہارے رفیق ہیں اور آخرت میں بھی۔''

یہ آوازۂ بشارت اور فرشتوں کی رفاقت' اسی برزخ کا دل کش سماں ہو سکتا ہے۔

❀ ❀ ❀

آخرت کی دوسری اور حقیقی منزل

قیامت اور جزائے اعمال

موت تو افراد کا معاملہ ہے۔ ایک مرتا ہے' اور دوسرا اس کی جگہ پیدا ہوتا ہے' قومیں بھی باری باری اس بازی گاہ کے تختہ پر آتی ہیں اور ایک قوم اپنا کھیل ختم کر کے کسی دوسری کے لیے جگہ خالی کر جاتی ہے' یہ سلسلہ ازل سے قائم ہے اور اب تک چل رہا ہے' کائنات جس نظام پر پیدا ہوئی تھی وہ بعینہٖ قائم ہے اور اس محفل کی جو رونق اول روز تھی وہ اب تک اسی طرح باقی ہے' غرض

ہزار شمع بکشتند و انجمن باقی است

لیکن کیا کوئی ایسا دن بھی آئے گا جب یہ ساری بساطِ ہستی الٹ جائے گی' کائنات کی یہ مجلس درہم برہم ہو جائے گی' اور آسمان و زمین کے کُرّے ٹکرا کر چور چور ہو جائیں گے' اور پھر وہ خلاقِ عالم اپنی صفتِ خلق و احسان و جزا کے منظر دکھائے گا اور نئی زمین اور نیا آسمان پیدا ہو کر ایک اور عالم کسی نئے نظام پر وجود پذیر ہوگا۔

نظامِ کائنات کی بربادی

دنیا کے وہ تمام لوگ جو حال کو دیکھ کر مستقبل کا پتا لگاتے ہیں کسی نہ کسی طرح اس سوال کا جواب اثبات میں دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جس طرح یہ افراد آتے اور فنا ہوتے ہیں' اسی طرح ایک دن آئے گا جب اس پوری دنیائے حیات پر موت طاری ہوگی' سب سے زیادہ اس سوال کے جواب میں کرید بلکہ انکار کا حق فلسفہ اور سائنس کے محققوں (سائنٹسٹس) کو ہوسکتا ہے۔ اہل فلسفہ کا بڑا گروہ اس امکان پر یقین رکھتا ہے' اور اہلِ سائنس بھی اس کو بہر حال محال نہیں سمجھتے بلکہ طبیعات دہیئتِ جدید کے مختلف محققوں کے خیالات اس باب میں امکان سے آگے بڑھ کر وقوع کی سرحد تک پہنچ چکے ہیں' وہ اس ہولناک دن کی آمد کے متعلق اپنے علم کے زور سے پیشین گوئیاں کرتے رہتے ہیں اور اس عالم گیر موت کے مختلف اسباب ظاہر ہوتے ہیں' کوئی کہتا ہے کہ نظامِ عالم کی پوری گاڑی جس انجن سے چل رہی ہے' وہ گرم آفتاب ہے جس کی یہ گرمی روز بروز کم ہوتی جاتی ہے' آخر ایک دن آئے گا۔ جب یہ انجن بالکل ٹھنڈا ہو جائے گا اور ساری گاڑی ٹوٹ پھوٹ جائے گی' ایک سبب یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ یہ پورا نظامِ کائنات جذب و کشش کے ستون پر قائم اور فضائے ہستی کے یہ تمام سیارے روز بروز کھنچے چلے آتے ہیں تو ایک دن وہ بھی آئے گا جب باہمی توازن باقی نہیں رہے گا' اس وقت تمام کُرّے ایک دوسرے سے قریب ہو کر

ٹکرا جائیں گے' اور یہ تصادم ان کو چور چور کر دے گا۔

ایک اور خیال یہ ہے کہ اس فضا میں کروڑوں ستارے تیر رہے ہیں' ان میں سے بہت کم کا علم ہم کو ہوا ہے' بہت ممکن ہے کہ کسی زمانہ میں ہماری زمین کسی نئے ستارہ سے ٹکرا کر چور چور ہو جائے اور اس کی ساری آبادی ہباءً منثوراً ہو کر رہ جائے۔

بہر حال اسبابِ طبعی کچھ ہوں مگر ایسا ہونا اہلِ سائنس کے نزدیک بھی امکان بلکہ وقوع کی امید سے خالی نہیں۔

قیامت کا عقیدہ

اہلِ مذاہب میں یہ عقیدہ کسی نہ کسی نوع سے ہر جگہ موجود ہے اور اس کا مجمل تذکرہ تمام آسمانی کتابوں میں ہے تورات میں اس کے اشارے پائے جاتے ہیں' زبور میں اس کی تصریحات ہیں' اور اس میں اس کو عدالت کا دن کہا گیا ہے۔ (۱) حضرت مسیح علیہ السلام کے زمانہ میں یہود کے دو فرقے تھے' ایک صدوقی' جو یونانیوں کے اثر سے آزاد خیال ہو گیا تھا' اور قیامت کا منکر تھا' مگر دوسرا فرقہ جو فریسی کہلاتا تھا' بدستور اپنے پرانے عقیدے پر قائم تھا' (۲) آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں جو یہودی تھے وہ قیامت حشر و نشر اور بہشت و دوزخ کے قائل تھے' ان کا عقیدہ تھا کہ جب قیامت آئے گی تو اللہ تعالیٰ ایک انگلی پر آسمانوں کو اور دوسری پر زمینوں کو' تیسری پر درختوں کو چوتھی پر پانی کو اور اندر کی نرم مٹی کو اور پانچویں پر تمام مخلوقات کو رکھے گا' اور ندا آوے گی کہ میں ہوں بادشاہ (۳) انجیل میں یہ عقیدہ پوری تصریح کے ساتھ مذکور ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے صدوقیوں کے مقابلہ میں توریت کی ایک آیت سے حیاتِ اخروی کا ثبوت پیش کیا ہے۔ (۴) اور مکاشفاتِ یوحنا میں قیامت کے احوال و اہوال کی پوری تفصیل و تشریح مذکور ہے' ہندو پرلوک کے نام سے اس عقیدہ (فنائے عالم) پر یقین رکھتے ہیں لیکن اس حقیقت کی کامل تشریح خاتم الانبیا محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ سے انجام کو پہنچی ہے۔

قیامت کے نام

کسی شے کی حقیقت کی اولین گرہ کشائی' اس کے ناموں کی تشریح سے ہوتی ہے' قرآن پاک میں قیامت کو بیسیوں ناموں سے یاد کیا گیا ہے' اور ان میں سے ہر ایک نام اس کے ایک خاص پہلو کو نمایاں اور ظاہر کرتا ہے قرآن میں اس کا سب سے پہلا نام جو سب سے پہلی سورہ میں ہے' وہ یوم الدین ہے' یعنی جزا کا دن' جس سے یہ

(۱) زبور ۹۔۶' ۱۷۱۔۱' ۲ و باب ۴۹' ۵۰۔
(۲) انجیل مرقس ۱۲' ۲۴ و اعمال ۲۳۔
(۳) صحیح بخاری تفسیر سورۂ زمر۔
(۴) متی ۲۲۔۳۱' ۳۲ لوقا ۲۰' ۲۷ مرقس ۱۸' ۱۲۔

معلوم ہوا کہ یہ عمومی جزا اور زبانی عدالت کا دن ہوگا' اس کے علاوہ اس کے اور بھی بہت سے نام قرآن میں جا بجا ہیں۔

﴿اَلسَّاعَةُ﴾ وہ گھڑی (وہ مقررہ وقت)

﴿يَوْمُ الْقِيَامَةِ﴾ کھڑے ہونے کا دن (مُردوں کے کھڑے ہونے کا دن)

﴿اَلْيَوْمُ الْحَقُّ﴾ سچا دن (نہ جس کے آنے میں کوئی شک ہے اور نہ جس کے فیصلہ میں کوئی غلطی ہوگی)

﴿يَوْمٌ مَّعْلُوْمٌ﴾ جانا ہوا دن' یا مقررہ دن۔

﴿اَلْيَوْمُ الْمَوْعُوْدُ﴾ موعودہ دن۔

﴿اَلْوَقْتُ الْمَعْلُوْمُ﴾ جانا ہوا وقت یا مقررہ وقت۔

﴿يَوْمُ الْاٰزِفَةُ﴾ قریب آنے والی مصیبت کا دن۔

﴿اَلْيَوْمُ الْاٰخِرِ﴾ پچھلا دن۔

﴿يَوْمٌ عَظِيْمٌ﴾ ایک بڑا دن۔

﴿يَوْمٌ عَسِيْرٌ﴾ ایک سخت دن۔

﴿يَوْمُ الْبَعْثِ﴾ جی اٹھنے کا دن۔

﴿يَوْمٌ عَصِيْبٌ﴾ سخت دن۔

﴿يَوْمَ التَّلَاقِ﴾ باہم ملنے کا دن۔

﴿يَوْمَ التَّنَادِ﴾ پکار کا دن۔

﴿يَوْمُ الْجَمْعِ﴾ اکٹھے ہونے کا دن۔

﴿يَوْمُ الْحِسَابِ﴾ حساب دن۔

﴿يَوْمُ الْحَسْرَةِ﴾ حسرت کا دن۔

﴿يَوْمُ الْخُرُوْجِ﴾ قبروں سے نکلنے کا دن۔

﴿يَوْمُ الْفَصْلِ﴾ فیصلہ کا دن۔

﴿اَلْقَارِعَةُ﴾ کھڑکھڑانے والی۔

﴿اَلْغَاشِيَةُ﴾ چھا جانے والی۔

﴿اَلطَّامَّةُ الْكُبْرٰى﴾ بڑی مصیبت۔

﴿اَلنَّبَاُ الْعَظِيْمُ﴾ بڑی خبر۔

﴿اَلْحَآقَّةُ﴾ ضرور آنے والی گھڑی۔

﴿اَلْوَعْدُ﴾ وعدہ۔

﴿اَلْوَاقِعَةُ﴾ وقوع پذیر۔
﴿اَمْرُ اللّٰهِ﴾ خدا کی بات۔
﴿اَلصَّآخَّةُ﴾ بہرا کرنے والی گھڑی۔

قیامت کے اوصاف

یہ تو وہ نام ہیں جو اسمِ مفرد یا اضافت' یا صفت کی صورت میں ہیں' ان کے علاوہ فقروں اور جملوں کی ترکیبوں کے ساتھ اس کے اور بھی بکثرت نام قرآن میں آئے ہیں' مثلاً۔

﴿یَوْمَ یُنْفَخُ فِی الصُّوْرِ﴾ ''جن دن نرسنگا پھونکا جائے گا۔''
﴿یَوْمَ یَنْفَعُ الصَّادِقِیْنَ صِدْقُهُمْ﴾ ''جس دن سچوں کو ان کی سچائی کام دے گی۔''
﴿یَوْمَ لَا یَنْفَعُ مَالٌ وَّ لَا بَنُوْنَ﴾ ''جس دن نہ مال کام آئے گا نہ اولاد۔''
﴿وَ یَوْمَ یَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰی یَدَیْهِ﴾
''اور جس دن گنہگار اپنے دونوں ہاتھ چبائے گا۔''
﴿وَ یَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ﴾ ''اور جس دن آسمان پھٹے گا۔''
﴿وَ یَوْمَ یَقُوْمُ الْاَشْهَادُ﴾ ''جس دن گواہ کھڑے ہوں گے۔''
﴿لِیَوْمٍ لَّا رَیْبَ فِیْهِ﴾ ''جس دن میں کوئی شک نہیں۔''
﴿وَ یَوْمَ نَحْشُرُ مِنْ کُلِّ اُمَّةٍ فَوْجًا﴾ ''جس دن ہم ہر قوم سے ایک گروہ کو اکٹھا کریں گے۔''
﴿یَوْمَ یَقُوْمَ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ ''جس دن لوگ جہان کے پروردگار کے لیے کھڑے ہوں گے۔
﴿یُخْرِجُوْنَ مِنَ الْاَجْدَاثِ﴾ (''جس دن) لوگ قبروں سے نکلیں گے۔''
﴿یَوْمَ یَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِیْهِ وَ اُمِّهٖ وَ اَبِیْهِ وَ صَاحِبَتِهٖ وَ بَنِیْهِ﴾ ''جس دن آدمی اپنے بھائی اور اپنی ماں اور باپ اور اپنی بیوی اور اپنے بیٹوں سے بھاگے گا۔''
﴿یَوْمًا لَّا تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَیْئًا﴾ ''جس دن کوئی شخص کسی کے کچھ بھی کام نہ آئے گا۔''
﴿یَوْمَ تَشْهَدُ عَلَیْهِمْ اَلْسِنَتُهُمْ﴾ ''جس دن ان کی زبانیں ان کے خلاف گواہی دیں گی۔''
﴿یَوْمَ لَا تَمْلِکُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَیْئًا﴾ ''جس دن کوئی دوسرے کے لیے کچھ بھلا نہ کر سکے گا۔''
﴿یَوْمَ لَا یُغْنِیْ مَوْلًی عَنْ مَّوْلًی شَیْئًا﴾ ''جس دن کوئی دوست کسی دوسرے دوست کو فائدہ نہ پہنچا سکے گا۔''
الغرض یہ اور اسی قسم کے دوسرے اوصاف اس ہولناک دن کے بیان کیے گئے ہیں' جن سے اس عظیم الشان دن میں انسان کی بے کسی' عاجزی اور اپنے اعمال کے سوا کسی دوسری چیز کے کام آنے سے قطعی مایوسی ظاہر کی گئی ہے۔

قیامت میں فسادِ نظام ہوگا

قیامت کے متعلق بعض متکلمین کو یہ شبہ ہوا ہے کہ وہ مادہ کے فنائے محض یا عدمِ محض کا نام ہے' حالانکہ یہ بات قرآنی تصریحات کے خلاف ہے۔ قرآن پاک کی بیسیوں آیتوں میں قیامت کی جو تصویر کھینچی گئی ہے وہ تمام تر فنائے حیات اور آسمان وزمین کے نظام کی برہمی اور ان کی تباہی کے خاکہ کے سوا کچھ اور نہیں' چنانچہ حسبِ ذیل آیات پر غور کرنے سے یہ نتیجہ خود بخود سامنے آجائے گا۔

﴿اَلْقَارِعَةُ ○ مَا الْقَارِعَةُ ○ وَ مَآ اَدْرٰکَ مَا الْقَارِعَةُ ○ یَوْمَ یَکُوْنَ النَّاسُ کَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ ○ وَ تَکُوْنُ الْجِبَالُ کَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ ○﴾ (قارعہ:۱'۵)

''متنبہ کرنے والی اور کیا چیز ہے متنبہ کرنے والی اور تم کو کس نے بتایا کہ کیا چیز ہے متنبہ کرنے والی' یہ وہ دن ہے جب لوگ پریشان پروانوں کی طرح اور پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح ہوں گے۔''

﴿اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا ○ وَ اَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا ○ وَ قَالَ الْاِنْسَانُ مَالَهَا ○ یَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا ○﴾ (زلزال:۱'۴)

''جب زمین خوب ہلائی جائے گی اور وہ اپنا بوجھ نکالے گی' اور انسان کہے گا زمین کو کیا ہوا' اس دن وہ اپنی حالت بیان کرے گی۔''

﴿اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ ○ وَ اَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَ حُقَّتْ ○ وَ اِذَا الْاَرْضُ مُدَّتْ ○ وَ اَلْقَتْ مَا فِیْهَا وَ تَخَلَّتْ ○﴾ (انشقاق:۱'۴)

''جب آسمان پھٹ جائیں گے اور وہ اپنے مالک کی فرمان برداری کریں گے اور وہ فرمان برداری کے لائق ہیں جب زمین پھیلائی جائے اور جو کچھ اس میں ہے اس کو ڈال دے گی اور خالی ہو جائے گی۔''

﴿اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ ○ وَ اِذَا الْکَوَاکِبُ انْتَثَرَتْ ○ وَ اِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ ○ وَ اِذَا الْقُبُوْرُ بُعْثِرَتْ ○ عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَ اَخَّرَتْ ○﴾ (انفطار:۱'۵)

''جب آسمان پھٹ جائیں گے اور جب ستارے بکھر جائیں گے اور جب سمندر چلائے جائیں گے اور جب قبر کے لوگ زندہ کیے جائیں گے اس وقت روح نے جو کچھ پہلے اور پیچھے بھیجا ہے اس کو جان لے گی۔''

﴿اِذَا الشَّمْسُ کُوِّرَتْ ○ وَ اِذَا النُّجُوْمُ انْکَدَرَتْ ○ وَ اِذَا الْجِبَالُ سُیِّرَتْ ○﴾ (تکویر:۱'۳)

''جب آفتاب اندھیر کیا جائے گا' جب ستارے تاریک ہو جائیں گے جب پہاڑ چلائے جائیں گے۔''

﴿اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَوَاقِعٌ ○فَاِذَا النُّجُوْمُ طُمِسَتْ ○وَ اِذَا السَّمَآءُ فُرِجَتْ ○وَ اِذَا الْجِبَالُ نُسِفَتْ﴾ (مرسلات:۷'۱۰)

''جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے وہ یقیناً ہونے والا ہے جب ستارے ماند کر دیے جائیں گے اور جب آسمان کھول دیا جائے گا اور جب پہاڑ ریزہ ریزہ کر دیے جائیں گے۔''

﴿فَاِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ ○ وَ خَسَفَ الْقَمَرُ ○ وَ جُمِعَ الشَّمْسُ وَ الْقَمَرُ ○﴾ (قیامہ:۷'۹)

''جب نگاہ ماند ہو جائے گی' جب ماہتاب بے نور ہو جائے گا اور آفتاب و ماہتاب اکٹھا کر دیے جائیں گے۔''

﴿یَوْمَ تَکُوْنُ السَّمَآءُ کَالْمُهْلِ ○ وَ تَکُوْنُ الْجِبَالُ کَالْعِهْنِ﴾ (معارج:۸'۹)

''جب آسمان پگھلے ہوئے تانبے کی طرح اور جب پہاڑ روئی کے گالوں کی مانند ہو جائیں گے۔''

﴿فَاِذَا نُفِخَ فِی الصُّوْرِ نَفْخَةٌ وَّاحِدَةٌ ○ وَّ حُمِلَتِ الْاَرْضُ وَ الْجِبَالُ فَدُکَّتَا دَکَّةً وَّاحِدَةً ○ فَیَوْمَئِذٍ وَّقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ○ وَ انْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَهِیَ یَوْمَئِذٍ وَّاهِیَةٌ○﴾ (الحاقۃ:۱۳'۱۶)

''جب صور میں ایک پھونک پھونکی جائے گی' جب زمین اور پہاڑ اٹھائے جائیں گے اور دونوں ٹکڑے ہو جائیں گے' اس دن ہونے والی بات ہو جائے گی اور آسمان پھٹ جائے گا اور اس دن کمزور ہو جائے گا۔''

﴿یَوْمَ تَرْجُفُ الْاَرْضُ وَ الْجِبَالُ وَ کَانَتِ الْجِبَالُ کَثِیْبًا مَّهِیْلًا ○ فَکَیْفَ تَتَّقُوْنَ اِنْ کَفَرْتُمْ یَوْمًا یَّجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِیْبَانِ ○ السَّمَآءُ مُنْفَطِرٌ بِهٖ وَ کَانَ وَعْدُهٗ مَفْعُوْلًا○﴾ (المزمل:۱۴'۱۷۔۱۸)

''جب زمین اور پہاڑوں میں لرزہ ہو گا اور پہاڑ پگھلا ہوا تانبا ہو جائیں گے کیونکر متقی ہو سکتے ہیں جب اس دن کا انکار کرتے ہو جو بچوں کو بوڑھا بنا دے گا' آسمان اس دن پھٹ جائیں گے اور خدا کا وعدہ پورا ہو جائے گا۔''

﴿یَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَیْرَ الْاَرْضِ﴾ (ابراہیم:۴۸)

''جب یہ زمین دوسری زمین سے بدل دی جائے گی۔''

﴿فَاِذَا انْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَکَانَتْ وَرْدَةً کَالدِّهَانِ﴾ (الرحمٰن:۳۷)

''جب آسمان پھٹ جائیں گے اور سرخ تلچھٹ کی طرح ہو جائیں گے۔''

﴿اِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ○ لَیْسَ لِوَقْعَتِهَا کَاذِبَةٌ ○ خَافِضَةٌ رَّافِعَةٌ ○ اِذَا رُجَّتِ الْاَرْضُ رَجًّا وَّ بُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا ○ فَکَانَتْ هَبَآءً مُّنْبَثًّا﴾ (واقعۃ:۱'۶)

''جب ہونے والی بات ہو جائے گی جس کے ہونے میں جھوٹ نہیں ہے' زیروزبر کر دینے والی جب زمین خوب ہلائی جائے گی اور پہاڑ پراگندہ کئے جائیں گے اس وقت وہ پریشان ذرات کی طرح ہو جائیں گے۔''

﴿وَ فُتِحَتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ اَبْوَابًا ○ وَّ سُيِّرَتِ الْجِبَالُ فَكَانَتْ سَرَابًا﴾(النباء:۱۹'۲۰)

''اور آسمان کھول دیے جائیں گے تو وہ دروازے دروازے ہو جائیں گے' اور پہاڑ چلائے جائیں گے تو وہ سراب ہو جائیں گے۔''

غرض اس قسم کی اور بہت سی آیتیں ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قیامت صرف نظامِ عالم کی درہمی اور دنیا کی حیاتِ موجودہ کی تباہی کا نام ہے جس کے بعد ایک نئی زمین اور ایک نیا آسمان بنے گا اور پچھلی دنیا کے نتائج پر اس دنیا کی حکومت کا قانون جاری ہوگا۔

﴿يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَ السَّمٰوٰتُ وَ بَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ﴾ (ابراہیم: ۴۸)

''جس دن یہ زمین دوسری زمین سے بدل جائے گی اور آسمان بھی بدل جائیں گے اور سب لوگ اس ایک سب پر قابو رکھنے والے خدا کے سامنے نکل کر آئیں گے۔''

قیامت کی حقیقت

اگرچہ قرآنِ پاک میں متفرق طور پر اس ہولناک دن کے احوال و کیفیت کا ذکر گوناگوں طریقوں سے کیا گیا ہے' تاہم ایک خاص سورہ بھی اس نام سے اس میں موجود ہے' جس میں نہایت اختصار و ایجاز کے باوجود انتہائی بلیغانہ وسعت ہے' چھوٹے چھوٹے فقروں میں بڑے بڑے اور اہم سے اہم مطالب کو اس طرح بیان کیا ہے کہ عقل ساکت اور قلب مطمئن ہو جاتا ہے اس سورہ کا آغاز ان آیتوں سے ہوتا ہے۔

﴿لَآ اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيَامَةِ ○ وَ لَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ○ اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ لَّنْ نَّجْمَعَ عِظَامَهٗ ○ بَلٰى قَادِرِيْنَ عَلٰٓى اَنْ نُّسَوِّيَ بَنَانَهٗ ○ بَلْ يُرِيْدُ الْاِنْسَانُ لِيَفْجُرَ اَمَامَه ○ يَسْئَلُ اَيَّانَ يَوْمُ الْقِيٰمَةِ ○ فَاِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ وَ خَسَفَ الْقَمَرُ ○ وَ جُمِعَ الشَّمْسُ وَ الْقَمَرُ ○ يَقُوْلُ الْاِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ اَيْنَ الْمَفَرُّ ○ كَلَّا لَا وَزَرَ ○ اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَئِذِ نِ الْمُسْتَقَرُّ ○ يُنَبَّؤُا الْاِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ بِمَا قَدَّمَ وَ اَخَّرَ ○ بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ ○ وَ لَوْ اَلْقٰى مَعَاذِيْرَهٗ﴾ (قیامہ:۱'۱۵)

''میں قیامت کے دن کی اور ملامت کرنے والے نفس کی قسم کھاتا ہوں کہ کیا (انسان) سمجھتا ہے کہ ہم (اس کے مرنے کے بعد) اس کی ہڈیوں کو اکٹھا نہیں کر سکتے' کیوں نہیں ہم تو اس کے پوروں کو درست

کر سکتے ہیں یہ نہیں بلکہ اصلی بات یہ ہے کہ انسان چاہتا یہ ہے کہ خدا کے سامنے ڈھٹائی کرے۔ پوچھتا ہے کہ قیامت کا دن کب ہے؟ تو جب نگاہ چوندھیانے لگے اور چاند بے نور ہو جائے اور سورج اور چاند ایک جگہ کر دیے جائیں' انسان اس دن کہے گا کہ اب کہاں ہے بھاگنے کی جگہ۔ ہرگز نہیں کہیں بچاؤ نہیں اس دن تیرے رب کے پاس ہے جا ٹھہرنا' اس دن انسان کو جو اس نے آگے بھیجا (عمل) اور پیچھے چھوڑا (مال و دولت) وہ بتایا جائے گا بلکہ انسان اپنے حال کو آپ دیکھتا ہے' اگرچہ وہ زبان سے بہانے تراشا کرے۔"

ان میں سے پہلی ہی آیت میں اللہ تعالیٰ نے روزِ قیامت اور نفسِ لوّامہ کی یکے بعد دیگرے قسم کھائی ہے' نفسِ لوّامہ یعنی ملامت کرنے والے نفس سے مقصود انسان کے اندر کا ضمیر ہے جو اس کے ہر برے کام کے وقت اندر سے غمگین و نادم ہوتا ہے اور اس کو اس کے اس کام پر ملامت کرتا ہے آخری آیت میں اسی کیفیتِ ضمیر کو ان لفظوں میں ادا فرمایا' بلکہ انسان اپنے حال کو آپ ہی خوب جانتا ہے' اگرچہ وہ زبان سے اپنی برائیوں اور کوتاہیوں کے لیے سینکڑوں بہانے تراشا کرے۔ انسان کی اس قلبی کیفیت کا نام نفسِ لوّامہ ہے۔

(۱) اجتماعیات کے عالم اچھی طرح جانتے ہیں کہ فرد اور جماعت کے احوال میں ایک خاص قسم کی مناسبت ہے' جس طرح آدمی پیدا ہوتا ہے' بڑھتا ہے بیمار ہوتا ہے' تندرست ہوتا ہے' گنہگار ہوتا ہے' نکوکار ہوتا ہے' پشیمان ہوتا ہے محنت کرتا ہے' نکونام ہوتا ہے' بدنام ہوتا ہے' خاص طبعی قوانین کی مطابقت سے وہ قوت حاصل کرتا ہے اور ان کی مخالفت سے وہ بیمار اور کمزور ہوتا ہے' پھر ایک خاص عمر کو پہنچ کر رفتہ رفتہ اس کے قوائے عمل سرد پڑتے جاتے ہیں۔ اور وہ مر جاتا ہے بعینہٖ یہی تمام احوال جماعتوں اور قوموں کو بھی پیش آتے ہیں' وہ بھی پیدا ہوتی ہیں' بڑھتی ہیں' تندرست ہوتی ہیں' کمزور ہو جاتی ہیں' گنہگار ہوتی ہیں' نیکوکار بنتی ہیں اور ایک خاص وقت اور عمر کو پہنچ کر ان کے عملی قویٰ کمزور اور مضمحل ہو جاتے ہیں اور وہ فنا ہو جاتی ہیں۔

دنیا میں اسی اصول پر ہزاروں قومیں پیدا ہو کر فنا ہو چکی ہیں۔ جن کے نام بھی تاریخ کے صفحوں پر آج موجود نہیں ہیں تو جس اصول پر اشخاص اور اشخاص کا مجموعہ جماعتیں اور جماعتوں کا مجموعہ اقوام پیدا ہوتی اور فنا ہوتی ہیں' کیا اسی اصول پر تمام اقوامِ عالم کا یہ مجموعہ جو پیدا ہوتا' بڑھتا اور ترقی کرتا چلا جاتا ہے ایک دن فنائے محض کے آغوش میں جا کر نہ سو جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک نے قیامت کے ثبوت میں اکثر عاد و ثمود و آلِ فرعون وغیرہ قوموں کی تباہی سے قیامت کی عمومی تباہی پر استدلال کیا ہے' اس کی مزید تفصیل آگے آئے گی۔

بہرحال اب جس طرح شخص کے اندر ایک نفسِ لوامہ' یا' ضمیر یا احساس ہے جو اس کے ہر برے فعل کے وقت اس کو ملامت کرتا اور اس کو گنہگار ٹھہراتا ہے اور جب کبھی وہ اپنے تمام کارناموں پر نگاہ ڈالتا ہے تو اپنے کو قصور وار جانتا اور گنہگار سمجھتا ہے اسی طرح قوموں کا ضمیر بھی اپنے گناہوں پر پچھتاتا اور اپنی تقصیروں پر نادم اور کوتاہیوں پر شرمندہ ہوتا ہے' اور ٹھیک اسی طرح یہ پوری انسانیت بھی ایک دن اپنے افراد کے مجموعی کارناموں پر نادم و پشیمان

ہوگی' اور اس کا ضمیر و نفسِ لوامہ بھی اس کو ملامت کرے گا' کائناتِ انسانی سے بڑھ کر خود کائناتِ ہستی بھی اس پر جو اس کے اندر کیا گیا' اپنے خالق کے سامنے اپنی پشیمانی و ندامت کا اظہار کرے گی اسی عمومی اعترافِ قصور اور کلی ندامت و پشیمانی کا نام قیامت ہے اور اسی مناسبت سے سورہ بالا میں نفسِ لوامہ اور قیامت کو باہم ایک قسم یعنی شہادت میں یکجا کیا گیا ہے اب اس تفصیل کی روشنی میں سورۂ مذکور کی آیتوں کو دوبارہ پڑھیے۔ (۱)

(۲) اس عالم کی ہر چیز پر اگر غور سے نگاہ ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ وہ متضاد عناصر و قویٰ کا مجموعہ ہے' اس میں سردی و گرمی' بیماری و تندرستی بقا و فنا اور دیگر ہر قسم کی متضاد قوتیں ودیعت رکھی گئی ہیں' ان متضاد قوتوں میں جب تک اعتدال قائم رہتا ہے' وہ چیز زندہ رہتی ہے' اور جس وقت یہ اعتدال جاتا رہتا ہے' اسی لمحہ وہ فنا ہو جاتی ہے ایک درخت میں ایک پھول کھلا' سردی و گرمی اور موسم کی تاثیر نے اس پر عمل کیا' جب تک ان متضاد دو تاثیرات و استعدادات میں اعتدال کی کیفیت رہی' وہ پھول شگفتہ رہا جس آن کسی ایک قوت نے شکست کھائی پھول کی ہستی معرضِ فنا میں آ گئی۔ یہی حال دنیا کی ہر چیز کا ہے اور اسی اصول پر افراد' خاندان' جماعتیں' قومیں' بلکہ حیوانات' شجر' حجر غرض دنیا کی ہر چیز چل رہی ہے۔

پوری کائناتِ ہستی کو لیجیے' اس کو خلاقِ عالم نے ان ہی متضاد عناصر و اخلاط پر قائم فرمایا ہے' دن رات' روشنی تاریکی' سردی گرمی' پانی آگ' بہار خزاں' تندرستی بیماری' دولت افلاس' حیات و موت' آسمان زمین' نیکی بدی' خیر شر' غرض جس کو بھی دیکھو یہی معلوم ہوگا کہ یہ اربع عناصر کی چہار دیواری' متضاد قویٰ اور حالات کی بنیادوں پر قائم ہے ان میں جب تک اعتدال قائم ہے' اس دنیا کی کل چل رہی ہے جس دن ان کے اعتدال میں فرق آیا وہی اس کی فنا کا دن ہوگا۔

لیکن جس طرح افراد و اشخاص میں بیماری کے بعد تندرستی اور تندرستی کے بعد بیماری کی صلاحیت موجود ہے اسی طرح اس نظامِ کائنات میں بھی تندرستی کے بعد بیماری اور بیماری کے بعد تندرستی کی صلاحیتیں پائی جاتی ہیں' کتنی دفعہ یہ واقعہ پیش آیا ہے کہ دنیا ظلم و جور سے لبریز ہوگئی اور کشت و خون کے سیلاب نے اس کے امن و امان کو غرق کر دیا کہ دفعتاً وہ پھر ابھری' اور اس کا غرق شدہ امن و امان کشتیٔ نوحؑ بن کر کرۂ ارضی کو بچا لے گیا' بارہا اس باغِ ہستی میں خزاں آئی اور پھر بہار کا موسم اس پر چھا گیا' اجرامِ سماوی کی باہمی مسابقت میں ہماری زمین کئی دفعہ ٹکرا جانے کے قریب پہنچی اور پھر بال بال بچ گئی' یہ کُرّے اپنی رفتار میں بسا اوقات گرنے کے قریب پہنچے' کہ پھر سنبھل گئے' مگر فساد و صلاح کا یہ نظام اسی وقت تک چل رہا ہے جب تک ان متضاد قویٰ اور کائنات کے استعدادات میں اعتدال قائم ہے' جس دن اعتدال فنا ہوگا۔ نظامِ ارضی کا پورا کارخانہ بھی درہم برہم ہو جائے گا' اس وقت زمین اپنی عمر کی پوری تاریخ اور کارناموں کے ساتھ اپنے خالق کے سامنے کھڑی ہوگی اور اپنے اوپر کی ہر کوتاہی و قصور کی شہادت اپنی زبان سے دے گی۔

---

(۱) مستفاد از تفسیر سورۂ قیامہ مولانا حمید الدین رحمۃ اللہ علیہ۔

﴿اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا ○ وَ اَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا ○ وَ قَالَ الْاِنْسَانُ مَالَهَا ○ یَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا ○ بِاَنَّ رَبَّکَ اَوْحٰی لَهَا ○ یَوْمَئِذٍ یَّصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا لِّیُرَوْا اَعْمَالَهُمْ ○ فَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَیْرًا یَّرَهٗ ○ وَ مَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا یَّرَهٗ ○﴾ (الزلزال:۱۔۸)

''جس وقت زمین ہلائی جائے گی' اور جب وہ اندر کے بوجھوں کو اگل دے گی' اور انسان کہے گا کہ اس کو کیا ہو گیا ہے اس دن وہ اپنی باتیں بیان کرے گی کہ اس کے پروردگار نے اس کو حکم دیا ہے اس دن لوگ لوٹیں گے کہ اپنے عمل دیکھیں' تو جس کسی نے ذرہ برابر نیکی کی ہے وہ اس کو دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ برابر بدی کی ہے' وہ بھی اس کو دیکھ لے گا۔''

صورِ قیامت

قرآن میں قیامت کے ذکر میں صور پھونکنے کا بار بار ذکر ہے ﴿فَاِذَا نُفِخَ فِی الصُّوْرِ﴾ پھر جب صور پھونکا جائے گا' صور کے لفظی معنی نرسنگھا کے ہیں' اصل یہ ہے کہ قدیم الایام میں باہلیوں' کنعانیوں' آرامیوں اور عبرانیوں وغیرہ تمام پرانی قوموں میں بادشاہی جلال وجلوس اور اعلان جنگ کے موقع پر نرسنگھا پھونکا جاتا تھا' اس لیے نرسنگھا پھونکنے کے معنی شاہی جلال کا اظہار یا غیر معمولی خطرہ کا اعلان ہے' چنانچہ تورات میں یہ محاورہ بکثرت استعمال کیا گیا ہے قرآن میں ہے کہ اس دن ندا ہو گی ﴿لِمَنِ الْمُلْکُ الْیَوْمَ﴾ آج کس کی بادشاہی ہے پھر اللہ تعالیٰ جواب دے گا ﴿لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ﴾ اس ایک سب پر غالب آنے والے کی غرض وہ دن آسمان وزمین اور نظمِ کائنات کے شہنشاہِ مطلق کے اظہارِ جلال اور شدید خطرۂ حساب کے اعلان کا ہو گا' اس لیے نفخِ صور اور نرسنگھا پھونکنے کا قدیم محاورہ اس کے لیے استعمال کیا گیا اور یہ بھی ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ واقعۃً اس دن اپنی شہنشاہی کا نرسنگھا پھونکنے کا حکم دے اور اس کی تعمیل ہو جیسا کہ صور کے لفظی معنی دلالت کرتے ہیں۔

عربوں کا انکار

اس تفصیل سے معلوم ہو گا کہ قیامت اپنے اندر کتنی عظیم الشان حقیقت رکھتی ہے لیکن اہلِ عرب کو توحید کے بعد جس عقیدہ سے شدت کے ساتھ انکار تھا جس کے ماننے پر وہ کسی طرح آمادہ نہیں ہوتے تھے' اور جو ان کی عقل میں کسی طرح نہیں سماتا تھا' وہ یہی قیامت اور حشر ونشر کا مسئلہ ہے۔ جاہلی عرب حیات بعد الموت' خدا کے آگے اپنے اعمال کے مواخذہ اور پرسش اور سزا وجزا سے قطعاً لاعلم تھے' اسی لیے ان کو اعمال کے خیر وشر اور نیکی وبدی میں وہ تمیز نہ تھی' جس پر اخلاق ومعاملات کا تمام تر دارومدار ہے' عرب کا شاعر آنحضرت ﷺ کی اس تعلیم کو سن کر تعجب سے کہتا ہے کہ

اَمَوْتُ ثُمَّ بَعْثُ ثُمَّ حَشْرُ

حَدِیْثُ خَرَافَةُ یَا اُمِّ عُمَرَ

''کیا موت ہے پھر جی اٹھنا ہے پھر اکٹھا ہونا ہے' اے ام عمر (شاعر کی بیوی کا نام ہے) یہ سب خرافات باتیں ہیں۔'' قریش کا ایک اور شاعر کہتا ہے۔ (۱)

یُحَدِّثُنَا النَّبِیُّ بِاَنَّ سَنُحْیٰی

وَ کَیْفَ حَیَاتُ اَصْدَآءُ وَ هَامِ

یہ نبی ہم سے کہتا ہے کہ ہم پھر زندہ کیے جائیں گے' حالانکہ صدیٰ اور ہام ہو کر پھر زندگی کیسی؟ (ان کا عقیدہ تھا کہ انسان مر کر پرندہ ہو جاتا ہے اور آواز دیتا پھرتا ہے' اسی کا نام ان کے ہاں صدیٰ اور ہام تھا)

قرآن مجید میں بھی ان کے یہ اقوال بکثرت نقل کیے گئے ہیں مثلاً

﴿ءَ اِذَا مِتْنَا وَ کُنَّا تُرَابًا ذٰلِکَ رَجْعٌۢ بَعِیْدٌ﴾ (قٓ : ۳)

''کیا جب ہم مر جائیں گے اور مٹی ہو جائیں گے یہ لوٹنا بہت دور ہے۔''

﴿ءَ اِنَّا لَمَرْدُوْدُوْنَ فِی الْحَافِرَةِ ○ ءَ اِذَا کُنَّا عِظَامًا نَخِرَةً﴾ (النازعات:۱۰'۱۱)

''کیا جب ہم ہڈی اور چورا ہو جائیں گے تو ہم بنا کر پھر اٹھائے جانے والے ہیں۔''

﴿ءَ اِذَا کُنَّا عِظَامًا وَّ رُفَاتًا ءَ اِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِیْدًا﴾ (بنی اسرائیل:۹۸)

''کیا جب ہم ہڈی اور چورا ہو جائیں گے تو ہم بنا کر پھر اٹھائے جانے والے ہیں۔''

﴿مَنْ یُّحْیِ الْعِظَامَ وَ هِیَ رَمِیْمٌ﴾ (یٰسٓ : ۷۸)

''ان سڑی گلی ہڈیوں کو کون جلائے گا۔''

ان میں بعضوں کا عقیدہ دہریوں کی طرح تھا کہ یہ دنیا اسی طرح قائم رہے گی' موت و حیات کا بھی سلسلہ اسی طرح برابر جاری رہے گا اور اس دنیاوی زندگی کے علاوہ کوئی دوسری زندگی نہیں ہے۔

﴿وَ قَالُوْا مَا هِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنْیَا نَمُوْتُ وَ نَحْیَا وَ مَا یُهْلِکُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ﴾ (الجاثیۃ:۲۴)

''انہوں نے کہا کہ یہی ہماری موجودہ زندگی ہے' دوسری نہیں' مرتے ہیں اور جیتے ہیں' اور زمانہ ہی ہم کو مارتا ہے۔''

﴿وَ قَالُوْٓا اِنْ هِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنْیَا وَ مَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِیْنَ﴾ (الانعام:۲۹)

''اور انہوں نے کہا یہی ہماری موجودہ زندگی ہے' ہم دوبارہ نہیں اٹھائے جائیں گے۔''

انہیں اپنے اعمال کے حساب و مواخذہ کا یقین نہ تھا۔

﴿اِنَّهُمْ کَانُوْا لَا یَرْجُوْنَ حِسَابًا﴾ (النباء:۲۷)

---

(۱) صحیح بخاری جلد اول باب الہجرۃ ص ۵۵۸۔

''وہ حساب کی امید نہیں رکھتے تھے۔''

خبابؓ بن الارت نہایت قدیم مسلمانوں میں ہیں' یہ لوہاری کا پیشہ کرتے تھے' ان کے کچھ دام قریش کے ایک رئیس عاص بن وائل پر واجب الادا تھے' وہ جب جا کر تقاضا کرتے تو عاص کہتا ''جب تک تم محمد کا انکار نہ کرو گے میں تم کو کچھ نہ دوں گا۔'' انہوں نے کہا یہ اس وقت تک نہیں ہوسکتا جب تک تم مر کر پھر جیو نہیں۔ ''اس نے کہا کیا مر کر مجھے پھر جینا بھی ہے! انہوں نے کہا ''بیشک'' اس نے مذاق سے کہا ''تو اچھا پھر وہیں میرا مال و دولت اور سروسامان ہوگا۔ وہیں تم دام بھی لے لینا[1] اس سے اندازہ ہوگا کہ اس بارہ میں اہلِ عرب کا کفر کتنا شدید تھا۔ اس لیے آنحضرت ﷺ نے ان کے سامنے توحید کے بعد جس عقیدہ کو سب سے زیادہ زور کے ساتھ پیش کیا وہ یہی تھا۔ قرآنِ مجید کی مکی سورتوں میں سب سے زیادہ اسی مضمون کو مختلف تعبیروں اور مؤثر طریقوں سے روزمرہ کے عینی مشاہدات اور دلائل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے ان میں ہیبتِ الٰہی' ہنگامۂ قیامت اور حشر ونشر کے رستخیز کی ایسی تصویر کھینچی ہے کہ سننے والا سرتا پا اثر ہو جائے۔ انسان کے عجز' عقل کے قصور' خدا کی عظمت وقدرت اور کائنات کی حیرت انگیز خلقت کو اس طرح بیان کیا ہے کہ سامع ہر قدم پر لرزہ براندام ہو جاتا ہے پھر ایک طرف حیاتِ ابدی' نعیمِ جنت اور بہشت کی مسرتوں کا دوسری طرف موت کی بے بسی' دنیا کی فنا' دوزخ کی دہشت اور عذابِ الٰہی کی تہدید کا ایسا ہولناک نقشہ کھینچا ہے کہ نفس انسانی اپنے تاثر کو چھپانے پر قادر نہیں رہتا۔

وحیِ الٰہی نے قیامت اور بہشت ودوزخ کے حالات ومناظر کو سب سے پہلے جن اسباب سے پیش کیا ہے ان سے اہلِ نظر صحابہؓ ناواقف تھے' حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ پہلے ایک بڑی سورت نازل ہوئی' جس میں جنت و دوزخ کا بیان ہے یہاں تک کہ جب لوگ اسلام کی طرف مائل ہوئے تب حلال وحرام کے احکام نازل ہوئے اور اگر پہلے ہی یہ حکم اترتا کہ شراب نہ پیو' بدکاری نہ کرو تو لوگ نہ مانتے' یہ آیت کہ ﴿بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ وَ السَّاعَةُ اَدْهٰى وَ اَمَرُّ﴾ بلکہ ان کے وعدہ کا وقت قیامت کی گھڑی نہایت مصیبت کی اور تلخ ہوگی مکہ معظمہ میں اتری اور میں اس وقت کمسن بچی تھی' کھیلتی تھی' بقرہ اور نساء کی سورتیں (جن میں احکام ہیں) اس وقت اتریں جب میں آنحضرت ﷺ کے ساتھ رہنے لگی تھی۔ [2] اس تشریح سے ثابت ہوتا ہے کہ تعلیمِ محمدی نے اس حقیقت کو ایمان کے اصول واساس میں کیوں داخل کیا ہے۔ اگر یہ تعلیم عقائد میں داخل نہ ہوتی' تو دلوں میں اعمال کی جزا و سزا کی ہیبت اور عظمت نہ بیٹھتی اور نہ احکامِ الٰہی کی تعمیل کی طرف دلی رجحان اور میلان ہوتا بلکہ یہودیوں کی طرح جن کے صحیفوں میں زیادہ تر دنیاوی جزا وسزا ہی کا ذکر باقی رہ گیا ہے' دوسرے اہل ایمان کے دل بھی سخت اور تاثر سے خالی ہو جاتے چنانچہ اس فلسفہ کو خود قرآن نے بیان کیا ہے۔

﴿فَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ قُلُوْبُهُمْ مُّنْكِرَةٌ وَّ هُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ﴾ (النحل:۲۲)

---

(۱) صحیح بخاری تفسیر کھیعص صفحہ ۶۶۱۔

(۲) صحیح بخاری جلد دوم صفحہ ۷۴۸ باب تالیف القرآن۔

''تو جولوگ آخرت کا یقین نہیں کرتے ان کے دل نہیں مانتے اور وہ غرور میں مبتلا ہیں۔''

اسی لیے مسلمانوں کو حکم ہوا کہ نماز کی ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ کی تلاوت کریں جس کا ایک ٹکڑا یہ بھی ہے ﴿مَالِکِ یَوْمِ الدِّیْنَ﴾ (روزِ جزا کا مالک) اسلام چاہتا ہے کہ یہ حقیقت اس کے پیروؤں کے دلوں میں پوری طرح گھر کرلے۔

قیامت پر قرآنی دلائل

قرآن نے قیامت کی ضرورت پر تمام دوسری دلیلوں سے قطع نظر کرکے عموماً دو باتوں سے استدلال کیا ہے اول یہ کہ انسان بے کار اور بے مقصد نہیں پیدا کیا گیا۔ اگر اس کے اعمال کا مؤاخذہ اور جزا و سزا نہ ہو تو خیر و شر اور نیکی بدی کا فطری امتیاز لغو اور انسانی زندگی تمام تر بے مقصد اور اس کے تمام کام بے نتیجہ ہو جائیں۔

﴿اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰکُمْ عَبَثًا وَّ اَنَّکُمْ اِلَیْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ﴾ (مومنون:۱۱۵)

(''اے لوگو)! کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ ہم نے تم کو بیکار پیدا کیا اور تم ہماری طرف لوٹائے نہ جاؤ گے۔''

﴿اَیَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ یُّتْرَکَ سُدًی﴾ (قیامہ:۳۶)

''کیا انسان یہ سمجھتا ہے کہ وہ بیکار چھوڑ دیا جائے گا۔''

دوسری بات جو روزِ جزا کی ضرورت کے ثبوت میں قرآن نے پیش کی ہے' وہ اللہ تعالیٰ کا عادل اور منصف ہونا ہے اگر اچھے اور برے انسانوں کے اعمال کی جزاء و سزا نہ ہو تو دونوں کا درجہ برابر ہو جائے اور نیکی و بدی اور گناہ و ثواب کے کوئی معنی نہ رہیں' بلکہ نعوذ باللہ خدا ظالم اور غیر منصف قرار پائے' اس موجودہ مادی دنیا میں بھی انسانوں کو اپنے اعمال کی کچھ نہ کچھ جزا ملتی ہے تاہم یہ صاف نظر آتا ہے کہ بہت سے گنہگار' سیہ کار اور ظالم یہاں آرام اور چین کی زندگی بسر کرتے ہیں اور بہت سے نیکوکار' پرہیز گار اور اچھے لوگ مصیبتیں اور کلفتیں جھیلتے ہیں اس لیے یقیناً یہ موجودہ زندگی اعمال کی جزا و سزا کی اصلی جگہ نہیں ہو سکتی۔ اس بنا پر دوسری زندگی کا ماننا ضروری ہے' جہاں ہر شخص کو اس کے اعمال کا پورا نتیجہ مل سکے اس موجودہ دنیا میں دنیاوی احکام اپنے ناقص علم کے مطابق اچھوں اور بروں کو ان کے اعمال کی جزا و سزا دیتے رہتے ہیں' پھر کتنا ضروری ہے کہ پوری دنیا کا عالم الغیب حاکم اپنے صحیح علم کے مطابق لوگوں کو جزا و سزا دے کر اپنے عدل و انصاف کا ثبوت دے۔ سورۂ والتین میں اسی استدلال کی طرف اشارہ ہے۔

﴿اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَیْرُ مَمْنُوْنٍ ○ فَمَا یُکَذِّبُکَ بَعْدُ بِالدِّیْنِ ○ اَلَیْسَ اللّٰهُ بِاَحْکَمِ الْحَاکِمِیْنَ ○﴾ (التین:۶'۸)

''لیکن جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک کام کیے' ان کے لیے نہ ختم ہونے والا اجر ہے' پھر اس کے بعد تجھ کو کیا چیز جزا پر یقین لانے نہیں دیتی' کیا اللہ تمام حاکموں میں سب سے بڑا حاکم نہیں (تمام فیصلہ کرنے والوں میں سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا نہیں)۔''

اسی لیے قرآن پاک کی مختلف آیتوں میں اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے کہ نیک و بد کا نتیجۂ عمل یکساں نہیں ہوسکتا۔ ایک جگہ خدا فرماتا ہے:

﴿اَمْ نَجْعَلُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کَالْمُفْسِدِیْنَ فِی الْاَرْضِ اَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِیْنَ کَالْفُجَّارِ﴾ (صٓ : ۲۸)

''کیا ان کو جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے' ان کی طرح کر دیں جو زمین میں فساد کرتے ہیں یا پرہیز گاروں کو بدکاروں کی طرح کریں۔''

دوسری جگہ ارشاد ہوا:

﴿اَمْ حَسِبَ الَّذِیْنَ اجْتَرَحُوا السَّیِّئَاتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ کَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَوَآءً مَّحْیَاهُمْ وَ مَمَاتُهُمْ سَآءَ مَا یَحْکُمُوْنَ﴾ (جاثیۃ:۲۱)

''کیا انہوں نے جنہوں نے گناہ کمائے یہ خیال کیا ہے کہ ہم ان کو ان کی طرح کر دیں گے جو ایمان لائے اور نیک کام کیے ان دونوں کی زندگی اور موت برابر ہوگی؟ ان کا یہ خیال برا ہے۔''

لوگوں کو روز جزا اور قیامت پر یقین کرنے سے جو وہم مانع تھا وہ یہ تھا کہ مرنے کے بعد پھر کوئی جیتا نہیں تو قیامت کے دن کیونکر جلائے جائیں گے یہ حقیقت میں استبعادی شبہ ہے' یعنی چونکہ مر کر دوبارہ جینا اب تک انسان کے تجربہ میں نہیں آیا اس لیے اس کو دوبارہ زندگی کا خیال مستبعد معلوم ہوتا ہے' ورنہ اس کے ان ہونی اور محال ہونے پر کوئی عقلی دلیل نہیں ہے۔ وحیِ محمدی نے اس گتھی کو اس طرح سلجھایا کہ کفار کے استبعاد کے وہم کو حسب ذیل مختلف طریقوں سے دور کر دیا۔

(۱) مر کر جینے کے بعد تاریخی مثالیں پیش کیں جیسا کہ حضرت ابراہیمؑ' حضرت عزیرؑ اور اصحابِ کہف کے قصوں میں مذکور ہیں اور ان سے استدلال کیا کہ جب چند آدمی یا پرند مر کر جی سکتے ہیں تو پوری دنیا بھی مر کر جی سکتی ہے۔

(۲) جس طرح زمین گرمیوں میں خشک اور بے حیات ہو جاتی ہے' اور پھر دفعتاً بارش کے ایک چھینٹے سے اس میں زندگی پیدا ہو جاتی ہے' سبزہ نکل آتا ہے کھیتیاں لہلہا اٹھتی ہیں اسی طرح قدرتِ الٰہی کی ایک بارش زمین سے انسانی دفینوں کو اگلوا دے گی' ﴿وَ اَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا﴾ اور زمین اپنے اندر کے بوجھوں کو باہر نکال دے گی) اور دوبارہ نئی زندگی پیدا کر دے گی۔

(۳) دوبارہ زندگی پر تعجب اور استبعاد اس لیے ہے کہ خدا کے دائرۂ قدرت کی پوری وسعت ہماری سمجھ میں نہیں آئی جس نے آسمان بنائے زمین بنائی' آسمان سے پانی برسایا' مردہ زمین سے زندہ کھیتیاں' سبزہ اور درخت اگائے اور پانی کے ایک قطرہ سے انسان بنایا' کیا وہ ان کے فنا کے بعد دوبارہ ان کی ایجاد پر قادر نہیں۔

(۴) حیات کا یہ تمام کارخانہ پہلے نیست و معدوم تھا' خدا نے اس کو ہست و موجود کیا' پھر رفتہ رفتہ اس کو

معدوم کر دیا تو جس نے پہلے بغیر کسی سابق مثال کے اس کارخانے کو پیدا کیا' وہ کیا دوبارہ اُس کو پیدا نہیں کر سکتا' جس نے نقشِ اول بنایا نقشِ ثانی کھینچنے پر اس کو قدرت نہیں؟

(۵) دنیا میں باری باری بہت سی قومیں وجود میں آئیں اور قوانینِ الٰہی کے مطابق انہوں نے جسمانی زور و طاقت' مالی وسعت' اجتماعی اور تمدنی عظمت اور سیاسی قوت حاصل کی بڑی بڑی عمارتیں بنائیں' عظیم الشان تمدن کی بنیاد ڈالی' قوموں کو اپنا محکوم بنا کر حکومت و سلطنت قائم کی' پھر جب انہوں نے غرور و نخوت' ظلم و ستم اور دوسرے قوانینِ الٰہی کی جو قوموں کی ہستی اور عظمت کی بقا کے لیے ضروری ہیں' مخالفت کی تو وہ فنا کر دی گئیں اور ان کا نام و نشان بھی صفحۂ ہستی سے مٹ گیا' عربوں سے سوال کیا کہ تمہارے عاد و ثمود جو کبھی جنوبِ سام کے نام سے عراق و شام و مصر و عرب پر چھائے ہوئے تھے کیا ہوئے؟ سبا اور تبع کی عظیم الشان حکومتیں کیا ہوئیں' فرعون اور اس کی سلطنت کا کیا حال ہوا؟ قومِ لوط اور قوم مدین کو زمین کیونکر نگل گئی؟

﴿اَوَلَمْ یَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَیَنْظُرُوْا کَیْفَ کَانَ عَاقِبَةُ الَّذِیْنَ کَانُوْا مِنْ قَبْلِهِمْ کَانُوْا هُمْ اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَّ اٰثَارًا فِی الْاَرْضِ﴾ (مؤمن:۲۱)

''کیا یہ زمین میں چلے پھرے نہیں کہ دیکھتے کہ ان سے پہلوں کا کیسا انجام ہوا جو ان سے قوت اور زمین میں یادگاروں کے لحاظ سے کہیں بڑھ کر تھے۔''

﴿اَلَمْ یَاْتِکُمْ نَبَاُ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ قَوْمِ نُوْحٍ وَّ عَادٍ وَّ ثَمُوْدَ وَ الَّذِیْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لَا یَعْلَمُهُمْ اِلَّا اللّٰهُ﴾ (ابراہیم:۹)

''کیا نوحؑ کی قوم اور عاد و ثمود کی اور جو ان کے بعد آئے' جن کو خدا ہی جانتا ہے' ان کی خبر تم کو معلوم نہیں ہوئی۔''

یہ تو وہ قومیں ہیں جن کا قرآن نے ذکر کیا ہے' ان کے علاوہ دنیا کی تاریخ میں کتنی قوموں کے عروج و فنا کی داستانیں محفوظ ہیں۔ بابلی' اسیری' اکادی اور مصری قومیں جو کبھی روئے زمین پر کوس لمن الملک بجاتی تھیں' ہزارہا سال سے بے نشان ہیں' نارمن جیسے فاتح کیا ہوئے' یونانی اور رومی جو کبھی دنیا کے تنہا مالک بن گئے تھے' اب ان کا کہیں وجود ہے' مجوس جو رومیوں کے مقابل صدیوں تک برسرِ پیکار رہے اب ان کی تعداد چند ہزار سے زیادہ نہیں' امریکہ کے قدیم باشندے جو کبھی اس براعظم کے مالک تھے' اب فنا کے قریب ہیں۔

الغرض جس طرح افراد جی کر مر جاتے ہیں' جماعتیں وجود میں آ کر مٹ جاتی ہیں' قومیں پیدا ہو کر فنا ہو جاتی ہیں' اسی طرح پوری دنیائے مخلوقات بھی ایک دن آئے گا' جب قانونِ الٰہی کے مطابق معدوم ہو جائے گی۔

جس طرح عوام جو قوموں کی تاریخ سے واقف نہیں صرف افراد کو جیتے اور مرتے دیکھتے ہیں وہ گو افراد کی فنا کا یقین رکھتے ہیں لیکن قوموں کی فنا کے مسئلہ کو نہیں سمجھ سکتے' اور اس میں شک کرتے ہیں' اسی طرح جن کی نظر دنیائے خلق کی تاریخ پر نہیں وہ اس کے فنائے کامل پر اپنی جہالت اور نادانی سے اعتبار نہیں کرتے۔ حالانکہ ایک وہ

دن آئے گا جب پوری دنیا اپنے وجود کی صلاحیت سے معرا ہو کر فنا ہو جائے گی' کائنات کا یہ نظام بدل جائے گا۔ اس موجودہ عالم کا قانونِ طبعی ایک دوسرے قانون طبعی سے منسوخ ہو جائے گا اور جیسا کہ سائنس کہتا ہے اور قرآن نے نقشہ کھینچا ہے آفتاب و ماہتاب' ستارے اور تمام اجرامِ فلکی ٹکرا کر چور چور ہو جائیں گے اور پوری دنیا کی عدالت قائم ہو کر نئی زمین اور نیا آسمان بنے گا۔

﴿یَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَیْرَ الْاَرْضِ وَ السَّمٰوٰتُ وَ بَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ﴾ (ابراہیم: ۴۸)

''جس دن یہ زمین دوسری زمین سے بدل جائے گی اور آسمان بھی اور مخلوق اکیلے زبردست خدا کے سامنے نکل کھڑی ہوگی۔''

سورۂ ق میں قیامت پر استدلال ان ہی دلیلوں سے کیا گیا ہے:

﴿قٓ. وَ الْقُرْاٰنِ الْمَجِیْدِ ○ بَلْ عَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ فَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا شَیْءٌ عَجِیْبٌ ○ ءَاِذَا مِتْنَا وَ كُنَّا تُرَابًا ذٰلِكَ رَجْعٌۢ بَعِیْدٌ ○ قَدْ عَلِمْنَا مَا تَنْقُصُ الْاَرْضُ مِنْهُمْ وَ عِنْدَنَا كِتٰبٌ حَفِیْظٌ ○ بَلْ كَذَّبُوْا بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ فَهُمْ فِیْٓ اَمْرٍ مَّرِیْجٍ ○ اَفَلَمْ یَنْظُرُوْٓا اِلَى السَّمَآءِ فَوْقَهُمْ كَیْفَ بَنَیْنٰهَا وَ زَیَّنّٰهَا وَ مَا لَهَا مِنْ فُرُوْجٍ ○ وَ الْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَ اَلْقَیْنَا فِیْهَا رَوَاسِیَ وَ اَنْۢبَتْنَا فِیْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍۢ بَهِیْجٍ ○ تَبْصِرَةً وَّ ذِكْرٰى لِكُلِّ عَبْدٍ مُّنِیْبٍ ○ وَ نَزَّلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً مُّبٰرَكًا فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ جَنّٰتٍ وَّ حَبَّ الْحَصِیْدِ ○ وَ النَّخْلَ بٰسِقٰتٍ لَّهَا طَلْعٌ نَّضِیْدٌ ○ رِّزْقًا لِّلْعِبَادِ وَ اَحْیَیْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّیْتًا كَذٰلِكَ الْخُرُوْجُ ○ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّ اَصْحٰبُ الرَّسِّ وَ ثَمُوْدُ ○ وَ عَادٌ وَّ فِرْعَوْنُ وَ اِخْوَانُ لُوْطٍ ○ وَ اَصْحٰبُ الْاَیْكَةِ وَ قَوْمُ تُبَّعٍ كُلٌّ كَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ وَعِیْدِ ○ اَفَعَیِیْنَا بِالْخَلْقِ الْاَوَّلِ بَلْ هُمْ فِیْ لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِیْدٍ ○﴾ (قٓ: ۱'۱۵)

''قسم ہے اس بڑی شان والے قرآن کی (جو مردہ دلوں کو زندہ کرتا ہے ان کافروں کو عقلی انکار نہیں ہے) بلکہ ان کو اس پر تعجب ہے کہ ان میں ایک آدمی آ کر ان کو (قیامت کا) ڈر سناتا ہے وہ کہتے ہیں کہ یہ تعجب کی بات ہے۔ کیا جب ہم مر جائیں گے اور مٹی ہو جائیں گے (تو پھر زندہ ہوں گے) یہ دوبارہ لوٹنا تو دور از عقل ہے (خدا کہتا ہے یہ تعجب کی کیا بات ہے) ہم کو معلوم ہے کہ زمین ان (مردہ جسموں میں) جو کمی کرتی ہے اور ہمارے پاس محفوظ ہے بلکہ بات یہ ہے کہ ان کافروں نے سچائی جھٹلا دی ہے جب وہ ان کے پاس آئی پس وہ الجھی باتوں میں پڑ گئے۔ کیا انہوں نے اپنے اوپر کے آسمانوں کو نہیں دیکھا کہ ہم نے اس کو کیسا بنایا' اور کس طرح اس کو سجایا ہے کہ اس میں کہیں سوراخ نہیں اور زمین کو پھیلایا ہے اور اس میں پہاڑ کے لنگر ڈالے اور اس میں قسم قسم کی رونق کی چیزیں اگائیں کہ ہر رجوع

ہونے والے بندہ کو اس سے سوجھ ہو اور یاد آئے اور آسمان سے برکت کا پانی برسایا پھر اس سے باغ اور کٹتے کھیت کے اناج اگائے اور کھجوروں کے لمبے درخت جن کے خوشے اوپر تلے ہیں۔ یہ بندوں کو روزی پہنچانے کے لیے ہے اور اس پانی سے مردہ آبادی کو ہم زندہ کرتے ہیں اسی طرح (قبروں سے) نکالنا ہوگا اور کافروں سے پہلے نوحؑ کی قوم رس والوں اور ثمود و عاد اور فرعون اور لوط کے بھائیوں نے اور جنگل والوں نے اور تبع کی قوم نے اس کو جھٹلایا (ان میں سے ہر ایک نے پیغمبر کو جھٹلایا) تو میری دھمکی پوری اتری کیا ہم پہلے پیدا کر کے تھک گئے جو دوبارہ نہیں پیدا کر سکتے بات یہ ہے کہ ان کافروں کو ازسرِ نو پیدائش میں شک ہے۔''

سورۂ قیامۃ میں بھی اس کا بیان ہے' اس کی آخری آیتیں یہ ہیں:

﴿اَیَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ یُّتْرَکَ سُدًی ○ اَلَمْ یَکُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِیٍّ یُّمْنٰی ○ ثُمَّ کَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوّٰی ○ فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَیْنِ الذَّکَرَ وَ الْاُنْثٰی ○ اَلَیْسَ ذٰلِکَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓی اَنْ یُّحْیِیَ الْمَوْتٰی ○﴾ (قیامۃ:۳۶'۴۰)

''کیا انسان یہ سمجھتا ہے کہ وہ یونہی بیکار چھوڑ دیا جائے گا۔ کیا وہ پانی کی ایک ٹپکی ہوئی بوند نہ تھی' پھر وہ بندھا ہوا خون ہوا' پھر خدا نے اس کو بنایا اور اس کو ٹھیک کیا۔ پھر اس کو جوڑا کیا' یعنی نر اور مادہ کیا وہ خدا اس پر قادر نہیں کہ مردوں کو دوبارہ جلائے۔''

﴿وَ قَالُوْٓا ءَ اِذَا کُنَّا عِظَامًا وَّ رُفَاتًا ءَ اِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِیْدًا ○ اَوَلَمْ یَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ قَادِرٌ عَلٰٓی اَنْ یَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ﴾ (بنی اسرائیل:۹۸'۹۹)

''اور وہ بولے کہ جب ہم ہڈی اور چورا ہو جائیں گے تو کیا پھر نئے بنا کر اٹھائے جائیں گے؟ کیا یہ نہیں دیکھتے کہ اللہ جس نے آسمانوں اور زمین کو بنایا وہ ان لوگوں کے مثل کو (دوبارہ بھی) بنا سکتا ہے۔''

ایک اور جگہ فرمایا:

﴿وَ هُوَ الَّذِیْ یَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ یُعِیْدُهٗ وَ هُوَ اَهْوَنُ عَلَیْهِ﴾ (روم:۲۷)

''اور خدا وہی ہے جو خلق کا آغاز کرتا ہے۔ پھر اس کو دوبارہ خلق کرے گا' اور یہ (دوبارہ خلق کرنا) اس کے لیے آسان ہے۔''

﴿اِنْ کُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِنْ تُرَابٍ﴾ (حج:۵)

(''لوگو)! اگر تم کو دوبارہ زندگی میں شک ہے تو ہم تو (پہلے) تم کو (اسی مردہ) مٹی سے پیدا کر چکے ہیں (پھر دوبارہ کیوں نہیں پیدا کر سکتے)۔''

قیامت کے متعلق تمام دور دراز اور طول طویل شکوک و شبہات کا کتنا مختصر جواب ہے۔

﴿قَالَ مَنْ یُّحْیِ الْعِظَامَ وَ هِیَ رَمِیْمٌ ○ قُلْ یُحْیِیْهَا الَّذِیْٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ﴾ (یٰسٓ :

۷۸۔ ۷۹)

''وہ بولا کون ان سڑی کھوکھلی ہڈیوں کو جلائے گا کہہ دے وہی جس نے پہلی دفعہ ان کو بنایا۔''

غرض وحیِ محمدی نے ہر پہلو سے کفار کے اس استعجاب اور استبعاد کو دور کیا' اور ان کو دوبارہ زندگی کا یقین دلایا۔

حشرِ جسمانی

اس بحث پر لوگوں نے قیامت برپا کر رکھی ہے کہ یہ دوبارہ زندگی اسی گوشت و پوست کے ساتھ ہوگی' یا صرف روحانی ہوگی۔ جہاں جسم و جسمانیت کا مطلق گذر نہ ہوگا؟ قرآن پاک کی مختلف آیتیں مختلف پہلوؤں کو پیش کرتی ہیں جن میں اشارۃً ہر قسم کی باتیں آ جاتی ہیں' تاہم قیامت کے متعلق اوپر کی آیتوں میں سے ایک ایک آیت پر غور کرو' کفار کو تعجب ہے کہ کیا ہمارا یہ جسم مر کر پھر جیے گا' کیا ہماری ان سڑی گلی ہڈیوں میں دوبارہ جان پڑے گی اور ہم قبروں سے نکل کر پھر اٹھ کھڑے ہوں گے' اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جسمانی زندگی کے علاوہ زندگی کا کوئی دوسرا مفہوم ان کے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں تھا' مگر اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ تم تعجب نہ کرو' اور انکار پر آمادہ نہ ہو کہ تمہارے یہ فنا شدہ جسم نہیں اٹھائے جائیں گے' اور نہ تمہاری ان بوسیدہ ہڈیوں میں روح پھونکی جائے گی' بلکہ وہ تو سراسر روحانی زندگی ہوگی' کیونکہ جب دوبارہ جسمانی زندگی کا تخیل ان کے لیے ناقابل فہم تھا تو خالص روحانی زندگی کا تخیل تو اور بھی ان کے فہم سے بالاتر تھا اور اب بھی ہے کہ ہم اس مادی زندگی کے جاننے والے سرتاپا روحانی زندگی کے تصور سے بالکل عاجز ہیں' اس لیے مصلحتِ الٰہی اسی کی مقتضی تھی کہ وہ اصل واقعہ پر زور دے' کیسے اور کیوں سے تعرض نہ کرے' اور صاحبِ فہم کو اس کے مطابق اس راز کو سمجھنے دے چنانچہ قرآن پاک کے اس اسلوب بیان کو اگر سمجھنا ہے تو ان آیتوں پر غور کرنا چاہیے:

﴿وَ قَالُوْٓا ءَ اِذَا ضَلَلْنَا فِی الْاَرْضِ ءَ اِنَّا لَفِیْ خَلْقٍ جَدِیْدٍ بَلْ هُمْ بِلِقَآئِ رَبِّهِمْ كٰفِرُوْنَ۝﴾ (سجدہ:۱۰)

''اور انہوں نے کہا کہ جب ہم زمین میں کھو جائیں گے' کیا ہم نئی پیدائش میں پھر ہوں گے (خدا فرماتا ہے یہ کچھ نہیں بلکہ) یہ اپنے پروردگار کی ملاقات کے منکر ہیں۔''

غور کرو کہ ان کی مادی معدومیت کے بعد مادی پیدائش کے پُر تعجب انکار پر اللہ تعالیٰ نے یہی فرمایا کہ یہ شکوک و شبہات اس لئے ان کو پیش آتے ہیں کہ مرنے کے بعد خدا کی ملاقات اور اس کے سامنے ہونے سے ان کو انکار ہے اور حواشی کو چھوڑ کر اصل مقصود یہی ہے کہ موت کے بعد اور آخرت میں خدا کے سامنے ہونے پر یقین رکھا جائے' اس سے ان کو کیا مطلب کہ وہ کس طرح ہوگا۔ چنانچہ اس کے بعد ہی فرمایا:

﴿قُلْ یَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِیْ وُكِّلَ بِكُمْ ثُمَّ اِلٰی رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ﴾ (السجدۃ:۱۱)

''جواب میں کہہ دے کہ ملک الموت جو تم پر متعین ہے وہ تم کو موت دے گا' پھر تم اپنے پروردگار کی طرف لوٹا دیے جاؤ گے۔''

یہی ملاقات اور رجوع الی اللہ اس عقیدۂ حشر کی اصل روح ہے۔

بات یہ ہے کہ ہم انہی باتوں کو سمجھ بوجھ سکتے ہیں جن کی مثالیں اور نظیریں اس مادی دنیا میں ہماری نگاہوں سے گزرتی رہتی ہیں اور وہ عالم جو نگاہوں سے مستور بلکہ تصور سے بھی دور ہے' اس کی باتوں کو اس طرح سمجھنا کہ ہر سوال اور تکرارِ سوال سے ہم بے نیاز ہو جائیں' تقریباً ناممکن ہے' ان کے متعلق جو کچھ کیا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ اس دیدۂ شہرستان وجود یعنی دنیا کے قیاس پر اس نادیدہ شہرستانِ بقا یعنی آخرت کا ہر نقشہ اور خاکہ بتایا اور سمجھایا جائے اور یہی محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم نے کیا ہے۔

جو لوگ اللہ تعالیٰ کی ہر قسم کی قدرت پر یقین رکھتے ہیں ان سے تو کچھ کہنا ہی نہیں' لیکن جو شخص جسمانی حشر کا تصور اس لیے محال سمجھتا ہے کہ عام انسانوں نے کسی مردہ جسم کو زندہ ہوتے نہیں دیکھا تو اس کے نزدیک تنہا روحانی زندگی کا تخیل تو اور بھی زیادہ محال ہونا چاہیے کیونکہ کسی انسان نے آج تک کسی انسان کو روحانی وجود میں نہیں دیکھا ہے' بلکہ وہ اس کا تصور بھی نہیں کر سکا ہے وہ جب انسانی زندگی کا تصور کرے گا تو جسم و شکل و اعضا کے ساتھ ہی کرے گا' ان سے مجرد ہو کر نہیں کرے گا۔

موت جسم سے روح کی مفارقت کا نام ہے' اس لیے اگر یہ سچ ہے کہ قیامت میں نئی زندگی ملے گی تو ظاہر ہے کہ موت کے بعد کی کیفیت اور صورت سے کوئی الگ صورت اور کیفیت ہوگی' جس کا نام حیاتِ ثانیہ رکھا گیا ہے' اور وہ یہ ہے کہ روح کا دوبارہ تعلق جسم کے ساتھ تسلیم کیا جائے' ورنہ غیر جسمانی زندگی تو قیامت کے پہلے بھی تھی' اب نئی بات کیا بڑھ گئی جس کا نام حیاتِ ثانیہ رکھ دیا گیا۔

گو روح انسانی جسم کے اندر ہر فعل کی فاعل ہے' مگر فاعل کے فاعل بننے کے آلات اور اوزار کی بھی ضرورت ہوتی ہے جن کے بغیر وہ اپنے فعل کے بجالانے سے مجبور رہتا ہے۔ اسی طرح روح اپنے فعلِ لذت والم کے انجام دینے کے لیے جسمانی آلات اور اوزار کی محتاج ہے کہ لذت والم کا کوئی روحانی احساس جسمانیت کے شائبہ سے مبرا ہو کر ہو ہی نہیں سکتا' اس بنا پر روحِ محض کا جنت کی لذتوں سے متمتع یا دوزخ کی تکلیفوں سے متالم ہونا' کسی جسمانی وساطت کے بغیر تصور میں نہیں آتا' خواب میں دیکھو کہ روح کو جو لذت یا تکلیف پہنچتی ہے' اس میں بھی جسمانی پیکر و ہیکل کی صورت نمودار ہوتی ہے۔

جسم و جسد

حشرِ جسمانی ماننے کے بعد یہ بحث بے سود ہے کہ آیا وہی جسم دوبارہ زندہ کر کے اٹھایا جائے گا' جس کے قالب میں وہ روح پہلے دنیا میں رہی تھی یا کسی دوسرے نئے جسمانی پیکر میں وہ روح پھونکی جائے گی' یا یہ کہ آئندہ

جسم اپنی مادیت اور ترکیب میں اسی دنیاوی جسم کے مماثل ہوگا جب کہ یہ حقیقت ہے اور اس پر سب کا اتفاق ہے کہ اعمال کی ذمہ داری روح پر ہے جسم پر نہیں' اور اسی طرح جزا و سزا کی راحت و تکلیف کا اصلی مورد روح ہے جسم نہیں تو پھر اب وہ کسی قالب میں بھی ہو اور کسی رنگ میں بھی ہو' روح پر مؤاخذہ اور ثواب و عذاب کی لذت و الم کا احساس یکساں ہوگا' البتہ یہ ضروری ہے کہ جو جسم ہم کو دوسری دنیا میں ملے گا اس کی خصوصیات و لوازم اس خاکی جسم کے خصوصیات و لوازم سے بالکل الگ ہوں گی' چنانچہ خود ہمارے تخیل اور تصور اور نیز خواب و رؤیا میں جو جسم ہم کو نظر آتا ہے وہ جسم ہو کر نظر آنے کے باوجود مادی جسمانیت سے سراسر پاک ہوتا ہے اس لیے لفظ جسم کے بولنے سے ان ہی خصوصیات کا جسم سمجھ لینا ضروری نہیں ہے' اور نہ اس جسم پر قیاس کر کے اس جسم پر اشکالات وارد کیے جا سکتے ہیں۔

خلقِ جدید

چنانچہ جو جسم قیامت میں عنایت ہوگا وہ نئی خلقت اور نئی آفرینش کا ممنون ہوگا۔ اسی لیے قرآن نے منکروں کے جواب میں یہ کہا ہے کہ ﴿بَلْ هُمْ فِيْ لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ﴾ (قٓ : ۱۵) بلکہ یہ لوگ نئی آفرینش میں ہیں۔

منکرین کی زبان سے کہلوایا:

﴿ءَ اِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا﴾ (بنی اسرائیل:۴۹)

''کیا ہم درحقیقت نئی آفرینش کر کے اٹھائے جائیں گے۔''

ایک دوسری سورہ میں یہ تلقین ہے۔

﴿اِنَّكُمْ لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ﴾ (سبا:۷)

''بے شک تم ایک نئی آفرینش میں ہونے والے ہو۔''

پھر تمثیل دے کر فرمایا:

﴿كَمَا بَدَاْنَآ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيْدُهٗ﴾ (انبیاء:۱۰۴)

''جس طرح ہم نے پہلی پیدائش کا آغاز کیا۔ اسی طرح ہم اس کو دوبارہ بنائیں گے۔''

اسی لیے اس عالم کی اس نئی خلقت و پیدائش والے جسم کو بعینہٖ اسی جسم کے مطابق سمجھنا صحیح نہیں ہے' اور نہ اس خاکی جسم کی تمام خصوصیات کا بعینہٖ اس جسم میں ہونا ضروری ہے اس کو اگر اس عالم کے لفظ ''جسم'' سے تعبیر کیا جاتا ہے تو اس لیے کہ ہماری زبان میں روح کے غلاف و قالب کے لیے جسم سے بہتر' قریب تر اور مشابہ تر کوئی دوسرا لفظ نہیں۔

یہ بات کہ حشر میں بعینہٖ گذشتہ گوشت و پوست کا ہونا اس لیے ضروری سمجھا جائے کہ وہ بھی عذاب و ثواب

ہیں شریک ہوں' تصریحِ قرآنی پر اضافہ ہے' قرآن میں تو یہ تصریح ہے کہ

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا بِاٰیٰتِنَا سَوْفَ نُصْلِیْهِمْ نَارًا کُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَیْرَهَا لِیَذُوقُوا الْعَذَابَ اِنَّ اللّٰهَ کَانَ عَزِیْزًا حَکِیْمًا﴾ (نساء:۵۶)

''بے شبہ جو لوگ ہماری آیتوں کے منکر ہوئے ہم ان کو آگ میں ڈالیں گے۔ جب ان کی کھالیں پک جائیں گی ہم ان کو اور کھالیں دیں گے جو پہلی کھالوں کی غیر ہوں گی تا کہ وہ عذاب چکھیں بے شک اللہ غالب اور حکمت والا ہے۔''

جب کھالیں یکے بعد دیگرے بدلتی جائیں گی تو پہلا حصۂ جسم جو گناہ میں شریک تھا' کہاں باقی رہا؟ اسی طرح یہ تصریح ہے کہ انسان کے ہاتھ پاؤں اور کھالیں اس کے اعمال پر شہادت دیں گی۔ اس سے معلوم ہوا وہ اصلی مجرم جو ان اعمال کا ذمہ دار اور اس مقدمہ کا مدعا علیہ ہے ان جسمانی اعضا کے علاوہ ہے اور وہ روح انسانی ہے۔

ذمہ داری روح پر ہے

یہی سبب ہے کہ موت و حیات' عذاب و ثواب اور اعمال کے مؤاخذہ کا اسلام نے جس سے تعلق بنایا ہے' وہ نفس یعنی روح ہے۔

﴿اَنْ تَقُوْلَ نَفْسٌ یّٰحَسْرَتٰی عَلٰی مَا فَرَّطْتُّ فِیْ جَنْۢبِ اللّٰهِ﴾ (زمر:۵۶)

''تو (قیامت میں) کوئی نفس یہ کہنے لگے کہ اسے افسوس اس پر کہ میں نے اللہ کے پہلو میں کمی کی۔''

﴿وَ لْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ﴾ (حشر:۱۸)

''اور چاہیے کہ ہر نفس دیکھے کہ اس نے کل (قیامت) کے لیے کیا آگے بھیجا۔''

﴿عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّآ اَحْضَرَتْ﴾ (تکویر:۱۴)

(''اس دن) ہر نفس جان لے گا جو اس نے حاضر کیا۔''

﴿عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَ اَخَّرَتْ﴾ (انفطار:۵)

(''اس دن) ہر نفس جان لے گا جو اس نے آگے بھیجا اور پیچھے چھوڑا۔''

﴿فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَیْئًا﴾ (انبیاء:۴۷)

''تو اس دن) کسی نفس پر کوئی ظلم نہ ہوگا۔''

جنت کی نسبت ہے:

﴿فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِیَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْیُنٍ﴾ (سجدہ:۱۷)

''کوئی نفس نہیں جانتا کہ ان کے لیے (جنت میں) کیا آنکھوں کی ٹھنڈک چھپا کر رکھی گئی ہے۔''

ان آیتوں میں دیکھو کہ عمل کی ذمہ داری اور اس کے اچھے اور برے نتیجوں کا بار جسم پر نہیں بلکہ روح اور نفس

پر ڈالا گیا اور اسی کو تکلیف ولذت سے آشنا کیا گیا ہے جنت میں داخلہ کی خوش خبری بھی اسی کو دی گئی ہے۔

﴿فَادْخُلِیْ فِیْ عِبَادِیْ ○ وَ ادْخُلِیْ جَنَّتِیْ ○﴾ (فجر:۲۹،۳۰)

''اے مطمئن روح! میرے بندوں میں شامل اور میری جنت میں داخل ہو جا۔''

دنیاوی جسم بدلتے رہنے پر بھی وہی جسم رہتا ہے

غرض اعمال اور ان کے نتائج کی اصل ذمہ دار اور جنت و دوزخ کی لذت والم کی اصل احساس لرنے والی ہستی صرف روح ہے' اور جسم کی حیثیت صرف ایک لباس وآلۂ احساس کی ہے۔ اس سے زیادہ اس کی کوئی حیثیت نہیں جسم لاکھ بار بدلے مگر روح اگر وہی ہے تو وہ انسان وہی ہے' اور اسی کو اپنی ذمہ داری کی جزا و سزا مل رہی ہے۔

لوگ اپنی ظاہر بینی سے اصل زور جسم پر دیتے ہیں' حالانکہ اس مٹی کے ڈھیر میں اگر روح کا خزانہ چھپا نہ ہو تو پھر اس مشتِ خاک میں دھرا کیا ہے' دیکھو انسان بچپن سے لے کر بڑھاپے تک وہی ایک شخص ہے جو پہلے تھا' حالانکہ اس کی جسمانی ہیئت اور اس کے جسم کا مادہ ہر آن اور ہر لمحہ فنا ہو کر بدلتا رہتا ہے' بیماریوں میں وہ سوکھ کر کانٹا ہو گیا۔ پھر تندرستی کے بعد نئے ذرات داخل ہو کر لہلہائے' تم غلطی سے یہ سمجھتے ہو کہ ہر حال میں وہی جسم یکساں طور پر قائم ہے' حالانکہ حکیم سے پوچھو تو وہ بتائے کہ اس کے ذرے کیونکر ہر آن جھڑتے اور گھٹتے رہے' اور جو خوراک وہ کھاتا رہا وہ خون ہو کر کیونکر ما یتحلل بنی' ان کی جگہ لیتی رہی۔ پھر کیا ایسے ہر آن فنا ہوتے رہنے والے اور چند سال کے بعد بالکل بدل جانے والے کو دائم الوجود اعمال کا ذمہ دار اور ان کے نیک و بد کی اصلی جزا یا سزا پانے کا مستحق ٹھہرایا جا سکتا ہے' لیکن جس طرح دنیا میں اگر کوئی مجرم آج بھاگ گیا اور چند سال کے بعد پکڑ کر جب لایا گیا تو یہ عذر نہیں کر سکتا کہ چونکہ وہ ہاتھ جس سے اس نے چوری کی تھی اور وہ پاؤں جن سے وہ مال لے کر بھاگا تھا' اس عرصہ دراز میں بدل گئے ہیں اس لیے وہ لائقِ تعزیر نہیں۔ کیونکہ وہ روح جس نے اپنے ارادہ ونیت سے اس کام کو اس کے ہاتھوں اور پاؤں کے ذریعہ کرایا تھا' جس طرح کل تھی' بعینہٖ آج بھی ہے اور جو تکلیف اس کو اپنے جسم کے ذریعہ کل پہنچ سکتی ہے اور اس جسمانی تغیر سے اس کی روحانی شخصیت میں اصلاً کوئی فرق نہیں پیدا ہوتا' اس لیے پہلے ہی جسم کے ضروری ہونے پر زور دینا بے سود ہے۔ اسی سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ جسم اگر بدل بھی جائے تو اعضا کی شہادت کا مسئلہ اپنی جگہ پر صحیح ہوگا' جسم کے اعضا دنیا میں بدلتے جاتے ہیں' مگر جو بیماری اگلے اجزا میں پیدا ہو گئی تھی' وہ ان کے فنا ہو جانے کے بعد بھی قائم رہتی ہے' مٹ نہیں جاتی' بلکہ وہی ان کے بعد کے آنے والے اجزا میں برابر سرایت کرتی رہتی ہے۔

اخروی جسم کیسا ہوگا

روحوں کو آخرت میں جو جسم ملیں گے وہ حقیقت میں ان کے اعمال ہی کے ظل وعکس ہوں گے یعنی جیسے اعمال ہوں گے' ویسے ہی ان کو جسم عنایت ہوں گے' چنانچہ اس دنیا کے جسمانی رنگ کے لحاظ سے خواہ کوئی کالا ہو یا

گورا' مگر اس دنیا میں اس کا یہ کالا پن اور گورا پن اعمال کی سیاسی وسپیدی کی صورت میں بدل جائے گا' خدا نے فرمایا:

﴿وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ ○ ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ ○ وَ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ ○ تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ ○﴾ (عبس:۳۸'۴۱)

''کتنے چہرے اس دن روشن ہنستے اور شاد ہوں گے اور کتنے چہروں پر اس دن کدورت ہوگی۔ اور ان پر سیاسی چھائی ہوگی۔''

﴿يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَّ تَسْوَدُّ وُجُوْهٌ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْوَدَّتْ وُجُوْهُهُمْ اَكَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ○ وَ اَمَّا الَّذِيْنَ ابْيَضَّتْ وُجُوْهُهُمْ فَفِيْ رَحْمَةِ اللّٰهِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ○﴾ (آل عمران:۱۰۶'۱۰۷)

''جس دن کتنے چہرے سپید ہوں گے' اور کتنے کالے' لیکن جن کے چہرے کالے ہوئے کیا تم وہ ہو جو ایمان کے بعد پھر کافر ہو گئے تھے تو اپنے کفر کرنے کے بدلہ عذاب کا مزہ چکھو' اور جن کے چہرے سپید ہوئے تو وہ اللہ کی رحمت میں ہوں گے اسی میں سدا رہیں گے۔''

صحیح حدیثوں میں ہے کہ جنت میں لوگ جوان بن کر داخل ہوں گے' اور جسم پر کبھی بڑھاپا نہیں آئے گا۔ ان کا قد حضرت آدمؑ کے اولین بہشتی قد کے مطابق ہوگا' دوزخیوں میں سے کسی کا سر پہاڑ کے برابر ہوگا' کسی کا ایک پہلو مفلوج ہوگا' کسی کے ہونٹ لٹکے ہوں گے' دل کے اندھے' آنکھوں کے اندھے بن کر اٹھیں گے۔ سزاؤں کے بعد جب ان کے جسم چور چور ہو جائیں گے' تو پھر صحیح وسالم نئے جسم نمودار ہوں گے اور پھر ان کی وہی کیفیت ہوگی' یہ بھی آیا ہے کہ جو اپنے کو بڑا سمجھتے ہیں وہ چیونٹی بن کر قیامت میں اٹھیں گے ان تمام شواہد سے ہویدا ہے کہ اس دنیا کے جسمانی قالب ہمارے اس دنیاوی جسم کے مطابق نہیں بلکہ ہمارے دنیاوی اعمال کے مطابق ہوں گے۔

❀ ❀ ❀

جزااورسزا

''یوم آخر'' یا ''یوم دین'' پر ایمان لانے سے اسلام کا حقیقی منشایہ ہے کہ لوگ اس کا یقین کریں کہ ان کے ہر عمل کا بدلہ ہے' کچھ اس دنیا میں اور پورا دوسری دنیا میں' اسی کا نام جزاوسزا ہے' دنیا کے دوسرے مذاہب بھی اس مسئلہ میں اسلام کے ہمنوا ہیں۔

جزااورسزا دیگر مذاہب میں

درحقیقت مذاہب کا حقیقی تعلق اس عقیدہ سے ہے کہ انسان اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے' اور اچھا یا برا جیسا کام اس سے صادر ہوتا ہے' اس کے مطابق اچھا یا برا معاوضہ اس کو دوسری دنیا میں ضرور ملے گا' اس عقیدہ کا نشان مصر و بابل جیسی دنیا کی قدیم قوموں میں بھی ملتا ہے' ہندوستان کے مذاہب میں اس دوسری دنیا کو دوسرے جنم سے تعبیر کیا گیا ہے' ان کا خیال یہ ہے کہ انسان جب مرتا ہے تو اس کے اچھے یا برے کاموں کے مطابق اس کی روح کسی جانور یا گھاس پھوس یا درخت کے قالب میں جا کر اپنے اعمال کا نتیجہ بھگتتی ہے اور پھر انسانوں کے قالب میں لائی جاتی ہے' اور کام کرتی ہے' اس کے بعد جس کے گناہ زیادہ ہوتے ہیں اس کو یم لوک میں جانا پڑتا ہے' جہاں نرگ (دوزخ) ہیں وہاں وہ ہر قسم کی سزا بھگتتی ہے بعدازیں اپنے بعض اچھے کاموں کی بدولت چندرلوک (چاند کی دنیا) میں جاتی ہے جس روح کے کچھ کام اب بھی باقی ہیں' وہ اس دنیا میں ہوا' بادل اور بارش کے ذریعہ سے دوبارہ آتی ہے اور اپنے کام کے مطابق حیوانات یا نباتات کے روپ میں سزا پاتی ہے اور پھر چھوٹ کر انسان بنتی ہے' یہاں تک کہ اس کے کام اتنے اچھے ہو جائیں کہ وہ سزا کے قابل نہ رہ جائے' اس وقت وہ مادی قالبوں کی قید سے نجات پا کر سورج لوک اور چندرلوک وغیرہ اجرام سماوی کی دنیاؤں میں جا کر آرام کرتی ہے اور پھر اپنے علم و عمل کی کسی کمی کے سبب سے بادل' ہوا' اناج یا کسی دوسری مخلوقات کے قالب میں ہو کر اس دنیا میں پھر آنا پڑتا ہے' اور پھر وہی عمل شروع ہوتا ہے' یعنی وہ نئے نئے جنموں میں سزا بھگتتی ہے' اور اس وقت تک آمد و رفت اور آواگون کے چکروں میں پھنسی رہتی ہے جب تک اس سے اچھے یا برے کاموں کا صدور ہوتا رہتا ہے' اس لیے کامل اور دائمی نجات کی صورت میں یہ ہے کہ انسان سے اچھا یا برا کوئی کام صادر نہ ہو' یہی ترکِ عمل روح کو مادہ کی قید سے آزاد کر کے ہمیشہ کے لیے چھٹکارا (موکش) دلاتا ہے' یہاں تک کہ یہ موجودہ مادی دنیا پرلے (قیامت) کے بعد پھر جب نئے سرے سے بنے گی۔ تو پھر وہی عمل اور سزا یعنی آواگون کا چکر شروع ہوگا' اور پھر اسی طرح چھٹکارا پائے گی اور پھر دوسری پرلے کے بعد نیا دور اسی طرح شروع ہوگا' یہ چکر اسی طرح ہمیشہ رہے گا۔

یہ وہ چکر ہے جس سے انسان کو کبھی نکلنا نصیب نہ ہوگا' الا یہ کہ ہمالہ کی چوٹی یا غار میں بیٹھ کر ترکِ عمل کے ذریعہ سے خود اپنے وجود سے ہاتھ دھولیا جائے لیکن اگر اس اصولِ نجات پر دنیا عمل کرے تو یہ بہارستان دم کے دم میں خارستان بن جائے' ہر قسم کا کاروبار بند ہو کر دنیا آپ سے آپ فنا کے قریب آ جائے' بدی کے ساتھ نیکی کا وجود بھی صفحۂ ہستی سے مٹ جائے اور باایں ہمہ دائمی وابدی نجات میسر نہ ہو' کیونکہ ہر پرلے کے بعد وہی جنم اور کرم اور آواگون پھر شروع ہوتا ہے۔ (۱) لیکن دنیا کے دوسرے مذاہب نے اس چکر' اور بے عملی سے انسان کو نجات دلائی ہے' انہوں نے موجودہ دنیا کے بعد ایک ہی دنیا اور تسلیم کی ہے' جس میں لوگوں کو اچھے اور برے اعمال کی پوری پوری جزا ملے گی' مختلف زردشتی فرقوں نے آریہ نسل ہونے کے باوجود ہندوؤں کے تناسخ کے بجائے مختلف سامی مذاہب کے خیالات کی نقالی کی ہے اور خصوصاً بعد والوں نے اسلام کے عقائد کو ''ارداے ویراف'' کے عجیب و غریب مشاہدات کا رنگ دے کر اور اس کی کتاب کو اسلام سے بھی پہلے کی قرار دے کر تمام تر قبول کر لیا ہے۔ (۲)

صحیفۂ ابراہیم یعنی سفرِ تکوین میں دنیا کی محنت و مشقت اٹھانے کے بعد پھر جنت میں داخلہ کا اشارہ ہے (تکوین ۲۔۱۹) علی ہذا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے صحیفوں میں اخروی جزا و سزا کے اصول مذکور ہیں' نیکوکاروں کے لیے ایک ''ستھری آبادی'' کا ذکر ہے' جس میں دودھ اور شہد کی نہریں بہتی ہیں' بدکاروں کے لیے ہلاکت' بربادی اور دردناک عذابوں کی خبر ہے مگر مترجموں نے ہر جگہ اس کو دنیاوی ثواب و عذاب بلکہ ارضِ موعودہ کی ظاہری سلطنت کے معنوں میں دکھایا ہے' حالانکہ بعض مقامات میں یہ بے جوڑ سی بات ہو کر رہ گئی ہے' حضرت آدمؑ کی جنتِ عدن اور اس کے چار دریاؤں کا ذکر تکوین کے دوسرے باب میں ہے' علاوہ ازیں تورات میں موت کے بعد کی زندگی کی تصریح ملتی ہے' حضرت ابراہیمؑ (پیدائش ۲۵۔۱۸) اور یعقوب علیہ السلام (پیدائش ۴۹۔۳۳) کی موت کی تعبیر ان لفظوں میں کی گئی ہے کہ ''جاں بحق ہوا اور وہ اپنے لوگوں میں جا ملا'' ساتھ ہی ہمیشہ کی بھلائی (استثنا ۶۔۲۴) کا بھی تذکرہ ہے اور جہنم کی آگ'' (استثناء ۳۲۔۲۲) کا بھی بیان ہے اور ہر ایک کو اس کے عمل کا بدلہ دیے جانے کی بھی تصریح ہے (یرمیاہ ۱۷۔۱۱) روح کی بقا اور آسمان پر چڑھنے کی تعلیم بھی ان صحیفوں میں موجود ہے (واعظ ۳۔۲۱) مرنے کے بعد روح کے خدا کے پاس واپس جانے کا بھی تذکرہ ہے (واعظ ۱۲۔۷) اور انسان کے اپنے ابدی مکان میں جانے کی بھی تصریح ہے' آخر میں ہے ''خدا سے ڈر اور اس کے حکموں کو مان کہ انسان کا فرضِ کلی یہی ہے' کیونکہ خدا ہر پاک فعل کو ہر ایک پوشیدہ چیز کے ساتھ خواہ بھلی ہو' خواہ بری عدالت میں لائے گا۔'' (واعظ ۱۲۔۱۳۔۱۴) زبور میں خدا کی عدالت کے دن کی تصریحات بار بار ہیں' امثال سلیمانی میں ہے کہ ''انسان کی راہیں خداوند کی آنکھوں کے سامنے ہیں اور وہ اس کی ساری روشوں کو جانتا ہے' شریر کی بدکاریاں اس کو پکڑ لیں گی اور وہ اپنے ہی گناہوں کی رسیوں سے جکڑا جائے گا۔ وہ بے تربیت پائے مر جائے گا اور اپنی جہالت کی شدت میں بھٹکتا

---

(۱) تناسخ کے رد میں الندوہ مئی و جون ۱۹۰۶ء میں ایک مضمون ہے۔

(۲) دبستان المذاہب کا مصنف جو زردشتی مذہب سے پوری واقفیت رکھتا تھا' اس نے اپنی کتاب میں اس کی پوری تفصیل درج کی ہے۔

پھرے گا (۵۔۲۱) دانیال میں ہے کہ ''اس وقت بہتیرے جو زمین میں خاک پر سو رہے ہیں' جاگ اٹھیں گے' بعض حیاتِ ابدی کے لیے اور بعضے رسوائی اور ذلت کے لیے۔'' (۱۲۔۲) خرقیال ۲۸ میں جنت کی طلائی اور جواہرات کی بنی ہوئی عمارتوں کے اشارات ہیں۔

حضرت مسیحؑ سے پہلے یہودیوں میں صدوقی نام ایک فرقہ پیدا ہوا جس نے حکمران یونانیوں کا تقرب حاصل کرنے کے لیے ان کی بعض باتیں قبول کر کے یہودی تعلیم میں شامل کیں (۱) منجملہ ان کے وہ قیامت اور حیاتِ اخروی کا بھی منکر ہوا' مگر اس کے مقابل کا دوسرا فرقہ جس نے اپنے کو فریسی (علیحدہ رہنے والا) کہا اپنے پرانے عقیدوں پر قائم رہا اور قیامت' حیاتِ اخروی اور جنت و دوزخ کے عقائد کو بدستور مانتا رہا' حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں فریسی یہی اعتقاد رکھتے تھے کہ جنت مادی ہوگی' اور وہاں بہشتیوں کو ان کی بیویاں واپس ملیں گی (مرقس ۱۲۔۲۴) یہودیوں کی پچھلی کتابوں میں جزا و سزا کی تفصیل موجود ہے' چنانچہ اسلام کے زمانہ میں بھی عرب کے یہودی اس پر ایمان رکھتے تھے اور کہتے تھے یہود کیسے ہی گنہگار ہوں' مگر چند روز سے زیادہ دوزخ میں نہیں رہیں گے (بقرہ۔۸۰ و آل عمران۔۲۳) یہ چند روز باختلافِ روایت تین روز' چالیس (۲) روز یا گیارہ (۳) مہینے ہیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے عہد میں یہودیوں کے ان دونوں فرقوں کے درمیان سخت اختلافات برپا تھے اور دونوں ایک دوسرے کی تردید و ابطال میں مصروف تھے' حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے صدوقیوں کے اس عقیدے کی تردید کی اور قیامت اور جزا و سزا پر ایمان لانے کی تعلیم دی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ایک حواری یوحنا نے اپنے مکاشفہ میں جنت اور دوزخ کی پوری تصویر کھینچی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اس جواب سے جو انہوں نے ایک صدوقی کے سوال کا دیا کہ ''اس دنیا میں لوگ شادی اور بیاہ نہیں کریں گے' بلکہ فرشتوں کے مانند رہیں گے۔ ایسا سمجھا جاتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جنت کو صرف روحانی وجود بخشا ہے' مگر درحقیقت ایسا نہیں ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنی زندگی کی آخری شب میں اپنے شاگردوں کے ساتھ بیٹھ کر جب انگور کا افشردہ پیتے ہیں تو کہتے ہیں:

''میں تم سے کہتا ہوں کہ انگور کے پھل کا رس پھر نہ پیوں گا' اس دن تک کہ تمہارے ساتھ اپنے باپ کی بادشاہت میں نیا نہ بنوں۔'' (متی ۲۶۔۲۹)

وہ یہودی علما کو خطاب کر کے فرماتے ہیں:

''اے سانپو! اور اے سانپوں کے بچو! تم جہنم کے عذاب سے کیونکر بھاگو گے۔ (متی ۲۳۔۳۳)

اپنے ایک وعظ میں دوزخ کا منظر دکھاتے ہیں اور فرماتے ہیں۔

---

(۱) برٹش انسائیکلوپیڈیا مضمون صدوقیت و صدوکیز۔

(۲) کتب سیر میں ان آیتوں کی تفسیر دیکھو۔

(۳) سیل کا ترجمہ قرآن حاشیہ زیر ترجمہ آیت بقرہ رکوع ۸۔

اس نے دوزخ کے درمیان عذاب میں ہو کے اپنی آنکھیں اٹھائیں' اور ابرہام (حضرت ابراہیمؑ) کو دور سے دیکھا اور اس کی گود میں لعزر کو' اور اس نے پکار کے کہا کہ اے باپ ابراہام! مجھ پر رحم کر اور لعزر کو بھیج کہ اپنی انگلی کا سرا پانی سے بھگو کر میری زبان ٹھنڈی کرے کیونکہ میں اس لو میں تڑپتا ہوں۔" (لوقا ۱۶۔۲۳)

مکاشفاتِ یوحنا میں دوزخ کو آگ اور گندھک کہا گیا ہے (۱۴۔۱۰) اور متی کی انجیل میں اس کے دروازے بھی بتائے گئے ہیں۔ (متی ۱۶۔۱۸) اسی طرح جنت اور اس کی طلائی اور جواہراتی تعمیر اور نہرِ آبِ حیات کا ذکر مکاشفات کے اکیسویں باب میں ہے اور وہاں کے انگوری افشردہ کا بیان متی میں ہے (۶۶۔۱۹) وہاں کے آبِ سرد کا ذکر بھی انجیل میں آتا ہے (لوقا ۱۶۔۲۳)

اسی طرح ہر ایک کے عمل کا حساب لیے جانے اور عمل کے مطابق بدلہ لینے کا ذکر بھی حواریوں کے خطوط میں موجود ہے۔

مبارک وہ مرد ہے جس کے گناہوں کا حساب خداوند نہ لے گا۔ (رومیون ۲۔۸)

سو ہر ایک ہم میں سے خدا کو اپنا حساب آپ دے گا۔" (رومیون ۱۴۔۱۱)

لیکن وہ اس کو جو زندوں اور مردوں کا حساب کرنے کو تیار ہے حساب دیں گے۔" (اول پطرس ۴۔۵)

اس باب میں اسلام کا تکمیلی پہلو یہ ہے کہ اس نے اس عقیدہ کو نہ صرف پوری تفصیل کے ساتھ بیان ہی نہیں کیا بلکہ اس کے تمام ضروری اجزا فراہم کیے' گزشتہ مذاہب کے تشنہ بیانات پر سیر حاصل بحثیں کیں ان کے نقائص کی تکمیل کی اور جزا و سزا کے اصول اس صفائی سے بیان کیے کہ اس عقیدہ کا ہر پہلو شکوک و شبہات سے پاک ہو گیا۔

آئندہ مباحث کے سمجھنے کے لیے پہلے چند اصول ذہن نشین کر لینے چاہییں۔

عالمِ آخرت کا فہم و ادراک

اس عالمِ آخر میں جو کچھ ہو گا وہ اگرچہ ہمارے اس زیرِ تجربہ اور زیرِ مشاہدہ مادی عالم سے بالکل الگ ہو گا تاہم چونکہ انسانی فہم کی مجبوری کی وجہ سے وہ اسی زبان و محاورات میں ادا کیا گیا ہے جو اس مادی عالم کے ساتھ مخصوص ہیں' اس لیے یہ الفاظ جن مادی خصائص کو مستلزم ہیں' یا ہم ان کے دیکھنے اور سننے کے اس دنیا میں عادی ہو گئے ہیں' ان لفظوں کو سنکر بعینہٖ وہی سمجھنا چاہتے ہیں جو اس دنیا میں ان لفظوں سے سمجھتے رہے ہیں' اسی سبب سے بعض کم فہم وہاں کے وقائع و احوال کا بیان سن کر ان میں سے بعض کو محال اور ناممکن کہہ اٹھتے ہیں' اور بعضے ان کی تشریح و تاویل اس طرح کرتے ہیں کہ لفظ و معنی میں ادنیٰ اشتراک بھی باقی نہیں رہتا یہ دونوں راستے سخت خطرناک ہیں' اسی لیے وحیِ محمدی نے ان نازک و دقیق اسرار کے بیان میں انسانی فطرت کی کمزوریوں کا پورا لحاظ کیا ہے۔ اس نے نہ تو یہودیوں کی طرح ان واقعات کو سرتاپا مادی کہہ کر عالمِ آخرت کو عالمِ آب و گل بنا دیا ہے اور نہ عقل و خرد کے بعض نادان مدعیوں کی طرح ان کو مادہ سے اتنا بلند و برتر کر دیا ہے کہ ان کا وجود ہی موہوم و فرضی ہو گیا ہے بلکہ

انسانی عقلوں کے اختلافِ مراتب کا لحاظ کر کے بزم کے اہلِ نظر اور تماشائیوں دونوں کی تشفی و تسکین کا سامان بہم پہنچایا ہے۔

ان اخروی وقائع کے مختلف مفہوموں اور مصداقوں کا لحاظ کر کے وحیِ محمدی نے ایسے جچے تلے الفاظ اختیار کیے ہیں، جن سے ایک فلسفی بھی بہرہ یاب ہوسکتا ہے، اور ایک عامی بھی، اور دونوں اپنی اپنی جگہ پر اپنے اپنے ایمان کا لطف اٹھا سکتے ہیں اور ایک ایسے مذہب کے لیے جو سارے انسانی طبقوں کو اپنا مخاطب بنانے کا دعویٰ کرتا ہے، ایسی ہی وسعت کی ضرورت تھی تا کہ وہ سب کے لیے اپنی اپنی جگہ پر تشفی کا باعث ہو سکے، ان تمام اخروی واقعات کو جن الفاظ میں بیان کیا ہے وہ ظاہر ہے کہ طبعاً وہی الفاظ ہو سکتے ہیں جن کے چاروں طرف اس دنیا کا مادی احوال، مادی مفہوم و مصداق اور جسمانی تخیلات لپٹے ہوئے ہیں۔ ان لفظوں کے سننے کے ساتھ جو مفہوم ہمارے ذہن میں آتا ہے، وہ سرتاپا انہی مادی قیود و لوازم کے ساتھ آتا ہے، ہم جب آگ کا لفظ سنتے ہیں تو معاً اس دنیاوی آگ کا مفہوم ذہن میں آتا ہے جس کو ہم یہاں دیکھتے ہیں، جو انسانوں، درختوں اور ہر اس چیز کو جو اس کے اندر ہوتی ہے، بلا تمیز یکساں جلا دیتی ہے مگر اخروی آگ ایسی نہ ہوگی، اس کے اندر بعض درخت ہوں گے جو نہیں جلیں گے، وہ صرف گنہگار انسانوں کو جلائے گی، کسی کے پاؤں کو چھوئے گی، کسی کی کمر تک آئے گی، کسی کے گلے تک پہنچے گی، اور وہ ایسی تیز و گرم ہوگی کہ یہ دنیاوی آگ اس کے مقابلہ میں ٹھنڈک ہے ''وزن'' لفظ سننے کے ساتھ اس عالم میں تولنے کی ساری خصوصیتیں ہمارے سامنے آجاتی ہیں، ترازو، پاسنگ، پلے، ڈنڈی اور تولی جانے والی چیز میں جسمیت اور ثقل کا ہونا، اسی طرح نامۂ عمل کے لکھنے کا مفہوم جب ہم سمجھنا چاہیں تو کاتب کی انگلیاں قلم، دوات، سیاہی، کاغذ اور حروف کی ساری قیدیں ہمارے ذہن میں آئیں گی، اس بنا پر ان الفاظ کے لغوی معنی اور ان کے قریب الفہم مجازی معنوں کے سمجھنے میں اختلافِ آرا کی بڑی گنجائش ہے، اس لیے حق تو یہ ہے کہ ان پر بلا مزید تشریح اس طرح ایمان لایا جائے کہ ہماری تشریح سے ان کے الفاظ کے مفہوم کی وسعت تنگ نہ ہو جائے، بایں ہمہ ان لوگوں کو بھی دائرہ سے خارج نہ کیا جائے، جو ان الفاظ سے وہ مفہوم سمجھ کر تسلی پا جانا چاہتے ہیں، جن کے وہ الفاظ متحمل ہو سکتے ہیں کہ اگر مرادِ الٰہی یہی تنگی ہوتی تو اللہ تعالیٰ انسانی عقلوں کے اختلافِ مراتب کا لحاظ کیے بغیر اپنے مفہوم کو اس وسعت کے بجائے تنگ سے تنگ الفاظ میں ظاہر فرما سکتا تھا، مگر ایسا نہیں کیا تا کہ اسلام مختلف العقول انسانوں کے لیے عالم گیر ثابت ہو سکے۔

ایک دوسری قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ عالمِ آخرت کے وقائع اور حالات کے سمجھنے میں اشکالات و اعتراضات اس لیے پیش آتے ہیں کہ ہم وجود اور اس کے موجودہ تمام قوانینِ فطرت کو اس طرح لازم و ملزوم سمجھتے ہیں کہ جب کسی شے کے وجود کا تذکرہ کیا جائے گا تو معاً اس کے وہی خصوصیات و لوازم سامنے آئیں گے، جن کے دیکھنے کے ہم اس دنیا میں عادی ہیں حالانکہ اربابِ عقل نے یہ طے کر دیا ہے کہ اس موجودہ دنیا کے معلومات و مسببات اور ان کے موجودہ علل و اسباب میں جو لزوم ہیں، وہ محض عادی ہے، یعنی اس لیے ایسا ہے کہ ہم ایسا دیکھتے

ہیں، یہ نہیں کہ اس لیے ایسا ہے کہ ایسا ہی ہونا چاہیے۔

اس بنا پر اگر صرف اتنی سی بات ذہن نشین کر لی جائے کہ موجودہ مادی دنیا میں جو قوانینِ فطرت اور علل و اسباب اور ان کے نتائج کارفرما ہیں، وہ صرف اسی عالم اور موجودہ دنیا کے قوانین ہیں۔ اگر خدائے تعالیٰ کوئی نئی دنیا بنائے یا نیا عالم خلق کرے، تو ضروری نہیں کہ یہی موجودہ قوانینِ فطرت وہاں بھی کارفرما ہوں، بلکہ بالکل ممکن ہے کہ اس نئے عالم میں نئے قوانین پر عمل ہو، نئی خصوصیات کے جسم ہوں، نئی قسم کی زندگیاں ہوں، نئی قسم کی آگ ہو، نئی قسم کے باغ اور ان کے پھل ہوں، نئی قسم کے موجودات و مخلوقات ہوں، نئے علل و اسباب ہوں اور نئے قوانینِ فطرت ہوں۔ وحیِ محمدی نے اسی نئے عالم کے متعلق کہا ہے۔ ﴿یَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَیْرَ الْاَرْضِ وَ السَّمٰوٰتِ﴾ (جس دن یہ زمین نئی زمین سے بدل جائے گی اور آسمان (نئے آسمانوں سے)۔

اب کون کہہ سکتا ہے کہ اس نئی زمین اور نئے آسمان میں بھی وہی قانون جاری ہوں گے، جو اس موجودہ زمین و آسمان میں جاری ہیں۔ اس بنا پر جسمانیت و مادیت کے وہ تمام اعتراضات اور آئندہ حیات کے متعلق وہ تمام اشکالات جو اس دنیا اور اس کے قوانین کی بنا پر پیدا ہوتے ہیں، بالکل بے بنیاد اور بے حقیقت ہیں۔

اس ضروری تمہید کے بعد جزا و سزا کی اسلامی تشریحات کی جانب قدم اٹھایا جاتا ہے۔

اصولِ جزا

اللہ تعالیٰ نے جس طرح موجودہ عالم کو اپنے خاص نظام اور قانون پر بنایا ہے، جس کو اہلِ فلسفہ قانونِ قدرت اور اہلِ مذہب تقدیر اور اندازۂ الٰہی کہتے ہیں، اسی طرح اس نے اپنے ہر عالم کے لیے ایک نظام اور تقدیر قائم کی ہے، جس کے مطابق اس عالم کا کاروبار انجام پاتا ہے، انسان غلطی سے یہ سمجھتا ہے کہ یہ اصولِ فطرت صرف مادیات تک محدود ہیں حالانکہ مادیات ہوں یا روحانیات، ذہنیات ہوں یا عملیات ہر ایک میں یہ یکساں جاری و ساری ہیں جس طرح یہ قانونِ فطرت ہے کہ زہر کھانے سے انسان کا جسم مر جاتا ہے اسی طرح یہ بھی اصولِ فطرت ہے کہ گناہ سے اس کی روح مر جاتی ہے اور جس طرح اصولِ حفظانِ صحت کی عدم پیروی سے انسان بیمار ہو جاتا ہے، اسی طرح اصولِ تزکیۂ نفس کی عدم متابعت سے بھی وہ مریض ہو جاتا ہے، پھر جس طرح دوا اور اصولِ حفظانِ صحت کی پابندی سے وہ اپنی جسمانی بیماری کے آلام سے نجات پاتا ہے، ایسا ہی روحانی تدابیرِ علاج کے ذریعہ سے وہ شفا یاب بھی ہوتا ہے۔

اعمال کے لوازم و نتائج

غرض جس طرح دنیا میں ہر چیز کی ایک خاصیت ہے، اور وہ جب یہاں وجود پذیر ہوتی ہے تو اس کے ساتھ اس کے خواص و آثار بھی پیدا ہوتے ہیں، اسی طرح انسان کی اندرونی کیفیات و اعمال کے بھی کچھ آثار و لوازم ہیں جو اس سے الگ نہیں ہو سکتے، غرور اور خاکساری، بخل اور فیاضی، انتقام اور عفو، شجاعت اور بزدلی، تقویٰ اور فسق

ایمان اور کفر ہر ایک کا ایک نہ ایک اثر و نتیجہ ہے' اور ہر ایک کے کچھ نہ کچھ خصائص ولوازم ہیں' جو اس سے اسی طرح الگ نہیں ہو سکتے جس طرح سنکھیا سے سمیّت' شکر سے مٹھاس اور آگ سے حرارت جدا نہیں ہو سکتی' اور ان معنوی' روحانی اور نفسیاتی چیزوں میں علت و معلوم کا وہی لزوم ہے جو جسمانی مادی اور طبیعاتی اشیا میں ہے۔

اشخاص کی نیکوکاری و بدکاری اور افراد کی سعادت و شقاوت کے جو اصول ہیں وہی جماعتوں اور قوموں کی صلاح و فساد' اور سعادت و شقاوت پر بھی حاوی ہیں' جس طرح ایک سائنٹسٹ (حکیم) کا کام ان مادی فزیکل اصولوں کو جاننا اور بتانا ہے اور ان کی تعلیم کا نام ہماری اصطلاح میں حکمت (سائنس) ہے' اسی طرح ان روحانی اسباب و علل اور آثار و نتائج کو جاننا اور بتانا انبیاء علیہم السلام کا کام ہے اور ان کی اس تعلیم کا نام شریعت ہے' انبیاؑ کی اس تعلیم کے مطابق ہم کو اعمال کے روحانی آثار و نتائج کا وہی یقین ہونا چاہیے جو ایک حکیم کی تعلیم کے مطابق ہم کو جسمانی اشیا کے خواص و آثار کا ہوتا ہے' سائیکالوجی (علم النفس) اور سوشیالوجی (علم الاجتماع) کی وسعتِ تحقیق نے اس مفہوم کے سمجھنے میں اب بہت کچھ سہولت پیدا کر دی ہے۔

عقاب و ثواب ردِّ عمل ہے

الغرض یہ مادی و جسمانی دنیا علت و معلول اور عمل و ردِّ عمل کے جس اصول پر مبنی ہے اس کی وسعت کے دائرہ میں انسان کا ہر قول اور ہر عمل شامل اور داخل ہے یہی سبب ہے کہ گناہ کے لازمی نتیجہ کا نام اسلام میں عقاب اور اعمالِ صالحہ کے لازمی نتیجہ کا نام ثواب رکھا گیا ہے' قرآن نے ان ہی دونوں اصطلاحوں کو بار بار استعمال کیا ہے' عقاب کا لفظ عقب سے نکلا ہے جس کے معنی پیچھے کے ہیں۔ اس لیے عقاب اس اثر کا نام ہے جو کسی فعل کرنے کے بعد لازم آ جاتا ہے اور ثواب کا لفظ ثوب سے لیا گیا ہے' جس کے معنی لوٹنے کے ہیں' اس لیے یہ کسی اچھے کام کے لوٹنے والے کے نتیجہ اور جزا کے معنی میں بولا گیا ہے۔

اسی ایک مسئلہ کو اگر اچھی طرح سمجھ لیا جائے تو جزا اور سزا کے شرعی اصول کے سمجھنے میں کوئی دقت نہ ہو' چنانچہ قرآن پاک میں یہ کئی دفعہ فرمایا گیا ہے:

﴿اَلْیَوْمَ تُجْزَوْنَ مَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ﴾ (جاثیہ:۲۸)

''جو تم کرتے تھے وہی آج بدلہ پاؤ گے۔''

اس سے معلوم ہوا کہ جزا و سزا ہمارے ہی اعمال کے ردِّ عمل (ری ایکشن) کا نام ہے' ایک اور جگہ ہے:

﴿لِتُجْزٰی کُلُّ نَفْسٍ بِمَا تَسْعٰی﴾ (طٰہٰ: ۱۵)

''تا کہ ہر جان کو اس کا بدلہ دیا جائے جو وہ کرتی ہے۔''

ان آیتوں میں یہ صاف تصریح ہے کہ یہ جزا و سزا تمامتر ہمارے دنیاوی اعمال کے آثار و لوازم ہیں۔

﴿فَاَصَابَھُمْ سَیِّاٰتُ مَا عَمِلُوْا وَ حَاقَ بِھِمْ مَّا کَانُوْا بِہٖ یَسْتَھْزِءُوْنَ﴾ (نحل:۳۴)

''تو ان کے برے کام ان پر پڑے اور ان کا ٹھٹھا کرنا ان پر الٹ پڑا۔''

غرض جزا و سزا انہی اعمال کے نتائج کا دوسرا نام ہے' چنانچہ آنحضرت ﷺ نے گویا اسی اصول کی تشریح میں یہ ارشاد فرمایا کہ قیامت میں اللہ تعالیٰ فرمائے گا۔ اے میرے بندو! یہ تمہارے ہی اعمال ہیں جو میں تم کو لوٹا کر یہاں دے رہا ہوں' تو جو کوئی جزائے خیر پاوے' وہ خدا کا شکر ادا کرے' اور جس کو برائی ملے وہ خود کو ملامت کرے۔ (۱)

حصولِ راحت کا اصول

یہ فطری قانون ہے کہ ہم کسی بڑی تکلیف سے اسی وقت بچ سکتے ہیں جب اس کی خاطر ہم اس سے چھوٹی چھوٹی تکلیفوں کو برداشت اور کسی بڑی خوشی کے لیے ہم اپنی چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو قربان کرتے رہیں' عاجلہ یعنی موجودہ اور آخرہ یعنی آئندہ۔ ان دونوں کا جب کبھی تقابل پیش آتا ہے' تو دوں ہمت اور پست خیال لوگ عموماً موجودہ (عاجلہ) راحت کو پسند کر کے آئندہ کی راحت کی فکر نہیں کرتے کہ ان کی نگاہ میں موجودہ راحت گو چھوٹی ہو مگر نقد ہے' اور آئندہ کی راحت گو بڑی خوش آیند ہے مگر وہ نسیہ ہے اور ان کا اصول یہ ہے کہ نقد را بہ نسیہ مگذار لیکن بلند ہمت اور عالی حوصلہ طبائع کا طریقِ عمل اس کے بالکل برخلاف ہے۔ فاتح اور کشور کشا آج اپنی جانیں جوکھم میں ڈالتے ہیں تا کہ کل سلطنت ان کے ہاتھ آئے' تاجر اور سوداگر آج اپنے سرمایہ کو بازار کے سپرد کر دیتے ہیں تا کہ دولت فردا سے بہرہ مندہ ہوں' ہر مہذب انسان اپنے بچہ کو بیس پچیس برس تک تعلیم و تربیت اور مشق و امتحان کی مصیبتوں کی آگ میں بے تامل جھونک دیتا ہے تا کہ اس کی آئندہ زندگی راحت و مسرت میں بسر ہو' لوگ اپنے سرمایۂ عزیز کو تکلیفیں اٹھا کر جمع کرتے جاتے ہیں' تا کہ کل اس سے زیادہ ضروری موقع پر اس کو کام میں لا سکیں اور تنگ دستی کی بڑی تکلیف سے بچ سکیں۔

غرض اگر انسانوں کی تمام کوششوں پر ایک غائر نگاہ ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ کامیابی کے حصول کا یہی اصول ان کے اندر جاری و ساری ہے کہ تھوڑی سی تکلیف کو اس لیے برداشت کر لیا جائے کہ کسی بڑی تکلیف سے رہائی ملے' چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو اس لیے برباد کیا جائے کہ کوئی بڑی خوشی حاصل ہو اور عارضی کامیابیوں کو اس غرض سے قربان کیا جائے کہ کوئی پائیدار اور دائمی کامیابی نصیب ہو' مگر یہ جب ہی ہو سکتا ہے کہ آئندہ کی خوشی و کامیابی کی فراوانی اور اس کے دوام اور کامیابی کا ہم کو یقین ہو' کیونکہ اگر ایسا یقین نہ ہو تو ہم کبھی اس ایثار و قربانی کے لئے آمادہ نہ ہوں' اسی لئے ایمان کی ضرورت ہے تا کہ ہمارے اندر یقین پیدا ہو جائے اور ہم اس ایثار و قربانی کو خوشی خوشی گوارا کر لیں جن لوگوں میں یہ یقین پیدا نہ ہوگا' ان سے یہ عظیم الشان قربانی بھی نہیں ہو سکتی' اسی لیے گنہگار انسانوں کی یہ کیفیت قرآن نے بیان کی ہے:

---

(۱) صحیح مسلم ترمذی کتاب الزہد و مسند ابن حنبل ج ۵ ص ۵۴۔۱۶۰ اور ادب المفرد و بخاری باب الظلم۔

﴿كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ ○ وَ تَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ﴾ (القیامۃ:۲۰،۲۱)

''ہرگز نہیں بات یہ ہے کہ تم موجودہ زندگی سے محبت رکھتے ہو اور آئندہ زندگی کو چھوڑتے ہو۔''

حالانکہ انسان اسی اصولِ کار کو اگر دنیا کی طرح آخرت کے معاملات میں بھی برتے تو اس کی کامیابی میں کوئی شک نہ رہے۔ آئندہ کا خیال کر کے موجودہ سے دست بردار ہو جانا یہی کامیابی کی کنجی ہے اور اسی اصول کے تحت میں دین و دنیا کی تمام نیکیوں اور کامیابیوں کا راز پوشیدہ ہے۔ موجودہ عارضی لذت کو آئندہ کی دائمی لذت پر اور حال کی معمولی راحت کو مستقبل کی دیرپا راحت پر قربان کر دینا وہ سچائی ہے جس کے تسلیم کرنے سے کوئی انحراف نہیں کر سکتا تم صبح خیزی کی معمولی تکلیف کو صحت کی دیرپا راحت کی خاطر قربان کرتے ہو ورزش اور دوڑ دھوپ کی محنت کو اس لیے قبول کرتے ہو کہ کل کی پیری اور بیماری کی تکلیف سے تم کو وہ بچائے غرض آج کی چھوٹی چھوٹی تکلیفوں کو اٹھاؤ گے تو کل کی بڑی تکلیف سے تم کو نجات مل سکے گی اور آج کی عارضی خوشیوں کو قربان کرو گے تو کل کی دائمی خوشی نصیب ہوگی یہی وہ فلسفہ ہے جس کو قرآن نے اس آیت میں ادا کیا ہے:

﴿وَ جَزٰهُمْ بِمَا صَبَرُوْا جَنَّةً وَّ حَرِيْرًا﴾ (الدھر:۱۲)

''اور خدا نے ان کے صبر کرنے پر ان کو باغ اور ریشم کے کپڑے مزدوری دی۔''

یہ صبر کیا تھا؟ دنیا کی عارضی خوشیوں کی قربانی تا کہ آخرت کی بڑی خوشی حاصل ہو اور یہاں ادائے نیکی اور احترازِ جرم کی معمولی تکلیفوں کی برداشت تا کہ وہاں کی بڑی تکلیف سے نجات ملے یہی سبب ہے کہ حدیث میں آیا ہے کہ حُفَّتِ الْجَنَّةُ بِالْمَكَارِهِ وَ حُفَّتِ النَّارُ بِالشهواتِ۔ یعنی جنت دنیاوی تکلیفوں سے اور دوزخ دنیا کی معمولی خوشیوں سے گھری ہوئی ہے نادان تقویٰ اور نیکی کی ان معمولی قیدوں سے گھبراتے اور گناہ کی عارضی لذتوں کے طلبگار رہتے ہیں اس لئے آخرت کی بڑی تکلیف میں گرفتار ہوں گے اور وہاں کی ابدی لذت سے محروم رہیں گے اور جو دین و دیانت اور نیکی و تقویٰ کی ان معمولی تکلیفوں کو گوارا کریں گے اور گناہ کی عارضی لذتوں سے بچیں گے وہ آخرت کی لاانتہا لذتوں سے شادکام ہوں گے یہی فلسفہ قرآن پاک کی اس آیت میں ادا ہوا ہے:

﴿وَ اَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَ نَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ○ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى ○﴾

(النازعات:۴۰،۴۱)

''لیکن جو اپنے پروردگار کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرا اور نفس کو ناجائز لذتوں اور خوشیوں سے باز رکھا تو جنت اس کا ٹھکانا ہے۔''

نامۂ عمل

ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں جو چیز بھی ایک دفعہ پیدا ہو جاتی ہے پھر وہ بے حکمِ خدا فنا نہیں ہوتی اسی طرح افعال و اعمال بھی جو انسان سے ظہور پذیر ہوتے ہیں وہ فنا نہیں ہوتے موجودہ سائنس (جس نے یہ اصول تسلیم کر

باہے کہ دنیا میں کوئی حرکت بھی پیدا ہو کر فنا نہیں ہوتی' یہاں تک کہ فضا میں ہر آواز اور ہر صدا بھی جو کبھی بلند ہوئی ہے' آج موجود ہے' اور ہمیشہ رہے گی اور ہم اس کو پکڑ پائیں تو سن سکتے ہیں) اعمال وافعال کے دوامِ وجود سے سلامی عقیدہ کو قبول کرنے میں پس وپیش نہیں کر سکتی' دنیا کے ریکارڈ میں انسان کا ہر عمل وفعل ہمیشہ کے لیے گویا بھرا ہے۔

قرآن پاک نے اسی اصول کو اپنی ان آیتوں میں بیان کیا ہے:

﴿هُنَالِکَ تَبْلُوْا کُلُّ نَفْسٍ مَّآ اَسْلَفَتْ﴾ (یونس:۳۰)

''اس وقت ہر جان جو اس نے پہلے کیا' اس کو آزمائے گی۔''

﴿کُلُّ امْرِئٍ بِمَا کَسَبَ رَهِیْنٌ﴾ (طور:۲۱)

''ہر آدمی اپنے عمل کے بدلے گرو ہے۔''

﴿کُلُّ نَفْسٍ بِمَا کَسَبَتْ رَهِیْنَةٌ﴾ (مدثر:۳۸)

''ہر جان اپنے عمل کے بدلے گرو ہے۔''

﴿فَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَیْرًا یَّرَهٗ ○ وَ مَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا یَّرَهٗ﴾ (الزلزال:۷'۸)

''تو جو کوئی ایک چیونٹی بھر نیکی کرے گا' وہ اس کو دیکھے گا' اور جو چیونٹی برابر بدی کر لے گا' وہ اس کو بھی دیکھے گا۔''

﴿یَوْمَ تَجِدُ کُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَیْرٍ مُّحْضَرًا وَّ مَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْٓءٍ﴾ (آل عمران: ۳۰)

''جس دن ہر جان جو اس نے اچھے کام کیے ان کو موجود پائے گی اور جو برے کام کیے وہ بھی۔''

یہ بات کہ ہر انسان کا ہر عمل وفعل صحیفۂ عالم پر ہمیشہ کے لیے ثبت ہو جاتا ہے' اس کو قرآن نے کئی طریقوں سے ادا کیا ہے۔

ایک اس طرح کہ انسان کی زبان سے جب کبھی کوئی لفظ نکلتا ہے' خواہ وہ کتنی ہی تنہائی میں بولا جائے' خدائی گواہ اس کو سننے کو موجود رہتے ہیں' اور وہ اس کو سن کر محفوظ کر لیتے ہیں:

﴿اِذْ یَتَلَقَّی الْمُتَلَقِّیٰنِ عَنِ الْیَمِیْنِ وَ عَنِ الشِّمَالِ قَعِیْدٌ ○ مَا یَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَیْهِ رَقِیْبٌ عَتِیْدٌ ○﴾ (قٓ : ۱۷'۱۸)

''جب دو لینے والے داہنے اور بائیں بیٹھے لیتے جاتے ہیں کوئی بات وہ نہیں بولتا مگر ایک نگراں اس کے پاس حاضر رہتا ہے۔''

کبھی اس کو اعمال کی تحریر و کتاب کے الفاظ میں ظاہر کیا گیا ہے:

﴿اَمْ یَحْسَبُوْنَ اِنَّا لَا نَسْمَعُ سِرَّهُمْ وَ نَجْوٰهُمْ بَلٰی وَ رُسُلُنَا لَدَیْهِمْ یَکْتُبُوْنَ﴾ (زخرف:

(۸۰)

''کیا یہ منکر سمجھتے ہیں کہ ہم ان کے بھید اور ان کی کانا پھوسی نہیں سنتے۔ کیوں نہیں! بلکہ ہمارے فرستادہ ان کے پاس اعمال کو لکھتے ہیں۔''

﴿اِنَّ رُسُلَنَا یَکْتُبُوْنَ مَا تَمْکُرُوْنَ﴾ (یونس:۲۱)

''بے شک ہمارے فرستادہ تمہاری چالوں کو لکھتے رہتے ہیں۔''

کبھی اللہ تعالیٰ ہر عمل کے موقع پر خود اپنی حاضری اور دائمی علم وشہادت کو ظاہر کرتا ہے:

﴿وَ مَا تَکُوْنُ فِیْ شَاْنٍ وَّ مَا تَتْلُوْا مِنْهُ مِنْ قُرْاٰنٍ وَّ مَا تَعْمَلُوْنَ مِنْ عَمَلٍ اِلَّا کُنَّا عَلَیْکُمْ شُهُوْدًا اِذْ تُفِیْضُوْنَ فِیْهِ﴾ (یونس:۶۱)

''اور تو کسی کام میں نہیں ہوتا' اور نہ قرآن سے کچھ پڑھتا ہے اور نہ تم لوگ کوئی کام کرتے ہو' لیکن ہم موجود ہوتے ہیں جب تم اس میں لگے ہوتے ہو۔''

کبھی یہ کہا ہے کہ ہر انسان کا نامۂ عمل اس کی گردن میں لٹکا ہے' قیامت کے دن وہی فردِ عمل کی صورت میں انسان کے سامنے پھیلا دیا جائے گا' کہ اپنا اعمال نامہ تم خود پڑھ لو۔

فرمایا:

﴿وَ کُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِیْ عُنُقِهٖ وَ نُخْرِجُ لَهٗ یَوْمَ الْقِیَامَةِ کِتٰبًا یَّلْقٰىهُ مَنْشُوْرًا ○ اِقْرَاْ کِتٰبَکَ کَفٰی بِنَفْسِکَ الْیَوْمَ عَلَیْکَ حَسِیْبًا﴾ (بنی اسرائیل:۱۳'۱۴)

''اور ہم نے ہر انسان کا نتیجہ (عمل) اس کی گردن میں چپکا دیا ہے' اور قیامت کے دن ہم دفتر کر کے نکالیں گے جس کو وہ کھلا ہوا پائے گا کہ اپنا دفتر پڑھ لے' آج تیرا نفس خود ہی محاسب ہو تو کافی ہے۔''

اس آیت کا ایسا محمل ہے کہ نامۂ عمل کو اگر کوئی واقعی کاغذ کا دفتر یا حساب وکتاب کا رجسٹر نہ سمجھے تو سمجھ سکتا ہے اور کہہ سکتا ہے کہ یہ تعبیر اس لیے اختیار کی گئی کہ جس طرح کاغذ اور رجسٹر میں قلم بند حساب کوئی بھول نہیں سکتا۔ اور ایک ایک چیز اس میں درج ہوتی ہے اسی طرح یہ اعمالِ انسانی فراموش نہ ہوں گے بلکہ لکھے ہوئے رجسٹر کی طرح محفوظ رہیں گے' فرمایا:

﴿وَ وُضِعَ الْکِتٰبُ فَتَرَی الْمُجْرِمِیْنَ مُشْفِقِیْنَ مِمَّا فِیْهِ وَ یَقُوْلُوْنَ یٰوَیْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْکِتٰبِ لَا یُغَادِرُ صَغِیْرَةً وَّ لَا کَبِیْرَةً اِلَّآ اَحْصٰىهَا وَ وَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا وَّ لَا یَظْلِمُ رَبُّکَ اَحَدًا﴾ (کہف:۴۹)

''اور نامۂ اعمال رکھا جائے گا' تو گنہگاروں کو تو دیکھے اس میں جو کچھ لکھا' اس سے ڈر رہے ہوں گے' اور کہیں گے کہ ہائے افسوس کہ اس کاغذ کو کیا ہے کہ چھوٹی بڑی بات نہیں چھوڑتا' لیکن اس کو شمار کر لیا اور جو کچھ انہوں نے زندگی میں کیا اس کو سامنے پائیں گے' اور تیرا پروردگار کسی پر ظلم نہ کرے گا۔''

بایں ہمہ اگر کوئی ٹھیٹ لفظوں کا پابند ہو کر نامۂ اعمال کو واقعی کاغذوں کا دفتر سمجھتا ہے' تو اس میں شک نہیں کہ الفاظ کے ظاہری معنی اس کی تائید کریں گے۔ مگر کون سمجھتا ہے کہ یہ کیونکر ہوگا' اسی لیے اس پر بحث فضول ہے کہ یہ کیونکر ہوگا' چاہے یہ ہو یا وہ' بہر حال ہمارے اعمال کا ایک ایک نقطہ محفوظ رہے گا' اور وہ خدا کے سامنے پیش ہوگا اور یہی اس عقیدہ کا اصل مقصد ہے۔

اعضا کی شہادت

انسان کا ہر عمل اپنے پیچھے اپنے کرنے والے کے اندر اپنا اچھا یا برا اثر چھوڑ جاتا ہے' اگر دل کا آئینہ صاف ہو' تو اس کو اپنے عمل کا چہرہ اس میں صاف دکھائی دے فرمایا۔

﴿بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِہٖ بَصِیْرَۃٌ ○ وَّ لَوْ اَلْقٰی مَعَاذِیْرَہٗ ○﴾ (قیامہ:۱۴'۱۵)

''بلکہ انسان کو اپنے نفس کا حال آپ دکھائی دیتا ہے' اگر چہ وہ اپنے عذر تراشتا ہے۔''

یہی وہ آئینہ ہے جو گناہ کے میل سے زنگ آلود ہو جاتا ہے۔

﴿کَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ﴾ (مطففین:۱۴)

''نہیں بلکہ ان کے دلوں پر زنگ بیٹھ گیا ہے۔''

گویا اسی آیت کی تفسیر میں آنحضرت ﷺ نے یہ فرمایا ہے کہ جب انسان پہلے پہل گناہ کرتا ہے تو اس کے دل میں ایک سیاہ نقطہ پڑ جاتا ہے اگر وہ توبہ و انابت کرتا ہے اور آئندہ اس سے باز رہتا ہے تو وہ مٹ جاتا ہے' اور اگر اسی طرح گناہ کئے جاتا ہے تو اس نقطہ کا دائرہ بڑھتا جاتا ہے' یہاں تک کہ ایک دن پورے دل پر چھا جاتا ہے۔ (ترمذی)

اسی طرح وہ اپنے جن اعضا سے جو برا کام کرتا ہے' اس کا اثر ان پر چھا جاتا ہے' یہاں تک کہ چہروں پر اس اثر کے نقوش ابھر آتے ہیں' آنکھوں میں اس کی لکیریں پڑ جاتی ہیں اور ہاتھ پاؤں پر اس کے نشان نمایاں ہو جاتے ہیں' عالمِ غیب کو چھوڑو' اسی عالمِ ظاہر میں تاڑنے والوں کی نگاہیں' انسانوں کے چہروں' آنکھوں اور ہاتھ پاؤں کے عنوانِ بیان سے انسان کے اندر کی تحریریں پڑھ لیتی ہیں' اسی طرح قیامت میں ان کے اعمال کے آثار و نتائج ان کے ایک ایک عضو سے نمایاں ہوں گے۔

﴿یُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِیْمَاھُمْ﴾ (رحمٰن:۴۱)

''گنہگار اپنی پیشانی سے پہچان لئے جائیں گے۔''

ایسی حالت میں اس وقت جب انسان کی زبانِ قال پر خداوندِ عدالت کے رعب و جلال سے مہر سکوت پڑ جائے گی' اگر انسان کے ہاتھ پاؤں اور کھال تک اس کے اعمالِ بد پر گواہی دے دیں تو تعجب کی کیا بات ہے' فرمایا:

﴿وَ امْتَازُوا الْیَوْمَ اَیُّھَا الْمُجْرِمُوْنَ ○ اَلْیَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓی اَفْوَاھِھِمْ وَ تُکَلِّمُنَآ اَیْدِیْھِمْ وَ

تَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ﴾ (یٰسٓ :۵۹و۶۵)

''اے گنہگارو! آج نیکوکاروں سے الگ ہوکر پہچان میں آ جاؤ۔۔۔۔آج ہم ان کے منہ پر مہر لگا دیں گے' اور ان کے ہاتھ ہم سے بولیں گے اور ان کے پاؤں ان کے کرتوتوں کی گواہی دیں گے۔''

﴿وَ يَوْمَ يُحْشَرُ اَعْدَآءُ اللّٰهِ اِلَى النَّارِ فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ ○ حَتّٰٓى اِذَا مَا جَآءُوْهَا شَهِدَ عَلَيْهِ سَمْعُهُمْ وَ اَبْصَارُهُمْ وَ جُلُوْدُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ○ وَ قَالُوْا لِجُلُوْدِهِمْ شَهِدْتُّمْ عَلَيْنَا قَالُوْٓا اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ﴾ (حم السجدۃ۱۹:۲۱)

''اور جس دن خدا کے دشمن دوزخ کی طرف ہانکے جائیں گے' اور وہ درجہ بدرجہ بانٹے جائیں گے' یہاں تک کہ جب وہ اس کے پاس پہنچے تو ان کے کانوں' آنکھوں اور ان کی کھالوں نے ان پر ان کے کرتوتوں کی گواہی دی' انہوں نے کہا تم نے ہم پر کیوں گواہی دی' کہا کہ جس خدا نے ہر چیز کو گویا کیا اسی نے ہم کو بھی گویا کیا۔''

اس لیے ان اعضا کی گویائی بھی اسی نوع کی ہوگی' جس نوع کی گویائی دنیا کی ہر چیز کو حاصل ہے' لیکن اس گویائی سے اگر کوئی حقیقی زبان کی گویائی مراد لے کر تشفی پاتا ہے تو اس کو اس کا حق حاصل ہے۔

میزان

اکثر انسانوں کے اچھے یا برے دونوں قسم کے اعمال ہوتے ہیں' ایک قسم کا عمل کم ہوگا اور دوسرا زیادہ یا دونوں برابر' دو مادی چیزوں کے درمیان تفاصل اور گھٹ بڑھ کا علم ہم کو تولنے یا گننے سے ہوتا ہے' اس لیے وزن اور حساب سے عموماً عدل وانصاف' حق اور ٹھیک ٹھیک کا مفہوم ادا کیا جاتا ہے' اعمال انسانی کے متعلق خدا نے فرمایا ہے کہ ان کو اس کے عمل کے مطابق پورا پورا بدلہ ملے گا' فرمایا:

﴿جَزَآءً وِّفَاقًا﴾ (النباء:۲۶) ''پورا پورا بدلہ۔''

اس برابری اور کمالِ عدل وانصاف کے مفہوم کو ترازو کی ناپ اور عدالت کی میزان کے استعارہ سے ادا کیا' فرمایا:

﴿فَلَنَقُصَّنَّ عَلَيْهِمْ بِعِلْمٍ وَّ مَا كُنَّا غَآئِبِيْنَ ○ وَ الْوَزْنُ يَوْمَئِذِ ِنِ الْحَقُّ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ○ وَ مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ﴾ (اعراف:۷'۹)

''پھر ہم احوال سنائیں گے اور ہم کہیں غائب نہ تھے اور وزن اس دن حق ہے۔ پھر جس کی تولیں بھاری ہوئیں۔ تو وہ ہیں' جن کا بھلا ہوا اور جس کی تولیں ہلکی پڑیں' سو وہی ہیں جو اپنی جانیں ہار بیٹھے۔''

﴿فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ ○ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ○ وَّ اَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ ○ فَاُمُّهٗ

هَاوِيَةٌ﴾ (القارعۃ:۶'۹)

''تو جس کی تول بھاری ہوئی تو وہ خوش خوش عیش میں ہوگا اور جس کی تول ہلکی ہوئی تو اس کی ماں دوزخ ہے۔''

ان دونوں آیتوں میں تول کے بھاری اور ہلکے ہونے سے مقصود اعمالِ خیر کی کمی وبیشی ہے' پہلی آیت میں اس کا اشارہ موجود ہے کہ وزن سے مراد حق وعدل ہے' اور یہ کہ انسان کا ہر عمل علمِ الٰہی میں موجود ہوگا اور وہ کسی طرح بیش وکم نہ ہوگا۔

اس مفہوم میں یہ استعارہ قرآن میں بکثرت مستعمل ہوا ہے' ایک جگہ ہے۔

﴿اَللّٰهُ الَّذِیْ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ وَ الْمِیْزَانَ﴾ (الشوری:۱۷)

''وہ اللہ جس نے کتاب کو بھی حق کے ساتھ اتارا' اور میزان کو۔''

یعنی کتابِ الٰہی حقانیت کے ساتھ اتری ہے اور اسی کے ساتھ میزان بھی جس سے مراد عدل ہے (طبری تفسیر آیت مذکورہ) اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے نظامِ کائنات کی ہر چیز میں جو اعتدالِ کامل رکھا ہے' اس کو بھی میزان ہی کے لفظ سے ادا فرمایا ہے۔

﴿وَ وَضَعَ الْمِیْزَانَ﴾ (الرحمٰن:۷)

''اور خدا نے ترازو رکھی ہے۔''

حساب

کمی وبیشی کے علم کا دوسرا طریقہ حساب ہے دوسری آسمانی کتابوں کی طرح قرآن میں بھی یہ استعارہ استعمال ہوا ہے' اور بار بار فرمایا ہے کہ ہم قیامت میں تمہارے عمل کا حساب لیں گے مگر اس حساب سے بھی وہی مقصود ہے جو وزن سے ہے' چنانچہ سورۂ انبیاء میں یہ مفہوم مزید تصریح کے ساتھ مذکور ہے' اور جس سے میزان کی حقیقت بھی پوری طرح سمجھ میں آتی ہے' فرمایا:

﴿وَ نَضَعُ الْمَوَازِیْنَ الْقِسْطَ لِیَوْمِ الْقِیٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَیْئًا وَ اِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَیْنَا بِهَا وَ كَفٰى بِنَا حٰسِبِیْنَ﴾ (الانبیاء:۴۷)

''اور ہم قیامت کے دن کے لیے ترازوئیں یعنی انصاف رکھیں گے پھر کسی پر کچھ ظلم نہ ہوگا' اگر رائی کے دانہ کے برابر بھی کچھ ہوگا تو ہم لے آئیں گے اور ہم کافی ہیں حساب کرنے والے۔''

اس آیت سے دو باتیں سمجھی جا سکتی ہیں' ایک تو یہ کہ وزن سے مقصود انصاف اور عدمِ ظلم ہے اور دوسری یہ کہ حساب سے مقصود یہ ہے کہ عملِ انسانی کا کوئی وزن معاوضہ میں چھوٹنے نہ پائے گا اور نہ وہ خدا کے علم سے غائب ہے لیکن بہر حال وزن وحساب کے مادی ہی مفہوموں کو اگر کوئی صحیح باور کرتا ہے' تو وہ بھی حق پر ہے۔

جنت ودوزخ

اب ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان اعمال کی تکلیف اور ذمہ داری سے مقصودِ الٰہی کیا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا منشا یہ ہے کہ روح انسانی کو سعادتِ ابدی اور ترقیاتِ غیر متناہی عطا کی جائیں۔ مگر اس سعادت وترقی کی بنیاد خدا نے اعمالِ نیک کے حصول اور اعمالِ بد سے پرہیز پر رکھی ہے۔ اس لیے یہ کہنا صحیح ہے کہ خلقتِ انسانی کی غرض یہ ہے کہ وہ احکامِ الٰہی کی تعمیل کرے تاکہ وہ اپنی مقررہ سعادت اور موعودہ ترقی کو حاصل کرے اور اسی عالم کا نام جہاں یہ سعادت ابدی اور ترقیاتِ غیر متناہی ملتی ہے ''بہشت'' ہے اور اس عالم کا نام جہاں جاکر دنیاوی کمیوں کی تلافی اور گزشتہ حیاتِ فانی کے اعمالِ بد کے نتائج سے پاکی حاصل ہوگی ''دوزخ'' ہے' اس لیے یہ کہنا صحیح ہے کہ جنت ہی انسان کا اصلی گھر ہے مزید تفصیل آگے آتی ہے۔

جنت انسان کی وراثت ہے

حضرت آدم علیہ السلام کا قصہ جو تورات اور قرآن پاک میں مذکور ہے وہ آغازِ خلقت کی محض تاریخ نہیں وہ حقیقتِ انسانی کی سچی اور حقیقی تفسیر ہے' عام طور سے سمجھا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو اپنے فضل سے جس جنت میں جگہ دی تھی وہ پہلے ان کو اور ان کی نسل کو ہمیشہ کے لیے دے دی گئی تھی' مگر چونکہ اتفاقاً ان سے گناہ سرزد ہوا اس لیے وہاں سے نکال کر زمین میں بھیج دیے گئے' مگر ایسا سمجھنا صحیح نہیں ہے کہ آدم علیہ السلام کا زمین میں آنا تو ان کی پیدائش سے پہلے ہی مقدر ہو چکا تھا کیونکہ اللہ تعالیٰ ان کی خلقت سے پہلے ہی فرشتوں پر یہ ظاہر کر چکا تھا کہ

﴿اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً﴾ (بقرہ:۳۰)

''میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔''

حضرت آدمؑ کا زمین میں خلیفہ ہونا ان کے زمین میں سکونت پذیر ہونے کی پیشین گوئی ہے' مگر زمین میں بھیجنے سے پہلے ان کو جنت میں رکھنا' پھر گناہ کے بعد وہاں سے ان کو نکال کر زمین میں بھیجنا یہ اشارہ رکھتا ہے کہ آدم اور ان کی نسل کی اصل جگہ یہی جنت ہے' مگر اس سے دوری ان کے گناہ کی وجہ سے ہے' اور اس کا حصول خدا کی اطاعت اور نیکوکاری کے ذریعہ ہوگا۔ چنانچہ ان کے زمین میں اترتے وقت اللہ تعالیٰ نے یہ اعلان فرمادیا:

﴿قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِیْعًا فَاِمَّا یَاْتِیَنَّكُمْ مِّنِّیْ هُدًی فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَ لَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ○ وَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ○﴾ (بقرہ:۳۸'۳۹)

''ہم نے کہا کہ تم سب اس جنت سے اترو' پھر کبھی تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت پہنچے تو جس نے میری ہدایت کی پیروی کی تو اس کو نہ ڈر ہوگا' نہ غم اور جنہوں نے نہ مانا اور ہمارے حکموں کو جھٹلایا' تو وہی ہیں دوزخ والے وہ اس میں رہا کریں گے۔''

﴿قَالَ اهْبِطَا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَ لَا يَشْقٰى ○ وَ مَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّ نَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيَامَةِ اَعْمٰى ○﴾ (طٰہٰ:۱۲۳،۱۲۴)

''خدا نے کہا کہ اس جنت سے تم دونوں ایک ساتھ اتر جاؤ' تم ایک دوسرے کے دشمن ہو تو اگر تمہارے پاس میری طرف سے کوئی رہنمائی آئے تو جس نے میری رہنمائی کی پیروی کی تو وہ نہ گمراہ ہوگا' اور نہ بد بخت ہوگا' اور جس نے میری یاد سے منہ پھیرا' تو اس کے لیے تنگ معاش ہوگی' اور قیامت میں ہم اس کو اندھا اٹھائیں گے۔''

توراۃ میں ہے کہ جنت میں دو درخت تھے' ایک نیک و بد کی پہچان کا اور دوسرا زندگیِ جاوید کا۔ توراۃ کی رو سے آدمؑ کو اسی نیک و بد کی پہچان کے درخت کا پھل کھانے سے منع کیا گیا ہے' لیکن آدم نے اس کو کھالیا' اور اس کی وجہ سے سب سے پہلے ان کو اپنی برہنگی کا علم ہوا' آخر خدا نے ان کو جنت سے نکال دیا کہ وہ زندگی کے درخت کا پھل کھا کر خدائی کا دعویٰ نہ کر بیٹھیں جب وہ جنت سے نکالے گئے تو ان سے کہا گیا۔ (سفر تکوین:۲)

''اور اس درخت سے کھایا جس کی بابت میں نے تجھ سے حکم کیا کہ اسے مت کھانا' زمین تیرے سبب سے لعنتی ہوئی' اور تکلیف کے ساتھ تو اپنی عمر بھر اس سے کھائے گا' اور وہ تیرے لیے کانٹے اور اونٹ کٹارے اگائے گی اور تو کھیت کی نبات کھائے گا اور تو اپنے منہ کے پسینہ کی روٹی کھائے گا جب تک کہ زمین میں پھر نہ جائے۔''

قرآن پاک میں اس درخت کا نام جس کے پھل کھانے سے آدمؑ کو روکا گیا تھا' تصریحاً مذکور نہیں لیکن ایک آیت سے اشارۃً معلوم ہوتا ہے کہ وہ نیک و بد کی شناخت کا درخت تھا' اور شیطان نے یہ کہہ کر ان کو کھلایا کہ ''یہ حیاتِ جاوید اور ملکِ جاوداں کا درخت ہے'' مگر اس کے کھانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کو ''برہنگی کا علم'' ہو گیا جو نیک و بد کی تمیز کا نتیجہ ہے فرمایا:

﴿فَوَسْوَسَ اِلَيْهِ الشَّيْطَانُ قَالَ يٰٓاٰدَمُ هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَ مُلْكٍ لَّا يَبْلٰى ○ فَاَكَلَا مِنْهَا فَبَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا﴾ (طٰہٰ:۱۲۰،۱۲۱)

''شیطان نے آدم کو وسوسہ دیا کہا اے آدم! کیا میں تجھے حیاتِ جاودانی اور سلطنتِ غیر فانی کا درخت بتاؤں تو (آدم و حوا) نے اس درخت کا پھل کھایا تو ان کی بری چیزیں ان پر کھل گئیں۔''

اب سوال یہ ہے کہ ''حیاتِ جاوداں'' اور غیر فانی بادشاہی'' سے مقصود کیا ہے' ظاہر ہے کہ جنت ہے' شیطان کا مقصود یہ تھا کہ اس جنت میں جس میں تم اب ہو' بے دردِ سر ہمیشہ رہنے کا نسخہ تم کو بتاؤں؟ انسان نے خواہش کی تو اس نے نیک و بد کی تمیز کے درخت کا پھل بتا دیا' یہ بھی کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ نیک و بد کی تمیز ہی پر انسان کی شرعی تکلیف اور مؤاخذہ کی بنیاد ہے' ہر وہ مخلوق بلکہ ہر وہ انسان جو اس ادراک سے خالی ہے' وہ شرعی تکلیف اور مؤاخذہ سے گرانبار نہیں' غرض اس خیر و شر کی معرفت کا لازمی نتیجہ شریعت کی تکلیف تھی' چنانچہ وہ اس کے سر ڈالی گئی اور پھر نسل

آدمؑ میں یہ نیک و بد کی تمیز فطری الہام کے ذریعہ عنایت ہوئی فرمایا۔ ﴿وَ نَفْسٍ وَّ مَا سَوّٰهَا ○ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَ تَقْوٰهَا○﴾ (الشمس ۷:۸) اور نفس اور اس کی بناوٹ کی قسم پھر نفس میں اس کی بدی اور اس کی نیکی کو الہام۔

عجب نہیں کہ قرآن پاک یہ آیتیں اسی مفہوم کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔

﴿اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ الْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَ اَشْفَقْنَ مِنْهَا وَ حَمَلَهَا الْاِنْسَانُ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا○ لِيُعَذِّبَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَ الْمُنٰفِقٰتِ وَ الْمُشْرِكِيْنَ وَ الْمُشْرِكٰتِ وَ يَتُوْبَ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا○﴾ (احزاب:۷۲،۷۳)

''ہم نے اپنی امانت (تکلیفِ شرعی) آسمانوں پر اور زمین پر اور پہاڑوں پر پیش کی تو انہوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا اور انسان نے اس کو اٹھا لیا کہ وہ ظالم اور نادان تھا' تا کہ اللہ نفاق والوں اور نفاق والیوں اور شرک والوں اور شرک والیوں کو سزا دے' اور ایمان والوں' اور ایمان والیوں پر رجوع ہو' اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔''

انسان نے اپنی جہالت سے اس تکلیفِ شرعی کی امانت کو اٹھا لیا' جو نیک و بد کی معرفت کا لازمی نتیجہ تھا' اور وہ اس تکلیف شرعی کا لازمی نتیجہ جزا اور سزا تھی' لیکن خدا کی رضامندی یہی تھی کہ اس کے سب بندے اس کی رحمت اور مغفرت کے مستحق ٹھہریں کہ اس کی رحمت و شفقت کا اقتضا یہی ہے کہ گنہگاروں کو معاف کرے اور نیکوکاروں پر اپنی خاص رحمت نازل کرے' لیکن اگر کاشت کار اپنے کھیتوں کو ابرِ رحمت سے مستفید ہونے کے قابل نہ بنائے تو وہ اس کی برکت سے مستفید نہ ہوگا' اسی طرح جو بندہ شرک و نفاق میں مبتلا ہو جانے سے اپنے آپ کو اس کی رحمت کے قابل نہ بنائے تو وہ بھی اس کی رحمت کی بارش سے سیراب نہ ہو سکے گا۔

غرض اس طرح وہ مصلحتِ الٰہی جو انسان کی پیدائش سے تھی' پوری ہوئی اور وہ حیاتِ جاوید اور غیر فانی بادشاہی جس کا حصول قضائے الٰہی نے انسان کی محنت' جدوجہد اور سعی و عمل پر موقوف رکھا تھا' اور جسے شیطان نے آدمؑ کو اسعی و محنت' محض بخت و اتفاق سے دلوانا چاہا تھا' بالآخر اس کا ملنا تقدیرِ الٰہی' جدوجہد' سعی و عمل اور نظامِ ربانی کے مطابق شریعت کی پیروی کے ذریعہ سے مقرر ہوا' جیسا کہ پہلے سے طے شدہ تھا' فرمان آیا:

﴿اِهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ﴾ (بقرہ:۳۸)

''یہاں سے تم سب اترو پھر اگر تمہارے پاس میری طرف سے کوئی رہنمائی آئے تو جس نے میری رہنمائی کی پیروی کی تو ان کو نہ ڈر ہوگا نہ غم۔''

﴿اِهْبِطَا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا

یَضِلُّ وَ لَا یَشْقٰی﴾ (طٰہٰ:۱۲۳)

''تم دونوں یہاں سے نیچے اترو تم ایک دوسرے کے دشمن ہو پھر اگر تمہارے پاس میری طرف سے رہنمائی آئے تو جس نے میری رہنمائی کی پیروی کی تو وہ نہ گمراہ ہوگا اور نہ بد بخت۔''

جب انسان کا اصل مقام وہی حیاتِ جاوید اور مملکتِ ابد ہے تو اسی کا حصول اس کی تمام کوششوں کا محور ہونا چاہیے' اور اسی حیاتِ فانی اور لازوال بادشاہی کی دولت کو اپنی اس فانی زندگی اور زوال پذیر بادشاہی کے تمام کاموں کے مزدو معاوضہ میں حاصل کرنا چاہیے تا کہ وہ اپنے باپ کی اس آسمانی بادشاہی کو پالے جس کی صفت یہ ہے:

﴿فَلَا یُخْرِجَنَّکُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰی ○ اِنَّ لَکَ اَلَّا تَجُوْعَ فِیْهَا وَ لَا تَعْرٰی ○ وَ اَنَّکَ لَا تَظْمَؤُا فِیْهَا وَ لَا تَضْحٰی ○﴾ (طٰہٰ:۱۱۷'۱۱۹)

''تو شیطان تم کو جنت سے باہر نہ کردے تو پھر تو مشقت میں پڑ جائے اور جنت میں تجھ کو یہ ملا ہے کہ اس میں تو نہ بھوکا ہوگا اور نہ ننگا نہ پیاسا ہوگا اور نہ دھوپ کی تپش اٹھائے گا۔''

آدمؑ اس جنت سے نکلے تو ان کو بھوک بھی لگی' ننگے بھی ہوئے' پیاس بھی معلوم ہوئی' اور دھوپ کی تپش کی تکلیف بھی ہوئی' اور زمین میں آ کر ان ہی چار چیزوں کی مشقت میں گرفتار ہوئے' کھانا' پینا' پہننا' رہنا' یہی انسان کی چار مختصر ضروریات ہیں' ان ہی کو اس نے اپنی ہوا و ہوس سے پھیلا کر ضروریات کا ایک عالم پیدا کر لیا جس کے مہیا کرنے' ضرورت سے زیادہ حاصل کرنے اور عمدہ بنانے میں اپنی موجودہ زندگی کی تمام تر توجہ کو مصروف کر کے اصل جنت کی طلب سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ یہیں سے شریعت کی تکلیف عائد ہوئی' اور جائز اکل' جائز شرب' جائز لباس اور جائز مسکن کے حصول کے طریقوں کی تعلیم اور ناجائز طریقوں سے احتراز کا حکم ہوا' اسی سے شریعت کے اصولِ معاملات اور اخلاقِ انسانی کی ذمہ داریاں پیدا ہوئیں اور پھر اس لیے تا کہ اس حیات فانی میں پھنس کر حیات غیر فانی کی طلب کو وہ بھول نہ جائے' عرفانِ الٰہی (عقائدِ صحیحہ) اور عبادتِ الٰہی اور اطاعتِ الٰہی کی تلقین ہوئی' جو جنت کی اصلی غذا اور روزی ہے۔

﴿اُولٰٓئِکَ هُمُ الْوَارِثُوْنَ ○ الَّذِیْنَ یَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ○﴾ (مؤمنون: ۱۰'۱۱)

''یہی وہ میراث لینے والے ہیں' جو سایہ دار باغ کے وارث ہوں گے' وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔''

لیکن یہ وراثت انسان کو اپنے اعمالِ خیر ہی کے ذریعہ ملے گی' چنانچہ اہلِ جنت کو جنت کے داخلہ کے وقت یہ بشارت ملے گی۔

﴿وَ فِیْهَا مَا تَشْتَهِیْهِ الْاَنْفُسُ وَ تَلَذُّ الْاَعْیُنُ وَ اَنْتُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ○ وَ تِلْکَ الْجَنَّةُ الَّتِیْٓ

اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ﴾ (زخرف:۷۱،۷۲)

''اوراس جنت میں وہ کچھ ہے، جس کو دل چاہے اور آنکھوں کو لطف ملے اور تم کو اس میں ہمیشہ رہنا ہے، اور یہی وہ جنت ہے جس کے وارث اپنے کاموں کے بدلہ تم بنائے گئے۔''

اوران ہی کو منادیِ غیب یہ ندا دے گا:

﴿وَ نُوْدُوْٓا اَنْ تِلْكُمُ الْجَنَّةُ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ﴾ (اعراف:۴۳)

''اوران کو پکار کر کہا گیا کہ یہی وہ جنت ہے جس کے تم وارث اپنے ان کاموں کے بدلہ بنائے گئے۔''

ملتِ توحید کے مبلغِ اعظم ابراہیم علیہ السلام کی دعاؤں کا ایک فقرہ یہ بھی تھا:

﴿وَ اجْعَلْنِیْ مِنْ وَّرَثَةِ جَنَّةِ النَّعِیْمِ﴾ (شعراء:۸۵)

''اور مجھ کو باغِ نعمت کے وارثوں سے بنا۔''

ان آیتوں سے ظاہر ہے کہ اسلام نے انسان کا اصلی مقام وہی قرار دیا ہے، جہاں نہ بھوک ہے، نہ پیاس، نہ برہنگی ہے نہ دھوپ کی تکلیف جہاں کی بادشاہی لازوال اور جہاں کی زندگی غیر فانی ہے لیکن اس کے حصول کا ذریعہ صرف انسان کا نیک عمل اور صحیح عرفان ہے، جن کے مجموعہ کا نام ''تقویٰ'' ہے۔

﴿تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِیْ نُوْرِثُ مِنْ عِبَادِنَا مَنْ كَانَ تَقِیًّا﴾ (مریم:۶۳)

''یہ وہ بہشت ہے جس کا وارث اپنے بندوں میں سے ہم اس کو بنائیں گے جو تقویٰ والا ہوگا۔''

انسانی جزا وسزا کے تین گھر

انسان کے تین گھر ہیں، ایک موجودہ فانی عالم، جس کو دنیا کہتے ہیں اور دوسرا درمیانی عالمِ موت یا عالمِ برزخ ہے، اور تیسرا اس غیر فانی زندگی کا گھر جس کو دارِ آخرت کہتے ہیں، یہودیوں کے یہاں اصلی زور اسی دنیا کی جزاء و سزا پر ہے، ان کے ہاں تیسرے کا ذکر بہت کم، اور دوسرے کا مطلق نہیں، اور عیسائیوں میں پورا زور تیسری منزل کی سزاء و جزا پر ہے، اور پہلی اور دوسری منزلوں کے ذکر سے خاموشی ہے لیکن وحیِ محمدی کی تکمیل نے ان تینوں گھروں کو انسانی جزا وسزا کا مقام قرار دیا، انسان کو اپنے اعمال کی پہلی جزاء وسزا تو اسی دنیا میں کامیابی و ناکامی کی صورت میں ملتی ہے، گو اس کامیابی و ناکامی کے سمجھنے کا معیار مختلف ہو، اس کے بعد جب انسانی روح دوسری منزل میں قدم رکھتی ہے تو یہاں بھی وہ اپنے اعمال کی تھوڑی بہت جزا وسزا کا منظر دیکھ لیتی ہے اس کے بعد جب موجودہ دنیا کے پورے کاروبار کا خاتمہ ہو کر اس فانی کائنات کا ہر نقش و نگار مٹ جائے گا اور پھر نئی زمین اور نیا آسمان بنے گا، تو فانی انسانوں کو دائمی زندگی کے لیے بیدار کیا جائے گا اور اس وقت اعمال کی پوری جزاء وسزا پائیں گے۔

انسان کا پہلا دارالجزا

غرض انسان کا پہلا دارالجزا یہی دنیا ہے، گو اس کے ہر نیک و بد فعل کی پوری جزا تو دوسری دنیا کی زندگی

میں ملتی ہے' لیکن اس کے نیک و بد فعل کے مماثل اس موجودہ دنیا کی زندگی میں بھی اس کو کچھ نہ کچھ جزا ملا کرتی ہے' انسان کی عزت' شہرت' ناموری' ہر دل عزیزی' محبوبیت' تسکین' اطمینان' سرور' فارغ البالی' حکومت یہ سب اس زندگی کے اعمالِ خیر کے نتائج ہیں' ان کے برخلاف' ذلت' رسوائی' بے عزتی' کسمپرسی' پریشان حالی' غم' خوف' محکومیت اس کے اعمالِ بد کے اثرات ہیں۔

یہودیوں کی توراۃ میں اعمال کے نتائج میں زیادہ اہمیت اسی دنیاوی دارالجزا کو دی گئی ہے' بلکہ توراۃ میں یہی خیال سب سے زیادہ نمایاں ہے کہ خدا کی فرمان برداری اور نافرمانی کی جزا اسی دنیا کے رنج و راحت کی صورت میں اسی زندگی میں سے ہے مثلاً خدا کے حکموں پر عمل کرو گے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمہاری کھیتیاں سرسبز ہوں گی' اولادیں برومند ہوں گی' جانور جنیں گے' درخت پھل دیں گے اور دشمن مغلوب ہوں گے' اور اگر خدا کی نافرمانی کرو گے تو تم پر وبائیں آئیں گی' قحط پڑیں گے' اولادیں جیتی نہ رہیں گی' جانور مر جائیں گے' شہر تباہ ہو جائیں گے' باغ پھل نہ دیں گے' اور دشمن تم پر چھا جائیں گے' عیسائیت نے اس کے بالمقابل سارا زور زمین کی مملکت پر نہیں بلکہ آسمان کی بادشاہت پر دیا ہے' اور اس ظاہری زندگی کے فوز و فلاح کو اپنے مقصد سے خارج قرار دیا ہے' آنحضرت ﷺ جس دعوت کو لے کر آئے وہ یہودیت اور عیسائیت کے اس افراط و تفریط دونوں سے پاک ہے' اس نے ایمان اور عمل صالح کا نتیجہ اس دنیا کی بادشاہی بھی قرار دی اور اس دنیا کی بھی زمین کی حکومت بھی اور آسمان کی جنت بھی' یہاں کی سرسبزی و شادابی بھی اور وہاں کا باغ و بہار بھی' چنانچہ اللہ تعالیٰ نے نکوکار مسلمانوں کے ذکر میں فرمایا:

﴿فَاٰتٰىهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَ حُسْنَ ثَوَابُ الْاٰخِرَةِ وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ (آل عمران:۱۴۸)

''تو خدا نے ان کو دنیا کا بدلہ بھی دیا اور آخرت کے ثواب کی خوبی بھی اور اللہ نیکی کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔''

ایمان اور عمل صالح والوں سے یہ وعدہ تھا کہ

﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّ اَجْرًا عَظِيْمًا﴾ (فتح:۲۹)

''خدا نے ان سے جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے' گناہوں کی بخشش اور بڑی مزدوری کا وعدہ کیا۔''

اور یہ بھی ان ہی سے وعدہ ہے:

﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ﴾ (النور:۵۵)

''خدا نے ان سے جو تم میں سے ایمان لائے اور اچھے کام کیے وعدہ کیا ہے کہ وہ ان کو ملک میں حاکم بنائے گا جس طرح ان سے اگلوں کو حاکم بنایا تھا۔''

لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ جس طرح اس دنیا کی فانی زندگی سے اس دنیا کی باقی زندگی زیادہ پائیدار ہے اسی طرح اس دنیا کے ثواب سے اس دنیا کے ثواب کی قدر و قیمت بھی زیادہ ہے' اور اسی دنیا کے حسنِ عمل کی کوشش سے اس دنیا کی بہتری بھی ملتی ہے' فرمایا:

﴿لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ وَّ لَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ وَ لَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِيْنَ﴾ (نحل :۳۰)

''جنہوں نے نیک کام کیے' اس دنیا میں ان کے لئے بھلائی ہے اور بے شبہ آخرت کا گھر بہتر ہے اور پرہیزگاروں کا گھر کیا اچھا ہے۔''

اسی طرح بدکاروں کی جزا جہاں اس دنیا کی دوزخ اور آگ کے عذاب کو فرمایا اسی طرح اس دنیا کی ذلت و خواری اور رسوائی کو بھی فرمایا:

﴿خَسِرَ الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةَ﴾ (حج:۱۱)

''اس نے دنیا اور آخرت کا نقصان اٹھایا۔''

﴿لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ﴾ (بقرہ:۱۱۴)

''ان کے لیے دنیا میں رسوائی ہے اور آخرت میں بڑی مار ہے۔''

﴿حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ﴾ (بقرہ:۲۱۷)

''ان کے اعمال دنیا اور آخرت میں برباد ہو گئے۔''

یہ بھی فرمایا:

﴿فَاُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ﴾ (آل عمران:۵۶)

''تو میں ان کو دنیا اور آخرت میں سخت سزا دوں گا۔''

تنگی اور بدحالی کی سزا بھی یہیں ملتی ہے۔

﴿وَ مَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّ نَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى ۝﴾ (طٰہٰ :۱۲۴)

''اور جس نے میری نصیحت سے منہ پھیرا تو اس کے لیے تنگ گذران ہے' اور قیامت میں میں اس کو اندھا اٹھاؤں گا کہ وہ دنیا میں دل کا اندھا بنا تھا۔''

انتہا یہ ہے کہ خود صحابہؓ کو جنگِ احد میں فتح نہیں ملی' اللہ تعالیٰ نے اس کو بھی ان کی بعض فروگذاشتوں کا ثمرہ بتایا:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطٰنُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا﴾ (آل عمران:۱۵۵)

''تم میں سے جو لوگ اس دن جب دونوں فوجیں بھڑیں' پیچھے ہٹے' ان کے بعض کاموں کی وجہ سے شیطان نے ان کو پھسلا دیا۔''

ایک اور مقام پر عام طور سے فرمایا گیا:

﴿وَ مَآ اَصَابَكُمْ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَ يَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ﴾ (شوریٰ:۳۰)

''جو مصیبت تم کو پہنچی' وہ تمہارے ہاتھوں کے کرتوتوں کے باعث اور وہ بہت سی باتوں سے درگزر کرتا ہے۔''

یہود کے ذکر میں قرآن نے اس مسئلہ کو بالکل واضح کر دیا ہے' عذاب کے موقع پر فرمایا۔

﴿ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَ مَا ثُقِفُوْٓا اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ حَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ وَ بَآءُوْا بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ يَقْتُلُوْنَ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّ كَانُوْا يَعْتَدُوْنَ﴾ (آل عمران:۱۱۲)

''ان پر ذلت ماری گئی جہاں پائے گئے' لیکن (جہاں عزت حاصل ہے) وہ خدا کے ذریعہ' لوگوں کے سہارے اور اللہ کا غصہ کما لائے اور ان پر (قومی) محتاجی ماری گئی یہ اس لیے کہ وہ خدا کے حکموں کا انکار کرتے تھے اور پیغمبروں کو مار ڈالتے تھے یہ اس لیے کہ وہ نافرمان ہیں اور حدودِ الٰہی سے آگے بڑھتے ہیں۔''

اس کے بالمقابل عام اہل کتاب سے کہا گیا:

﴿وَ لَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَ الْاِنْجِيْلَ وَ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ﴾ (مائدہ:۶۶)

''اور اگر یہ تورات اور انجیل کو اور جو ان کی طرف ان کے پروردگار کی طرف سے (اب) اتارا گیا' اس کو قائم رکھتے تو وہ اپنے اوپر (برکاتِ آسمانی) سے کھاتے اور اپنے پاؤں تلے کے نیچے (راضی خیر و برکت) سے کھاتے۔''

ایک اور موقع پر اشارہ ہے۔

﴿وَ لَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَ اتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ وَ لٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ﴾ (اعراف:۹۶)

''اور ان آبادیوں کے رہنے والے ایمان لاتے اور پرہیزگاری کے کام کرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین سے برکتوں کو کھولتے' لیکن انہوں نے خدا کے احکام کو جھٹلایا' تو ہم نے ان کے اعمال کی پاداش میں ان کو پکڑ لیا۔''

مگر یہ دار الجزا فانی ہے

لیکن یہاں ایک لغزش گاہ بھی ہے جس سے اہلِ ہوش کو باخبر رہنا چاہیے' اس دنیا میں گو انسان کو اعمال کی جزا و سزا کسی نہ کسی رنگ میں ضرور ملتی ہے' مگر کیا شخصی زندگی اور کیا جماعتی حیات کے لحاظ سے یہ دار الجزا جس کا نام دنیا ہے' عارضی اور فانی ہے' یہاں کا غم بھی فانی اور یہاں کی خوشی بھی عارضی ہے۔ اس لیے صرف اسی دنیا کی کامیابی کو اپنی زندگی کا اصلی مطلوب و مقصود اور غایت و منتہا نہیں بنانا چاہیے' بلکہ یہ سمجھنا چاہیے کہ اس سے بھی زیادہ ایک اور وسیع آسمانی مملکت اور لازوال ربانی سلطنت ہے' جو فنا و زوال کے ہر عیب اور ہر نقص سے پاک ہے اور جہاں کی نعمتیں اس دنیا کی نعمتوں سے کہیں زیادہ بہتر اور غیر فانی ہیں' اس لیے اس فانی دنیا کی لذتوں میں پڑ کر اس کو بھول نہیں جانا چاہیے۔ اس مسافر کی عقلِ سلیم کی داد کون دے گا' جو راستہ کی عارضی خوش منظریوں اور سفر کی فانی دلچسپیوں میں پڑ کر اپنے خوش سواد اور سدا بہار وطن کو فراموش کر بیٹھے۔

﴿بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۝ وَ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّ اَبْقٰى﴾ (اعلیٰ:۱۶:۱۷)

''بلکہ تم دنیاوی زندگی کو بڑھ کر چاہتے ہو' حالانکہ آخرت کی زندگی اس سے بہتر اور اس سے زیادہ پائیدار ہے۔''

﴿وَ لَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ﴾ (یوسف:۵۷)

''اور بے شک آخرت کی مزدوری (یہاں کی مزدوری سے) بہتر ہے۔''

اسی طرح گنہگاروں کے لیے یہاں کی ذلت اور رسوائی سے بڑھ کر ایک اور ذلت و رسوائی کا مقام ہے۔

﴿فَاَذَاقَهُمُ اللّٰهُ الْخِزْيَ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ لَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ﴾ (زمر:۲۶)

''تو خدا نے ان کو اس دنیاوی زندگی میں رسوائی کا مزہ چکھایا' اور شبہ نہیں کہ آخرت کا عذاب اس سے بھی بڑا ہے' اگر وہ جانتے۔''

اس دنیا کی ذلت و رسوائی تو شاید سہ بھی لی جائے مگر وہاں کے عذاب کی سختی کون سہ سکتا ہے کہ

﴿وَ لَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَدُّ وَ اَبْقٰى﴾ (طٰہٰ: ۱۲۷)

''اور آخرت کا عذاب البتہ زیادہ سخت اور زیادہ دیرپا ہے۔''

اس لیے اس فانی دنیا میں انسان کو اپنے حسن عمل کے بدولت جو زور و قوت جاہ و جلال' نعمت و مال' اور حکومت و سروری ملے' ان کو بھی آخرت کی لازوال نعمتوں اور وہاں کی غیر فانی بادشاہی کے حصول میں صرف کرنا چاہیے کہ اس سے خود ان دنیاوی نعمتوں کو بھی بقا اور پائداری حاصل ہوگی' اسی فلسفہ کو محمد رسول اللہ ﷺ کی وحیِ حقیقت طراز نے قارون کی نصیحت کے ضمن میں ان لفظوں میں ادا کیا ہے۔

﴿وَابْتَغِ فِيمَآ اٰتٰىكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ وَ لَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَ اَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ وَ لَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْاَرْضِ﴾ (قصص:۷۷)

''اور خدا نے جو تجھ کو دیا ہے اس سے آخرت کا گھر تلاش کر اور دنیا سے اپنا حصہ نہ بھول' اور جس طرح خدا نے تجھ پر احسان کیا ہے تو بھی خدا کے بندوں پر احسان کر اور (اس دولت سے) زمین میں خرابی نہ چاہ۔''

چنانچہ ناخلف یہود پر تباہی اسی لیے آئی کہ وہ دنیاوی زندگی کی دولت و جائداد کی محبت میں ایسے پھنسے کہ ان کو اپنے کاروبار میں آخرت کے سودا کا خیال بھول کر بھی نہ آیا:

﴿فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ وَّرِثُوا الْكِتٰبَ يَاْخُذُوْنَ عَرَضَ هٰذَا الْاَدْنٰى وَ يَقُوْلُوْنَ سَيُغْفَرُ لَنَا وَ اِنْ يَّاْتِهِمْ عَرَضٌ مِّثْلُهٗ يَاْخُذُوْهُ اَلَمْ يُؤْخَذْ عَلَيْهِمْ مِّيْثَاقُ الْكِتٰبِ اَنْ لَّا يَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ وَ دَرَسُوْا مَا فِيْهِ وَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ﴾ (اعراف:۱۶۹)

''تو ان کے بعد کچھ ناخلف کتاب کے وارث ہوئے جو اس دنیا کے سامان و اسباب کو لیتے ہیں' اور کہتے ہیں کہ ہم کو معاف ہوگا اور اگر ویسا ہی سامان و اسباب پھر آئے تو پھر لیں کیا ان سے کتاب کے حق میں یہ عہد نہیں لیا گیا کہ وہ خدا پر حق کے سوا کچھ اور نہ بولیں' حالانکہ جو اس میں ہے وہ اس کو پڑھ چکے ہیں' اور آخرت کا گھر پرہیزگاروں کے لیے بہتر ہے کیا تم سمجھتے نہیں۔''

یہ دار الجزا دار لاصلاح بھی ہے

اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت و شفقت سے انسان کو پیدا کیا' اور اس ہمیشہ کی زندگی کا مقام بھی دکھایا اور بتا دیا کہ اس مقام کا دائمی و ابدی استحقاق خود تمہارے عمل سے تم کو حاصل ہو سکتا ہے' اور یہ دنیاوی زندگی اسی لیے اس کو دی گئی کہ وہ اس زمانہ میں اس سدا بہار سرزمین کی ملکیت کو اپنے عمل کی قیمت سے خرید سکے' پھر چونکہ انسان دوسری مصلحتوں کے لحاظ سے طبعاً کمزور' زود فراموش اور بھولنے والا بھی پیدا ہوا' اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنی اسی مستعار زندگی میں بار بار اپنے سنبھلنے' سدھرنے اور کامیاب بننے کے مواقع عنایت کیے۔ رسولوں کی بعثت' معلموں کی آمد' شریعت کی تعلیم پھر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا سلسلہ' گناہوں پر جسمانی سزا و تعزیر' عملِ خیر پر روحانی لذت اور عملِ شریر پر روحانی غبار و کدورت کے لوازم اسی لیے مقرر ہوئے کہ اس کو ہر قدم پر اپنے اعمال پر متنبہ اور اپنی غلط روی کا احساس ہو' اور ان سب کے علاوہ اس نے اپنی غایت رحمت سے انسانوں کی تنبیہ اور اصلاح کے لیے حسب ذیل مراتب مقرر کیے:

(۱) نیکی سے برائی کا کفارہ' چونکہ انسان کتنی ہی کوشش کرے اپنی فطری کمزوریوں کی حد سے باہر نہیں نکل

سکتا' اس لیے جس طرح اس دنیا میں اس نے انسانوں کے دلوں میں یہ فطری اصول ودیعت کر دیا ہے کہ جس کی نیکیوں کا پلہ بھاری ہو اس کی معمولی برائیوں سے چشم پوشی کی جاتی ہے' یا یہ کہ آخر میں اس کا کوئی ایک نیک کام اتنا زبردست ہو جاتا ہے کہ اس سے اس کی تمام اگلی برائیوں کی فرد دھل جاتی ہے' اسی کا نام کفارۂ عمل ہے۔'' چنانچہ وحی محمدی نے اصولی طور پر یہ حقیقت ان الفاظ میں تلقین کی:

﴿اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّئَاتِ﴾ (ہود:۱۱۴)

''بے شبہ نیکیاں' برائیوں کو دور کر دیتی ہیں۔''

اس آیت کا یہ بھی منشا ہے کہ نیکیوں کی تدریجی ترقی بالآخر برائیوں کو کم کرتی جاتی ہے' یہاں تک کہ وہ پورا نیکو کار انسان بن جاتا ہے اور یہ بھی خوش خبری اس میں پوشیدہ ہے کہ یہی نیکیاں اس کی پہلی برائیوں کے نتیجہ کو بھی انشاء اللہ مٹا دیں گی' اس معنی کی اور آیتیں بھی قرآن پاک میں ہیں:

﴿اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَیِّاٰتِكُمْ وَ نُدْخِلْكُمْ مُّدْخَلًا كَرِیْمًا﴾ (نساء:۳۱)

''تم کو جن باتوں سے منع کیا گیا ہے' اگر ان میں کی بری باتوں سے تم بچتے رہو گے تو ہم تمہاری تقصیریں تم سے اتار دیں گے اور تم کو عزت کے مقام میں داخل کریں گے۔''

﴿لَئِنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَ اٰتَیْتُمُ الزَّكٰوةَ وَ اٰمَنْتُمْ بِرُسُلِیْ وَ عَزَّرْتُمُوْهُمْ وَ اَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا لَّاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَیِّاٰتِكُمْ وَ لَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ﴾ (مائدۃ:۱۲)

''البتہ اگر تم نماز کھڑی کرو' اور زکوٰۃ دو اور میرے پیغمبروں پر ایمان لاؤ اور ان کی مدد کرو گے اور اللہ کو اچھی طرح کا قرض دو گے تو میں تمہارے گناہوں کو اتار دوں گا اور تم کو ان جنتوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔''

﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ نَتَقَبَّلَ عَنْهُمْ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَ نَتَجَاوَزُ عَنْ سَیِّاٰتِهِمْ فِیْٓ اَصْحٰبِ الْجَنَّةِ﴾ (احقاف:۱۶)

''یہ وہ ہیں جن کے اچھے عمل کو ہم قبول اور ان کی برائیوں سے درگزر کریں گے۔''

(۲) توبہ کفارہ ہے' انسان کے تمام کاروبار میں اصل شے اس کا دل ہے' اسی سے وہ پاک ہوتا ہے اور اسی سے ناپاک بنتا ہے' انسان کا دل اگر خلوص کے ساتھ کسی وقت خدا کی طرف رجوع کرے اور اپنی تقصیروں اور فرو گذاشتوں پر اس کی بارگاہ میں نادم و شرم سار ہو کر اپنی پچھلی زندگی سے بیزار ہو کر آئندہ کے لیے نیکوکاری کا خدا سے مستحکم وعدہ کرے تو اس کا نام توبہ ہے۔ یہ توبہ گنہگار سے گنہگار انسان کو بھی خدا کی آغوشِ محبت میں لا کر ڈال دیتی ہے۔ آدم علیہ السلام کا قصور اور پھر ان کی توبہ' اور رحمتِ الٰہی کا رجوع' واقعہ کے علاوہ اس بات کی ایک مثالی

صورت بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی آغوشِ رحمت' کس طرح گنہگار انسان کو واپس لینے کے لیے ہمیشہ وا رہتی ہے۔ رحمت الٰہی کے اس پر جوش نظارہ کی جو کیفیت محمد رسول اللہ ﷺ کے صحیفۂ وحی اور پیامِ نبوت میں نظر آتی ہے. اس سے ہندوستان کا ہرمت اور دھرم قطعاً محروم' تورات خاموش' زبور کی سریلی آواز مدھم' اور انجیل کی خوش خبری مبہم ہے۔ محمد رسول اللہ ﷺ نے اپنے پیام ربانی میں اس کی کیفیات اور اصول وشرائط کو جس شرح وبسط کے ساتھ بیان فرمایا ہے' وہ گویا رب العالمین کی طرف سے رحمۃ للعالمین کا خاص حصہ تھا' فرمایا:

﴿اِلَّا مَنْ تَابَ وَ اٰمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا فَاُولٰٓئِکَ یَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَ لَا یُظْلَمُوْنَ شَیْئًا﴾ (مریم:۶۰)

''مگر جس نے توبہ کی اور ایمان لایا اور نیک کام کیے تو وہ جنت میں داخل ہوں گے' اور ان پر کچھ ظلم نہ کیا جائے گا۔''

اس سے آگے بڑھ کر یہ کہ ایک توبہ کی بھلائی اس کے گناہوں کے سارے دفتر دھو کر ان کی جگہ آپ لے لے گی۔

﴿اِلَّا مَنْ تَابَ وَ اٰمَنَ وَ عَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِکَ یُبَدِّلُ اللّٰهُ سَیِّاٰتِهِمْ حَسَنَاتٍ وَّ کَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا﴾ (فرقان:۷۰)

''مگر جس نے توبہ کی اور ایمان لایا' اور اچھے کام کیے تو یہ وہ ہیں جن کی برائیوں کو اللہ بھلائیوں میں بدل دے گا اور اللہ بخشنے والا' رحم والا ہے۔''

اور یہی اس کی شان رحمت کا اقتضا ہے' یہاں تک کہ چور اور ڈاکو بھی اپنے گناہوں سے توبہ کریں تو ان کو بھی بشارت ہے۔

﴿فَمَنْ تَابَ مِنْۢ بَعْدِ ظُلْمِهٖ وَ اَصْلَحَ فَاِنَّ اللّٰهَ یَتُوْبُ عَلَیْهِ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ○ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ یُعَذِّبُ مَنْ یَّشَآءُ وَ یَغْفِرُ لِمَنْ یَّشَآءُ وَ اللّٰهُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ﴾ (مائدہ:۳۹'۴۰)

''تو جس نے اپنے پر ظلم کرنے کے بعد توبہ کی اور اپنے کو سدھارا تو بے شک اللہ اس پر رجوع ہوگا اور اللہ بخشنے والا' مہربان ہے کیا تجھے نہیں معلوم کہ آسمانوں کی اور زمین کی بادشاہی اس کی ہے جس کو چاہے سزا دے اور جس کو چاہے معاف کرے اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے اپنا یہ قطعی اصول ظاہر فرما دیا کہ

﴿وَ اِنِّیْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَ اٰمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدٰی﴾ (طٰہٰ: ۸۲)

''اور بے شک میں اس کو بخشنے والا ہوں جس نے توبہ کی اور ایمان لایا اور نیک کام کیے اور پھر راہ پر چلا۔''

لیکن توبہ کس کے لیے ہے اور کس شرط کے ساتھ ہے۔

﴿اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ فَاُولٰٓئِكَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ○ وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ حَتّٰٓى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّى تُبْتُ الْئٰنَ وَ لَا الَّذِيْنَ يَمُوْتُوْنَ وَ هُمْ كُفَّارٌ﴾ (نساء:۱۷،۱۸)

''اللہ کو ان کی توبہ قبول کرنی ضرور ہے جو نادانی سے برا کام کرتے ہیں، پھر جلد توبہ کرتے ہیں تو یہی وہ ہیں جن کو اللہ معاف کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ سب جانتا ہے اور حکمت والا ہے اور ان کی توبہ نہیں ہے، جو برے کام کرتے جاتے ہیں یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کو موت آئی تو اس نے کہا اب میں نے توبہ کی، اور نہ ان کی توبہ ہے جو کافر ہو کر مریں۔''

مقصود یہ ہے کہ توبہ کے بعد اس بندہ کے دل میں آئندہ تلافی اور تدارک کا احساس بھی موجود ہو، اور ظاہر ہے کہ موت کے وقت یہ احساس ممکن ہی نہیں، ہاں اگر وہ توبہ اپنے احساس کے اثر سے کر لے، اور اس کے بعد اتفاقاً موت آ جائے تو یقیناً رحمتِ الٰہی اس کے قبول کرنے میں تامل نہ کرے گی۔

﴿وَ الَّذِيْنَ عَمِلُوا السَّيِّاٰتِ ثُمَّ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِهَا وَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ (اعراف:۱۵۳)

''اور جنہوں نے برے کام کیے پھر اس کے بعد باز آئے (توبہ کی) اور یقین کیا تو بے شک تیرا پروردگار اس کے بعد بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔''

﴿وَ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا﴾ (نساء:۱۱۰)

''اور جو کوئی برا کام کرے یا اپنے آپ پر ظلم کرے، پھر اللہ سے اپنے گناہ کی معافی چاہے تو وہ اللہ کو بخشش والا، رحم کرنے والا پائے گا۔''

(۳) مصائب کی تنبیہ اور کفارہ: دنیا میں انسان کو مصائب سے زیادہ بری اور تکلیف دہ چیز کوئی دوسری نہیں معلوم ہوتی لیکن یہ حقیقت بھلانے کے لائق نہیں کہ افراد بلکہ جماعتیں اور قومیں بھی مصائب ہی کی تنبیہ اور سرزنش سے متنبہ اور ہوشیار ہو کر آمادۂ اصلاح ہوتی ہیں۔ چنانچہ اکثر اخلاقی محاسن کے جوہر کو مصیبتوں کی آگ نکھار کر کندن بناتی ہے۔ صبر، استقلال، تواضع، شکر، محبت اور رحم ان تمام اخلاقی فضائل کی تربیت ان ہی مصائب کے زیرِ سایہ ہوتی ہے، مغرور انسان بھی جب کسی اتفاقی مصیبت کی ٹھوکر کھاتا ہے، تو سنبھل جاتا ہے اس لیے غافل انسانوں اور خود فراموش سرمستوں کو ہوش میں لانے کے لیے کبھی کبھی مصیبتوں سے بڑھ کر کوئی دوسری چیز نہیں کہ ان کی بدولت ملحد سے ملحد انسان بھی ایک دفعہ بے قرار ہو کر خدا کا نام لے ہی لیتا ہے۔

دولت و نعمت اور کامیابی و مسرت وہ شراب ہے جس کے نشہ کا اتار اتفاقی مصائب ہی کی ترشی سے ہو سکتا

ہے۔ انسان خدا کو کتنا ہی بھولا ہو اور اپنی دولت و ثروت پر کتنا ہی نازاں ہو لیکن جب وہ کسی افتاد سے دوچار ہوتا ہے تو دفعتاً اس کی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔ تنگ دستی، عزیزوں کی موت، آرزوؤں کی ناکامی ان میں ہر چیز وہ ٹھوکر ہے، جس کو کھا کر سرمست سے سرمست راہگیر بھی ایک دفعہ چونک کر ہشیار ہو جاتا ہے اور اس کو اپنے راستہ کی غلطی معلوم ہو جاتی ہے اس لیے ان مصائب میں انسانوں کے اعمالِ بد اور گناہوں کا کفارہ بننے کی صلاحیت پوری طرح موجود ہے کہ اس تھوڑی تکلیف سے بندہ میں جو احساس پیدا ہوتا ہے وہ بڑی بیش قیمت چیز ہے۔

قرآن پاک نے اس نکتہ کو جا بجا بیان کیا ہے، اور بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ گنہگاروں کو اس سے پہلے کہ ان کو ہلاک کرے، مصائب کی آزمائشوں میں ڈالتا ہے، تاکہ شاید وہ اپنے بھولے ہوئے مالک کو یاد کریں، اور اپنی غلط روی پر متنبہ ہو کر اپنی ہدایت و اصلاح کی فکر کریں، فرمایا:

﴿وَ لَقَدْ اَخَذْنَا اٰلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِیْنَ وَ نَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرَاتِ لَعَلَّهُمْ یَذَّكَّرُوْنَ﴾ (اعراف: ۱۳۰)

''اور بے شک ہم نے فرعون والوں کو قحطوں اور پھلوں کی کمی کی مصیبت میں گرفتار کیا تاکہ وہ نصیحت پکڑیں۔''

بنی اسرائیل کے متعلق ہے۔

﴿وَ بَلَوْنٰهُمْ بِالْحَسَنَاتِ وَ السَّیِّاٰتِ لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ﴾ (اعراف:۱۶۸)

''اور ہم نے ان کو نعمتوں اور مصیبتوں کے ساتھ آزمایا تاکہ وہ شاید باز آئیں۔''

اسی سورہ میں ایک اور جگہ اس اصول کو ایک کلیہ کی حیثیت سے بیان کیا گیا ہے:

﴿وَ مَآ اَرْسَلْنَا فِیْ قَرْیَةٍ مِّنْ نَّبِیٍّ اِلَّاۤ اَخَذْنَاۤ اَهْلَهَا بِالْبَاْسَآءِ وَ الضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ یَضَّرَّعُوْنَ﴾ (اعراف:۹۴)

''اور ہم نے کسی آبادی میں کوئی نبی نہیں بھیجا لیکن وہاں کے رہنے والوں کو سختیوں اور مصیبتوں میں گرفتار کیا تاکہ وہ شاید گڑگڑائیں۔''

مسلمانوں سے فرمایا گیا:

﴿وَ لَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَ الْجُوْعِ وَ نَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَ الْاَنْفُسِ وَ الثَّمَرَاتِ وَ بَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ○ الَّذِیْنَ اِذَاۤ اَصَابَتْهُمْ مُّصِیْبَةٌ قَالُوْۤا اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ○ اُولٰٓئِكَ عَلَیْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ رَحْمَةٌ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ○﴾ (بقرہ: ۱۵۵، ۱۵۷)

''اور البتہ ہم تم کو تھوڑے خوف، بھوک اور دولت کی اور جانوں کی اور پھلوں کی کمی سے آزمائیں گے اور ان صابروں کو خوش خبری سنا کہ جن کو جب کوئی مصیبت ستاتی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم خدا کے ہیں اور اسی

کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں' یہ وہ ہیں جن پر اللہ کی برکتیں اور رحمتیں ہوں گی اور یہی سیدھی راہ پائے ہوئے ہیں۔"

اس اصول کے تحت میں آنحضرت ﷺ نے اس کے متعدد جزئیات بیان فرمائے ہیں' حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ جب یہ آیت اتری ﴿مَنْ يَّعْمَلْ سُوْءً يُّجْزَ بِهٖ﴾ (نساء : ۱۸) "جو کوئی برائی کرے گا' اس کا بدلہ اس کو دیا جائے گا" تو میں نے آنحضرت ﷺ سے اس کا مطلب پوچھا فرمایا کہ یہ اللہ تعالیٰ کا اپنے بندہ پر عتاب ہے اس کا بدلہ دنیا میں بندہ کی ہر تکلیف سے پورا ہو جاتا ہے' جیسے اس کو بخار آ جائے' یا وہ کسی اور مصیبت سے دوچار ہو جائے' یہاں تک کہ جیب میں کوئی چیز رکھ کر بھول جائے اور اس سے جو تکلیف اس کو پہنچے' وہ تکلیف بھی کفارہ بن جاتی ہے یہاں تک کہ بندہ گناہوں سے اس طرح صاف ستھرا ہو کر نکلتا ہے جیسے بھٹی سے سونا۔ (۱)

دوسری حدیثوں میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ مسلمان کو کوئی مصیبت پیش نہیں آتی ہے' لیکن یہ کہ اللہ تعالیٰ اس کو اس کے گناہوں کا کفارہ بنا دیتا ہے' یہاں تک کہ اگر اس کے کوئی کانٹا چبھ چلے تو بھی کفارہ بن جاتا ہے' تیسری روایت میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ "مسلمان کو کوئی تکلیف یا بیماری یا غم یا اذیت نہیں پہنچتی' لیکن یہ کہ وہ اس کے گناہوں کا کفارہ ہو جاتی ہے' یہاں تک کہ اگر اس کے کوئی کانٹا چبھ جائے تو وہ بھی۔" چوتھی روایت میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ "کسی مسلمان کو کوئی تکلیف کانٹا چبھنے سے لے کر اوپر تک جتنی بھی پہنچے' اللہ تعالیٰ اس سے اس کے گناہوں کو اس طرح جھاڑ دیتا ہے' جیسے درخت کے پتے جھڑ جاتے ہیں۔"(۲) پانچویں روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ دنیا میں جو مسلمان کسی جرم کا مرتکب ہوا' اور اس کی سزا اس کو یہیں مل گئی' تو وہ اس کے لیے کفارہ' اور اس کو اس گناہ سے پاک وصاف بنانے والی ہے۔"(۳)

سطورِ بالا سے ہویدا ہے کہ کوئی انسان جو اقرارِ توحید کے بعد گناہ سے ملوث ہو گیا ہو دنیا میں توبہ' اعمالِ نیک اور مصائب پر صبر وشکر کے ذریعہ سے نجات پا سکتا ہے اور اس دنیا سے اسی طرح پاک وصاف ہو کر نکل سکتا ہے کہ موت کے بعد اس کو کسی نئے کفارۂ گناہ کی ضرورت پیش نہ آئے۔

اسی لیے قرآن پاک میں ہے:

﴿وَ لَنُذِيْقَنَّهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْاَدْنٰى دُوْنَ الْعَذَابِ الْاَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ﴾ (سجدہ:۲۱)

"اور ہم البتہ ان کو بڑے عذاب کے پہلے ادنیٰ عذاب کا کچھ مزہ چکھائیں گے تاکہ وہ اب بھی باز آئیں۔"

اس آیت پاک سے معلوم ہوا کہ عذابِ الٰہی کا مقصد انتقام اور نفسِ سزا اور عقوبت نہیں بلکہ شریر نفس کو راہِ

---

(۱) یہ اور اس کی ہم معنی حدیث اکثر کتب میں مثلاً ترمذی تفسیر آخر النساء سنن ابی داؤد اوائل کتاب الجنائز۔

(۲) صحیح بخاری اوائل کتاب المرضیٰ میں یہ تینوں روایتیں ہیں۔

(۳) صحیح بخاری کتاب الرد علی الجہمیۃ۔

راست پر لانا ہے' اسی لیے ایک اور آیت میں فرمایا:

﴿مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَ اٰمَنْتُمْ وَ كَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا﴾ (نساء:۱۴۷)

''اللہ تعالیٰ تم کو عذاب دے کر کیا کرے گا اگر تم شکر کرو اور ایمان لاؤ کہ خدا (نیکیوں کا) قبول کرنے والا (تمہارے ہر عمل کو) جاننے والا ہے۔''

الغرض یہ عذاب اس دنیا میں آئندہ گناہوں سے بچانے اور گزشتہ گناہوں سے پاک کرنے کے لیے ہوتا ہے' اور عالمِ برزخ اور عالمِ بعث میں چونکہ نئے عمل کے محل نہیں' اس لیے ان دونوں مقاموں میں آئندہ کا کوئی سوال نہیں پیدا ہو سکتا صرف گزشتہ بداعمالیوں کی سزا بھگت کر ان کے نتائج سے نجات مل سکتی ہے اور یہی عالمِ برزخ اور عالمِ بعث کے عذابوں کا مقصد ہے' الا یہ کہ پروردگارِ عالم خود اپنی رحمت سے نوازے' اور معاف فرمائے۔

عذابِ برزخ بھی کفارہ ہے

لیکن اگر کسی انسان کے اندر گناہوں کی ناپاکیاں اتنی زیادہ ہیں کہ اس کی دنیاوی زندگی کے تمام کفارے بھی اس کو دھو کر پاک وصاف نہ بنا سکے تو اس کو اپنے مرنے کے بعد بھی برزخ کے عالم میں اپنے اعمالِ بد کی مناسب سزاؤں کی صورتوں میں تکلیفیں اٹھا کر پاک وصاف بننا پڑے گا۔ یہی عالم برزخ کا عذاب ہے اس سے ظاہر ہوگا کہ عالمِ برزخ کی یہ سزائیں اس لیے ہیں کہ ہم نے دنیا میں اپنی ناپاک خواہشوں اور ناپاک کاموں سے احتراز کرنے کی جو زحمت نہیں اٹھائی اور اچھے کاموں کے کرنے سے جو تھوڑی تکلیف پیش آتی ہے' اس کو برداشت کر کے اچھے کام جو نہیں کیے ان دونوں کے معاوضہ میں عالمِ برزخ میں آ کر عذاب کی تکلیفیں اٹھائیں' تاکہ حیاتِ ثانی کے دروازہ پر پہنچ کر بھی اگر ہم ان سزاؤں کے ذریعہ پاک وصاف ہو سکیں تو پاک وصاف ہو کر اپنی موروثی بہشت کے قابل بن سکیں جو صرف پاکوں اور بے گناہوں کی جگہ ہے' یعنی ان کی ہے جو یا سرے سے کسی گناہ کے مرتکب نہ ہوئے ہوں یا یہ کہ گناہ کے مرتکب ہوئے' مگر اعمالِ نیک' توبہ اور مصائب میں صبر وشکر کر کے یا برزخ میں سزا پا کر وہ گناہوں کے داغ سے نجات پا سکے۔

یہ بات کہ عذابِ برزخ بھی ہمارے گناہوں کا کفارہ ہے' اسلام کے اس اصول سے مترشح ہے کہ ایک مسلمان کی ہر تکلیف اس کے کسی نہ کسی گناہ کا کفارہ ہے' اس بنا پر عذابِ برزخ بھی اس کے گناہ کا کفارہ ہوگا' قرآن پاک کی بعض آیتوں سے یہ بات بھی کنایتہً نکلتی ہے:

گنہگار حشر کے دن کہیں گے۔

﴿وَ بَلَغْنَآ اَجَلَنَا الَّذِيْٓ اَجَّلْتَ لَنَا﴾ (انعام:۱۵)

''اور ہم مقررہ وقت جس کو تو نے ہمارے لیے مقرر کیا تھا' پہنچ چکے۔''

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ حشر سے پہلے عذاب کے ایک دورے کو ختم کر چکے۔

بعض حدیثوں میں بھی اس کنایہ کی تصریح ملتی ہے' کنز العمال میں ایک حدیث ہے:

عَنِ ابْنِ عِمْرَانَ طُوْلُ مُقَامُ اُمَّتِیْ فِیْ قُبُوْرِهِمْ تَمْحِیْضُ لِذُنُوْبِهِمْ. (کنز العمال' باب عذاب القبر جلد ۸ ص ۹۶)

''ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ میری امت کے لوگوں کا اپنی قبروں میں طول قیام ان کو گناہوں سے خالص کرتا ہے۔''

اسی لیے ایک اور حدیث میں آیا ہے:

اَکْثَرُ عَذَابُ اُمَّتِیْ فِیْ قُبُوْرِهِمْ. (۱)

''میری امت کے لوگوں کو زیادہ تر عذاب ان کی قبروں میں ہوگا۔''

اس حدیث کا (اگر وہ ثابت ہو تو) منشا یہ ہے کہ امتِ محمدیہ کے اکثر افراد اسی برزخ کے محدود زمانۂ عذاب میں نکھر کر اور پاک وصاف ہو کر جنت کے قابل ہو جائیں گے اور عذابِ دوزخ کی ضرورت ان کو پیش نہ آئے گی۔ حافظ ابن قیم ایک موقع پر لکھتے ہیں:

فَاِنْ وَفَتْ بِالْخَلَاصِ مِنْهَا فِیْ هٰذِهِ الدَّارِ وَ اِلَّا فَفِی الْبَرْزَخِ' فَاِنَّ وَ فِیْ بِالْخَلَاصِ وَ اِلَّافَفِیْ مُوَقَّفِ الْقِیَامَةِ وَ اَهْوَا لِهَا مَا یَخْلِصُهُمْ مِنْ تِلْکَ الْبَقِیَةِ. (۲)

''اگر ان بیماریوں کا یہ علاج اس دنیا میں نجات کے لیے پورا ہو گیا تو خیر' ورنہ برزخ کی سزا سے علاج کیا جائے گا' تو اگر یہ نجات کے لیے کافی ہو گیا تو خیر' ورنہ پھر قیامت کا مقام اور اس کی ہولناکیاں باقی بیماریوں سے نجات دلائیں گے۔''

رؤیائے برزخ کی حدیث میں جو پہلے مفصل گزر چکی ہے' وہ منظر دکھایا گیا ہے جس میں گنہگار عذاب کے دور سے نکل کر اور نہرِ حیات میں نئی زندگی پا کر بہشت کے مستحق قرار پائے ہیں' غالباً انہی نجات پانے والے مومنوں کو دیکھ کر مشرکین بھی قیامت میں یہ کہیں گے:

﴿وَ یَوْمَ یَحْشُرُهُمْ جَمِیْعًا یٰمَعْشَرَ الْجِنِّ قَدِاسْتَکْثَرْتُمْ مِّنَ الْاِنْسِ وَ قَالَ اَوْلِیٰٓؤُهُمْ مِّنَ الْاِنْسِ رَبَّنَا اسْتَمْتَعَ بَعْضُنَا بِبَعْضٍ وَّ بَلَغْنَآ اَجَلَنَا الَّذِیْٓ اَجَّلْتَ لَنَا﴾ (الانعام: ۱۲۸)

''اور جس دن وہ ان سب کو اکٹھا کرے گا اے گروہِ جن! تم نے بہت سے انسانوں کو اپنا بنا لیا اور ان کے دوست انسان کہیں گے کہ ہمارے پروردگار! ہم میں سے ایک نے دوسرے سے کام نکالا اور ہم مقررہ وقت کو جس کو تو نے ہمارے لیے ٹھہرایا تھا' پہنچ چکے۔''

---

(۱) اس حدیث کو شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی نے حجۃ اللہ البالغہ باب الوقائع الحشریہ میں نقل کیا ہے لیکن مجھے اس کا اصل ماخذ معلوم نہ ہو سکا۔

(۲) شفاء العلیل لابن القیم مطبعہ حسینیہ مصر ص ۲۲۴۔

یہ الفاظ کہ ہم اپنے مقررہ وقت کو جس کو تو نے ہمارے لیے مقرر کیا تھا' پہنچ چکے یہ معنی رکھتے ہیں کہ ''عالمِ برزخ'' کا مقررہ دورۂ عذاب ہم ختم کر چکے' اور اب حشر ونشر کے عذاب کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے' اس لیے بعض دوسرے نیک بختوں کی طرح ہم کو بھی اب چھٹکارا ملے' جواب ملے گا:

﴿قَالَ النَّارُ مَثْوٰكُمْ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ﴾ (انعام:۱۲۸)

''فرمائے گا' آتشِ دوزخ تمہارا ٹھکانا ہوا اس میں سدا رہو گے' لیکن یہ کہ جو اللہ چاہے۔ بے شک تیرا رب حکمت اور علم والا ہے۔''

اس جواب کا مطلب یہ ہے کہ ابھی تمہارا دورۂ عذاب ختم نہیں ہوا ہے اور تمہاری پاکیزگی ابھی کامل نہیں ہوئی' اس لیے ابھی اس دوسرے عالم کا عذاب بھی تم کو سہنا ہے' پھر جب خدا چاہے گا' تم کو اس سے نجات دے گا۔ اس کا ہر کام علم وحکمت پر مبنی ہے' اس کے علم وحکمت اور مصلحت کا جب تقاضا ہوگا تم کو نجات ملے گی۔ (۱)

عذابِ دوزخ کفارۂ گناہ ہے

ابھی یہ آیت اوپر گذر چکی ہے۔

﴿مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَ اٰمَنْتُمْ وَ كَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا﴾ (نساء:۱۴۷)

''خدا کو تمہارے عذاب سے کیا کام' اگر تم شکر کرو اور ایمان لاؤ کہ خدا تمہاری شکر گذاری کو قبول کرنے والا اور تمہارے دلوں کو جاننے والا ہے۔''

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کو گنہگاروں کے عذاب سے کوئی خوشی نہیں حاصل ہوتی' نہ وہ چاہتا ہے کہ اس کے گنہگار بندے اس عذاب میں مبتلا ہوں' لیکن ازل سے اس نے اپنے جو قانون مقرر کر دیے ہیں وہ ان کو توڑتا بھی نہیں' جس وقت آدمؑ کو جنت کی سرزمین سے نکال کر اس دنیا میں اس لیے بھیجا گیا کہ وہ اپنے عمل کے استحقاق سے اس جنت کو دوبارہ ہمیشہ کے لیے حاصل کریں' اسی وقت یہ قانون بھی ان کو سنا دیا گیا تھا:

﴿اِهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ○ وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ﴾ (بقرہ:۳۸،۳۹)

''یہاں سے تم سب اترو تو اگر تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت اترے تو جس نے میری ہدایت کی پیروی کی' تو ان پر نہ کوئی خوف ہے' اور نہ غمگین ہوں گے' اور جنہوں نے ناشکری کی اور ہماری نشانیوں کو جھٹلایا تو وہی دوزخ والے ہوں گے وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔''

اس آیت میں مستحقِ دوزخ ہونے کی دو وجہیں بیان کی گئی ہیں' ایک کفران اور دوسری تکذیب۔ دیکھو کہ

---

(۱) حسب تفسیر ابن عباسؓ' ابن جریر طبری ج۸ ص۲۴ مصر۔

اوپر کی نساء والی آیت میں عذابِ دوزخ سے نجات پانے کی دو شرطیں شکر اور ایمان ان کے بالمقابل ہیں' اس سے ظاہر ہوا کہ شکر اور ایمان استحقاقِ جنت کی شرطیں اور کفران اور تکذیب استحقاقِ دوزخ کے اسباب ہیں' بقیہ تمام نیکیاں شکر اور ایمان کے فروع اور تمام برائیاں کفران اور تکذیب کی شاخیں ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو اس لیے نہیں بنایا کہ وہ ان کو پیدا کر کے دوزخ کا ایندھن بنائے' بلکہ اس نے تو ان کو اپنی رحمت کے ظہور کے لیے پیدا کیا' غیظ و غضب کے اظہار کے لیے نہیں فرمایا۔

﴿اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ الْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَ اَشْفَقْنَ مِنْهَا وَ حَمَلَهَا الْاِنْسَانُ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا ○ لِّيُعَذِّبَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَ الْمُنٰفِقٰتِ وَ الْمُشْرِكِيْنَ وَ الْمُشْرِكٰتِ وَ يَتُوْبَ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا﴾ (احزاب:۷۲'۷۳)

''ہم نے یہ امانت آسمانوں پر' زمین پر اور پہاڑوں پر پیش کی تو ان سب نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا اور ڈرے اور انسان نے اس کو اٹھا لیا کہ وہ ظالم اور نادان تھا' تا کہ اللہ نفاق کرنے والوں اور نفاق کرنے والیوں اور شرک کرنے والوں اور شرک کرنے والیوں کو سزا دے' اور ایمان والوں اور ایمان والیوں پر وہ اپنی رحمت کے ساتھ رجوع ہو اور اللہ تو بخشنے والا اور رحمت والا ہے۔''

اس آیت پاک سے صاف ہویدا ہے' کہ اللہ تعالیٰ کی اصلی صفت یہی ہے کہ وہ غفور و رحیم ہے یعنی بخشش و رحمت اس کی صفتِ ذاتی ہے' اب اگر کوئی اپنے آپ پر ظلم کر کے گناہ کرتا ہے' اور اس لیے وہ اپنے کو رحمتِ الٰہی سے دور کر لیتا ہے تو یہ خود انسان کا فعل ہے۔

﴿فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَ لٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ﴾ (توبہ:۷۰)

''اللہ نہ تھا کہ ان پر ظلم کرتا' لیکن وہ اپنی جانوں پر آپ ظلم کرتے ہیں۔''

﴿وَ مَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعِبَادِ﴾ (مؤمن:۳۱)

''اور اللہ اپنے بندوں پر ظلم کرنا نہیں چاہتا۔''

غرض جو کچھ ہے وہ اپنے اعمال کا نتیجہ ہے۔

﴿لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا تَسْعٰى﴾ (طٰہٰ: ۱۵)

''کہ ہر جان کو اپنے ہی کیے کا بدلہ دیا جائے گا۔''

اس لیے بہشت یا دوزخ جو کچھ ہے انسان کے اپنے ہی عمل کا لازمی نتیجہ ہے' جس طرح دنیا کے ہر عمل کا کوئی نہ کوئی لازمی نتیجہ ہے' مثلاً کھانے کا نتیجہ شکم سیری' پینے کا سیرابی' بھوک کا تکلیف' بیماری کا بے آرامی' گرنے کا چوٹ' زہر کا موت' شہد کا مٹھاس' غرض ہر اچھے برے فعل کا ایک لازمی جسمانی نتیجہ ہے' جو دنیا میں ہمارے عمل کے بعد ہم کو ملتا رہتا ہے' اسی طرح ہم کو اپنے اعمال کا ایک روحانی نتیجہ بھی لازمی ملنے والا ہے' جو ہم کو اس دوسرے عالم میں

ملے گا۔تو جس طرح زہر کھا کر مرنے کی ذمہ داری خود ہم پر عائد ہوتی ہے' اور ہم یہ نہیں کہتے کہ ہم زہر کھا کر مر کیوں گئے یا گرنے سے ہم کو چوٹ کیوں آئی۔اسی طرح ہم یہ سوال بھی نہیں کر سکتے ہیں ہم کو ان اعمال کے بعد دوزخ کی سزا کیوں ملی کہ دونوں ہمارے اعمال کے یکساں لازمی نتیجے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی غایت رحمت سے ہم کو اعمال کے نتیجوں سے قبل از وقت مطلع فرما دیا ہے' ہم کو اس نے نیک و بد کی تمیز کا احساس بخشا' عقل عنایت کی' ضمیر عطا کیا' پھر نبی اور رسول بھیجے' شریعت دی' کتاب مرحمت فرمائی' اس پر بھی اگر ہم باز نہ آئے اور ان اعمال کا ارتکاب کیا تو اب ہم کو ان اعمال کے نتائج سے کون بچا سکتا ہے۔

﴿رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ﴾ (نساء: ۱۶۵)

''یہ رسول بھیجے' نیکوں کو خوش خبری سنانے والے اور بدکاروں کو ہشیار کرنے والے تا کہ خدا پر انسان کی حجت باقی نہ رہے۔''

پھر اپنی رحمت سے سب سے آخر میں اپنی رحمت کے کامل مظہر کو دنیا میں بھیجا:

﴿وَ مَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِيْنَ﴾ (انبیاء:۱۰۷)

''ہم نے تجھ کو (اے پیغمبر!) ساری دنیا کے لیے رحمت بنا کر بھیجا۔''

لیکن ظالم و نادان انسانوں نے اس رحمت کے قبول سے انکار کیا' اور طرح طرح کی بداعتقادیوں اور بد اعمالیوں سے اپنے کو برباد کیا اور جس غرض سے خدا نے ان کو پیدا کیا تھا' اس سے اعراض کیا اور اپنے کو خود اپنے ہاتھوں سے ہلاکت و بربادی میں مبتلا کیا۔

﴿وَ مَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّ اَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ ○ وَ لَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّ لَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ ○ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ وَ لِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ﴾ (ہود:۱۱۷'۱۱۹)

''اور نہ تھا تیرا رب جو آبادیوں کو ظلم سے ہلاک و برباد کرتا درانحالیکہ ان کے رہنے والے نکوکار ہوتے اور اگر تیرا رب چاہتا تو سب لوگوں کو (زبردستی) ایک راہ پر کر دیتا' لیکن وہ ایسی زبردستی نہیں کرتا اور وہ یونہی ہمیشہ اختلافات میں رہتے ہیں' مگر جن پر تیرے رب کا رحم ہوا' اور اسی واسطے ان کو پیدا کیا۔''

اس آیت سے واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو رحمت کے لیے بنایا ہے' عذاب کے لیے نہیں لیکن انسان خود اپنے عمل سے خدا کی رحمت کے بجائے اس کے عذاب کا سزاوار اپنے کو ٹھہرا لیتا ہے۔اس آیت کی تفسیر میں حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں:

﴿لِلرَّحْمَةِ خَلَقَهُمْ وَ لَمْ يَخْلُقْهُمْ لِلْعَذَابِ﴾ (طبری ج۱۱)

''خدا نے انسانوں کو رحمت کے لیے پیدا کیا عذاب کے لیے نہیں۔''

لیکن اگر ظالم و نادان انسان نے خدا کی ان پے در پے رحمتوں کے باوجود اپنے کو اس کی رحمت کا مستحق نہ بنایا تو کیا وہ خدائے رحمان و رحیم جس کا یہ اعلان ہے:

﴿کَتَبَ عَلٰی نَفْسِہِ الرَّحْمَۃَ﴾ (انعام:۱۲)

''اس خدا نے (مخلوقات پر) رحمت کو اپنے اوپر واجب کر لیا ہے۔''

﴿سَلَامٌ عَلَیْکُمْ کَتَبَ رَبُّکُمْ عَلٰی نَفْسِہِ الرَّحْمَۃَ﴾ (الانعام:۵۴)

''تم پر سلامتی ہو تمہارے رب نے رحمت کو اپنے اوپر فرض ٹھہرا لیا ہے۔''

﴿وَ رَحْمَتِیْ وَسِعَتْ کُلَّ شَیْءٍ﴾ (اعراف ۱۵۶)

''اور میری رحمت نے ہر چیز کو سما لیا ہے۔''

﴿وَ رَبُّکَ الْغَفُوْرُ ذُو الرَّحْمَۃَ﴾ (کہف:۵۸)

''تیرا پروردگار بخشنے والا رحمت والا ہے۔''

﴿وَ رَحْمَتِیْ سَبَقَتْ غَضَبِیْ﴾ (صحیح بخاری)

''اور میری رحمت میرے غضب پر سبقت لے گئی۔''

وہ اپنے گنہگار روسیہ کار بندوں سے ہمیشہ کے لیے اپنا منہ موڑ لے گا' حالانکہ اس کی رحمت کسی غرض سے نہیں بلکہ بے غرض ہے' فرمایا:

﴿وَ رَبُّکَ الْغَنِیُّ ذُو الرَّحْمَۃَ﴾ (انعام:۱۳۳)

''اور تیرا رب بے نیاز رحمت والا ہے۔''

اور تسلی دی ہے:

﴿یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِہِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَۃِ اللّٰہِ اِنَّ اللّٰہَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا اِنَّہٗ ھُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ﴾ (زمر:۵۳)

''اے میرے وہ بندو! جنہوں نے اپنے اوپر آپ ظلم کیا ہے خدا کی رحمت سے نا امید نہ ہو' خدا سب گناہوں کو معاف کرتا ہے بے شک وہی بخشنے والا' رحمت والا ہے۔''

اس کی رحمت کا ظہور جس طرح اس دنیا میں ہوا ہے' اس دنیا میں بھی ہو گا' اور وہاں اس کی رحمت کا سب سے بڑا مظہر اس کے مقامِ لعنت (دوزخ) سے دوری اور اس کے مقامِ رحمت (بہشت) سے قرب ہے۔

﴿مَنْ یُّصْرَفْ عَنْہُ یَوْمَئِذٍ فَقَدْ رَحِمَہٗ ذٰلِکَ الْفَوْزُ الْمُبِیْنُ﴾ (انعام:۱۶)

''جس سے خدا کا عذاب ہٹایا گیا وہی ہے جس پر اس نے اپنی رحمت کی اور اس کی رحمت کا یہ حصول ہی کھلی کامیابی ہے۔''

اللہ تعالیٰ کی ان پے در پے رحمتوں کا یہ تقاضا ہے کہ وہ گنہگاروں کو زیادہ سے زیادہ یہ کہ ان کے نتائجِ عمل کے

بھگت لینے کے بعد آخر کار اپنی رحمت کے سایہ میں لے لے اور وہ ان کو اپنی بخششوں سے سرفراز فرمائے۔

دوزخ قید خانہ نہیں شفا خانہ ہے

انسان جب عدمِ حفظِ صحت کی غلط کاریوں کے سبب سے بیمار ہو جاتا ہے تو اکثر یہی سمجھا جاتا ہے کہ فطرت نے اس کو ان کے معاوضہ میں بیماری کی تکالیف کی سزائیں دی ہیں' مگر واقعہ یہ نہیں ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ان غلط کاریوں کے جو برے نتائج انسان کے جسم کے اندر پیدا ہو گئے ہیں' ان کو دور کرنے کے لیے جسم جدوجہد کرتا ہے اس لڑائی کا نام بیماری اور اس لڑائی کی کشمکش کا نام بیماری کی تکالیف و آلام ہے جن کو ہم دردِ سر' دردِ شکم' اعضا شکنی اور بے خوابی وغیرہ الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں یہی روحانی بیماریوں کا حال ہے جن کو ہم اصطلاحِ شرعی میں گناہ اور جن کے نتائجِ بد کو ''عذاب'' کہتے ہیں یہ نتائج آتشِ دوزخ اور اس کے شدائد و آلام کی صورت میں ظاہر ہوں گے اور جن کا منشا یہ ہوگا کہ روحِ انسان اپنی غلط کاریوں کے نتائجِ بد کو دور کرنے کے لیے جدوجہد میں مصروف ہوگی' وہ ان سے عہدہ برآ ہوگی' خدا کی رحمت سے سرفرازی پا کر اس عذاب سے نکل کر اپنی موروثی بہشت میں داخل ہوگی۔

اس تمہید سے یہ ظاہر ہے کہ دوزخ کی مثال یہ نہیں ہے کہ وہ مجرموں کے لیے قید خانہ ہے بلکہ یہ ہے کہ وہ بیماریوں کے لیے شفا خانہ ہے' بیمار کو شفا خانہ کے اندر بھی ہر قسم کی تکلیفیں محسوس ہوتی ہیں' درد' اعضا شکنی' شدتِ تشنگی' سوزشِ جسم وہاں کڑوی سے کڑوی غذا پلائی جاتی ہے' بدمزہ سے بدمزہ کھانا کھلایا جاتا ہے۔ ضرورت ہوتی ہے تو اس کو نشتر دیا جاتا ہے' اس کا کوئی عضو کاٹا جاتا ہے' کوئی داغا جاتا ہے اور ان سب کی تکلیفیں ان کو اٹھانی پڑتی ہیں' مگر یہ ساری ایذا رسانی' کسی انتقام اور تکلیف دہی کی غرض سے نہیں ہوتی بلکہ عدمِ صحت کی غلط کاریوں کے برے نتائج سے اس کے جسم کو محفوظ رکھنے کی غرض سے کی جاتی ہے' اس کو جو تکلیفیں وہاں محسوس ہوتی ہیں' وہ گو شفا خانہ کے اندر ہی محسوس ہوتی ہیں' مگر ان کا سبب شفا خانہ نہیں بلکہ خود اس بیمار کا اصولِ صحت سے دانستہ یا نادانستہ انحراف کرنا اور اس کی وجہ سے بیماریوں میں مبتلا ہونا ہے۔

یہ اصول ان آیتوں اور صحیح حدیثوں سے پوری طرح سمجھ میں آتا ہے جن میں بالآخر عذابِ دوزخ سے نجات پانے کی کیفیت بیان کی گئی ہے' دنیاوی آلام و تکالیف کی نسبت قرآن نے یہ اصول پیش کیا ہے:

﴿وَ لِيُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ يَمْحَقَ الْكٰفِرِيْنَ﴾ (آل عمران:۱۴۱)

''اور تا کہ خدا ایمان والوں کو پاک و خالص کرے اور کافروں کو مٹائے۔''

یہی اصول عذابِ اخروی پر صادق آتا ہے' کہ اس سے بھی مقصود گنہگار اہلِ ایمان کی پاکی و صفائی ہے' چنانچہ حدیث صحیح میں ہے کہ حقوق العباد کے بعد۔

حَتّٰى اِذَا هُذِّبُوْا و نَقُّوْا اُذِنَ لَهُمْ فِيْ دُخُوْلِ الْجَنَّةِ. (صحیح بخاری باب القصاص یوم القیامۃ ص ۹۶۷)

''یہاں تک کہ جب گنہگار چھٹ جائیں گے اور پاک وصاف ہو جائیں گے تب ان کو جنت میں داخل ہونے کی اجازت ملے گی۔''

اس حدیث میں یہ دو لفظ ﴿هُذِّبُوْا وَ نَقُّوْا﴾ ذرا تشریح طلب ہیں ﴿هُذِّبُوْا﴾ کا مصدر تھذیب ہے تہذیب کے لغوی معنی یہ ہیں کہ درختوں کی خراب شاخیں اس لیے چھانٹ دی جائیں تا کہ ان میں سرسبزی وشادابی پیدا ہو اور ترقی کی نئی زندگی ان کو مل جائے اور نَقُّوْا۔ کا مصدر تنقیہ۔ ہے تنقیہ کے اصلی معنی یہ ہیں کہ کسی چیز کے اندر سے خراب و فاسد مادہ کو الگ کر دیا جائے تا کہ وہ پوری طرح نکھر جائے' اس تشریح سے صاف کھل گیا کہ گنہگاروں کو جنت کے داخلہ کے لیے کیا درکار ہے اسی لیے قرآن پاک میں ہے کہ اہلِ جنت جب جنت کے قریب پہنچیں گے تو ندا آئے گی:

﴿طِبْتُمْ فَادْخُلُوْهَا خٰلِدِيْنَ﴾ (زمر:۷۳)

''تم پاک وصاف ہو چکے تو جنت میں سدا کے لیے آ جاؤ۔''

الغرض جب اس طیب و پاکیزگی کا دور آئے گا تو گنہگاروں کو بھی نجات ملے گی' اسی لیے ہر گنہگار کے لیے دوزخ سے نکلنے کی مدت خواہ کتنی ہی طویل ہو مگر بہر حال اس کی انتہا ہے' فرمایا:

﴿لٰبِثِيْنَ فِيْهَآ اَحْقَابًا﴾ (النبا:۲۳)

''دوزخ میں وہ صدہا سال تک پڑے رہیں گے۔''

لیکن بالآخر ان صدہا سال کا بھی ایک دن خاتمہ ہوگا' اور خدا نے چاہا تو ان کو نجات ملے گی۔

حدیثِ رؤیائے برزخ میں ہے کہ ''آپؐ نے دوزخ میں کچھ ایسے لوگوں کو بھی دیکھا' جنہوں نے کچھ اچھے اور کچھ برے کام کیے تھے' ان کا آدھا دھڑ تو نہایت خوب صورت اور آدھا سخت بدصورت تھا' جب ان کی سزا کی مدت ختم ہوئی تو فرشتوں نے ان سے کہا کہ جاؤ اس نہر میں جا کر پڑ جاؤ' سامنے وہ نہر تھی' جس میں خالص سپید پانی بہہ رہا تھا' وہ اس میں جا کر پڑ گئے پھر نکل کر آئے' تو ان کی وہ بدصورتی جاتی رہی اور نہایت خوب صورت ہو گئے اس سے ظاہر ہے کہ خدا کی رحمت کیونکر گنہگاروں کو سرفراز فرمائے گی۔

کیا دوزخ بھی ایک نعمت ہے

اس تفصیل کے بعد اگر یہ کہا جائے کہ قیامت اور دوزخ کی ہولناکیاں اور سزائیں بھی گنہگاروں کے لیے اللہ تعالیٰ کی اسی طرح نعمت ہیں جس طرح اس دنیا میں شفاخانوں کا وجود بیماروں کے لیے نعمت ہے' اگر دوزخ نہ ہوتی تو گنہگاروں کی پاکیزگی اور پاکوں کی جنت میں ان کے داخل ہونے کی کوئی صورت نہ تھی' اس رحمان ورحیم کی رحمت وکرم نے گوارا نہ کیا کہ ان بدبختوں کو ان کی نافرمانیوں کے باوجود ہمیشہ کے لیے محروم رکھا جائے' اس لیے ان کی صفائی کے لیے پہلے برزخ کا حمام مقرر کیا اور جو اس سے بھی پاک نہ ہو سکیں ان کے لیے دوزخ کی آگ

مقرر کی کہ وہ اپنی ہر قسم کی بداعمالیوں کے میل کچیل کو جلا کر نکھر کر پاک ہو جائیں' اور کندن بن کر بالآخر اپنی آبائی اور فطری وراثت (جنت) پائیں' اس نظریہ کو پیشِ نظر رکھ کر قرآنِ پاک کی ان آیتوں کو پڑھیے' جن میں قیامت اور دوزخ کی ہولناکیوں اور مصیبتوں کو بھی نعمت سے تعبیر کیا گیا ہے' فرمایا۔

﴿يُرْسَلُ عَلَيْكُمَا شُوَاظٌ مِّنْ نَّارٍ وَّ نُحَاسٌ فَلَا تَنْتَصِرَانِ ○ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ○ فَاِذَا انْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ وَرْدَةً كَالدِّهَانِ ○ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ○ فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُسْئَلُ عَنْ ذَنْۢبِهٖٓ اِنْسٌ وَّ لَا جَآنٌّ ○ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ○ يُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِيْمٰهُمْ فَيُؤْخَذُ بِالنَّوَاصِيْ وَ الْاَقْدَامِ ○ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ○ هٰذِهٖ جَهَنَّمُ الَّتِيْ يُكَذِّبُ بِهَا الْمُجْرِمُوْنَ ○ يَطُوْفُوْنَ بَيْنَهَا وَ بَيْنَ حَمِيْمٍ اٰنٍ ○ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ﴾ (رحمٰن:۳۵'۴۵)

''تم پر آگ کے صاف اور دھواں ملے شعلے چھوٹیں گے' پھر کوئی تمہاری مدد نہ کر سکے گا تو تم اپنے پروردگار کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے پھر جب آسمان پھٹ کر تلچھٹ کی طرح گلابی ہو جائے گا تو تم اپنے پروردگار کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے پھر اس دن کسی انس و جن سے اس کے گناہ کی نسبت پوچھا نہ جائے گا' تو تم اپنے پروردگار کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے گنہگار اپنی نشانیوں سے پہچان لیے جائیں گے پھر وہ اپنی پیشانیوں کے بال اور پاؤں سے پکڑے جائیں گے تو تم اپنے پروردگار کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے یہ وہ دوزخ ہے' جس کو گنہگار جھٹلاتے تھے وہ اس دوزخ اور گرم پانی کے بیچ میں گشت کریں گے تو تم اپنے پروردگار کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔''

ان آیتوں کی تفسیر کسی پہلو سے بھی کیجیے یہ بات بہر حال ماننی پڑے گی کہ قیامت اور دوزخ کے ہولناک احوال مجرموں کے حق میں نعمت ہیں اس لیے بھی کہ دنیا میں وہ ان کے ڈر سے برائیوں کو چھوڑ کر راہِ راست پر آتے ہیں اور اس لیے بھی کہ آخرت میں وہ انہی کے ذریعہ سے اپنے گناہوں کے نتائجِ بد سے بری ہو کر بہشتِ ربانی کے لائق بن سکیں گے۔

دوزخ میں رحمتِ الٰہی کا ظہور اور نجات

انسان اور وہ بھی اللہ کی توحید کا قائل اور رسول کی صداقت کا معترف خواہ کسی قدر گمراہ اور گنہگار ہوتا ہم اس کے نامۂ اعمال میں کچھ نہ کچھ نیکیاں ضرور ہوں گی' قیامت گو اللہ تعالیٰ کے عتاب و جلال کا روز ہوگا' جس میں ہر گنہگار کو اپنی گنہگاری کا ملزم ہونا پڑے گا' مگر بالآخر اس رحمان و رحیم کی شانِ رحیمی کا ظہور ہوگا اور رَحْمَتِيْ سَبَقَتْ غَضَبِيْ اور میرے غصہ سے میری رحمت سبقت لے گئی ہے' کے اعلان کا مصداق شفاعت کی صورت میں جلوہ گر ہوگا' اور گنہگاروں کو اس کی بدولت گناہوں کے داغ سے پاک و صاف ہو کر پاکوں کی بہشت میں داخلہ کی اجازت

ملے گی' فرمایا:

﴿وَ مَنْ یُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ وَ یَعْمَلْ صَالِحًا یُّكَفِّرْ عَنْهُ سَیِّاٰتِهٖ وَ یُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ﴾ (تغابن:۹)

''اور جو اللہ پر ایمان لائے اور اچھے کام کرے اس سے اس کی برائیاں جھاڑ دے گا' اور اس کو جنت میں داخل کرے گا۔''

﴿وَ اٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّ اٰخَرَ سَیِّئًا عَسَى اللّٰهُ اَنْ یَّتُوْبَ عَلَیْهِمْ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ﴾ (توبہ:۱۰۲)

''اور دوسرے لوگ جنہوں نے اپنے گناہوں کا اقرار کیا اور ملایا ایک کام نیک اور دوسرا بد شاید اللہ ان کو معاف کر لے۔ بے شک اللہ بخشنے والا رحم والا ہے۔''

اس معافی کی دو صورتیں ہیں' ایک تو یہ کہ وہ بالکلیہ یعنی عذاب کے بغیر ہی معاف کر دے' دوسری یہ کہ وہ دوزخ میں کچھ دن جا کر خدا کی معافی سے سرفراز ہو کر اس سے نکلیں' فرمایا:

﴿وَ اِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِیًّا ثُمَّ نُنَجِّی الَّذِیْنَ اتَّقَوْا وَّ نَذَرُ الظّٰلِمِیْنَ فِیْهَا جِثِیًّا﴾ (مریم:۷۱'۷۲)

''اور تم میں کوئی نہیں جو جہنم میں وارد نہ ہو تیرے رب کا یہ ضروری فیصلہ ہے پھر ہم ان کو جو خدا سے ڈرے' نجات دیں گے اور مشرکوں اور کافروں کو ہم اس میں گھٹنے کے بل گرے ہوئے چھوڑ دیں گے۔''

احادیثِ صحیحہ میں اس کے متعلق آنحضرت ﷺ کی حسبِ ذیل تصریحات مذکور ہیں۔

(۱) حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ شفاعت کے ذریعہ لوگ دوزخ سے چھوٹی ککڑیوں کے مانند نکلیں گے (صحیح بخاری کتاب الشفاعۃ)

(۲) حضرت انسؓ بن مالک سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ دوزخ سے کچھ لوگ اس کی جھلس کھا کر نکلیں گے' اور جنت میں داخل ہوں گے۔'' (صحیح بخاری کتاب الشفاعۃ)

(۳) حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''جنت والے جنت میں اور دوزخ والے دوزخ میں داخل ہو چکیں گے تو خدا فرمائے گا' کہ جس کے دل میں رائی کے برابر بھی ایمان ہو اس کو دوزخ سے نکالو تو وہ کوئلے ہو کر نکلیں گے' پھر وہ نہر حیات میں ڈال دیے جائیں گے' تو وہ اس طرح اگیں گے جس طرح سیلاب کے بہاؤ میں جنگلی دانہ اگتا ہے۔'' (صحیح بخاری کتاب الشفاعۃ)

(۴) حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے قیامت کے حالات بیان کرتے ہوئے فرمایا ''پھر میں سجدہ میں گر پڑوں گا اور پڑا رہوں گا' تو آواز آئے گی کہ اے محمد! سر اٹھا' مانگ دیا جائے گا' تو میں سر اٹھاؤں گا اور اس حمد سے جو خدا مجھے سکھائے گا۔ اس کی حمد کروں گا اور سفارش کروں گا' تو خدا ایک حد مقرر فرمائے گا تو میں ان کو دوزخ سے نکالوں گا' اور جنت میں داخل کروں گا' پھر لوٹ آؤں گا اور سجدہ میں گر پڑوں گا۔

پھر وہ کچھ لوگوں کو بخش دے گا' اسی طرح تیسری پھر چوتھی بار کروں گا۔ یہاں تک کہ دوزخ میں پھر وہی رہ جائے گا' جس کو قرآن نے روک رکھا ہے۔'' (صحیح بخاری کتاب الشفاعۃ)

(۵) حضرت عمرانؓ بن حصین سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''محمد کی شفاعت سے کچھ ایسے لوگ دوزخ سے نکلیں گے اور جنت میں داخل ہوں گے جن کا نام جہنم والے ہوگا۔'' (ایضاً)

(۶) حضرت ابو ہریرہؓ کے سوال پر آپؐ نے فرمایا کہ ''میری سفارش سے سرفراز ہونے کی خوش قسمتی اس کو حاصل ہوگی' جس نے خلوصِ قلب سے اللہ کی توحید کا اقرار کیا ہو۔'' (صحیح بخاری کتاب الشفاعۃ)

(۷) حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ جب اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے فیصلہ سے فراغت پائے گا' اور چاہے گا کہ ان کو جنہوں نے اس کی توحید کی گواہی دی تھی' دوزخ سے نکالے تو فرشتوں کو ان کے نکالنے کا حکم دے گا فرشتے ان توحید والوں کو اس علامت سے پہچانیں گے کہ ان کی پیشانیوں میں سجدہ کے نشان ہوں گے کہ خدا نے آدم کے بیٹے کی پیشانی کے نشان سجدہ کو دوزخ کی آگ پر حرام کر دیا ہے تو وہ ان کو جلا نہ سکے گی' فرشتے جب ان کو نکالیں گے تو وہ جلے جھلسے ہوں گے' پھر ان پر آبِ حیات چھڑکا جائے گا' تو وہ اس طرح اگیں گے جس طرح سیلاب کے بہاؤ میں جنگلی دانہ اگتا ہے۔'' (صحیح بخاری کتاب الشفاعۃ)

(۸) حضرت ابو سعیدؓ خدری سے روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ جنت والے جنت میں دوزخ والے دوزخ میں داخل ہو چکیں گے' تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا' دیکھو جس کے دل میں ایک رائی کے دانہ کے برابر بھی ایمان ہو اس کو دوزخ سے نکالو تو وہ جل کر کوئلہ ہو کر نکلیں گے' پھر وہ نہرِ حیات میں ڈال دیے جائیں گے تو اس طرح وہ اگیں گے جس طرح سیلِ آب کے کنارے جنگلی دانہ اگتا ہے۔'' (صحیح بخاری کتاب الایمان)

(۹) حضرت ابو سعیدؓ خدری سے روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ ''اہلِ دوزخ جو دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے وہ اس میں نہ مریں گے نہ جئیں گے لیکن وہ لوگ جن کو دوزخ کی آگ بعض گناہوں کی وجہ سے چھوئے گی تو وہ اس میں کچھ دیر کے لیے مر جائیں گے' یہاں تک کہ وہ جل جائیں گے پھر ان کے حق میں شفاعت کی اجازت ہوگی' تو وہ تھوڑے تھوڑے کر کے آئیں گے اور جنت کی نہروں میں پھیل جائیں گے' اور اہلِ جنت سے کہا جائے گا کہ ان پر پانی بہاؤ تو وہ اس طرح اگیں گے جیسے سیلاب کے بہاؤ میں جنگلی دانے۔'' (صحیح بخاری کتاب الایمان)

(۱۰) حضرت عبداللہؓ بن مسعود سے روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ ''سب سے آخر میں جو شخص دوزخ سے نجات پا کر نکلے گا وہ گھسٹتا ہوا نکلے گا' اور اس کو جنت بھری معلوم ہوگی۔''

(۱۱) حضرت ابو سعیدؓ خدری سے صحیحین میں روایت ہے کہ خدا فرمائے گا کہ ملائکہ نے سفارش کی اور پیغمبروں نے سفارش کی اور اہلِ ایمان نے سفارش کی' اور اب صرف وہ رہ گیا جو تمام رحم کرنے والوں میں سب سے بڑا رحم کرنے والا ہے یعنی خود وہ رحمان و رحیم' تو وہ دوزخ سے مٹھی بھر کر ان لوگوں کو نکالے گا جنہوں نے کبھی کوئی بھلائی نہیں کی۔'' (صحیحین)

حضرت انسؓ بن مالک سے روایت ہے کہ حکم ہوگا کہ جس نے ﴿لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ﴾ کہا ہو اور اس کے دل پر جو برابر بھی نیکی ہو اس کو دوزخ سے باہر کرو جس نے ﴿لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ﴾ کہا ہو اور گیہوں کے دانہ کے برابر بھی اس کے دل میں نیکی ہو اور جس نے ﴿لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ﴾ کہا ہو اور ذرہ کے برابر بھی اس کے دل میں نیکی ہو اس کو آگ سے الگ کرو (ترمذی صفۃ النار حدیث حسن صحیح)

احادیث کی کتابوں میں اس قسم کی اور بہت سی حدیثیں ہیں، جن کا استقصاء یہاں مقصود نہیں، ان تمام حدیثوں میں قرآن پاک کی اس اہم آیت کا جلوہ موجود ہے۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ﴾ (نساء:۱۱۶)

"بے شک اللہ اس کو معاف نہ کرے گا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے اور اس کے سوا جو گناہ ہے وہ اس کو جس کے لئے چاہے گا معاف کر دے گا۔"

اس آیت میں تصریح ہے کہ شرک کے علاوہ ہر گناہ کے نتیجہ سے برأت کی جا سکتی ہے مگر شرک وہ بیماری ہے جس کے نتائج سے عہدہ برآ ہونا ممکن نہیں اس لیے ان کے نتائجِ بد بھگتے بغیر نجات کا تصور بھی خدا کے قانون ابدی کے خلاف ہے۔

شرک و کفر کی بخشایش نہیں

احکامِ الٰہی اور شریعتِ ربانی کی کھلی ہوئی دو قسمیں ہیں، ایک کا تعلق دل اور قلب سے ہے جو بمنزلۂ اصل کے ہے اس کو مذہب کی زبان سے ایمان، فلسفہ کی اصطلاح میں علم، اور تصوف کی بولی میں عرفان کہتے ہیں، اور دوسری قسم وہ ہے جو اس عقیدۂ اول کی فرع اور نتیجہ ہے اور جس کا تعلق اعضا اور جوارح سے ہے، اس کو ہم مختصراً عمل اور تفصیلاً عبادات و معاملات اور اخلاق کہتے ہیں، شرک و کفر کے گناہ کا تعلق قسمِ اول سے اور دوسرے گناہوں کا تعلق قسمِ دوم سے ہے، دلوں میں ایمان و عمل و عرفان کی اگر ایک کرن بھی ہو تو اس ظلمت کدہ میں روشنی کی امید کسی نہ کسی طرح کی جا سکتی ہے، مگر جس کا شانۂ دل میں اس نور کا ایک ذرہ بھی نہ ہو اس کی روشنی سے ہمیشہ کے لیے نا امیدی ہے، اسی لیے ایمان کے بغیر اعمال بھی کالعدم ہو جاتے ہیں، اور جہاں ایمان کچھ بھی موجود ہے، اعمالِ خیر کا کچھ نہ کچھ وجود ضروری ہے، البتہ اعمال شر کا بھی ساتھ ساتھ وجود ہے، جن کی تلافی عذابِ دوزخ کے بعد یا خدا کی رحمت سے ہو سکتی ہے، اور نجات مل سکتی ہے، ایمان و علم و عرفان جس کی حقیقت "ایمان بالغیب" ہے، اس کا حصول موت کے بعد جب حقائق خود بخود ہمارے سامنے آ جاتے ہیں، ہماری سعادت کا نتیجہ نہیں بلکہ خود ان حقائق کے ظہور کا نتیجہ ہوگا اس بنا پر شرک و کفر کے گناہ کی مغفرت کی امید قانونِ الٰہی کے مطابق ناممکن ہے، البتہ عمل کی کمی کی تلافی جو دوسری قسم کا گناہ ہے خدا کی رحمت سے بعید نہیں ہے۔

سمجھنے کے لیے ان دونوں کی کھلی ہوئی مثال یہ ہے کہ دنیا میں تعلیمی امتحان کے لیے ۳۳ نمبر کم از کم فرض کیا

گیا ہے' اب اگر کسی کا پرچہ بالکل سادہ ہے اور اس لیے اس کا نمبر صفرِ محض ہے تو رحم دل سے رحم دل ممتحن کے لیے بھی یہ ناممکن ہے کہ اس کو ادنیٰ سے ادنیٰ درجہ میں بھی کامیاب کر سکے' لیکن جس نے کچھ جوابات لکھے ہیں اور کچھ چھوڑ دیے ہیں' اور کچھ غلط لکھے ہیں تو اگر وہ ۲۹' ۳۰ کے قریب بھی پہنچ گیا ہے' تو رحمدل ممتحن ۳۳ تک اس کو پہنچا کر ادنیٰ درجہ میں کامیاب بنا سکتا ہے۔

الغرض ایمان وعلم وعرفان کے مجرم جن کا نام مشرک وکافر ہے' اپنے ناقابلِ تلافی نتیجہ کے بھگتے بغیر عذابِ دوزخ سے رہائی کا تصور بھی نہیں کر سکتے کہ ان کی دنیاوی زندگی کا عرفانی فقدان رحمتِ الٰہی کو اپنی طرف جذب کرنے کی قدرت ہی نہیں رکھتا' مگر کیا شرک وکفر کے گنہگاروں کے لیے شرک وکفر کے دورۂ عذاب کے طے کر لینے کے بعد بھی رہائی کا تصور کیا جا سکتا ہے؟ اس کا جواب آئندہ سطروں میں ملے گا۔

کیا دوزخ کی انتہا ہے

دوزخ جو عقابِ الٰہی کا گھر ہے' کیا ہمیشہ آباد رہے گا؟ اللہ تعالیٰ کی رحمتِ عمومی کے قائلوں کے نزدیک اس کا جواب نفی میں ہے'[1] ان کا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مقررہ مدتِ دراز کے بعد ایک دن جہنم کی آگ رحمتِ الٰہی

(۱) ابتدائی اسلامی فرقوں میں جہنم کی ابدیت اور غیر ابدیت پر بہت سے مناظرے ہو چکے ہیں' جن کی تفصیل ملل ونحل کی کتابوں میں موجود ہے' ایک دو کو چھوڑ کر اس پر تو بے شبہ قطعیت کے ساتھ سب کا اتفاق ہے کہ جنت کا وجود دائمی اور ابدی ہے' لیکن جہنم کے دوام اور ابدیت میں کسی قدر اختلاف ہے' عام اہلِ سنت کا عقیدہ یہ ہے کہ جہنم اور جنت دونوں کا وجود دائمی اور ابدی ہے' گنہگار مومن اپنے گناہ کے بقدر عذاب اٹھا کر یا خدا کی رحمت سے معاف ہو کر بالآخر جنت میں داخل کئے جائیں گے لیکن مشرک وکافر کے گناہ کبھی معاف نہ ہوں گے اور وہ ہمیشہ دوزخ میں جلیں گے' فقہا اور محدثین کا ایک گروہ جو مرجیۂ کہلاتا ہے اس بات کا قائل ہے کہ جو مومن ہوگا' وہ گنہگار بھی ہوگا تو بھی دوزخ میں نہ جائے گا' بلکہ معافی سے سرفراز ہو کر شروع ہی سے جنت میں داخل ہوگا۔ اس کے برخلاف خوارج اور معتزلہ کا یہ عقیدہ ہے کہ مومن بھی اگر گناہِ کبیرہ کا مرتکب ہوگا تو وہ بھی کفار کی طرح ہمیشہ دوزخ ہی میں رہے گا' اور بھی اس بارہ میں لوگوں کی مختلف راہیں ہیں۔

اہل سنت کے ایک مختصر گروہ کا جس میں صحابہؓ کرام اور تابعین کے نام بھی ہیں' اور متاخرین میں جس کے پرجوش حامی حافظ ابن قیم ہیں' یہ خیال ہے کہ جب گنہگار اپنے اپنے گناہوں کے بقدر عذاب پا چکیں گے' تو جہنم فنا کر دی جائے گی' حافظ ابن قیم نے اپنی دو کتابوں شفاء العلیل اور حادی الارواح (دونوں مطبوعہ ہیں' حادی الارواح اعلام الموقعین کے ساتھ چھپی ہے) میں قرآن' احادیث' آثار اور عقل کی پچیس دلیلوں سے اپنے مسلک کو مبرہن کیا ہے (دیکھو شفاء العلیل ص ۲۵۲ تا ص ۲۶۴' حسینیہ مصر اور حادی الارواح از ص ۱۶۷ تا ۲۳۵ جلد دوم مطبوعہ جدیدہ مصر) علامہ ابن تیمیہ نے بھی اس نظریہ کو سلف اہل سنت کے ایک فریق کا خیال تسلیم کیا ہے (حادی الارواح ابن قیم جلد دوم ص ۱۶۷) ایک زیدی یمنی عالم شیخ مقبلی نے بھی اس کو قبول کیا ہے' العلم المشائخ فی ایثار الحق علی الاباو المشائخ ص ۱۲۲ (صوفیہ میں شیخ محی الدین ابن عربی اور ان کے متبعین یہ فرماتے ہیں کہ کافر ومشرک جن میں خلودِ نار کا حکم ہے' وہ بالآخر دوزخ میں رہتے رہتے ایسے ہو جائیں گے کہ ان کو اسی دوزخ میں راحت ولذت معلوم ہونے لگے گی جیسے بعض کیڑے غلاظتوں ہی کو پسند کرتے ہیں اور ان ہی میں لطف اٹھاتے ہیں' میں نے اس باب کو بہت ڈرتے ڈرتے لکھا ہے کہ اس میں اجمالِ الٰہی کی تصریح کا جرم عائد ہوتا ہے اگر یہ اختیار کردہ پہلو حق نہ ہو تو اللہ مجھے معاف فرمائے اور توبہ کی توفیق بخشے اور اپنی مراد کا دروازہ مجھ پر کھول دے۔

کے چھینٹوں سے بالآخر سرد ہو جائے گی' حدیث صحیح میں ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ''جنت میری رحمت اور دوزخ میرا عذاب ہے۔''(۱) اسی کے ساتھ حدیث صحیح میں وارد ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے مخلوقات کا فیصلہ کیا' اسی وقت اس نے اپنے عرش کے اوپر لکھ دیا کہ ﴿رَحْمَتِیْ سَبَقَتْ غَضَبِیْ﴾(۲) (میری رحمت میرے غضب سے سبقت لے گئی)۔

اب اگر دوزخ جو اس کے غضب کا مظہر ہے' اس کی جنت ہی کی طرح دائمی و ابدی ہو تو اس کا غضب اس کی رحمت پر سبقت لے جاتا ہے یا برابر ہو جاتا ہے' اور اس کا تخیل بھی اس رحمان و رحیم کی نسبت نہیں ہو سکتا' اسی طرح حدیث میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کے سو حصوں میں سے صرف ایک حصہ دنیا میں اتارا' اور ننانوے حصے قیامت کے دن کے لیے رکھے ہیں'(۳) اس لیے ماننا پڑتا ہے کہ ایک دن آئے گا' جب اس کے غضب پر اس کی رحمت غالب آئے گی اور اس کی رحمت کے سوا کچھ باقی نہ رہے گا اور یہ وہ دن ہو گا جب گنہگار اپنے گناہوں کی ناپاکیوں اور نجاستوں سے اپنے اپنے مقررہ وقت پر پاک ہو کر اس کی رحمت کی سرفرازی کے قابل بنیں گے۔

اسلام کی رو سے سب سے بڑے مجرم مشرک و کافر ہیں' جو اس وقت تک نجات نہ پا سکیں گے' جب تک دوزخ کے تنور میں ایک گرم کوئلہ بھی باقی ہے' تاہم ان کے عذاب کی مدت کی نسبت بھی قرآن میں حسب ذیل تصریحات ہیں:

(۱) ﴿لٰبِثِیْنَ فِیْهَآ اَحْقَابًا﴾ (نباء:۲۳)

''وہ دوزخ میں صدہا ہزار سال ٹھہریں گے۔''

صدہا ہزار سال کی مدت کس قدر بڑی ہے' پھر بھی ایک دن اس کا خاتمہ ہو گا' دوسری آیت جو صریحاً کفار و مشرکین کے حق میں ہے یہ ہے۔

(۲) ﴿اَلنَّارُ مَثْوٰىكُمْ خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ اِنَّ رَبَّكَ حَكِیْمٌ عَلِیْمٌ﴾ (انعام:۱۲۸)

''دوزخ ہے تمہارا ٹھکانا' اس میں تم سدا رہنے والے ہو' لیکن یہ کہ اللہ جو چاہے' بے شک تیرا رب حکیم و علیم ہے۔''

اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ شرک و کفر کی سزا تو اصل میں قانوناً یہی ہے کہ دوزخ میں دائمی سزا دی جاتی رہے' مگر اس کی رحمت کا اقتضا کچھ اور ہے لیکن وہ حکیم و علیم ہے اس لیے وہ اپنا ہر کام اپنی حکمت و مصلحت اور علم کے مطابق کرتا ہے اور وہی جانتا ہے کہ کس کے حق میں کیا کرنا چاہیے اور کب کرنا چاہیے۔

تیسری آیت میں ہے:

---

(۱) صحیح بخاری باب رحمۃ اللہ جلد دوم ص ۱۰۱' ۱۱ و صحیح مسلم۔

(۲) صحیح بخاری باب ﴿وَ لَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِیْنَ﴾ جلد دوم ص ۱۰۱' ۱۱ و صحیح مسلم باب سعۃ رحمۃ اللہ۔

(۳) صحیح مسلم باب سعۃ رحمۃ اللہ۔

(۳) ﴿خٰلِدِیْنَ فِیْهَا مَادَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّکَ اِنَّ رَبَّکَ فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ﴾ (ھود:۱۰۷)

''وہ دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے' جب تک آسمان وزمین قائم رہیں' لیکن یہ کہ جو تیرا رب چاہے' بے شک تیرا رب جو چاہتا ہے وہ کرتا ہے۔''

دوسری اور تیسری آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے ان کے حق میں اپنی مشیت کو عذاب کی انتہا بتایا ہے اور اپنے کو رب کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے' جس سے اشارہ نکلتا ہے کہ اس کی مشیت سے بالآخر اس عذاب کا ختم ہونا اس کی ''ربوبیت'' کا اقتضا ہے۔

قرآن پاک میں کوئی ایسی صاف وصریح آیت موجود نہیں ہے جس سے دوزخ کی بقائے دوام' عدمِ انتہا اور تسلسلِ وجود پر تصریح استدلال کیا جا سکے' حالانکہ اس کے برخلاف بہشت کی ہمیشگی وبقا اور عدمِ انقطاع وعدمِ فنا کی بیسیوں آیتیں قرآن پاک میں موجود ہیں چنانچہ ان دونوں کے فرق کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے اس اوپر والی آیت کو ہم تمام وکمال یہاں نقل کرتے ہیں' فرمایا:

﴿فَاَمَّا الَّذِیْنَ شَقُوْا فَفِی النَّارِ لَهُمْ فِیْهَا زَفِیْرٌ وَّ شَهِیْقٌ ○ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا مَادَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّکَ اِنَّ رَبَّکَ فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ ○ وَ اَمَّا الَّذِیْنَ سُعِدُوْا فَفِی الْجَنَّةِ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا مَادَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّکَ عَطَآءً غَیْرَ مَجْذُوْذٍ ○﴾ (ھود:۱۰۶'۱۰۸)

''تو لیکن جو بد بخت ہوئے وہ دوزخ میں ہوں گے اس میں ان کو گدھوں کی طرح چلانا اور دھاڑنا ہے جب تک آسمان اور زمین ہیں وہ اس دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے' لیکن یہ کہ جو تیرا رب چاہے' بے شک تیرا رب جو چاہتا ہے وہ کرتا ہے اور لیکن جو خوش قسمت ہوئے تو وہ جنت میں ہوں گے ہمیشہ اس میں رہیں گے جب تک آسمان وزمین قائم رہیں' مگر جو چاہے تیرا رب یہ غیر منقطع بخشش ہوگی۔''

دیکھو اہلِ جنت اور اہلِ دوزخ دونوں کے لیے خلود ودوام فرمایا' پھر ان دونوں میں اس کے بعد اپنی مشیت سے استثناء فرمایا' مگر اہلِ دوزخ کے دوام کے ذکر میں فرمایا کہ مگر جو چاہے تیرا رب' بے شک تیرا رب جو چاہے کر ڈالتا ہے۔'' اس سے معلوم ہوا کہ وہ چاہے تو دوزخ کے عذاب کو ختم کر دے' اور چاہے تو قائم رکھے' لیکن اہلِ جنت کے دوام کے ذکر میں بتصریح فرمایا۔ ''مگر جو چاہے تیرا رب یہ غیر منقطع بخشش ہوگی۔'' اس سے معلوم ہوا کہ اہلِ جنت کے حق میں اس کی مشیت یہی ہوگی کہ وہ بے انقطاع اور غیر منتہی دوام وتسلسل کے ساتھ ہمیشہ قائم وباقی رہے' اس آیت کی تفسیر میں متعدد آئمہ سلف مثلاً ابن زید اور شعبی وغیرہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اہلِ جنت کے بارہ میں تو اپنی مشیت ظاہر فرما دی کہ وہ مسلسل اور غیر منقطع ہے لیکن اہلِ دوزخ کی نسبت اپنی مشیت کو کسی مصلحت سے

محفوظ رکھا ہے۔ (۱)

ایک اور مقام پر خاص طور پر کفار و مشرکین کا نام لے کر اس طرح فرمایا گیا ہے:

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ اَھْلِ الْکِتٰبِ وَ الْمُشْرِکِیْنَ فِیْ نَارِ جَھَنَّمَ خٰلِدِیْنَ فِیْھَا اُولٰٓئِکَ ھُمْ شَرُّالْبَرِیَّۃِ ○ اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِکَ ھُمْ خَیْرُالْبَرِیَّۃِ ○ جَزَآؤُھُمْ عِنْدَ رَبِّھِمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْھَآ اَبَدًا﴾ (البینۃ:۶۔۸)

''بے شک اہلِ کتاب اور مشرکوں میں سے جنہوں نے کفر کیا وہ جہنم کی آگ میں (خالد) پڑے رہیں' یہ بدترین لوگ ہیں بے شک جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے' وہ بہترین ہیں' ان کی جزا ان کے پروردگار کے نزدیک بسنے کے باغ ہیں جن میں نہریں بہتی ہوں' وہ اس میں ہمیشہ (خالد) رہیں گے۔''

غور سے دیکھو کہ اس میں اہلِ دوزخ کے مقابلہ میں اہلِ جنت کے دوام کی نسبت کتنی تاکید پر تاکید ہے پہلے ''عدن'' فرمایا جس کے معنی ''قیام'' اور ''بسنے'' کے ہیں' پھر خالدین'' کہا کہ وہ اس میں رہا کریں گے' بعد ازیں ''ابدًا'' فرمایا کہ وہ جنت میں ابدی طور سے قیام کریں گے۔

اسی طرح ایک اور سورہ میں ہے:

﴿وَ یُدْخِلْہُ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْھَآ اَبَدًا ذٰلِکَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ○ وَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَآ اُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ النَّارِ خٰلِدِیْنَ فِیْھَا وَ بِئْسَ الْمَصِیْرُ○﴾ (تغابن:۹'۹۔۱۰)

''اور اس کو ان باغوں میں داخل کرے گا' جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہوں گی' جن میں وہ ہمیشہ رہا کریں گے اور وہی بڑی کامیابی ہے' اور جنہوں نے انکار کیا' اور ہماری باتوں کو جھٹلایا وہی دوزخ والے ہیں وہ اس میں رہا کریں گے' اور وہ بری جگہ ہے۔''

دیکھو کہ تقابلاً دونوں میں خالدین (رہا کریں گے) اور خالدین فیہا ابداً (ہمیشہ رہا کریں گے) کا فرق کتنا نمایاں ہے کہیں یہ کیا گیا ہے کہ کفار کے عذاب میں مدت کی تعیین سے سرے سے خاموشی برتی گئی ہے' اور جنت میں خلود کی تصریح فرما دی گئی ہے مثلاً۔

﴿یَوْمَ تَبْیَضُّ وُجُوْہٌ وَّ تَسْوَدُّ وُجُوْہٌ فَاَمَّا الَّذِیْنَ اسْوَدَّتْ وُجُوْھُھُمْ اَکَفَرْتُمْ بَعْدَ اِیْمَانِکُمْ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا کُنْتُمْ تَکْفُرُوْنَ ○ وَ اَمَّا الَّذِیْنَ ابْیَضَّتْ وُجُوْھُھُمْ فَفِیْ رَحْمَۃِ اللّٰہِ ھُمْ فِیْھَا خٰلِدُوْنَ﴾ (ال عمران:۱۰۶'۱۰۷)

''جس دن کچھ منہ سپید ہوں اور کچھ سیاہ تو جو سیاہ ہوئے تو کیا ایمان کے بعد کافر ہو گئے تھے' تو اپنے کفر

(۱) طبری در منثور سیوطی تفسیر آیات ہود رکوع ۹ و انعام رکوع ۱۵۔

کی پاداش میں عذاب کا مزہ چکھو اور جن کے منہ سفید ہوں تو وہ اللہ کی رحمت میں ہوں گے اور اس رحمت میں سدا رہیں گے۔"

آیتِ بالا میں عذاب کے ذکر میں مدت کی تصریح سے سراسر خاموشی ہے' اور رحمت کے ذکر میں خلود کی تصریح تام ہے' ان ہی آیتوں کی تفسیر میں آنحضرت ﷺ اور بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کرام سے روایتیں ہیں کہ ایک دن آئے گا جب دوزخ کے میدان میں ہو کا عالم ہوگا' اور کوئی ایک متنفس بھی وہاں نظر نہیں آئے گا' چنانچہ:

(۱) طبرانی میں حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ صحابی سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ جہنم پر ایک دن ایسا آئے گا جب خزاں رسیدہ پتے کے مانند ہو جائے گا' اور اس کے دروازے کھل جائیں گے۔

(۲) حضرت جابر رضی اللہ عنہ یا کسی اور صحابی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ "جہنم پر ایک دن ایسا آئے گا جس میں اس کے دروازے کھل جائیں گے اور اس میں کوئی نہ ہوگا۔

(۳) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں جو کہتا ہوں وہ یہ ہے کہ جہنم میں ایک دن ایسا آئے گا جب اس میں کوئی نہ ہوگا۔

(۴) تفسیر عبد بن حمید میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کی گئی ہے کہ انہوں سے فرمایا کہ اگر اہلِ دوزخ ریگستانِ عالج کے ذرات کے شمار کے بقدر بھی دوزخ میں رہیں' پھر بھی ایک دن آئے گا' جب وہ اس سے نکلیں گے۔

(۵) عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ بن العاص سے روایت ہے کہ جہنم پر ایک دن آئے گا جب اس کے خالی دروازے بھڑ بھڑائیں گے' اور اس میں کوئی نہ ہوگا اور یہ اس وقت ہوگا جب لوگ اس میں صدہا ہزار سال (احقاب) کی مدت پوری کر لیں گے۔

(۶) عبدالرزاق' ابن منذر' طبرانی اور بیہقی کی کتاب الاسماء والصفات میں ہے کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ بن عبداللہ صحابی یا ابوسعید رضی اللہ عنہ خدری صحابی یا کسی اور صحابی نے فرمایا کہ ﴿اِلَّا مَا شَاءَ رَبُّکَ﴾ کا استثنا پورے قرآن پر حاوی ہے یعنی جہاں جہاں قرآن میں ﴿خَالِدِیْنَ فِیْهَا﴾ (سدا اس میں رہیں گے) ہے' وہاں مشیتِ الٰہی کا استثنا قائم ہے۔

(۷) حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ بن مسعود نے فرمایا کہ دوزخ پر ایک زمانہ آئے گا جب اس کے خالی دروازے کھڑ کھڑائیں گے۔ (۱)

دفع شبہ

قرآن پاک میں ایسی بھی چند آیتیں ہیں جن سے لوگوں کو دوزخ کے دوام کا خیال ہوا ہے' مثلاً وہ تین

(۱) حافظ ابن قیم نے شفاء العلیل (ص ۲۵۸) میں ان روایات کو غیر مطبوعہ کتبِ تفسیر و حدیث سے نقل کیا ہے ان میں سے بعض ابن جریر طبری میں بھی آیاتِ مذکور کی تفسیر میں خصوصاً تفسیر سورۂ ہود جلد ۱۲ ص ۶۶ میں مذکور ہیں اور حافظ جلال الدین سیوطی نے بھی تفسیر در منثور تفسیر سورۂ ہود جلد ثالث ص ۳۵۰ میں زیرِ آیت مذکورۂ ہود میں ذکر کیا ہے اور کتاب الاسماء والصفات بیہقی (ص ۱۲۳) مطبوعہ حیدر آباد میں چھٹی روایت ہے۔

آیتیں جن میں کفار کو ﴿خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ اَبَدًا﴾ ہمیشہ کے لیے عذاب کی دھمکی دی گئی ہے۔

(۱) ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَعَنَ الْكٰفِرِیْنَ وَ اَعَدَّ لَهُمْ سَعِیْرًا ○ خَالِدِیْنَ فِیْهَآ اَبَدًا﴾ (احزاب:۶۴)

''بے شک خدا نے کافروں پر لعنت کی اور ان کے لیے وہ آگ مہیا کی جس میں وہ ہمیشہ پڑے ہیں گے۔''

(۲) ﴿وَ مَنْ یَّعْصِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ فَاِنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدِیْنَ فِیْهَآ اَبَدًا﴾ (الجن:۲۳)

''اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا تو اس کے لیے جہنم کی وہ آگ ہے جس میں وہ ہمیشہ پڑا رہے گا۔''

(۳) ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَ ظَلَمُوْا لَمْ یَكُنِ اللّٰهُ لِیَغْفِرَ لَهُمْ وَ لَا لِیَهْدِیَهُمْ طَرِیْقًا اِلَّا طَرِیْقَ جَهَنَّمَ خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ اَبَدًا﴾ (النساء:۱۶۸،۱۶۹)

''بے شک جنہوں نے کفر کیا' اور حد سے آگے بڑھے نہیں ہے کہ اللہ ان کو بخشے اور نہ یہ کہ ان کو راہ دکھائے لیکن جہنم کی راہ جس میں وہ ہمیشہ پڑے رہیں۔''

ان تینوں آیتوں میں ﴿خَالِدِیْنَ فِیْهَآ اَبَدًا﴾ (دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے) کا مطلب یہ ہے کہ ایسے لوگ جن کے حق میں یہ آیتیں آئی ہیں وہ اس وقت تک دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے جب تک حسبِ مشیتِ الٰہی دوزخ کے خاتمہ کا دور نہیں آئے گا۔

باقی چند آیتوں میں ابدا (ہمیشہ) کے بغیر صرف ﴿خَالِدًا﴾ ہے' جیسا ﴿فِیْهَا خَالِدُوْنَ﴾ وہ اس میں خالد رہیں گے) یا ایک جگہ ہے۔

﴿وَ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْخُلْدِ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ﴾ (السجدۃ:۱۴)

''اور ''خلود'' کے عذاب کا مزہ چکھو۔''

تو یہاں ایک بات سمجھ لینی چاہیے کہ خلود کے دو معنی ہیں' ایک حقیقی دوام اور دوسرے قیامِ طویل' ان دو میں سے کسی ایک معنی کی تخصیص قرینہ سے ہوگی' اسی دوسرے معنی کے اعتبار سے عربی اشعار میں پہاڑوں اور بدویانہ چولھوں کے پتھروں کے لیے خوالد اور خالدات کے لفظ صفت میں آتے ہیں' کیونکہ وہ تا دیر اور زمانۂ دراز تک باقی رہنے والے ہیں' اس سے معلوم ہوا کہ تنہا خَالِدِیْنَ۔ کا لفظ ابدیت کے مفہوم میں صریح نہیں' جب تک اس ساتھ کوئی اور قرینہ قائم نہ ہو' جو دوام کے معنی کی تخصیص کر دے' جیسا کہ یہ قرینہ ان آیتوں میں ہے' جہاں اہل جَنّٰتُ کو خَالِدِیْنَ کہا گیا ہے کہ تقریباً بیس آیتوں میں اس خلود کے معنی دوام اور عدم انقطاع کے بتائے گئے ہیں' اس لیے جنت کے سلسلہ میں جہاں صرف خَالِدِیْنَ۔ بھی ہے وہ ہمیشگی اور دوام ہی کے معنی لیے جائیں گے بر خلاف اس کے جہاں دوزخ کے ساتھ خَالِدِیْنَ کا لفظ ہے وہاں دوام کے مفہوم کے لیے کوئی قرینہ موجود نہیں' اس لیے دوزخ والی آیتوں میں خلود سے مقصود یہ ہے کہ گنہگار زمانۂ دراز تک دوزخ میں رہیں گے' غالباً یہی وجہ ہے کہ

گنہگار اہل ایمان کی سزا میں کبھی خَالِدِیْنَ کے ساتھ اَبَدًا استعمال نہیں کیا گیا ہے' گنہگار اہل ایمان میں سب سے بڑی دھمکی اس کو دی گئی ہے' جس نے کسی مسلمان کا خون بے سبب بہایا ہو مگر اس کے لیے بھی خالدین کے ساتھ ابدًا۔ استعمال نہیں کیا گیا' فرمایا: ﴿وَ مَنْ یَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآءُ ہٗ جَھَنَّمُ خَالِدًا فِیْھَا﴾ (نساء : ۹۳) اور جو کوئی کسی باایمان کو قصداً قتل کرے گا' تو اس کا بدلہ دوزخ ہے' جس میں وہ خالدًا یعنی مدت دراز تک پڑا رہے گا۔

یہی سبب ہے کہ معتزلہ اور خوارج کے سوا تمام اہلِ اسلام اس بے گناہ مسلمان مقتول کے قاتل کی بالآخر بخشایش کے قائل ہیں اس سے معلوم ہوا کہ ان آیتوں میں خلود سے مراد ''ہمیشگی'' نہیں ہے' بلکہ زمانۂ دراز ہے کہ اہلِ توحید کی بالآخر نجات قرآن وحدیث کی متفقہ تعلیم ہے' اور اس لیے مومن کے لیے اس کے کسی جرم کی سزا میں ہمیشگی کا مفہوم داخل ہی نہیں ہوسکتا' بنابریں ان آیتوں میں ''خلود'' کے معنی منطقی دوام نہیں' بلکہ عرفی دوام' یعنی مدتِ دراز کے ہیں۔ ہم عام طور سے مجرم کے لیے ''حبسِ دوام'' کی قانونی اصطلاح بولتے ہیں جس سے مراد ابد تک کیا قیامت تک کا زمانہ بھی نہیں ہوسکتا' بلکہ عمر بھر بھی نہیں' بلکہ صرف اس سے قانونی قید کی درازترین مدت مراد ہے' جس کا قانونی اندازہ بیس سال کیا گیا ہے' کتنے مجرم ہیں جو اس مدت کو کاٹ کر آزادی حاصل کرتے ہیں' اور ایسے بھی ہیں جو کسی شاہی عفوِ عام کے سلسلہ میں قبل از مدت رہائی پاجاتے ہیں۔

(۱) ﴿اِنَّ الْفُجَّارَ لَفِیْ جَحِیْمٍ ○ یَّصْلَوْنَھَا یَوْمَ الدِّیْنِ ○ وَ مَا ھُمْ عَنْھَا بِغَآئِبِیْنَ ○﴾ (انفطار:۱۴'۱۶)

''بے شک گنہگار دوزخ میں ہیں' وہ انصاف کے دن اس میں داخل ہوں گے اور وہ اس سے چھپے نہیں رہ سکتے۔''

(۲) ﴿وَ قَالَ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْا لَوْ اَنَّ لَنَا کَرَّۃً فَنَتَبَرَّاَ مِنْھُمْ کَمَا تَبَرَّءُ وْا مِنَّا کَذٰلِکَ یُرِیْھِمُ اللّٰہُ اَعْمَالَھُمْ حَسَرَاتٍ عَلَیْھِمْ وَ مَا ھُمْ بِخَارِجِیْنَ مِنَ النَّارِ﴾ (بقرہ:۱۶۷)

''اور کہیں گے کہ کاش ہم کو دوبارہ دنیا کی زندگی ملتی تو ہم اپنے پیشواؤں سے ہی الگ ہوجاتے جیسے وہ ہم سے یہاں الگ ہوگئے اللہ ان کے کاموں کو ایسے ہی حسرتیں بنا کر ان کو دکھائے گا اور وہ دوزخ سے نکلنے والے نہیں۔''

(۳) ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَوْ اَنَّ لَھُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا وَّ مِثْلَہٗ مَعَہٗ لِیَفْتَدُوْا بِہٖ مِنْ عَذَابِ یَوْمِ الْقِیٰمَۃِ مَا تُقُبِّلَ مِنْھُمْ وَ لَھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ○ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّخْرُجُوْا مِنَ النَّارِ وَ مَا ھُمْ بِخَارِجِیْنَ مِنْھَا وَ لَھُمْ عَذَابٌ مُّقِیْمٌ ○﴾ (مائدہ:۳۶'۳۷)

''بے شک جنہوں نے کفر کیا' اگر ان کی ملکیت میں کل روئے زمین ہو' اور اتنا ہی اور ہوتا کہ اس کو فدیہ دے کر قیامت کے عذاب سے رہائی پائیں تو وہ ان کی طرف سے قبول نہ ہو اور ان کے لیے دردناک

عذاب ہے' وہ چاہیں گے کہ دوزخ سے نکل جائیں' لیکن وہ اس سے نکلنے والے نہیں اور ان کے لیے قائم عذاب ہے۔"

(۴)﴿كُلَّمَآ اَرَادُوْٓا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا مِنْ غَمٍّ اُعِيْدُوْا فِيْهَا وَ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ﴾ (حج:۲۲)

"جب وہ چاہیں کہ اس دوزخ سے غم کی وجہ سے نکل پڑیں وہ اس میں لوٹا دیے جائیں گے (اور کہا جائے گا کہ) جلنے کی سزا چکھو۔"

(۵)﴿وَ اَمَّا الَّذِيْنَ فَسَقُوْا فَمَاْوٰهُمُ النَّارُ كُلَّمَآ اَرَادُوْٓا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا اُعِيْدُوْا فِيْهَا وَ قِيْلَ لَهُمْ ذُوْقُوْا عَذَابَ النَّارِ الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ﴾ (سجدہ:۲۰)

"اور لیکن جنہوں نے نافرمانی کی تو ان کا ٹھکانا دوزخ ہے جب وہ چاہیں گے کہ وہ اس سے نکل جائیں اس میں لوٹا دیے جائیں گے اور کہا جائے گا کہ دوزخ کی اس مار کا مزہ چکھو جس کو تم جھٹلاتے تھے۔"

یہ وہ پانچ آیتیں ہیں جن سے بعضوں کو عذابِ دوزخ کے دوام اور غیر منقطع بقا کا خیال پیدا ہوا ہے' مگر ان میں سے ایک ایک آیت پر غور کرو تو ان کے خیال کی غلطی فوراً معلوم ہو جائے گی' پہلی آیت کا منشا اسی قدر ہے کہ کوئی گنہگار اگر یہ سمجھے کہ وہ کسی جگہ چھپ کر دوزخ کے عذاب سے بچ جائے گا' تو یہ محال ہے کہ عذاب سے چھپ کر بچ جانا کسی طرح ممکن نہیں۔ دوسری آیت کا مطلب یہ ہے کہ دوزخی کہیں گے کہ ہم کو دوزخ سے نکل کر دوبارہ دنیا میں جانے دیا جائے' تو اب کے ہم نیکی کا کام کریں گے اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ اب یہاں سے نکل کر دنیا میں دوبارہ جانا نہیں تیسری آیت میں ہے کہ پورے روئے زمین کی دولت دے کر بھی آخرت میں نجات خریدی نہیں جا سکتی' اور نہ وہاں سے کوئی نکل کر بھاگ سکتا ہے۔ چوتھی اور پانچویں آیت کا صریح مفہوم یہ ہے کہ اگر کوئی دوزخی دوزخ کے عذاب سے گھبرا کر اس سے نکل بھاگنا چاہے گا تو وہ پکڑ کر پھر اسی میں ڈال دیا جائے گا' ان آیتوں سے صرف اتنا معلوم ہوا کہ گنہگار از خود دوزخ سے نکل نہ سکیں گے' اور نہ مدتِ عذاب کے اندر وہ خلاصی پا سکتے ہیں' مگر اس سے خدا تعالیٰ کے حکم و اجازت سے بالآخر اس سے نجات پانے کی نفی نہیں نکلتی' اور نہ اس کی کہ بقدرِ گناہ عذاب کے مدت بسر کرنے کے بعد بھی نجات نہیں مل سکتی اور نہ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ بہشت کی طرح دوزخ کو بھی غیر متناہی دوام بخشا گیا ہے۔

یہی وہ آیتیں ہیں جن سے گنہگاروں کے لیے دوامِ عذاب کا مفہوم نکالا جا سکتا ہے مگر ایک ایک آیت کو غور سے پڑھو کہ ان میں سے کسی میں بھی دوزخ کے دوام' بقا اور عدمِ فنا یا اس کے عذاب کے عدمِ انتہا کی تصریح ہے حالانکہ اس کے بالمقابل جنت کی بقائے دوام اور عدمِ انقطاع کی تصریح بار بار اور بتکرار ہے۔

ایک اور نکتہ لحاظ کے قابل ہے اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ خدا نے گنہگاروں کو عذابِ دوزخ کی ابدیت اور دوام کی دھمکی دی ہے' تاہم اس حقیقت سے چشم پوشی نہیں کرنی چاہیے کہ نیکی کا بدلہ نہ دینا یقیناً برائی ہے' جس سے

اللہ تعالیٰ کی قدوسیت کا دامن تمامتر پاک ہے کہ ﴿ اِنَّکَ لَا تُخْلِفُ الْمِیْعَادَ﴾(آل عمران:۱۹۴) تو وہ وعدہ کے خلاف نہیں کرتا ﴿اِنَّہٗ کَانَ وَعْدُہٗ مَاْتِیًّا﴾ (مریم:۴) اس کا وعدۂ جنت پورا ہی ہوگا' لیکن اگر برائی کا بدلہ حسبِ تہدید سابق برائی کے ساتھ نہ دیا جائے' تو حقیقت میں خلافِ وعدگی نہیں جو قابلِ ملامت ہو بلکہ اس کا نام مغفرت' کرم' عطا اور عفو ہے' جس کا اہل اس رحمان و رحیم اور عَفُوٌّ غَفُوْر سے بڑھ کر کوئی دوسرا نہیں' اس لیے گنہگاروں کے ساتھ جیسا کہ اس نے فرمایا ہے' اپنی حکمت و مصلحت کی بنا پر وہ جو چاہے کر سکتا ہے' چنانچہ مسند ابو یعلی میں حضرت انسؓ بن مالک سے روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ خدا نے کسی نیک کام پر جس ثواب کا وعدہ فرمایا ہے' وہ اس کو ضرور ہی پورا کرے گا لیکن جس کسی کو اس کے کسی کام پر عذاب کی دھمکی دی ہے تو اس کو اختیار حاصل ہے۔"(۱)

کوئی کہہ سکتا ہے کہ اگر بالآخر گناہوں کی مغفرت اور خدا کی رحمت میں یہ وسعت اور عموم ہے کہ بڑے سے بڑے گنہگار بھی دوزخ کی آگ میں جل کر بالآخر پاک وصاف اور جنت میں داخل ہونے کے قابل ہو جائیں گے' تو اشارات و کنایات کے بجائے ان کی معافی کی صریح تصریح کیوں نہیں کر دی گئی؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگر ایسا کیا جاتا تو یہ ان مجرموں اور گنہگاروں کے حق میں اچھا نہ ہوتا کیونکہ اس سے ان میں ندامت اور توبہ کے رجحان کے بجائے خودسری' گستاخی اور شوخی پیدا ہوتی اور ان میں آئندہ کے نتائجِ بد سے نڈر پن اور بے خوفی آ جاتی اور ایسا نہ ہونا تنبیہ و صلاح و تدارک کی مصلحتوں کے سراسر منافی ہوتا۔ اس لیے ان کی قانونی سزا تو اللہ تعالیٰ نے دائمی عقاب مقرر فرمائی' لیکن آخر کار ان کی نجات کو اپنی مشیت اور علم و مصلحت کے سپرد فرما کر' ان کو ایک گونہ اپنے سے ناامید بھی نہیں ہونے دیا' اور امید و بیم کی حالت میں رکھ کر اپنے سامنے جھکنے اور محبت کرنے کا جذبہ بھی پیدا کر دیا اور یہ اس باب میں وہ عظیم الشان اصلاح ہے جس کو ایک طرف عیسائیوں نے کفارہ کی اور دوسری طرف ہندو مذاہب نے کرم کی تعلیم دے کر غارت کر دیا تھا۔

عیسائیوں کا یہ عقیدہ تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مصلوب ہو کر جی اٹھنے پر ایمان لانے سے تمام گناہ دفعتاً معاف ہو جاتے ہیں' اس تعلیم نے اعمال کو غیر ضروری چیز ٹھہرا دیا تھا۔ اس کے برخلاف ہندو مذاہب نے خدا کو اتنا بے اختیار ٹھہرایا کہ اعمال بد کے نتائج جن کو کرم کہتے ہیں' خدا چاہے بھی تو معاف نہیں ہو سکتے' اسلام نے آ کر ترازو کے ان دونوں پلوں کو برابر کر دیا' ایک طرف فرمایا' ﴿کُلُّ نَفْسٍ بِمَا کَسَبَتْ رَھِیْنَۃٌ﴾ ہر نفس اپنے عمل کے ہاتھ میں گرو ہے (المدثر) اور دوسری طرف فرمایا ﴿یَغْفِرُ لِمَنْ یَّشَآءُ وَ یُعَذِّبُ مَنْ یَّشَآءُ﴾ خدا جس کو چاہے بخش دے اور جس کو چاہے عذاب دے (المائدہ) یعنی قانوناً ہر انسان اپنے عمل کے نتائج کا یقیناً پابند ہے' مگر خدا تعالیٰ کی قدرت اور رحمت اس قانون کے باوجود جو چاہے کر سکتی ہے جس طرح اس دنیا کا حال ہے کہ اگرچہ خدا کے بنائے ہوئے قانون یہاں جاری ہیں' جن کو آپ قانونِ فطرت کہتے ہیں مگر باایں ہمہ اس کا حکم اور اس کی خواہش

(۱) بحوالہ شفاء العلیل ابن قیم ص ۲۲۲ مصر۔

اور مصلحت ان پر بھی حاکم ہے اور وہ جو چاہے کر سکتا ہے' اس تعلیم نے ایک طرف اعمال کو غیر ضروری ہونے سے بچا لیا' اور دوسری طرف خدا کی قدرتِ تام اور رحمتِ عام کا دروازہ بھی کھلا رکھا۔

عذابِ طویل کا سبب

بعض کم فہم یہ اعتراض کرتے ہیں کہ انسان کا گناہ تو ایک لمحہ کا کام ہے' پھر اس کا عقاب اتنا طویل کیوں رکھا گیا' سال دو سال یا عمر بھر کے گناہ کی سزا صدہا اور ہزار سال کے عقاب سے دینا مناسب نہیں حالانکہ یہ لوگ اگر دنیاوی ہی واقعات پر غور کرتے تو وہ ان کی تسکین کے لیے کافی ہوتے' دنیا کا ہر بڑے سے بڑا قانونی گناہ ایک لمحہ میں انجام پا جاتا ہے' چوری' عمل خلافِ قانون یا کسی کو قتل کرتے کتنی دیر لگتی ہے؟ مگر اس کے معاوضہ میں سالہا سال کی قید ہم خود اپنی انسانی عدالت گاہوں میں تجویز کرتے ہیں' اور اس کو خلافِ عقل نہیں کہتے۔

دوسری صحیح تر مثال یہ ہے کہ انسان کو دیکھو کہ ذرا سی جسمانی بد پرہیزی اور اصولِ صحت کی معمولی سی غلطی کی پاداش میں وہ کبھی ہفتوں' مہینوں' بلکہ سالہا سال بیمار رہتا ہے اور ایک مدتِ دراز میں جا کر کہیں ان چند لمحوں کی غلطی کی تلافی کر پاتا ہے اور کبھی اس معمولی غلطی کی بدولت عمر بھر اس کے روگ میں مبتلا رہتا ہے' اور آخر میں جان دے دیتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ گناہ اور اس کی تلافی کی مدت میں یکسانی نہیں ہوتی' بلکہ ہمیشہ غلطی کی مدت کے مقابلہ میں اس کی تلافی کی مدت صدہا اور ہزارہا گنا زیادہ ہوتی ہے' کیونکہ طبیعت پر جو اثر پڑ جاتا ہے اس کی تلافی کی مدت غلطی کی نوعیت' طبیعت کی صلاحیت' اور خلاقِ عالم کی مصلحت کی بنا پر مختلف ہوتی ہے' اسی لیے عقابِ طویل سے رہائی یا شفایابی کی مدت بھی ہر گنہگار کے لیے یکساں نہیں ہو سکتی۔ ﴿وَ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِحَقِيْقَةِ الْحَالَ﴾

مشرک و کافر کا آخر انجام

اگر یہ صحیح ہے کہ بالآخر ایک دن جہنم کی آگ سرد ہو جائے گی تو کیا اہل کفر و شرک بھی اپنے گناہوں سے پاک ہو کر رحم و کرم کے سزاوار ہو جائیں گے؟ جواب یہ ہے کہ

قرآن پاک میں اس کی تصریح موجودہ ہے کہ شرک و کفر کا گناہ معاف نہ ہوگا یعنی اس کے اُخروی نتائج کی پاداش ضروری ہے' اور یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ شرک و کفر کی جزا دوامِ عذاب اور خلودِ نار ﴿خَالِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا﴾ ہے یعنی جب تک دوزخ قائم ہے' اس سے ان کو نجات نہیں مل سکتی' مگر جب حسبِ مشیتِ الٰہی وہ دن آ جائے کہ دوزخ کی مدتِ حیات ختم ہو جائے تو اس وقت عجب نہیں کہ ان کو بھی اس سے رہائی مل سکے۔

چنانچہ مشرکین و کافرین کے ذکر میں خدا فرماتا ہے:

﴿قَالَ النَّارُ مَثْوٰكُمْ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ﴾ (الانعام: ۱۲۸)

''فرمائے گا۔ دوزخ کی آگ تمہارا ٹھکانا ہے اس میں ہمیشہ رہو گے مگر یہ کہ جو چاہے اللہ بے شک تیرا

پروردگار حکمت وعلم والا ہے۔"

اس آیت کا آخری ٹکڑا خاص طور سے غور کے قابل ہے' فرمایا "تیرا رب حکمت اور علم والا ہے" اس موقع پر خدا کے لیے خاص طور سے رب کا لفظ لانا یہ معنی رکھتا ہے کہ اس کی شانِ ربوبیت اگر چاہے گی' اور اس کے غیر محدود علم وحکمت کا اقتضا ہوگا تو دوزخ کے خاتمہ پر ان کو رہائی مل سکے گی۔

لیکن اس میں شک ہے کہ آیا اس کے بعد بھی وہ جنت میں داخل ہوسکیں گے کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبان سے قرآن پاک میں یہ تصریحِ الٰہی ہے:

﴿اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَ مَاْوٰهُ النَّارُ﴾ (المائدہ:۷۲)

"یہ کہ بے شبہ اللہ کا جو شریک بنائے گا تو اللہ نے اس پر جنت حرام کر دی ہے اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے۔"

نیز ایک اور آیت میں ہے:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ وَ لَا يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِيْ سَمِّ الْخِيَاطِ﴾ (اعراف:۴۰)

"بے شک جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا اور ان کے ماننے سے غرور کیا تو ان کے لیے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے اور وہ جنت میں داخل نہیں ہوں گے تا آنکہ اونٹ سوئی کے ناکہ میں داخل ہو جائے۔"

الغرض خدا کے اعلان کردہ قانونِ جزا کا اقتضا تو یہی ہے کہ گو دوزخ کے عذاب کا خاتمہ ہو جانے پر بھی جنت کے احاطہ میں ان کا گذر نہ ہو' لیکن اللہ تعالیٰ کی رحمت ومغفرت کا دائرہ بہت وسیع ہے جیسا کہ خود اس نے اہلِ دوزخ کی نسبت کہا ہے کہ ﴿اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ﴾ "وہ سدا دوزخ میں رہیں گے لیکن تیرا رب جو چاہے' بے شک تیرا رب جو چاہے کر گزرتا ہے۔"

اس دائرہ کی وسعت کو کون کم کر سکتا ہے کیونکہ اپنی رحمت کی وسعت کی نسبت اس کا اعلان یہ ہے:

﴿رَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ﴾ (اعراف:۱۵۶)

"اور میری رحمت ہر شے کو اپنی گنجایش میں لیے ہے۔"

اس رحمتِ عام کی وسعت سے آسمان وزمین کا کون سا گوشہ محروم ہے؟ اس سے بڑھ کر یہ کہ پیغمبر کے جھٹلانے والوں کی نسبت خدا فرماتا ہے:

﴿فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ رَّبُّكُمْ ذُوْ رَحْمَةٍ وَّاسِعَةٍ وَّ لَا يُرَدُّ بَاْسُهٗ عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ﴾ (انعام:۱۴۷)

"تو (اے پیغمبر!) اگر وہ تجھے جھٹلائیں تو کہہ دے کہ تمہارا پروردگار وسیع رحمت والا ہے اور اس کا عذاب

گنہگاروں سے لوٹایا نہیں جا سکتا۔''

یعنی کسی دوسرے میں یہ طاقت نہیں کہ اس کے بھیجے ہوئے عذاب کو گنہگاروں کے سر سے ٹال دے لیکن خود اس کی رحمت بڑی وسیع ہے' وہ چاہے تو ان کو دنیا ہی میں ہدایت دے کر جنت نصیب کرے' یا آخرت میں عذاب دینے کے بعد درگذر کر دے' اور اس کی اصل رحمت کا محل وہی ہے' جہاں کسی دوسری رحمت کا وجود نہ ہوگا' فرمایا:

﴿مَنْ يُّصْرَفْ عَنْهُ يَوْمَئِذٍ فَقَدْ رَحِمَهٗ﴾ (انعام:۱۶)

''جس سے اس دن عذاب ہٹایا گیا تو خدا نے اس پر رحم کیا۔''

صحیح بخاری و مسلم و ترمذی میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اگر مؤمن کو معلوم ہو کہ خدا کے پاس کتنا عقاب ہے تو وہ جنت سے مایوس ہو جائے' اور اگر کافر کو یہ معلوم ہو کہ اس کی رحمت کتنی وسیع ہے تو وہ بھی جنت سے ناامید نہ ہو۔

مصلح الدین سعدی شیرازی نے غالباً اسی حقیقت کو اپنے ان دو شعروں میں ادا کیا ہے۔

به تهدید اگر برکشد تیغِ حکم
بمانندِ کروبیاں صم و بکم
وگر دردہد' یک صلائے کرم
عزازیل گوید نصیبے برم

خود اس رحمان و رحیم کا جس کی بادشاہی آسمان و زمین کو محیط ہے' یہ ارشاد ہے کہ وہ جو چاہے کر سکتا ہے۔

﴿يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ وَ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا بَيْنَهُمَا وَ اِلَيْهِ الْمَصِيْرُ﴾ (مائدہ:۱۸)

''جس کو چاہتا ہے بخش دیتا ہے اور جس کو چاہے عذاب دیتا ہے اور آسمانوں کی اور زمین کی اور ان کے بیچ کی بادشاہی اللہ کے لیے ہے' اور اس کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔''

لیکن اس کی یہ مشیت جیسا کہ اس نے (انعام:۱۲۸) میں فرمایا ہے' اس کی وسیع حکمت و مصلحت پر مبنی ہے وہ جو چاہے کر سکتا ہے' مگر کرتا وہی ہے جو اس کی مصلحت و حکمت کا تقاضا ہوتا ہے۔

اس سے زیادہ اس بات میں کچھ اور کہنا حد سے آگے بڑھنا ہے کہ جس کی تصریح خود خدائے تعالیٰ نے فرمائی اس کی تصریح کا حق کسی کو کیا ہے' اس لیے مشرک و کافر کے آخر انجام کے سوال کا جواب صرف مشیتِ الٰہی ہے' جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا ہے:

﴿اَلنَّارُ مَثْوٰىكُمْ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ﴾ (انعام:۱۲۸)

''دوزخ تمہارا ٹھکانا ہے اس میں سدا رہو گے' لیکن جو چاہے اللہ بے شک تیرا پروردگار حکمت والا' اور علم والا ہے۔''

جمہور کا مسلک

یہ جو کچھ کہا گیا وہ اس جماعت کا خیال ہے جو اللہ تعالیٰ کی رحمتِ عمومی کی معتقد ہے' جمہور کا مسلک اس سے کچھ مختلف ہے اس کے نزدیک بہشت کی طرح دوزخ بھی ہمیشہ باقی رہے گا' اور ان لوگوں کو جو شرک و کفر کے مرتکب ہوں گے کبھی دوزخ سے نجات نہیں ملے گی۔

اس عقیدہ کے مطابق گنہگاروں کی دو قسمیں ہیں' ایک وہ جو گنہگار تھے مگر دل میں ایمان رکھتے تھے ایسے لوگ عذاب کے بغیر ہی یا عذاب کے بعد اللہ تعالیٰ کے عفو و کرم سے سرفراز ہو کر بالآخر جنت میں داخل ہوں گے' دوسرے وہ جو ہمیشہ شرک و کفر میں مبتلا رہے اور اس سے توبہ کئے اور ایمان لائے بغیر مر گئے' ایسے لوگوں کی بخشائش کبھی نہ ہو گی اور وہ ہمیشہ کے لیے جہنم میں داخل کر دیے جائیں گے ان کی گنہگاری اس درجہ ہو گی کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کو اپنی طرف کسی طرح جذب نہ کر سکیں گے یہ وہ زمینِ شور ہوں گے جس میں اس رحمتِ عام کی بارش بھی کوئی روئیدگی پیدا نہ کر سکے گی۔

رحمتِ عمومی کے معتقدین گزشتہ آیتوں سے جو معنی نکالتے ہیں' وہ جمہور کے نزدیک صحیح نہیں' وہ ان کے بیان کردہ مطالب کو تاویلات کا درجہ دیتے اور اس کی پیش کردہ روایات کو صحت اور قوت سے خالی جانتے اور قرآن مجید کی حسبِ ذیل آیتوں سے اپنے دعویٰ پر استدلال کرتے ہیں۔

(۱) ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَعَنَ الْكَافِرِيْنَ وَ اَعَدَّلَهُمْ سَعِيْرًا○ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا﴾ (احزاب:۶۴'۶۵)

''بے شک خدا نے کافروں پر لعنت کی اور ان کے لیے وہ آگ مہیا کی جس میں وہ ہمیشہ سدا پڑے رہیں۔''

(۲) ﴿وَ مَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ فَاِنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا﴾ (جن:۲۳)

''اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا' تو اس کے لیے جہنم کی آگ ہے' وہ اس میں ہمیشہ سدا پڑے رہیں۔''

(۳) ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ ظَلَمُوْا لَمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَلَهُمْ وَ لَا لِيَهْدِيَهُمْ طَرِيْقًا○ اِلَّا طَرِيْقَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا﴾ (نساء:۱۶۸'۱۶۹)

''بے شک جنہوں نے کفر کیا اور حد سے آگے بڑھے' نہیں ہے کہ اللہ ان کو بخشے اور نہ یہ کہ ان کو راہ دکھائے لیکن جہنم کی راہ اس میں وہ ہمیشہ سدا پڑے رہیں۔''

ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ ان پر ہمیشہ عذاب ہو گا تو عذاب کی جگہ یعنی دوزخ بھی ہمیشہ قائم رہے گی۔

ان آیتوں کے علاوہ اور بھی دوسری آیتیں ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دوزخ کا عذاب کفار سے کبھی دور نہ ہو گا۔

(۱) ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَوْ اَنَّ لَھُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا وَّ مِثْلَہٗ مَعَہٗ لِیَفْتَدُوْا بِہٖ مِنْ عَذَابِ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ مَا تُقُبِّلَ مِنْھُمْ وَ لَھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ○ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّخْرُجُوْا مِنَ النَّارِ وَ مَا ھُمْ بِخَارِجِیْنَ مِنْھَا وَ لَھُمْ عَذَابٌ مُّقِیْمٌ○﴾ (مائدہ:۳۶،۳۷)

''بے شک جن لوگوں نے کفر کیا' اگر بالفرض ان کے پاس ساری دنیا کا خزانہ ہو' اور اتنا ہی اس کے ساتھ اور تا کہ وہ اس کو فدیہ دے کر قیامت کے دن کے عذاب سے چھٹ جائیں' تو ان سے یہ فدیہ قبول نہ کیا جائے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے' چاہیں گے کہ دوزخ سے نکل جائیں' اور وہ اس سے نہیں نکل سکیں گے' اور ان کے لئے قائم رہنے والا عذاب ہے۔''

(۲) ﴿وَ مَا ھُمْ بِخٰرِجِیْنَ مِنَ النَّارِ﴾ (بقرہ:۱۶۷)

''وہ دوزخ سے نکل نہیں سکیں گے۔''

قیامت کے منکروں کی نسبت فرمایا:

(۳) ﴿فَالْیَوْمَ لَا یَخْرُجُوْنَ مِنْھَا وَ لَا ھُمْ یُسْتَعْتَبُوْنَ﴾ (جاثیہ:۳۵)

''تو آج اس (دوزخ) سے وہ نہیں نکالے جائیں گے۔ اور نہ ان کا عذر سنا جائے گا۔''

(۴) ﴿اَلَآ اِنَّ الظّٰلِمِیْنَ فِیْ عَذَابٍ مُّقِیْمٌ﴾ (شوریٰ:۴۵)

''ہاں کافر و مشرک قائم رہنے والے عذاب میں ہوں گے۔''

ظلم کا اطلاق قرآن مجید میں شرک پر کیا گیا ہے' اس سے معلوم ہوا کہ اہلِ شرک کا عذاب قائم رہے گا۔

(۵) ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَ مَا تُوْا وَھُمْ کُفَّارٌ اُولٰٓئِکَ عَلَیْھِمْ لَعْنَۃُ اللّٰہِ وَ الْمَلٰٓئِکَۃِ وَ النَّاسِ اَجْمَعِیْنَ ○ خٰلِدِیْنَ فِیْھَا لَا یُخَفَّفُ عَنْھُمُ الْعَذَابُ وَ لَا ھُمْ یُنْظَرُوْنَ○﴾ (بقرہ:۱۶۲)

''بے شک جنہوں نے کفر کیا' اور اسی کفر کی حالت میں مر گئے' ان پر اللہ کی' فرشتوں کی اور آدمیوں کی سب کی لعنت ہے اس میں وہ سدا رہیں گے ان کے عذاب میں کمی نہیں کی جائے گی اور نہ ان کو مہلت دی جائے گی۔''

(۶) ﴿وَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَھُمْ نَارُ جَھَنَّمَ لَا یُقْضٰی عَلَیْھِمْ فَیَمُوْتُوْا وَ لَا یُخَفَّفُ عَنْھُمْ مِنْ عَذَابِھَا﴾ (فاطر:۳۶)

''اور ان کے لیے جنہوں نے کفر کیا جہنم کی آگ ہے نہ تو ان کا فیصلہ کیا جائے گا کہ وہ مر جائیں اور نہ سزا میں کچھ کمی کی جائے گی۔''

شرک و کفر والوں کی مغفرت کسی حال میں نہ ہوگی' فرمایا:

(۷) ﴿اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ﴾ (نساء:۴۸)

''بے شک اللہ اس کو معاف نہ کرے گا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے۔''

(۸) ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَ صَدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ثُمَّ مَاتُوْا وَھُمْ کُفَّارٌ فَلَنْ یَّغْفِرَ اللّٰہُ لَھُمْ﴾۔(محمد:۳۴)

''بے شبہ جنہوں نے کفر کیا' اور خدا کے راستہ سے روکا اور اسی کفر کی حالت میں وہ مر گئے تو ان کو ہرگز معاف نہ کیا جائے گا۔''

ان کے لیے جنت کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند ہے۔

(۹) ﴿اِنَّہٗ مَنْ یُّشْرِکْ بِاللّٰہِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰہُ عَلَیْہِ الْجَنَّۃَ وَ مَاْوٰہُ النَّارُ﴾ (المائدۃ:۷۲)

''یقیناً جو خدا کے ساتھ شرک کرے گا تو اللہ نے اس پر جنت حرام کر دی' اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے۔''

(۱۰) ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا وَاسْتَکْبَرُوْا عَنْھَا لَا تُفَتَّحُ لَھُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ وَ لَا یَدْخُلُوْنَ الْجَنَّۃَ حَتّٰی یَلِجَ الْجَمَلُ فِیْ سَمِّ الْخِیَاطِ﴾ (اعراف:۴۰)

''بے شک جنہوں نے ہمارے حکموں کو جھٹلایا اور ان کے ماننے سے سرکشی کی ان کے لیے آسمان کے دروازے کھولے نہ جائیں گے اور نہ جنت میں وہ داخل ہوں گے تا آنکہ اونٹ سوئی کے ناکہ میں گھس جائے۔''

(۱۱) ﴿وَ لَا یَحْزُنْکَ الَّذِیْنَ یُسَارِعُوْنَ فِی الْکُفْرِ اِنَّھُمْ لَنْ یَّضُرُّوا اللّٰہَ شَیْئًا یُرِیْدُ اللّٰہُ اَلَّا یَجْعَلَ لَھُمْ حَظًّا فِی الْاٰخِرَۃِ وَ لَھُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ﴾ (ال عمران:۱۷۶)

''اور (اے پیغمبر!) تجھے وہ لوگ جو کفر میں جلدی کرتے ہیں' غم میں نہ ڈالیں' وہ ہرگز خدا کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے' خدا چاہتا ہے کہ ان کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہ بنائے اور ان کے لیے بڑا عذاب ہے۔''

اس قسم کی اور بھی بہت سی آیتیں ہیں' جن سے ثابت ہوتا ہے کہ جو لوگ مرتے دم تک شرک و کفر میں مبتلا رہے اور توبہ نہیں کی' ان کا گناہ بخشا نہ جائے گا' اور وہ جنت میں کبھی داخل نہ ہو سکیں گے' بلکہ ہمیشہ دوزخ کے عذاب میں پڑے رہیں گے' جہاں نہ ان کے عذاب میں کبھی تخفیف ہو گی اور نہ ان کو موت آئے گی۔

تصویر کے دونوں رخ آپ کے سامنے آ گئے

بیا کیں داوریہارا بہ پیشِ داور اندازیم

بہشت و دوزخ کی جزا و سزا بھی تمثیلی ہے

اوپر عالمِ برزخ کے ذکر میں ہم بہ تفصیل بتا چکے ہیں کہ آخرت میں جزاء و سزا تمام تمثیلی ہو گی۔ اس تمثیلی کے دو معنی ہیں' ایک یہ کہ جیسا عمل ہو گا اسی کے مناسب و مشابہ اس کی جزا یا سزا ہو گی' مثلاً قرآن میں ہے کہ جو زکوٰۃ یعنی اپنے مال کا میل کچیل مستحقین کو کھانے کے لیے نہ دے گا تو اس کو دوزخ میں زخموں کا دھوون کھانے کو ملے گا' یا یہ کہ جو خدا کی راہ میں اپنی جان دے گا مرنے کے بعد اس کو جانِ تازہ اور حیاتِ نو بخشی جائے گی' وہ دولت مند جس کو

دھوپ کی تپش سے بچنے کے لیے قصر و محل اور پینے کے لیے ٹھنڈے سے ٹھنڈا پانی اور عزت کی جگہ عنایت کی گئی تھی' اگر اس نے دنیا میں ان نعمتوں کے ملنے کا حق اس دنیا میں ادا نہ کیا' تو دوسری دنیا میں اس کو یہ سامان نہیں ملے گا۔

﴿فِیْ سَمُوْمٍ وَّ حَمِیْمٍ○ وَّ ظِلٍّ مِّنْ یَّحْمُوْمٍ○ لَّا بَارِدٍ وَّ لَا کَرِیْمٍ○ اِنَّھُمْ کَانُوْا قَبْلَ ذٰلِکَ مُتْرَفِیْنَ﴾ (واقعۃ:۴۲'۴۵)

''وہ لو اور کھولتے پانی میں دھوئیں کے سایہ میں' نہ ٹھنڈ' نہ باعزت بے شک وہ پہلے ناز و نعمت میں تھے۔''

رؤیائے برزخ کی حدیث میں ہے کہ آپ نے کچھ ایسے لوگوں کو دیکھا جن کا آدھا دھڑ خوب صورت اور آدھا بدصورت تھا یہ وہ تھے جن کے کچھ کام اچھے اور کچھ برے تھے اس لیے بداعمالی بدصورتی اور نیکی خوب صورتی کے رنگ میں نمایاں ہوئی۔ صریح طور سے یہ اصول ان حدیثوں سے مستنبط ہوتا ہے:

(۱) حضرت ابوسعیدؓ خدری سے روایت ہے کہ جو مومن خود بھوکا رہ کر کسی دوسرے بھوکے مومن کو کھلائے گا تو خدا اس کو جنت کے پھل کھلائے گا اور جو پیاسا ہو کر کسی دوسرے پیاسے کو پلائے گا تو خدا اس کو جنت میں شرابِ طہور پلائے گا اور جو کوئی کپڑوں کا حاجت مند ہو کر ننگے کو پہنائے گا تو خدا اس کو جنت کے سبز جوڑے پہنائے گا (ترمذی کتاب الزہد والرقاق ص ۴۰۴)

(۲) حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''جو کوئی کسی مسلمان کی دنیاوی تکلیفوں میں سے کسی تکلیف کو دور کرے گا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی تکلیف دور فرمائے گا اور جو کوئی کسی نادار کو یہاں کسی مصیبت میں پھنسائے گا تو اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت میں اس کو مصیبت میں مبتلا فرمائے گا اور جو کسی مسلمان کی ستر پوشی کرے گا' تو خدا دنیا و آخرت میں اس کی ستر پوشی کرے گا اور جو کوئی اپنے بھائی کی مدد میں جب تک رہے گا' خدا اس وقت تک اس کی مدد میں رہے گا (ترمذی ص ۳۲۳)

(۳) جو انسانوں پر رحم کرے گا خدا اس پر رحم فرمائے گا۔'' (ترمذی)

تمثیل کے دوسرے معنی یہ ہیں' کہ جو امور معنوی اور غیر مجسم ہیں' وہ اپنی مثالی شکل و صورت میں ظاہر ہوں گے مثلاً۔

(۱) قرآن میں ہے کہ ''جو اس دنیا میں حقیقت بینی سے اندھا ہوگا' وہ آخرت میں بھی اندھا ہوگا دیکھو کہ دنیا کی معنوی قلبی نابینائی دوسرے عالم میں ظاہری جسمانی نابینائی کی شکل میں ظاہر ہوگی۔

(۲) حدیث میں ہے کہ ''اہل تکبر قیامت کے دن چیونٹیاں بنا کر اٹھائے جائیں گے' جن پر ہر طرف سے ذلت و خواری چھائی پھرے گی۔ [1] دیکھو کہ تکبر کی جزا ذلت و خواری سے ملے گی' اور چیونٹیوں سے زیادہ حقیر و ذلیل کوئی ہستی نہیں اس لیے ان کی بڑائی اور تکبر کا معاوضہ ہوگا کہ چیونٹی بن کر اٹھیں۔

---

(۱) ترمذی کتاب الزہد والرقاق۔

(۳) اسی طرح آپؐ نے فرمایا کہ جو بخل کرے گا' قیامت میں اس کا مال سانپ بن کر اس کو ڈسے گا'(۱) صفت بخل اس کے حق میں اسی سانپ کی صورت اختیار کر کے اس کی تکلیف کا باعث ہوگی آنحضرت ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ ''جو شخص بلاوجہ بھیک مانگ کر اپنی آبروریزی کرتا ہے' قیامت میں وہ اٹھے گا تو اس کے منہ پر گوشت نہ ہوگا' دیکھو کہ دنیاوی بے شرمی و بے حیائی بے گوشت چہرہ کی صورت میں ظاہر ہوگی اسی طرح یہ بھی فرمایا کہ دو بیبیوں کا وہ شوہر جو ایک کا حق ادا کرتا اور دوسری سے غفلت برتتا تھا' قیامت میں اس طرح آئے گا کہ اس کا ایک پہلو (گویا) مفلوج ہو کر جھک گیا ہوگا۔(۲) ایک بیوی کا عدمِ ادائیگیِ حق اپنی تمثیلی صورت میں ایک پہلو کی مفلوجی کیفیت میں نمودار ہوگا' یہ چند حوالے ذکر کیے گئے ہیں' ان ہی پر جزاء وسزا کے اور دوسرے جزئیات کو قیاس کرنا چاہیے۔ اس مسئلہ کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے حسب ذیل آیتوں پر غور کرنا چاہیے۔

﴿وَ مَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِیْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِیْشَةً ضَنْكًا وَّ نَحْشُرُهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اَعْمٰى ○ قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِیْۤ اَعْمٰى وَ قَدْ كُنْتُ بَصِیْرًا ○ قَالَ كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰیٰتُنَا فَنَسِیْتَهَا وَ كَذٰلِكَ الْیَوْمَ تُنْسٰى ○﴾ (طٰہٰ:۱۲۴-۱۲۶)

''جس نے میری یاد سے منہ پھیرا تو اس کو تنگ گذران ملتی ہے اور قیامت کے دن ہم اس کو اندھا اٹھائیں گے وہ کہے گا اے میرے پروردگار! تو نے مجھے اندھا کیوں اٹھایا میں تو دیکھتا تھا۔ فرمائے گا' اسی طرح میری آیتیں تیرے پاس آئیں تو تو نے ان کو بھلا دیا ایسے ہی آج تو بھلایا جائے گا۔''

دیکھو کہ دل کی نابینائی' قیامت میں ظاہری نابینائی اور یہاں خدا کو بھولنا اور اس کے احکام کو یاد نہ کرنا' وہاں رحمتِ الٰہی کی یاد سے بھول کی شکل میں نمودار ہوگا۔

دوزخ کی جسمانی سزائیں

دوزخ میں جسمانی اور روحانی دونوں سزائیں ملیں گی' قرآن پاک میں جن جسمانی سزاؤں کا ذکر ہے' وہ حسب ذیل ہیں۔

(۱) آتشِ دوزخ اور اس کی سوزش کا ذکر بار بار آیا ہے' بلکہ اَلنَّارُ یعنی آگ گویا دوزخ کا دوسرا نام ہے۔ ان ہی معنوں میں ﴿اَلسَّعِیْرُ﴾ یعنی جلتی آگ بھی بارہا مستعمل ہوا ہے' اور ﴿عَذَابَ الْحَرِیْقِ﴾ (جلن کا عذاب) بھی دو چار جگہ کہا گیا ہے' اور ایک جگہ یہ بھی ہے کہ:

﴿تَلْفَحُ وُجُوْهَهُمُ النَّارُ وَ هُمْ فِیْهَا كٰلِحُوْنَ﴾ (مؤمنون:۱۰۴)

''ان کے چہروں کو دوزخ کی آگ جھلس دے گی اور ان کی صورتیں اس میں بگڑ جائیں گی۔''

---

(۱) صحیح بخاری کے الفاظ یہ ہیں مثل لہ مالہ شجاعا اقرع۔

(۲) ترمذی۔

دوزخ کا ایک اور نام سقر ہے، جس کے متعلق یہ ہے کہ:

﴿وَ مَآ اَدْرٰکَ مَا سَقَرُ ○ لَا تُبْقِیْ وَلَا تَذَرُ ○ لَوَّاحَةٌ لِّلْبَشَرُ ○﴾ (مدثر:۲۷،۲۹)

''اور تمہیں کیا معلوم سقر کیا ہے، نہ وہ رحم کھائے گی، نہ چھوڑے گی چہروں کو جھلس دینے والی۔''

﴿کَلَّآ اِنَّهَا لَظٰی ○ نَزَّاعَةً لِّلشَّوٰی ○﴾ (معارج:۱۵،۱۶)

''ہرگز نہیں وہ شعلہ والی آگ ہے منہ کی کھال ادھیڑنے والی۔''

﴿اِنَّهَا تَرْمِیْ بِشَرَرٍ کَالْقَصْرِ ○ کَاَنَّهٗ جِمٰلَتٌ صُفْرٌ ○﴾ (مرسلات:۳۲،۳۳)

''دوزخ محل کے برابر اونچی چنگاریاں اتنی بڑی پھینکے گی جیسے زرد رنگ کے اونٹ۔''

(۲) وہاں سایہ نہ ہوگا بلکہ یہ حکم ہوگا:

﴿اِنْطَلِقُوْٓا اِلٰی ظِلٍّ ذِیْ ثَلٰثِ شُعَبٍ ○ لَّا ظَلِیْلٍ وَّ لَا یُغْنِیْ مِنَ اللَّهَبِ﴾ (مرسلات: ۳۰،۳۱)

''چلو ایک چھاؤں کی طرف جس کی تین پھانکیں ہوں گی، نہ گھن کی چھاؤں اور نہ تپش میں کام آسکے۔''

(۳) وہاں ٹھنڈک نہ ہوگی:

﴿لَا یَذُوْقُوْنَ فِیْهَا بَرْدًا وَّ لَا شَرَابًا﴾ (النباء:۲۴)

''اس میں وہ نہ ٹھنڈک کا مزہ چکھیں گے اور نہ کسی پینے کی چیز کا۔''

(۴) دوزخ میں نہ موت آئے گی کہ چین آجائے، اور نہ ایسی زندگی ہی ہوگی جس میں کوئی مسرت ہو، دو جگہ فرمایا۔

﴿لَا یَمُوْتُ فِیْهَا وَ لَا یَحْیٰی﴾ (طٰہٰ:الاعلیٰ)

''وہاں وہ نہ مرے گا نہ جیے گا۔''

(۵) پینے کو گرم پانی ملے گا، جس سے آنتیں نکل پڑیں گی۔

﴿وَ سُقُوْا مَآءً حَمِیْمًا فَقَطَّعَ اَمْعَآءَهُمْ﴾ (محمد:۱۵)

''اور وہ گرم پانی پلائے جائیں گے تو وہ پانی ان کی آنتوں کو ٹکڑے کر دے گا۔''

(۶) اور پیپ پئیں گے۔

﴿اِلَّا حَمِیْمًا وَّ غَسَّاقًا﴾ (النباء:۲۵)

''لیکن کھولتا پانی اور پیپ۔''

(۷) ان کے اوپر سے گرم پانی چھوڑا جائے گا۔

﴿یُصَبُّ مِنْ فَوْقِ رُءُوْسِهِمُ الْحَمِیْمُ﴾ (الحج:۱۹)

''ان کے سروں کے اوپر گرم پانی ڈالا جائے گا۔''

(۸) کھانے کو سینڈھے کا پھل ملے گا۔

﴿اَمْ شَجَرَةُ الزَّقُّوْمِ○ اِنَّهَا شَجَرَةٌ تَخْرُجُ فِیْٓ اَصْلِ الْجَحِیْمِ○ طَلْعُهَا كَاَنَّهٗ رُءُوْسُ الشَّیٰطِیْنِ○ فَاِنَّهُمْ لَاٰكِلُوْنَ مِنْهَا فَمَالِـُٔوْنَ مِنْهَا الْبُطُوْنَ○ ثُمَّ اِنَّ لَهُمْ عَلَیْهَا لَشَوْبًا مِّنْ حَمِیْمٍ○﴾ (الصفت:۶۲و۶۴۔۶۷)

''یا سینڈھے کا پھل ۔۔۔۔۔۔۔ وہ ایک درخت ہے دوزخ کی جڑ میں اس کے شگوفے جیسے شیطانوں کے سر' تو وہ کھائیں گے اور اس سے پیٹ بھریں گے' پھر اس پر گرم پانی کی ملونی ہوگی۔''

﴿اِنَّ شَجَرَةَ الزَّقُّوْمِ○ طَعَامُ الْاَثِیْمِ○ كَالْمُهْلِ یَغْلِیْ فِی الْبُطُوْنِ○ كَغَلْیِ الْحَمِیْمِ○﴾ (دخان:۴۳۔۴۶)

''سینڈھے کا درخت گنہگار کی غذا ہے' جیسے پگھلا ہوا تانبا وہ پیٹوں میں کھولتا ہے جیسے کھولتا پانی۔''

(۹) خاردار جھاڑی کی خوراک ہوگی' جس سے بدن کو کوئی فائدہ نہ ہوگا۔

﴿لَیْسَ لَهُمْ طَعَامٌ اِلَّا مِنْ ضَرِیْعٍ○ لَّا یُسْمِنُ وَ لَا یُغْنِیْ مِنْ جُوْعٍ○﴾ (الغاشیۃ:۶'۷)

''اور ان کے لیے کوئی کھانا نہ ہوگا' لیکن خاردار جھاڑی جو نہ موٹا کرے گی' اور نہ بھوک سے بے پروا کرے گی۔''

(۱۰) زخموں کے دھودن کی خوراک ملے گی۔

﴿وَ لَا طَعَامٌ اِلَّا مِنْ غِسْلِیْنَ﴾ (حاقہ:۳۶)

''اور نہ کوئی کھانا مگر زخموں کا دھوون۔''

(۱۱) کھانا نگلا نہ جائے گا۔

﴿وَ طَعَامًا ذَا غُصَّةٍ﴾ (مزمل:۱۳)

''اور گلے میں اٹکنے والا کھانا۔''

(۱۲) آگ کے کپڑوں کا لباس ہوگا۔

﴿فَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا قُطِّعَتْ لَهُمْ ثِیَابٌ مِّنْ نَّارٍ﴾ (حج:۲)

''کافروں کے لیے آگ کے کپڑے قطع ہوں گے۔''

(۱۳) لوہے کے ہتھوڑے پڑیں گے۔

﴿وَ لَهُمْ مَّقَامِعُ مِنْ حَدِیْدٍ﴾ (حج:۲۱)

''اور ان کے لیے لوہے کہ ہتھوڑے ہیں۔''

(۱۴) گلے میں طوق اور زنجیریں۔

﴿اِذِ الْاَغْلٰلُ فِیْٓ اَعْنَاقِهِمْ وَ السَّلٰسِلُ یُسْحَبُوْنَ﴾ (مؤمن:۷۱)

''جب ان کی گردنوں میں طوق اور زنجیریں ہوں گی وہ کھینچے جائیں گے۔''

﴿اِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ سَلٰسِلَا وَ اَغْلَالًا وَّ سَعِيْرًا﴾ (الدہر:۴)

''ہم (خدا) نے کافروں کے لیے زنجیریں اور طوق اور آگ تیار رکھی ہے۔''

﴿مُقَرَّنِيْنَ فِي الْاَصْفَادِ﴾ (ابراہیم:۴۹)

''وہ زنجیروں میں جکڑے ہوئے۔''

دوزخ میں روحانی سزائیں

ان جسمانی سزاؤں کے ساتھ روحانی سزائیں بھی ہوں گی جو اہلِ نظر کی نگاہوں میں ان سے بھی بڑھ کر ہیں' چنانچہ دوزخ کی وہ آگ جس کی گرمی اور سوزش کا حال اوپر گزر چکا وہ دل کو جھانکے گی' فرمایا:

﴿نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ ۝ الَّتِيْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْئِدَةِ ۝﴾ (ہمزہ:۶-۷)

''سلگائی ہوئی اللہ کی آگ جو دلوں کو جھانکے گی۔''

﴿وَ اَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ﴾ (یونس:۵۴)

''اور جب عذاب کو دیکھیں گے تو اپنی پشیمانی کو چھپائیں گے۔''

﴿يٰحَسْرَتٰى عَلٰى مَا فَرَّطْتُّ فِيْ جَنْۢبِ اللّٰهِ﴾ (زمر:۵۶)

''اے حسرت اس پر کہ میں نے خدا کے پہلو میں کمی کی۔''

﴿كُلَّمَآ اَرَادُوْٓا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا مِنْ غَمٍّ﴾ (حج:۲۲)

''وہ جب دوزخ سے غم کی وجہ سے نکلنا چاہیں۔''

ذلت کا عذاب:

﴿فَالْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ﴾ (احقاف:۲۰)

''تو آج ذلت کے عذاب کا بدلہ دیے جاؤ گے۔''

اس افسوس و حسرت و ندامت سے بڑھ کر یہ کہ ان کو معذرت پیش کرنے کی بھی اجازت نہ ہوگی۔

﴿لَا تَعْتَذِرُوا الْيَوْمَ﴾ (تحریم:۷)

''آج معذرت نہ پیش کرو۔''

اللہ عزوجل سے مکالمہ کا شرف ان کو نہ ملے گا' جب وہ بات کرنا چاہیں گے تو وہ فرمائے گا:

﴿اِخْسَئُوْا فِيْهَا وَ لَا تُكَلِّمُوْنِ﴾ (مؤمنون:۱۰۸)

''ذلیل ہو اس دوزخ میں اور مجھ سے بات نہ کرو۔''

سب سے بڑھ کر یہ کہ اللہ تعالیٰ کے جلوہ سے محروم رہیں گے۔

﴿كَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ﴾ (المطففین:۱۵)

''ہرگز نہیں وہ اس دن اپنے رب سے پردہ میں ہوں گے۔''

ان میں سے جنہوں نے اس دنیا میں اپنے پروردگار کو بھلا دیا تھا' اس دن وہ بھی ان کو اپنی رحمت وشفقت کی یاد سے بھلا دے گا فرمایا۔

﴿كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيْتَهَا وَ كَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسٰى﴾ (طٰہٰ:۱۲۶)

''اسی طرح ہماری آیتیں تیرے پاس آئیں تو تو نے ان کو بھلا دیا' ایسے ہی آج تو بھی بھلایا جائے گا۔''

ایسے دوزخی بھی ہوں گے جو اللہ تعالیٰ کی نگاہِ کرم سے بھی محروم رہیں گے' وہ ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھے گا' نہ ان سے کچھ بات کرے گا' اور نہ ان کی اصلاحِ حال کی کوئی فکر کرے گا' یہ حقیقت میں شفیق ومہربان رب کی انتہائی ناراضی کی تصویر ہے' اس درد کے احساس کو وہی کچھ سمجھ سکتے ہیں جو عشق ومحبت کے زخم خوردہ ہیں' فرمایا:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَ اَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا اُولٰٓئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ وَ لَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَ لَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَ لَا يُزَكِّيْهِمْ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ﴾ (آل عمران:۷۷)

''جو لوگ اللہ کے عہد اور اپنی (جھوٹی) قسموں کے ذریعہ سے تھوڑی سی دولت خریدا کرتے ہیں آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہیں' نہ قیامت میں خدا ان سے بات کرے گا' نہ ان کی طرف دیکھے گا' نہ ان کو سنوارے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔''

جنت

جنت کے نام

اس مقام کا نام جو نیکو کار انسانوں کا دائمی گھر ہوگا' قرآن پاک میں عموماً ﴿اَلْجَنَّةُ﴾ (باغ) بتایا گیا ہے اور کبھی کبھی اس کو مناسب اضافتوں کے ساتھ بھی ادا کیا گیا' مثلاً ﴿جَنَّةُ النَّعِيْمِ﴾ (نعمت کا باغ) ﴿جَنَّةُ الْخُلْدِ﴾ (بقائے دوام کا باغ) ﴿جَنّٰتُ عَدْنٍ﴾ (دائمی سکونت کے باغ) ﴿جَنَّةُ الْمَاْوٰى﴾ (پناہ کا باغ) ان کے علاوہ اور دوسرے لفظوں سے بھی اس کی تعبیر کی گئی ہے ﴿فِرْدَوْسِ﴾ (باغ) ﴿رَوْضَةٌ﴾ (چمن) ﴿دَارُ الْخُلْدِ﴾ (ہمیشگی کا گھر) ﴿دَارُ الْمَقَامَةِ﴾ (قیام کا گھر) ﴿دَارُ السَّلَام﴾ (امن وسلامتی کا گھر)

جنت کا دوام

اس موجودہ دنیا میں بھی گو لذتیں اور مسرتیں ہیں مگر جو چیز یہاں نہیں' وہ بقائے دوام ہے۔ یہاں کی ہر لذت عارضی اور ہر مسرت آنی جانی ہے' یہاں خوشی کا کوئی ایسا ترانہ نہیں' جس کے بعد غم و ماتم کا نالہ نہ ہو' یہاں ہر پھول کے ساتھ کانٹے' ہر روشنی کے ساتھ تاریکی' ہر وجود کے ساتھ فنا' ہر سیری کے بعد بھوک' ہر سیرابی کے بعد پیاس اور ہر غنا کے بعد محتاجی ہے۔ انسان ہزاروں مشکلیں اٹھانے اور ہزاروں صدمے سہنے کے بعد ایک مسرت کا پیام سنتا اور خوشی کا منظر دیکھتا ہے' مگر ابھی اس سے سیر ہونے کی بھی نوبت نہیں آتی کہ اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے' غرض اس موجودہ عالمِ فانی کی ہر شے آنی جانی ہے اور یہی یہاں کی سب سے بڑی کمی ہے۔

لیکن جنت اس مملکت کا نام ہے' جہاں کی لذتیں جاودانی اور جہاں کی مسرتیں غیر فانی ہیں' جہاں حیات ہے مگر موت نہیں' راحت ہے مگر تکلیف نہیں لذت ہے' مگر الم نہیں' مسرت ہے' مگر غم نہیں' جہاں وہ سکون ہے جس کے ساتھ اضطراب نہیں' اور وہ شادمانی ہے جس کے بعد حزن واندوہ نہیں' شیطان نے حضرت آدمؑ کے سامنے جنت کا جو نقشہ کھینچا تھا وہ بالکل صحیح تھا' اس نے کہا اے آدمؑ

﴿هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَ مُلْكٍ لَّا يَبْلٰى﴾ (طٰهٰ: ۱۲۰)

''کیا میں تجھے سدا جینے کا درخت اور وہ بادشاہی بتاؤں جس کو فنا نہیں۔''

مگر جنت کا یہ وصف سنا کر ان کو جدھر کا راستہ بتایا' وہ موت کے درخت اور فنا کے ملک کی طرف کا تھا' اور یہی وہ فریب تھا جس میں آدم گرفتار ہوئے' چنانچہ اسی جنتی زندگی کی تلاش میں وہ چیز کھالی' جو ان کے حق میں زہر تھی' یعنی گناہ کا پھل' نتیجہ یہ ہوا کہ جنۃ الخلد اور غیر فانی ملک کا استحقاق ان کے اور ان کی نسل کے اعمالِ صالحہ کا صلہ قرار

پایا چنانچہ فرمایا:

﴿اَمْ جَنَّةُ الْخُلْدِ الَّتِیْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ وَ كَانَتْ لَهُمْ جَزَآءً وَّ مَصِیْرًا﴾ (فرقان:۱۵)

''یا ہمیشگی کا باغ جس کا وعدہ پرہیزگاروں سے کیا گیا جو ان کا صلہ ہوگا اور واپسی کی جگہ۔''

یہ ہمیشگی کا باغ وہ غیر فانی مملکت ہے جہاں کا آرام دائمی اور جہاں کی سلامتی ابدی' جہاں کی لذت بے انتہا' جہاں کی زندگی غیر منقطع' جہاں کا سرور غیر مختتم اور جہاں کا عیش جاوداں ہے۔ چنانچہ اس کی تصریح قرآن پاک کی سولہ آیتوں میں مختلف طریقوں سے کی گئی ہے' فرمایا:

(۱) ﴿وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَاۤ اَبَدًا وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا وَ مَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِیْلًا﴾ (نساء:۱۲۲)

''اور جو ایمان لائے اور اچھے عمل کئے ہم ان کو باغوں میں داخل کریں گے' جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہوں گی وہ ہمیشہ کے لیے رہ پڑیں گے' اللہ کا وعدہ سچا ہے اور اللہ سے زیادہ کس کی بات سچی ہوگی۔''

اس تاکید پر تاکید اور پرزور طریقۂ تعبیر پر نظر ڈالئے کہ صرف ''خلود'' پر اکتفا نہیں کی بلکہ ساتھ ہی ابدا فرما کر اس خلود کو غیر فانی اور قیام کو ابدی ظاہر فرمایا' اس پر بھی بس نہ کی بلکہ یہ بھی اضافہ کیا کہ یہ اللہ کا سچا وعدہ ہے پھر مزید تاکید کا اضافہ کیا کہ اللہ سے زیادہ سچی بات کس کی ہوسکتی ہے' اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ خلودِ جنت اور بقائے غیر فانی کی قطعیت کتنی ہے۔

(۲) ﴿وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَاۤ اَبَدًا﴾ (نساء:۵۷)

''اور جو ایمان لائے' اور اچھے عمل کیے ہم ان کو ان باغوں میں داخل کریں گے جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہوں گی ان میں وہ ہمیشہ رہا کریں گے۔''

(۳) ﴿لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَاۤ اَبَدًا﴾ (مائدہ:۱۱۹)

''ان کے لیے وہ باغ میں جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہیں وہ ان میں ہمیشہ رہا کریں گے۔''

(۴) ﴿وَ جَنّٰتٍ لَّهُمْ فِیْهَا نَعِیْمٌ مُّقِیْمٌ ○ خٰلِدِیْنَ فِیْهَاۤ اَبَدًا﴾ (التوبۃ:۲۱۔۲۲)

(اور اللہ ان کو خوش خبری دیتا ہے کہ ان کے لیے وہ باغ ہیں جن میں ہمیشہ کا آرام ہے اور جن میں وہ ہمیشہ رہا کریں گے)

(۵) ﴿وَ اَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَاۤ اَبَدًا﴾ (التوبۃ:۱۰۰)

''اور ان کے لیے وہ باغ مہیا کیے ہیں' جن کے نیچے نہریں رواں ہیں اور ان میں ہمیشہ رہا کریں گے۔''

(۶) ﴿وَ یُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَاۤ اَبَدًا﴾ (تغابن:۹)

''اس کو ان باغوں میں داخل کرے گا' جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی ان میں وہ ہمیشہ رہا کریں

گے۔"

(۷)﴿وَ مَنْ یُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ وَ یَعْمَلْ صَالِحًا یُّدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ اَبَدًا قَدْ اَحْسَنَ اللّٰهُ لَهٗ رِزْقًا﴾ (طلاق:۱۱)

"اور جو اللہ پر ایمان لائے اور نیک کام کریں اس کو وہ ان باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں ان میں وہ ہمیشہ رہا کریں گے اللہ نے اس کو روزی خوب دی۔"

(۸) ﴿جَزَآؤُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ اَبَدًا﴾ (بینہ:۸)

"ان کی مزدوری ان کے رب کے حضور میں بسنے کے وہ باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، جن میں وہ ہمیشہ رہا کریں گے۔"

یہ آیتیں وہ ہیں جن میں اہلِ جنت کو جنت میں خلودِ ابدی کی قطعی بشارت سنائی گئی ہے، ان کے علاوہ وہ آیتیں ہیں جن میں جنت کی راحتوں اور لذتوں کی ابدیت اور دوام کی خبر دی گئی ہے، فرمایا:

(۹) ﴿وَ یُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِیْنَ الَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا حَسَنًا○ مَّا کِثِیْنَ فِیْهِ اَبَدًا○﴾ (کہف:۲،۳)

"اور ان مومنوں کو بشارت دوں گا جنہوں نے اچھے کام کیے کہ ان کے لیے اچھی مزدوری ہے جس میں وہ ہمیشہ قیام پذیر رہیں گے۔"

سورہ ص میں جنت کی اکثر نعمتوں کے ذکر کے بعد ہے:

(۱۰) ﴿هٰذَا مَا تُوْعَدُوْنَ لِیَوْمِ الْحِسَابِ اِنَّ هٰذَا لَرِزْقُنَا مَالَهٗ مِنْ نَّفَادٍ﴾ (صٓ: ۵۳،۵۴)

"یہ وہ ہے جس کا حساب کے دن تم کو دیے جانے کا وعدہ کیا جاتا ہے، بے شبہ یہ ہماری وہ روزی ہوگی جس کو ختم ہونا نہیں ہے۔"

(۱۱)﴿وَ اَمَّا الَّذِیْنَ سُعِدُوْا فَفِی الْجَنَّةِ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّکَ عَطَآءً غَیْرَ مَجْذُوْذٍ﴾ (ھود:۱۰۸)

"اور لیکن جو خوش قسمت ہوئے تو وہ جنت میں رہا کریں گے جب تک آسمان اور زمین ہیں، لیکن جو تیرا رب چاہے وہ بخشش ہوگی جو منقطع نہ ہوگی۔"

یعنی خدا کی مشیت کے سوا ان کو اس جنت سے کوئی الگ نہ کر سکے گا، لیکن اس کی مشیت یہی ہوگی کہ ان کے لیے اس کی یہ بخشش دائمی اور غیر منقطع طریقہ سے ہمیشہ قائم رہے پھر جس کے متعلق اس کی مشیت کا یہ اعلان ہے وہ فنا کیونکر ہو سکے گی۔

(۱۲) ﴿وَ جَنّٰتٍ لَّهُمْ فِيْهَا نَعِيْمٌ مُّقِيْمٌ﴾ (توبہ:۲۱)

''اور وہ باغ جن میں ان کے لیے قائم رہنے والی نعمت ہوگی۔''

(۱۳) ﴿اُكُلُهَا دَآئِمٌ وَّ ظِلُّهَا﴾ (رعد:۳۵)

''جنت کا میوہ اور اس کا سایہ دائمی ہے۔''

(۱۴) ﴿وَ فَاكِهَةٍ كَثِيْرَةٍ ۝ لَّا مَقْطُوْعَةٍ وَّ لَا مَمْنُوْعَةٍ ۝﴾ (واقعہ:۳۲'۳۳)

''اور بہت سے میوے جن کا نہ انقطاع ہوگا اور نہ جن کی روک ہوگی۔''

(۱۵) ﴿اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ﴾ (التین:۶)

''لیکن جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کیے ان کے لیے وہ مزدوری ہے جس کا سلسلہ کبھی ختم نہ ہوگا۔''

فنائے راحت اور انقطاعِ مسرت کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ راحت و مسرت کے اسباب کا خاتمہ ہو جائے' اور دوسرے یہ کہ خود لذت اٹھانے والے کی زندگی کا خاتمہ ہو جائے۔ پہلی صورت کی نفی تو گذشتہ آیتوں میں کر دی گئی کہ راحت و مسرت کے اسباب کا وہاں خاتمہ نہ ہوگا' اب رہ گئی دوسری صورت تو گو ﴿خَالِدِيْنَ فِيْهَا اَبَدًا﴾ کہہ کر اس کی نفی بار بار کی جا چکی ہے مگر ایک جگہ تبصریح یہ کہہ دیا گیا ہے کہ اس احاطہ میں موت کا گذر نہ ہوگا' فرمایا:

(۱۶) ﴿لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا الْمَوْتَ اِلَّا الْمَوْتَةَ الْاُوْلٰى﴾ (دخان:۵۶)

''جنت میں جانے والے پہلی موت کے سوا پھر موت کا مزہ نہیں چکھیں گے۔''

لیکن اب ایک تیسری صورت یہ بھی ممکن تھی کہ مسرت کے اسباب بھی قائم رہیں اور اہلِ جنت کی زندگی بھی دائم ہو مگر کچھ دنوں کے بعد ان کو وہاں سے نکال کر الگ کر دیا جائے تو اس کی تصریح بھی فرما دی کہ یہ بھی ممکن نہ ہوگا کہ کوئی اہلِ جنت کو ان کے عیش و راحت کی منزل گاہوں سے باہر نکال۔ فرمایا۔

﴿لَا يَمَسُّهُمْ فِيْهَا نَصَبٌ وَّ مَا هُمْ مِّنْهَا بِمُخْرَجِيْنَ﴾ (حجر:۴۸)

''وہاں ان کو کوئی غم نہ چھوئے گا' اور نہ وہ اس میں سے نکالے جائیں گے۔''

یہ بھی ممکن کہ خود اہل جنت اس سے گھبرا کر نکل آئیں تو فرمایا کہ ان کی جبلت و فطرت ایسی ہوگی کہ وہ خود بھی اس مہمان خانہ الٰہی سے نکلنا پسند نہیں کریں گے فرمایا۔

﴿خٰلِدِيْنَ فِيْهَا لَا يَبْغُوْنَ عَنْهَا حِوَلًا﴾ (کہف:۱۰۸)

''سدا رہیں گے اس میں اس سے منتقل نہ ہونا چاہیں گے۔''

دوام و بقا اور تسلسل و عدمِ انقطاع کی اس تو برتو تاکید اور اصرار سے اندازہ ہوگا کہ اسباب مسرت کی بقاء راحت کا دوام اور زندگی کا تسلسل جنت کی اصلی خصوصیت ہوگی' یہی وہ حقیقت ہے جس کی لالچ شیطان نے ﴿وَ مُلْكٍ لَّا يَبْلٰى﴾ (طٰہٰ: ۱۲۰) اور غیر فانی سلطنت کہہ کر آدمؑ کو دلائی تھی اور اس بہانہ سے اس عالمِ بقا سے ان کو اس عالمِ فنا میں بھجوا دیا' آخر وہ زمانہ آئے گا' جب آدمؑ کی اولاد کو ان کے اعمال کے بدولت اس غیر فانی بادشاہی

کی وراثت ہمیشہ کے لیے حاصل ہوگی۔

غیر فانی بادشاہی

دنیا میں شخصی راحت و آلام کا بلند سے بلند تخیل' ایک لفظ بادشاہی کے اندر بخوبی ادا ہوسکتا ہے اگر انسان کو اس کی انتہائی آرزوؤں کے برآنے کی خوش خبری دینے کے لیے کوئی لفظ ہوسکتا ہے تو یہی ہے گویا بادشاہی اس کیفیت کا نام ہے' جس میں انسان کی کوئی آرزو کامیابی سے محروم نہ رہے' سامانِ راحت اور اسبابِ شادمانی کی فراوانی سے اس کی مسرت میں کسی غم کا شائبہ نہ ہو' اونچے اونچے محل' ہرے بھرے باغ' بہتی نہریں' سرسبز و شاداب تختے' سونے چاندی کے اسباب' زر و جواہر کے برتن' زریں کمر غلام و خدام' ریشمی لباس' طلائی تخت' موتیوں کے ہار' سونے کے کنگن' شراب کے زمردیں اور بلوریں پیالے' حسین و مہ جبیں بیگمات غرض ایک لفظ بادشاہی کے یہ تمام ضروری لوازمے ہیں۔

جنت کی مختصر ترین لیکن سچی تعریف آدمؑ کے دشمن نے آدمؑ کے سامنے کی تھی۔

﴿وَ مُلْكٍ لَّا يَبْلٰى﴾ (طٰہٰ: ۱۲۰)

''اور غیر فانی بادشاہی۔''

آنے والی زندگی کے اس غیر فانی عیش و مسرت کے لیے مختلف پیغمبروں نے مختلف لفظ استعمال کیے ہیں۔ چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اس کے لیے آسمانی بادشاہی کی اصطلاح قائم فرمائی' اور اپنی گفتگو کے تمام استعاروں میں اس مفہوم کو اسی لفظ سے ادا کیا ہے مگر جیسا کہ بار بار کہا گیا ہے کہ انسانی لغت کے الفاظ سے جو مادیت کی گودوں میں پلے اور مادیت کے ماحول میں پھولے پھلے ہیں' کسی روحانی مفہوم کی تعبیر ناممکن ہے کہ اس کے ہر لفظ کے مفہوم کو ان ہی لوازم اور خیالات کے ساتھ انسان سمجھنے پر مجبور ہے' جو ہمیشہ سے اس لفظ کے ساتھ وابستہ چلے آتے ہیں' آپ بادشاہی کو آسمانی کہہ کر کسی قدر مادہ سے بلند کریں مگر بادشاہی کے مفہوم کے ساتھ جو موروثی خیالات و لوازم وابستہ ہیں وہ دور نہیں ہو سکتے' چنانچہ خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنی زندگی کی آخری شب میں شاگردوں کو جب شراب کا پیالہ بھر کر دیتے ہیں تو آسمانی بادشاہی کے مادی لطف و مسرت کا ذکر ان لفظوں میں کرتے ہیں:

میں پھر تمہیں کہتا ہوں کہ انگور کا شیرہ پھر نہ پیوں گا' اس دن تک کہ تمہارے ساتھ اپنے باپ کی بادشاہی میں اسے نیا نہ پیوں۔'' (متی ۲۶۔۲۹)

آپ نے دیکھا کہ ''باپ'' کی آسمانی بادشاہی میں بھی انگور ہی کا شیرہ پینے کو ملے گا۔

اور یوحنا حواری نے جب اس آسمانی بادشاہی کا خواب دیکھا تو وہ ان کو اسی سونے چاندی کے محل' آبِ حیات کی نہر اور جواہرات کی دیواروں میں نظر آئی (مکاشفات یوحنا باب ۲' ۲۲)

وہاں رات نہ ہوگی' اور دیے' چراغ اور سورج کی روشنی کے محتاج نہیں' کیونکہ خداوندان کو روشن کرتا ہے' اور وہ ابدالاباد بادشاہی کریں گے۔(۲۲۔۵)

لیکن یہ ''بادشاہی'' عیسوی پیغام میں ہنوز تفسیر کی محتاج ہے' نبوت کے آخری پیغام نے اس اجمال کی تفصیل ان لفظوں میں کی ہے۔

﴿فَوَقٰىهُمُ اللّٰهُ شَرَّ ذٰلِكَ الْيَوْمِ وَ لَقّٰىهُمْ نَضْرَةً وَّ سُرُوْرًا ○ وَ جَزٰهُمْ بِمَا صَبَرُوْا جَنَّةً وَّ حَرِيْرًا ○ مُّتَّكِـِٕيْنَ فِيْهَا عَلَى الْاَرَآئِكِ لَا يَرَوْنَ فِيْهَا شَمْسًا وَّ لَا زَمْهَرِيْرًا ○ وَّ دَانِيَةً عَلَيْهِمْ ظِلٰلُهَا وَ ذُلِّلَتْ قُطُوْفُهَا تَذْلِيْلًا ○ وَ يُطَافُ عَلَيْهِمْ بِاٰنِيَةٍ مِّنْ فِضَّةٍ وَّ اَكْوَابٍ كَانَتْ قَوَارِيْرَا ○ قَوَارِيْرَا مِنْ فِضَّةٍ قَدَّرُوْهَا تَقْدِيْرًا ○ وَ يُسْقَوْنَ فِيْهَا كَاْسًا كَانَ مِزَاجُهَا زَنْجَبِيْلًا ○ عَيْنًا فِيْهَا تُسَمّٰى سَلْسَبِيْلًا ○ وَ يَطُوْفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ اِذَا رَاَيْتَهُمْ حَسِبْتَهُمْ لُؤْلُؤًا مَّنْثُوْرًا ○ وَ اِذَا رَاَيْتَ ثَمَّ رَاَيْتَ نَعِيْمًا وَّ مُلْكًا كَبِيْرًا ○ عٰلِيَهُمْ ثِيَابُ سُنْدُسٍ خُضْرٌ وَّ اِسْتَبْرَقٌ وَّ حُلُّوْٓا اَسَاوِرَ مِنْ فِضَّةٍ وَ سَقٰىهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا ○ اِنَّ هٰذَا كَانَ لَكُمْ جَزَآءً وَّ كَانَ سَعْيُكُمْ مَّشْكُوْرًا ○﴾ (دہر:۱۱'۲۲)

''تو اللہ نے اہل جنت کو اس دن کی تکلیف سے بچالیا' اور ان کو تروتازگی اور شادمانی سے ملایا اور ان کے صبر کے بدلے میں ان کو (رہنے کے لیے) باغ اور (پہننے کے لیے) ریشمی کپڑے دیے وہ ان باغوں میں تختوں پر تکیے لگائے ہوں گے ان میں نہ دھوپ ہوگی نہ ٹھنڈ اور ان کے سائے ان پر جھکے ہوں گے ان کے خوشے پست ہو کر لٹکے ہوں گے' چاندی کے برتن اور نقرئی شیشوں کے آبخورے جو ناپ کر بنائے گئے ہیں' ان کو لوگ ان کے پاس لیے پھریں گے اور ان کو وہاں وہ پیالہ پلایا جائے گا جس میں سونٹھ ملی ہوگی اس میں ایک چشمہ کا نام سلسبیل ہے اور سدا رہنے والے کمسن غلام ان کی خدمت میں گھوم رہے ہوں گے اور تو انہیں دیکھے تو سمجھے کہ موتی بکھرے ہیں اور جب تو یہ سب دیکھے تو وہاں نعمت وعیش اور بڑی بادشاہی دیکھے' ان کی پوشاک سبز نرم ریشم اور دبیز ریشم ہوگی اور ان کو نقرئی کنگن پہنائے جائیں گے' اور ان کا پروردگار ان کو پاک شراب پلائے گا یہ تمہاری مزدوری ہوگی اور تمہاری محنت کی قدر کی جائے گی۔''

یہ پورا نقشہ اس عیش ومسرت کا ہے جو اس دنیا کے شاہانہ محلوں کے متعلق تخیل میں آتا ہے اس بیان کی تائید و تصدیق اس صحیح حدیث سے ہوگی جو جامع ترمذی میں حضرت مغیرہؓ صحابی سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''موسیٰ علیہ السلام نے اپنے پروردگار سے پوچھا کہ اے پروردگار! جنت والوں میں سے سب سے کم رتبہ کون ہو گا' فرمایا وہ شخص جو جنت والوں کے جنت میں داخل ہو چکنے کے بعد آخر میں آئے گا تو اس سے کہا جائے گا کہ جنت میں داخل ہو جاؤ وہ کہے گا کہ ''اب میں کہاں جاؤں کہ لوگ اپنے اپنے مقام پر جا چکے' اور ربانی نوازشوں پر

قابض ہو چکے اس سے کہا جائے گا کہ کیا تو اس پر راضی ہے کہ تجھے وہ ملے جو دنیا کے بادشاہوں میں سے کسی کے پاس نہ تھا' عرض کرے گا۔'' خداوندا میں راضی ہو گیا۔ فرمائے گا تیرے لیے اتنا اور اس سے دونا اور اس سے تگنا اور چوگنا ہے' کہے گا خداوندا میں راضی ہو گیا۔ خدا فرمائے گا' تیرے لیے وہ اور اس کا دوگنا ہے عرض کرے گا میں راضی ہو گیا فرمائے گا اس کے ساتھ یہ بھی کہ جو تیرا دل آرزو کرے اور جو تیری آنکھ کو لذت بخشے۔''(۱)

باغ کا استعارہ

آخرت کے خانۂ عیش و راحت کے لیے قرآن پاک نے عموماً جنت اور کہیں روضہ کے لفظ کا استعمال کیا ہے۔ نادان اس کی وجہ یہ قرار دیتے ہیں کہ عرب کے شورو بے حاصل اور خشک صحرا کے بسنے والوں کی انتہائی آرزو چونکہ سرسبز و شاداب باغوں ہی کی ہو سکتی ہے' اس لیے ان کے لیے یہ لفظ اس مقامِ آخرت کے لیے قرآن نے استعمال کیا ہے مگر یہ سمجھنا چاہیے کہ قرآن کا مخاطب صرف عرب نہیں بلکہ دنیا کا گوشہ گوشہ ہے اس لیے عرب کی تخصیص بے معنی ہے کیا دنیا کے سرسبز و شاداب ملکوں کے بسنے والوں کے تخیل میں باغ و راغ اور رنگ و گل کی بہار پسندیدہ نہیں ہے۔ اصل یہ ہے کہ یہاں بیابان و گلستان کی تخصیص نہیں' یہ فطرتِ انسانی کی تصویر ہے' انسان کسی خطۂ ارضی میں آباد ہو مگر وہ سرسبز و شاداب قطعات باغ و بہار' اور کنار آب و نہر کو عیش و مسرت کا مقام سمجھتا ہے اور ان کو دیکھ کر اندر سے اس کی روح وجد کرتی ہے۔

اس استعارہ کے استعمال کا ایک اور نکتہ بھی توجہ کے قابل ہے' انسان کا گھر وہ عیش خانہ ہوتا ہے جس میں حزن و غم کی آمیزش بھی شامل ہوتی ہے' اہل و عیال اور دولت و مال کے متعلق ہر قسم کی فکریں اس کے دل کے دامن سے لپٹی ہوئی ہیں' مگر جب انسان سیر و تفریح کے لیے باغ و چمن کا رخ کرتا ہے' تھوڑی دیر کے لیے وہ ہر غم کو بھول جاتا اور ہر تعلق کو دل سے نکال دیتا ہے اور ایسا شاداں و فرحاں بن جاتا ہے کہ غم و الم اس کے ہر گوشۂ خاطر سے دور ہو جاتے ہیں۔ وحیِ محمدی علی صاحبہ الصلوٰۃ والسلام نے اس لفظ کو اسی لیے استعمال کیا ہے تاکہ اس سے اخروی عیش و مسرت' شادی و خوشی اور فراغِ خاطر کی پوری تصویر کھنچ جائے۔

سامانِ جنت کے دنیاوی نام

یہ حقیقت بار بار دہرائی گئی ہے کہ عالمِ آخرت کی اشیا کو جن دنیاوی الفاظ سے ادا کیا گیا ہے' ان سے مقصود بالکل وہی نہیں ہیں جو ان لفظوں سے سمجھنے کے ہم عادی ہیں' بلکہ ان اخروی اشیا کو ان دنیاوی الفاظ سے اس لیے ادا کیا گیا ہے کہ وہ ان سے خاص مناسبت رکھتی ہیں' ورنہ از روئے حقیقت ان الفاظ کے لغوی مفہوم و معنی سے ان کی اخروی حقیقتیں بدرجہا بلند و اتم ہوں گی چنانچہ قرآن مجید کی ان آیتوں میں:

﴿وَ بَشِّرِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ كُلَّمَا

(۱) جامع ترمذی تفسیر سورہ سجدہ (حدیث حسن صحیح)

رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا قَالُوْا هٰذَا الَّذِیْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ وَ اُتُوْابِهٖ مُتَشَابِهًا وَ لَهُمْ فِیْهَا اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ○ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَسْتَحْیٖٓ اَنْ یَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا﴾ (البقرۃ:۲۵،۲۶)

''اوران کوجوایمان لائے اوراچھے کام کیے یہ خوش خبری سنا کہ ان کے لیے وہ باغ ہیں جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہوں گی وہ جب ان باغوں سے کوئی پھل دیے جائیں گے کہیں گے کہ یہ وہی ہے جو اس سے پہلے ہم کو دیا گیا تھا اور وہ ان کو ایک دوسرے کے مشابہ دیا جائے گا' اوران باغوں میں ان کی صاف ستھری بیویاں ہوں گی اوران باغوں میں رہا کریں گے۔ بے شبہ خدا اس سے شرمندہ نہیں کہ وہ ایک مچھر کی یا اس سے بھی کم رتبہ کی چیز کی مثال بیان کرے۔''

ان آیتوں کے سباق اور نظم وترتیب پر لحاظ کر کے میرے ذہن میں یہی معنی آتے ہیں کہ ان میں دنیاوی الفاظ اوران کے اخروی مفہوم کے درمیان تشابہ کا بیان ہے ورنہ حقیقت کی رو سے ان الفاظ کے دنیاوی لغوی معانی اوراخروی معنوں میں وہی نسبت ہے' جو مچھر اور کسی عظیم الجثہ شے کے درمیان ہوسکتی ہے' یہی سبب ہے کہ جنت کی لذتوں اور نعمتوں کی نسبت قرآن نے یہ بھی کہا ہے:

﴿فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِیَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْیُنٍ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ﴾ (السجدۃ:۱۷)

''تو کسی نفس کو معلوم نہیں کہ ان کے لیے ان کے (اچھے) اعمال کے بدلہ میں آنکھوں کی جو ٹھنڈک چھپا کر رکھی گئی ہے۔''

اس ''آنکھوں کی ٹھنڈک'' یعنی لذت وراحت کی کیفیت دنیاوی تخیل سے چونکہ بہت بلند ہے' اس لیے فرمایا گیا کہ جنت کی راحت ولذت کی حقیقت علم وفہم سے پوشیدہ اور مخفی ہے' آنحضرت ﷺ نے اسی مفہوم کو اپنے ان مبارک الفاظ سے واضح فرمادیا ہے:

((قَالَ اللّٰهُ اَعْدَدْتُّ لِعِبَادِیَ الصَّالِحِیْنَ مَا لَا عَیْنٌ رَاَتْ وَ لَآ اُذُنٌ سَمِعَتْ وَ لَا خَطَرَ عَلٰی قَلْبِ بَشَرٍ)) (۱)

''خدا فرماتا ہے کہ میں نے اپنے نیک بندوں کے لیے وہ مہیا کیا ہے جس کو نہ کسی آنکھ نے دیکھا نہ کسی کان نے سنا اور نہ کسی انسان کے دل میں اس کا خیال آیا۔''

اگر جنت کے باغوں' نہروں' میووں' غلاموں' شرابوں' ریشمی کپڑوں' اور طلائی زیوروں کی وہی اخروی حقیقت ہے جو ان لفظوں سے لغوی طور پر ہم اس دنیا میں سمجھتے ہیں تو اللہ تعالیٰ بہشت کی لذتوں اور مسرتوں کو ایک ''مخفی حقیقت'' نہ فرماتا اور نہ آنحضرت ﷺ اس کی توضیح میں اس درجہ بلندی کرتے کہ وہ ایسی چیزیں ہیں جن کو نہ آنکھوں نے دیکھا اور نہ کانوں نے سنا اور نہ وہ کسی انسان کے خیال میں گذریں مزید تاکید روایت کے دوسرے

(۱) صحیح بخاری باب کلام الرب وتفسیر سورہ سجدہ صحیح مسلم کتاب الجنۃ وترمذی تفسیر سجدہ۔

الفاظ میں ہے:

((بَلَّهُ مَا طَلَعْتُمْ عَلَيْهِ))

''جو تم جانتے ہو اس کو چھوڑ دو۔''

صحیح مسلم کی روایت میں یہ الفاظ ہیں بَلَّهُ مَا اَطْلَعَكُمُ اللّٰهُ عَلَيْهِ۔ اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں' ایک یہ کہ بلکہ خدا نے تم کو اس پر مطلع بھی نہیں کیا۔ دوسرے یہ کہ خدا نے اس کا جو حال بتایا ہے اس سے بھی درگذر کرو۔

غرض ان لفظوں سے جو بھی تم سمجھ سکتے ہو اس کو چھوڑ کر آگے بڑھو' اصحابِ تفسیر نے حضرت ابن عباسؓ سے بسند نقل کیا ہے:

وَ قَالَ السُّفْيَانُ الثَّورِیُّ عَنِ الْاَعْمَشِ عَنْ اَبِیْ ظِبْيَانَ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ لَايَشْبُهُ شَیْءٌ مِّمَّا فِیْ الْجَنَّةِ مَا فِی الدُّنْيَا اِلَّا فِی الْاَسْمَآءِ.

''سفیان ثوری اعمش سے اور وہ ظبیان سے اور وہ حضرت ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ جنت میں جو کچھ ہے وہ دنیا کی چیزوں سے ناموں کے سوا اور کسی بات میں مشابہ نہیں۔''

دوسری روایت کے یہ الفاظ ہیں۔

لَيْسَ فِی الدُّنْيَا مِمَّا فِی الْجَنَّةِ اِلَّا الْاَسْمَآءُ۔ (۱)

''جنت میں جو کچھ ہے وہ ناموں کے سوا دنیا میں نہیں۔''

غرض ان الفاظ سے ان ہی دنیاوی مشاہدات کی چیزوں کو سمجھنا ضروری نہیں بلکہ ان سے بدرجہا بلند لذائذ اور مسرتیں مراد ہیں جن کی تعبیر کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ کسی وجۂ مناسب کے سبب سے ان کو ان دنیاوی لفظوں سے ادا کیا جائے اور اس پر بھی مفہوم ادا نہ ہو سکے' اس میں اشکال نعوذ باللہ' اللہ تعالیٰ کی عدمِ قدرتِ کلام کے سبب سے نہیں ہے بلکہ عاجز انسانوں کی ذہنی درماندگی کے سبب سے ہے کہ نادیدہ و ناشنیدہ اور دردلِ ناخلیدہ مفاہیم کے لیے ان کی زبان و لغت میں کوئی لفظ ہی نہیں۔

جنت کی مسرتیں اعمال کی تمثیل ہیں

یہ اصول بارہا بیان میں آ چکا ہے کہ دوزخ کی تکلیفیں ہوں یا جنت کی مسرتیں دونوں اعمالِ انسانی کی تمثیلیں ہیں اسی لیے قرآن پاک نے بتصریح تمام یہ کہا ہے:

﴿اِنَّمَا تَجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ﴾ (الطّور:۱۶)

''وہی بدلہ پاؤ گے جو تم کرتے تھے۔''

حدیث میں آتا ہے کہ قیامت میں خدا فرمائے گا ''اے میرے بندو' یہ تمہارے ہی عمل ہیں جو تم کو واپس مل

(۱) صحیح مسلم کتاب الجنة و صفة نعيمها۔

رہے ہیں تو جو نیکی پائے وہ خدا کا شکر ادا کرے اور جو برائی پائے وہ اپنے آپ کو ملامت کرے۔

مثلاً وہ نیکوکار جو دنیا میں اللہ تعالیٰ کے خوف سے ہمیشہ ترساں ولرزاں رہتے تھے' ان کو جنت میں امن و سلامتی کے ساتھ وہاں کی تمام راحتیں ملیں گی تو

﴿قَالُوْا اِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِيْٓ اَهْلِنَا مُشْفِقِيْنَ ○ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَ وَقٰنَا عَذَابَ السَّمُوْمِ○﴾ (طور:۲۶'۲۷)

''کہیں گے ہم اس سے اپنے پہلے گھر والوں میں ڈرتے تھے تو خدا نے ہم پر مہربانی کی اور ہم کو دوزخ کی لو کے عذاب سے بچالیا۔''

اس آیت سے صاف نمایاں ہے کہ جو لوگ دنیا میں خدا کے قہر وغضب سے ڈرتے تھے وہ قیامت میں گرم لو (سموم) کے عذاب سے بچائے جائیں گے قہر وغضب کی تمثیل شعلہ' آتش' لو وغیرہ گرم چیزوں سے ہے' تو جو لوگ دنیا میں خدا کے قہر وغضب سے ترساں تھے' دیکھو کہ قیامت میں ان کو سموم یا گرم ہوا کی لو سے بچائے جانے کی بشارت ملی۔ (۱) دولت مند وقوی دست منکرین' غریب مسلمانوں کو دیکھ کر دنیا میں ان پر تحقیرانہ ہنستے تھے' قیامت میں اس کا الٹا ہوگا کہ یہ ان پر ہنسیں گے' فرمایا:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا كَانُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَضْحَكُوْنَ ○ فَالْيَوْمَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنَ الْكُفَّارِ يَضْحَكُوْنَ○﴾ (المطففین:۲۹و۳۴)

''بے شک گنہگار ایمان والوں پر ہنستے تھے۔۔۔۔۔۔تو آج ایمان والے کافروں پر ہنسیں گے۔''

نیکوکاروں کے دنیا کے آنسو یہاں تبسم اور خندۂ مسرت میں بدل گئے اور گنہگاروں کی وہاں کی ہنسی یہاں آنسوؤں کا تار بن کر ظاہر ہوئی۔

گنہگار جو دنیا میں اپنی دولت وقوت کے نشہ میں چور اور اپنے اہل وعیال کے ساتھ خوش اور مسرور رہتے تھے وہ یہاں غمگین ہوں گے' اور جو وہاں غمگین تھے' وہ یہاں خوش اور مسرور ہوں گے۔

﴿فَسَوْفَ يَدْعُوْا ثُبُوْرًا○ وَّ يَصْلٰى سَعِيْرًا○ اِنَّهٗ كَانَ فِيْٓ اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا○﴾ (انشقاق:۱۱'۱۳)

''تو وہ موت کو پکارے گا اور دوزخ میں داخل ہوگا کیونکہ وہ اپنے اہل وعیال میں (مغرورانہ) خوش تھا۔''

اور جو نیکوکار وہاں اہل وعیال میں بیٹھ کر بھی مسرت سے نا آشنا' تھا اس کا یہ حال ہوگا کہ

﴿فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَّسِيْرًا○ وَّ يَنْقَلِبُ اِلٰٓى اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا○﴾ (انشقاق:۸'۹)

(۱) تفسیر ابن جریر طبری آیت مذکورہ وبیہقی فی البعث کما فی الدر المنثور للسیوطی تفسیر آیت مذکورہ۔

''تو اس سے آسان حساب لیا جائے گا اور وہ خوش خوش اپنے لوگوں کے پاس لوٹے گا۔''

قرآن پاک میں بارہا یہ آیتیں یا بعینہٖ ان ہی معنوں کی آیتیں آئی ہیں۔

﴿وَ بَشِّرِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ﴾ (بقرہ:۲۵)

''اور جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے ان کو باغوں کی خوش خبری سنا جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔''

ان آیتوں میں ایمان اور عمل صالح کے بالمقابل باغ اور اس کی نہروں کا ذکر پابندی کے ساتھ آتا ہے اس سے ادھر خیال جاتا ہے کہ ان دونوں میں کوئی خاص تمثیلی تعلق ہے' یہ ظاہر ہے کہ درخت اصلی چیزیں ہیں' جن کی ترقی اور نشو ونما پانی سے ہوتی ہے بعینہٖ اسی طرح ایمان اصل ہے جس کی جڑوں کی سیرابی اعمالِ صالحہ کی آبیاری سے ہوتی ہے اگر ایمان ہو اور اعمالِ صالحہ نہ ہوں تو وہ ایک ایسا درخت ہوگا جس کی ترقی اور نشو ونما کی امید نہیں اور اگر صرف عملِ صالح ہے اور ایمان نہیں تو ریگ میں پانی کی روانی ہے جس کا وجود وعدم یکساں ہے اس تمثیل کے ذہن میں آنے کے ساتھ قرآن پاک کی یہ آیت سامنے آتی ہے:

﴿وَ اُدْخِلَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ تَحِیَّتُهُمْ فِیْهَا سَلٰمٌ ○ اَلَمْ تَرَ كَیْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَیِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَیِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُهَا فِی السَّمَآءِ تُؤْتِیْۤ اُكُلَهَا كُلَّ حِیْنٍۭ بِاِذْنِ رَبِّهَا وَ یَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ یَتَذَكَّرُوْنَ ○﴾ (ابراھیم:۲۳'۲۵)

''اور جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے وہ ان باغوں میں داخل کیے گئے جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں' وہ اپنے پروردگار کے حکم سے ان میں سدا رہیں گے' وہاں سلامتی کی مبارک باد ہے' کیا تو نے نہیں دیکھا کہ خدا نے کیسی ایک مثال بیان کی نیک بات ایک ستھرے درخت کی طرح ہے جس کی جڑ مضبوط ہو اور ٹہنی آسمان میں ہو' اپنے پروردگار کے حکم سے وہ ہمہ وقت پھل لایا کرتا ہے' اور خدا مثالیں بیان کرتا ہے کہ لوگ شاید سوچیں۔''

اس آیت میں جنت اور کلمۂ طیبہ کے درخت کی پوری تمثیل ہے' یہاں ایک تقابل ہے کہ پہلے میں جب یہ کہا گیا کہ ''اپنے پروردگار کے حکم سے وہ ان باغوں میں سدا رہیں گے'' تو دوسرے میں ہے کہ وہ درخت اپنے پروردگار کے حکم سے سدا پھل دیتا رہے گا۔ کلمۂ طیبہ سے یہاں مراد ایمان ہے'(۱) جس کی جڑ مضبوط و مستحکم اور اس کی شاخیں آسمان میں اور اس کے پھل سدا پھلنے والے ہیں۔

صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت عثمانؓ بن مظعون صحابی کی وفات کے بعد ان کی ایک ہمسایہ صحابیہؓ نے خواب میں دیکھا کہ ایک نہر بہہ رہی ہے' اور جب یہ معلوم ہوا کہ یہ حضرت عثمانؓ بن مظعون کی ہے' انہوں نے آ کر یہ

(۱) تفسیر ابن جریر طبری تفسیر آیت مذکور۔

خواب آنحضرت ﷺ سے بیان کیا۔ آپؐ نے اس کی تعبیر میں فرمایا ((ذلک عمله یجری له)) یعنی یہ نہر ان کا عمل ہے جو ان کے لیے بہہ رہی ہے۔ (بخاری کتاب التعبیر)

ان دونوں سابقہ حوالوں سے یہ ہویدا ہوتا ہے کہ ایمان کی تمثیل سدا بہار درخت سے اور عمل کی تمثیل نہروں سے ہے' اس بنا پر اہلِ جنت کے لیے بار بار جس باغ اور نہرِ جاری کی بشارت دی گئی ہے' وہ حقیقت میں ان کے ایمان اور عملِ صالح کی تمثیلی شکلیں ہوں گی' ان کا ایمان خوش نما اور سدا بہار باغ اور ان کے اعمال صالحہ صاف و شفاف نہر کی صورت میں نمایاں ہوں گے اور وہ ان سے لطف ولذت اٹھائیں گے۔

اسی قیاس پر جنت کی دوسری لذتوں اور مسرتوں کی حقیقت کی تشریح کی جاسکتی ہے۔ علوم نبوی کے ایک بڑے واقف کار اور اسرارِ شریعت کے ایک بڑے دانائے راز شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ حجۃ اللہ البالغہ میں لکھتے ہیں:

﴿وَ اَکْثَرُ الْوَقَائِعُ الْحَشْرِیَّةِ مِنْ هٰذَا الْقَبِیْلِ وَ بِالْجُمْلَةِ فَتُشَبِّهَاتُ وَ تَمَثَّلاتُ لِمَا عِنْدَهَا وَ تَتَشَبَّهُ النِّعْمَةِ بِمَطْعَمِ هِنِیْءً وَّ مَشْرَبَ مَرِیْءً وَ مَنْکَحَ شَهِیًّ وَّ مَلْبَسَ رَضِیًّ وَّ مَسْکَنَ بَهِیًّ﴾ (ص:۳۶ھند)

''حشر کے واقعات از قبیلِ تمثیل ہیں ۔۔۔۔۔۔۔ حاصل یہ کہ یہ تمام امورِ معانی کا جسمانی قالبوں میں اور مثالی صورتوں میں ظاہر ہونا ہے ۔۔۔۔۔۔۔ اللہ تعالیٰ کی عنایت ومہربانی خوش مزہ کھانے' خوش گوار پینے کی چیزوں' رغبت انگیز لذتِ نکاح' دل پسند لباس اور عمدہ مسکن کی صورتوں میں نمایاں ہوگی۔''

ہم نے آیات واحادیث کے حوالوں سے پہلے کئی دفعہ یہ دکھایا کہ اس تمثیل وتشبیہ کے کیا معنی ہیں' اور کیونکر غیر مجسم معانی' اپنے مناسب قالبوں میں مجسم ہوکر وجود پذیر ہوتے ہیں' دنیا کے تمام اعمالِ صالحہ کی اگر تحلیل کی جائے تو ان کی اولاً دو قسمیں نکلیں گی خدا پر ایمان اور خلوصِ دل سے اس کی اطاعت جس کو ''حقوق اللہ'' کہتے ہیں۔ اور دوسری بندگانِ الٰہی کے ساتھ حسنِ سلوک' بندگانِ الٰہی کے ساتھ جو حسنِ سلوک کیا جاسکتا ہے' وہ یہی ہے کہ ان کی عزت وآبرو کا پاس کیا جائے' جس کو عفت وعصمت کہتے ہیں' اور ان کی ضروریات زندگی یہی کھانا' پینا' پہننا اور رہنا ہیں' ان ہی کی نسبت ہم ان کے ساتھ حسن سلوک کر سکتے ہیں۔ اب یہ پانچ قسمیں ہوئیں' جنت کی نعمتیں ان ہی پانچ قسموں پر منحصر ہیں' ایمان واخلاص واطاعت کی جزا تو خود اللہ تبارک تعالیٰ ہے' وہ اپنے قرب اور اپنے دیدار سے نوازے گا' عفت وعصمت کی جزا حسین ومہ جبین بیویوں کی صورت میں نمایاں ہوگی' دوسروں کو کھلانے کی جزا جنت کے باغ اور پھل اور قسم قسم کے الوانِ طعام ہیں' دوسروں کو پلانے کی جزا خوش مزہ وخوش گوار پینے کی مختلف چیزوں کی فراوانی ہے' پہنانے کی جزا ریشم وحریر ودیباواطلس اور بہتر خوش نما لباس ہے اور رہنے اور بسانے میں حسن سلوک کی جزا خوش منظر مکان وقیام گاہ ہے۔

ایک اور پہلو سے دیکھیے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کی بہشت کی صفت یہ بیان فرمائی ہے:

﴿اِنَّ لَکَ اَلَّا تَجُوْعَ فِیْهَا وَ لَا تَعْرٰی ○ وَ اَنَّکَ لَا تَظْمَئُوْا فِیْهَا وَ لَا تَضْحٰی﴾ (طٰہٰ: ۱۱۸، ۱۱۹)

''بے شک تیرے لیے اس بہشت میں نہ بھوکا ہونا' نہ ننگا ہونا اور نہ پیاسا ہونا' نہ دھوپ میں رہنا۔''

یہی چار مختصر انسانی ضرورتیں ہیں جو پھیل کر ایک دنیا ہو گئی ہیں' جب آدم کی اولاد کو اپنے اعمالِ صالحہ کی بدولت نجات ملے گی' تو پھر ان کے لیے وہی بہشت ہے جس میں نہ بھوکا ہونا ہے' نہ پیاسا ہونا' نہ ننگا ہونا' نہ گرمی اور نہ دھوپ کی تکلیف میں گرفتار ہونا' اس حقیقت کی تعبیر دو طرح سے کی جا سکتی ہے' یا تو یہ کہ بہشت میں اہلِ بہشت کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ وہ ان تمام انسانی ضرورتوں سے یکسر پاک و بے نیاز ہو جاتے ہیں اسی لیے وہاں نہ کوئی بھوکا ہو گا نہ پیاسا اور نہ ننگا ہو گا اور نہ دھوپ اور لو کی محنت میں گرفتار' دوسرے یہ کہ بہشت میں اہلِ بہشت کو کھانے کے لیے ایسے الوانِ نعمت ملیں گے جن کو کھا کر انسان پھر بھوکا نہ ہو گا' اور پینے کے لیے شراب و شربت کی وہ نہریں بہیں گی جن کو پی کر پھر پیاسا نہ ہو گا اور پہننے کو وہ کپڑے ملیں گے جو پھر نہ میلے ہوں گے اور نہ بوسیدہ ہو کر پھٹیں گے اور رہنے کے لیے ایسے گھنے باغ اور بلند مکانات ملیں گے جہاں دھوپ کا گزر نہ ہو گا۔

یہ اصول پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ دنیا میں انسان کے لیے جو لطف و لذت ہے وہ تھوڑی سی تکلیف کا نتیجہ ہے' انسانی اصول یہ ہے کہ بڑی لذت کے حصول کے لیے تھوڑی تکلیف گوارا کرتا ہے اور بڑی مسرت پر چھوٹی چھوٹی مسرتوں کو قربان کرتا ہے' اسی اصول پر اس کے تمام اعمال کی کامیابی و ناکامیابی کی بنا ہے' اعمالِ صالحہ کے بجا لانے میں انسان کو اس دنیا میں چھوٹی چھوٹی تکلیفیں برداشت کرنی پڑتی ہیں' اور اپنی عارضی خوشیوں اور لذتوں کو ان پر قربان کرنا ہوتا ہے' صبح کے نمازی کو خوابِ سحر کی لذت کو خیر باد کہنا' اور دوپہر کی جلتی دھوپ میں ظہر کے لیے مسجد میں جانا پڑتا ہے۔ خود بھوکا رہ کر دوسروں کو کھلانا پڑتا ہے اور اپنی بہت سی ناجائز مگر بظاہر دلچسپ خوشیوں کا ایثار کرنا پڑتا ہے۔ اس طرح پاکیزہ زندگی گذارنے پر اس کو آخرت کی غیر فانی دولت اور ابدی سعادت میسر آتی ہے۔

انسان کو دنیا میں ان اعمالِ صالحہ کی خاطر جن چیزوں کو قربان کرنا پڑتا ہے ان میں پہلی چیز تو خود اس کی زندگی ہے پھر انسانی زندگی کی وہ چار قسمیں ہیں جن کا نام کھانا' پینا' پہننا اور رہنا ہے' اس لیے آخرت میں ان قربانیوں کی جزا میں ان ہی کے مناسب و مماثل جو چیزیں ملیں گی وہ غیر فانی زندگی' الوانِ طعام' اقسامِ شراب و شربت' انواعِ لباس اور بہترین مسکن ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَاَمَّا مَنْ طَغٰی ○ وَ اٰثَرَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا ○ فَاِنَّ الْجَحِیْمَ هِیَ الْمَاْوٰی ○ وَ اَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَ نَهَی النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰی ○ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِیَ الْمَاْوٰی○﴾ (النازعات: ۳۷، ۴۱)

''پس جس نے خدا سے سرکشی کی اور دنیاوی زندگی (کے ناجائز لطف و آرام) کو ترجیح دی تو دوزخ اس کا ٹھکانا ہے لیکن جو خدا کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرا اور اپنے نفس کو ناجائز خواہشوں سے روکا تو اس

کا ٹھکانا بہشت ہے۔''

گواس کی جزئی نیکیوں کی جزا تو وقتاً فوقتاً اس دنیا میں تھوڑی تھوڑی کر کے شہرت' تعریف' ہر دلعزیزی اور دولت کی صورت میں ملتی رہتی ہے' مگر پوری زندگی کی مجموعی جزا دوسری زندگی میں ہی اس کو ملے گی۔

﴿وَ اِنَّمَا تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ﴾ (آل عمران:۱۸۵)

''اور تمہاری مزدوری قیامت کے دن پوری ادا کی جائے گی۔''

لطف و مسرت کا تصور

مسرت ایک نفسی کیفیت کا نام ہے جو انسان کو اپنی کسی خواہش کے پورے ہوتے وقت حاصل ہوتی ہے اس بنا پر مسرت کے وجود کے لیے کسی خواہش کی تکمیل ضروری ہے' اب انسانی خواہشوں کی تحلیل کرو' تو بالآخران کی انتہا ان ہی باتوں پر ہوگی جن کی طلب اس کی فطرت کے اندر ودیعت کر دی گئی ہے' اب غور کرو کہ وہ کیا چیزیں ہیں' یا کیا چیزیں اس کے فہم میں آ سکتی ہیں' وہ یہی ہیں' باغ و بہار' لباس و طعام' حور و قصور' خدم و حشم' سامان و اسباب اور زر و جواہر۔ مسرت اور راحت کا جب کبھی تخیل آئے گا' اور جب کبھی ہم ان کو سمجھنا چاہیں گے اور کہنا چاہیں گے تو ہم کو ان ہی چیزوں کا نقشہ کھینچنا پڑے گا' اور ہماری انسانی فطرت ان ہی مسرتوں اور خوشیوں کو ڈھونڈنے کی عادی ہے' اور ان ہی کے حصول کی خاطر دنیا میں ہر طرح کی سیہ کاری اور گنہگاری کی مرتکب ہوتی ہے' اس لیے ان سے احتراز کرنے پر جو چیزیں ہم کو وہاں ملیں گی وہ ہمارے ان ہی عادی و مانوس اسباب مسرت کی صورتوں میں ہمارے سامنے پیش ہوں گی' اور ہم ان سے لطف اندوز ہوں گے۔

لطف و مسرت کا اعلیٰ ترین تخیل

اس دنیائے کون و فساد میں ہم ایک عجیب قسم کی مصیبت میں مبتلا ہیں' ہم کو تخیل کے لحاظ سے اپنی آرزوؤں اور خواہشوں کی وسیع اور غیر محدود دنیا بخشی گئی ہے لیکن اپنی اپنی خواہشوں اور تمناؤں کے مطابق اپنی دنیا بنا لینے پر قدرت نہیں' نتیجہ یہ ہے کہ اگر ہم نے صبر و شکر کا دامن نہیں پکڑا ہے تو ہم سے زیادہ اس دنیا میں تصور و تخیل کی تکلیف میں کوئی اور گرفتار نہیں' جنت آخرت کی اس دنیا کا نام ہے جو ہمارے اعلیٰ ترین تخیل اور ہماری تمناؤں اور آرزوؤں کے مطابق ہوگی۔

﴿جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ لَهُمْ فِيْهَا مَا يَشَآءُوْنَ كَذٰلِكَ يَجْزِى اللّٰهُ الْمُتَّقِيْنَ﴾ (النحل:۳۱)

''رہنے کے باغ جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں' ان کے لیے ان باغوں میں وہ ہے جو وہ چاہیں' اللہ اسی طرح پرہیزگاروں کو بدلہ دے گا۔''

﴿وَ لَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِىْٓ اَنْفُسُكُمْ وَ لَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ﴾ (حم السجدۃ:۳۱)

''اور تمہارے لیے جنت میں وہ ہے جو تمہارے دل چاہیں' اور تمہارے لیے اس میں وہ ہے جو تم مانگو۔''

﴿لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ فِيْهَا وَ لَدَيْنَا مَزِيْدٌ﴾ (قٓ : ۳۵)

''ان کے لیے جنت میں وہ ہے جو وہ چاہیں' اور ہمارے پاس اس سے بھی بڑھ کر ہے۔''

﴿وَ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْهِ الْاَنْفُسُ وَ تَلَذُّ الْاَعْيُنُ﴾ (زخرف:۷۱)

''اور جنت میں وہ ہے جس کی دل خواہش کریں' اور جو آنکھوں کو لذت دے۔''

﴿لَهُمْ فِيْهَا مَا يَشَآءُوْنَ خٰلِدِيْنَ كَانَ عَلٰى رَبِّكَ وَعْدًا مَّسْئُوْلًا﴾ (فرقان:۱۶)

''ان کے لیے جنت میں وہ ہے جو وہ چاہا کریں گے' یہ ہمیشہ وعدہ ہے تیرے رب کے ذمہ۔''

﴿لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ﴾ (زمر:۳۴)

''ان کے لیے ان کے پروردگار کے پاس وہ ہے جو وہ چاہیں گے۔''

الغرض جنت وہ مقام ہے' جہاں ہم کو وہ کچھ ملے گا' جہاں تک ہمارا مرغِ خیال اڑ کر پہنچ سکتا ہے' لطف و مسرت کا وہ بلند سے بلند معیار جو تصور میں آ سکتا ہے' وہاں ہمارے لیے مہیا ہوگا' صحابہؓ میں ہر قسم کے لوگ تھے' جنت کے سامانِ مسرت کے متعلق وہ اپنی اپنی پسند اور آرزو کے مطابق آپؐ سے پوچھتے رہتے تھے' اور آپؐ جواب دیتے تھے حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ جنت میں جو سب سے کم رتبہ ہوگا اس کی کیفیت بھی یہ ہوگی کہ خدا تعالیٰ اس سے فرمائے گا کہ تو اپنی انتہائی آرزو دل میں خیال کر' وہ کرے گا تو خدا فرمائے گا کہ تجھ کو وہ سب کچھ دیا گیا جس کی تو نے آرزو کی تھی' اور اس کے برابر اور یہاں تک (۱) کہ بازار کا شوق ہوگا تو بازار بھی لگے گا' لیکن وہ حقیقی خرید و فروخت نہ ہوگی کہ وہاں کمی کس چیز کی ہوگی' بلکہ وہ مثالی صورتوں میں ہوگی' الا الصور من الرجال۔ (۲)

کسی کو جنت میں کھیتی کا شوق ہوگا تو دانہ' سبزہ' غلہ اور پھر تیاری یہ سب کام منٹوں میں انجام پا جائے گا' ایک بدوی نے پوچھا یا رسول اللہ ﷺ وہاں گھوڑے بھی ہوں گے' فرمایا کہ اگر تم کو جنت ملی تو اگر تم یہ بھی چاہو گے کہ سرخ یاقوت کا گھوڑا ہو جو تم کو جہاں چاہو بہشت میں لیے پھرے تو وہ بھی ہوگا' (۳) دوسرے نے پوچھا کہ یا رسول اللہ ﷺ اونٹ بھی ہوگا۔ فرمایا اگر تم جنت میں گئے تو تمہارے لیے وہ سب کچھ ہوگا۔ جو تمہارا دل چاہے گا اور تمہاری آنکھیں پسند کریں گی۔ (۴)

جنت میں اہلِ جنت کے مختلف رتبے ہوں گے اس لیے اعلیٰ کے لباس و سامان کو دیکھ کر ادنیٰ کو اپنی کمی کا

---

(۱) صحیح مسلم۔

(۲) ترمذی دیکھو مشکوٰۃ صفۃ الجنۃ۔

(۳) صحیح بخاری۔

(۴) ترمذی۔

خیال ہوگا تو اس کے تصور میں یہ پیدا کر دیا جائے گا حَتّٰی یَتَخَیَّلُ اِلَیْہِ۔ کہ خود اس کا لباس سامان اس سے بہتر ہے اور یہ اس لیے ہوگا کہ جنت میں کسی کو غم ہونا ممکن نہیں۔ (۱)

جنت جہاں کوئی جسمانی وروحانی آزار نہیں

کسی صاحبِ دل نے جنت کی یہ تعریف خوب کی ہے۔

بہشت آنجا کہ آزارے نہ باشد

دنیا میں کوئی بڑی سے بڑی مسرور زندگی بھی ایسی نہیں مل سکتی جس کے پہلو میں مسرت کے پھول کے ساتھ غم کا کوئی کانٹا نہ چبھ رہا ہو' یا تو موجودہ مسرت کے آئندہ ختم ہو جانے کا خوف ہے اور یا گزشتہ ناکامی کا افسوس ہے اس بنا پر یہاں کی کوئی خوشی بھی کامل نہیں مگر جنت وہ مقام ہوگا' جہاں نہ ماضی وحال کا غم ہوگا اور نہ مستقبل کا خوف ہوگا۔ چنانچہ اہلِ جنت کے متعلق بار بار ارشاد ہوا:

﴿لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَ لَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ﴾

''نہ ان کو خوف ہوگا اور نہ غمگین ہوں گے۔''

اور یہی بہشت کی سب سے بڑی نعمت ہوگی اس میں جسمانی وروحانی ہر قسم کی نعمتیں داخل ہیں۔

دنیا میں کوئی انسان اس وقت تک کوئی لقمہ گلے سے نہیں اتار سکتا اور نہ کوئی چیتھڑا بدن پر رکھ سکتا ہے جب تک اس کے سر کا پسینہ پاؤں تک نہ آئے' دنیا کی تمام فانی مسرتیں ہماری فانی کوششوں کا فانی نتیجہ ہیں' مگر جنت کی خوشیاں بے غم وتکلیف ہماری گزشتہ فانی نیکیوں کا غیر فانی نتیجہ ہیں' اور یہ محض اللہ تعالیٰ کا رحم وکرم ہے کہ وہاں ہم کو ہماری آسائش کا تمام سامان کسی قسم کی ادنیٰ زحمت ومشقت اٹھائے بغیر میسر ہوگا جس کے بغیر دنیا میں کوئی انسان زندہ ہی نہیں رہ سکتا' اور جس کی کشمکش سے یہ دنیا ہر انسان کے لیے دوزخ بنی ہے' چنانچہ اہل جنت جنت میں داخل ہو کر اور شاہانہ تزک واحتشام اور لباس وزیور سے آراستہ ہو کر خدا کی حمد وتعریف کا ترانہ ان لفظوں میں گائیں گے۔

﴿جَنّٰتُ عَدْنٍ یَّدْخُلُوْنَهَا یُحَلَّوْنَهَا فِیْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّ لُؤْلُؤًا وَّ لِبَاسُهُمْ فِیْهَا حَرِیْرٌ ○ وَ قَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ اِنَّ رَبَّنَا لَغَفُوْرٌ شَكُوْرُ ۨ○ الَّذِیْ اَحَلَّنَا دَارَ الْمَقَامَةِ مِنْ فَضْلِهٖ لَا یَمَسُّنَا فِیْهَا نَصَبٌ وَّ لَا یَمَسُّنَا فِیْهَا لُغُوْبٌ○﴾ (فاطر: ۳۳'۳۵)

''رہنے کے باغ جن میں وہ داخل ہوں گے ان میں وہ سونے کے کنگن اور موتی پہنائے جائیں گے' اور ان کی پوشاک ان میں ریشم ہوگی' اور وہ کہیں گے پاک ہے وہ جس نے ہم سے غم دور کر دیا' بے شک ہمارا پروردگار گناہوں کا معاف کرنے والا ہے' اور نیکیوں کی قدر کرنے والا ہے' وہ جس نے ہم کو اپنی

(۱) ترمذی' یہ کل حدیثیں مشکوٰۃ صفۃ الجنۃ سے لی گئی ہیں۔

مہربانی سے رہنے کے گھر میں اتارا اور ہم کو وہاں نہ مشقت پہنچی اور نہ اس میں ہم کو تھکنا ہے۔"

﴿لَا يَمَسُّهُمْ فِيْهَا نَصَبٌ وَّ مَا هُمْ مِنْهَا بِمُخْرَجِيْنَ﴾ (حجر:۴۸)

"ان میں ان کو کوئی آزار نہ ہوگا' اور نہ وہاں سے نکالے جائیں گے۔"

جنت جہاں رشک وحسد نہیں

موجودہ دنیا خیر وشر کے متضاد عناصر سے بنی ہے' یہاں ثواب کے ساتھ گناہ' رحم کے ساتھ سنگ دلی' محبت کے ساتھ کینہ ہے' یہ گناہ وکینہ اور بغض وحسد' وہ آگ ہے جس نے یہاں کے قلبی امن وامان کے خرمن میں آگ لگا رکھی ہے۔ ہر شخص یہاں دوسروں کی اچھی حالت کو دیکھ کر جلتا ہے اور دوسروں پر غصہ کے جوش وخروش سے ابلتا ہے۔ جنت وہ عالم ہے جہاں اس آگ اور سیلاب کا وجود نہ ہوگا' ہر قسم کے گناہ' سنگ دلی' عداوت اور بغض وحسد کا خاتمہ ہوگا' اور خالص محبت والفت کے دریا موجزن ہوں گے فرمایا۔

﴿لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا اِلَّا سَلٰمًا﴾ (مریم:۶۲)

"اس میں امن وسلامتی کے سوا کوئی بیہودہ بات نہیں سنیں گے۔"

﴿وَ نَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ﴾ (اعراف:۴۳)

"اور ہم نے ان کے سینوں سے کینہ کو کھینچ لیا' ان کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔"

﴿وَ نَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ اِخْوَانًا عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ﴾ (حجر:۴۷)

"اور ہم نے ان کے سینوں سے کینہ کو کھینچ لیا' بھائی بھائی بن کر تختوں پر آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے۔"

اس کی تفسیر میں حدیث صحیح میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ "وہاں نہ دلوں کا اختلاف ہوگا' نہ باہم بغض اور کینہ سب کے دل ایک دل کی طرح متحد ہوں گے۔

وہاں کی جسمانی زندگی کیسی ہوگی

بہشت میں زندگی کی جو لذتیں ہوں گی' ان کی تعبیر الوانِ نعمت اور انواعِ شربت وشراب اور دوسرے مادی لذائذ سے ہوسکتی ہے مگر وہ حظ ومسرت اور اطمینان وسکینت کے علاوہ کسی معنی میں بھی مادی خصوصیات سے آلودہ نہ ہوں گی' یہاں ہر کھانے پینے کے ساتھ بول وبراز' پسینہ اور سوءِ ہضم کی علت لگی ہوئی ہے' اور بغیر اس کے انسان یہاں زندہ نہیں رہ سکتا مگر وہاں کچھ نہ ہوگا۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اہل جنت کھائیں گے اور پئیں گے' لیکن نہ تھوکیں گے نہ وہاں بول وبراز کی حاجت ہوگی' نہ وہاں ناک سے رطوبت نکلے گی' نہ بلغم اور کھکھار جیسی گھنونی چیزیں ہوں گی' کھانا ایک ڈکار میں ہضم ہوگا' وہاں کے پسینہ میں مشک کی خوشبو ہوگی' جو بہشت میں داخل ہوگا' اس کو وہ نعمت ملے گی کہ پھر کبھی تکلیف نہ ہوگی' نہ ان کے کپڑے بوسیدہ ہوں گے' اور نہ ان کی جوانی زائل ہوگی' وہاں منادیِ غیب یہ پکار کر کہہ دے گا' یہاں وہ تندرستی ہے کہ بیمار نہ پڑو گے' وہ زندگی ہے کہ پھر موت نہ آئے گی' وہ جوانی

ہے کہ پھر بوڑھے نہ ہوگے' اور وہ آرام ہے کہ پھر تکلیف نہ پاؤ گے لوگوں کے چہرے اپنے اپنے اعمال کے مطابق چمکیں گے' کوئی ستارہ کی طرح کوئی چودھویں کے چاند کی طرح۔ (۱)

غور کرو کہ وہ جسمانی زندگی ہماری موجودہ جسمانی زندگی سے کتنی مختلف ہوگی' اس پر تعجب نہ کرنا چاہیے انسان کبھی شکمِ مادر میں ایک بچہ کی صورت میں زندہ تھا' مگر وہاں اس کی زندگی' اس کی غذا' اس کے فضلۂ غذا' اس کی سانس اور دوسرے لوازمِ حیات بیرونِ شکم کے دنیاوی اصولِ حیات وقوانینِ زندگی سے بالکل مختلف تھے اور جس طرح شکمِ مادر میں بچہ کا' اس بیرونی زندگی کے حکایات کو تعجب کے ساتھ سن کر آمادۂ انکار ہونا دانش مندی نہ ہوگا' ایسے ہی اس مادی زندگی کے خوگر' اور اس عالمِ آب وگل کے باشندے اس دوسری زندگی کے اصولِ حیات' طرزِ غذا اور دوسرے لوازمِ حیات کو سن کر آمادۂ انکار ہوں تو ان کا یہ فعل بھی دانش مندی کے خلاف ہوگا۔

جنت ارتقائے روحانی ہے

مادی وجسمانی خلقت وفطرت کی لاکھوں برس کی تاریخ کے مطالعہ اور تحقیق سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچی ہے کہ مادہ نے لاکھوں برس کے تغیرات کے بعد اس انسانی جسمانیت تک ترقی کی ہے' وہ پہلے جماد بنا' پھر نبات کی شکل میں آیا پھر حیوان کا قالب اختیار کیا' پھر جسمِ انسانی کی صورت میں نمودار ہوا۔ اور یہ مادیت کی معراجِ ترقی ہے' جمادیت مٹ کر نباتیت پیدا ہوئی' اور نباتیت فنا ہو کر حیوانیت نمودار ہوئی۔ پھر حیوانیت معدوم ہو کر انسانیت ظہور پذیر ہوئی اور ارتقائے انسانی کا جسمانی پہلو تکمیل کو پہنچ گیا' لیکن انسانیت کا دوسرا رخ جو روحانیت سے عبارت ہے' ہنوز اپنے آغازِ طفولیت میں ہے کیا اس پر بھی اسی ارتقائی دور کے مدارج نہیں آئیں گے' ایک مادہ پرست صرف بامِ ارتقا تک زینہ بزینہ چڑھ کر ٹھہر جاتا ہے لیکن مذہب اس سے بھی آگے لے چلتا ہے' اور یہاں سے وہ اڑ کر سقفِ آسمان تک پہنچتا ہے' اور ملکوتیت کی سرحد کی ترقی شروع کرتا ہے۔ قرآن پاک کی ان آیتوں پر غور کرنے سے اس نظریہ کے اشارات نکلتے ہیں:

﴿اَلَّذِیْنَ یَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ○ وَ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِیْنٍ ○ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِیْ قَرَارٍ مَّكِیْنٍ ○ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِیْنَ ○﴾ (المؤمنون:۱۱'۱۴)

''جو فردوس کی وراثت پائیں گے' اور وہ اس میں سدا رہیں گے' اور ہم (خدا) نے انسان کو مٹی کی کشید سے بنایا پھر اس کو (رحمِ انسانی کے) ایک ٹھہراؤ کی جگہ میں ایک بوند بنایا' پھر اس بوند کو بندھا ہوا خون بنایا' پھر اس خون کو لوتھڑا بنایا' پھر اس لوتھڑے کو ہڈیاں بنایا' پھر ہڈیوں کو گوشت پہنایا' پھر ان کو ایک نئی

(۱) یہ ساری حدیثیں صحیح مسلم صفۃ الجنۃ میں ہیں۔

صورت میں اٹھا کر کھڑا کیا' تو برکت والا ہے سب سے بہتر بنانے والا (خدا)۔''

لیکن یہ ترقی یہیں تک پہنچ کر رک نہیں جائے گی۔ بلکہ آگے بھی ہوگی' اس لیے جس طرح ماں کے پیٹ کی تنگ و تاریک دنیا میں زیست و حیات کے کچھ قواعد تھے' پھر عالم کی اس سے بھی وسیع تر دنیا میں اس نے قدم رکھا' جہاں ترقی و حیات کے دوسرے ہی اصول ہیں اسی طرح اس دنیائے مادی سے نکل کر اس وسیع تر دنیا میں قدم رکھے گا' جہاں ترقی اور سعادت کے اور دوسرے اصول ہوں گے' چنانچہ اس کے بعد ہی فرمایا:

﴿ثُمَّ اِنَّكُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ لَمَيِّتُوْنَ ○ ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ تُبْعَثُوْنَ﴾ (مؤمنون:۱۵'۱۶)

''پھر بے شک تم اس کے بعد مرنے والے ہو اور پھر قیامت کے دن اٹھائے جاؤ گے۔''

جس طرح انسانیت سے پہلے لاکھوں برس میں ایک نوع کی کیفیت مٹ کر دوسری نوع کی کیفیت پیدا ہوتے ہوتے انسانیت تک نوبت پہنچی' موت کے معنی یہ ہیں کہ اب نوعِ انسانی کی تمام کیفیتیں مٹ کر ایک بلند تر نوع کی کیفیتوں کی تیاری شروع ہوئی' صدہا' ہزارہا سال کے بعد قیامت سے دوسری نوعِ ملکوتی کا ظہور ہوگا۔

یہاں مسئلۂ ارتقا کا دوسرا اصول سامنے آتا ہے جس کو ''بقائے اصلح'' کہتے ہیں کہ ان مدارجِ ترقی کے اثنا میں ہزاروں وہ نوعیں فنا ہوتی رہتی ہیں' جن میں آگے بڑھنے کی صلاحیت نہیں ہوتی' اور وہی باقی رہ جاتی ہیں جن میں آئندہ بقا کی پوری استعداد ہوتی ہے' جس طرح پچھلی استعداد سے آئندہ کی استعداد پیدا ہوتی ہے' اسی طرح اس دوسری ملکوتی نوع کی استعداد ان ہی کو ملتی ہے جن کے اندر اپنی پچھلی مادی و جسمانی زندگی میں اس کی استعداد پیدا ہو چکی تھی' دوزخ کے درجے ان لوگوں کے مقامات ہیں جو گویا ہنوز' جمادی و نباتی و حیوانی منزلوں میں ہیں اور ممکن ہے کہ وہ اس دارالامتحان میں اپنی کمی استعداد کے بقدر رہ کر آگے کی استعداد پیدا کر لیں' اور ملکوتیت کی ترقی حاصل کر سکیں۔

بہشت کے مختلف مدارج ان کی استعدادوں کے مقامات ہیں وہ اپنی پہلی ہی زندگی میں اس ترقی کی استعداد پیدا کر چکے تھے لیکن یہاں پہنچ کر بھی ان کی روحانی ترقی کا دروازہ بند نہ ہوگا' بلکہ وہ بقدرِ استعداد تکمیل کے مدارج طے کرتے چلے جائیں گے' شاید اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ﴾ (التین:۶) ''ان (بہشتیوں) کے لیے نہ ختم ہونے والی مزدوری ہے۔''

ایک دوسری آیت میں ہے کہ نشاۃِ ثانیہ میں اہلِ ایمان کے آگے پیچھے' داہنے بائیں نور ہوگا' پھر بھی دعا کریں گے۔

﴿نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَ بِاَيْمَانِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَ اغْفِرْ لَنَا اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِيْرٌ﴾ (التحریم:۸)

''ان کا نور ان کے سامنے اور داہنے دوڑے گا اور وہ کہیں گے اے ہمارے پروردگار! ہمارے نور کو کامل

کراور ہم کو معاف کرتو ہر بات کرسکتا ہے۔"

مومنوں کے لبوں پر اللہ کے بخشے ہوئے نور کی مزید تکمیل اور اتمام کی دعا ادھر اشارہ کر رہی ہے کہ ان کے مدارج میں ترقی ہوتی رہے، جس کا اقتضا خدا کی ربوبیت کا منشا ہے۔

امن وسلامتی کا گھر

انسان امن وسلامتی کا بھوکا ہے لیکن وہ اس امن وسلامتی کو اسبابِ راحت کے انبار میں تلاش کرتا ہے، اور نہیں پاتا، وہ دنیا میں امن کا گوشہ ڈھونڈتا ہے، اور وہ اس کو نہیں ملتا، لیکن یہاں آ کر اس کو نہ صرف امن کا گوشہ بلکہ امن وسلامتی کی ایک دنیا ملے گی وہ پرند جو عمر بھر چار عناصر کے قفس میں گرفتار رہا، یہاں وہ سدرۃ المنتہیٰ کی ہر شاخ پر آزادانہ پرواز کرے گا، جنت کے جہاں وحیِ محمدی نے اور بہت سے نام بتائے ہیں، وہاں اس کا ایک نام دارالسلام بھی بتایا ہے جس کے معنی امن وسلامتی کے گھر کے ہیں۔

اہل جنت کی نسبت ارشاد ہے:

﴿لَهُمْ دَارُ السَّلَامِ عِنْدَ رَبِّهِمْ﴾ (انعام:۱۲۷)

"ان کے لیے ان کے پروردگار کے پاس سلامتی کا گھر ہے۔"

اللہ تعالیٰ نے جس شریعت کو دے کر اپنے پیغمبر علیہ السلام کو مبعوث فرمایا ہے وہ حقیقت میں اسی امن وسلامتی کی نوید وبشارت ہے، اسی لیے فرمایا:

﴿وَ اللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلٰى دَارِ السَّلَامِ﴾ (یونس:۲۵)

"اور اللہ سلامتی کے گھر کی طرف بلاتا ہے۔"

آنحضرت ﷺ جب مدینہ منورہ تشریف لائے تو سب سے پہلے اس امن وسلامتی کے گھر کی دعوت پیش فرمائی، عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ ایک یہودی عالم تھے، آنحضرت ﷺ کی جس صدائے نبوت نے سب سے پہلے ان کے دل میں گھر کیا، وہ یہ تھی لوگو! سلامتی پھیلاؤ، بھوکوں کو کھلاؤ، جب دنیا غفلت کی نیند سوئے تو تم اٹھ کر خدا کی عبادت کرو، امن وسلامتی کے گھر میں رہنا تم کو نصیب ہوگا۔

جنت کے ذکر میں امن وسلامتی کا تذکرہ قرآن پاک میں بار بار آیا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جنت کے در و دیوار سے امن وسلامتی کے ترانے سنائی دیں گے۔

﴿وَ الْمَلٰٓئِكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ ○ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ ○﴾ (رعد:۲۳، ۲۴)

"اور فرشتے ہر دروازہ سے ان کے سامنے یہ کہتے ہوئے آئیں گے کہ تم پر سلامتی ہو کہ تم نے صبر کیا تھا، تو کیسا اچھا پچھلا گھر ہے۔"

وہاں امن وسلامتی کے سوا کچھ اور سنائی نہ دے گا۔

﴿اِلَّا قِیۡلًا سَلٰمًا سَلٰمًا﴾ (واقعہ:۲۶)

''لیکن سلامتی سلامتی کی پکار۔''

فرشتے اہلِ جنت کو یوں کہیں گے۔

﴿اُدۡخُلُوۡهَا بِسَلٰمٍ ذٰلِکَ یَوۡمُ الۡخُلُوۡدِ﴾ (قٓ : ۳۴)

''اس جنت میں سلامتی کے ساتھ داخل ہو یہ زندگیِ جاوید کا دن ہے۔''

﴿لَا یَسۡمَعُوۡنَ فِیۡهَا لَغۡوًا اِلَّا سَلٰمًا﴾ (مریم:۶۲)

''اس میں سلامتی کے سوا کوئی اور بیہودہ بات نہ سنیں گے۔''

جنت کا ایک اور نام قرآن میں ''مقامِ امین'' امن والا مقام بتایا گیا ہے' فرمایا:

﴿اِنَّ الۡمُتَّقِیۡنَ فِیۡ مَقَامٍ اَمِیۡنٍ﴾ (الدخان:۵۱)

''بے شک پرہیز گار لوگ امن والے مقام میں ہوں گے۔''

مقامِ رحمت

خدا کی رحمت کب نہیں؟ اور کہاں نہیں؟ مگر دنیا کے فطری قوانین کے بموجب اس دنیا میں ایسے واقعات اور حادثے بھی پیش آ جاتے ہیں' جن کو ہم رحمت کے بجائے قہرِ الٰہی سے تعبیر کرتے ہیں' پھر یہ بھی واقعہ ہے کہ خود ہم کو ہمارے اعمال کی بدولت خداوند تعالیٰ کے قہر وغضب میں مبتلا ہونا پڑتا ہے' لیکن ایک عالم وہ ہے جہاں اس کی رحمت کے سوا اس کے قہر وغضب کا نام ونشان نہ ہوگا' وہاں ہر طرف اس کی رحمت اور فیض وکرم کی بارش ہوگی اور اس کی رحمت کے سوا وہاں کوئی اور منظر کبھی دکھائی نہ دے گا:

﴿یُبَشِّرُهُمۡ رَبُّهُمۡ بِرَحۡمَةٍ مِّنۡهُ وَ رِضۡوَانٍ وَّ جَنّٰتٍ لَّهُمۡ فِیۡهَا نَعِیۡمٌ مُّقِیۡمٌ﴾ (التوبہ:۲۱)

''ان کا پروردگار ان کو اپنی رحمت خوش نودی اور ان باغوں کی خوش خبری دیتا ہے جن میں ان کے لیے ہمیشہ کا آرام ہے۔''

اہل جنت کو جن کے چہرے خوشی سے دمکتے ہوں گے یہ آواز سنائی دے گی:

﴿وَ اَمَّا الَّذِیۡنَ ابۡیَضَّتۡ وُجُوۡهُهُمۡ فَفِیۡ رَحۡمَةِ اللّٰهِ هُمۡ فِیۡهَا خٰلِدُوۡنَ﴾ (آل عمران:۱۰۷)

''لیکن جن کے چہرے روشن ہوئے تو وہ اللہ کی رحمت میں ہوں گے اس میں وہ سدا رہیں گے۔''

مقامِ نور

جنت کا نور وہ مقام ہے جہاں ظلمت وتاریکی کا نام ونشان نہ ہوگا' جنتیوں کے چہرے روشن ہوں گے کوئی ستاروں کی طرح چمکے گا' اور کوئی چاند کی طرح ہر طرف ان پر انوار کی بارش ہوگی' آگے پیچھے' دائیں بائیں ہر سمت

سے نورِ درخشاں ہوگا' فرمایا:

﴿نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَ بِاَيْمَانِهِمْ﴾ (تحریم:۸)

''ان کا نوران کے سامنے اوران کے داہنے دوڑے گا۔''

اس دن اہلِ ایمان کے نورِ ایمان کی بجلیاں ہر طرف کوندیں گی:

﴿يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ يَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَ بِاَيْمَانِهِمْ بُشْرٰىكُمُ الْيَوْمَ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ﴾ (حدید:۱۲)

''جس دن تو مومن مردوں اور مومن عورتوں کو دیکھے گا کہ ان کا نوران کے سامنے اوران کے داہنے چمکے گا' آج تم کو خوش خبری ہو' وہ باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں' ان میں ہمیشہ رہا کرو گے' یہی بڑی کامیابی ہے۔''

اس دن اہلِ نفاق اہلِ ایمان سے آرزو کریں گے کہ ذرا ٹھہر جایئے کہ ہمارے ظلمت کدہ میں بھی ایک دم کے لیے روشنی ہو جائے۔

﴿يَوْمَ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَ الْمُنٰفِقٰتُ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا انْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ﴾ (حدید:۱۳)

''جس دن منافق مرد اور منافق عورتیں اہلِ ایمان سے کہیں گی کہ ذرا ٹھہرو کہ ہم بھی تمہارے نور سے روشنی لیں۔''

مقامِ رضوان

جنت کے انعامات کی فہرست میں سب سے آخری چیز مقامِ رضوان ہے' یعنی اللہ تعالیٰ کا اپنے بندہ سے راضی اور خوش ہونا کہ اس کے بعد نہ کبھی وہ اپنے اس بندہ پر عتاب فرمائے گا نہ اس سے ناراض ہوگا' بلکہ اس کو اپنی رضامندی اور خوش نودی کی لازوال دولت عطا فرمائے گا متقیوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے جو نعمتیں رکھی ہیں' ان میں جنت' نہریں' پاک بیویاں اوران سب کے بعد روح کی مسرت رکھی ہے' لیکن ان سب کے بعد بھی اپنی سب سے آخری نعمت اپنی اسی رضامندی کو ظاہر فرماتا ہے' چنانچہ سورۂ توبہ میں رحمت اور رضوان کے بعد جنت کے ذکر کو جگہ دی گئی ہے:

﴿يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَ رِضْوَانٍ وَّ جَنّٰتٍ لَّهُمْ فِيْهَا نَعِيْمٌ مُّقِيْمٌ﴾ (توبہ:۲۱)

''ان کا پروردگار ان کو اپنی رحمت اور خوش نودی (رضوان) کی خوش خبری دیتا ہے اوران باغوں کی جن میں نعمتِ الٰہی قائم رہے گی۔''

سورۂ حدید میں بھی اسی طرح مغفرت اور رضائے الٰہی کے بعد بطور تکملہ کے جنت کا ذکر آتا ہے۔ فرمایا:

﴿وَ فِی الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ شَدِیْدٌ وَّ مَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانٌ وَ مَا الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ○ سَابِقُوْٓا اِلٰی مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ جَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ اُعِدَّتْ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ یُؤْتِیْهِ مَنْ یَّشَآءُ وَ اللّٰهُ ذُوا الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ ○﴾ (حدید:۲۰،۲۱)

''اور آخرت میں سخت عذاب ہے اور خدا کی بخشش اور رضامندی بھی ہے اور دنیا کی زندگی تو دھوکے کا سامان ہے اپنے رب کی بخشش اور اس جنت کی طرف دوڑو جس کا پھیلاؤ آسمان اور زمین کے پھیلاؤ کے برابر ہے یہ ان کے لیے بنائی گئی ہے جو اللہ اور اس کے رسولوں پر یقین رکھتے ہیں یہ اللہ کی مہربانی ہے جس کو چاہتا ہے دیتا ہے اور اللہ بڑی مہربانی والا ہے۔''

سورۂ آل عمران میں جنت کی تمام نعمتوں کو گنا کر ان کا خاتمہ رضوان کی عظیم الشان بشارت پر کیا گیا ہے فرمایا:

﴿لِلَّذِیْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خَالِدِیْنَ فِیْهَا وَ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّ رِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ﴾ (آل عمران:۱۵)

''جنہوں نے پرہیزگاری کی ان کے لیے ان کے پروردگار کے پاس ایسے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں ان میں وہ سدا رہیں گے اور پاک بیویاں اور اللہ کی خوشنودی۔''

سورۂ توبہ میں جنت کی تمام نعمتوں سے بڑھ کر نعمت رضوانِ الٰہی کو قرار دیا ہے:

﴿وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِیْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا وَ مَسٰكِنَ طَیِّبَةً فِیْ جَنّٰتِ عَدْنٍ وَ رِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ﴾ (توبہ:۷۲)

''اللہ نے باایمان مردوں اور عورتوں سے ان باغوں کا وعدہ کیا ہے جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں ان میں سدا رہیں گے اور رہنے کے ستھرے گھر اور اللہ کی رضامندی سب سے بڑی ہے وہی بڑی کامیابی ہے۔''

بہشت کی مطمئن روحوں کو یہ نوید مسرت سنائی جاتی ہے:

﴿یٰٓاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ○ ارْجِعِیْٓ اِلٰی رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً ○﴾ (فجر:۲۷،۲۸)

''اے اطمینان والی روح! تو اپنے رب کے پاس اسی طرح واپس جا کہ تو اس سے راضی ہو اور وہ تجھ سے راضی ہو۔''

اہل جنت کی یہ صفت آئی ہے:

﴿رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ﴾ (مائدۃ:۱۱۹)

''خدا ان سے خوش اور وہ خدا سے خوش۔''

ان ہی آیتوں کی تفسیر میں آنحضرت ﷺ نے یہ بشارت سنائی ہے کہ ''خداوند تعالیٰ اہلِ جنت کو آواز دے گا کہ اے جنت والو! وہ جواب دیں گے کہ اے خداوند! ہم حاضر ہیں سب بھلائیاں تیرے پاس ہیں' فرمائے گا (جنت کی نعمتیں پاکر) اب تم خوش ہوئے' عرض کریں گے' پروردگار کیوں خوش نہ ہوں کہ تو نے ہم کو وہ کچھ دیا جو کسی کو نہیں دیا' فرمائے گا کہ میں ان تمام گزشتہ نعمتوں سے بڑھ کر جو چیز ہے وہ تم کو نہ دوں؟ کہیں گے اے پروردگار! ان سے بہتر کیا ہے فرمائے گا یہ کہ اپنی رضامندی وخوشی تم پر اتاروں پھر اس کے بعد میں کبھی تم سے ناراض نہ ہوں گا۔ (۱)

مقامِ طیب وطاہر

موجودہ دنیا کی ہر چیز آلودگیوں اور نجاستوں سے بھری ہے لیکن بہشت وہ مقام ہے جو پاکی' ستھرائی' لطافت اور طہارت کا مظہر ہے' اس میں وہی داخل ہوں گے جو گناہوں سے پاک ہو چکے ہوں' فرمایا:

﴿طِبْتُمْ فَادْخُلُوْهَا خَالِدِيْنَ﴾ (زمر:۷۳)

''تم پاک ہو چکے تو جنت میں ہمیشہ کے لیے داخل ہو جاؤ۔''

جو زندگی وہاں ملے گی' وہ بھی پاک وصاف اور ستھری اور ہر جسمانی وروحانی آلائش سے بری ہوگی' فرمایا:

﴿مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً وَّ لَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾ (نحل:۹۷)

''مرد ہو یا عورت جس نے مومن بن کر اچھے کام کیے ہم اس کو ایک پاک زندگی دے کر جلائیں گے اور ان کو ہم ان کے سب سے بہتر عمل کے مطابق بدلہ دیں گے۔''

جو گھر وہاں ملیں گے وہ بھی پاک وصاف اور ستھرے ہوں گے ﴿وَ مَسٰكِنَ طَيِّبَةً﴾ (صف:۳) ''اور پاک گھر۔'' جو بیویاں ملیں گی وہ بھی پاک ہوں گی۔

﴿وَ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ﴾ (آل عمران:۱۵)

''اور پاک بیویاں۔''

وہاں کی جو باتیں ہوں گی وہ بھی پاک ہوں گی۔

﴿وَ هُدُوْٓا اِلَى الطَّيِّبِ مِنَ الْقَوْلِ﴾ (حج:۲۴)

''اور اہل جنت کو پاکیزہ گفتگو کی طرف رہنمائی کی جائے گی۔''

ان کے پینے کی جو چیز ملے گی وہ بھی پاک ہوگی۔

﴿شَرَابًا طَهُوْرًا﴾ (دہر:۲۱)

---

(۱) صحیح بخاری ومسلم صفۃ الجنۃ۔

''پینے کی پاک چیز۔''

غرض کہ ہر چیز وہاں پاک' صاف طیب وطاہر اور تمام روحانی وجسمانی آلودگیوں سے مبرا ہوگی۔

مقامِ تسبیح وتہلیل

اس آرام ولطف کے بعد اہلِ جنت کی روحانی وجسمانی لذت' اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا اور تسبیح وتہلیل ہوگی' یہ ان کی روحانی غذا ہوگی' وہ عالم جہاں ہر طرف انوارِ الٰہی برسیں گے' جہاں صفائی اور ستھرائی کے سوا کوئی اور منظر نہ ہوگا جہاں قدس ونزاہت کی ہر طرف صورتیں نظر آئیں گی' وہاں حمد وثنا کے روح افزا ترانے بھی ہر طرف سے بلند ہوں گے:

﴿دَعْوَاهُمْ فِيْهَا سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ وَ تَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ وَ اٰخِرُ دَعْوٰهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ (یونس:۱۰)

''جنت میں ان کی ندا یہ ہوگی کہ اے میرے اللہ! تیری پاکی اور ان کی آپس کی دعا سلامتی ہوگی اور ان کی آخری پکار یہ ہوگی کہ دنیا کے پروردگار اللہ (تعالیٰ) کی حمد ہو۔''

جنت کی تمام شاہانہ نعمتوں کے بعد بڑی نعمت یہ ہوگی کہ خدا کی تسبیح وتہلیل کی نئی نئی پر لطف راہیں وہاں پر کھلیں گی' فرمایا:

﴿اِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّ لُؤْلُؤًا وَّلِبَاسُهُمْ فِيْهَا حَرِيْرٌ ○ وَ هُدُوْٓا اِلَى الطَّيِّبِ مِنَ الْقَوْلِ وَ هُدُوْٓا اِلٰى صِرَاطِ الْحَمِيْدِ﴾ (حج:۲۳'۲۴)

''بے شک اللہ ان کو جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے ان باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں' ان میں ان کو سونے کے کنگن اور موتی پہنائے جائیں گے اور ان کی پوشاک ان میں ریشم کی ہوگی' اور وہ راہ دکھائے جائیں اچھی بات کی اور وہ دکھائے جائیں گے' اس سراپا حمد (ذات) کی راہ۔''

وہ اپنے ہر سرور اور نعمت کے شکریہ میں فرشتوں کے ساتھ مل کر حمدِ الٰہی کا سرودِ سرمدی گائیں گے اور یہ وہ وقت ہوگا جب عالمِ وجود کے ہر گوشہ سے اس کی حمد کا ترانہ بلند ہوگا' فرمایا:

﴿وَ قَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوْهَا خٰلِدِيْنَ ○ وَ قَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ صَدَقَنَا وَعْدَهٗ وَ اَوْرَثَنَا الْاَرْضَ نَتَبَوَّاُ مِنَ الْجَنَّةِ حَيْثُ نَشَآءُ فَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ ○ وَ تَرَى الْمَلٰٓئِكَةَ حَآفِّيْنَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَ قُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ وَ قِيْلَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○﴾ (زمر:۷۳'۷۵)

''جنت کے نگہبان ان سے کہیں گے تم پر سلامتی ہو تم پاک ہو چکے تو جنت میں چلے جاؤ' اہلِ جنت کہیں گے اس اللہ کی حمد ہو جس نے اپنا وعدہ سچا کیا اور ہم کو اس سرزمین کا مالک کیا کہ جنت میں جہاں چاہیں

رہیں تو کام کرنے والوں کی کیسی اچھی مزدوری ہے اور تو دیکھے گا کہ فرشتے عرشِ الٰہی کو گھیرے اپنے پروردگار کی حمد کی تسبیح کر رہے ہوں گے اور سب لوگوں کے درمیان فیصلہ کیا جائے گا اور کہا جائے گا کہ حمد ہو سارے عالم کے پروردگار کی۔"

اہل جنت کے متعلق قرآن پاک میں ایک جگہ ہے:

﴿لَا یَسْمَعُوْنَ فِیْهَا لَغْوًا اِلَّا سَلٰمًا وَّ لَهُمْ رِزْقُهُمْ فِیْهَا بُكْرَةً وَّ عَشِیًّا﴾ (مریم:۶۲)

"وہ نہ سنیں گے وہاں بیکار بات مگر سلام اور ان کی روزی اس میں صبح اور شام ہوگی۔"

اس صبح و شام کی روزی سے مقصود کیا جنت کے کھانے کے الوانِ نعمت ہیں؟ اگر ایسا ہوتا تو صبح و شام کی تخصیص کیا تھی وہ تو ہر وقت سامنے ہوں گے میرا گمان یہ ہے کہ وہ اس روزی سے خدا کی تسبیح و تہلیل کی روحانی روزی اور ربانی غذا مراد ہے اور حدیث کے ان لفظوں کو اسی کی تفسیر جانتا ہوں صحیح مسلم میں ہے کہ آپ نے جنت کی نعمتوں کے سلسلہ میں فرمایا۔

﴿یُسَبِّحُوْنَ اللّٰهَ بُكْرَةً وَّ عَشِیًّا﴾ (صحیح مسلم باب صفۃ الجنۃ)

"وہ صبح اور شام اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تقدیس کریں گے۔"

ایک اور حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ اہلِ جنت کو خدا کی تسبیح و تقدیس کا الہام ہوا کرے گا اور شاید قرآن پاک کی اس آیت کے یہی معنی ہوں:

﴿وَ هُدُوْٓا اِلَى الطَّیِّبِ مِنَ الْقَوْلِ وَ هُدُوْٓا اِلٰى صِرَاطِ الْحَمِیْدِ﴾ (حج:۲۴)

"اور اچھی بات کی طرف ان کی رہنمائی کی جائے گی اور اس سراپا حمد کا راستہ ان کو بتایا جائے گا۔"

مقامِ قرب

اہلِ جنت کو جو کچھ نصیب ہوگا' ان کے سوا سب سے اعلیٰ مرتبہ' قرب خاص کا مقام ہوگا' بندے اپنے پروردگار کی حضوری کا شرف پائیں گے' قرآن پاک میں جابجا ان کے لیے یہ آتا ہے۔ جَزَآؤُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ۔ (ان کی جزا ان کے پروردگار کے پاس) یہ قربِ خاص کے اشارے ہیں اور ایک جگہ یہ اشارہ اس تصریح سے بدل جاتا ہے:

﴿اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِیْ جَنّٰتٍ وَ نَهَرٍ ○ فِیْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِیْكٍ مُّقْتَدِرٍ﴾ (قمر:۵۴'۵۵)

"بے شک پرہیزگار باغوں میں اور نہروں میں سچائی کی نشست گاہ میں اس بادشاہ کے حضور جس کا سب پر قبضہ ہے۔"

دیدار

جنت کی سب سے آخری لیکن بڑی نعمت اللہ تعالیٰ کی تجلی کا نظارہ ہے' کون ہے جو اس مطلعِ انوار کے دیدار

کی تاب لا سکے تاہم یا تو یہ آنکھیں اور ہوں گی' یا وہ نورِ مطلق کسی خاص شان میں نمایاں ہوگا' اس وقت یہ عالم ہوگا کہ وہ نور کا مرکز بن کر نمودار ہوگا' اور اہلِ جنت کی مشتاق آنکھیں اس کی طرف اٹھی ہوں گی۔

﴿وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ○ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ﴾ (قیامۃ:۲۲'۲۳)

''کتنے چہرے اس دن تروتازہ اور اپنے پروردگار کی سمت دیکھ رہے ہوں گے۔''

اسی آیت کی تفسیر میں حضرت جریر بنؓ عبداللہ صحابی روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ تم ''اپنے پروردگار کو بالمشاہدہ دیکھو گے۔'' دوسری روایتوں میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ جیسے چاند کو تم دیکھ رہے ہو ایسے ہی تم اپنے پروردگار کو دیکھو گے' اس دیدار و رؤیت میں کوئی ایک دوسرے کا مزاحم نہ ہوگا۔ (۱) اس تمثیل سے رسول اللہ ﷺ کے دو مقصود ہیں ایک تو شدتِ یقین کا اظہار کہ جس طرح تم اس روشن چاند کو بے شک وشبہ دیکھ رہے ہو اسی طرح بے شک وشبہ اپنے پروردگار کو دیکھو گے' دوسرا مقصد یہ ہے کہ جس طرح لاکھوں کا مجمع بھی ہو تو سب لوگ ایک چاند کو یکساں حیثیت سے باطمینان اس طرح دیکھ سکتے ہیں کہ ایک کا دیکھنا دوسرے کے دیکھنے میں عائق نہیں ہوتا' اسی طرح دیدارِ الٰہی میں کروڑوں کا ہجوم ہوگا اس میں خدا کے دیدار سے ایک دوسرے کا مانع نہ ہوگا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ جس دن جنتی اپنے پروردگار کے حضور میں پیش ہوں گے ان کی زبان پر سلامتی کی دعا ہوگی۔

﴿تَحِيَّتُهُمْ يَوْمَ يَلْقَوْنَهٗ سَلَامٌ﴾ (احزاب:۴۴)

''ان کی دعا جب وہ اپنے پروردگار سے ملیں گے سلامتی ہوگی۔''

بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ وہ سراپا رحمت پروردگار خود اپنے بندہ کو اپنی زبان سے سلامتی کا پیام دے گا۔

﴿سَلَامٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيْمٍ﴾ (یٰسٓ:۵۸)

''رحمت والے پروردگار کی طرف سے پیام سلامتی ہوگا۔''

بخاری میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا خداوند تعالیٰ اپنے بندہ سے ترجمان کے بغیر خود کلام فرمائے گا۔ (۲)

یہ رؤیت کیونکر ہوگی؟ اہلِ روایت لفظ کے قائل ہیں۔ اہلِ عقل زیادتِ ایمان کی تاویل کرتے ہیں' اہلِ حقیقت اس کو اسماء وصفات کی ناقابلِ بیان جلوہ انگیزی سے تعبیر کرتے ہیں' لیکن فیصلہ یہ ہے۔

بیا کیں داور یہارا پیشِ داور اندازیم

ان تعلیمات کا عملی اثر

اوپر کے صفحوں میں قیامت حشر ونشر اور جنت ودوزخ کے پورے مناظر گزر چکے۔ یہ ایمان بالغیب مذہب کی حقیقت کا اصلی جوہر ہے' اور اسی کے یقین میں مذہب کی اصلی طاقت پوشیدہ ہے۔ معلوم ہو چکا ہے کہ اہلِ عرب

(۱) صحیح بخاری جلد ثانی ص ۱۱۰۵۔

(۲) صحیح بخاری ج ثانی باب کلام الرب۔

کوان حقائق کی تسلیم سے کس قدر انکار تھا بلکہ مرکر جی اٹھنا اور اس موت کے بعد دوبارہ زندہ ہونا ان کے نزدیک کس قدر مستبعد تھا' قرآن پاک کا بڑا حصہ شرک کے ابطال اور توحید کے اثبات کے بعد اسی حیات بعد الموت کی تلقین اور اس پر ایمان کی دعوت پر مشتمل ہے آنحضرت ﷺ اپنے اکثر خطبوں میں اس کا حال بیان کیا کرتے تھے' اور جمعہ کے خطبوں' میں خصوصیت کے ساتھ سورۂ قٓ تلاوت فرماتے تھے' جس میں قیامت کے حالات ہیں' مگر دیکھو کہ ۲۳ برس کی مسلسل تعلیم قرآن پاک کی تاثیر اور محمد رسول اللہ ﷺ کے فیضِ ہدایت سے نہ صرف ان کا انکار اقرار سے بدل گیا' بلکہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ مناظر ان کے دل و دماغ کی لوح میں منقوش ہو گئے تھے۔

یاد ہوگا کہ اسلام کے آغاز میں ایک عرب شاعر نے طنزاً کہا تھا:

اَمُوْتُ ثُمَّ بَعَثَ ثُمَّ حَشَرَ
حَدِیْثُ خَرَافَةُ یَا اُمِّ عَمَرَوْ

''کیا مرنا ہے' پھر جینا اور پھر اکٹھا ہونا
اے عمرو کی ماں یہ خرافات باتیں ہیں''

لیکن چند ہی سال کے بعد یہ طنز انکار' رمز یقین سے بدل گیا' اور اس وقت عرب کا شاعر یہ کہنے لگا۔

''ہم آسمان تک پہنچ گئے' اور خدا سے امید ہے کہ ہم اس سے بھی اونچے ہو جائیں گے۔ (۱)

وَ اِنَّا لَنَرْجُوْا فَوْقَ ذٰلِكَ مَظْهَرًا

''اور ہم یہ امید رکھتے ہیں کہ اس سے بھی بلند مقام میں ظہور کریں۔''

آنحضرت ﷺ استفسار فرماتے ہیں کہ آسمان سے بھی بلند مقام اور کیا ہے عرض کرتا ہے کہ جنت یا رسول اللہ! آپؐ فرماتے ہیں ان شاء اللہ دیکھو کہ جن کی نظریں زمین سے اونچی نہیں جا پاتی تھیں ان کا تخیل آسمان سے بھی اونچا جانے لگا جن کو مر کر پھر جینا دور از عقل معلوم ہوتا تھا' جن کو آخرت کے مؤاخذہ کا کوئی ڈر نہ تھا جن کو اپنے اعمال کی جواب دہی کی پروانہ تھی' جو سزا و جزا کے مفہوم سے بیگانہ تھے' جو جنت و دوزخ کے تخیل سے ناآشنا تھے' وہ اس ہولناک منظر سے ڈرنے لگے۔ دوسری زندگی پر ان کو اسی طرح یقین آ گیا جس طرح آج کی زندگی پر تھا' آخرت کے مؤاخذہ سے وہ بید کی طرح کانپنے لگے' اعمال کی جواب دہی سے ترساں ولرزاں رہنے لگے' سزاء و جزا کے خوف سے وہ اپنے ہر عمل کی باز پرس خود کرنے لگے' جنت کا اشتیاق ان کو بڑی سے بڑی قربانی پر آمادہ کر دیتا تھا' دوزخ کا ڈر ان کے دل کے اندر کے ہر تار کو چھیڑا کرتا تھا' ان کی آنکھوں کو اشک بار کرتا تھا' فرائض اور ذمہ داری کو دیانت داری کے ساتھ ادا کرنے پر ہر لحظہ ان کو آمادہ کرتا رہتا تھا' راحت کے خواب اور آرام کے بستر سے ان کو چونکا کر عمل کے میدان میں تنہا لے آتا تھا اور ہر نیک کام اور عمدہ عمل کے لیے ان کو ہمہ تن سرگرم اور سرتاپا مصروفِ جدوجہد بنا دیتا تھا' تنہائی اور تاریکی میں بھی ان کے دل اور بدن کی برائیوں اور بداعمالیوں سے باز رکھتا تھا' ان

(۱) اصابہ اور استیعاب ذکر نابغہ جعدی۔

کے ضمیر اور دل کے صفحوں کو ہر وقت خدا کی آنکھوں کے سامنے کھلا رکھتا تھا۔

ایک دفعہ کسی حقیت کے متعلق دو صحابیوں میں جھگڑا تھا' آنحضرت ﷺ نے فریقین کی باتیں سن کر ایک کے حق میں فیصلہ دے دیا' پھر فرمایا میں بھی ایک آدمی ہوں' مدعی اور مدعا علیہ میں سے ممکن ہے کہ کوئی زیادہ اچھا بولنے والا ہو جو اپنے دعویٰ کو خوبی کے ساتھ بیان کرے اور میں اس کے موافق اس کا فیصلہ دوں لیکن درحقیقت وہ چیز اس کی نہ ہو' تو گویا میں اس کے گلے میں آگ کا ایک طوق پہنا رہا ہوں' یہ سن کر فریقین پر یہ اثر ہوا کہ دونوں رونے لگے اور ہر ایک اپنا حصہ دوسرے کو دینے لگا۔ (۱)

حضرت عمرؓ خدا کے مطیع و فرمان بردار تھے' رسول کے عاشق اور شیدا تھے' نیکیوں سے مالا مال تھے' جنت کی بشارت سے سرفراز تھے' تاہم آخرت کے مؤاخذہ اور جواب دہی سے اس قدر خوف زدہ تھے کہ ایک دفعہ انہوں نے کہا کہ ''اگر وصالِ نبوی کے بعد میرے اچھے اور برے اعمال برابر برابر رہیں تو بھی میں خوش ہوں' اگر جنت نہ ملے تو پروا نہیں' مگر الٰہی دوزخ نہ ملے' (۲) وہ نزع کی حالت میں بہت بے چین تھے۔ بعض صحابہؓ ان کے اچھے اعمال گنا کر ان کو تسلی دینے لگے تو جواب میں کہا' خدا کی قسم اگر کل زمین میرے لیے سونا ہو جاتی کہ اس کو دے کر عذاب الٰہی سے بچ سکتا تو میں دے دیتا۔ (۳) ام المومنین حضرت عائشہؓ کہتی تھیں۔ اے کاش میں جنگل کی گھاس ہوتی۔ (۴) اے کاش میں کچھ نہ ہوتی۔ (۵) قیامت کے متعلق قرآن پاک کی یہ عجیب مؤثر آیت

﴿یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَیْءٌ عَظِیْمٌ ○ یَوْمَ تَرَوْنَهَا تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّآ اَرْضَعَتْ وَ تَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا وَ تَرَى النَّاسَ سُكٰرٰى وَ مَا هُمْ بِسُكٰرٰى وَ لٰكِنَّ عَذَابَ اللّٰهِ شَدِیْدٌ ○﴾ (حج:۱'۲)

''لوگو! اپنے رب سے ڈرو' قیامت کا بھونچال ایک بڑی چیز ہے جس دن اس کو دیکھو گے' ہر دودھ پلانے والی عورت اپنے دودھ پیتے بچہ کو بھول جائے گی اور پیٹ والی اپنا پیٹ ڈال دے گی اور لوگوں کو نشہ میں دیکھو گے لیکن وہ نشہ میں نہ ہوں گے' بلکہ اللہ کا عذاب سخت ہوگا۔''

جب اتری اور آنحضرت ﷺ نے صحابہؓ کو سنایا اور اس کی تفسیر کی تو ان کے چہروں کا رنگ بدل گیا (۶) اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ (۷) ایک دفعہ آنحضرت ﷺ نے قبر کا ذکر کیا اور موت کے بعد کے عذاب کا

---

(۱) سنن ابی داؤد کتاب الاقضیہ۔
(۲) صحیح بخاری باب الھجرۃ جلد اول ص ۵۵۔
(۳) صحیح بخاری فضائل حضرت عمرؓ جلد اول ص ۵۲۱۔
(۴) ابن سعد جزء النساء ص ۵۱۔
(۵) صحیح بخاری مناقب عائشہؓ و تفسیر سورۂ نور و مستدرک حاکم ترجمہ عائشہؓ و ابن حنبل مسند عائشہؓ۔
(۶) صحیح بخاری تفسیر سورۂ حج ج ۲ ص ۶۹۳۔
(۷) جامع ترمذی تفسیر سورۂ حج۔

حال بیان کیا تو صحابہؓ چیخیں مار مار کر رونے لگے'(۱) حضرت ابو ہریرہؓ کو ایک بار قیامت کے ایک منظر کے بیان کرنے کی ضرورت پیش آئی تو اثنائے روایت میں وہ تین دفعہ بے ہوش ہو کر گرے' اور جب امیر معاویہؓ کے سامنے یہ آیت دہرائی گئی تو ان پر بھی گریہ طاری ہو گیا۔ (۲)

اس یقین و ایمان کا دوسرا سماں یہ ہے کہ بدر کا میدانِ جنگ ہے' مشرکین کی ایک ہزار لوہے میں ڈوبی ہوئی فوج کا سیلاب امنڈا آ رہا ہے' ادھر تین سو نہتے مسلمان صف باندھے کھڑے ہیں کہ آپ صحابہؓ کی طرف خطاب کر کے فرماتے ہیں ''لو اس جنت کا موقع سامنے ہے جس کی وسعت آسمان و زمین کے برابر ہے۔'' ایک انصاری حیرت سے پوچھتے ہیں کہ کیا آسمان و زمین کے برابر؟ آپؐ فرماتے ہیں ہاں' وہ خوشی سے واہ واہ کہہ اٹھتے ہیں آپؐ دریافت فرماتے ہیں کہ تم نے واہ واہ کیوں کہا' عرض کی' اس امید سے کہ شاید میں بھی اس میں ہوں' فرمایا تم اس میں ہو' یہ سن کر وہ کھجور نکال کر جلدی جلدی کھانے لگا۔ بالآخر جنت کے جانے میں اتنا توقف بھی شاق گزرا' بولے اتنی دیر بھی کیوں کی جائے' یہ کہہ کر کھجوریں پھینک دیں اور تلوار کھینچ کر آگے بڑھے اور شہید ہوئے۔

غزوۂ احد میں بھی اسی قسم کا ایک واقعہ پیش آیا' احد کے میدان میں دار و گیر کا شور برپا تھا' لاشوں پر لاشیں گر رہی تھیں کہ ایک صحابیؓ نے آگے بڑھ کر پوچھا یا رسول اللہ! اگر خدا کی راہ میں مارا گیا تو کہاں ہوں گا؟ فرمایا جنت میں۔ وہ کھجور کھا رہے تھے' ہاتھ سے کھجوریں پھینک دیں اور لڑ کر جان دے دی' اور قیسؓ ایک صحابی تھے وہ ایک جہاد میں شریک تھے' انہوں نے اسلامی فوج کے سپاہیوں کے سامنے کہا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ جنت کے دروازے تلواروں کے سائے کے نیچے ہیں ایک معمولی سا مسلمان پاس کھڑا تھا' اس نے آگے بڑھ کر پوچھا کہ کیا آپ نے خود رسول اللہ ﷺ کو یہ کہتے سنا ہے' انہوں نے کہا ہاں' یہ سن کر وہ اپنے دوستوں کے پاس آیا اور سلام کر کے رخصت ہوا' میان توڑ کر پھینک دی اور تلوار لے کر دشمن کی صف میں جا پڑا اور شہادت حاصل کی۔ (۳) ان حیرت انگیز واقعات میں سے ہر ایک واقعہ پر غور کرو کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم نے منکر اور کافر عربوں کے دل و دماغ اور ذہنی اعتقاد کو کس طرح آن کی آن میں بدل دیا اور دم کے دم میں ان کے عقائد و اخلاق کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔

❀ ❀ ❀ ❀

(۱) سنن نسائی کتاب الجنائز باب التعوذ من القبر۔

(۲) جامع ترمذی ابواب الزہد۔

(۳) یہ تینوں واقعے صحیح مسلم کتاب الجہاد باب ثبوت الجنۃ للشہید میں ہیں' دوسرا واقعہ سنن نسائی میں بھی ہے کتاب الجہاد باب ثواب من قتل فی سبیل اللہ۔

قضاءوقدر

﴿اِنَّا كُلَّ شَیْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ﴾ (قمر:۴۹)

(بے شک ہم نے ہر چیز کو ایک (مقررہ) اندازے پر پیدا کیا)

اگرچہ قرآن پاک میں ایمان کے سلسلہ میں اس کا ذکر کہیں نہیں آیا' مگر اس کا اعادہ بار بار قرآن میں اتنی دفعہ ہوا ہے کہ اس کی اہمیت اس کی مقتضی ہے کہ اس کو بھی ایمانیات کے پہلو میں جگہ دی جائے' چنانچہ بعض صحیح حدیثوں میں یہ ایمانیات کی آخری کڑی قرار بھی دی گئی ہے' اور سلسلۂ توحید میں اسلام نے اللہ تعالیٰ کی وسعت قدرت اور مشیتِ مطلقہ کا جو نقشہ کھینچا ہے' اس کا لازمی نتیجہ بھی یہی ہونا چاہیے۔

اس عقیدہ کا ماحصل یہ ہے کہ دنیا میں جو کچھ اب تک ہوا ہے' جو کچھ ہو رہا ہے اور جو کچھ آئندہ ہوگا وہ اللہ تعالیٰ کے علم سابق اور فیصلۂ ازلی کے مطابق ہوا ہے' ہوتا ہے اور ہوگا جس طرح مہندس اور انجینئر مکان بنانے سے پہلے مکان کی تمام جزئیات پر غور کر کے پہلے ہی سے نقشہ تیار کر لیتے ہیں اور اسی مجوزہ نقشہ کے مطابق معمار اور مزدور اس کی تعمیر کو مکمل کرتے ہیں' اسی طرح مہندسِ ازل خالقِ کائنات نے کائنات کی پیدائش سے پہلے اس کے تمام اصول وقواعد اور دوسرے اہم جزئیات طے کر کے ہر چیز کی نسبت فیصلہ کر دیا تھا۔ اب اسی فیصلہ کے مطابق یہ کائنات اور اس کے تمام حوادث و واقعات انجام پا رہے ہیں' موت وحیات' فقر وغنا' کامیابی و ناکامی' تکلیف و راحت ہر چیز پہلے سے طے شدہ ہے اور اسی کے مطابق وہ ظہور پذیر ہوتی ہے۔

یہ عقیدہ بھی اسلام کے ساتھ مخصوص نہیں جو کچھ مخصوص ہے وہ اس کی تکمیلی تعلیم ہے۔

توراۃ میں حضرت آدمؑ وشیطان اور ہابیل وقابیل کے قصوں میں اس عقیدہ کے اشارات پائے جاتے ہیں حضرت یوسف کا خواب اسی حقیقت کی تعبیر ہے مگر ان اشارات سے گذر کر زبور میں اس کی کھلی کھلی تعلیم بھی ملتی ہے زبور ۱۳۸۔۱۴ میں ہے۔

''تیرے کام حیرت افزا ہیں' اس کا میرے جی کو بڑا یقین ہے جب کہ میں پردے میں بنایا جاتا تھا اور زمین کے اسفل میں منقوش ہوتا تھا تو میرے جسم کی صورت تجھ سے چھپی نہ تھی' تیری آنکھوں نے میرے بے ترتیب مادہ کو دیکھا اور تیرے دفتر میں یہ سب چیزیں تحریر کی گئیں' اور ان کے دلوں کا حال بھی کہ کب بنیں گی' جب ہنوز ان میں سے کوئی بھی نہ تھی۔''

اس کے بعد زبور ۱۴۸ کا ترانہ حمد اسی لے میں شروع ہوتا ہے۔

”۔۔۔۔۔۔۔خداوند کے نام کی ستائش کریں کہ اس (خدا) نے حکم دیا' اور وہ (مخلوقات) موجود ہو گئے اس نے ان کو پائداری بخشی اس نے ایک تقدیر مقرر کی جو ٹل نہیں سکتی۔ (۱)

انجیل میں اس کی تعلیم ”خدا کی مرضی“ کے عنوان سے ہے' حضرت عیسیٰ علیہ السلام زندگی کی آخری شب کی دعا میں فرماتے ہیں۔ میری مرضی نہیں تیری مرضی پوری ہو (متی ۲۶۔۳۹) اور اسی کا ذکر یوحنا (۵۔۳۔۶۔۳۸) اور خطوط فلپون (۲۔۱۳) میں ہے اور رومیوں کے نویں باب میں اس کی پوری تفصیل ہے مگر خاتم النبیین علیہ الصلوٰۃ و السلام کی تعلیم نے اول یہ کیا کہ اس مسئلہ کی مجمل حقیقت کی توضیح اور اس کی حکمت و مصلحت کی تشریح کی اور پھر یہ کیا کہ گزشتہ مذاہب کی طرح اپنے دفتر کے کسی ایک گوشہ میں بطور ایک حقیقتِ ثانیہ کے اس کو کہہ کر خاموشی اختیار نہیں کر لی بلکہ بار بار اتنی دفعہ دہرایا کہ سننے والوں کے دلوں میں اس کی عقیدت نے گھر کر لیا اور یہ تلقین یقین کی صورت میں ان کی رگ و ریشہ میں پیوست ہو گئی' اور ایسا اس نے اس لیے کیا کہ صبر و شکر کی اخلاقی تعلیم صرف نظریہ کی صورت میں نہ رہ جائے بلکہ عملی حیثیت سے اس کے پیروؤں کے اندر استقلال و ثبات کی روح اور دنیا کے مصائب و حوادث میں تسلی و تشفی کی قوت پیدا کرے' اور اس طرح یہ عقیدہ پہلے کی طرح صرف ایک مذہبی تلقین یا فلسفیانہ نظریہ کی حیثیت میں نہ رہے بلکہ ایک مفید عملی تعلیم کی شکل اختیار کر لے۔

وحیِ محمدی نے اس اصطلاح کے لیے دو لفظ اختیار کیے ہیں' ایک قدر ہے جس کے معنی اندازہ کرنے کے ہیں اور دوسرا قضا جس کے معنی فیصلہ کرنے کے ہیں۔

﴿اِنَّا كُلَّ شَیْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ﴾ (قمر:۴۹)

”ہم نے ہر چیز کو اندازہ سے پیدا کیا۔“

﴿هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ طِیْنٍ ثُمَّ قَضٰۤى اَجَلًا﴾ (انعام:۲)

”وہی ہے جس نے تم کو مٹی سے بنایا' پھر ایک وقت کا فیصلہ کیا۔“

یہ دونوں لفظ بجائے خود اس عقیدہ کی اسلامی حقیقت کو پوری طرح واضح کر دیتے ہیں' مقصود یہ ہے کہ کائنات کی پیدائش سے پہلے کائنات کی ہر چیز کے متعلق اللہ تعالیٰ نے اپنے اندازہ اور تقدیر سے ہر ایک کا فیصلہ فرما دیا ہے اور متعین کر دیا ہے اسی کے مطابق یہ کائنات چل رہی ہے' اس میں خدا کے حکم کے بغیر ایک ذرہ کا بھی تغیر نہیں ہو سکتا آسمان کو جس طرح بنایا' آفتاب کو جس طرح روشن کیا' چاند کے متعلق جو اصول مقرر فرما دیا' ستاروں کے نکلنے اور ڈوبنے کے جو احکام دے دیے' موت و حیات' فنا و بقا اور عروج و زوال غرض کائنات کی ہر شق اور ہر پہلو کے متعلق جو اصول متعین فرما دیے انہی پر وہ چل رہی ہے قرآن پاک میں کائنات کے بہت سے حالات بیان کرنے کے بعد ہے:

﴿وَ الشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ذٰلِكَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ ○ وَ الْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ

(۱) صحیح مسلم بروایت ابن عمرؓ و ابو ہریرہؓ باب الایمان۔

حَتّٰی عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِيْمِ ○ لَاالشَّمْسُ يَنْبَغِیْ لَهَا اِنْ تُدْرِكَ الْقَمَرُ وَ لَاالَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ وَ كُلٌّ فِیْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ○﴾ (یٰسٓ :۳۸، ۴۰)

''اور سورج اپنے ٹھہراؤ پر چل رہا ہے' یہ ہے غالب اور علم والے کی تقدیر (اندازہ) اور چاند کو ہم نے تقدیر (اندازہ) کر دی ہے منزلیں یہاں تک کہ وہ پرانی ٹہنی کی طرح (خمیدہ) ہو کر لوٹتا ہے' نہ تو سورج کی قدرت میں ہے کہ چاند کو پالے اور نہ رات دن سے آگے بڑھے ہر ایک اپنے مدار میں تیر رہا ہے۔''

یہ تو آسمان کی بات تھی' زمین کے متعلق ارشاد ہوا:

﴿وَ قَدَّرَ فِيْهَآ اَقْوَاتَهَا﴾ (حم السجدۃ:۱۰)

''اور زمین میں اس کی روزیاں اندازہ کر دیں۔''

اس سے آگے بڑھ کر یہ کہ دنیا کی ہر چیز میں اس نے ایک اندازہ مقرر کر دیا۔

﴿قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَیْءٍ قَدْرًا﴾ (طلاق:۳)

''اللہ نے ہر چیز کے لیے ایک اندازہ بنایا ہے۔''

موت وحیات بھی اسی اندازہ کے مطابق ہے' فرمایا:

﴿نَحْنُ قَدَّرْنَا بَيْنَكُمُ الْمَوْتَ﴾ (واقعہ:۶۰)

''ہم نے تمہارے درمیان موت کو اندازہ کر دیا۔''

ہر شے میں اللہ تعالیٰ نے جو اندازہ لگایا ہے وہ وہی ہے جس کو لوگ قانونِ قدرت کہتے ہیں اور جس پر دنیا چل رہی ہے' اسی طرح اللہ تعالیٰ نے کائنات کے ہر حصہ اور ہر پہلو کے متعلق اپنے احکام معین فرما دیے ہیں' جن کی اطاعت اس پر واجب ہے۔ علیٰ ہذا انسانوں کی ترقی وزوال' موت وحیات' بیماری وصحت' دولت وافلاس' آرام و تکلیف' سعادت وشقاوت ہر ایک کے اصول وقواعد مقرر فرما دیے ہیں' غرض ان کو آرام وتکلیف جو کچھ بھی پیش آتی ہے خدا کے علم اور اجازت سے پیش آتی ہے۔

﴿مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ (تغابن:۱۱)

''نہیں پہنچتی تم کو کوئی مصیبت لیکن اللہ کے حکم سے۔''

اور چونکہ تقدیر سے کوئی چیز ہٹ نہیں سکتی' اسی لیے مقدرات کو نوشتۂ الٰہی سے تعبیر کرتے ہیں کہ جس طرح لکھی ہوئی بات قائم رہتی ہے مٹتی اور بھولتی نہیں' ایسے ہی یہ باتیں بھی مٹتی اور بدلتی نہیں۔

﴿وَ مَا تَحْمِلُ مِنْ اُنْثٰی وَ لَا تَضَعُ اِلَّا بِعِلْمِهٖ وَ مَا يُعَمَّرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ وَ لَا يُنْقَصُ مِنْ عُمُرِهٖٓ اِلَّا فِیْ كِتٰبٍ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ﴾ (فاطر:۱۱)

''اور کوئی عورت حمل میں نہیں رکھتی' اور نہ جنتی ہے' لیکن خدا کے علم سے اور نہ کسی دراز عمر کو عمر کی درازی ملتی ہے' یا اس کی عمر کم کی جاتی ہے لیکن وہ کتاب میں ہے' بے شک یہ اللہ پر آسان ہے۔''

اس آیت پاک میں دو ٹکڑے ہیں' ایک یہ کہ جو عورت بھی اپنے پیٹ میں بچہ رکھتی ہے یا بچہ جنتی ہے وہ خدائے پاک کے علم سے ہے' دوسرا یہ ہے کہ جس کو چھوٹی بڑی جو عمر بھی ملتی ہے' وہ کتابِ الٰہی میں پہلے سے لکھی ہوتی ہے ان دونوں ٹکڑوں کے ملانے سے معلوم ہوگا کہ کتابِ الٰہی میں ہونا اور علمِ الٰہی میں ہونا دونوں ہم معنی ہیں۔

قرآن پاک نے اس کو بھی ظاہر کیا ہے کہ قضا و قدر کے عقیدہ کی فلسفیانہ حقیقت سے زیادہ اس کی نظر اس عقیدہ کی اخلاقی اہمیت پر ہے' انسان کا یہ حال ہے کہ وہ اپنی ناچیز کوشش کی ذرا سی کامیابی پر فخر و غرور کے نشہ میں چور ہو جاتا ہے اور ذرا سی ناکامی پر وہ دل شکستہ ہو کر ہمت ہار بیٹھتا ہے۔ یہ دونوں مختلف اخلاقی بیماریاں اس لیے اس کو لاحق ہوتی ہیں کہ وہ اپنے کام کے اچھے یا برے نتیجے کو خود اپنے کام کا لازمی نتیجہ جانتا ہے اس لیے وہ کبھی اپنے کیے پر مغرور اور کبھی ملول ہوتا ہے اور یہ دونوں کیفیتیں افراد اور اقوام کی متانت' استقلال اور صبر و ثبات کے جوہر کو برباد کرتی ہیں۔ اس لیے ایک ایسے عقیدہ کی ضرورت تھی جو کامیابی کے فخر و مسرت اور ناکامی کے افسوس و حسرت دونوں موقعوں پر عاجز انسانوں کی دست گیری کرے اور وہ یہی عقیدۂ قضا و قدر ہے۔

اس عقیدہ کا منشا یہ ہے کہ ہم کو جو کامیابی ہوتی ہے وہ ہماری کوشش کا براہِ راست نتیجہ نہیں' بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کا نتیجہ ہے' اس لیے اس پر ہمارا فخر غرور کرنا بیجا ہے' اسی طرح ہم کو جو ناکامی پیش آتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی کسی حکمت و مصلحت کا نتیجہ اور ہمارے کام سے پہلے ہی ہمارے کاموں کے نتیجے اس علام الغیوب کے علم میں مقرر ہو چکے تھے اس لیے ہم کو دل شکستہ اور مایوس نہ ہونا چاہیے' بلکہ اسی جوش و خروش اور سرگرمی سے پھر از سرِ نو جد و جہد میں مصروف ہو جانا چاہیے۔

اس مسئلہ کی یہ پوری توضیح سورۂ حدید میں ان لفظوں میں مذکور ہے:

﴿مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِي الْاَرْضِ وَ لَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ○ لِّكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَ لَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰىكُمْ وَ اللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ﴾ (حدید:۲۲'۲۳)

''کوئی مصیبت نہیں آتی ملک میں اور نہ خود تم (اس ملک کے بسنے والوں) میں لیکن یہ کہ وہ ایک کتاب (الٰہی) میں اپنی پیدائش سے پہلے درج ہوتی ہے یہ اللہ پر آسان ہے ایسا اس لیے کیا گیا تا کہ تم اس پر جو تم سے جاتا رہے غم نہ کھایا کرو اور جو تم کو (اللہ) دے اس پر اترایا نہ کرو اور اللہ تعالیٰ (کسی) ترانے والے بڑائی مارنے والے کو پیار نہیں کرتا۔''

اس آیتِ کریمہ نے مسئلۂ قضا و قدر کے فلسفہ کو اس خوبی سے واضح کیا ہے کہ اس کی تائید کے لیے مزید تشریح کی ضرورت باقی نہیں رہتی' یہ اسی عقیدہ کا نتیجہ تھا کہ صحابہ کرامؓ کی گردنیں عین کامیابی و فتوحات کی حالت میں خداوندِ قادرِ مطلق کے آگے جھک جاتی تھیں اور ناکامی کی حالت میں ان کے دل یاس و ناامیدی سے دوچار نہیں ہوتے' خاموش رہتے تھے۔ مالی بے چارگی' سیاسی مصیبت' عزیزوں کی مفارقت' لڑائیوں کی ناکامی کسی موقع پر وہ

رحمتِ الٰہی سے مایوس ہونا نہیں جانتے تھے' اور ہر خطرناک کام کے لیے وہ قدم اٹھا بیٹھتے تھے کہ ان کا یقین تھا کہ موت اپنے وقت پر آئے گی اور جو کچھ ہونا ہے وہ ہو کر رہے گا' اسی لیے ان کے دلوں میں وہ عزم ہوتا تھا کہ نہ اس کو پہاڑ روک سکتے تھے' نہ سمندر بہا لے جا سکتے تھے اور نہ حوادث کا طوفان اس کو اکھاڑ سکتا تھا' اور نہ بھڑکتی ہوئی آگ کے شعلے اس کو جلا سکتے تھے۔

﴿وَ مَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا وَ مَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَ مَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَ سَنَجْزِي الشّٰكِرِيْنَ ○ وَ كَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ مَا ضَعُفُوْا وَ مَا اسْتَكَانُوْا وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ ○﴾ (آل عمران:۱۴۵'۱۴۶)

''کسی کے اختیار میں نہیں کہ وہ اللہ کے حکم کے بغیر مر سکے' یہ لکھا ہوا مقرر ہے۔ جو کوئی دنیا کا معاوضہ چاہے گا تو ہم اس کو اس میں سے کچھ دیں گے اور جو آخرت کا معاوضہ چاہے گا اس میں سے کچھ (یہاں) دیں گے اور پورا معاوضہ شکر کرنے والوں کو آئندہ (وہاں) دیں گے' کتنے پیغمبر تھے جو لڑے ہیں ان کے ساتھ بہت سے خدا کے طالب تھے تو خدا کی راہ میں ان کو جو مصیبت پیش آئی اس کی وجہ سے نہ وہ دل ہارے نہ سست ہوئے اور نہ دب گئے اور اللہ ثابت قدم رہنے والوں کو پیار کرتا ہے۔

ان آیتوں نے یہ واضح کر دیا کہ قضا و قدر کے عقیدہ کا نتیجہ پستی' سستی اور دون ہمتی نہیں' بلکہ بلندی' استقلال' اور صبر و ثبات ہے اور یہی وہ چیز ہے جو محمد رسول اللہ ﷺ اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے کارناموں میں ہر دیکھنے والے کو صاف نظر آتی ہے' ان کو صاحبِ وحی کی یہ تعلیم تھی کہ وہ دشمنوں سے کہہ دیں کہ ہمیں ڈر نہیں کیونکہ

﴿لَنْ يُّصِيْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا هُوَ مَوْلٰنَا وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ﴾ (توبۃ:۵۱)

''ہم پر کوئی آفت آ ہی نہیں سکتی لیکن جو خدا نے ہمارے لیے لکھ دیا ہے وہ ہمارا آقا ہے اور اللہ پر چاہیے کہ ایمان والے بھروسہ کریں۔''

خطرات اور مشکلات کی ان کو پروا نہیں کہ جن کے لیے موت لکھی ہے وہ میدانِ جنگ میں بھی مریں گے اور بسترِ راحت پر بھی اور جن کی موت کا مقررہ وقت نہیں آیا' وہ تلواروں کی دھاروں اور سمندروں کے طوفانوں سے بھی سلامت بچ کر نکل آئیں گے:

﴿يَقُوْلُوْنَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِيْ بُيُوْتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِيْنَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ﴾ (آل عمران:۱۵۴)

''منافق کہتے ہیں کہ اگر ہماری بات مان لی جاتی تو ہم یہاں مارے نہ جاتے۔ کہہ دے کہ اگر تم اپنے گھروں میں بھی ہوتے تو جن پر یہاں مرنا لکھا جا چکا تھا وہ از خود اپنے مقتل میں نکل کر چلے جاتے۔''

﴿اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَ لَوْ كُنْتُمْ فِيْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ﴾ (نساء:۷۸)

''تم جہاں بھی رہو تم کو موت آ کر پالے گی اگر چہ تم مضبوط اور مستحکم قلعوں میں ہو۔''

یہی وہ عقیدہ ہے جو مسلمان کی ناقابلِ ہزیمت جرأت اور غیر شکست پذیر عزیمت اور بے خوف بہادری کا راز ہے کچھ لوگوں نے اپنی غلط فہمی سے یہ سمجھا ہے کہ مسئلہ تقدیر کے ماننے سے انسان کا مجبورِ محض ہونا لازم آتا ہے اور اس سے یہ تعلیم نکلتی ہے کہ انسان اپنی تقدیر پر صابر و شاکر ہو کر سست و غافل بن کر بیٹھ رہے حالانکہ اگر یہ صحیح ہوتا تو نہ رسولوں کی بعثت کی ضرورت تھی نہ ربانی کتابوں کے اترنے کی حاجت ہوتی' نہ تبلیغ و ارشاد کی تاکید ہوتی نہ اصلاح و ہدایت کا حکم ہوتا اور خدا کی مخلوق اپنے حال پر چھوڑ دی جاتی' مگر ایسا نہیں کیا گیا۔ لاکھوں پیغمبر بھیجے گئے' کتنی کتابیں اتریں' کروڑوں مبلغ اور مرشد بنا کر پھیلائے گئے' ہدایت اور ارشاد کی تاکید پر تاکید آئی' لوگوں کو دعوت و اصلاح ہر مسلمان کا فرض ٹھہرایا' کوشش و محنت' سعی و تلاش اور جدوجہد کی ہر مسلمان کو تاکید کی گئی' محمد رسول اللہ ﷺ کی جدوجہد سے معمور زندگی ہمارے لیے نمونہ ٹھہرائی گئی' اور خلفائے راشدین اور عام صحابہ نے اپنے کارناموں سے اس نمونہ کی کامیابی کی تصدیق کی۔

اب کیا محمد رسول اللہ ﷺ کی تلقین اور آپ کا عمل دو متضاد چیزیں تھیں؟ نہیں یہ دونوں ایک دوسرے کی مؤید تھیں' اور اس طرح یہ ایک دوسرے کی تصدیق کرتی تھیں کہ **اعملوا فکل میسر لما خلق لہٗ** ۔(بخاری)

''لوگو! اپنے اپنے کام کیے جاؤ کہ تم میں سے ہر شخص سے وہی کام صادر ہوں گے جن کے لیے وہ پیدا کیا گیا ہے۔''

کام کرنا انسان کا فرض ہے اور اس کے نتیجہ کے مطابق جزا دینا خدا کا کام ہے اور یہ تقدیر ہے' فرمایا:

﴿اِنَّ سَعْیَکُمْ لَشَتّٰی ○ فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰی وَاتَّقٰی ○ وَ صَدَّقَ بِالْحُسْنٰی ○ فَسَنُیَسِّرُہٗ لِلْیُسْرٰی ○ وَ اَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰی ○ وَ کَذَّبَ بِالْحُسْنٰی ○ فَسَنُیَسِّرُہٗ لِلْعُسْرٰی ○ وَ مَا یُغْنِیْ عَنْہُ مَالُہٗٓ اِذَا تَرَدّٰی ○ اِنَّ عَلَیْنَا لَلْھُدٰی ○ وَ اِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَۃَ وَ الْاُوْلٰی﴾

(الیل:۴'۱۳)

''بے شبہ تمہاری کوششیں مختلف رخ کی ہیں تو جس نے دیا اور پرہیز گاری کی اور نیکی کو سچ کر دکھایا تو ہم اس کو ہمیشہ ہمیشہ آسانی کی طرف لے چلیں گے اور جس نے نہ دیا اور بے پروائی برتی اور نیکی کو جھٹلایا تو ہم اس کو آہستہ آہستہ سختی کی طرف لے چلیں گے' اور اس کی دولت مندی اس کو گڑھے میں گرنے سے نہیں بچا سکتی ہے' بے شک راہ سوجھانا ہمارا فرض ہے اور آخر اور اول ہمارے لیے ہے۔''

یہ ہے قضا و قدر اور سعی و عمل کی باہمی تطبیق جس کی ژولیدگی نے اسلام سے پہلے ایک عالم کو گمراہ کر رکھا تھا' کام کرنا اور عمل کر دکھانا' انسان کا فرض ہے اور اس کے مطابق اس کی جزا دینا جو اس کام کے لیے پہلے سے مقدر ہو چکی ہے خدا کا کام ہے' نیکوں کو آہستہ آہستہ نیکی کے مزید راستہ کے دکھانے کا نام توفیق و ہدایت ہے اور بروں کو خدا کی طرف سے اس توفیق و ہدایت کے نہ ملنے کا نام عدمِ توفیق و ضلالت ہے اور ان دونوں میں سے ایک کا ملنا انسان

کی ابتدائی کوشش سے ہے' خدا فرماتا ہے:

﴿وَ الَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا﴾ (عنکبوت:۶۹)

''اور جو ہماری بات میں کوشش کرتے ہیں البتہ ہم ان کو اپنا راستہ سوجھاتے ہیں۔''

خدا کی طرف سے توفیق وضلالت کا ملنا' خود انسان کے اچھے یا برے عمل کا لازمی نتیجہ ہے۔

﴿وَ مَا یُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفَاسِقِیْنَ﴾ (بقرہ:۲۶)

''اور ہم اس سے گمراہ نہیں بناتے لیکن انہی کو جو ہمارا حکم نہیں مانتے۔''

غرض پہلے فسق عدمِ اطاعت اور نافرمانی ہوتی ہے' تب اس کے نتیجہ کے طور پر خدا کی طرف سے ضلالت کا ظہور ہوتا ہے۔

﴿وَ اَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی ○ وَ اَنَّ سَعْیَهٗ سَوْفَ یُرٰی ○﴾ (نجم:۳۹'۴۰)

''اور انسان کے لیے نہیں لیکن وہی جس کی اس نے کوشش کی اور بے شک اس کی کوشش (خدا کے حضور) دیکھی جائے گی۔''

اس کی مثال بالکل بچہ کی سی ہے' بچہ چلنا یا بولنا کیونکر سیکھتا ہے' وہ پہلے چلنے اور بولنے کی خود کوشش کرتا ہے تو اس کے والدین اس کو چلنا اور بولنا سکھاتے ہیں' بچہ پاؤں اٹھاتا ہے اور والدین اس کے ہاتھ پکڑ کر اس کو دو چار قدم چلاتے ہیں اور اس طرح رفتہ رفتہ آہستہ آہستہ چلنا سیکھتا ہے' وہ پہلے زبان ہلاتا ہے اور مبہم آوازیں نکالتا ہے تو والدین اس کو بامعنی الفاظ کی تلقین کرتے ہیں اور اس طرح دونوں کوششیں مل کر بارآور ہوتی ہیں اسی طرح تقدیرِ الٰہی اور عملِ انسانی باہم مل کر انسانوں کی عملی تاریخ تیار کرتے ہیں۔

جبر وقدر

عموماً لوگ اس موقع پر جبر وقدر کے مسئلہ کو چھیڑتے ہیں' یعنی یہ کہ انسان اپنے عمل میں مجبور ہیں یا مختار۔ حالانکہ یہ سر رشتہ کائنات کا وہ عقدہ ہے جس کا حل نہ صرف یہ کہ مذہب کے ناخن سے نہیں بلکہ عقل کے ناخن سے بھی نہیں ہوسکتا جس طرح اہلِ مذہب ارادۂ الٰہی اور ارادۂ انسانی کی باہمی تطبیق میں حیران ہیں اسی طرح فلسفۂ الٰہیات کے معلم علمِ الٰہی اور انسان کی عملی آزادی کے درمیان اور فلسفۂ اخلاق والے انسان کی آزادیِ عمل اور اس کے موروثی اثرات اور ماحول کی تاثیرات کی مجبوریوں کے درمیان جو تصادم ہے اس کو بمشکل بچا سکتے ہیں۔

دنیا کے عام مذاہب کا بھی یہی حال تھا' ہر دھاگے میں یہ گرہ' اسی طرح پڑی ہوئی تھی اور اس کے حل کی صورتیں دو ہی انہوں نے نکالی تھیں' یا تو سرے سے اس سے خاموشی برتی جائے' اور دبے پاؤں اس راستہ سے گذر جایا جائے' یا بحث چھڑی تو جبر ہی کی طرف ان کا میلان نمایاں تھا' چنانچہ یہی جبر ہندو مذاہب میں تناسخ' آواگون

اور کرم کی صورت میں ہے' عیسائیوں میں حضرت آدمؑ کے گناہ اور خدا کی مرضی کے پیرایہ میں ہے'[1] اور یہودیوں کے مجموعۂ تورات میں حضرت ایوبؑ کا صحیفہ ادھر ہی رہبری کرتا ہے' دوسری طرف مجوسی تھے' جنہوں نے انسانی اختیار و آزادی کو یہاں تک بڑھا دیا تھا کہ خود خدا بھی اس کے آگے مجبور تھا۔ خدا کو نہ صرف انسانوں کے بلکہ فرشتوں کے کاموں پر کوئی قابو حاصل نہ تھا'[2] غرض آنحضرت ﷺ کی بعثت کے پہلے مذاہب کی یہی دو نوعیتیں تھیں یعنی یا تو ان کو اس مشکل کی خبر ہی نہیں تھی' یا تھی تو خدا کی قدرتِ مطلقہ اور مشیت عامہ کی اس طرح تعبیر کرتے تھے کہ انسان بالکل بے بس اور مجبور نظر آتا تھا' یا یہ کہ تناسخ کے چکر میں اس کو پھنسا کر اس کی زندگی کو اس کے پچھلے جنم کے کرموں کے ہاتھوں گرو کر دیتے ہیں' یا پھر اس سے بچے تو انسان کو کامل' خود مختار بنا کر خود خدا کو مجبور بنا دیا۔

تمام انبیا میں آنحضرت ﷺ ہی کی شخصیت ہے' جس کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے اپنے اس دیرینہ راز کے چہرہ سے پردہ ہٹایا' حقیقت یہ ہے کہ یہ دو صداقتیں ہیں اور دونوں اپنی اپنی جگہ پر صحیح ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ تمام دنیا اور اس کے ذرہ ذرہ پر قدرت مطلقہ رکھتا ہے' آسمان و زمین اور بر و بحر میں کوئی چیز نہیں جو اس کے ارادہ اور مشیت کے بغیر حرکت بھی کر سکے' اس طرح انسان اور اس کے تمام اعمال بھی اس کی قدرت اور مشیت کے ماتحت ہیں' یہ وہ عقیدہ ہے جو ہر مذہب کی اور خصوصاً اسلام کی جان ہے' اگر یہ نہ ہو تو مذہب کی قوت بے اثر ہو کر رہ جائے اور ایک ایسا خدا ماننا لازم آ جائے جس کے اختیارات محدود' جس کی قدرتیں ناقص اور جس کی شہنشاہی نا تمام ہو۔

دوسری طرف یہ بھی صداقت ہے کہ دوسری مخلوقات کو نہ سہی مگر انسان کو اپنے اعمال کے کرنے نہ کرنے کا کسی نہ کسی طرح اختیار ضرور بخشا گیا ہے' اگر یہ اختیار نہ تسلیم کیا جائے اور انسان کو اسی طرح سراپا مجبور فرض کیا جائے جس طرح دوسری مخلوقات ہیں تو پھر انسان کے لیے خیر و شر کا امتیاز جزا و سزا' شریعت' کتاب' تعلیم اور انبیا کی بعثت یہ تمام چیزیں بیکار محض ہو جائیں' ظلم و انصاف دنیا میں کوئی چیز باقی نہ رہے' انسان کا اپنے کسی فعل پر قابلِ مدح یا قابلِ ملامت ہونا بے معنی ہو جائے' کسی اچھے کام پر خدا کا اس کو انعام' اور برے کام پر عذاب دینا سراسر ظلم بن جائے بلکہ اس دنیا کی عدالت میں بھی وہ اپنے کسی فعل کا ذمہ دار نہ ٹھہرائے۔

الغرض یہ دونوں باتیں اپنی اپنی جگہ پر درست ہیں' ایک یہ کہ خدا کو اپنی مخلوقات پر قدرتِ تامہ حاصل ہے' اور اس کی مشیت و ارادہ ہر جزو و کل پر حاوی ہے اور دوسری یہ کہ انسان کو بھی اپنے عمل پر کوئی نہ کوئی ایسا اختیار حاصل ہے جس کی وجہ سے وہ اپنے اس عمل کا ذمہ دار بنتا ہے نیکی کے کاموں کے کرنے پر وہ تعریف کا' اور بدی کے کاموں پر ملامت کا سزاوار ٹھہرتا ہے اور اسی کی بنا پر وہ اپنی دوسری زندگی میں اپنے فعل کی جزاء و سزا پانے کا مستحق

---

(۱) انجیل میں ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی گرفتاری کی رات کو دعا میں فرمایا۔ ''اے خدا اگر تو اس پیالہ کو ہٹا سکتا ہے تو ہٹا دے لیکن میری نہیں بلکہ تیری مرضی پوری ہو۔'' عیسائیوں کے جبری و قدری فرقوں کی معرکہ آرائی کا حال فرنچ فاضل موسیو دی کانٹ کی کتاب الاسلام (ترجمہ عربی) ص ۸۷ سے کسی قدر معلوم ہو سکتا ہے۔

(۲) شفاء العلیل فی القضاء والقدر والتعلیل حافظ ابن قیم۔

ٹھہرے گا اسی پر وہ فطرت کے سامنے دنیا کی عدالت میں اور آخرت میں بھی مؤاخذہ اور باز پرس کی ذمہ داری میں گرفتار ہے اور اسی کے لیے خدا کی طرف سے اس کے پاس ہدایت کی کتاب اور راستہ دکھانے والے رسول اور نبی آتے ہیں۔

آنحضرت ﷺ کا صحیفۂ ربانی پہلی اور آخری آسمانی کتاب ہے جس نے ان دونوں صداقتوں کو پوری تفصیل اور وضاحت کے ساتھ ساتھ اپنی اپنی جگہ پر تسلیم کیا ہے' اور ان کی تبلیغ کی ہے' ایک طرف وہ کہتا ہے کہ ''خدا کی اجازت کے بغیر درخت کا ایک پتہ بھی نہیں گر سکتا۔'' اور دوسری طرف وہ کہتا ہے۔ ''ہر جان اپنے کاموں کے ہاتھوں گرو ہے۔'' یعنی خدا کی ہمہ گیر قدرت' وسیع اختیار اور نا قابل رد مشیت کے باوجود اس نے خود اپنے اختیار' خود اپنی مشیت اور خود اپنی حکمت سے انسان کو ارادہ اور ارادہ کے مطابق اپنے کام کرنے والے اعضا کو ہلانے کی مشروط طاقت بخشی' یہی ارادہ اور اعضا کو اس کے مطابق حرکت دے سکنے کی محدود قدرت' اس کی ذمہ داری' تکلیف' باز پرس اور مؤاخذہ کی بنیاد ہے اور اسی پر اس کے اعمال' اخلاق اور معاملات کی پوری عمارت کھڑی ہے' اس لیے انسان پر اس کے کسی ایسے عمل کی ذمہ داری قانوناً اور شرعاً نہیں جو اس کے ارادہ اور نیت سے صادر نہ ہوئی ہو بلکہ اس کے کرنے یا نہ کرنے میں وہ مجبور و بے اختیار رہا۔ ﴿اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ﴾ اس تطبیق سے نہ تو خدائے پاک کی قدرت و اختیار کی وسعت میں فرق آتا ہے اور نہ انسان کا تمامتر مجبور ہونا لازم آتا ہے' خدا جب چاہے انسان سے اپنے دیے ہوئے اختیار اور بخشی ہوئی قدرت کو چھین لے مگر ایک وقتِ مقرر تک اپنے بنائے ہوئے قانون اور فرمائے ہوئے وعدہ کے مطابق وہ اس کو اس اختیار اور قدرت سے محروم نہیں کرتا' فرمایا:

﴿فَمَنْ شَآءَ فَلْیُؤْمِنْ وَّ مَنْ شَآءَ فَلْیَكْفُرْ﴾ (تو جو چاہے مومن بن جائے' اور جو چاہے کافر ہو جائے)

اس لیے ہر انسان اپنی جنت آپ بناتا اور اپنی دوزخ آپ مہیا کرتا ہے۔

﴿مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ وَ مَنْ اَسَآءَ فَعَلَیْهَا وَ مَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِ﴾ (حم السجدۃ: ۴۶)

''جس نے نیک کام کیا' تو اپنے لیے کیا اور برا کام کیا تو اپنے لیے کیا تیرا پروردگار بندوں پر ظلم نہیں کرتا۔''

کہ اگر ایسا نہ ہو تو وہ ظلم ہو جس سے اللہ تعالیٰ کی ذات پاک و برتر ہے' چنانچہ ارشاد ہے:

﴿وَ مِنْهُمْ مَّنْ یَّسْتَمِعُوْنَ اِلَیْكَ اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ وَ لَوْ كَانُوْا لَا یَعْقِلُوْنَ ○ وَمِنْهُمْ مَّنْ یَّنْظُرُ اِلَیْكَ اَفَاَنْتَ تَهْدِی الْعُمْیَ وَ لَوْ كَانُوْا لَا یُبْصِرُوْنَ ○ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَظْلِمُ النَّاسَ شَیْئًا وَّ لٰكِنَّ النَّاسَ اَنْفُسَهُمْ یَظْلِمُوْنَ ○﴾ (یونس: ۴۲' ۴۴)

''اے پیغمبر! ان میں سے کچھ ایسے ہیں جو تمہاری طرف کان لگاتے ہیں' تو کیا تم بہروں کو سناؤ گے' اور

اگر چہ وہ سمجھتے نہ ہوں' اور ان میں سے کچھ ایسے ہیں جو تمہاری طرف دیکھتے ہیں' تو کیا تم اندھوں کو سوجھاؤ گے اور اگر چہ وہ نہ دیکھیں۔ بے شک اللہ لوگوں پر ظلم نہیں کرتا' بلکہ لوگ ہیں جو اپنے اوپر آپ ظلم کرتے ہیں۔''

وہ انسان جو اندھا اور بہرہ بنتا ہے' اور حق کا پیغام نہ سنتا ہے اور نہ اس پر عمل کرتا ہے' خدا اس کو اندھا اور بہرہ بنا کر پھر اس کو دیکھنے اور سننے کی تکلیف نہیں دیتا کہ اگر وہ ایسا کرتا تو یہ اس کا ظلم ہوتا' اور ظلم کے ہر شائبہ سے اس کا ہر حکم اور ہر کام بری ہے' لوگوں کو قرآن کی ہدایت و ضلالت کے الفاظ سے بھی دھوکا ہوا ہے حالانکہ ہدایت اور ضلالت خدا کا وہ فیضان ہے جو انسان کے اچھے یا برے کام کے جواب میں خدا کی طرف سے ہوتا ہے' ضلالت کی نسبت فرمایا:

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَیْهِمْ ءَ اَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ وَ عَلٰی سَمْعِهِمْ وَ عَلٰۤی اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ﴾ (بقرہ:۶'۷)

''بے شک جنہوں نے (اسلام کی تعلیمات کے قبول) سے انکار کیا ان کو تمہارا تنبیہ کرنا یا نہ کرنا دونوں برابر ہے' وہ ایمان نہ لائیں گے خدا نے ان کے دلوں پر اور کانوں پر مہر کر دی اور آنکھوں پر پردہ۔''

دیکھو جب انسان سے کفر کا صدور پہلے ہو چکا' تب خدا کی طرف سے ضلالت کا فیضان ہوا' اور اس کو تشبیہاً یوں ادا کیا کہ ان کے دلوں پر مہر پڑ گئی کہ سمجھتے نہیں' کانوں پر مہر کر دی کہ سنتے نہیں اور آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا ہے کہ دیکھتے نہیں' دوسری جگہ فرمایا:

﴿بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَیْهَا بِكُفْرِهِمْ﴾ (نساء:۵۵)

''بلکہ خدا نے ان کے کفر کے سبب سے ان کے دلوں پر مہر کر دی۔''

یہاں بھی ان کا کفر خدا کی مہر پر مقدم ہے' مقصد یہ ہے کہ جب کفر کا صدور ہوتا رہتا ہے تو دلوں سے صداقت شناسی اور اثر پذیری کا جوہر سلب ہو جاتا ہے اور یہی خدا کی مہر ہے۔ (۱)

برخلاف اس کے اگر لوگ کانوں سے پیغامِ حق کے سننے اور آنکھوں سے دیکھنے اور دل سے سمجھنے کی کوشش کریں تو اللہ تعالیٰ اپنی توفیق و ہدایت سے سرفراز فرمائے' ارشاد فرمایا:

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ یَهْدِیْهِمْ رَبُّهُمْ بِاِیْمَانِهِمْ﴾ (یونس:۹)

''بے شک جو ایمان لائے اور نیک کام کیے ان کو ان کا پروردگار ان کے ایمان کے سبب ہدایت دے گا۔''

﴿وَ الَّذِیْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًی﴾ (محمد:۱۷)

---

(۱) قرآن پاک میں جہاں خدا کی اس مہر کا یا کسی کو ہدایت نہ دیے جانے کا ذکر ہے وہاں اس کے کفر و فسق کی علت ہمیشہ پہلے ذکر کر دی گئی ہے اس لیے ان آیتوں سے جبر پر استدلال صحیح نہیں۔

''اور جنہوں نے ہدایت قبول کی ان کو ہدایت میں اور بڑھایا۔''

ایرانی فلسفۂ خیر وشر کی آمیزش نے اس مسئلہ کو اور زیادہ الجھا دیا ہے' حالانکہ عربی الفاظ خیر وشر کو اعمال کے خیر وشر سے بحث نہیں' عربی میں مطلق ''خیر'' کے معنی دولت ونعمت وآرام کے اور شر'' کے معنی غربت' تکلیف اور مصیبت کے ہیں۔ قرآن پاک میں یہ دونوں لفظ ان ہی معنوں میں آئے ہیں' البتہ جب ان کے ساتھ لفظ عمل شریک ہوگا' تو عملِ خیر اور عملِ شر کے معنوں میں یہ استعمال ہوگا' جیسے

﴿فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ○ وَ مَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ○﴾ (زلزال: ۷، ۸)

''جو کوئی ذرہ برابر نیکی کرے گا وہ اس کو دیکھے گا اور جو برائی کرے گا وہ اس کو دیکھے گا۔''

اس لیے حدیثوں کے ان الفاظ میں

﴿وَ الْقَدْرِ خَيْرِهٖ وَ شَرِّهٖ مِنَ اللّٰهِ تَعَالٰى﴾

''اور اس پر ایمان کہ خیر اور شر کی تقدیر خدا کی طرف سے ہے۔''

کا یہ مطلب نہیں کہ انسانوں کے اچھے اور برے کام سب خدا کی طرف سے ہیں' بلکہ یہ معنی ہیں کہ انسان کو راحت ورنج' مسرت وتکلیف' دولت وافلاس اور صحت ومرض وغیرہ اچھائی اور برائی سب خدا کی طرف سے پہنچتی ہے اور اس کے تسلیم کرنے میں کیا عذر ہو سکتا ہے۔

بعض لوگوں کو صحیح مفہوم کے سمجھنے ہیں ان آیتوں سے بھی شبہ ہوتا ہے جن میں یہ ذکر ہے کہ ''اگر خدا چاہتا تو ان کو ہدایت دے دیتا۔'' اس سے وہ غلطی سے یہ سمجھتے ہیں کہ وہ خود خداوند تعالیٰ ہی ہے جو ان کافروں کو ہدایت سے جبراً روکے ہوئے ہے' حالانکہ ان آیتوں کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ از خود اسلام قبول نہیں کر سکتے' الا یہ کہ خود خدا زبردستی ان کو مسلمان بنا دینا چاہے' مگر ایسے زبردستی سے مسلمان یا کافر' اور نیک یا بد بنا دینا اللہ تعالیٰ کے جاری قانون کے خلاف ہے چنانچہ ان آیتوں کا یہی مطلب ہے۔

﴿وَ مَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ﴾ (دہر:۳۰)

''تم نہیں چاہو گے الا یہ کہ خود خدا چاہے اور (تم کو زبردستی مسلمان بنا دے)''

﴿مَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْٓا اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ﴾ (انعام:۱۱۱)

''وہ نہیں ہیں کہ ایمان لے آئیں الا یہ کہ خدا چاہے۔''

﴿وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدٰى﴾ (انعام:۳۵)

''اور اگر خدا چاہتا تو ان کو ہدایت پر متفق کر دیتا۔''

﴿فَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ﴾ (انعام:۸)

''تو اگر وہ (خدا) چاہتا تو البتہ ان سب کو وہ خود ہدایت دے دیتا۔''

﴿وَ لَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ﴾ (نحل:۹)

''اور اگر وہ خدا چاہتا البتہ ان سب کو ہدایت دے دیتا۔''

مگر اس کی عادت نہیں کہ وہ بندے کے ارادہ اور کوشش کے بغیر از خود کسی کو ہدایت دے اس لیے اس مشیت الٰہی کے ساتھ قرآن پاک کی وہ آیتیں مطابق ہوں گی، جن میں بندوں کی مشیت کا بھی اعتبار کیا گیا ہے، فرمایا:

﴿فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّ مَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ﴾ (کہف:۲۹)

''تو جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر کرے۔''

﴿فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا﴾ (دہر:۲۹: مزمل:۱۹)

''تو جو چاہے اپنے پروردگار کی طرف کا راستہ اختیار کرے۔''

﴿فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ مَاٰبًا﴾ (نبا:۲۹)

''سو جو چاہے اپنے پروردگار کے پاس اپنا ٹھکانا بنا رکھے۔''

﴿اِلَّا مَنْ شَآءَ اَنْ يَّتَّخِذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا﴾ (فرقان:۵۷)

''لیکن جو اپنے پروردگار کی طرف راستہ اختیار کرنا چاہیے۔''

اللہ تعالیٰ کی طرف سے گمراہی بھی اترتی ہے مگر کن کے لیے تصریحاً فرمایا:

(۱) ﴿وَ مَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ﴾ (بقرہ:۲۶)

''اور اللہ اس سے گمراہ نہیں کرتا مگر نافرمانوں کو۔''

(۲) ﴿فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْفَاسِقِيْنَ﴾ (صف:۵)

''جب وہ کج ہوئے تو اللہ نے ان کے دلوں کو کج کر دیا اور اللہ بے حکم لوگوں کو ہدایت نہیں کرتا۔''

(۳) ﴿بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ﴾ (المطففین:۱۴)

''بلکہ ان کے کام ان کے دلوں پر زنگ بن گئے۔''

(۴) ﴿بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ﴾ (نساء:۱۵۵)

''بلکہ ان کے کفر کے سبب سے اللہ نے ان پر مہر کر دی۔''

(۵) ﴿اِنْصَرَفُوْا صَرَفَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ﴾ (توبۃ:۱۲۷)

''وہ پھر گئے اللہ نے ان کے دلوں کو اس لیے پھیر دیا کہ وہ لوگ سمجھتے نہ تھے۔''

(۶) ﴿كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِ الْكٰفِرِيْنَ﴾ (اعراف:۱۰۱)

''اسی طرح اللہ کافروں کے دلوں پر مہر کر دیتا ہے۔''

(۷) ﴿فِىْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا﴾ (بقرہ:۱۰)

''ان کے دلوں میں (پہلے سے نفاق کی) بیماری تھی، تو خدا نے بیماری بڑھادی۔''

ان آیتوں میں سے ہر ایک پر غور کرو، ہر ایک سے یہ صاف صریح معلوم ہوگا کہ انسان کی بداعمالی مقدم ہے اور اللہ تعالیٰ کا اس کے جوابی اثر کو اپنی طرف سے ضلالت، گمراہی، زنگ، مہر اور بیماری فرمانا مؤخر ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ضلالت، زنگ، مہر اور بیماری کا اترنا علت اور انسانوں کا کفر و گناہ نفاق معلول نہیں ہے، بلکہ حقیقت اس کے برعکس ہے، یعنی انسان کا فسق، کجی، زنگ، کفر، انصراف (پھر جانا) نادانی اور قلب کی بیماری پہلے ہوتی ہے، اور خدا کی طرف سے اس کے جواب میں ضلالت و گمراہی اور دل پر مہر بعد کو ہوتی ہے، اور یہی طبعی اصول بھی ہے، انسان جب گرتا ہے تو چوٹ لگتی ہے، اور غمگین ہوتا ہے، تب آنسو کے قطرے ٹپکتے ہیں، اگر کوئی اس کو الٹ کر بیان کرے تو یہ کیسی سخت نادانی ہوگی۔

بہر حال اس مسئلہ میں مہبطِ وحی و رسالت محمد رسول اللہ ﷺ کی عجیب مصلحت بینی یہ ہے کہ آپؐ نے اپنی امت کو اس پر جس شدت سے ایمان لانے کی تلقین فرمائی اسی شدت سے اس میں بحث و مناقشہ سے منع فرمایا۔ (۱) اور درحقیقت اس نظریہ سے اسی طرح فائدہ اٹھانے میں راز ہے، یہ کلی جہاں چٹکی کہ اس کی خوشبو اڑ گئی۔

اس عقیدہ کے تمام وسیع اطراف اور گوشوں کو چھوڑ کر جن کو متکلمین کی مجادلانہ کاوشوں نے پیدا کیا ہے، قرآن حکیم کی صرف اس آیت کو سمجھ لینا کافی ہے۔

﴿وَ لَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ وَ خَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا﴾ (فرقان:۲)

''اور خدا کی سلطنت میں اس کا کوئی شریک نہیں اور اس نے ہر چیز کو پیدا کیا پھر اس کا ایک اندازہ (تقدیر) لگا دیا۔''

❀ ❀ ❀

(۱) مشکوٰۃ باب الایمان بالقدر۔

ایمان کے نتائج

گذشتہ صفحوں میں ایمان کی حقیقت اور اس کی چھ شاخوں خدا' فرشتے' رسول' کتاب' یوم آخر اور قدر کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں' اور دکھایا گیا ہے کہ ان میں سے ہر عقیدہ کی حقیقت کیا ہے' اس کی صداقت کی دلیلیں کیا ہیں؟ اور اس کی تعلیم میں شارع نے کیا مصلحتیں رکھی ہیں اور شروع میں یہ بحث بھی کی جا چکی ہے کہ ہر مذہب میں اور خصوصاً مذہبِ اسلام میں ایمان کو اولین اہمیت کیوں دی گئی ہے؟ وہ بحثیں اصول کی تھیں' یہاں خاتمہ میں نتائج کی حیثیت سے پھر اسی دعویٰ کی تکرار کی جاتی ہے یعنی یہ کہ درحقیقت ایمانیات اسی لائق ہیں کہ ان کو مذہب میں یہی اولین درجہ دیا جائے' کیونکہ مذہب جن نتائج تک پہنچنا چاہتا ہے وہاں ایمان کی روشنی کے بغیر پہنچنا ممکن ہی نہیں۔

اس سے پہلے کہ ہم کسی دستور پر عمل کریں' یہ ضروری ہے کہ ہم اس دستور کی خوبی اور سچائی کا یقین کریں کہ اگر ایسا نہ ہو تو ہم اس پر ایمان داری کے ساتھ نہ تو عمل کر سکتے ہیں اور نہ ہمارے نفس وضمیر پر اس کا اثر ہو سکتا ہے' یہ حقیقت ہر دلیل سے ثابت ہے کہ ہمارے تمام اعمال ہمارے دل کے تابع ہیں' اس لیے جب تک دل نہ بدلے گا' ہمارے اعمال میں تغیر نہیں ہو سکتا یعنی ہمارے اعمال کی اصلاح تمامتر ہمارے دل کی اصلاح کے زیرِ اثر ہے۔ اور ایمان کا مقصد اسی دل کی اصلاح ہے کہ اگر یہ درست ہو گیا تو سب کچھ درست ہو گیا۔

یہاں ایک خاص نکتہ ہے جس کو سمجھے بغیر آگے نہیں بڑھنا چاہیے' یہود نے سب سے زیادہ اہمیت عملی رسم و رواج کو دی تھی' اور عیسائیوں نے اس کے برخلاف صرف ایمان پر نجات وفلاح کا دار و مدار رکھا' چنانچہ حواریوں کے خطوط وملفوظات میں اس تعلیم کو بہت کچھ نمایاں کیا گیا ہے' اور بتایا گیا ہے کہ عمل نہیں بلکہ صرف ایمان نجات کا ذریعہ ہے۔ اسلام کی پہلی تکمیلی شان اس بارہ میں یہ ہے کہ وہ دونوں کی اصلاح کر کے ان دونوں کو جمع کرتا ہے' اور کہتا ہے کہ نجات نہ تنہا ایمان اور نہ تنہا عمل پر بلکہ ایمانِ صحیح اور عملِ صالح کی جامعیت پر موقوف ہے۔ ﴿اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾ (جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کیے) دوسری بات یہ ہے کہ وہ ایمان کو محض ایمان کی بنا پر اہمیت نہیں دیتا' بلکہ اس لیے اہمیت دیتا ہے کہ وہ عملِ صالح کی علت وسبب ہے یعنی وہ عملِ صالح کے لیے راستہ بناتا اور تخم ریزی کے لیے زمین درست کرتا ہے۔

یہ کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے اس لیے نخلِ ایمان کی شناخت بھی اس کے پھل ہی سے ہو سکتی ہے اب اگر ایسا کوئی شخص تم کو نظر آتا ہے کہ زبان سے ایمان کا دعویٰ کرتا ہے مگر اس کے اعمال میں اس ایمان کے مطابق کوئی بہتر تغیر نظر نہیں آتا' تو یہی سمجھنا چاہیے کہ ایمان نے اس کی زبان سے اتر کر اس کے دل کی گہرائیوں میں برگ و بار پیدا نہیں کیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ قرآنِ پاک ہر نیکی اور خوبی کو ایمان کا خاصہ اور

مومنوں کا وصفِ لازم بتاتا ہے ہر اہم موقع پر اس نے مسلمانوں کو ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾ (اے وہ لوگو! جو ایمان لائے) کی ندا سے خطاب کیا ہے، جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان احکام پر وہی عمل کر سکتے ہیں جو ایمان سے متصف ہیں، بہت سے موقعوں پر ہے ﴿اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ﴾ (اگر تم ایمان والے ہو)

اس سے معلوم ہوا کہ یہ بات ایمان والوں ہی کے لیے خاص ہے، اور وہی اس کے اہل و سزاوار ہیں، فرمایا۔

﴿وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ﴾ (بقرہ:۱۶۵)

''ایمان والے سب سے زیادہ اللہ سے محبت رکھتے ہیں۔''

اس سے معلوم ہوا کہ محبتِ الٰہی ایمان کی بہت بڑی علامت ہے ایک اور سورہ میں ہے:

﴿اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِیْنَ اِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ لِیَحْكُمَ بَیْنَهُمْ اَنْ یَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ (نور:۵۱)

''ایمان والوں کی بات یہ ہے کہ جب ان کو فیصلہ کرنے کے لیے اللہ و رسول کی طرف بلایا جائے تو کہیں کہ ہم نے سنا اور ہم نے مانا اور ان ہی لوگوں کا بھلا ہے۔''

اس سے ظاہر ہوا کہ ایمان کا ایک نتیجہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت اور اس کے فیصلہ کے آگے سر جھکانا ہے دوسری آیت میں فرمایا:

﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ﴾ (حجرات:۱۰)

''ایمان والے تو آپس میں بھائی ہیں۔''

اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ مسلمانوں میں باہمی محبت اور شفقت ہونا بھی ایمان کی نشانی ہے، ایک اور آیت میں ہے:

﴿وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْیَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ﴾ (آل عمران:۱۶۰)

''اور خدا ہی پر چاہئے کہ ایمان والے بھروسہ کریں۔''

معلوم ہوا کہ خدا پر بھروسہ اور توکل اہل ایمان کی شان ہے۔ سورۂ مومنون میں اہلِ ایمان کے اوصاف یہ بتائے گئے ہیں۔

﴿قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ○ الَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلٰوتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ○ وَ الَّذِیْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ○ وَ الَّذِیْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ ○ وَ الَّذِیْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ○ ..... وَ الَّذِیْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَ عَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ○ وَ الَّذِیْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ یُحَافِظُوْنَ ○﴾ (مؤمنون:۱، ۵۔۔۔۔۔۹)

''بے شبہ اہل ایمان نے بھلائی پائی جو اپنی نماز میں ادب سے جھکے رہتے ہیں، اور جو نکمی بات پر دھیان نہیں دیتے اور جو زکوٰۃ ادا کرتے ہیں، اور جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔ اور جو

اپنی امانتوں اور وعدوں کی نگرانی رکھتے ہیں اور جو اپنی نمازوں کی پابندی کرتے ہیں۔"

ان آیتوں سے اہلِ ایمان کے ضروری اوصاف یہ معلوم ہوئے' نماز میں خشوع وخصوع' بے کار باتوں سے احتراز' زکوٰۃ وخیرات دینا عفت و پاک دامنی' امانت' ایفائے عہد' نمازوں کی پابندی' ان آیتوں میں ایک عجیب رمز ہے' دیکھو کہ اہلِ ایمان کے اوصاف کا آغاز بھی نماز سے کیا گیا اور انجام بھی نماز پر رکھا گیا' اس سے اشارہ نکلا کہ نماز ایمان کی اولین وآخرین نشانی ہے' اور اسی لیے ایمان کے بعد سب سے زیادہ اس پر زور دیا گیا ہے۔

ہم نے یہ چند آیتیں یہاں مثالاً نقل کی ہیں' ورنہ اگر کوئی استقصاء کرے تو قرآن میں ایمان کے اثرات و نتائج اور بہت سے ملیں گے' احادیث میں بھی اس مضمون کی کمی نہیں' صحیح حدیث ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ایمان کی کچھ اوپر ستر شاخیں ہیں' حافظ بیہقی نے اپنی کتاب شعب الایمان میں مختلف حدیثوں سے ایمان کی ان ستر شاخوں کو ایک ایک کر کے گنایا ہے' اس کتاب کا خلاصہ مختصر شعب الایمان کے نام سے چھپ بھی گیا ہے' ایک حدیث میں ایمان کی شناخت' اخلاق کی پاکیزگی کو بتایا گیا ہے' آپؐ نے فرمایا۔

اَکْمَلُ الْمُؤْمِنِیْنَ اِیْمَانًا اَحْسَنُھُمْ خُلُقًا (سنن ابی داؤد کتاب السنۃ)

"مومنوں میں اس کا ایمان سب سے زیادہ کامل ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہیں۔"

حسنِ اخلاق کا اساسی مرکز محبت ہے' یہ محبت سب سے پہلے تو اسی ہستی سے ہونی چاہیے' جو تمام محبتوں کا مرجع ومرکز ہے' یعنی اللہ تعالیٰ اور اس کے بعد اسی محبتِ الٰہی کے ضمن اور تبعیت میں اس ہستی سے بھی محبت کرنا جس کی ہدایت اور تعلیم کے وسیلہ سے یہ جوہرِ ایمانی ہم کو ہاتھ آیا اس محبت کے سامنے دوسری تمام دنیاوی محبتیں' اور قرابت اور رشتہ داری کے علائق ہیچ ہیں' فرمایا:

لَایُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی اَکُوْنُ اَحَبَّ اِلَیْہِ مِن وَّلِدِہٖ وَ وَالِدِہٖ وَ النَّاسُ اَجْمَعِیْنَ. (مسلم و بخاری کتاب الایمان)

"تم میں سے کوئی اس وقت تک ایمان میں کامل نہیں جب تک اس کے دل میں میری محبت اس کی اولاد والدین اور تمام لوگوں سے زیادہ نہ ہو۔"

ایمان کا تیسرا اثر یہ ہے کہ اس کو اپنی ہم جنس برادری اور پڑوسی سے بھی اسی طرح محبت' پیار اور اخلاص ہو جس طرح خود اپنے آپ سے' فرمایا:

وَ الَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یُحِبُّ لِاَخِیْہِ اَوْلِجَارِہٖ مَایُحِبُّ لِنَفْسِہٖ. (بخاری و مسلم کتاب الایمان)

"قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے تم میں سے کسی کا ایمان اس وقت تک کامل نہیں جب تک وہ اپنے بھائی یا پڑوسی (راوی کو شک ہے) کے لیے نہ چاہے جو وہ اپنے لیے چاہتا ہے۔"

آپؐ نے ایک دفعہ صحابہؓ کو خطاب کر کے فرمایا' جب تک تم مومن نہ بنو گے جنت میں داخل نہ ہو سکو گے اور مومن نہ بنو گے جب تم آپس میں ایک دوسرے سے محبت نہ کرو گے' میں تمہیں بتاؤں کہ تم میں آپس میں محبت کیونکر ہو سکتی ہے' آپس میں سلام پھیلاؤ (مسلم کتاب الایمان)

یہ محبت کسی نمائش' ریا یا ذاتی نفع و نقصان کے لیے نہ ہو بلکہ خدا اور صرف خدا کے لیے ہو' فرمایا تین باتیں جس میں ہیں اس نے ایمان کا مزہ پا لیا' اول یہ کہ اس کے دل میں خدا اور رسول سے بڑھ کر کسی اور کی محبت نہ ہو' دوسری یہ کہ بندگانِ خدا سے صرف خدا کے لیے محبت کرتا ہو' تیسری یہ کہ کفر سے نجات پانے کے بعد پھر اس میں آلودہ ہونا اس کے لیے اتنا ہی تکلیف دہ ہو جتنا آگ میں ڈالا جانا۔'' ایک صحابیؓ نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! کامل اسلام کس مسلمان میں ہے۔ فرمایا اس مسلمان میں جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرا مسلمان محفوظ رہے' فرمایا کہ ایمان کی ستر سے کچھ اوپر شاخیں ہیں' جن میں سے ایک شرم و حیا ہے'' یہ بھی تعلیم دی کہ جس کو خدا اور آخرت کا ایمان ہو اس کو چاہیے کہ زبان سے بات نکالے تو اچھی' ورنہ چپ رہے۔ جس کو خدا اور آخرت پر ایمان ہو اس کو چاہیے کہ اپنے پڑوسی کو دکھ نہ پہنچائے جس کو خدا اور آخرت پر ایمان ہو اس کو چاہیے کہ مہمان کی عزت کرے۔'' ایک صحابیؓ آپؐ کے اس ارشاد کو نقل کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا تم میں سے کوئی اگر کوئی برائی دیکھے تو اس کو ہاتھ سے مٹا دے' یہ نہ ہو سکے تو زبان سے ٹوک دے' یہ بھی نہ ہو سکے تو اپنے دل میں اس کو برا سمجھے اور یہ ایمان کا آخری درجہ ہے۔''(۱)

اس کے بالمقابل آپؐ نے متنبہ فرمایا کہ ''نفاق کی چار نشانیاں ہیں' جس میں ان میں سے ایک بھی پائی جائے اس میں اتنا نفاق کا عنصر موجود ہے' اگرچہ وہ نماز گذار اور روزہ دار ہی کیوں نہ ہو' اور اپنے کو وہ مسلمان ہی کیوں نہ سمجھتا ہو' ایک یہ کہ گفتگو کرے تو جھوٹ بولے' وعدہ کرے تو توڑ دے امانت سپرد کی جائے تو خیانت کرے غصہ آئے تو گالی بکے (۲) اس تفصیل سے ظاہر ہو گا کہ تمام نیکیاں اور ہر قسم کی بھلائیاں اور خوبیاں جس ایک جڑ کی شاخیں ہیں وہ ایمان ہے' اور اسی لیے وہ مذہب کا اصل الاصول ہے وہ نہ ہو تو انسانی نیکیوں کی ساری عمارت بے بنیاد ہے۔ اس تقریر سے کسی کو یہ شبہ نہ ہو کہ ایمان کے بعد عمل کی ضرورت نہیں' اسلام نے اسی نکتہ کو بار بار ادا کیا ہے کہ نجات کا مدار ایمان اور عمل صالح دونوں پر ہے' اسی لیے ﴿اٰمَنُوْا﴾ کے ساتھ ساتھ ﴿وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾ پر بھی اس نے ہمیشہ زور دیا ہے' بلکہ اوپر جو کچھ کہا گیا ہے' اس کا منشا یہ ہے کہ ان دونوں میں ایمان اصل اور عمل اس کی فرع ہے ایمان ملزوم اور اعمالِ حسنہ اس کے خصوصیات اور لوازم ہیں' یعنی ان دونوں میں اصل و فرع اور لازم و ملزوم کا تعلق ہے' جو ایک دوسرے سے الگ اور جدا نہیں ہو سکتے' اس لیے جس طرح ایمان کے بغیر عمل سرسبز نہیں رہ سکتا' اسی طرح عمل کے بغیر ایمان ایک بے برگ و بار درخت ہے جس کا فائدہ کے لحاظ سے عدم و وجود برابر ہے'

(۱) یہ تمام روایتیں صحیحین کتاب الایمان میں ہیں۔
(۲) صحیح بخاری کتاب الایمان پیشِ نظر مسلم ہے۔

اس بنا پر جہاں ایمان ہے اس کے عملی نتائج و آثار کا وجود بھی ضروری ہے۔

کاغذ کے چار سو اکہتر صفحے سیاہ ہو چکے، ناظرین کے ہاتھ ان اوراق کی گرانباری سے اور آنکھیں ان سطور کی کم سوادی سے تھک چکی ہوں گی، اس لیے بہتر ہے کہ رہروِ قلم کے ساتھ قافلۂ نظر کے دوسرے رفقا بھی کچھ دیر آرام کریں، ہر چند کہ

رہروان را خستگیِ راہ نیست
عشق ہم راہ است وہم خود منزل است

سلیمان ندوی

دارالمصنفین ۔۔۔۔۔۔۔رمضان ۱۳۵۰ھ